یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔
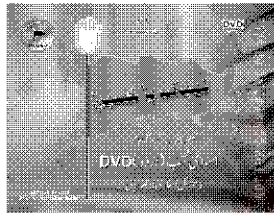
منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

آیت اللہ العظمی محمد حسین طباطبائی
ترجمہ
المیزان
فی
تفسیر القرآن
آیت اللہ حسن رضا غدیری
۵
الغدیر

تالیف:

علامہ السید محمد حسین الطباطبائی

ترجمہ

المیزان

فی تفسیر القرآن

(علمی، فنی، فلسفی، ادبی، تاریخی اور حدیثی معارف سے مزین)

جلد ۵

مترجم

آیت اللہ حسن رضا غدیری

ناشر

الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ)

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد سے رجسٹرڈ

ISBN No.

978-969-8947-14-9

شناس نامۂ کتاب

نام کتاب ---------------- المیزان فی تفسیر القرآن

جلد------------------------- پنجم

تالیف------------------- آیت اللہ العظمیٰ السیّد محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ ------------------ آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی

اہتمام وترتیب ------------ سیّد دولت علی زیدی

تدوین وتزئین ------------ آغا ابوطالب غدیری

ناشر--------------------- الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ)

تاریخ اشاعت باراوّل ----------- اگست 2017ء

مطبع----------------- حیدری پریس۔ ریلوے روڈ لاہور

ملنے کا پتہ: ☆ الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ)، ہوپ روڈ، لوکو شیڈ لاہور۔ 54900 (پاکستان)

فون: 0306-4132380 / 0333-4237989

☆ حق برادرز، غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، اردو بازار (لاہور) فون: 0333-4431382

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ نساء

۷۷ سے ۱۷۶ آیات تک

یہ سورۂ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا

فہرست

موضوعی فہرست

جوموضوعات اس جلد میں عنوان قرار پائے وہ درج ذیل ہیں :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حرفِ اوّل

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مطہر پر اُتارا اور یہ کلام کتابی صورت میں قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت وسعادت کا ضامن ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کی دنیوی واُخروی زندگی کے زریں اصول ذکر کئے گئے ہیں، اس کی جامعیت کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہر خشک وتر کا ذکر نہایت خوبصورت انداز میں کر دیا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کا اجمالی یا تفصیلی، جزئی یا کلی، عام یا خاص صورت میں تذکرہ نہ ہو، یقیناً یہ مقدس کتاب ہمارے لئے خدائی آئین ہے کہ جس میں ہمارے حقوق وواجبات سب مذکور ہیں، اس میں کوئی لفظ زائد ہے اور نہ ہی کوئی حرف بے معنی ہے بلکہ اس کے وہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتداء میں مذکور ہیں کہ جنہیں ''حروف مقطعات'' کہا جاتا ہے وہ بھی عظیم معانی ومفاھیم کے حامل ہیں البتہ ان کے بارے میں حقیقی علم اللہ تعالیٰ کو ہے کہ جس نے انہیں نازل فرمایا یا اس ہستی کو ہے جس پر یہ نازل ہوئے اور اس ہستی نے ان کا علم اہل بیتؑ کو عطا فرمایا، کوئی دوسرا شخص ان کا یقینی وتعینی معنیٰ نہیں کرسکتا، آئمہ معصومینؑ نے قرآنی آیات کی تفسیر میں جو کچھ ارشاد فرمایا اس کی روشنی میں ہمیں اللہ کے کلام کے معانی کا ادراک آسان ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں ہر حوالہ سے بحث وتحقیق، سند اور متن کا مکمل جائزہ لینا اور پھر آیات کا آیات کے تناظر میں معنیٰ کرنا، کرنے کا اصل کام ہے اور یہ کام ہر دور میں ارباب فکر ونظر نے انجام دیا تا کہ اللہ کے کلام سے استفادہ کرتے ہوئے حقائق ومعارف سے آگاہی حاصل کی جاسکے، اس حوالہ سے ان بزرگ محققین کی کاوشیں لائق تحسین ہیں جنہوں نے اپنے شب وروز ایک کر کے اس مقدس کتاب کی پوشیدہ حقیقتوں تک ممکنہ رسائی کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کیا، اگرچہ تفسیر القرآن بالقرآن کا عمل گونا گوں جہات سے بحث کا حامل ہے لیکن اللہ کا کلام ہی اس کی صحیح تفسیر کرسکتا ہے خواہ وہ لفظی صورت میں ہو یا وجودی صورت میں ہو، کون نہیں جانتا کہ عربوں کو اپنی فصاحت وبلاغت اور ادب پر ناز تھا اور وہ اپنے سوا سب کو عجم یعنی گنگے سمجھتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل گمان کو اس عظیم ہستی کے ذریعے بے نقاب کیا جسے (معاذ اللہ) جاہل وان پڑھ سمجھنے والوں نے بالآخر عالم ومعلم تسلیم کیا، میں سمجھتا ہوں کہ ادبی کمالات پر فخر کرنے والوں کے لئے قرآن مجید کے حروف مقطعہ ہی چیلنج کے لئے کافی تھے کہ انہی کے معانی بتاؤ اور ان کے مقابل کلام لے آؤ، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے رموز واسرار کا علم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرما کر عربوں کے غرور کا سر قلم کر دیا اور وہ اس عظیم کتاب کی مثل لانے سے عاجز وناتواں ہو گئے، یہی بات قرآن مجید کی معجزاتی حیثیت کا

منہ بولتا ثبوت ہے کہ آج تک کسی کو اس کا مقابلہ کرنے یا اس کی نظیر لانے کی جرأت نہ ہوسکی، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا یا جیسا کہ کفار و مشرکین نے الزام لگایا تھا کہ (معاذ اللہ) محمدؐ نے خود ہی اسے بنایا ہے اور اس کی نسبت اللہ کی طرف دے دی ہے اگر ان کی بات درست ہوتی تو وہ یقیناً اس سے بڑا کلام پیش کر دیتے یا اس کے برابر کا کلام لے آتے مگر ایسا نہ ہوسکا بلکہ اس کے برعکس وہ لوگ اس کے مقابل میں اپنی ناتوانی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے اور اس عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے، اللہ کا کلام آج بھی اپنی عظیم نسبت کے ساتھ موجود ہے اور کسی کو اس کا مقابلہ کرنے کی مجال نہیں، اس کی ترتیب ہی ایسی ہے کہ کوئی شخص اس جیسی کلامی ترتیب پیش ہی نہیں کر سکتا بلکہ اس کا بیان خواہ جس موضوع سے متعلق ہو انفرادیت کا حامل ہے اور اس کے جملے اس کی خدائی نسبت کی گواہی دیتے ہیں اس مقدس کتاب کا ہر لفظ اور ہر حرف ہدایت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اس کے بارے میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے کس قدر خوبصورت الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ اے لوگوں، تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے حرام وحلال کو تم پر واضح کر دیا ہے اس کے فرائض وفضائل کو، اس کے ناسخ ومنسوخ کو، اس کی رخصت وعزیمت کو، اس کے خاص وعام کو، اس کے مرسل ومحدود کو، اس کے محکم ومتشابہ کو اچھی طرح کھول کر بتا دیا ہے اس کے مجملات کی تفسیر کر دی ہے اس کے اسرار و گہرائیوں کو واضح کر دیا ہے، قرآن کا ظاہر دلفریب ہے اور اس کا باطن عمیق ہے نہ اس کے عجائبات انتہا پذیر ہوں گے اور نہ اس کے غرائب کبھی ختم ہوں گے اور یاد رکھو کہ تاریکیاں اگر دور ہوسکتی ہیں تو اسی سے! حقیقت میں حضرت علیؑ نے اللہ کی کتاب کے حوالہ سے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس کے اسرار و رموز کو حضرت رسولؐ خدا نے بیان فرما دیا ہے مگر افسوس کہ گردشِ ایام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات پر پردہ ڈال دیا جس کے نتیجہ میں اس مقدس کتاب سے کما حقہ ہدایت حاصل کرنا آسان نہ ہے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس کلام الٰہی کی مختلف تفسیریں کی گئیں اور تحریف وتفسیر بالرائے کے ذریعے اس کے حقائق سے نورِ ہدایت حاصل نہیں کرنے دیا گیا حالانکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ہی قرار دے (من فسر القرآن برأیه فلیتبوا متعدهٔ من النار)، قرآن کی تفسیر خود قرآن کے ذریعے کرنے کا وہ پہلا کام ہے جو اہل بیتؑ نے تعلیم دیا اور پھر انہی حضرات نے اس کی تفسیر میں قرآنی آیات کے استدلال سے اس کے معانی بتائے، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقدس کلام کو پڑھ کر اس کے معانی کو سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے، ہماری کوشش ہے کہ المیزان فی تفسیر القرآن کے اردو ترجمہ کے ذریعے اس عظیم آئین الٰہی سے کسب فیض کر کے اس کے حقائق ومعارف سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے اس پر عمل کی راہ ہموار کی جائے، یقیناً تفسیر المیزان اپنے موضوع کے لحاظ سے اسم با مسمٰی ہے، اللہ ہماری کوشش قبول فرمائے۔

حسن رضا غدیری

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

پیش لفظ

قرآن فہمی ہماری زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہم پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ہماری ہدایت و سعادت کے لئے معصوم رہبر و رہنما بھیجے اور اپنی طرف سے کتابیں نازل کر کے عملی دستوار العمل سے آگاہی دلائی، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے معصوم رہبروں کے سید و سردار حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی اور سب سے آخری کتاب اُتری جس کے بارے میں ارشاد ہوا: ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' وہ کتاب ایسی ہے جس کے بارے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا، وہ تقویٰ والوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔ اس مقدس کتاب کی تفسیر بھی یقیناً ان ہستیوں کا حق ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے علوم و معارف کا امین قرار دیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو اس کتاب اور ان ہستیوں کی پیروی کا حکم دیا گیا تاکہ وہ اپنی فلاح و کامیابی کو یقینی بنا سکیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اس مقدس کتاب کی تفسیر ''المیزان'' کے اُردو ترجمہ کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائی اور پانچویں جلد آپ قارئین کرام تک پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، اس جلد میں سابقہ مباحث کی تکمیل کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، اس میں سورۂ نساء کی آیت ۷۷ سے آخری آیات تک اور سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیات سے آیت ۵۴ تک کی تفسیر مذکور ہے جس میں متعدد اہم ترین مطالب و موضوعات پر نہایت علمی انداز میں تذکرے شامل ہیں اور حسب معمول آیات کی تفسیر میں روایات شامل کر کے جہاں تفسیر القرآن بالقرآن کا اسلوب اختیار کیا گیا وہاں تفسیر القرآن باھل البیت کو ملحوظ رکھ کر ارشادات و فرمودات معصومینؑ کا حوالہ دیا گیا جو کہ اس مقدس کتاب کی حقیقتوں کا علم رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان معصوم ہستیوں کو اپنی کتاب کے تمام علوم سے نوازا اور انہوں نے بھی اپنی زندگی میں ممکن حد تک ان علوم و معارف کو لوگوں تک پہنچایا، تفسیر المیزان میں اس حوالہ سے خصوصی توجہ مبذول کی گئی کہ آیات کے الفاظ سے ظاہری معانی کے ادراک کے ساتھ ساتھ ان کے حقیقی معانی سے بھی آگاہی حاصل ہو چنانچہ اس میں مختلف عناوین کے تحت مطالب شامل کئے گئے مثلاً روایات کی روشنی میں، تاریخ کے حوالہ سے، ادب کے تناظر میں، اعتقادی مسائل کی رو سے، اخلاقی امور کی بابت، علمی و فلسفی علوم کے آئینہ میں! گویا ہر ممکنہ پہلو کے پیش نظر اس کی جامعیت وافادیت کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی، بعض موارد میں لغت واصطلاح کو بھی مورد توجہ قرار دیا گیا، گویا ہر قاری کے ذوقِ مطالعہ کی تکمیل کا ہدف حاصل کرنے کی سعی ہوئی جس سے اس کتاب کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس کے مندرجات سے بھرپور استفادہ کی راہ ہموار ہوگئی،

اگر چہ تفسیر المیزان سے پہلے اور بعد متعدد تفاسیر لکھی گئیں اور یقیناً اہل علم حضرات نے محنت کے ساتھ اللہ کی کتاب کے مطالب کی توضیحات اپنے ذوقِ علمی کے مطابق پیش کیں جو کہ اپنے مقام پر قابل قدر ہے لیکن تفسیر المیزان کو جو خصوصیت حاصل ہے اور انفرادیت کا مقام ملا وہ اسی کا حصہ ہے، دراصل مؤلف کی علمی شخصیت کی وجہ اس کتاب کو علمی حلقوں میں خاص توجہ کی نظر سے دیکھا گیا اور حوزہ علمیہ قم المقدسہ کی عظیم شخصیات کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا کہ جن میں خود مترجم بھی شامل ہیں اس کے علاوہ وہ مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ میں اس کتاب کی تدریس نے اس کی اہمیت وافادیت کو مزید آشکار کر دیا، تفسیر المیزان کے اُردو ترجمہ میں عربی متن کی شستگی اور ادبی رفعت وعلمی عظمت کو بخوبی مورد توجہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر یہ کتاب اُردو میں ہی لکھی جاتی تو ایسی ہی ہوتی، گویا اُردو ادب کی لطافت کے ہر زاویہ پر نظر رکھتے ہوئے قارئین کرام کو اس عظیم الشان کتاب سے استفادہ کرنے کے ممکنہ اسباب فراہم کئے گئے، خاص طور پر علمی وفلسفی بحثوں میں اس اہم امر کو ملحوظ رکھا گیا کہ اصطلاحات کی صحیح عکاسی ہو اور مطالب کی تفہیم کا حق ادا ہو سکے، علمی حلقوں میں اُردو ترجمہ کی مقبولیت اور محبوبیت ومرغوبیت پر کسی مزید اظہار یہ سے قطع نظر اس کی اشاعت کی مکرر صورت پر اکتفاء کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اپنی کتاب کی خدمت کے اعزاز سے نوازا اور اس کی اعلیٰ وارفع تعلیمات سے آگاہی کے حصول کی راہ میں کردار ادا کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔ یوں تو اللہ کی کتاب کی تلاوت وقرائت کے ذریعے اس میں پوشیدہ لعل وجواہر سے فیض پانے کی توفیق ہر شخص کو ملتی ہے لیکن اس کے معانی کے ادراک کا عمل ہر زبان میں اس زبان کے اہل ہی کو نصیب ہوتا ہے المیزان کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے مثلاً فارسی، انگیریزی (کچھ جلدیں) اور اُردو ترجمہ کی اشاعت کی سعادت الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان کو حاصل ہوئی ہے۔ ہماری کوشش ہے اس مجموعہ کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے اور اس کی تمام جلدیں اُردو ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر آسکیں، اشاعتی عمل میں بعض غیر متوقع صورتحال کا سامنا ہوتا ہے جس کے باعث قدرے تاخیر واقع ہو جاتی ہے اس پر ہم اپنے قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں کہ انہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس عمل کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور اشاعتی عمل میں شریک تمام احباب کو اجر عظیم سے نوازے۔ اس کتاب کی اشاعت میں بابو غلام علی شبیر مرحوم اور انکی زوجہ مرحومہ نور زینب شبیر کے پسماندگان نے مالی تعاون فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا وآخرت میں اس عمل کا اجر عظیم عطا فرمائے اور مرحومین کو شفاعتِ معصومینؑ ورفاقتِ صالحین سے سرفراز فرمائے۔ مومنین سے ان مرحومین کے ایصال ثواب کے لئے سورۂ فاتحہ کی استدعا ہے۔

سیّد دولت علی زیدی

انچارج، الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان

آیات ۷۷ تا ۸۰

○ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

○ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

○ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

○ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾

ترجمہ

○ ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ تم ابھی اپنے ہاتھ روکے رکھو، اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، پھر جب ان پر قتال واجب کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح خوفزدہ ہو گیا جس طرح خدا کے عذاب سے خوفزدہ ہوتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے: پروردگار! تو نے ہم پر قتال کیوں واجب کیا ہے، کیا ہو جاتا اگر تو ہمیں کچھ دیر مہلت دے دیتا، ان سے کہہ دیجئے کہ دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تم پر ذرہ بھر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔''
(۷۷)

○ ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں موت پکڑ لے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو، اور اگر تمہیں کوئی نیکی و اچھی چیز ملے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تیری اپنی طرف سے ہے، کہہ دیجئے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔''

(۷۸)

○ ''آپ کو جو نیکی و اچھی چیز ملے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تکلیف و مصیبت آئے وہ آپ کی اپنی طرف سے ہے، اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔''

(۷۹)

○ ''جو شخص رسول کی اطاعت کرے تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا۔''

(۸۰)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ، اپنی ماقبل آیات سے متصل و مربوط ہیں اور سب کی سب ایک ہی سیاق کی حامل ہیں۔
ان آیات میں ان لوگوں کے حوالہ سے بات کی گئی ہے جو مؤمنین کا دوسرا گروہ ہے جو ضعیف الایمان ہیں۔
ان آیات میں دنیا کی فنا پذیری اور اخروی نعمتوں کی بقاء و دوام کی یاد دہانی ہوئی ہے اور ان میں حسنات (نیکیوں و اچھائیوں) اور سیئات (برائیوں و تکلیفوں) کی اصل اور قرآنی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

قتال کے حکم سے پہلے اور بعد

○ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ.........اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً''
(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھیں۔۔۔)

اس میں ''كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' مذکور ہے یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو، تو ''کفّ الأیدی'' یعنی ہاتھوں کو روکے رکھنے سے کنایۃً یہ مراد ہے کہ قتال کرنے سے رکے رہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی ہاتھوں سے کی جاتی ہے لہٰذا اسی سے کنایۃً ایسا کہا گیا ہے۔
اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ صدرِ اسلام میں مسلمانوں پر یہ بات گراں گزرتی تھی کہ کفار ان پر زیادتیوں پر زیادتیاں کئے جاتے تھے اور ہر ظلم ان پر روا رکھتے تھے، اس سنگین صورتحال کو دیکھ کر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تھا اور وہ ظلم سہہ کر خاموش رہنے اور تلوار اٹھا کر ان کا مقابلہ نہ کرنے کی بجائے دشمنوں اور ظالموں کو منہ توڑ جواب دینے پر تُل جاتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو روکیں اور کوئی عسکری و دفاعی اقدام نہ کریں بلکہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں تاکہ دین کی بنیادیں مضبوط ہوں اور ان میں استحکام پیدا ہو، پھر اللہ انہیں جہاد کی اجازت دے گا کہ دشمنانِ خدا کے مقابلے میں قیام کریں، اور اگر ایسا نہ ہوتا اور خداوند عالم انہیں رک جانے کا حکم نہ

دیتا تو دین کی صورت ہی کچھ اور ہو جاتی اور اس کی بنیادیں ہی اکھڑ جاتیں اور اس کے حصے بخرے ہو جاتے۔

ان آیات میں ان لوگوں کی مذمت و سرزنش ہوئی ہے کہ جو کفار کے مقابلے میں آ کر ان سے قتال کرنے کی جلدی کے خواہاں تھے اور اس کے لئے ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار تھے جبکہ ان کی تعداد اور طاقت دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے میں کافی نہ تھی لیکن جوں ہی ان پر قتال واجب کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ اس طرح دشمن سے ڈرنے لگا جس طرح خدا سے ڈرتے تھے یا اس سے بھی کہیں زیادہ، جبکہ وہ (دشمن) انہی جیسے انسان تھے۔

قتال کے حکم پر اعتراض

○ ''وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ''

(اور انہوں نے کہا کہ پروردگارا، تو نے ہم پر قتال کیوں واجب کیا ہے؟)

بظاہر یہ جملہ ''اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ'' پر عطف ہے، خاص طور پر یوں کہ اس میں بیان کا اسلوب، فعلِ مضارع (يَخْشَوْنَ النَّاسَ) سے فعل ماضی (قَالُوْا) میں بدلا گیا ہے، لہٰذا اس میں ''قَالُوْا'' (فعلِ ماضی) فاعل یعنی ''کہنے والے'' وہی لوگ ہیں جو قتال کے حکم کے منتظر رہتے تھے اور دشمن کی زیادتیوں پر صبر کرنے کو ناگوار سمجھتے تھے کہ جن سے کہا گیا کہ ابھی اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو (كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ)۔

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ''رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ'' (پروردگارا، تو نے ہم پر قتال کیوں واجب کیا ہے، تو نے کیوں تھوڑی دیر تک اسے مؤخر نہیں کیا؟) ان لوگوں کی زبان حال کی ترجمانی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ الفاظ انہوں نے اپنی زبان ہی سے کہے ہوں، کیونکہ قرآنِ مجید میں اس طرح کے استعمالات عام ہیں اور اس میں ہر طرح کے حوالے معمول کا حصہ ہیں۔

یہاں لفظ ''اَجل'' کو ''قریب'' کے ساتھ متصف کر کے ذکر کیا گیا ہے (یعنی انہوں نے کہا کہ تو نے ہمیں تھوڑی سی مدت تک کی مہلت کیوں نہ دی) تو اس میں ''اجل'' سے مراد موت ہے کہ جس کا آنا یقینی اور بہت نزدیک ہے، تو اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ خدا سے یہ پوچھ رہے تھے کہ اس نے ان پر قتال کیوں واجب کیا ہے وہ تو کچھ مدت کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں، بلکہ ان کا اس طرح کہنا دراصل ایک طرح سے ان کی طرف سے اشارہ تھا کہ اگر وہ قتل نہ کئے جائیں بلکہ اپنی طبعی موت سے دنیا سے جائیں تو یہ زندگی ان کے لئے بہت تھوڑی اور اجل قریب ہی ہوگی، تو کیا ان سے اس تھوڑی سی زندگی پر راضی نہیں اور

انہیں قتل وقتال کا حکم دے کر ان کے لئے موت میں جلدی کر رہا ہے؟ ان کی یہ بات ان کے دلوں میں دنیاوی زندگی سے محبت کی وجہ سے تھی جبکہ قرآنی تعلیمات میں دنیاوی زندگی کو "متاعِ قلیل" سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس سے استفادہ کیا جاتا ہے پھر وہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا جبکہ آخرت کی زندگی ہمیشہ باقی رہنے والی حقیقی حیات ہے اور وہی خیر و بہتر ہے، اسی وجہ سے انہیں ان الفاظ میں جواب دیا گیا: "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ" (کہہ دیجئے کہ دنیا کا ساز وسامان بہت کم ہے اور آخرت اس کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے)۔

دنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی کا تقابل

○ "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ"
(کہہ دیجئے کہ دنیا کا ساز وسامان بہت کم ہے اور آخرت کی زندگی پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے)۔

اس جملے میں خداوند عالم نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کمزور دل لوگوں کو جواب دیں کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور وہ اس نہایت بے مایہ وکمترین دنیاوی زندگی کی عیش و عشرت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے اور خدا کی خاطر جان قربان کرنے پر مقدم کرنے وترجیح دینے میں غلطی پر ہیں۔ خلاصہ یہ کہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ایمان میں تقویٰ کی عظیم صفت اپنائیں اور یہ یاد رکھیں کہ دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابلے میں نہایت قلیل وکمتر متاع کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ آخرت تقویٰ والوں کے لئے خیر اور بہتر زندگی ہے لہٰذا وہ دنیا کی قلیل وکمتر متاع کے مقابلے میں آخرت کی بہتر زندگی کو اپنائیں کیونکہ وہ مؤمن ہیں اور تقویٰ کے راستہ پر گامزن ہیں اور وہ اپنے دلوں میں کبھی ایسا خیال نہ لائیں کہ خدا ان پر ظلم وزیادتی کرے گا کہ جس کے سبب وہ اس متاع قلیل کو جو ان کے پاس موجود ہے اس خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی پر ترجیح دیں۔ انہیں ایسا سوچنا بھی زیب نہیں دیتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ بھر ظلم نہیں کرتا (وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا)۔

بنا برایں اس بیان سے بخوبی واضح ہو گیا کہ جملہ "لِّمَنِ اتَّقَىٰ" صفت کو موصوف کی جگہ رکھنے کے باب سے ہے (جہاں موصوف کا ذکر ہونا تھا وہاں صفت کا ذکر ہوا) تاکہ حکم کا سبب واضح ہو سکے اور یہ کہنا درست ہو کہ حکم کا مورد اس سبب کا ایک مصداق ہے یعنی اس پر حکم منطبق ہوتا ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ سے فہم المعنی کے لئے اس طرح فرض کرنا پڑے گا۔ واللہ اعلم۔ کہ گویا عبارت یوں ہے: "والآخرة خير لكم لانكم ينبغي ان تكونوا لايمانكم اهل تقوى، والتقوىٰ سبب للفوز بخير الآخرة" (اور آخرت تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے

ایمان کی وجہ سے تقویٰ والے ہو، اور تقویٰ ہی اخروی بھلائی سے بہرہ ور ہونے کا سبب ہے)۔ لہٰذا جملہ ''لمن اتقٰی'' خاص معنی و مقصود کے بیان سے کنایہ کے طور پر ہے۔

موت سے چھٹکارا ممکن نہیں

○ ''اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ''
(تم جہاں کہیں بھی ہو تمہیں موت پالے گی خواہ تم مضبوط مورچوں میں کیوں نہ ہو)

لفظ ''بروج'' جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد ''برج'' ہے جس کا معنٰی قلعوں پر بنائی جانے والی مخصوص جگہیں ہیں (مورچے) اور انہیں اس قدر مضبوط بنایا جاتا ہے کہ اس سے دشمن کے مقابلے میں دفاع ممکن ہو، برج کا اصل معنٰی ظہور ہے، اسی سے زیب وزیبائش کے ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کرنا اور اس جیسے معانی مقصود ہوئے ہیں۔

''مشیدۃ'' کا مصدر ''تشیید'' ہے جس کا معنٰی بلند کرنا ہے، اس کی اصل ''شید'' ہے جس کا معنٰی چونہ، گچ ہے کیونکہ وہ مکان کو مضبوط بناتا ہے اور اسے بلند کرنے میں مدد دیتا ہے کہ جس سے اس کی زیب و زینت ہو جاتی ہے، لہٰذا ''بروج مشیدہ'' سے مراد وہ بلند مقامات ہیں جو قلعوں پر تعمیر کئے جاتے ہیں جن کے سہارے انسان ہر آنے والے دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہاں تمثیلی طور پر بعض ان چیزوں کے حوالہ سے بات ہوئی ہے جن کے ذریعے اپنے آپ کو تکلیفوں سے بچایا جا سکتا ہے اور اسی کو ہر تکلیف و ناگوار چیز سے بچاؤ کا مضبوط مقام و ذریعہ قرار دیا گیا ہے، آیت کا مفہوم اور خلاصہ معنٰی یہ ہے کہ موت ایسی چیز ہے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں خواہ تم اس سے بچنے کے لئے کسی مضبوط ترین جگہ میں پناہ کیوں نہ لے لو، لہٰذا تم ہرگز یہ نہ سوچو کہ اگر تم میدان جنگ میں نہ جاؤ اور تم پر جہاد واجب قرار نہ دیا جاتا تو تم موت سے بچ سکتے تھے اور اس سے تمہیں چھٹکارا مل سکتا ہے، ایسا ہرگز نہیں کیونکہ جو وقت اللہ تعالٰی نے مقرر کر دیا ہے وہ آ کر ہی رہے گا۔

اچھائیوں اور برائیوں کی نسبتیں

○ ''وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ..........''
(اور اگر تمہیں کوئی نیکی و فائدہ حاصل ہو تو وہ کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے.......)

ان دو جملوں میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی غلط باتوں کا حوالہ دے کر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ انہیں ان کا جواب دیں اور حقیقت حال واضح کریں کہ انسان کو جو نیکی یا برائی و تکلیف پہنچتی ہے اس کی وجہ وسبب کیا ہے؟

بیان کا سیاق اس بات کا متقاضی ہے کہ ان جملوں کے کہنے والے وہی کمزور دل مؤمنین ہوں جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ وہ اپنی زبانِ حال یا گفتار میں اس طرح کے اظہارات کرتے ہیں، اور ان کا ایسا کہنا نئی بات نہیں اس سے پہلے حضرت موسیٰ کا سامنا بھی اسی طرح کی باتوں سے ہوا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے حوالہ سے یوں ارشاد فرمایا:

''فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ أَلَآ إِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ''(سورۂ الاعراف: آیت ۱۳۱)

(جب انہیں کوئی فائدہ واچھائی حاصل ہوتی تو کہتے ہیں یہ ہمارے لئے ہے اور اگر کسی تکلیف و ناگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا (کوئی مصیبت آپڑتی) تو وہ اسے موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی بری قسمت قرار دیتے تھے، یاد رکھو کہ ان کی بری قسمت تو اللہ کے پاس معلوم ہے لیکن ان کے اکثر لوگ آگاہی نہیں رکھتے)۔

اس طرح کی باتیں دیگر امتوں کی طرف سے بھی منقول ہیں کہ وہ اپنے انبیاء سے کرتے تھے اور یہ امت بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح کا سلوک کرنے میں دیگر امتوں سے پیچھے نہیں رہی، ان کے بارے میں خداوند عالم نے فرمایا ہے: ''تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ '' (ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں) ___ سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۸ ___، اور وہ اس کے باوجود قوم بنی اسرائیل سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں، چنانچہ ان کے بارے میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''انهم لا يدخلون جحر ضب الّا دخلتموه'' (وہ جس بل میں گھسے تم بھی اس میں ضرور گھسو گے)۔

اس حوالہ سے فریقین (شیعہ وسنی) کی اسناد سے مربوطہ روایات ذکر ہو چکی ہیں۔

ان آیات کے بارے میں اکثر مفسرین نے بھرپور کوشش کی کہ ثابت کریں کہ یہ یہودیوں یا منافقین یا دونوں کے بارے میں نازل ہوئیں، جبکہ آپ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ سیاقِ کلام اس کی نفی کرتا ہے۔

بہرحال زیر نظر آیت مبارکہ اپنے سیاق کے ساتھ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ اس میں ''حسنة'' اور ''سيّئة'' سے مراد ان کے وہی معانی ہیں جن کا اسناد اور نسبت دینا اللہ تعالیٰ کی طرف درست قرار پاتا ہو جبکہ ان لوگوں نے ''حسنہ'' کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور ''سیّئہ'' کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، تو یہ ''حسنات'' اور ''سیّئات'' دراصل وہی واقعات وحوادث ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کے بعد ان پر آئے یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ دین کو عام کیا اور پرچم توحید کو بلند کیا اور لوگوں کو دشمنانِ خدا کے مقابلے میں جہاد کرنے کی ترغیب دلائی تو جب وہ میدان کو نکلے تو کہیں فتح وکامیابی اور مال غنیمت حاصل ہوا اور کہیں قتل ہونے، زخمی ہونے اور دیگر کہیں مصائب کا سامنا کرنا پڑا، تو انہوں نے اچھائیوں یعنی فتح وکامیابی اور مال غنیمت ملنے کو تو اللہ کی طرف منسوب کر دیا اور تکلیفوں ومصائب (سیئات)

کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا کہ یہ انہی کی بدشگونی، کمزور مؤقف اور غلط تدبیر کا نتیجہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ انہیں اس کا جواب دیں اور کہیں سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے (قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ) کہ یہ سب حوادث وواقعات ایسے ہیں جو کائنات کا نظام چلانے والے کے ہاتھ میں ہیں وہ جو چاہتا ہے تدبیر کرتا ہے اور وہ خدائے واحد ویکتا ہے کہ جس کا کوئی شریک نہیں اور ہر چیز اپنے وجود وبقاء اور ان تمام حوادث میں جن سے اس کا سامنا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ وتابع ہے کسی دوسرے سے وابستہ وتابع نہیں، چنانچہ قرآنی تعلیمات وبیانات سے اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

ان تمام مطالب کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تعجب وحیرت کے انداز میں فرمایا: ''فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا'' (ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں) یعنی ان کی فکریں جمود کا شکار ہیں اور ان کی قوت فہم و ادراک کام ہی نہیں کرتی کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کر سکیں۔

حسنات وسیئات کی اصل بنیادیں

○ ''مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ''

(جو حسنہ تجھے حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو سیئہ تم پر آئے وہ تیری اپنی طرف سے ہے)

اللہ تعالیٰ نے جب لوگوں کے بارے میں یہ بیان کر دیا کہ وہ کوئی بات سمجھنے سے قاصر ہیں تو اس کے بعد حقیقت الامر کو بیان کرنے کی غرض سے خطاب کا رخ لوگوں سے پھیر کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابت حسنہ وسیئہ کے حوالہ سے اصل حقیقت واضح کی کہ جس میں اس مطلب کا ذکر اس بناء پر فرمایا کہ اللہ نے جو احکام تمام موجودات کے لئے قرار دیئے ہیں وہ سب افراد پر لاگو ہوتے ہیں اور موجودات میں بنی نوع انسان بھی ہیں لہٰذا وہ بھی ان احکام کے حوالہ سے برابر ہیں خواہ کوئی مؤمن ہو یا کافر ہو، نیک عمل کرنے والا ہو یا برا عمل کرنے والا ہو، نبی ہو یا کوئی دوسرا شخص ہو۔

''حسنات'' سے مراد وہ امور ہیں جن کو انسان طبعی طور پر اچھا سمجھتا ہے مثلاً صحت وسلامتی، نعمت، امن ورفاہ، تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ''سیئات'' سے مراد وہ امور ہیں جن کو انسان ناپسند کرتا ہے مثلاً بیماری، ذلت وخواری، فتنہ و فساد وغیرہ، تو یہ سب انسان ہی کی کارستانیاں ہیں ان میں خدا کا کوئی دخل نہیں، اس بناء پر زیر نظر آیت مبارکہ درج ذیل آیت شریفہ سے قریب المعنیٰ ہے:

○ ''سورۂ انفال، آیت: ۵۳

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۳﴾''

(یہ اس لئے ہے کہ اللہ کسی اس نعمت کو تبدیل نہیں کرتا جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں، اور اللہ بخوبی سننے والا، نہایت آگاہ ہے)

لیکن اس کے باوجود ایک کلّی حوالہ سے کہ جس کا تفصیلی بیان عنقریب آئے گا تمام حسنات وسیّئات کا خداوند عالم کی طرف منسوب ہونا مذکورہ بالا مطلب سے منافات نہیں رکھتا۔ اس کی وضاحت جلد پیش ہوگی۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منصبی حیثیت

○ ''وَاَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا''

(اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے پیغام بر بنا کر بھیجا ہے)

اس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منصبی حیثیت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ آپ کی ذمہ داری اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ رسول و پیامبر ہیں اور آپ کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ آپ پر اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، یعنی لوگوں کے اچھا یا برا کرنے میں آپ کا کوئی دخل نہیں کہ اگر وہ برا کریں تو گویا آپ نے انہیں اس راہ پر لایا ہے اور انہیں حسنات سے دور کیا ہے، ایسا نہیں ____ بلکہ آپ نے اپنا فریضہ ادا کیا اور اپنی منصبی ذمہ داری پوری کی، اس پر عمل کر کے حسنات ونیکیاں کرنا یا سیئات و برائیوں کا ارتکاب لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔

اس جملے میں ان لوگوں کے بیان (الزام) کی تردید ہوئی ہے جو سیئات و برائیوں کے رسیا ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہے: (هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ) تاکہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مورد ملامت قرار دیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مطلب کی تائید میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا'' (اور اللہ ہی گواہی کے لئے کافی ہے)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہے

○ ''مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ''

(جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

اس جملے میں نئے حوالہ سے سابقہ آیت ''وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا'' (اور ہم نے آپ کو پیامبر بنا کر بھیجا ہے) کی تاکید مزید ہوئی ہے اور آنحضرت ﷺ کی منصبی حیثیت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، گویا اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کی اصل بنیاد سے آگاہی دلائی ہے کہ اے رسول، آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ ہمارا پیغام پہنچائیں لہٰذا جس نے آپ کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس سے منہ موڑا تو آپ کو ہم نے ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا (آپ پر اس کے کئے کی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ'' (جو شخص رسول کی اطاعت کرے) صفت کو موصوف کی جگہ قرار دینے کے طور پر ہے تاکہ حکم کی اصل بنیاد سے آگاہی دلائی جا سکے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے: ''وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۗ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا'' (اور آخرت اس کے لئے ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔

لہٰذا سیاقِ کلام اپنی درست صورت میں باقی ہے اور اس میں مخاطب کے انداز ''وَ اَرْسَلْنٰكَ'' کے بعد ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ'' کہا گیا اور پھر دوبارہ خطاب کے انداز میں ''فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ'' فرمایا، تو اس کے باوجود کلام کا سیاق اپنی اصل صورت میں باقی رہا جو کہ کلامِ خداوندی کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف حسنات وسیئات کی نسبت

ایسا لگتا ہے کہ انسان جب پہلی مرتبہ ''حسن'' وخوبصورتی کے معنی کی طرف متوجہ ہوا تو اپنے ہی ہمنوع افراد میں جمال کے مشاہدہ سے ہوا اور ''جمال'' سے مراد کسی کا اپنے وجود میں تخلیقی طور پر اعتدال کا حامل ہونا ہے یعنی اس کی جسمانی ساخت، اعضاء وجوارح کی مناسب ترکیب بالخصوص چہرہ میں دلکشی ہو، اس کے بعد وہ دیگر مادی موجودات ومحسوسات کے دائرہ میں آنے والے امور میں اس طرح کی خوبصورتی سے آگاہ ہوا، اس بناء پر خوبصورتی کی برگشت اس معنی کی طرف ہوئی کہ جو چیز اپنے اس وجودی مقصد سے مطابقت رکھتی ہو جو اس کی نوع میں طبعی طور پر ملحوظ ومعین ہو، مثلاً کسی انسان کے چہرہ کی خوبصورتی اس پر موقوف ہے کہ چہرے کے تمام اعضاء یعنی آنکھیں، پلکیں، کان، ناک، ہونٹ وغیرہ اس طرح اپنی اپنی جگہ پر سجے ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کو اسی جگہ پر ہونا چاہیے تھا۔ گویا ان کی ترکیب ہی ایسی ہو کہ سب اپنی اپنی جگہ پر سجے ہوں، اسی طرح وہ ایک دوسرے کے حوالہ سے بھی ایسی ترکیب کے حامل ہوں، تو اس وقت انسان کا دل اس طرف کھینچ جاتا ہے اور انسان اس کے دیدار سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے، اسے ''خوبصورت'' کہا جاتا ہے لیکن اگر کوئی چیز اس طرح کے اوصاف کی حامل نہ ہو اور اس کے اعضاء میں ایسی ترکیب نہ پائی جائے کہ جس سے انسان کا دل اس کا گرویدہ ہو سکے اور انسانی طبیعت اس کی طرف رغبت کرے تو اسے ''بدصورت'' کہا جاتا ہے، البتہ اس میں بھی معیاروں کا مختلف ہونا مؤثر واقع

ہوتا ہے، بنا برایں ''بدصورتی'' ـــــ یا بدی و برائی ـــــ عدمی معنی کی حامل ہوتی ہے جبکہ ''خوبصورتی'' میں وجودی معنی پایا جاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس وقت خوبصورت کہا جاتا ہے جب اس میں وہ اوصاف موجود ہوں جو اس میں ہونے چاہییں اور بدصورت اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس میں وہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں جو اس میں ہونے چاہییں۔

اس کے بعد انسان نے ''خوبصورتی و بدصورتی'' کے اس معنی و معیار کو افعال و اعمال اور معاشرہ میں عام رائج امور و عناوین کی بابت دیکھا کہ کون سی چیز معاشرہ کی تشکیل کی اصل غرض و مقصد سے موزونیت و ہمرنگی کی حامل ہے اسے انسانی زندگی کی سعادت یا زندگی سے بہرہ ور اور لطف اندوز ہونا قرار دیا، اور کون سی چیز معاشرہ کی تشکیل کے اصل ہدف سے موزونیت نہیں رکھتی؟ اس بناء پر امور و اعمال کی خوبصورتی و بدصورتی ـــــ اچھے و برے ـــــ ہونے کا تعین ہوا، مثلاً عدل، احسان کے حقدار پر احسان کرنا، تعلیم و تربیت، نصیحت و خیرخواہی اور اس طرح کے امور خوبصورت و نیکیاں کہلائے اور ظلم و زیادتی جیسے امور و اعمال بدصورت و برائیاں کہلائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے امور و اعمال یعنی عدل و احسان وغیرہ انسان کی سعادت یا معاشرتی زندگی کی معنوی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے تخلیقی مقصد سے ہمرنگ ہیں لہٰذا وہ حسنات و اچھائیاں و نیکیاں ہیں جبکہ دوسری قسم کے امور و افعال یعنی ظلم و زیادتی وغیرہ اس کے برعکس ہیں لہٰذا وہ سیئآت و برائیاں ہیں، تو اسی معیار کے مطابق خوبصورتی و بدصورتی اس فعل سے وابستہ ہوگی جو مذکورہ دو صفتوں میں سے کسی ایک سے متصف ہو کہ جس کی بناء پر اس کا معاشرہ کی اصل غرض سے ہمرنگ ہونا ملحوظ ہوگا، چنانچہ بعض کام ایسے ہیں جن کا حسن و خوبصورتی دائمی ہے کیونکہ وہ معاشرہ کی تشکیل کی اصل غرض سے ہم آہنگ ہیں جیسے عدل و انصاف، اور بعض امور و اعمال ایسے ہیں جن کی بدصورتی و برا ہونا دائمی ہے کہ وہ معاشرہ کی تشکیل کے ہدف سے ہمرنگ نہیں ہو سکتے جیسے ظلم و زیادتی۔

البتہ بعض افعال و اعمال ایسے ہیں جن کا خوبصورت یا بدصورت یعنی اچھا یا بُرا ہونا دائمی نہیں بلکہ حالات و اوقات اور مقامات و معاشروں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے جیسے ہنسی مذاق کہ دوستوں و ہم سن افراد کے ساتھ اچھا جبکہ بزرگوں کے ساتھ برا ہے، اور خوشی و مسرت کی محفلوں میں اچھا جبکہ غم و حزن اور عزا کی مجالس میں قبیح و برا ہے اسی طرح مساجد و عبادت گاہوں میں ہنسی مذاق کرنا قبیح ہے، اسی کے مانند زنا و بدکاری اور شراب خوری اہل مغرب کے ہاں اچھی جبکہ مسلمانوں کے ہاں بری ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حسن و قبح کے بارے میں ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان میں دوام و ثبات نہیں پایا جاتا ہے اور نہ ہی کلیت پائی جاتی ہے بلکہ وہ مطلقاً تغیر پذیر ہیں یعنی ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے، اس نظریہ کے قائل

نے اس کی صحت پر یہ مثال دے کر استدلال پیش کیا ہے کہ جس طرح عدل اور ظلم، جو کہ حُسن اور قبح کے واضح ترین مصداق ہیں وہ دائمی اور ہمیشگی کی صفت سے متصف نہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل حُسن و قبح کو دوام و ہمیشگی حاصل نہیں، کیونکہ اس کا مشاہداتی ثبوت یہ ہے کہ بعض امور بعض معاشروں میں عدل کہلاتے ہیں جبکہ بعض دیگر معاشروں و اقوام میں عدل نہیں کہلاتے یعنی بعض معاشرتی قوانین ایسے ہیں جنہیں بعض اقوام تو عدل سے موسوم کرتی ہیں جبکہ دوسری قومیں ان قوانین کو ظلم قرار دیتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''عدل'' کا معنیٰ کسی معین شے سے مختص نہیں، اس کی مثال کوڑوں کی سزا کہ جسے اسلام نے زنا کرنے والے کے لئے مقرر کیا ہے اور اسے عدل و عادلانہ حکم قرار دیا ہے لیکن اہل مغرب کے نزدیک اسے ظلم کہا جاتا ہے، اسی طرح کئی دیگر احکام و دستورات ایسے ہیں جن کے بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض ادیان واقوام انہیں عدل کہتے ہیں اور دوسرے اسے ظلم کہتے ہیں۔

اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا سوچنا اصل مطلب، معنی و مفہوم اور مصداق کے درمیان خلط ملط کا شکار ہونے کا نتیجہ ہے، تو جو شخص مفہوم و مصداق کے درمیان ہی فرق کو نہ سمجھتا ہو اس کے ساتھ بحث کرنے کا فائدہ ہی کچھ نہیں اور ہم اس طرح کی سوچ رکھنے والے شخص سے بات ہی نہیں کرنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان معاشرتی عوامل کی تغیر پذیری کے جاری سلسلہ کی بناء پر تمام معاشرتی احکام و امور میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے خواہ وہ تبدیلی دفعتاً آئے یا تدریجاً آئے، لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر ہرگز خوش نہیں ہوتا کہ وہ عدل کی صفت سے محروم ہو اور اسے ظالم کہا جائے اور نہ ہی اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ کسی ظالم سے ظلم کا مشاہدہ کرے کہ جس کی تاویل نہ کر سکے۔ بہرحال اس موضوع کی تفصیلات بہت زیادہ ہیں کہ اگر ہم ان کی بابت گفتگو کرنے لگیں تو شاید اپنے اصل موضوع و مقصود کہ جو اس سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے سے دور ہو جائیں اور اس کے بارے میں بحث نہ کر سکیں۔

بہرحال حسن و قبح کے مفہوم و معنی کی بابت انسان اس قدر وسعت کا قائل ہوا کہ اسے تمام معاشرتی امور اور زندگی کے تمام مراحل تک لے گیا اور ان کے معانی و مفاہیم کو مختلف عوامل کی اثر گزاری سے وابستہ کر کے اس نتیجہ تک پہنچا کہ جو امور اس کی زندگی کی آرزوؤں سے ہم آہنگ اور اس کی ذاتی یا معاشرتی زندگی میں سعادت بخش ہوں مثلاً صحت و سلامتی اور راحت و آرام، تو وہ ''حسنات'' ہیں اور جو اس کے منافی ہیں مثلاً تکلیفیں و پریشانیاں، فقر و ناداری یا بیماری و اسارت وغیرہ تو وہ ''سیئآت'' ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات واضح ہوئی کہ ''حسنہ'' اور ''سیئہ'' دو ایسی صفتیں ہیں کہ جن سے امور یا افعال اس حوالہ سے متصف ہوتے ہیں کہ اس سے نوعی کمال یا فردی سعادت وابستہ ہوتی ہے لہٰذا اس حوالہ سے حسن و قبح کو دو اضافی صفتیں کہا جائے گا، اگرچہ بعض موارد میں ان کی اضافت دائمی و لازمی ہوتی ہے کہ ان سے جدا نہیں ہوتی اور بعض موارد میں متغیر ہوتی

رہتی ہے مثلاً مال کا خرچ کرنا، اس شخص کی نسبت حسن و اچھا کہلاتا ہے جو اس کا حقدار ہو اور قبیح و برا ہے اس شخص کی نسبت جو حقدار نہ ہو، اور یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ ''حسن'' و اچھائی ہمیشہ وجودی و ثبوتی حقیقت ہے جبکہ ''قبح'' و برائی عدمی معنی رکھتی ہے کہ جو اس صفت یا حالت کا کسی موجود میں نہ پایا جانا اور اس کی طبع وفطرت وجودی سے ہم آہنگ نہ ہونا ہے۔ ورنہ اصل موجود یا فعل وعمل مذکورہ ہم آہنگی وہمرنگی اور عدم مطابقت کے حوالہ سے یکساں ہوتا ہے اس میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ یعنی وہ چیز یا عمل اپنی اصل حقیقت میں نہ ''اچھا'' ہے اور نہ ''برا'' بلکہ ایک ''چیز'' یا ''عمل'' ہے کہ جسے اس کی اصل وجودی حیثیت میں اچھا او برا نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً زلزلہ وتباہ کن سیلاب جب کسی علاقہ میں آئیں تو وہاں کے باسیوں کے لئے نہایت برے اور قبیح کہلاتے ہیں جبکہ ان کے دشمنوں کے لئے اچھے اور نعمتیں کہلاتے ہیں اور دینی نقطۂ نظر سے بھی یہی حال ہے کہ جو بلاء ومصیبت دشمنانِ دین، فساد پھیلانے والوں، بدکاری کے مرتکبوں اور سرکشوں پر نازل ہو اسے اچھا قرار دیا جاتا ہے جبکہ وہی بلا ومصیبت اگر نیک وصالح مؤمن بندوں پر آئے تو ان کے لئے بری کہا جاتا ہے، اسی طرح کھانا کھانا اچھا اور مباح کہلاتا ہے مثلاً جب کھانے والے کے اپنے مال سے ہو، اور اسے ہی برا اور حرام کہا جاتا ہے جب کسی دوسرے کے مال سے اس کی اجازت ورضامندی کے بغیر کھایا جائے کیونکہ اس میں اس حکم کی پیروی کا فقدان ہوتا ہے جس میں کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، یا اس حکم کی فرماں برداری نہیں ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وحلال کردہ مال میں قناعت ومیانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس بناء پر اسے ''قبیح'' کہا جاتا ہے۔ یہی صورتحال مرد اور عورت کے باہمی ملاپ میں ہوتی ہے کہ وہ اچھا ومباح عمل ہوتا ہے جب مثلاً شوہر اور بیوی کے درمیان ہو، اور اسے برا وحرام کہا جاتا ہے جب بدکاری کی بنیاد پر ہو کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف ورزی کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی اس میں خدائی حکم کی موافقت کا فقدان ہوتا ہے، بنا بر ایں ''حسنات'' امور وافعال میں ''وجودی'' عنوان جبکہ ایک حوالہ سے ''حسن'' (اچھا) اور دوسرے حوالہ سے ''قبیح'' (برا) کہا جاتا ہے وہ ایک جیسا ہے، یعنی اصل چیز یا عمل ایک ہی حیثیت کا حامل ہے البتہ اس کا اچھا یا برا ہونا دوسرے عنوان کی بناء پر ہوتا ہے۔

قرآنی آیات مبارکہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ خداوند عالم کے علاوہ جس جس پر لفظ ''شئ'' (چیز) استعمال ہوتا ہے وہ مخلوق اور خدا کی پیدا کردہ ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

○ سورۂ زمر، آیت: ۶۲

''اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ''

(اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے)

○ سورۂ فرقان، آیت: ۲

''وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝''

(اور اس نے ہر چیز کو خلق کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی پوری تقدیر)

ان دو آیتوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے مخلوق ہے، اس کے بعد ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ سجدہ، آیت: ۷

''الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ''

(وہ ہے کہ جس نے ہر شے کی تخلیق اچھی قرار دی)

اس آیت میں تخلیق کے اچھا قرار دینے کا ثبوت پایا جاتا ہے، یہاں اچھا قرار دینے سے مراد وہ اچھائی وخوبصورتی ہے جو خلقت کا لازمی امر ہے کہ اس سے ہرگز جدا نہیں ہوسکتا بلکہ اسی پر اس کا دارومدار ہے یعنی حسن و جمال اور اچھا و خوبصورت ہونا خلقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

بنابرایں ہر شے کو خوبصورتی و اچھائی اور حسن و جمال سے اسی قدر حصہ حاصل ہے جس قدر وہ خلقت و وجود سے حصہ پائے، اگر آپ ''حُسن'' وخوبصورتی اور اچھائی کے اس معنٰی پر بخوبی توجہ کریں جو پہلے بیان ہو چکا ہے تو اس سلسلہ میں مزید مربوطہ مطالب واضح ہو جائیں گے کیونکہ ''حُسن'' سے مراد کسی چیز کا اپنی خلقت و وجود کی اصل غرض وغایت سے پورے طور پر ہمرنگ وموزونیت کا حامل ہونا ہے، اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کائنات کے وجودی نظام کے تمام اجزاء میں نہایت ہمرنگی و مطابقت اور درست ترتیب و پیوستگی پائی جاتی ہے اور ربّ العالمین کی ذات اس سے بالاتر ومنزہ ہے کہ وہ کوئی چیز خلق کرے کہ جس کے اجزاء باہم ہمرنگی ومطابقت نہ رکھتے ہوں اور ایک دوسرے سے اس طرح متصادم ہوں کہ ان کے درمیان عدم مطابقت کی وجہ سے اس کی تخلیق کی اصل غرض ومطلوب ہی ختم ہو جائے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم ہستی کی تخلیق میں جس مقصد کا ارادہ کیا ہے وہ پورا نہ ہو جبکہ عالم ہستی میں پایا جانے والا نظام ایسا ہے جس سے عقلیں دنگ اور فکریں حیرت زدہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار گوناگوں آیاتِ مبارکہ میں فرمایا:

○ سورۂ زمر، آیت: ۴

''هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ''

(وہ اللہ، یکتا ہے، زبردست ہے)

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۸

''وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ''

(اور وہ اپنے بندوں پر تسلط وغلبہ رکھنے والا ہے)

○ سورۂ فاطر، آیت: ۴۴

''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾''

(اور اللہ ایسا نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز اسے عاجز و ناتواں کردے، بے شک وہ نہایت دانا، نہایت قدرتمند ہے)

اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے، کوئی چیز اسے مغلوب نہیں کرسکتی اور نہ ہی کوئی چیز اسے اس سے عاجز کرسکتی ہے جس کی تخلیق کا اس نے ارادہ کیا ہو اور جو کچھ وہ اپنے بندوں کے بارے میں چاہتا ہو۔

بنابر ایں عالم ہستی کی ہر نعمت ''حسنہ'' اور اچھی ہے کیونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور اسی نے اسے وجود عطا فرمایا ہے، اسی طرح ہر بلاء ''سیئہ'' اور برائی ہے خواہ وہ عالم ہستی کی موجودات میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی تخلیق اور وجود عطا کئے جانے کی نسبت سے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیوں نہ ہو لیکن دوسری نسبت کے حوالہ سے وہ ''سیئہ'' اور برائی ہے، اسی مطلب کا بیان درج ذیل آیتوں میں ہوا ہے:

○ سورۂ نساء، آیت: ۷۸

''وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾''

(اور اگر انہیں کوئی حسنہ حاصل ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انہیں کوئی سیئہ پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے، کہہ دیجئے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں)۔

○ سورۂ اعراف، آیت: ۱۳۱

''فَاِذَا جَاۗءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾''

(پس جب انہیں کوئی حسنہ و اچھائی حاصل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ ہمارے لئے ہے اور اگر ان پر کوئی سیئہ نازل ہوتی ہے تو وہ اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے نام بُری فال قرار دیتے ہیں، یاد رکھو کہ ان کی قسمت اللہ کے پاس ہے لیکن ان کے اکثر لوگ آگاہ ہی نہیں رکھتے)

ان آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیتوں میں اس موضوع کی بابت وضاحت کی گئی ہے۔

اب جہاں تک ''سیئہ'' کا تعلق ہے تو قرآنِ مجید اس کی نسبت انسان کی بابت خود انسان کی طرف دیتا ہے، ملاحظہ ہو:

○ سورۂ نساء، آیت: ۷۹

''مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ''

(اور جو حسنہ و نیکی آپ کو حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو سیئہ و مصیبت آپ پر آئے وہ آپ کی اپنی طرف سے ہے)

○ سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۰

''وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ ''

(اور تم پر جو مصیبت نازل ہو وہ خود تمہارے ہی کئے کا نتیجہ ہوتی ہے اور اللہ تمہارے بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے)

○ سورۂ رعد، آیت: ۱۱

''اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ''

(اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں)

○ سورۂ انفال، آیت: ۵۳

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ''

(خدا ایسا نہیں کہ کسی قوم کو جو اس نے نعمت عطا کی ہو اسے بدل دے جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں)

اس موضوع کی بابت دیگر آیات میں بھی مربوطہ مطالب ذکر کئے گئے ہیں۔

مزید وضاحت: سابقہ آیات، جیسا کہ قارئین کرام آگاہ ہو چکے ہیں، ان بلاؤں و مصیبتوں کو حسنات کی طرح اصل تخلیق میں یکساں قرار دیتی ہیں یعنی وہ اپنی اصل خلقت میں حسن کی حامل ہیں کہ ان کی اصل تخلیق میں کوئی برائی و بدصورتی نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ان کے ''برائی'' ہونے میں سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان بعض دوسری اشیاء سے طبعی طور پر ہمرنگ نہیں جو ان سے ضرر و نقصان کا شکار ہوتی ہیں، بنابرایں اس کی برگشت بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے کہ اس نے ان اشیاء کو ان کے طبعی تقاضوں و چاہتوں کی مطلوبہ نعمتیں عطا نہیں کیں۔ چنانچہ عطا و بخشش کا روک دینا ان اشیاء کے لئے مصیبت و ''سیئہ'' قرار پاتا ہے کہ جس کی وضاحت اس آیۂ مبارکہ میں ہوئی ہے:

○ سورۂ فاطر، آیت: ۲

''مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ''

(جس چیز کو خدا لوگوں کے لئے رحمت سے کھول دے (عطا کرے) اسے کوئی بھی روک نہیں سکتا، اور جسے روک

لے اسے اس کے بعد کوئی دے نہیں سکتا اور وہ غالب و دانا ہے)۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عطا و عنایت کا روک دینا یا کسی کو اپنی رحمت میں سے زیادہ اور کسی کو کم عطا کرنا درحقیقت اس چیز و شخص کی ظرفیت اور اہلیت کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ اس مطلب کو اس مثال کے ذریعے بیان فرمایا:

O سورۂ رعد، آیت: ۱۷

''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا''

(اس نے آسمان سے پانی نازل کیا تو ہر زمین نے اپنے اندازہ کے مطابق اس سے استفادہ کیا)

O سورۂ حجر، آیت: ۲۱

''وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ؗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾''

(اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں، اور ہم معین اندازہ سے زیادہ نازل نہیں کرتے)۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے استحقاق و اہلیت کے مطابق عطا کرتا ہے کہ جسے وہ خود بہتر جانتا ہے، جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا:

O سورۂ ملک، آیت: ۱۴

''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ''

(وہ بخوبی آگاہ ہے اس سے کہ جو اس نے خلق کیا، اور وہ نہایت مہربان، بخوبی آگاہی رکھنے والا ہے)

یہ ایک واضح و معلوم حقیقت ہے کہ نعمت، نقمت و بلاء، اور آسودگی کا تعلق ہر چیز سے اس کی اپنی نسبت و مناسبت سے ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

O سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۸ -

''وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا''

(اور ہر چیز کی اپنی سمت معین ہے وہ اسی کی طرف رخ کئے ہوئے ہے)

لہٰذا ہر چیز اپنی اسی سمت کی طرف رواں دواں ہے جو اس سے مخصوص ہے اور اس سے مناسبت و موزونیت رکھتی ہے اور اسی غرض و مقصد کو حاصل کرنے کی راہ پر گامزن ہے جو اس کی طبع و وجودی سے ہمرنگ ہے۔

یہاں سے ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں یعنی ''سراء'' (خوشی) ''ضراء'' (تکلیف و مصیبت)، ''نعمت''، ''نقمت'' اور بلاء کہ جو اس انسان پر آتی ہیں جو قرآن مجید کی نگاہ میں اختیاری زندگی گزار رہا ہے تو وہ سب اس کے اپنے اختیار سے وابستہ امور ہیں کیونکہ وہ ایسے راستہ پر چل رہا ہے کہ اگر اس پر صحیح طور پر چلتا رہے تو اسے سعادت حاصل ہوگی

اور اگر صحیح طور پر نہ چلے تو شقاوت و بدبختی اس کا مقدر بن جائے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام امور میں اس کا اپنا اختیار دخیل ہے، یعنی وہ سب کچھ اپنے اختیار و مرضی سے کرتا ہے۔

قرآن مجید بھی اسی بات کی تصدیق کرتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

○ سورۂ انفال، آیت: ۵۳

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ''

(یہ اس لئے ہے کہ اللہ کسی اس نعمت کو تبدیل نہیں کرتا جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی پاکیزہ نیتیں اور اعمالِ صالحہ ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے میں دخیل ہیں تو اگر وہ اپنی نیتوں اور اعمال میں پاکیزگی و نیکی برقرار نہ رکھیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت روک لیتا ہے۔

اللہ نے اس حوالہ سے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے۔

○ سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۰

''وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ''

(اور تم پر جو مصیبت نازل ہو وہ تمہارے ہی کئے کا نتیجہ ہے اور اللہ بہت سی غلطیوں سے درگزر کرتا ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تکلیفوں و مصیبتوں اور ناگوار حالات کے وجود پذیر ہونے میں لوگوں کے اعمال دخیل ہیں اور اللہ تو ان کی بہت سی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

○ سورۂ نساء، آیت: ۷۹

''مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ''

(جو ''حسنہ'' اچھائی تجھے حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو ''سیئہ'' و برائی تجھ پر آئے وہ تیری اپنی طرف سے ہے)۔

اس آیت کے تناظر میں یہ گمان ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے اپنے نبی ﷺ پر نازل کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے اس واضح حقیقت کو بھلا دیا جو اس نے ان آیات میں واضح طور پر بیان فرمائی: ''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ'' سورۂ زمر، آیت: ۶۲ (اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے) ____ اور ''الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ'' (اس نے ہر شے کی خلقت اچھی قرار دی) سورۂ سجدہ، آیت: ۷ ____، تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اپنی ''مخلوق'' اور ''اچھی'' قرار دیا ہے۔ اور خداوند عالم نے

سورۂ مریم، آیت ۶۴ میں یوں ارشاد فرمایا: "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" (اور تیرا پروردگار بھولنے والا نہیں) اور ارشاد فرمایا: "لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى" (میرا رب نہ بھٹکتا اور نہ ہی بھولتا ہے)____ سورۂ طٰہٰ، آیت ۵۲____، اس بناء پر جملہ "مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ" (جو حسنہ واچھائی تجھے حاصل ہو) کا معنیٰ یہ ہے کہ جو بھی اچھائی تجھے حاصل ہو۔ جبکہ تجھے جو کچھ حاصل ہو وہ اچھائی ہے۔ تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور "وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ" کہ جو "سیئہ" اور بدی تجھ پر آئے وہ تیری اپنی کارگزاری کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ تیرے مقصود ومطلوب سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے تیری نسبت "سیئہ" کہلاتی ہے وہ اپنے طور پر "حسنہ" ہوتی ہے کیونکہ تو نے اسے اپنے بُرے اختیار سے اپنایا ہے اور اس سے قریب تر ہوا ہے۔ اور گویا تو نے ہی اسے اللہ سے چاہا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ و بالاتر ہے کہ تجھے کسی برائی و بدی یا تکلیف وشدت میں مبتلا کرے۔

ایک اہم نکتہ کی وضاحت

زیر نظر آیۂ مبارکہ میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگرچہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیا گیا ہے لیکن اس کا معنیٰ ومطلب عمومی ہے جس میں سب لوگ مخاطب ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ کہ یہ آیت آخری دو آیتوں جیسی ہے جن میں یوں ارشاد ہوا: (ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا)، (وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ)، کہ ان میں عمومی واجتماعی خطاب ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے شخصی وفردی خطاب پر مشتمل ہے، یعنی اس میں شخص وفرد اسی طرح ملحوظ ہے جس طرح عموم ومعاشرہ ملحوظ ہے، کیونکہ انسانی معاشرہ اپنی مخصوص حیثیت وخصوصیت اور ارادہ واختیار کی صفت کا حامل ہے جو کہ شخص وفرد کی حیثیت واختیار سے مختلف ہے۔ معاشرہ ایسی وجودی خصوصیت رکھتا ہے جس میں پہلے اور بعد میں آنے والے تمام افراد شامل قرار پاتے ہیں اسی وجہ سے پہلوں کے برے اعمال کا مؤاخذہ موجودہ نسل سے کیا جاتا ہے اور مرنے والوں سے زندہ لوگوں کی برائیوں کا مواخذہ کیا جاتا ہے اور بے گناہ لوگوں سے گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کا محاسبہ ومؤاخذہ کیا جاتا ہے جبکہ اس طرح کا مؤاخذہ کسی فرد سے بہ حیثیت اس کے فرد ہونے کے ہرگز صحیح نہیں، اس موضوع کی بابت اسی کتاب کی دوسری جلد میں اعمال کے احکام کی بحث میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔۔

اور زیر نظر آیۂ مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احد میں زخمی ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر چوٹیں آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندانِ مبارک بھی ٹوٹ گئے اور چند

مسلمان بھی شہید وزخمی ہوئے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم نبی تھے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وارد ہونے والی مصیبت وتکلیف کی نسبت اس معاشرہ کی طرف دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی نافرمانی کی لہٰذا وہ بڑی مصیبت تھی جو ان لوگوں کے اپنے ہی کئے کا نتیجہ تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی معاشرہ کے ایک فرد تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جانے والی تکلیف ومصیبت دراصل ایک ایسی آزمائش اور عظیم امتحان تھا جو اللہ کی راہ میں آپ پر آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعوت الی اللہ اور پاکیزہ مشن کی راہ میں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری بصیرت وآگاہی کے ساتھ انجام دی کہ جو اپنے طور پر ایسی نعمت ہے جو درجات کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔

یہی حال ہر اس مصیبت وتکلیف کا ہے جو کسی قوم پر آتی ہے تو وہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے کہ جس کے حوالہ سے قرآن مجید اسے اس قوم کی طرف منسوب کرتا ہے اور قرآن تو حق وحقیقت کے سوا کوئی مقصد ومقصود ہی نہیں رکھتا، قرآن کی نظر صرف حق وحقیقت پر ہوتی ہے، اور قرآنی نقطۂ نگاہ اور معیار کی بناء پر یہ حقیقت واضح ہے کہ جو اچھائیاں اور نیکیاں وبھلائیاں لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں ان کا سرچشمہ ذات پروردگار ہے، البتہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں نیکیوں وبھلائیوں کی نسبت بعض حوالوں سے خود لوگوں کی طرف دی گئی ہے مثلاً:

- سورۂ اعراف، آیت: ۹۶

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ"

(اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے)۔

- سورۂ سجدہ، آیت ۲۴

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ"

(اور ہم نے انہیں امام وپیشوا قرار دیا وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کا فریضہ ادا کرتے ہیں یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے)

- سورۂ انبیاء، آیت: ۸۶

"وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِىْ رَحْمَتِنَا ۖ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾"

(اور ہم نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا کہ وہ نیک وصالح ہیں)

بہرحال ان مطالب پر مشتمل بہت ہی زیادہ آیات موجود ہیں۔

ایک واضح قرآنی حقیقت

کلامِ الٰہی سے اس حقیقت کا واضح و روشن ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں بیان کیا ہے کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اپنا مقصود نہیں پا سکتا، اور نہ ہی کسی خیر و بھلائی سے بہرہ ور ہو سکتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر و ہدایت کے، یعنی اللہ کی مشیت و تقدیر اور ہدایت کی توفیق عطا کئے جانے کے بغیر کوئی مخلوق نہ تو اپنا مقصود حاصل کر سکتی ہے اور نہ ہی حق و حقیقت کی راہ پا سکتی ہے۔ چنانچہ درج ذیل آیات میں اسی موضوع کو بیان و ذکر کیا گیا ہے۔

O سورۂ طٰہٰ، آیت: ۵۰

''اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾''

(وہ ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت (خلعتِ وجود) عطا کی پھر اس کی ہدایت کی)۔

O سورۂ نور، آیت: ۲۱

''وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا''

(اور اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک بھی ہرگز کبھی پاکیزگی کا حامل نہ ہوتا)

ان دو آیتوں اور اس سے پہلی آیات کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خداوند عالم کی عطا و عنایت کے بغیر کوئی شخص کسی اچھائی و بھلائی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو اس بھلائی و اچھائی کا مالک قرار نہ دے اس وقت تک وہ اس کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بنا بر ایں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سب ہی نیکیاں و حسنات اللہ کی ہیں اور تکلیفیں و سیّئات انسان کی اپنی ہیں، یعنی حسنات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور سیئات کا سبب خود انسان ہے۔ اس بیان سے زیر نظر آیۂ مبارکہ ''مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ'' کا معنیٰ واضح ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر یہ کہنا قرین صحت ہے کہ تمام حسنات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ وہ ہر حسنہ و نیکی کا خالق ہے اور یہ حقیقت مسلم الثبوت ہے کہ تخلیق اور حُسن ایک دوسرے سے جدا نہیں، اور اس حوالہ سے بھی حسنات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں کہ نیکیاں اور ہر خیر اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ جب تک وہ خود کسی کو عطا نہ کرے کوئی اس سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، اس بناء پر سیّئات میں سے کوئی سیّئہ و برائی اور تکلیف و شر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی سیّئہ، سیّئہ ہونے کے طور پر ایسی ہے کہ اسے ''مخلوق'' نہیں کہا جا سکتا یعنی اس کی تخلیق نہیں ہوتی جبکہ اللہ تعالیٰ کا کام تخلیق ہے اور سیّئہ کی اصل محرومی ہے

یعنی انسان جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوتا ہے کہ اللہ اس کے کئے کے نتیجہ میں اپنی رحمت کا دروازہ اس پر بند کر دیتا ہے تو اس محرومی اور اللہ کی رحمت سے ہاتھ دھو بیٹھنے کو سیئہ کہتے ہیں، تو وہ ''خلق'' کئے جانے سے تعلق ہی نہیں رکھتی یا یوں کہیں کہ تخلیق کا عمل اس سے تعلق ہی نہیں پکڑتا، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حسنہ کا معنیٰ اطاعت اور سیئہ کا معنیٰ معصیت ہے تو اس حوالہ سے ان کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی بابت اس کتاب کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ ''اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا'' کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اگر آپ زیر نظر آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں دیگر کتب تفسیر کا مطالعہ کریں تو آپ کو مختلف آراء اور گونا گوں اقوال و نظریات دکھائی دیں گے کہ جن کے مطالعہ سے آپ حیران و ششدر رہ جائیں گے، مجھے امید ہے کہ اس سلسلہ میں اب تک میں نے جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اور آیت کے حوالہ سے مطالب ذکر کئے ہیں وہی اصل مقصود کے سمجھنے میں کافی ہوں گے، لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اس موضوع کی مختلف جہات اور گونا گوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے مدنظر قرار دیا جائے اور ''حسنہ'' و ''سیئہ'' اور ''نعمت'' و ''نقمت'' کے بارے میں قرآنی معیار کے عین مطابق معنیٰ کہا جائے تا کہ اصل معنیٰ معلوم ہو سکے، اسی طرح معاشرہ اور فرد کی شخصیتوں و حیثیتوں کا تعین بھی قرآنی اصطلاح کے مطابق کیا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے درمیان خلط ملط ہو جائے اور پھر اصل نتیجہ حاصل نہ ہو سکے۔

روایات پر ایک نظر

خدا کے فرمان سے روگردانی کرنے والے

تفسیر ''در منثور'' میں آیۂ مبارکہ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ نسائی نے اور ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم (حاکم نے روایت کو صحیح قرار دیا ہے) اور بیہقی نے اپنی کتاب السنن میں عکرمہ کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ عبدالرحمان بن عوف اور اس کے ساتھی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یانبی اللہ کنا فی عز و نحن مشرکون فلما امنا صرنا اذلّة'' اے اللہ کے نبی جب ہم مشرک تھے تو ہماری بڑی عزت تھی مگر ایمان لانے کے بعد ہم ذلت کا شکار ہو گئے ہیں (وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اجازت و حکم دیں کہ وہ مشرکوں کو قتل کریں اور ان سے جنگ کریں۔م) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ''انی امرت

بالعفو فلا تقاتلوا القوم ''مجھے عفو ودرگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا تم ان لوگوں سے جنگ نہ کرو، پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تو وہاں حکم دیا کہ مشرکوں سے جنگ کریں، مگر انہوں نے خدا کے فرمان کی اطاعت نہ کی بلکہ نافرمانی کے مرتکب ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی:

''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ........ ''(کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روک لو............)

(تفسیر درمنثور جلد ۲۔ص ۱۸۴)

تفسیر درمنثور کی دوسری روایت

تفسیر 'درمنثور'' ہی میں ایک اور روایت مذکور ہے کہ عبد بن حمید ابن جریر اور ابن منذر نے قتادہ کے حوالہ بیان کیا کہ انہوں نے اس آیۂ مبارکہ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ۔۔۔'' کی بابت کہا کہ ہجرت سے پہلے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند اصحاب مشرکوں سے قتال کرنے میں بہت جذباتی تھے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا ''ذرنا نتخذ معاول فنقاتل بها المشركين ''ہمیں اجازت دیں کہ ہم بھی ہتھیار اُٹھالیں اور مشرکوں کے ساتھ قتال کریں، قتادہ نے کہا کہ عبدالرحمان بن عوف بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کی، تو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ مجھے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، لیکن جوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کا حکم صادر ہوا تو انہی لوگوں نے نافرمانی کی اور اسے ناپسند کیا، اور ایسی روش اختیار کی کہ ان کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا وہ آپ سنیں ''قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا'' کہہ دیجئے کہ دنیا کا ساز وسامان بہت تھوڑا ہے جبکہ آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کریں اور تم پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حدیث قدسی کا حوالہ:

تفسیر العیاشی میں صفوان بن یحییٰ نے روایت کی ہے کہ امام ابوالحسنؑ نے ارشاد فرمایا ''یا ابن آدم بمشیتی كنت انت الذی تشاء و تقول، و بقوتی ادّیت الیٰ فریضتی و بنعمتی قویت علیٰ معصیتی، ما اصابك من حسنة فمن الله، وما اصابك من سیّئة فمن نفسك، و ذاك انی اولیٰ بحسناتك منك،

وانت اولی بسیئاتک منی، وذاک انی لااسأل عما افعل وھم یُسألون''

اے فرزندِ آدم، میری مشیت کی وجہ سے تو مشیت والا ہوا ہے اور جو چاہتا ہے کہتا ہے، اور میری قوت کی وجہ سے تو میرے فرائض ادا کرنے پر قادر ہوا ہے اور میری عطا کی ہوئی نعمت کی بناء پر تو نے میری نافرمانی کی طاقت پائی ہے، جو حسنہ و نیکی تجھے حاصل ہو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو سیئہ و تکلیف تجھے پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ میں تیری نیکیوں کی بابت تجھ سے زیادہ حقدار ہوں کہ ان کی نسبت میری طرف ہو۔ اور تو اپنی برائیوں و تکلیفوں کے حوالہ سے خود ذمہ دار ہے۔ کیونکہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس کی بابت مجھ سے باز پرس نہیں ہو سکتی جبکہ لوگوں سے ان کے کئے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۵۸)

یاد رہے کہ یہی روایت اسی کتاب (المیزان) کی پہلی جلد میں دوسرے الفاظ میں آیۂ مبارکہ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا'' ــــــ بقرہ،۲۶ ــــــ کی تفسیر کے ضمن میں ذکر ہو چکی ہے اور اس کی بابت مربوطہ مطالب بھی ذکر ہو چکے ہیں۔

امتحان و آزمائش کی شدت وضعف

کتاب کافی میں مولفؒ نے اپنے اسناد سے عبدالرحمٰن بن حجاج کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ذکر عند ابی عبداللہ(ع) البلاء وما یخص اللہ بہ المؤمن، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے عام لوگوں کے امتحان و آزمائش اور اس امتحان و آزمائش کا تذکرہ ہوا جو اللہ مؤمن بندے سے لیتا ہے، فقال: سئل رسول اللہ (ص) من اشد الناس بلاءً فی الدنیا؟ امامؑ نے فرمایا کہ حضرت رسول خدا ﷺ سے پوچھا گیا کہ دنیا میں لوگوں میں سب سے زیادہ کون شخص امتحان میں مبتلا ہوتا ہے؟ فقال(ص) النبیّون ثم الامثل فالامثل، ویبتلی المؤمن، بعد علیٰ قدر ایمانہٖ وحسن اعمالہ،فمن صح ایمانہٗ وحسن عملہٗ اشتد بلاؤہ، ومن سخف ایمانہٗ وضعف عملہٗ قل بلاؤہ، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے انبیاء اور پھر ان کے بعد جو ان سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو، اس کے بعد مؤمن کا امتحان و آزمائش اس کے ایمان اور حسن عمل کے مطابق ہوتی ہے کہ جس کا ایمان صحیح ہو اور عمل اچھا ہو اس کا امتحان سخت ہوتا ہے اور جس کا ایمان کمزور ہو اور عمل بھی ضعیف ہو تو اس کی آزمائش کم ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے مشہور اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر'' دنیا مؤمن کا قید خانہ اور کافر کی بہشت ہے۔

کتاب کافی ہی میں ان دونوں اماموں (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ) سے متعدد اسناد سے منقول ہے کہ

انہوں نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اسے تکلیفوں کے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔
(کتاب اصول کافی، جلد اوّل، ص ۲۵۲)

اسی کتاب یعنی اصول کافی ہی میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: انما المؤمن بمنزلة كفة الميزان كلما زيد في ايمانه زيد في بلائه، مؤمن کی مثال ترازو کے پلڑے جیسی ہے کہ جس قدر اس کا ایمان زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کا امتحان بھی زیادہ ہوتا ہے۔

خدا کا بندۂ مؤمن سے رابطہ

امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مؤمن کے ساتھ رابطہ و پیوستگی میں رہتا ہے اور اسے اسی طرح امتحان و ابتلاء کی صورت میں ہدیے بھیجتا رہتا ہے جس طرح کوئی شخص مسافرت کے عالم میں اپنے اہل وعیال سے رابطہ میں رہتے ہوئے ان کے لئے رہنمائی و نصیحتوں کے تحفے و ہدیے بھیجتا ہے، اور جس طرح کوئی طبیب و معالج مریض شخص کو اس کی صحت و تندرستی یقینی بنانے کے لئے پرہیز کرنے اور بعض چیزوں کو ترک کرنے کی تلقین کرتا ہے اسی طرح خداوند عالم بھی اپنے بندۂ مؤمن کو بعض لذائذ ترک کرنے کا حکم دے کر اسے سختیوں سے دوچار کر کے اس کی سلامتی کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔(ان الله عزوجل ليتعاهد المؤمن بالبلاء كما يتعاهد الرجل اهلهٗ بالهداية من الغيبة ويحميه الدنيا كما يحمى الطبيب المريض) (اصولِ کافی، جلد اول، صفحہ ۲۵۵)

کتاب اصول کافی ہی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے فرمایا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ خداوند عالم کو اس بندے سے کوئی کام نہیں جس کے مال و بدن میں اس کا کوئی حصہ ہی نہ ہوا۔(لا حاجة لله فيمن ليس لهٗ في ماله وبدنه نصيب)(یعنی نہ تو وہ اپنے مال میں اور نہ ہی اپنے بدن میں اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض ادا کرتا ہو)۔(اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۵۶)

امام زین العابدینؑ کی روایت

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میرے پدر بزرگوار نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ولو کان المؤمن علی جبل لقیض اللہ عزوجل لہٗ من یؤذیہ لیأجرہ علی ذالك''
(اگر مؤمن پہاڑ کی چوٹی پر کیوں نہ ہو خداوند عالم اس تک کسی ایسے کو ضرور پہنچادے گا جو اسے ایذاء وتکلیف دے تا کہ اس پر (تکلیف سہنے پر) اسے اجر عطا کرے)۔ (علل الشرائع، ج۱ ص ۴۴)

امام جعفر صادقؑ کے دوارشادات

کتاب ''التمحیص'' میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: ''لاتزل الھموم والغموم بالمؤمن حتی لاتدع لہٗ ذنبًا'' تکلیفیں اور غم وآلام مؤمن کے ساتھ ساتھ رہیں گے جب تک کہ اس کا کوئی گناہ باقی نہ رہے۔

اورانہی امامؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشادفرمایا: ''لا یمضی علی المؤمن اربعون لیلۃ الاعرض لہٗ امر یحزنہٗ یذکّر ربّہ'' مؤمن پر چالیس راتیں نہیں گزرتیں مگر یہ کہ اس پر کوئی ایسی مصیبت آجاتی ہے جو اسے غمزدہ کردیتی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرتا اور اسی کو پکارتا ہے۔

محبت علیؑ واہل بیتؑ

امام علیؑ نے ارشادفرمایا: لو احبنی جبل لتھافت، ومن احبنا اھل البیت فلیستعد للبلاء جلبابًا، اگر کوئی پہاڑ بھی مجھ سے محبت کرے گا تو ریزہ ریزہ ہوجائے گا اور جوشخص اہل بیتؑ سے محبت کرے وہ تکلیفوں کے لئے پوری طرح تیار رہے، (بعض نسخوں میں ہے: للفقر، یعنی فقر کے لئے تیار رہے)
(نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۱۱۱۔۱۱۲)

ان ارشادات کی تشریح میں ابن ابی الحدید معتزلی نے لکھا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ سے ایک صحیح روایت منقول ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ نے ارشادفرمایا: یاعلی لا یحبك الّا مؤمن ولا یبغضبك الّا منافق، اے علی، تجھ سے کوئی محبت نہ کرے گا سوائے اس کے کہ جو مؤمن ہو اور تجھ سے کوئی دشمنی نہیں کرے گا سوائے منافق کے (کتاب شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱۸ صفحہ ۱۰۸) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ نے فرمایا: ان البلوئ اسرع الی المؤمن من الماء الی الحدور، مؤمن پر بلا ومصیبت اس طرح تیزی سے آتی ہے جس طرح پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، ان بیانات سے یہ نتیجہ یقینی حاصل ہوتا ہے کہ علیؑ کی محبت سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوسکتے ہیں (یہاں تک ابن ابی الحدید کا بیان تمام ہوا)

بہر حال اس موضوع پر متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جن سے ہمارے ذکر کردہ مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔

خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ علیہم السلام کی اطاعت

ابن منذر اور خطیب نے ابن عمر سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: کنا عند رسول اللہ (ص) فی نفر من اصحابہ فقال (ص): یا ھؤلاء الستم تعلمون انی رسول اللہ (ص) الیکم؛ قالوا: بلیٰ، ہم ایک دن چند صحابۂ کرام کے ہمراہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے پوچھا: اے حاضرین، کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟ سب نے کہا: ہاں، قال (ص): الستم تعلمون ان اللہ انزل فی کتابہ انہ من اطاعنی فقد اطاع اللہ؛ قالوا: بلیٰ، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ نازل فرمایا ہے کہ جو شخص میری اطاعت کرے گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی،؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، نشھد انہ من اطاعك فقد اطاع اللہ وان من طاعتہ طاعتك، ہم گواہی دیتے ہیں کہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور اللہ کی اطاعت ہی کا حصہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت! اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فان من طاعة اللہ ان تطیعونی وان من طاعتی ان تطیعوا آئمتکم، وان صلّوا قعوداً فصلّوا قعوداً اجمعین، تو اللہ کی اطاعت اس میں ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت اس میں ہے کہ تم اپنے آئمہ کی اطاعت کرو، اگر وہ بیٹھ کر نماز ادا کریں تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز ادا کرو۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲۔ص ۱۸۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان کہ اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز ادا کرو تو یہ درحقیقت اتباع و پیروی کے آخری حد تک واجب ہونے سے کنایۃً ذکر ہوا ہے۔

آیات ۸۱ تا ۸۴

○ وَ يَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿۸۱﴾

○ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿۸۲﴾

○ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۳﴾

○ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿۸۴﴾

ترجمہ

○ ''اور وہ کہتے ہیں: اطاعت ہوگی، مگر جب آپ کے ہاں سے اُٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ والے رات کو اپنے کہے کے برعکس سوچ بچار (اور سازشیں) کرتے ہیں، جبکہ اللہ ان کے راتوں کو ہونے والے مشوروں اور باتوں کو لکھتا ہے، لہٰذا آپ اُن سے روگردانی کریں اور اللہ پر بھروسہ کریں کہ اللہ ہی کارسازی کے لئے کافی ہے۔'' (۸۱)

○ ''کیا وہ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے، اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔'' (۸۲)

○ ''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی بات آتی ہے تو وہ اسے منتشر کردیتے ہیں، اگر وہ اسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے اولی الامر کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اہل تحقیق ہیں وہ اس کے بارے میں بخوبی آگاہی حاصل کر لیتے، اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیروکار ہو جاتے سوائے چند لوگوں کے۔'' (۸۳)

○ ''بس آپ اللہ کی راہ میں قتال کریں، آپ صرف اپنے ذمہ دار ہیں کسی دوسرے کے نہیں، اور مؤمنوں کو قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب دلائیں، بہت جلد اللہ کافروں کی کاروائیوں کا سدّ باب کرے گا، کہ اللہ نہایت سخت طاقت والا اور سخت سزا دینے والا ہے۔'' (۸۴)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ، اپنی ماقبل آیات سے بے ربط نہیں، گویا اس موضوع کا تتمہ و تکمیلی بیان ہے جس میں ضعیف الایمان مسلمانوں کو مورد ملامت و مذمت قرار دیا گیا ہے اور اس تکمیلی بیان کا فائدہ انہیں بصیرت آموز نصیحت کرنا ہے کہ اگر وہ غور وفکر اور تدبر سے کام لیتے ہوئے بصیرت و آگاہی کے خواہاں ہوں!

ظاہر و باطن اور قول و فعل میں فرق

○ ''وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ''

(اور وہ کہتے ہیں: اطاعت!)

یہاں لفظ ''طاعۃ'' مرفوع ہے یعنی ۃ پر پیش ـــــ تنوین ـــــ کے ساتھ ہے، اور کہا گیا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ یہ جملہ میں خبر کے طور پر ہے ـــــ اور جملہ اسمیہ میں مبتداء اور خبر دونوں مرفوع ہوتے ہیں، م ـــــ، اور فہم المعنیٰ کے لئے عبارت یوں فرض کرنی ہوگی، ''امرنا طاعة'' (ہمارا کام اطاعت کرنا ہے) یعنی ہم آپ کی اطاعت ہی اطاعت کرنے والے ہیں۔

لفظ ''بروز'' کا معنیٰ ظہور وخروج یعنی باہر جانا ہے۔

لفظ ''تبییت'' بیتوتہ سے ہے جس کا معنیٰ کسی کام کارات میں محکم و پختہ کرنا اور اس کی تدبیر کرنا ہے۔

اور ''تقول'' میں ضمیر فاعل کی برگشت ''طائفۃ'' یا حضرت پیغمبر اسلام ﷺ (الرسول) کی طرف ہے۔

بنابرایں آیت کا معنیٰ ـــــ واللہ اعلم ـــــ یہ ہے: اور وہ لوگ کہ جنہیں آپ جہاد کے لئے بلاتے ہیں وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں: ''امرنا طاعة'' ہمارا کام (فریضہ) تو اطاعت کرنا ہے، مگر جب وہ آپ کی محفل سے باہر جاتے ہیں تو رات کو آپس میں اپنی اس بات کے بارے میں غور وفکر کرنے لگ جاتے ہیں جو انہوں نے آپ سے کہی تھی یا جہاد کے علاوہ دیگر ان امور کے بارے میں کہ جو آپ نے ان سے کہے تھے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور ان کے فرمان کی خلاف ورزی کا پختہ ارادہ رکھتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے رُوگردانی کریں اور اللہ پر بھروسہ کرکے پختہ ارادہ کے ساتھ اقدام کریں، چنانچہ اس طرح ارشاد الٰہی ہوا: ''فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ و کفٰی باللہ وکیلاً'' (پس ان سے منہ پھیرلیں اور اللہ پر توکل کریں کہ اللہ ہی کا سہارا کافی ہے)۔

یہاں یہ مطلب قابلِ ذکر ہے کہ آیت میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ آیت میں منافقین ملحوظ ہیں اور انہی کے بارے میں بات ہوئی ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے اس کا تذکرہ کیا ہے بلکہ آیت کے سیاق کو مدنظر رکھیں تو صورتحال اس سے برعکس دکھائی دیتی ہے۔

قرآن میں تدبر!

○ ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ''

(کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے........)

اس آیت میں استفہامی سوالیہ انداز میں قرآن میں غور وفکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

''تدبر'' کا معنیٰ کسی چیز کو کسی چیز کے بعد لینا ہے، یعنی پیچھے پیچھے، یہاں آیہ مبارکہ میں اس سے مراد ایک آیت کے بعد دوسری آیت میں غور وفکر کرنا یا ایک ہی آیت میں بار بار غور وفکر کرنا ہے، لیکن جب غرض ومقصود یہ مطلب بیان کرنا ہے کہ قرآن میں اختلاف نہیں اور یہ بات چونکہ ایک سے زیادہ آیات میں بیان ہوئی ہے لہٰذا یہاں تدبر سے مراد یہ ہوگا کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت میں غور وفکر کریں گو یا مذکورہ دو معنوں میں سے پہلا معنیٰ مراد لینا زیادہ بہتر ہے، اگرچہ اس سے دوسرے معنیٰ کا مراد لینا بھی نادرست نہیں قرار پاتا۔

بہرحال آیت سے مراد یہ ہے کہ انہیں قرآنی آیات میں غور وفکر کرنے کی ترغیب دلائی جائے اور یہ کہ وہ نازل ہونے والے ہر حکم میں، یا بیان کی جانے والی حکمت ودانائی پر مبنی بات میں، یا کسی واقعہ یا اخلاق ونصیحت وغیرہ میں ان تمام آیات کی طرف رجوع کریں جو اس سے مربوط ہوں خواہ وہ مکی آیات ہوں یا مدنی، محکم ہوں یا متشابہ، اور پھر ان آیات کو ایک دوسرے کے تناظر میں دیکھیں تو اُنہیں معلوم ہوجائے گا کہ ان آیات میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا، بلکہ آیات مبارکہ اس طرح سے ہیں کہ ان میں سے قدیم (پہلے نازل ہونے والی) آیت، جدید (بعد میں نازل ہونے والی) آیت کی

تصدیق کرتی ہے، اور ان میں سے بعض، دوسری بعض کی گواہی دیتی ہیں جبکہ ان کے درمیان کسی بھی صورت میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا یعنی نہ تو ایسا تناقضی اختلاف کہ وہ ایک دوسرے کی نفی کریں یا ان میں سے کوئی ایک، دوسری کو رد کرے، اور نہ ہی تفاوتی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ دو آیتوں میں معانی کی مشابہت یا معانی کی متانت کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے، اور نہ ہی ان کے مقاصد میں اختلاف کی کوئی صورت پائی جاتی ہے کہ جس کی رو سے یہ کہا جاسکے کہ ان میں سے بعض آیات بیان کے لحاظ سے مضبوط و محکم اور رسا ہیں جبکہ دوسری اس صفت کی حامل نہیں، ایسا ہرگز نہیں، قرآن مجید تو ایسی عظیم کتاب ہے جس کی بابت خود اسی میں یوں مذکور ہے: **کتابًا متشابهًا مثانی تقشعر منه الجلود**، وہ ایسی کتاب ہے کہ جس کے الفاظ ایک جیسے ہیں، ہر جزء دوسرے جزء سے مشابہت رکھتا ہے، اس کو سننے سے کھالیں سکڑ جاتی ہیں۔ یہ ایک نہایت لطف استعارہ ہے مطالب کے رسا اور موثر ہونے سے!

بنا برایں قرآنِ مجید میں اس طرح کے اختلافات کا نہ پایا جانا ہی لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہی دلاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی مقدس کتاب ہے اسے کسی غیر اللہ نے نہیں نازل کیا کیونکہ یہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتی تو اس میں کثیر اختلاف پایا جاتا اور وہ اختلاف سے ہرگز محفوظ نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کائنات کی تمام موجودات ـــــ خاص طور پر انسان کہ جس کے بعض افراد اس شک میں مبتلا ہیں کہ قرآن انہی کی طرف سے ہے۔ کی وجودی تخلیق اور طبعی ساخت ہی ایسی ہے کہ ہر آن تحرک، تغیر اور تکامل کی راہ پر رہتی ہیں، ان میں سے جسے بھی دیکھیں اس کے وجود کے زمانی مراحل مختلف جہات اور گوناگوں حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔

ہر انسان ہر روز اپنے آپ کو گذشتہ کل سے عقلمند تر سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ وہ جو نیا کام کرتا ہے یا کوئی صنعت وایجاد وغیرہ پیش کرتا ہے یا کوئی رائے ونظریہ وموقف اختیار کرتا ہے وہ اس کے پہلے کام ونظریہ سے زیادہ مضبوط ومستحکم ہے یہاں تک کہ ایک ہی عمل کہ جس میں وجودی تسلسل پایا جاتا ہو اسے بار بار انجام دینے سے یہی تصور واحساس پیدا ہوتا ہے کہ آخری بار، پہلے سے بہتر ہے اور اس کا بعض حصہ، بعض سے افضل ہے مثلاً کوئی شخص کتاب لکھتا ہے، کوئی شاعر شعر کہتا ہے، کوئی مقرر خطاب کرتا ہے تو وہ اپنے پہلے عمل سے زیادہ بہتر اپنے بعد والے عمل کو پاتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا قرین صحت ہے کہ کوئی ایک شخص نہ خود اپنی ذات میں اور نہ ہی اپنے انجام دیئے جانے والے عمل میں اختلاف سے مبرا نہیں اور صرف یہ نہیں کہ ایک ہی اختلاف ہو بلکہ بہ کثرت اختلاف پایا جاتا ہے تو ایسا ہونا ایک قاعدۂ کلیہ ہے جو نوع انسانی میں طبع الوجودی صورت میں پایا جاتا ہے بلکہ اس کے علاوہ دیگر تمام موجودات میں پایا جاتا ہے کیونکہ عالم امکان میں جتنی مخلوق موجود ہے وہ تحول وتکامل (یعنی تبدیلی اور نقص سے کمال کی طرف جانے) کے نظام کی محکوم ہے لہٰذا آپ کوئی مخلوق جو عالم موجودات میں ہو ایسی نہیں پائیں گے جو ہمیشہ ایک ہی حالت پر باقی ہو بلکہ اس کی ذات اور حالات میں

تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

انہی مطالب سے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ آیۂ مبارکہ میں اختلاف کے ساتھ ''کثیر'' کا لفظ کیوں ذکر کیا گیا ہے''اختلافاً کثیراً'' یہاں ''کثیرا'' کی صفت توضیحی ہے احترازی نہیں، تو آیت کا معنٰی یوں ہوگا کہ اگر قرآن اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں اختلاف پاتے اور وہ اختلاف کثیر ہوتا بلکہ اس قدر کثیر ہوتا کہ جو ہر اس چیز میں پایا جاتا ہے جو غیر اللہ کی طرف سے ہو، لہٰذا آیت کا معنٰی یہ نہیں کہ قرآن مجید سے کثیر اختلاف کی نفی ہوئی ہے نہ کہ کم اختلاف کی بلکہ ہر طرح کے اختلاف کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اہل تدبر اس حقیقت کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید ایک جامع کتاب ہے جس میں انسانیت سے مربوط تمام امور کے بارے میں مطالب مذکور ہیں مثلاً اعتقادات کے باب میں مبداء و معاد اور خلق و ایجاد، پھر عمومی انسانی فضائل و کمالات، پھر وہ قوانین جو معاشرہ و فرد سے تعلق رکھتے ہیں کہ جو نوع انسانی میں اس طرح حکم فرما ہیں کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا مسئلہ اس سے باہر نہیں، پھر تاریخی واقعات، سبق آموز حکایات اور اخلاقی نصائح مذکور ہیں، ان سب کو مخصوص و منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے اور دنیا والوں کو اس کی نظیر پیش کرنے کی دعوت و چیلنج کیا گیا ہے۔
ان تمام معارف و حقائق کو ۲۳ برسوں میں تدریجاً نازل ہونے والی آیات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ جو مختلف حالات میں نازل ہوئیں کچھ رات میں نازل ہوئیں تو کچھ دن میں نازل ہوئیں، کچھ سفر میں نازل ہوئیں تو کچھ حضر میں نازل ہوئیں، کچھ جنگ کے موقع پر نازل ہوئیں تو کچھ صلح کے زمانہ میں نازل ہوئیں، کچھ سختی و تکلیف کی حالت میں نازل ہوئیں تو کچھ آسانی و آرام کے زمانہ میں نازل ہوئیں۔

لیکن ان تمام مختلف حالات و گوناگوں ادوار و ازمان کے باوجود قرآن مجید کی معجزہ آسا بلاغت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا، نہ ہی اس کے بلند پایہ معارف و عالی ترین حکیمانہ مطالب میں اور نہ ہی اس کے معاشرتی و شخصی قوانین میں کسی قسم کا اختلاف دکھائی دیا، بلکہ اس کے مطالب کے درمیان ربط و پیوستگی کا عالم یہ ہے کہ جو کچھ اس کے آخری تنزیلی دور میں آیا وہ اس کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والے مطالب سے پورے طور پر مرتبط ہے، اسی طرح اس کی تفصیلات اور فروعات کی برگشت اس کے بنیادی حقائق اور اصولوں کی طرف ہوتی ہے، اگر اس کے احکام و عملی دستورات پر تجزیاتی نگاہ کریں تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ان سب کا محور خالص توحید ہی ہے اور جب خالص توحید پر غور کریں تو اس میں وہ تمام تفصیلات سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں جو پورے قرآن میں پھیلی ہوئی آیات میں مذکور ہیں، تو یہ ہے قرآن کی مجموعی صورت!

اب اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں بخوبی تدبر سے کام لے تو اپنے زندہ شعور اور فطری اعتراف کے ساتھ یہ فیصلہ کرے گا کہ اس طرح کے کلام کا متکلم ایسا نہیں ہوسکتا جو گردشِ لیل و نہار اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے تغیر و تبدل اور تکامل کے اس نظام کا مغلوب و محکوم

ہو کہ جو عالم ہستی میں نافذ و حاکم ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا اقرار و اعتراف کرے گا کہ وہ خدائے واحد و قہار، یکتا و غالب ہے۔

نتیجہ بیان یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ سے درج ذیل مطالب واضح ہو گئے:

(۱) قرآن مجید عام فہم کلام ہے اور اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

(۲) قرآنی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔

(۳) قرآن ایسی کتاب ہے جس میں نہ تو نسخ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اس کے مطالب کو غلط و نادرست قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس میں کوئی نقص و کمی بھی نہیں پائی جاتی کہ جسے دور کرنے کی ضرورت ہوتا کہ اس کے بعد اسے مکمل کئے جانے کی بات کی جاسکے اور نہ ہی اس کی ترتیب و ترکیب کی درستگی کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ کوئی حکمران و سلطان اس کے خلاف کبھی کوئی فیصلہ نافذ نہیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ جس چیز میں اس طرح کے امور کی گنجائش پائی جائے اسے ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں تغیر و تبدل واقع ہو سکے، لیکن جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو چونکہ اس میں کسی طرح کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں پائی جاتی لہٰذا نسخ و ابطال وغیرہ بھی اس میں ممکن نہیں، یعنی کوئی شخص اس کے احکام کو منسوخ نہیں کرسکتا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ قیامت کے دن تک باقی ہے۔

جنگ بدر (صُغریٰ) کا ایک حوالہ

○ ''وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ''

(اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو اسے عام کر دیتے ہیں.......)

''اَذَاعُوْا'' کا مصدر ''ذاعہ'' ہے جس کا معنٰی عام کرنا، پھیلا دینا ہے (النشر والاشاعہ) آیہ مبارکہ میں ''ذاعہ'' کے حوالہ سے ایسا کرنیوالوں کی ایک طرح کی مذمت و سرزنش بیان ہوئی ہے، اور آیت کے ذیلی جملہ: ''وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ...'' میں اس مطلب کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ اس طرح کی خبروں کو عام کرنے سے اہل ایمان کے گمراہ ہونے کا خطرہ تھا اور وہ گمراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی کیونکہ ان آیات مبارکہ میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے چنانچہ اس کا تائیدی ثبوت بعد والی آیت مبارکہ میں (فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) میں موجود ہے کہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتال کا حکم دیا گیا یہاں تک کہ اگر مؤمنین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت نہ بھی کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکہ و تنہا رہ جائیں تب بھی قتال کا خدائی حکم باقی ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آیت میں ''امر'' سے مراد وہ افواہیں ہیں جو کفار اور ان

کے گماشتے مؤمنین کے درمیان نفاق واختلاف کو ہوادینے کے لئے پھیلاتے تھے توضعیف الایمان افراد غور وفکر اور تدبر کے بغیر ہی ان خبروں کو عام کردیتے تھے جس کے نتیجہ میں مؤمنین کے دلوں میں کمزوری پیدا ہوتی تھی البتہ اللہ تعالیٰ کا مؤمنین پر کرم واحسان ہے کہ اس نے انہیں اس طرح کی خبریں وافواہیں پھیلانے والوں کے شیطانی مقاصد سے محفوظ رکھا اور وہ لوگ کہ جو اس طرح کے کاموں سے مؤمنین کو رسوا کرنے کے خواہاں تھے نا کام ہو گئے۔

بنابرایں یہ آیۂ مبارکہ جنگ بدر (صغریٰ) پر منطبق ہوتی ہے کہ جس کے بارے میں سورۂ آلِ عمران میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔تو یہاں مورد بحث آیات، اُن آیات مبارکہ سے موضوع ومطالب کے حوالہ سے مشابہت رکھتی ہیں چنانچہ ان آیات میں غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں یوں ارشاد فرمایا:

''اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۚ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ....... تا....... اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ''(سورۂ آل عمران: ۱۷۲ تا ۱۷۵)

(وہ لوگ کہ جنہوں نے زخمی ہونے کے باوجود اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا ان میں سے جن لوگوں نے نیکی کی اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے عظیم اجر مقرر ہے۔وہ وہی ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہو گئے ہیں (دشمنوں کا لشکر تم پر حملہ کرنے کو تیار کھڑا ہے) لہٰذا تم ان سے ڈرو اور بچ کر رہو، تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ اللہ ہمیں کافی اور وہ بہترین سہارا ہے......یہ شیطان ہے جو اپنے پیروکاوں کو خوف دلاتا رہتا ہے مگر آپ مؤمنین ان سے مت ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو (میرے حکم کی نافرمانی کرنے سے ڈرو) اگر تم ایمان والے ہو)۔

ان آیات سے ___ جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں ___ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو کفار سے جہاد کرنے کی دعوت دیتے تھے جبکہ وہ اس سے پہلے جنگ احد میں سخت دشواری کا سامنا کر چکے تھے، اور کچھ لوگ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ مؤمنین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفار کے مقابلے میں آنے سے باز رکھیں لہٰذا اس مقصد کے لئے یہ افواہیں پھیلاتے تھے کہ مشرکین ان کے مقابلے میں صف آراء ہو گئے ہیں تا کہ وہ ان سے گھبرا کر میدان میں جانے سے رک جائیں۔

اس کے بعد ان آیات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس طرح کی افواہیں دراصل شیطان کی چالیں ہیں جو وہ اپنے پیروکاروں کے ذریعے پھیلاتا ہے، لیکن ان آیات میں مؤمنین کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انہیں تاکیداً حکم دیا گیا کہ وہ شیطان کے پیروکاروں کی افواہوں سے ہرگز خوفزدہ نہ ہوں بلکہ اگر ایمان والے ہیں تو صرف اللہ سے ڈریں۔

بہرحال ان آیات اور زیر نظر آیات مبارکہ یعنی ''وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ'' میں غور وفکر کریں تو اس سلسلہ میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں جنگ بدر (صغریٰ) کے واقعہ کو یاد دلا رہا ہے اور اس واقعہ کو ان واقعات میں سے قرار دے رہا ہے جن کے حوالہ سے وہ ضعیف الایمان لوگوں کی مذمت کرتا ہے مثلاً: ''فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ''، ''وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ''، ''وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ''، ''وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ'' اس کے بعد اس سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا: ''وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ''

افواہوں کے ازالہ کا عملی طریقہ

○ ''وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ''

(اگر وہ اسے رسول اور اپنے اولی الامر کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی سوج بوجھ رکھتے ہیں وہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جاتے)۔

اس جملے میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اسے اللہ کی طرف لے جائیں جبکہ اس سے پہلی آیات میں یوں ذکر ہوا: ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' اگر تم کسی چیز میں نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پلٹا دو (سورۂ نساء، آیت ۵۹) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں جس چیز کو لے جانے و پلٹانے کا حکم مذکور ہے وہ متنازع فیہ شرعی حکم ہے کہ جس میں اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ لیکن یہاں جس پلٹانے اور لے جانے کا حکم مذکور ہے وہ لوگوں کے درمیان پھیلائی جانے والی امن یا خوف کی خبر ہے کہ جس کا لیجانا و پلٹانا اللہ اور اس کی کتاب کی طرف کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اسے رسول اور ان کے اولی الامر ہی حل کر سکتے ہیں کہ اگر وہ اس سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کریں تو وہ اس کی چھان بین کر کے رجوع کرنے والوں کو اس خبر کے درست یا نادرست اور صحیح یا غلط ہونے سے آگاہ کر سکتے ہیں، تو یہاں علم وآگاہی سے مراد حق و باطل اور سچ و جھوٹ کے درمیان تمیز کرنا ہے، چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیتوں میں پایا جاتا ہے:

○ سورۂ مائدہ، آیت: ۹۴

''لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ''

(تاکہ خدا آگاہ ہو کہ کون دل سے اس سے ڈرتا ہے)

○ سورۂ عنکبوت، آیت: ۱۱

''وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝''

(اور تا کہ اللہ جان لے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جان لے ان لوگوں کو جو منافق ہیں)۔

آیت مبارکہ میں لفظ ''استنباط'' ذکر ہوا ہے (يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ) جس کا معنٰی کسی بات کو ابہام کی حالت سے نکال کر تمیز و معرفت کے مرحلہ تک لانا ہے، اس کا لفظی اشتقاق ''نَبَط'' سے ہے (نَ اور تَ پر زبر کے ساتھ) کہ جو کنویں سے نکالے جانے والے سب سے پہلے ڈول کو کہتے ہیں، اس بناء پر عین ممکن ہے کہ یہاں ''استنباط'' کا عمل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولی الامر کی صفت قرار دیا جائے اور یوں معنٰی کیا جائے کہ وہ اصل بات کی تحقیق اور بخوبی چھان بین کر کے معلوم کر لیں گے کہ حق و سچ کیا ہے؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمل کو رجوع کرنے والوں کی صفت قرار دیا جائے اور یوں معنٰی کیا جائے کہ اگر وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے اولی الامر کی طرف رجوع کریں تو وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے اولی الامر کے بتانے سے آگاہ ہو جائیں گے کہ حقیقت الامر کیا ہے؟

اس طرح آیت کے معنٰی کی برگشت اس طرف ہوگی کہ اگر ''الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ '' (ان میں سے استنباط کرنے والوں) سے مراد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولی الامر ہوں، جیسا کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، تو آیت کا معنٰی یہ ہوگا کہ اگر لوگ اس خبر اور افواہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے اولی الامر کی طرف پلٹا دیں یعنی ان سے حقیقت الامر اور حق و سچ دریافت کریں تو انہیں یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولی الامر کو حقیقت الامر سے آگاہی حاصل ہو جائے گی، اور اگر اس سے مراد رجوع کرنے والے لوگ ہوں تو اس کا معنٰی یہ ہوگا کہ اس خبر اور افواہ کے بارے میں حقیقت الامر سے آگاہ ہونے کے خواہاں افراد ان رجوع کرنے والوں سے باخبر ہو جائیں گے۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''اولی الامر'' سے مراد کون ہیں؟ تو اس سلسلہ میں صورت حال واضح ہے کہ اس سے مراد وہی ''اولی الامر'' ہیں جو سورۂ نساء، آیت ۵۹ میں مذکور ہیں جس میں یوں کہا گیا ہے: ''وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ '' (اور تم اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور اپنے اولی الامر کی) اس آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ تمام اقوال کی برگشت پانچ بنیادی اصولوں کی طرف ہوتی ہے، البتہ ہم نے اس سلسلہ میں جو کچھ سمجھا ہے وہ دیگر اقوال سے زیادہ واضح ہے۔

اولی الامر کے بارے میں پانچ اقوال

اولی الامر کے بارے میں جو پانچ اقوال پیش کئے گئے ہیں ان کی تفصیل یوں ہے:

پہلا قول: اس سے مراد وہ ''اولی الامر'' ہیں جن کا ذکر سورۂ نساء کی آیت ۵۹ (وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ) میں ہے۔

دوسرا قول: فوج ولشکر کے سربراہ، تو یہ قول اس بناء پر قرین صحت نہیں کہ لشکر وفوج کے سربراہوں کا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اسی لشکر کے امور کی سربراہی ونگرانی کرتے ہیں جو کسی مخصوص واقعہ میں تشکیل پاتا ہے کہ ان کی مہارت اور دائرۂ کار اس سے باہر نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک آیت مبارکہ میں ذکر کئے جانے والے، امور واحوال اور موارد و وقائع کا تعلق ہے یعنی دشمنوں کی طرف سے افواہیں پھیلانا اور معاشرے میں امن وامان کے مسائل پیدا کر کے خوف ودہشت کی فضا قائم کرنا کہ جو مشرکین کی طرف سے جاسوس بھیج کر مؤمنین کو تشویش میں مبتلا کرنے کی غرض سے ہوتا تھا، تو اس طرح کے امور میں لشکر کے سربراہوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت الامر کی بخوبی چھان بین اور تحقیق کر کے لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہی دلائیں اور ان خبروں وافواہوں کے بارے میں انہیں حق وسچ سے باخبر کریں کہ جن کے متعلق وہ پوچھتے ہیں۔

تیسرا قول: علماء، اس قول کا آیت مبارکہ سے عدم مناسبت کا حامل ہونا واضح ہے کیونکہ صدر اسلام کے علماء محدثین وفقہاء اور قاریانِ قرآن ماہرین علم کلام تھے کہ جن کی علمی مہارت فقہ وحدیث جیسے علوم میں تھی جبکہ آیۂ شریفہ میں جملہ ''وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ'' سے مراد وہ افواہیں جن کا تعلق سیاسی اغراض ومقاصد سے ہے اور ان میں سے ہر بات کسی مخصوص مقصد سے وابستہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا قبول کیا جانا یا رد کیا جانا یا نظر انداز کیا جانا معاشرتی زندگی میں کسی بڑے ایسے سانحہ کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے جسے کوئی اصلاح کرنے والا اپنی تمام تر فکری وعملی صلاحیت کے باوجود روک نہ سکے، یا کسی حادثے کا موجب بن سکتا ہے جس سے امت کی سعادت کی راہ میں کی جانے والی کوششوں کو نقصان پہنچے اور انہیں عزت سے محروم کر کے ذلت ورسوائی اور قتل وقید سے دوچار کردے، تو اس طرح کے امور میں ان علماء کا کیا کردار اور علمی مہارت کام آسکتی ہے جو علم حدیث وفقہ یا قرائت وغیرہ میں بلند مقام رکھتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دے اور ان معاملات کو ان کی طرف لے جانے کا فرمان جاری کرے؟ اور پھر یہ کہ اس طرح کے امور میں ان سے کسی حل کی توقع ہی کیا ہوسکتی ہے؟

چوتھا قول: خلفاء راشدین یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ، یہ قول اس لئے بھی قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس کی نہ تو قرآنِ مجید کی کسی آیت سے تائید وتصدیق ہوتی ہے اور نہ ہی سنت وحدیث سے اس کے بارے میں کوئی ثبوت ملتا ہے کہ جس پر یقینی طور پر اعتماد کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آیت میں مذکورہ حکم کے بارے میں دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک سے مختص ہے اور دوسری یہ کہ ہر دور کے لئے ہے یعنی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے بعد کے زمانوں کے لئے بھی ہے، اگر پہلی صورت مقصود ہو تو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس

زمانہ کے لوگوں بالخصوص صحابۂ کرام کو اس سلسلہ میں بخوبی معلوم ہوتا کہ یہی چار حضرات آیت میں مقصود قرار دیئے گئے ہیں جبکہ حدیث وتاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا اور ان کے بارے میں کوئی خاص دلیل نہیں ملتی، اور اگر دوسری صورت مقصود ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان چار حضرات کی زندگیوں کے بعد آیت کا حکم ختم ہو جائے اور ان کے بعد آیت میں مذکور حکم بے معنی ہو جائے، اگر ایسا ہی مقصود تھا تو ضروری تھا کہ آیت میں اس کا تذکرہ کر دیا جاتا جبکہ ایسا نہیں ہوا، حالانکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ تمام احکام جو مخصوص دور کے لئے تھے اور ان کا تعلق زمانۂ نزول ہی تک محدود تھا ان کے بیان میں اس کا اشاراتی حوالہ موجود تھا جیسے وہ احکام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ومختص تھے، مگر اس طرح کا اشاراتی حوالہ زیر نظر آیت مبارکہ میں موجود نہیں۔

پانچواں قول: اربابِ اقتدار وحکمران طبقہ، اس قول کے قائل نے جب دیکھا کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی ایسے مخصوص گروہ کا ثبوت نہیں پایا جاتا جنہیں اس معنیٰ میں اہل حل وعقد اور ارباب اقتدار واختیار کہا جائے جو تمدن یافتہ اقوام ہیں ان کے معاشروں پر حکمران طبقہ کہلاتا ہے مثلاً وزراء پر مشتمل کابینہ اور لوگوں کی منتخب کردہ پارلیمنٹ وغیرہ، اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں امت اسلامیہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے علاوہ کسی چیز کو اپنے معاشرتی نظام میں داخل نہیں کرتی تھی بلکہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا فرمان نافذ العمل ہوتا تھا، لہٰذا اس قائل کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا کہ وہ ''اولی الامر'' کی تفسیر میں اس سے اہل شوریٰ والے صحابہ اور بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہنے والے حضرات مراد لے، بہر حال خواہ وہ اس سے اہل حل وعقد وارباب اقتدار مراد لے یا شوریٰ والے صحابہ مراد لے دونوں صورتوں میں اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مؤمنین ومنافقین جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بھی مشاورت میں شامل رکھتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنگ اُحد کے دن ان لوگوں کو مشاورت میں شامل کرنا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف رجوع کرنے اور اپنے امور میں ان سے ہدایت حاصل کرنے کا حکم دے، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ایسے افراد میں وہ شخص بھی شامل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفاء کے ادوار میں ان لوگوں میں شامل تھا جن سے مشاورت کی جاتی تھی یعنی عبدالرحمان بن عوف، اور یہ آیات مبارکہ کہ جن میں ضعیف الایمان افراد کی ان کے ان اعمال کے حوالہ سے مذمت مذکور ہے جن کا اُنہوں نے ارتکاب کیا ان میں سرفہرست وہ یعنی عبدالرحمان بن عوف اور اس کے ساتھی شامل ہیں چنانچہ انہی کے بارے میں ارشاد ہوا: ''اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا...... '' کہ اس سلسلہ میں منقول صحیح روایت کے مطابق اس سے مراد عبدالرحمان بن عوف اور اس کے ساتھی ہیں، جیسا کہ نسائی نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں اسے صحیح روایات میں سے شمار کر کے ذکر کیا ہے اور طبری و دیگر مفسرین نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ یہ آیت بن عوف اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ جنہوں نے فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلاف ورزی کی، یہ روایت سابقہ روایات کی بحث میں ذکر ہو چکی ہے، جب صورتحال ایسی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آیت میں اس طرح کے لوگوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور مؤمنین سے کہا گیا ہو کہ بن عوف جیسے

افراد کو اولی الامر تسلیم کر کے اپنے امور ان کی طرف لوٹائیں اور ان سے اسلامی حکم دریافت کریں؟

بہر حال آیۂ مبارکہ: ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' کی تفسیر میں ہم نے جس قول کو قرین صحت قرار دے کر دوسرے اقوال و آراء پر اسے ترجیح دی وہی متعین قرار پاتا ہے۔

رحمت الٰہی کا نتیجہ

''وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا''

(اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور شیطان کی پیروی کرتے سوائے چند افراد کے)

اس آیت کے بارے میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کا واضح اشارہ جنگ بدر صغریٰ کی طرف ہے کہ جس میں ابو سفیان نے نعیم بن مسعود اشجعی کو مدینہ بھیجا تا کہ وہاں جا کر افواہیں پھیلائے تا کہ لوگوں میں خوف و دہشت پیدا ہو اور انہیں جنگ کے لئے میدان کو نکلنے سے باز رکھا جاسکے، لہٰذا یہاں شیطان کی پیروی کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی پھیلائی ہوئی افواہوں کو سچ مانا جائے اور اس کی وجہ سے جنگ کے لئے میدان کو نہ جایا جائے۔

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' سے جو استثناء ہوا ہے اس کا معنٰی کسی مزید توجیہ و تاویل کے بغیر ہی سمجھ میں آتا ہے کیونکہ ابو سفیان کے بھیجے ہوئے جاسوس نعیم بن مسعود نے لوگوں میں افواہیں پھیلا دی تھیں کہ ابو سفیان نے بہت بڑا لشکر اکٹھا کر لیا ہے اور آمادہ باش فوج تیار کر چکا ہے لہٰذا اس سے بچ کر رہو اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں نہ دو ورنہ تم سب ہی مارے جاؤ گے، چنانچہ ان افواہوں نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا اور وہ خوفزدہ ہو گئے لہٰذا انہوں نے بدر کی جنگ میں بہانے تراشنے شروع کر دیئے سوائے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ بعض مخلص مؤمنین کے، بنابرایں جملہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' سے یہی مراد ہے، اور اس کا تائیدی ثبوت اسی سے ملتا ہے کہ اکثر لوگ بہانے تراش کر میدان سے منہ موڑ گئے سوائے چند افراد کے، پھر کئی لوگ ان چند افراد کے ساتھ ہو گئے اور میدان کو نکل پڑے۔

تو یہ وہ معنٰی ہے جو ہم نے جملہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' کی بابت ذکر کیا ہے کہ یہی معنٰی قرین صحت اور ان قرائن و اشاراتی دلائل سے ثابت ہوتا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کئے جا چکے ہیں، لہٰذا اس حوالہ سے مزید کسی اضافی بیان و تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مفسرین کے مختلف اقوال و آراء

آیۂ مبارکہ کے جملہ استثنائیہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' کہ جو ''وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ'' کے بعد ذکر ہوا ہے، کے

بارے میں مفسرین حضرات نے مختلف آراء پیش کی ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو قرین صحت ہو بلکہ نادرستی یا اضافی عبارتوں کو شامل کرنے کئے بغیر سمجھ میں نہ آنے کی حامل ہیں۔

پہلی رائے: آیت میں فضل و رحمت سے مراد وہی سلسلۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا کہ جس میں اس کی اطاعت، اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے، اور ''اِلَّا قَلِیۡلًا'' میں جن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ان سے مراد مؤمنین، فطرت سلیمہ اور پاک دل والے افراد ہیں، اس لحاظ سے آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے تمہیں جس کی ہدایت فرمائی ہے یعنی اطاعت کا واجب ولازم ہونا اور اس کی بابت رسول اور اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کا حکم، تو تم سب شیطان کی پیروی کر کے گمراہی کی وادی میں گر جاتے سوائے تم میں سے چند افراد کے، کہ جو فطرت سلیمہ والے ہیں کہ وہ حق و نیکی کی راہ سے ہرگز ہٹ نہیں سکتے۔

جواب: اس رائے پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کو ایک خاص حکم کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جو کہ بلا دلیل ہے اور یہ بات قرآنی طرزِ بیان سے قطعی طور پر بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کو ایک مورد سے مخصوص و محدود کرے، اس کے علاوہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ظاہر الآیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ فضل و رحمت کے اس احسان کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس نے پہلے کیا ہے۔

دوسری رائے: آیۂ مبارکہ سے اس کے ظاہری معانی ہی مقصود ہیں، اور مراد یہ ہے کہ جو مؤمنین مخلصین نہیں اُنہیں اضافی فضل و رحمت کی ضرورت ہے اگرچہ مخلصین بھی خدائی عنایت سے بے نیاز نہیں۔

جواب: یہ رائے صحیح نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا کہ ظاہر الآیۃ سے غیر مخلصین مقصود ہوتے کہ وہی فضل و رحمت کے محتاج ہیں آیت اس طرح کے توھم کو رد کر دیتی جو کہ بلاغت قرآن کا تقاضہ ہے جبکہ آیت میں ایسا نہیں ہوا، جیسا کہ درج ذیل آیتوں میں مشہود ہے:

- سورۂ نور، آیت: ۲۱

''وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَازَکٰی مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا''

(اور اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا)

اس آیت میں عمومی طور پر تمام بندوں کو فضل و رحمت کا محتاج ذکر کیا گیا ہے۔

اور آنحضرت ﷺ سے جو کہ تمام مخلوق سے افضل اور خیر الناس ہیں مخاطب ہو کر یوں ارشاد فرمایا:

- سورۂ اسراء، آیت: ۷۵

''وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡئًا قَلِیۡلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ''

(اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ بناتے تو نزدیک تھا کہ آپ ان کی طرف کچھ جھکاؤ کریں (ان سے دوستی کرلیں)

اس صورت میں ہم آپ کو زندگی و موت دونوں میں (دگنا عذاب چکھاتے)۔

تیسری رائے:۔ فضل و رحمت سے مراد قرآنِ مجید اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہے۔

چوتھی رائے:۔ فضل و رحمت سے مراد فتح و کامیابی ہے، لہٰذا جو استثناء ذکر ہوا ہے (اِلَّا قَلِیۡلًا) وہ درست قرار پاتا ہے کیونکہ اکثریت اس لئے حق پر ثابت قدم رہتی ہے کہ ان کا مقصود خود حق نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد فتح و کامیابی جیسی ظاہری عنایاتِ خداوندی ہوتا ہے اور وہ حق کی راہ میں آنے والی سختیوں و دشواریوں پر صبر نہیں کرتے سوائے معدودے چند افراد کے کہ جو بابصیرت مؤمنین ہیں۔

پانچویں رائے: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں استثناء (اِلَّا قَلِیۡلًا) کا جملہ "لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّیۡطٰنَ" سے تعلق نہیں بلکہ جملہ "اَذَاعُوۡابِهٖ" سے ہے۔

چھٹی رائے: یہاں استثناء کا تعلق جملہ "الَّذِیۡنَ یَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ" سے ہے۔

ساتویں رائے: استثناء لفظوں میں ہے جو کہ جمع مراد ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا: اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتی تو تم سب شیطان کی پیروی کرتے، یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے سورۂ اعلیٰ، آیت ۷ میں اس طرح ارشاد ہوا: "سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ۙ اِلَّا مَاشَآءَاللّٰهُ" ہم آپ پر اس کی قرائت کریں گے کہ آپ نہ بھلا پائیں گے مگر جو اللہ کی مشیت ہو) تو "اِلَّا مَاشَآءَاللّٰهُ" سے جو استثناء ہوا ہے وہ نہ بھولنے کے عمومی حکم سے آگاہی دلاتا ہے۔

یہ تمام آراء ظاہر بظاہر بیانی تکلف سے خالی نہیں۔

قتال فی سبیل اللہ کا حکم

○ "فَقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ"

(پس اللہ کی راہ میں قتال کرو آپ پر اپنی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور مؤمنین کو قتال پر آمادہ کریں)

لفظ "تکلیف" جو کہ "تکلف" کا مصدر ہے وہ لفظ "کلفة" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ مشقت ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حکم دے کر مکلف پر مشقت مسلط کر دی جاتی ہے۔

لفظ "تنکیل"، "نکال" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے وہ سزا ہے جو کسی نافرمان کو

اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ اور دیگر مکلفین اس جیسی نافرمانی کے دوبارہ مرتکب نہ ہوں۔

جملہ ''فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ''میں حرف فاء تفریع کے لئے ہے، اس میں قتال کے حکم کو سابقہ آیات سے حاصل ہونے والے مطالب کی فرع کے طور پر ذکر کیا گیا ہے یعنی وہ لوگ دشمن کے مقابلے میں جنگ کرنے کے لئے میدان میں نکلنے کو گراں سمجھتے تھے اور اس کی بابت کوتاہی و عدم توجہی و بے رغبتی سے کام لیتے تھے۔ خداوند عالم نے آنحضرت ﷺ کو فرمان جاری کیا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرو، چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد یہ الفاظ مذکور ہیں: ''لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ'' (آپ پر صرف اپنی ذمہ داری عائد ہے)، اس بناء پر آیت کا معنیٰ یہ ہوگا، جب لوگ جہاد کے بارے میں سستی و کوتاہی سے کام لیتے ہیں اور قتال کے لئے میدان کو جانا پسند نہیں کرتے تو آپ اے اللہ کے رسول! خود قتال کو نکلیں اور آپ پر ان کا سستی و کوتاہی سے کام لینا اور خدا کے حکم کی نافرمانی کرنا گراں نہ گزرے کیونکہ کسی کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی اور جو فریضہ دوسروں پر عائد ہوتا ہے اس کا آپ سے تعلق نہیں۔ آپ پر صرف وہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، ہاں، آپ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ انہیں قتال کی ترغیب دلائیں اور خود قتال کر کے مؤمنین کو اس پر آمادہ کریں کہ شاید خداوند عالم کافروں کا شر اور خطرہ دور کر دے۔

جملہ ''لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ اپنے عمل کے علاوہ کسی چیز کے مکلّف نہیں یعنی اس کے علاوہ آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، بنا برایں ''اِلَّا نَفْسَكَ'' میں جو استثناء ذکر ہوا ہے اس سے فہم المعنی کے لئے مضاف تصور میں لانا ہوگا اور جملہ کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا: لا تكلف انت شيئًا الا عمل نفسك (آپ پر سوائے اپنے آپ کے کسی کے عمل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی)

جملہ ''عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ......''میں لفظ ''عسیٰ'' کے بارے میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ امید کے معنی پر دلالت کرتا ہے، خواہ اس امید کا تعلق متکلم سے ہو یا مخاطب سے ہو یا مقام تخاطب سے ہو، لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ حرف ''عسیٰ'' خداوند عالم کے حوالہ سے حتم ویقین کا معنیٰ رکھتا ہے کہ یہاں حتمی و یقینی صورت ملحوظ و مقصود ہے، بلکہ اس سے اس کا عمومی معنیٰ ہی مراد ہوگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو مورد سرزنش قرار دیئے جانے کا ثبوت ملتا ہے جو قتال فی سبیل اللہ کے لئے میدانِ جنگ کو جانے میں سستی و بے توجہی سے کام لیتے تھے، چنانچہ اس حوالہ سے جب ان کی طرف سے نہایت بے توجہی و نافرمانی کا مظاہرہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ خود قتال کریں اور ان لوگوں کی پرواہ نہ کریں بلکہ اُنہیں اس سلسلہ میں اصرار ہی نہ کریں اور انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیں، ان لوگوں کی بے رغبتی سے دل برداشتہ بھی نہ ہوں کہ آپ پر صرف اپنی ذمہ داری پوری کرنی لازم ہے اور آپ پر اُنہیں اللہ کا حکم پہنچا دینا کافی ہے خواہ کوئی اطاعت کرے یا نافرمانی کرے۔

روایات پر ایک نظر

کافی کی دو روایتیں

(۱) کتاب اصول کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے محمد بن عجلان کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، آپؑ نے ارشاد فرمایا: ان الله عیّر اقواما بالاذاعة فی قوله عزّوجل: ''وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ'' فایاکم والاذاعة، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو افواہیں پھیلانے پر مورد سرزنش قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: (جب ان کے پاس امن یا خوف میں سے کوئی حکم آتا ہے تو وہ اس کی بابت افواہیں پھیلاتے ہیں لہٰذا تم افواہیں پھیلانے سے اجتناب کرو (اصول کافی جلد اول، صفحہ ۳۶۹)

(۲) عبدالحمید بن ابی دیلم سے مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اللہ نے آیہ مبارکہ ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' اور جملہ ''وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ'' کے ذریعے لوگوں کے امور کو ان کے اولی الامر کی طرف لوٹایا ہے اس میں وہ اولی الامر مراد ہیں جن کی اطاعت کرنا ان پر واجب قرار دیا (اصول کافی، جلد اول صفحہ ۲۹۵)

اس روایت سے ہمارے اس مؤقف کی تائید ہوتی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ دوسری آیت میں اولی الامر سے مراد وہی حضرات ہیں جو پہلی آیت میں مقصود ہیں۔

آئمہ اہل بیتؑ کے بارے میں واضح بیان

تفسیر العیاشی میں عبداللہ ابن عجلان سے روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: آیہ مبارکہ ''وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ'' میں اولوا الامر سے مراد آئمہؑ ہیں (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۶۰)

اسی مطلب پر مشتمل ایک روایت عبداللہ بن جندب سے منقول ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے واقفی مذہب کے بارے میں اپنے خط میں اولی الامر کے بارے میں ان سے آئمہ اہل بیتؑ مراد ہونے کا تذکرہ فرمایا، اور اسی مطلب کو شیخ مفید نے اپنی کتاب ''الاختصاص'' میں اسحاق بن عمار کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

فضل ورحمت کے مصداقی معانی

محمد بن فضیل سے منقول ہے کہ حضرت امام ابوالحسنؑ نے آیۂ مبارکہ "وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس میں "فضل" سے مراد حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور "رحمت" سے مراد حضرت امیر المومنینؑ ہیں (الفضل رسول اللہ (ص) ورحمتہ، امیر المؤمنین) (ملاحظہ ہو، تفسیر العیاشی، جلد اوّل ص ۲۶۱)

اسی تفسیر میں دیگر روایتیں بھی مذکور ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱) زرارہ سے روایت منقول ہے کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: آیۂ مبارکہ "لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ" میں "فضل" سے مراد حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر ہے اور خدا کی رحمت سے مراد آئمہ اہل بیتؑ کی ولایت ہے۔

(۲) محمد بن فضیل سے مروی ہے کہ عبد صالح حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ نے ارشاد فرمایا: الرحمۃ رسول اللہ (ص) والفضل علی بن ابی طالب (ع)، رحمت سے مراد حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فضل سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۶۰)

یہاں یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا روایات میں فضل ورحمت کے حوالہ سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ مصداق پر منطبق کرنے سے عبارت ہے کہ جسے علمی زبان میں "جریؑ" کہا جاتا ہے۔ اوران سے نبوت وامامت مراد لینا اس مناسبت سے ہے کہ وہ دونوں ایسے متصل و باہم پیوستہ اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ضلالت وگمراہی کے گہرے کھڈ میں گرنے اور شیطان کی چالوں کا شکار ہونے سے بچالیا ہے، ان میں ایک تبلیغی سبب جبکہ دوسرا تنفیذی سبب ہے، اور آخری روایت (جس کے راوی محمد بن فضیل بحوالہ امام موسیٰ کاظمؑ ہیں) آیت سے مطابقت کے حوالہ سے زیادہ موزوں وقرین صحت لگتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی مقدس کتاب میں رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر عالمین کے لئے رحمت بنا کر) (سورۂ انبیاء، آیت: ۱۰۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخصوص ذمہ داری

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے علی بن حدید کے حوالہ سے مرازم کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: "ان اللہ کلّف رسول اللہ (ص) ما لم یکلّف بہ احدًا من خلقہ، ثم کلّفہٗ ان یخرج علی الناس کلھم وحدہ بنفسہ وان لم یجد فئۃ تقاتل معہٗ، ولم یکلّف ھذا احداً من خلقہ لا قبلہٗ ولا بعدہٗ" اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عائد فرمائی وہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر عائد نہیں کی، پھر انہیں اس پر مکلف فرمایا کہ تمام لوگوں کے سامنے اکیلے میدان کو جائیں خواہ کوئی گروہ ان

کے ساتھ جا کر قتال کرنے کے لئے موجود نہ بھی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس طرح کا حکم اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا، نہ آپ سے پہلے اور نہ ہی آپ کے بعد! اس کے بعد امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ'' (اور آپ اللہ کی راہ میں قتال کریں، اپنے سوا کسی کو مکلّف نہ کریں) پھر امامؑ نے فرمایا: **وجعل الله لهٗ ان یأخذ ما أخذ لنفسہٖ فقال عزّوجل:** ''مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا''، **وجعل الصلاۃ علی رسول الله (ص) بعشر حسنات**، اور اللہ تعالیٰ نے اس مخصوص ذمہ داری کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وہی کچھ مخصوص فرمایا جو اپنے لئے مخصوص کیا کہ وہ مال غنیمت میں سے جو اللہ کا حق ہے وہ اسے لے لیں، اور ارشاد ہوا: جو شخص ایک نیکی لے آئے اس کے لئے دس نیکیاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات کو دس نیکیوں کے برابر قرار دیا۔

(کتاب کافی، جلد ۸ صفحہ ۲۷۴)

امام علیؑ نے قیام کیوں نہ کیا؟

سلیمان بن خالد سے روایت مذکور ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کی کہ لوگوں کے اس سوال کا کیا جواب ہے کہ اگر امام علیؑ حق پر تھے تو پھر اپنا حق لینے کے لئے قیام کیوں نہ کیا؟ تو امامؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس طرح قیام کرنے کا حکم صرف حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا ان کے علاوہ کسی انسان کو یہ حکم نہیں دیا، اسی لئے خدا نے ارشاد فرمایا: ''فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ'' (اے میرے نبی! آپ اللہ کی راہ میں قتال کریں، آپ پر اپنے سوا کسی کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی مؤمنین کو قتال کی ترغیب دلائیں) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے لئے یوں فرمایا: ''**الا متحرفًا لقتال أو متحیّزًا الیٰ فئة**'' (سوائے اس کے کہ کوئی شخص قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو یا لشکر سازی کے لئے گروہ تشکیل دینے کی غرض سے قتال نہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے)۔ تو اس وقت کوئی گروہ یا لشکر ایسا موجود نہ تھا جو امام علیؑ کی معاونت کرتا، لہٰذا انہوں نے قیام نہ فرمایا (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۶۱)

ایک روایت زید بن شحام سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: **ماسئل رسول الله (ص) شیئًا قط فقال: لا**، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی کچھ مانگا گیا اور آپؐ نے نہ میں جواب دیا ہو، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ ہوتا تو اسے عطا فرما دیتے اور اگر اس وقت موجود نہ ہوتا تو یوں فرماتے: ان شاء اللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی سے اس کی برائی کا بدلہ نہیں لیا، اور جب آیہ مبارکہ: ''فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ'' نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر لشکر کا اپنی سربراہی میں سامنا کیا۔ (بحوالہ تفسیر العیاشی، مذکورہ بالا)

اس مطلب پر دیگر متعدد روایات موجود ہیں۔

آیات ۸۵ تا ۹۱

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۗ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۗ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۗ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

ترجمہ

○ ''جو شخص اچھی شفاعت کرے تو اس کا بھی اس سے حصہ ہوگا اور جو شخص بری شفاعت کرے تو اس کا بھی اس سے حصہ ہوگا، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔''

(۸۵)

○ ''اور جب تمہیں کوئی سلام وتحیت کی جائے تو تم اس کے جواب میں اس سے بہتر یا اس جیسا سلام وتحیت کرو، یقیناً اللہ ہر شے کا حساب کرنے والا ہے۔''

(۸۶)

○ ''اللہ، کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، وہ ضرور تمہیں قیامت کے دن اکٹھا کرے گا کہ جس میں کوئی شک نہیں، اور اللہ سے زیادہ سچ بات کرنے والا کون ہے۔''

(۸۷)

○ ''تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کی بابت دو گروہوں میں بٹ گئے ہو جبکہ اللہ نے انہیں ان کے کئے کی وجہ سے سرگرداں کر دیا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کی راہ پر لاؤ جسے اللہ نے اس کی گمراہی میں چھوڑ دیا ہے، اور اللہ جسے گمراہی میں چھوڑ دے تو آپ اس کے لئے کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔''

(۸۸)

○ ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کفر اختیار کرو جس طرح اُنہوں نے کفر اختیار کیا ہے کہ پھر تم ان کے برابر ہو جاؤ، پس تم اس وقت تک ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں، اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑ لو اور جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار قرار نہ دو۔''

(۸۹)

○ ''سوائے ان لوگوں کے کہ جو اس قوم سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان میثاق و معاہدہ ہو چکا ہو، یا وہ تمہارے پاس آئیں جبکہ وہ تم سے یا اپنی ہی قوم سے جنگ کرنے سے اکتا گئے ہوں ___ یا ناتوان ہوں ___ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا کہ پھر وہ تم سے نبرد آزما ہو جاتے، لیکن اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار کریں اور تم سے جنگ نہ کریں بلکہ صلح کی پیشکش کریں تو پھر اللہ نے تمہارے لیے اُن پر کوئی راہ قرار نہیں دی۔''

(۹۰)

○ ''تم عنقریب دوسرے کچھ لوگوں کو پاؤ گے جو تمہارے ساتھ امن و امان قائم رکھنے کے خواہاں ہیں اور اپنی قوم سے بھی امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، وہ جب بھی فتنہ و فساد کی طرف کھینچے گئے تو اس میں اوندھے گر گئے، پس اگر وہ تم سے نہ تو کنارہ کشی کریں اور نہ صلح کی بات کریں اور نہ یہ لڑائی کرنے سے باز آئیں تو پھر انہیں پکڑ لو اور جہاں بھی تمہارے قابو میں آئیں تو انہیں قتل کر دو، ایسے ہی لوگوں پر ہم نے تمہارے لئے واضح غلبہ عطا کیا ہے۔''

(۹۱)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ، اپنی ماقبل آیات سے مربوط و پیوستہ ہیں، کیونکہ ان تمام سات آیات (۸۵ تا ۹۱) میں مشرکین کے ایک گروہ سے جو کہ ان میں سے منافق تھے، قتال کرنے کا حکم مذکور ہے، ان آیات میں اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے مؤمنین کے سامنے ایمان لانے کا اظہار کیا پھر اپنی جگہوں کو پلٹ گئے اور مشرکین کے ساتھ ان کے شرک میں شریک ہو گئے، تو ان سے قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا، کچھ لوگ کہنے لگے کہ ان سے جنگ کی جائے جبکہ کچھ لوگ اس سے متفق نہیں تھے بلکہ ان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہوئے ان کی طرفداری کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمان جاری فرمایا کہ یا تو وہ ہجرت کریں یا قتال کریں، اور مؤمنین کو ان کی سفارش و طرفداری اور ان کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کرنے سے منع کیا، ان کے علاوہ دیگر افراد کے بارے میں کہ جو ان سے ملحق ہوئے ان آیات میں ارشاد ہوا کہ یا تو وہ ہتھیار ڈال دیں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور ان آیات میں ان مقاصد کو سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جو شفاعت و سفارش کے حوالہ سے ملحوظ ہیں اور پھر دوسری آیت میں تحیہ و سلام سے مربوط حکم مذکور ہے۔

شفاعت کا جامع اصول

○ ''مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا.........الخ''

(جو شخص اچھی شفاعت کرے تو اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا.......)

عربی زبان میں لفظ ''نصیب'' اور ''کفل'' کا ایک ہی معنیٰ ہے، اور شفاعت چونکہ ایک طرح کی وساطت ہے جس کا مقصد کسی نقص و خامی کی درستگی یا کسی فائدہ و امتیاز کا حصول وغیرہ ہوتا ہے لہٰذا اس میں کسی ایسے مسئلہ کی اصلاح میں سبب قرار پانے کا حوالہ پایا جاتا ہے جس سے مربوط نتیجہ یعنی جزا و سزا کا تعین ہوتا ہے کہ جس کے لئے شفاعت کا قانون تشکیل دیا گیا

ہے، اس بناء پر شفیع (شفاعت کرنے والا) اور مشفوع لہٗ (جس کی شفاعت کی گئی) دونوں اس نتیجہ میں شریک قرار پاتے ہیں کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہوتا ہے۔ اب وہ نتیجہ خیر ہو یا شر، اس میں کوئی فرق نہیں، اسی وجہ سے آیۂ مبارکہ میں دونوں کا تذکرہ ہوا اور یوں ارشاد ہوا: ''مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا'' (جو شخص اچھی شفاعت کرے تو اس کے لئے اس میں سے حصہ ہے اور جو شخص بری شفاعت کرے تو اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا)۔ اس میں نتیجہ کے دونوں پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

اس حقیقت کے بیان میں مؤمنین کے لئے بیدار باش کا ناصحانہ پیغام بھی ہے اور خبردار اور متوجہ رہنے کا اشارہ بھی ہے کہ شفاعت کرتے وقت اس کے نتیجہ سے آگاہ رہیں کہ کس کی شفاعت کر رہے ہیں، اور اگر اس میں شر و فساد ہو تو اس سے اجتناب کریں مثلاً مشرکین میں سے منافقین کے لئے انہیں قتال سے باز رکھنے کی بابت شفاعت کرنا وغیرہ، کیونکہ فتنہ و فساد کو خواہ کم ہی ہو اس کے حال پر چھوڑ دینا اور اس کے مزید بڑھنے اور بڑے فساد میں بدل جانے کی حالت کو دیکھ کر سستی و بے پرواہی سے کام لینا خود ایک برائی و فساد ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی اور نہ ہی اس پر قابو پانا آسان ہوتا ہے بلکہ وہ حرث و نسل اور ملکوں و نسلوں کی تباہی کا سبب بنتا ہے اسی وجہ سے آیۂ مبارکہ میں بُری شفاعت کرنے سے منع کیا گیا ہے جو کہ ظالموں، سرکشوں، منافقوں، مشرکوں کے لئے شفاعت کرنے سے عبارت ہے کہ وہ زمین میں فساد پھیلانے والے ہیں۔

تحیہ و سلام کا عمومی ضابطہ

○ ''وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ ....''

(اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر سلام کرو........)

اس جملے میں سلام کا جواب دینے کے بارے میں حکم مذکور ہے کہ جب تم پر سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر یا اس جیسا سلام کرو، یہ عمومی ضابطہ ہے، اس میں ہر سلام کا اس سے اچھا یا اس جیسا سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ آیات میں مسلمانوں کو صلح و مصالحت کی پیشکش ملحوظ ہے کہ اس میں وہ اچھے انداز سے اپنا عملی مؤقف ظاہر کریں۔ چنانچہ بعد والی آیات اس مقصد کو ثابت کرتی ہیں۔

قیامت کے دن کی یاد

○ ''اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ.........''

(اللہ کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تمہیں اکٹھا کرے گا.........)

آیت کا معنیٰ واضح ہے، اور یہ آیت سابقہ دو آیتوں میں مذکور مطالب کی وجہ وسبب کے بیان پر مشتمل ہے، گویا یوں کہا جارہا ہے: اللہ نے شفاعت کے حوالہ سے جو حکم تمہیں دیا ہے اس پر عمل کرو خواہ اچھی شفاعت ہو یا بری شفاعت (دونوں میں اللہ کے فرمان کو ملحوظ رکھو) اور جو شخص تم پر سلام کرے اسے نفی میں جواب دے کر یا اس سے منہ پھیر کر باطل و بے اثر نہ کرو کیونکہ تمہارے آگے ایک دن آنے والے ہے جب اللہ تمہیں اکٹھا کرے گا اور اس دن اللہ تمہارے اعمال کا حساب کرے گا کہ اگر تم نے اس کے حکم کی فرمانبرداری کی یا نافرمانی کی اس کے مطابق جزا وسزا مقرر کرے گا۔

منافقین کے بارے میں واضح مؤقف!

○ ''فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ''
(تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو جبکہ اللہ نے انہیں ٹھکرا دیا ہے.......)

لفظ ''فئة'' کا معنیٰ گروہ ہے۔

''ارکاس'' (اَرْكَسَهُمْ) کا معنیٰ ٹھکرانا ہے۔

یہ آیت سابقہ آیت ''مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً.......'' سے مربوط اور اس کی فرع ہے کہ جس میں اصل حکم کی تمہید ومقدمہ مذکور ہے، لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہے: جب بری شفاعت میں، شفاعت کرنے والا بھی اس برائی میں شریک قرار پاتا ہے تو اے ایمان والو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقین کے حوالہ سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہو اور دو جماعتوں میں بٹ گئے ہو کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ان سے قتال کیا جائے جبکہ دوسرا گروہ ان کی شفاعت کرتا ہے اور ان سے قتال نہ کرنے کی ترغیب دلاتا ہے کیا دوسرا گروہ منافقین کے مضبوط ہونے سے ان کے شر اور فتنہ وفساد کے پھیلنے کی بابت چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور ان کے تقویت پانے میں انہیں ان کے سابقہ گناہوں کی راہ پر دوبارہ لانا چاہتا ہے جبکہ اللہ نے ان کے برے اعمال کی سزا کے طور پر انہیں ان کی گمراہی کی طرف لوٹا دیا ہے حالانکہ وہ اس گمراہی سے باہر نکل آئے تھے، تو کیا تم لوگ شفاعت کر کے ان لوگوں کی ہدایت کے خواہاں ہو جنہیں اللہ نے گمراہی کی سزا سے دوچار کر دیا ہے؟ جسے اللہ گمراہی سے دوچار کرے اسے ہدایت کی راہ پر کوئی بھی نہیں لاسکتا۔

جملہ ''وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا'' (اور جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے تو آپ اس کے لئے کوئی راستہ نہیں

پا سکتے) میں عام مؤمنین سے جاری خطاب کا رُخ حضرت رسول اللہ ﷺ کی طرف کر دیا گیا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ مؤمنین جو منافقین کی شفاعت کرتے ہیں وہ حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ اگر وہ اصل حقیقت سے آگاہی رکھتے تو ہرگز ان کی شفاعت نہ کرتے، لہٰذا اللہ نے اُن سے اپنے خطاب کا رُخ موڑ کر اس ہستی کو مخاطب کیا جسے اصل حقیقت کا علم ہے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ رسولِ خدا ﷺ!

کافروں کی باطل تمنا

○ ''وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَآءً.........''

(وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم کفر اختیار کرو جس طرح اُنہوں نے کفر اختیار کیا کہ پھر تم سب برابر ہو جاؤ.......)

یہ آیت سابقہ جملہ ''وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ'' کی وضاحت کے طور پر ہے، اس بناء پر اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اُس پر مزید یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کفر اختیار کرو تا کہ تم ان جیسے ہو جاؤ۔

پھر اللہ نے مسلمانوں کو کافروں سے راہ و رسم رکھنے اور دوستی قائم کرنے کی ممانعت کی اور اگر وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں (اللہ کے راستہ پر آئیں) تو ان سے دوستانہ تعلق رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر وہ روگردانی کریں تو ان پر قابو پا کر جہاں بھی ہوں انہیں قتل کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں اور ان سے دوستی کرنے اور ان کی مدد کرنے سے ہر صورت میں اجتناب کریں، چنانچہ آیت میں جملہ ''فَاِنْ تَوَلَّوْا'' سے ثابت ہوتا ہے کہ مؤمنین پر لازم ہے کہ وہ انہیں ہجرت کرنے پر بھرپور آمادہ کریں کہ اگر وہ مثبت جواب دیں تو ان سے دوستی قائم رکھیں اور اگر انکار کریں تو ان کو قتل کر دیں۔

ایک استثنائی حکم

○ ''اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ''

(سوائے ان لوگوں کے، کہ جس قوم سے تمہارے اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہو یا وہ تمہارے پاس آئیں کہ

ان کے دل تنگ ہوں)

اس آیۂ مبارکہ میں اس حکم سے استثناء مذکور ہے جو جملہ ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ'' میں صادر ہوا، کہ اس میں مشرکوں کو گرفتار کرنے اور انہیں قتل کرنے کے عمومی حکم سے دو قسم کے لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے: (۱) وہ لوگ کہ جن کے ساتھ ان لوگوں کا عہد و پیمان (معاہدہ) ہے جو مسلمانوں سے صلح کے رابطے میں ہیں کہ وہ لوگ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں، یعنی ان مشرکوں اور کسی قوم کے درمیان معاہدہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی پر حملہ ہوا تو دوسرے اس کی مدد کریں گے، (۲) وہ مشرکین جو مسلمانوں سے جنگ کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ نہ تو انہیں جنگ کرنے کی توان حاصل ہے اور نہ ہی اپنی قوم سے نبرد آزما ہونے کی طاقت رکھتے ہیں یا اس کے علاوہ دیگر عوامل و اسباب کے نتیجہ میں جنگ کرنے سے باز رہتے ہیں اور کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے مؤمنین سے صلح کی راہ پر رہنے کا اظہار کرتے ہیں، کہ وہ نہ تو مؤمنین کے ساتھ ہیں اور نہ ان کے خلاف ہیں، تو یہ دو طرح کے افراد اس عمومی حکم سے مستثنیٰ ہیں، اور جملہ ''حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کے دل مسلمانوں سے جنگ کرنے کی بابت تنگی کا شکار ہیں یعنی وہ اس کی طرف رغبت ہی نہیں رکھتے۔

اور جملہ ''سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ'' سے مؤمنین کو مطلع کیا گیا ہے کہ عنقریب کچھ لوگ ان سے ملحق ہوں گے، جو مذکورہ بالا مستثنیٰ لوگوں میں سے دوسری قسم جیسے ہوں گے کیونکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ تمہیں اور اپنی قوم دونوں کو امن و امان سے بہرہ ور رکھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا کہ وہ لوگ منافق ہیں اور ان کے غیر جانبداری کے دعوے میں صداقت نہیں کہ جس کی بناء پر ان پر بھروسہ کیا جا سکے، اور ان کے وعدوں پر اعتماد کیا جائے، اسی وجہ سے ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں جو مثبت شرطیں ذکر کی گئی ہیں یعنی ''فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ'' (اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی پیشکش کریں) ان کو منفی شرطوں میں تبدیل کر دیا گیا اور یوں کہا گیا: ''فان لم يعتزلوكم ويلقوا اليكم السلم ويكفوا ايديهم'' (اگر وہ تم سے کنارہ کشی نہ کریں اور تمہارے ساتھ صلح کی بات نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں) تو اس میں مؤمنین کو متنبہ و خبردار کیا گیا کہ وہ ان لوگوں سے بچ کر رہیں اور ان کے دھوکہ میں نہ آئیں۔

اس طرح آیت کا معنیٰ واضح ہو جاتا ہے۔

''تحیت'' کی بابت ایک بحث

یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ ہر قوم و ملت کے افراد اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت و رسومات، ترقی و پسماندگی اور عادات و رواجوں کے مختلف ہونے کے باوجود معاشرتی میل جول میں تحیت و آداب کا عمل ضرور اپناتے ہیں اور ایک دوسرے سے

ملاقات میں مخصوص جذبات کا اظہار کرتے ہیں خواہ جس صورت میں کیوں نہ ہو یعنی سر ہلا کر، ہاتھ کے اشارہ سے، ٹوپی بلند کر کے، اور اس طرح کے دیگر طریقوں سے تحیت و آداب کا عمل انجام دیتے ہیں اور ان امور کے مختلف ہونے میں ان کے معاشرتی آداب و رسوم کے تعین کی بابت مؤثر عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے کہ ان کے مختلف ہونے کے نتیجہ میں تحیت و آداب کے طور طریقے بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ معاشروں میں رائج تحیت و آداب کے مختلف طریقوں پر غور کریں تو آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ ان سب میں ایک چیز قدر مشترک ہے اور وہ عبارت ہے انکساری، عاجزی اور خضوع و فروتنی کے اظہار سے، کہ جس طرح کوئی چھوٹا بڑے سے، کم مرتبہ عالی مرتبہ سے، غلام آقا سے، اطاعت کرنے والا اطاعت کئے جانے والے سے کرتا ہے، ان تمام طور طریقوں میں اچھی طرح غور کرنے سے اس کے پس منظر میں ایک طرح کے غلامانہ نظام کی عملداری کے اشارے ملتے ہیں کہ ابھی تک اقوامِ عالم اس سے دوچار ہیں اور ہر قوم و ملت میں زمانۂ جاہلیت کی مروجہ عادات اپنی مختلف صورتوں کے ساتھ گھر کر چکی ہیں کہ ان کی ابتداء اطاعت گزاری سے ہوتی ہے اور اس کا منتہیٰ اطاعت کئے جانے والے شخص تک ہوتا ہے، اس کا آغاز کم مرتبہ و کم درجہ شخص سے ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ عالی مرتبہ و بلند پایہ تک جاتا ہے، درحقیقت اس طرح کے طور طریقوں کا سرچشمہ وثنیت و بت پرستی اور استعماری نظام کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ جیسا کہ آپ خود اس سے آگاہ ہیں تو اس کی سب سے بڑی کوشش ہی یہ ہے کہ معاشرہ میں بُت پرستی و شخص پرستی اور وثنیت و غیر خدا کی پوجا کے تمام سلسلے جڑ سے اکھاڑ دیئے جائیں بلکہ ہر وہ رسم جس کا منتہیٰ بت پرستی ہو اور اس کی برگشت وثنیت کی طرف ہوتی ہو اس کا قلع قمع کر دیا جائے اس مقصد کے لئے اسلام نے ایک آسان، سیدھا اور نہایت موزوں راستہ اختیار کیا کہ جس سے ظالمانہ استعماری انداز اور غیر خدا کی پرستش کے تمام راستے بند ہو جائیں اور وہ ہے سلام کرنا، کہ جس میں سلام کرنے والے کی طرف سے اس شخص کے لئے کہ جسے سلام کیا جائے ایک طرح کا امن و سلامتی کا پیغام اور ہر طرح کے ظلم و زیادتی کی نفی کا اظہار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فطری آزادی کے تحفظ کی پاسداری کا عملی عہد بھی ہے کیونکہ انسانی معاشرہ کا سب سے پہلا اور بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کے تمام افراد ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ کو یقینی بنائیں کیونکہ تمام امور کی بازگشت انہی کی طرف ہے اور یہ سلام ہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر دو افراد کو ان کی باہمی ملاقات میں ضروری قرار دے کر بنی نوع انسان پر احسان فرمایا ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت کا خیال رکھتے ہیں، اس سلسلہ کی مربوطہ آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ نور، آیت: ۶۱

''فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً''

(تم جب گھروں میں آؤ تو ایک دوسرے کو سلام کرو جو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ برکت والی تحیت ہے)

○ سورۂ نور، آیت: ۲۷

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ''

(اے ایمان والو، اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک ان سے اُنسیت واپنائیت قائم نہ کرو اور ان گھر والوں کو سلام کرو کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم باخبر وآگاہ رہو)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ وہ مؤمنین کو سلام کہیں جبکہ آنحضرت ﷺ مؤمنین کے سردار وآقا ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ انعام، آیت: ۵۴

''وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ''

(اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں تو ان سے کہیں: تم پر سلام ہو، تمہارے پروردگار نے تم پر رحمت نازل کرنا اپنے اوپر لازم کرلیا ہے)۔

اس کے علاوہ دیگر افراد پر کہ جو مؤمن نہیں سلام کہنے کا حکم دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ زخرف، آیت: ۸۹

''فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ''

(ان سے درگزر کرو اور ان سے کہو، سلام کہ بہت جلد وہ آگاہ ہو جائیں گے)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ سلام کر کے تحیت کا عمل زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے درمیان رائج تھا چنانچہ اس کا ثبوت ان کے اشعار وغیرہ میں موجود ہے، لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں مرقوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں تحیت کی کئی صورتیں رائج تھیں، کبھی ایک دوسرے سے ملنے پر یوں کہتے تھے: ''انعم صباحًا'' اور کبھی کہتے تھے: ''ابیت اللعن'' اور کبھی کہتے تھے: ''سلام علیکم'' تو یہ تیسری قسم دراصل کہنے والے کی طرف سے باہمی امن وسلامتی کے عہد کی صورت تھی اور اس بات کی علامت تھی کہ ان کے درمیان کوئی جھگڑا لڑائی نہیں ہے، پھر جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو انہوں نے تحیت کو سلام علیکم کہنے سے مختص ومحدود کر دیا اور اسلام نے اسی کا حکم دے دیا، یہاں تک کتاب لسان العرب کی عبارت تمام ہوئی (ملاحظہ ہو: لسان العرب جلد ۱۲ صفحہ ۲۸۹)۔

البتہ یہ نکتہ شائستہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلام کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعات میں بہت زیادہ تذکرہ فرمایا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا کہ سلام حج کی طرح حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف کی باقی ماندہ یادگاروں میں سے ایک ہے، اس سلسلہ کی آیات ملاحظہ ہوں:

- سورۂ مریم، آیت: ۴۷

''قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ''

(اس نے کہا: تجھ پر سلام ہو، میں تیرے لئے بہت جلد اپنے پروردگار سے طلب مغفرت کروں گا)

- سورۂ ہود، آیت: ۶۹

''وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ''

(اور ہمارے نمائندے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے کہا سلام ہو، اس نے کہا: سلام ہو)

یہ واقعہ قرآن مجید میں متعدد مقامات میں مذکور ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے سلام کو اپنی تحیت قرار دیتے ہوئے اپنے مقدس کلام میں متعدد بار اسے ذکر فرمایا ہے:

- سورۂ صافات، آیت: ۷۹

''سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ''

(سلام ہو نوح پر عالمین میں)

- سورۂ صافات، آیت: ۱۰۹

''سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ''

(سلام ہو ابراہیم پر)

- سورۂ صافات، آیت: ۱۲۰

''سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ''

(سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر)

- سورۂ صافات، آیت: ۱۳۰

''سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ''

(سلام ہو آلِ یٰسین پر)

- سورۂ صافات، آیت: ۱۸۱

''وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ''

(اور سلام ہو رسولوں پر)

مذکورہ بالا تمام آیات ایک سورہ مبارکہ میں ہیں جن میں سلام کا لفظ مذکور ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے خود استعمال کیا ہے۔

اور اپنے مقرب فرشتوں کی تحیت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

- سورۂ نحل، آیت: ۳۲

''الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ''

(جن پاک لوگوں کی فرشتے روح قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں تم پر سلام ہو)

- سورۂ رعد، آیت: ۲۴

''وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ''

(اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے پاس آتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم پر سلام ہو)

اور اہل بہشت کی تحیت کا تذکرہ ان لفظوں میں فرمایا:

- سورۂ یونس، آیت: ۱۰

''وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ''

(اور اس میں ان کی تحیت سلام ہے)

- سورۂ واقعہ، آیت: ۲۵ تا ۲۶

''لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝''

(وہ اس میں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے اور نہ ہی ایک دوسرے پر گناہ کی تہمت لگائیں گے وہ صرف یہ سنیں گے، سلام، سلام)

روایات پر ایک نظر

تحیت یعنی سلام

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ ''وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ...... '' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ علی بن ابراہیم نے اس آیت کی تفسیر میں امامین صادقین (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ) کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: ''ان المراد من التحیة فی الآیة السلام وغیرہ من اکبر'' (آیت میں تحیت سے مراد سلام اور اس کے علاوہ دیگر نیک اعمال ہیں)۔(تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۸۵)

سلام سنت جواب واجب

کتاب اصول کافی میں مؤلفؒ نے سکونی کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا: السلام تطوع والرد فریضة، (سلام مستحب ہے اور جواب واجب ہے)۔(اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۶۴۴)

اسی کتاب میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے عینیہ (یا عنبسہ) کے حوالہ سے مصعب کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ جس میں انہوں نے امام جعفر صادقؑ کا یہ ارشاد گرامی بیان کیا: القلیل یبدؤن الکثیر بالسلام، والراکب یبدء الماشی، واصحاب البغال یبدؤن اصحاب الحمیر، واصحاب الخیل یبدؤن اصحاب البغال (کم لوگ زیادہ لوگوں کو، سواری پر سوار پیدل چلنے والے کو، خچروں پر سوار لوگ گدھوں پر سوار لوگوں کو اور گھوڑوں پر سوار لوگ گدھوں پر سوار لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں)۔(اصولِ کافی جلد ۲، صفحہ ۶۴۶)

کافی ہی میں دو دیگر روایتیں بھی مذکور ہیں ان میں سے ایک جراح مدائنی کے حوالہ سے مؤلف نے اپنے اسناد سے

ذکر کی ہے اور اس میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی بیان کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''یسلم الصغیر علی الکبیر والمار علی القاعد والقلیل علی الکثیر'' چھوٹا بڑے پر، سوار پیدل چلنے والے پر اور کم تعداد والے لوگ زیادہ تعداد والوں پر سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ (کافی جلد ۲ صفحہ ۶۴۷)

دوسری روایت ابن ابی بکیر کے حوالہ سے منقول ہے جس میں امام جعفر صادقؑ کے بعض اصحاب کا بیان ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے امامؑ سے سنا، آپؑ بیان فرمار ہے تھے کہ ''یسلم الراکب علی الماشی، والماشی علی القاعد، واذا لقیت جماعة سلم الاقل علی الاکثر، واذا لقی واحد جماعة سلم الواحد علی الجماعة، سوار شخص پیدل چلنے والے پر، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص پر سلام کرتا ہے، جب دو گروہ آمنے سامنے قرار پائیں تو کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں پر سلام کرتے ہیں، اور جب کوئی ایک شخص کسی گروہ کے سامنے آئے تو وہ ایک اس گروہ پر سلام کرتا ہے۔ (اصول کافی، جلد دوم، صفحہ ۶۴۸)

اسی مطلب سے نزدیک تر ایک روایت بیہقی کے حوالہ سے تفسیر درمنثور میں زید بن اسلم کی بیان کردہ حدیث نبوی ﷺ ذکر کی گئی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر ''درمنثور۔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۹۔

مرحوم کلینیؒ نے کافی میں اپنے ہی اسناد سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''اذا مرت الجماعة بقوم اجزأهم ان یسلم واحد منهم، واذا سلم علی القوم وهم جماعة اجزأهم ان یرد واحد منهم'' جب کچھ لوگ کسی قوم کے قریب سے گزریں تو ان میں سے ایک شخص ہی ان پر سلام کرے تو کافی ہے اور جب کسی گروہ وقوم پر سلام کیا جائے تو اس میں سے ایک شخص اس کا جواب دے تو کافی ہے (اصول کافی، جلد ۲، ص ۶۴۷)

یاد رہے کہ مذکورہ بالا روایات میں امامؑ نے خبر کے انداز میں حکم بیان فرمایا ہے۔

نماز کی حالت میں سلام کا جواب

کتاب تہذیب میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے محمد بن مسلم کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا کہ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپؑ نماز میں مشغول تھے، میں نے سلام کیا اور یوں کہا: السلام علیک، تو امامؑ نے نماز کی حالت میں اس کا جواب انہی الفاظ میں دیتے ہوں یوں فرمایا: السلام علیك، میں نے کہا: کیف اصبحت؟ (آپ کا کیا حال ہے)؟ امامؑ نے اس کا جواب نہ دیا جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے

پوچھا: ایرد السلام وھو فی الصلوٰۃ؟ کیا نماز کی حالت میں سلام کا جواب دیا جاتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: نعم، مثل ماقیل لہٗ، ہاں، اسی طرح سے جس طرح اس سے کہا جائے (تہذیب، جلد دوم، صفحہ ۳۲۹) اسی کتاب میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے منصور بن حازم کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اذا سلم علیك الرجل وانت تصلی قال: ترد علیه خفیًا کما قال، جب کوئی شخص تجھ پر سلام کرے جبکہ تو نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے جواب میں آہستہ سے وہی الفاظ کہو جو اس نے کہے۔ (بحوالہ مذکورہ)

کن لوگوں پر سلام کرنا منع ہے؟

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے مسعدہ بن صدقہ کی روایت ذکر کی ہے جس میں اُنہوں نے بیان کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے پدر بزرگوار امام محمد باقرؑ کے حوالہ سے ارشاد فرمایا:

لا تسلموا علی الیھود، ولا علی النصاریٰ، ولا علی المجوس، ولا علی عبدۃ الاوثان، ولا علی موائد شراب الخمر، ولا علی صاحب الشطرنج والنرد، ولا علی المخنث، ولا علی الشاعر الذی یقذف المحصنات، ولا علی المصلّی لان المصلی لا یستطیع ان یرد السلام لان التسلیم من المسلم تطوّع والرد فریضۃ، ولا علی اکل الربا، ولا علیٰ رجل جالس علی غائط، ولا علی الذی فی الحمام ولا علی الفاسق المعلن بفسقہٖ

یہودیوں پر سلام نہ کرو، نصرانیوں پر سلام نہ کرو، آتش پرستوں پر سلام نہ کرو، بُت پرستوں پر سلام نہ کرو، شرابخوری کے دسترخوان پر بیٹھنے والوں پر سلام نہ کرو، شطرنج و نرد کھیلنے والوں پر سلام نہ کرو، ہم جنس پرستوں پر سلام نہ کرو، اس شاعر پر سلام نہ کرو جو نیک و پاکدامن عورتوں پر برائی کی تہمت لگاتا ہو، نماز پڑھنے والے پر سلام نہ کرو کیونکہ وہ نماز کی حالت میں سلام کا جواب نہیں دے سکتا جبکہ سلام کرنا مسلمان پر سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے، سودخور پر سلام نہ کرو، بیت الخلاء میں بیٹھے ہوئے شخص پر سلام نہ کرو، اور نہ ہی اس شخص پر سلام کرو جو حمام میں ہو، اور نہ اس فاسق و بدکار شخص پر سلام کرو جو ظاہر بظاہر اپنے فسق کا ارتکاب کرتا ہو۔

بہرحال سلام کے حوالہ سے مربوطہ مطالب پر مشتمل کثیر روایات موجود ہیں اور اس سلسلہ میں ہم جو کچھ ذکر کر چکے ہیں وہ روایات سے فہم المعنیٰ کو آسان تر بنا دیتا ہے، بنا برایں ''سلام'' دراصل تحیت ہی کی ایک صورت ہے جس میں

سلامتی کے جذبہ وجذبات کا نہایت ظریف اظہار ہے اور دو ملنے والوں میں برابری کی بنیاد پر باہمی امن کے عملی مظاہروں کو مزید وسعت دینے کا ثبوت ہے کہ جو برتری کے احساس کو ختم کر کے اسے متوازن ومتوازی صورت میں لاکر انسانی اقدار کی عملی پاسداری کا نمونہ پیش کرنے کا مخصوص انداز ہے، اور روایات میں جو مذکور ہے کہ چھوٹا بڑے پر، کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں پر اور ایک شخص گروہ کے تمام افراد پر سلام کرنے میں پہل کرے تو اس سے برابری کے مذکورہ بالا معیار کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اس کا تعلق حقوق کی پاسداری سے ہے جو کہ لازم وواجب امر ہے، اور اسلام نے ہرگز کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس سے حقوقی سلسلہ ونظام کو ٹھیس پہنچتی ہو اور فضیلتوں وخصوصیتوں اور امتیازی حوالوں کی نفی ہوتی ہو بلکہ اسلام نے کسی فضیلت وبرتری سے محروم افراد کو حکم دیا ہے کہ فضل وفضیلت کے حامل افراد کی عزت کریں اور حقدار کو اس کا حق ادا کریں، اس کے ساتھ ساتھ فضل وفضیلت والوں کو اپنے فضل پر غرور کرنے اور دوسروں پر تکبر وبڑائی سے پیش آنے سے منع کیا ہے کہ اس طرح کے برتاؤ سے ناحق اور زیادتی کا ارتکاب ہوگا جس سے انسانی معاشرہ میں بسنے والوں کے درمیان توازن کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اور جہاں تک بعض افراد پر سلام کرنے کی ممانعت کا تعلق ہے تو اس کا تعلق ممانعت کے اس حکم سے ہے جس میں ان سے قلبی لگاؤ کے ساتھ کامل وابستگی اختیار کرتے ہوئے ان کا غلام بن جانا ہے چنانچہ اس حوالہ سے قرآنِ مجید میں یوں ارشاد ہوا:

- سورۂ مائدہ، آیت: ۵۱

  ''لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ''

  (یہود ونصاریٰ کو اپنے اولیاء اور دوست قرار نہ دو)

- سورۂ ممتحنہ، آیت: ۱

  ''لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ''

  (میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ)

- سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳

  ''وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا''

  (اور ان لوگوں کا سہارا نہ لو جو ظالم ہیں)

اس طرح کے مطالب دیگر آیات میں بھی مذکور ہیں۔

البتہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظالموں کو اپنے قریب تر کرنے اور ان کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کروانے کے لئے ان پر سلام کرنا ضروری ہوتا ہے تا کہ دین کی تبلیغ ممکن ہو اور وہ حق بات سننے پر آمادہ ہوں کیونکہ سلام کرنے سے باہمی اُنس پیدا ہوتا ہے اور دلوں میں مخصوص جذبات جنم لیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا: ''فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ'' (ان سے درگزر کریں اور کہیں، سلام) سورۂ زخرف، آیت: ۸۹ ______، اور مؤمنین کو مخاطب قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف و توصیف میں یوں فرمایا: ''وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا'' (اور جب جاہلوں سے ان کا سامنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: سلام!) سورۂ فرقان، آیت: ۶۳

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نمونہ

تفسیر صافی میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: **السلام علیك**، (آپ پر سلام ہو)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''**وعلیك السلام ورحمة الله**'' (اور آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت ہو)، دوسرا شخص آیا تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''**السلام علیك ورحمة الله**'' (آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت ہو)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''**وعلیك السلام ورحمة الله وبركاته**'' (اور آپ پر سلام ہو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں)، تیسرا شخص آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''**السلام علیك ورحمة الله وبركاته**'' (آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''**وعلیك**'' (اور آپ پر بھی!) تو اس نے عرض کی کہ آپ نے میرے لئے کمی کر دی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ'' (جب تم پر تحیت کی جائے تو تم اس سے بہتر تحیت کرو) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپ نے کوئی فضل چھوڑا ہی نہیں لہٰذا میں نے اسی کے مانند تجھے جواب دیا ہے۔

(تفسیر صافی، جلد اول، صفحہ ۴۴۲)

اسی کے مانند سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں احمدؔ کے حوالہ سے (کہ اُنہوں نے کتاب الزہد میں اسے ذکر کیا ہے) اور ابن جریرؔ، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابن مردویہ کے حوالہ سے صحیح سند کے ساتھ سلمان فارسی کی بیان کردہ روایت ذکر کی ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۸۸)

امام علیؑ کا صریح فرمان

کتاب کافیؔ میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: امیر المؤمنین امام علی ابن ابی طالب علیہ

السلام ایک دن کہیں سے گزر رہے تھے کہ راستہ میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، امامؑ نے انہیں سلام کیا تو اُنہوں نے جواب میں یہ الفاظ کہے: علیك السلام ورحمة الله وبركاتهٗ ومغفرتهٗ ورضوانهٗ (آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت، اس کی برکتیں، اس کی مغفرت و بخشش اور اس کی رضا ہو) یہ سن کر امیر المؤمنینؑ نے ان سے فرمایا: لا تجاوزوا بنا مثل ما قالت الملائكة لابينا ابراهيم، قالوا: رحمة الله وبركاتهٗ عليكم اهل البيت، تم ہم سے آگے نہ بڑھو، کہ ہم وہی کہتے ہیں جو فرشتوں نے ہمارے پدر بزرگوار ابراہیمؑ سے کہا، انہوں نے یوں کہا: اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے اہلِ بیت! (اصولِ کافی، جلد ۲، صفحہ ۶۴۶)

اس روایت میں اشاراتی ثبوت یہ نظر آتا ہے کہ اسلام میں سلام کرنے کی بابت سنت یہ ہے کہ پورا سلام کیا جائے جو کہ یہ ہے: السلام علیك ورحمة الله وبركاتهٗ، یہی سلام ہر مسلمان کے لئے سنت قرار دیا گیا ہے، اور یہ دین ابراہیمؑ کے خالص اصولوں سے ماخوذ ہے اور اُن مطالب کی تصدیق ہے جو پہلے ذکر ہو چکے ہیں کہ سلام کے ساتھ تحیت کا یہ طریقہ دین حنیف سے تعلق رکھتا ہے۔

امام صادقؑ کا فرمان

کتاب اصولِ کافی ہی میں ایک روایت مذکور ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: ان من تمام التحية للمقيم المصافحة، وتمام التسليم على المسافر المعانقة، تحیت کی کمالی صورت یہ ہے کہ باہر سے آنے والا شخص گھر بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ مصافحہ کرے اور اگر آنے والا شخص سفر سے آیا ہو تو گھر بیٹھا ہوا شخص اس کے ساتھ معانقہ کرے۔ (کافی، بحوالہ مذکورہ بالا)

چھینکنے کے وقت دُعائیہ کلمات

کتاب الخصال میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا فرمان منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اذا عطس احد کم قولوا یرحمکم الله، وهو یقول: یغفر الله لکم ویرحمکم، قال الله تعالیٰ: ''وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ'' تم میں سے جب کوئی شخص چھینک مارے تو تم یہ کہو: اللہ تم پر رحم فرمائے، اور وہ اس کا جواب یوں دے: اللہ تمہیں مغفرت و بخشش سے نوازے اور تم پر رحمت نازل فرمائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب تم پر تحیت کی جائے تو تم اس سے بہتر تحیت کرو۔ (خصال، شیخ صدوقؒ، صفحہ ۱۲۷)

خدائی آداب کی پاکیزہ مثال

کتاب المناقب میں مذکور ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی ایک کنیز نے آپؑ کی خدمت میں پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا تو امامؑ نے اس کے عوض اسے آزاد کرتے ہوئے فرمایا: ''انت حرة لوجه الله'' تو اللہ کی رضا وخوشنودی کے لئے آزاد کی جاتی ہے، کسی نے امامؑ سے اس سلسلہ میں پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ادبنا الله تعالیٰ، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ آداب سکھائے ہیں اور فرمایا ہے کہ جب تم پر تحیت کی جائے تو تم اس سے بہتر تحیت کرو (اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ) تو اس کے لئے بہترین تحیت یہ تھی کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ (المناقب، جلد ۴ صفحہ ۱۸)

مذکورہ بالا روایات سے آپ خود آگاہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آیت میں مذکور تحیت کے وسیع معنیٰ کا ثبوت پایا جاتا ہے۔

منافقین کی بابت اختلافِ رائے

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ ''فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ.......'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ مفسرین کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ سے مدینہ آئے تھے اور اُنہوں نے مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور پھر جب مکہ واپس پلٹ گئے تو چونکہ مدینہ کے ماحول کو اپنے لئے سازگار نہ پایا لہٰذا دوبارہ شرک کا اظہار کرنے لگے، پھر وہ مشرکین کا سامان لے کر یمامہ گئے تو مسلمانوں نے ان کا راستہ روک کر ان سے جنگ کرنا چاہی، اس وقت مسلمانوں کے درمیان اس سلسلہ میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا، بعض افراد نے اس کی ممانعت کی اور کہا کہ ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ وہ مؤمن ہیں، بعض حضرات نے کہا کہ وہ مشرک ہیں، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس شانِ نزول کی تائید حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول روایت سے ہوتی ہے۔ (تفسیر مجمع البیان، جلد ۳، صفحہ ۸۶)

کافروں کی تمنائے باطل

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ ''وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا.......'' (وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی اسی طرح کفر اختیار کرو جس طرح اُنہوں نے کفر اختیار کیا ہے) کی بابت مذکور ہے کہ یہ آیت عرب کے دو قبیلوں اشجع اور بنی ضمرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور ان کی بابت یہ بتایا گیا ہے کہ جب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ حدیبیہ کے لئے نکلے تو ان دو قبیلوں کے

علاقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ہوا اور اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی ضمرہ سے صلح کر رکھی تھی اور باہمی صلح نامہ لکھ دیا تھا ،صحابۂ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ قبیلۂ بنی ضمرہ کا قریبی علاقہ ہے، اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ ہم مدینہ سے باہر چلے گئے ہیں تو ممکن ہے وہ مدینہ پر دھاوا بول دیں یا ہمارے خلاف قریش کی مدد کریں۔ لہٰذا پہلے ان کا کام تمام کرلیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں، وہ لوگ عرب کے دوسرے قبائل کی نسبت اچھے کردار کے مالک ہیں وہ والدین سے نیک سلوک کرنے ،صلہ رحمی کرنے اور عہد و پیمان کو پورا کرنے میں زیادہ معروف ہیں، اور قبیلۂ اشجع بھی قبیلۂ بنی ضمرہ کے قریبی علاقہ میں رہتے تھے اور وہ کنانہ کی نسل سے تھے، ان کے اور قبیلۂ بنی ضمرہ کے درمیان بھی صلح نامہ لکھا جاچکا تھا اور انہوں نے قسمیں کھا رکھی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کے امن و امان اور خیالداری میں بھرپور کردار ادا کریں گے، اگر ان میں سے کوئی ایک قحط سالی کا شکار ہوا تو دوسرا اسے اپنی سرزمین استعمال کرنے دے گا تاکہ وہ اپنے جانوروں کو وہاں چرا سکیں، چنانچہ ایسا ہوا کہ انہی ایام میں قبیلہ اشجع کا علاقہ قحط سالی سے دوچار ہوگیا جبکہ قبیلۂ بنی ضمرہ کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا، مسلمانوں کو ان دو قبیلوں کے درمیان صلح نامہ کا علم نہ تھا، انہوں نے سمجھا کہ قبیلہ اشجع کے لوگ قبیلۂ بنی ضمرہ پر حملہ کرنے والے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ قبیلۂ اشجع کے لوگ قبیلۂ بنی ضمرہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلہ اشجع سے جنگ کرنے کو تیار ہو گئے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی ضمرہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا'' (وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر اختیار کرو جس طرح انہوں نے کفر اختیار کیا ہے کہ پھر تم برابر ہو جاؤ، پس اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑ لو اور اُنہیں قتل کردو جہاں بھی تم انہیں پاؤ، اور ان میں سے کسی کو دوست و مددگار نہ بناؤ) اس کے بعد قبیلۂ اشجع کو مستثنیٰ کر دیا اور فرمایا: ''اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا'' (سوائے ان لوگوں کے کہ جن کا اس قوم سے سامنا ہو جن سے تمہارے اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہو چکا ہو یا وہ اس حالت میں آئیں کہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے کی تو ان ہی نہ رکھتے ہوں، اگر خدا چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا تو وہ یقیناً تم سے جنگ کرتے لیکن اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار کریں کہ تم سے جنگ نہ کریں بلکہ تمہیں صلح کی پیشکش کریں تو (جان لو کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر تسلط عطا نہیں کیا)۔

ادھر قبیلۂ اشجع کے لوگ ان تین مقامات پر اتر چکے تھے: بیضاء، حل، مستباح، چونکہ یہ مقامات حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کے نزدیکی علاقہ میں تھے تو وہ لوگ خوفزدہ ہو گئے کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو بھیج کر ان پر حملہ نہ کروا دیں اور ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ خدشہ ہوا کہ وہ لوگ ان کے اطراف سے حملہ کر دیں اور نقصان پہنچائیں کیونکہ وہ ان کے

راستہ ہی میں تھے، اسی دوران میں قبیلۂ اشجع کہ جس کا سردار مسعود بن رجیلہ تھا سات سوافراد کے ہمراہ آ گئے اور شعب سلع میں قیام پذیر ہو گئے، یہ واقعہ ماہ ربیع الاوّل ۶ھ کو رونما ہوا، تو آنحضرت ﷺ نے اسید بن حصین کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ جاؤ اور دیکھو کہ اشجع والے ہماری طرف کیوں آتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ کے فرمان پر اسید اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ان کی طرف گیا اور ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ تو مسعود بن رجیلہ جو کہ ان کا سردار تھا وہ کھڑا ہوا اور اس نے اسید اور ان کے ساتھیوں پر سلام کیا اور کہنے لگا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ کریں، یہ سُن کر اسید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور صورتحال سے آپ ﷺ کو آگاہ کیا، اس وقت حضرت رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ ڈر گئے ہیں کہ شاید ہم ان پر حملہ کرنے آئے ہیں لہٰذا وہ مجھ سے صلح کی بات کرنا چاہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ان سے مزید بات چیت کرنے سے پہلے دس کھجوروں سے لدے اونٹ ہدیۃً ان کی طرف روانہ فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ مقصد کے حصول کی خاطر اس سے پہلے ہدیہ دینا اچھا عمل ہے، پھر آپ ﷺ خود ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے پوچھا: اے قبیلۂ اشجع والو، تم کیوں ہمارے قریب آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہماری رہائش آپ کے نزدیک ہے اور ہم اپنی قوم میں سب سے کم افراد والے ہیں تو ہم نہ تو آپ سے جنگ کرنے کی توان رکھتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ سے بہت قریب ہیں اور نہ ہی ہم قوم سے جنگ کرنے کی پوزیشن میں ہیں کیونکہ ہماری تعداد بہت کم ہے لہٰذا ہم اس لئے یہاں آئے ہیں کہ آپ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں، آنحضرت ﷺ نے ان کی پیشکش کو قبول فرمایا اور ان سے ترک مخاصمت کا معاہدہ کرلیا، وہ لوگ معاہدہ کرنے کے بعد وہاں سے واپس اپنے دیار کو پلٹ گئے۔ اُنہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ........ تا........ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا''۔
(تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۴۵)

قبیلۂ بنی مدلج سے معاہدہ

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے فضل ابی العباس کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے آیۂ مبارکہ ''اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: یہ آیت قبیلۂ بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ لوگ حضرت رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے لئے یہ بات گراں ہے کہ ہم آپ کی رسالت کی گواہی دیں، نہ تو ہم آپ کے ساتھ ہیں اور نہ ہی آپ کے مخالفین کے ساتھ ہیں، راوی (فضل ابی العباس) نے امامؑ سے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے کیا بات کی؟ امامؑ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے معاہدہ کرلیا کہ پہلے عربوں سے اپنے معاملات سے فارغ ہو جائیں تو پھر انہیں بلائیں

گے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں گے، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ ان سے قتال کریں گے (روضۃ الکافی، صفحہ ۳۲۷)

سیف بن عمیرہ کی روایت

تفسیر العیاشی میں سیف بن عمیرہ سے روایت مذکور ہے، اُنہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ ''اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْکُمْ فَلَقٰتَلُوْکُمْ'' کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: میرے والد بزرگوار فرماتے تھے کہ یہ آیت قبیلۂ بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے کنارکشی اختیار کی اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نبرد آزما نہ ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم سے ہمصدا ہوئے، میں نے پوچھا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دشمنوں سے فارغ ہونے تک ان سے جنگ نہ کی، پھر دیگر اقوام کی طرح اُن سے برابر سلوک کیا۔ یعنی پہلے اسلام کی دعوت دی کہ انکار کی صورت میں جنگ کرنے کا اعلان کیا اور جملہ ''حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ اُنہوں نے اسلام قبول کرنے میں دل تنگی دکھائی۔ (تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۲۶۲)

معاہدہ کی پاسداری

تفسیر ''مجمع البیان'' میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ جملہ ''قَوْمٍۭ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ'' میں ''قوم'' سے مراد قبیلۂ ہلال بن عویمر سلمی مراد ہے کہ جس نے اپنی قوم کی طرف سے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ میں یہ طے پایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کی طرف سے جو شخص بھی ہماری طرف آیا ہم اس سے دست و گریباں نہ ہوں گے اور ہماری طرف سے جو آپ کی طرف آئے اس سے آپ دست و گریباں نہ ہوں گے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی ایسے شخص سے دست و گریباں ہونے سے منع فرمایا جس سے معاہدہ ہوا ہو۔ (معاہدہ کی عملی پاسداری کا حکم دیا)۔ (تفسیر ''مجمع البیان'' جلد ۳۔ صفحہ ۸۸)

اس مضمون و مطلب پر مشتمل روایات تفسیر درمنثور میں بھی مختلف اسناد کے ساتھ ابن عباس اور دیگر راویوں کے حوالہ سے مذکور ہیں۔

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں مذکور ہے کہ ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں، اور ابن منذر، ابن ابی حاتم، نحاس اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے آیۂ مبارکہ ''اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ ..... '' کی تفسیر میں بیان کیا کہ اس آیت کو سورۂ برائت کی اس آیت نے منسوخ کر دیا: ''فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ'' سورۂ برائت، آیت ۵ ______ (پس جب وہ مہینے گزر جائیں تو مشرکین سے قتال کرو جہاں بھی انہیں پاؤ)۔

آیات ۹۲ تا ۹۴

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

ترجمہ

○ ''کسی مؤمن کو روا نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے، سوائے اس کے کہ غلطی سے ہو جائے اور جو شخص غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے تو ایک مؤمن غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرے مگر یہ کہ وہ صدقہ کر دیں (معاف کر دیں)، اگر وہ (مقتول) ان لوگوں میں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں جبکہ وہ خود مؤمن ہو تو اس کی دیت ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ہے اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہو کہ جن کے اور تمہارے درمیان عہد و میثاق۔ معاہدہ۔ طے پا چکا ہے تو اس کی دیت اس کے وارثوں کو ادا کی جائے گی اور ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ہوگا، لیکن جو شخص ایسا نہ کر سکتا ہو تو وہ پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے کہ اللہ سے توبہ کرنے کی یہی صورت ہے، اور اللہ بخوبی آگاہ و دانا ہے۔''

(۹۲)

○ ''اور جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اللہ اس پر غضب و لعنت کرتا ہے اور اس نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر کر دیا ہے۔''
(۹۳)

○ ''اے ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو خوب چھان بین کرو، اور جو شخص تم پر سلام کرے تو اسے یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں ہے، کہ اس طرح تم دنیاوی زندگی کا مال و متاع حاصل کرنا چاہو، اللہ کے پاس تو بہت زیادہ غنیمتیں ہیں، تم خود بھی اس سے پہلے ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا اچھی طرح چھان بین کرو کہ اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔''

(۹۴)

تفسیر و بیان

مومن کو قتل کرنے کی ممانعت

○ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا''

(کسی مؤمن کو روا نہیں کہ کسی مؤمن کو قتل کرے، مگر یہ کہ غلطی سے ہو جائے)

لفظ ''خطاء'' کو خا اور طا دونوں پر زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اس صورت میں حرف طا پر مد نہیں ہوتی، اور مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جو کہ ''فعال'' کے وزن پر ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا معنیٰ غلطی ہے جو کہ عربی میں لفظ ''صواب'' یعنی درستی کے معنی کے مقابل میں آتا ہے، لیکن یہاں آیۂ مبارکہ میں اس سے مراد وہ معنیٰ ہے جو ''عمداً'' کے مقابلے میں آتا ہے کیونکہ اس کے بعد والی آیت میں واضح طور پر اس کا تقابلی حوالہ مذکور ہے جس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا'' (اور جو شخص کسی مؤمن کو عمداً قتل کرے)۔

اور آیت مبارکہ میں جو نفی کی گئی ہے ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ کسی مؤمن کو روا اور مناسب نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے، یعنی جب وہ ایمان کے دائرہ میں آچکا ہے اور مؤمن کہلاتا ہے تو اب اس کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا کہ وہ کسی اپنے جیسے مؤمن کو قتل کر دے، البتہ اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو اس کا حکم دوسرا ہے، تو یہاں غلطی سے قتل کئے جانے کی بات استثناء متصل ہے۔ (یعنی ''اِلَّا خَطَـًٔا'' کہ اس میں حرف اِلَّا سے جو استثناء مذکور ہے وہ استثناء منفصل نہیں بلکہ استثناء متصل ہے کہ جس سے دونوں کا ایک ہی دائرہ میں ہونا ملحوظ ہے کہ وہ دونوں ___ قاتل و مقتول ___ مؤمن ہوں) بنا برایں اس جملہ کی بازگشت اس مطلب کی طرف ہوتی ہے کہ کوئی مؤمن ہرگز کسی مؤمن کو، مؤمن ہونے کی بناء پر قتل کرنا نہیں چاہتا، یعنی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مؤمن ہے اس کے قتل کا ارادہ نہیں کرتا۔ اس طرح کے کلام کی مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو:

○ سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۱

''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ..........''

(اور کسی بشر کے لئے یہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے........)

- سورۂ نمل، آیت: ۶۰

''مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا''

(تمہارے لئے یہ نہیں ہے کہ تم ان کے درختوں کو اُگاؤ)

- سورۂ یونس، آیت: ۷۴

''فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ''

(تو ان کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں جسے اُنہوں نے اس سے پہلے جھٹلایا ہے)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات میں زیر نظر آیت کے مشابہ کلام موجود ہے، اس کے ساتھ ساتھ زیر نظر آیت کی بابت یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ اس میں کنایۃً ایک شرعی حکم سے آگاہی دلائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو پہلے اور نہ ہی بعد میں کبھی اس کو جائز وروا قرار نہیں دیا اور نہ دے گا کہ کوئی مؤمن کسی مؤمن کو قتل کرے بلکہ اللہ نے ایسا کرنا حرام قرار دیا ہے سوائے اس صورت میں کہ جب غلطی سے ایسا ہو جائے، کیونکہ غلطی کی صورت میں وقوع پذیر ہونے والے اس عمل میں مؤمن کو قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ یا تو کسی کو بھی قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ اتفاقاً مؤمن قتل ہو جاتا ہے یا یہ کہ اسے جائز القتل کافر سمجھ کر غلطی سے قتل کر دے کہ جس کو قتل کرنا حرام قرار نہیں دیا گیا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت مبارکہ میں ''اِلَّا خَطَـًٔا'' سے جو استثناء ہوا ہے وہ استثنائے منقطع ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ ''اِلَّا خَطَـًٔا'' سے حقیقی معنی میں استثناء مقصود نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ غلطی سے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا ایسا کرنا مباح وجائز قرار دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی مؤمن کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ اس استثناء (اِلَّا خَطَـًٔا) میں غلطی سے قتل سرزد ہونے کی حرمت کا حکم ختم کیا گیا ہے یا یہ کہ اس پر حرمت کا حکم لاگو ہی نہیں کیا گیا، لہٰذا اس سے ہرگز کوئی حرج لازم نہیں آتا، بنابرایں حق یہ ہے کہ یہ استثناء متصل ہے۔

غلطی سے ہونے والے قتل کا حکم

- ''وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا...... تا........ يَّصَّدَّقُوْا''

(اور جو شخص غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے......)

آیت مبارکہ میں جملہ ''فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ'' ذکر ہوا ہے، تو تحریر کا معنیٰ غلام کو آزادی دلانا ہے۔

اور ''رقبة'' کا لغوی معنیٰ گردن ہے لیکن مجازی طور پر اسے اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی کی ملکیت میں ہو (غلام)، لفظ ''دیت'' خونبہا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ مال جو جرم کرنے والے کی طرف سے مقتول کی جان کے بدلے میں اس کے وارثوں کو یا کسی عضو کے ضائع ہونے کی صورت میں متاثرہ شخص کو ادا کیا جاتا ہے، بنا بر ایں آیت مبارکہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مؤمن غلام کو آزاد کرائے اور اس کے وارثوں کو اس کا خون بہا بھی دے، لیکن اگر مقتول کے وارث خوں بہا معاف کر کے صدقہ کر دیں اور اسے معاف کر دیں تو اس صورت میں دیت کا ادا کرنا واجب نہیں۔

مؤمن مقتول اور غیر مؤمن ورثہ!

○ ''فَإِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ''

(لیکن اگر وہ اس قوم سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں)

یہاں حرف ''كَانَ'' کی ضمیر کی بازگشت مؤمن مقتول کی طرف ہوتی ہے، اور ''قَوۡمٍ عَدُوٍّ'' سے مراد کفار حربی ہیں (یعنی وہ کفار جو مسلمانوں سے حالت جنگ میں ہوں)، بنا بر ایں آیت مبارکہ کا معنیٰ یہ ہے کہ جو غلطی سے مارا گیا ہو وہ خود مؤمن ہو جبکہ اس کے ورثہ کفار حربی ہوں تو وہ اس سے میراث نہیں پائیں گے لہٰذا ایک غلام آزاد کرانا واجب ہوگا اور کوئی دیت نہیں دی جائے گی کیونکہ کافر حربی، مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔

عہد و پیمان کا حکم

○ ''وَإِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ''

(اور اگر وہ اس قوم میں سے ہو جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہو.......)

یہاں بھی حرف ''كَانَ'' کی ضمیر کی بازگشت مؤمن مقتول کی طرف ہوتی ہے چنانچہ آیت کا سیاق اسی کی تصدیق کرتا ہے۔

اور یہاں ''مِّیْثَاقٌ'' سے مراد ہر طرح کا عہد و پیمان ہے خواہ عہد الذمہ ہو یا کوئی دوسرا معاہدہ ہو، اس بناء پر آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر مقتول مؤمن ہو کہ جو اس قوم سے ہو جس کے اور تمہارے درمیان عہد و میثاق ہو چکا ہو تو اس صورت میں دیت بھی ادا کرنی ہوگی اور غلام کو آزاد بھی کرانا ہوگا، یہاں آیت میں دیت کا ذکر غلام آزاد کرانے سے پہلے میثاق و معاہدہ کی عملی پاسداری کی بابت تاکید کی غرض سے ہے۔

ناداری کی صورت میں خاص حکم

○ ''فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ''

(مگر جو شخص نادار ہو تو دو مہینے پے در پے روزے رکھے)

اس میں مراد یہ ہے کہ جو شخص غلام آزاد نہ کرا سکتا ہو اس پر واجب ہے کہ پے در پے دو مہینے روزے رکھے، یہی معنیٰ کلام میں موجود ترتیب سے قریب تر ہے۔

خاص عنایت خداوندی

○ ''تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ''

(یہ اللہ کی طرف سے توبہ کے طور پر ہے.......)

یہاں یہ مطلب بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ حکم یعنی روزہ کا واجب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شخص کے لئے توبہ اور رحمت کی ایک صورت ہے جو غلام آزاد کرنے سے قاصر و ناتوان ہے، گویا یہ ایک طرح کی نرمی ہے کہ یہ حکم نادار شخص کے لئے خداوند عالم کی طرف سے خصوصی رعایت و عنایت پر مبنی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ''تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ'' آیت میں مذکورہ کفارہ کی تمام قسموں سے مربوط ہو اور اس کی بازگشت ان سب امور کی طرف ہو جن کا ذکر آیت میں ہوا ہے یعنی غلام آزاد کرانا وغیرہ، بنابرایں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ غلطی سے کسی کو قتل کرنے والے کے لئے کفارہ کا واجب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے گناہ کی توبہ کے طور پر ہے اور اس کے اس عمل کے ان سنگین آثار کی تلافی کی بابت خدا کی طرف سے خاص عنایت کی ایک صورت ہے جو یقینی طور پر اس پر مترتب ہوتے ہیں۔ اس سے یہ درس بھی ملتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو اس طرح کے کاموں سے بچا کر رکھیں اور کسی

مومن کو قتل کرنے میں بے توجہی و جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں، اس کی مثال ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں قصاص کے حوالہ سے یوں ارشاد فرمایا ہے: ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ'' تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۹)

اسی طرح یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاشرہ کے لئے بھی توبہ کی ایک صورت اور لوگوں کے لئے خاص عنایت ہے کہ اس طرح ان کے آزاد افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی کو غلطی سے قتل کردے تو اس کے بدلے میں ایک غلام آزاد کرے تو اس سے آزاد افراد میں ایک فرد کا اضافہ ہوتا ہے اور دیت کی ادائیگی سے مقتول کے ورثہ کے مالی نقصان کی تلافی ہوتی ہے۔

اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں آزادی حقیقی زندگی جبکہ غلام بنانا ایک طرح کا قتل ہے، اور اسلام کامل دیت کو کسی شخص کے کمترین وجودی فوائد میں سے قرار دیتا ہے، ہم اس مطلب کی مزید وضاحت عنقریب مربوطہ مباحث میں کرینگے۔

اور جہاں تک خطاء، عمد، تحریر (غلام آزاد کرنا) دیت، مقتول کے ورثہ، میثاق اور اس طرح کے دیگر وہ الفاظ جو آیت میں ذکر کئے گئے ہیں ان کے معانی کا تعلق ہے تو اس کا تعین احادیث و روایات پر موقوف ہے، جو شخص ان سے مطلع ہونا چاہے وہ فقہی کتب کا مطالعہ کرے۔

عمداً قتل کرنے کی اُخروی سزا

○ ''وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ''
(اور جو شخص عمداً کسی مؤمن کو قتل کرے اس کی سزا دوزخ ہے)

''التعمد'' (مُتَعَمِّدًا) کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی کام کا ارادہ اس کے اسی مخصوص عنوان سے کیا جائے جو اس کا ہے، اور کسی بھی اختیاری فعل میں عنوان اور وجہ کا ارادہ ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اسے اختیاری نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا یہ ممکن ہے کہ کسی ایک فعل کے ایک سے زیادہ عناوین ہوں یعنی یہ ممکن ہے کہ ایک ہی فعل۔ ایک لحاظ سے عمدی ہو جبکہ دوسرے لحاظ سے خطائی ہو یعنی غلطی سے سرزد ہوا ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص دور سے ایک شکل دیکھ کر اسے حیوان سمجھ کر اس کے شکار کے لئے اس کی طرف تیر چلائے جبکہ وہ حقیقت میں انسان ہو اور وہ اس تیر سے قتل ہوجائے تو اس صورت میں وہ شخص شکار کرنے میں متعمد اور انسان کے قتل کرنے میں خاطہ کہلائے گا، یعنی اس نے شکار کا قصد و ارادہ کیا تھا لہٰذا اس بناء پر اس کا فعل عمدی کہلائے گا لیکن چونکہ اس نے انسان کے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ غلطی سے ہوگیا تو اس بناء پر اسے خاطیٔ کہا جائے گا، اسی طرح مسئلہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کو سرزنش کرنے یا اصلاح کی غرض سے مارے کہ اس میں اس کی اصلاح

کے علاوہ کوئی دوسرا ہدف ومقصد ملحوظ نہ ہو لیکن وہ اس مارنے کے نتیجہ میں مرجائے تو وہ بھی قتل خطاء میں شمار ہوگا، بنابرایں آیت میں ''وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا'' سے مراد وہ شخص ہے جو کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے اور اسے معلوم ہو کہ جسے وہ قتل کر رہا ہے وہ مؤمن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے شخص کے بارے میں سخت ترین سزا یعنی ہمیشہ کی آگ میں جلنا مقرر فرمایا ہے البتہ آپ سورۂ نساء آیت ۴۸ ''إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ'' (اللہ یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے) میں آگاہ ہو چکے ہیں اور اسی طرح سورۂ زمر، آیت: ۵۳ ''إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا'' (اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے) سے بھی زیر نظر آیت مبارکہ کے عمومی حکم میں استثنائی صورت کی گنجائش پائی جاتی ہے، یعنی دونوں آیتیں زیر بحث آیت مبارکہ کہ جسمیں ہمیشہ کی آگ میں جلنے کی سزا مذکور ہے کے عمومی حکم کو مقید کرسکتی ہیں کیونکہ وہ اس سزا کے حتمی ویقینی ہونے میں صریح بیان پر مشتمل نہیں لہٰذا اس میں توبہ یا شفاعت کے ذریعے عفو ومعافی کا امکان پایا جاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں گھر سے نکلنا

○ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا''

(اے ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو چھان بین کرلو.........)

یہاں لفظ ''ضرب'' (ضَرَبْتُمْ) کا معنیٰ سفر کرنا ہے، اور یہاں سفر کو ''فِي سَبِيلِ اللَّهِ'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کرنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس سے مراد جہاد کرنے کے لئے گھر سے نکلنا ہے۔

لفظ تبیّن (فَتَبَيَّنُوا) کا معنیٰ تمیز کرنا ہے (دو چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کرنا) یہاں اس سے مراد مؤمن و کافر کے درمیان تمیز کرنا ہے، اس کا ثبوتی حوالہ (قرینہ) یہ الفاظ ہیں: ''وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا'' (اور جو تم پر سلام کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں) اور ''أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَمَ'' سے مراد وہی مشہور ومعروف طرزِ عمل ہے جو اہل ایمان ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے اختیار کرتے ہیں، اور اسے ''السلام'' کی بجائے ''السَّلَم'' (لام پر زبر کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے کہ جس کا معنیٰ سلام کرنا نہیں بلکہ سر جھکا دینا، سر تسلیم خم کر دینا اور امن وصلح کے لئے قدم بڑھانا ہے (لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَمَ) یعنی جو شخص تمہاری طرف صلح کا قدم بڑھائے اس سے یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں۔

جملہ ''تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'' سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کی دولت اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی غرض سے

مسلمان یہ بہانہ نہ تراشیں کہ جو شخص صلح و سلامتی کا ہاتھ بڑھائے اس سے یہ کہنے لگیں کہ تو مؤمن نہیں، لہٰذا اس کے ساتھ ہی یوں ارشاد ہوا: "فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ" (کہ اللہ کے پاس زیادہ مال و دولت اور غنیمتیں ہیں) لفظ "مَغَانِمُ" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "مغنم" ہے، یعنی جو غنیمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ اس دنیاوی مال و دولت اور غنیمتوں سے زیادہ بہتر ہیں جن کے وہ طلبگار اور خواہاں ہیں، کیونکہ جو غنیمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ کثیر ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی غنیمتوں کو دُنیاوی غنیمتوں پر ترجیح دو۔

ماضی کی یاددہانی

○ "كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا"

(تم اس سے پہلے ایسے ہی تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا چھان بین کرو)۔

اس جملے سے مراد یہ ہے کہ تم اس سے پہلے بھی دنیاوی مال و دولت کی محبت کے اسیر تھے اور اس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے، یعنی ایمان لانے سے پہلے تمہاری یہی حالت تھی، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا اور تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا کہ جس نے تمہیں دُنیاوی مال و دولت پر مر مٹنے سے باز رکھا اور تمہیں اللہ کے پاس موجود کثیر غنیمتوں کے حصول کی راہ پر لا کھڑا کیا، تو جب ایسا ہے تو تم پر لازم ہے کہ چھان بین کرو اور اچھی طرح تحقیق کر کے عملی اقدام کی راہ اختیار کرو، آیۂ مبارکہ میں دو مرتبہ "تبینوا" (چھان بین و تحقیق کرو) کا حکم مذکور ہے اس کا مقصد حکم میں تاکید ہے۔

یہ آیۂ مبارکہ اگرچہ وعظ و نصیحت اور ایک طرح کی سرزنش و تنبیہ پر مشتمل ہے لیکن اس میں صراحت کے ساتھ یہ بیان نہیں کیا گیا کہ جس قتل کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا ہے وہ کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرنا ہے، بلکہ وہ اس مورد کی بابت ہے کہ کسی مؤمن نے غلطی سے کسی اس مشرک کو قتل کیا جس نے اظہارِ ایمان کرتے ہوئے صلح کی خاطر پیشکش اور اقدام کیا جبکہ اس مؤمن نے اس کے حقیقی مؤمن ہونے پر یقین نہ کیا اور یہ گمان کیا کہ وہ جان کے خطرے کی وجہ سے اظہارِ ایمان کر رہا ہے، لہٰذا اس نے اسے قتل کر دیا، تو اس کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا کہ تم اچھی طرح تحقیق اور چھان بین کر لو، بنا بر ایں آیۂ مبارکہ میں سرزنش کے انداز میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ اسلام ظاہر ہی کو کافی سمجھتا ہے اور اسی پر احکام مترتب ہوتے ہیں اور جہاں تک کسی کے باطن کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اور وہی ہے جو دلوں کے رازوں سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ آیۂ مبارکہ میں جملہ "تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" مقتضائے حال کو بیان کرتا ہے یعنی سلسلۂ گفتگو کے تناظر میں اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ تمہاری حالت (اور ہمیشہ کی عادت) ہی یہ ہے

کہ جو شخص ایمان کا اظہار کرتا ہے تم اس کے بارے میں کسی طرح کی تحقیق و چھان بین اور اس کے بارے میں اچھی طرح معلوم کرنے کی زحمت گوارا کئے بغیر اس کے قتل میں جلدی کرتے ہو اور یہ اس شخص کی روش ہے جس کا مطمع نظر صرف مال و دولت اور غنیمت حاصل کرنا ہو کہ وہ کسی نہایت کمزور دلیل اور معمولی سے معمولی بہانہ کی بناء پر ایمان لانے کا اظہار کرنے والے شخص کو قتل کر دیتا ہے اور کسی مضبوط وجہ کو خاطر میں نہیں لاتا، تو مؤمنوں کی وہ حالت ہے جو ایمان لانے سے پہلے تھی کہ وہ صرف دُنیا کے طلبگار و فریفتہ تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اُن پر احسان فرمایا اور انہیں ایمان کی نعمت سے نوازا تو ان پر واجب ہو گیا کہ وہ اپنے ہر کام میں نہایت اچھی طرح تحقیق و چھان بین کریں اور زمانۂ جاہلیت کی قدیم عادتوں کے رسیا بن کر نہ رہیں اور جو کچھ اس دور کی غلط عادات باقی رہ گئی ہیں اُن سے دوری اختیار کریں۔

روایات پر ایک نظر

غلطی سے ہونے والے قتل کی سزا؟

○ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا........''
(کسی مؤمن کو روا نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے)۔

تفسیر ''درمنثور'' میں آیۂ مبارکہ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا'' کی تفسیر میں ایک روایت مذکور ہے جسے ابن جریر نے عکرمہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: قبیلۂ بنی عامر بن لوی کا ایک شخص جس کا نام حارث بن یزید بن نبیشہ تھا، ابوجہل کے ساتھ مل کر عیاش بن ابی ربیعہ کو مار پیٹ اور تشدد کا نشانہ بناتا تھا، پھر وہ (یعنی حارث) ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اظہار کرے، راستہ میں ''حرّہ'' کے مقام پر عیاش بن ابی ربیعہ سے ملاقات ہوگئی، عیاش نے موقع کو غنیمت جانا اور حارث پر دھاوا بول دیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی تک وہ کافر ہے اس پر تلوار کھینچ لی اور اسے قتل کر دیا، اور پھر حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعہ کی خبر دی، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا.....'' (کسی مؤمن کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے سوائے اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیاش کے سامنے آیت کی تلاوت فرمائی اور پھر اسے حکم دیا کہ جاؤ اور ایک غلام آزاد کرو۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۱۹۲)

یہ واقعہ دیگر اسناد سے بھی مروی ہے یعنی عکرمہ کے علاوہ دیگر راویوں نے بھی اسے بیان کیا ہے، ان میں بعض

روایات میں مذکور ہے کہ عیاش نے حارث کو فتح مکہ کے دن موت کے گھاٹ اتارا، جبکہ وہ اس دن سے پہلے تک مشرکین کے تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا اور وہ اس پر بھرپور ظلم کرتے تھے اور اس دن جوں ہی حارث اس کے سامنے آیا تو اس نے موقع پاتے ہی اسے قتل کر دیا جبکہ اس وقت حارث مسلمان ہو چکا تھا لیکن عیاش کو اس کے اسلام لانے کا علم نہ تھا۔

اس روایت کے باوجود ہم نے عکرمہ کی جو روایت ذکر کی ہے وہ زیادہ معتبر ہے اور تاریخی حوالہ سے بھی اس کی تائید وتصدیق ہوتی ہے کیونکہ سورۂ نساء کے نزول کی تاریخ سے اسی کی مناسبت ظاہر ہوتی ہے۔

تفسیر طبری کی روایت

طبری نے اپنی تفسیر میں ابن زید کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت مبارکہ ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا......'' ابودرداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ ایک جنگ میں شریک تھا، ایک مرتبہ لشکر سے دور ہٹ کر کسی غرض سے قریبی درّہ کی طرف چلا گیا، وہاں ایک شخص کو دیکھا جو بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا، اس نے اس شخص پر تلوار سے حملہ کر دیا تو اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے: لا الہ الا اللہ، ابودرداء نے اس کی پرواہ نہ کی اور اسے قتل کر دیا، پھر اس کے مویشیوں کو اپنے ساتھ لے کر لشکر کے پاس آگیا لیکن اپنے کئے کے بارے میں اسے تشویش لاحق ہوگئی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو واقعہ کی خبر دی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۲۹)

ابن حارثہ جہنی کی روایت

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں رویانی، ابن مندہ اور ابونعیم کے حوالہ سے منقول ہے کہ بکر بن حارثہ جہنی نے بیان کیا کہ یہ آیت خود اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۹۳) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بھی ابو درداء جیسا واقعہ پیش آیا، بہرحال ان روایات سے مورد کی تطبیق سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا (یعنی آیت کو ان تمام واقعات پر منطبق کیا جا سکتا ہے)۔

قتل کا کفارہ؟

کتاب ''تہذیب الاحکام'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حسین بن سعید کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے اپنے

اسناد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا فرمان ذکر کیا جس میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کل العتق یجوزله المولود الا فی کفارۃ القتل، فان اللہ تعالیٰ یقول: ''فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ''، یعنی بذلك مقرۃ قد بلغت الحنث'' ہر کفارہ کی ادائیگی میں اس بچے کو دیا جاسکتا ہے جو تازہ پیدا ہوا ہو (نومولود) سوائے قتل کے کفارہ کے، کہ اس میں بالغ غلام کو آزاد کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ'' (مؤمن غلام کو آزاد کیا جائے) اور اس سے مراد وہ غلام ہے جو بالغ ہو کہ جس کا اظہار واقرار قابل قبول ہوتا ہے (ملاحظہ ہو، کتاب تہذیب الاحکام جلد ۸ صفحہ ۳۲۰)

امام موسیٰؑ کاظم کا فرمان

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کسی غلام کا مؤمن ہونا کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: فطرت کی بنیاد پر! (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۶۳)

بلادِ شرک میں مسلمان کا قتل؟

کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس مسلمان کے بارے میں پوچھا گیا جسے بلادِ شرک میں مسلمانوں نے (اسے کافر سمجھتے ہوئے) قتل کردیا ہے، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ جب اس سانحہ کی اطلاع امام المسلمین کو مل جائے تو اسے چاہیے کہ اس کی بجائے ایک مؤمن غلام آزاد کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: ''فَإِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ'' اگر وہ اس قوم سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں جبکہ وہ خود مؤمن ہو تو ایک مومن غلام کو آزاد کریں۔ (من لا یحضرہ الفقیہ، ص ۵۱۰)

اس کی مانند ایک روایت تفسیر العیاشی میں بھی مذکور ہے، اور امامؑ کا یہ فرمان کہ ''اس کی بجائے'' (اس کی جگہ/اس کے بدلے میں) تو اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ غلام آزاد کرنے میں حقیقت اور حکمت یہ ہے کہ اس سے آزاد مؤمنوں کی تعداد میں ایک شخص کا اضافہ ہوجائے گا کیونکہ مؤمن کے قتل کی وجہ سے اس میں کمی آگئی تھی، جیسا کہ اس حوالہ سے

مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور غلام آزاد کرنے کی حکمت بیان ہو چکی ہے۔

اور مؤمن غلام آزاد کرنے کی حکمت کے حوالہ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفارات میں اس کی عمومی حکمت و مصلحت شاید یہ ہو کہ ایک آزاد شخص جو کہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا وہ آزاد مؤمنوں کی تعداد میں اضافہ قرار پائے گا کیونکہ ان میں سے ایک شخص معصیت کے ارتکاب کے نتیجہ میں کم ہوا ہے، (اس مطلب پر اچھی طرح غور کریں) یعنی جب کسی مؤمن نے غلطی و گناہ اور معصیت کے ارتکاب کے نتیجہ میں کفارہ کے طور پر ایک مؤمن غلام کو آزاد کیا جبکہ اس مؤمن غلام نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تو گویا ایک مؤمن کے گناہ کے کفارہ میں ایک مؤمن آزاد ہو گیا جس سے نیک مؤمنوں کی تعداد میں ایک شخص کا اضافہ ہو گیا۔

دو ماہ روزہ رکھنے کا مسئلہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''ان كان على رجل صيام شهرين متتابعين فافطر أو مرض فى الشهر الاول فان عليه ان يعيد الصيام، وان صام الشهر الاول، وصام من الشهر الثانى شيئًا ثم عرض له ماله فيه عذر فعليه ان يقضى'' (اگر کسی شخص پر کفارہ کے پے در پے دو ماہ روزے رکھنا واجب ہوا اور وہ پہلے مہینہ میں ایک دن روزہ افطار کرے (روزہ توڑ دے) تو اس پر لازم ہے کہ دوبارہ پورے ایک مہینہ کے روزے رکھے (اعادہ کرے) اور اگر اس نے پہلے مہینہ کے تمام روزے پے در پے رکھے ہوں اور دوسرے مہینہ کے چند دن روزہ رکھ چکا ہو لیکن کسی وجہ سے دوسرے مہینہ کے روزے پورے نہ کر سکے تو اس پر باقی ماندہ دنوں کی قضا واجب ہے۔ (فروع کافی، جلد چہارم، صفحہ ۱۳۹)

امامؑ کے فرمان ''فعليه ان يقضى'' کے الفاظ سے باقی ماندہ دنوں کے روزے پورے کرنے کا معنیٰ سمجھنا دراصل ''پے در پے'' ادا کرنے کے حکم کی بناء پر ہے۔

عمداً قتل کرنے کی توبہ؟

تفسیر العیاشی اور فروع کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت مذکور ہے کہ آپؑ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی مؤمن کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو کیا اس کے لئے توبہ کی گنجائش موجود ہے اور اس کی توبہ قبول ہو گی؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ان كان قتله لايمانه فلا توبة له، اگر اس نے اسے اس لئے قتل کیا کہ وہ مؤمن ہے تو اس میں توبہ کی

گنجائش نہیں پائی جاتی، اس کی توبہ قابل قبول نہیں ــــــ وان کان قتلهٗ لغضب او لسبب شیٴ من اشیاء الدنیا فان توبتهٗ ان یقاد منهٗ اور اگر اس نے اسے غصہ میں آکر کسی دنیاوی چیز کے لالچ میں قتل کیا ہو تو اس سے انتقام لیا جائے گا اسے سزا دی جائے گی، وان لم یکن علم بهٖ انطلق الیٰ اولیاء المقتول فاقر عندهم بقتل صاحبهم فان عفوا عنه فلم یقتلوه اعطاهم الدیة واعتق نسمة، وصام شهرین متتابعین واطعم ستین مسکیناً توبة الی الله عزوجل اور اگر اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہو سکے (قاتل کا پتہ نہ چل سکے) تو اس پر لازم ہے کہ وہ خود مقتول کے ورثہ کے پاس جائے اور ان کے سامنے اقرار کرے کہ اس نے قتل کیا ہے، پس اگر وہ اسے معاف کر دیں اور قصاص کے طور پر اسے قتل نہ کریں تو انہیں دیت ادا کرے اور ایک غلام آزاد کرے اور دو ماہ پے در پے روزے رکھے اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے کہ یہ سب کچھ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی صورت ہے۔ (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۶۷، فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۲۸۶)

دوزخ کی سزا

کتاب تہذیب الاحکام میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابوسفائح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ مبارکہ "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ" کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "جزاؤه جهنم ان جازاه" اس کی سزا دوزخ ہے اگر خدا اسے سزا دے۔ (تہذیب الاحکام، جلد ۱۰، صفحہ ۱۶۵)

یہی مطلب تفسیر "درمنثور" میں طبرانی اور دیگر کے حوالہ سے ابوہریرہ کی زبانی حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر ذکر کیا گیا ہے، اور یہ روایات جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں انہی نکات پر مشتمل ہیں جن کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ آیات سے انہی کا استفادہ ہوتا ہے، بہرحال قتل اور اس کا بدلہ لینے کی بابت کثیر روایات وارد ہوئی ہیں، اہل فکر و نظر حضرات کتب حدیث کا مطالعہ کر کے اُن سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

عمداً قتل کا اصل واقعہ

تفسیر "مجمع البیان" میں آیہ مبارکہ "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ........" کے ذیل میں مذکور ہے کہ یہ آیت ضبابہ کنانی کے بارے میں نازل ہوئی کہ اس نے اپنے بھائی ہشام کو بنی نجار کے محلہ میں قتل کیا ہوا پایا تو واقعہ کی اطلاع حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیس بن ہلال فہری کو اس کے ہمراہ روانہ فرمایا اور اس سے کہا کہ بنی

نجار سے کہو کہ اگر ہشام کے قاتل کو جانتے ہو تو اسے مقتول کے بھائی کے سپرد کرو تا کہ اس سے قصاص کرے اور اگر تمہیں معلوم نہیں کہ کس نے قتل کیا ہے تو اس کا خونبہا (دیت) اس کے بھائی کو ادا کرو، قیس بن ہلال نے حضرت رسول خدا کا پیغام بنی نجار کو پہنچایا، بنی نجار نے اس کا خوں بہا (دیت) ادا کر دی، جب قیس بن ھلال فہری، ضبابہ کے ہمراہ واپس آ رہا تھا تو شیطان نے ضبابہ کے دل میں وسوسہ ڈال دیا کہ تو نے یہ کیا برا کام کیا ہے اور اپنے دامن پر داغ لگا دیا کہ بنی نجار تیرے بھائی کو قتل کر کے اس کی دیت تجھے دے دیں اور تو یہ رقم لینے پر اکتفاء کرلے؟ بہتر ہے کہ اسی قیس بن ھلال کو قتل کر دے تا کہ اس طرح اپنے بھائی کے بدلہ میں ایک شخص کو قتل کرلے اور اس کے ساتھ ساتھ دیت کا مال بھی تیرے ہاتھ آ گیا ہے، بالآخر شیطان نے اس پر غلبہ کیا اور اس نے قیس کو قتل کر دیا، اور خود اونٹ پر سوار ہو کر کفر کی حالت ہی میں مکہ واپس چلا گیا اور یہ اشعار اس کی زبان پر تھے:

قَتَلْتُ بِهٖ فِهْرًا وَ حَمَّلْتُ عَقْلَهٗ

سُرَاةَ بَنِیْ نَجَّارَ اَرْبَابُ فَارِع

فَاَدْرَكْتُ ثَارِیْ وَاضْطَجَعْتُ مُوَسِّدًا

وَكُنْتُ اِلَی الْاَوْثَانِ اَوَّلُ رَاجِع

میں نے ہشام کے بدلہ میں فہری کو قتل کر دیا اور اس کی دیت بنی نجار کے بزرگوں کے ذمہ میں ڈال دی کہ جو بڑی جائدادوں کے مالک ہیں، اس طرح میں نے اپنے مقتول بھائی کا بدلہ بھی لے لیا اور خونبہا بھی پالیا، اب میں آرام وچین کی نیند سوؤں گا اور میں پھر اپنے بت پرستی کے عقیدہ پر پلٹ گیا اور میں پہلا وہ شخص ہوں جس نے اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ کفر اختیار کرلیا اور اپنے پہلے دین کی طرف پلٹ گیا۔

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لا أومنه فی حلّ ولا حرم" میں اسے حرم کے باہر امان دوں گا اور نہ حرم کے اندر امان دوں گا، (اس سے مراد یہ ہے کہ وہ واجب القتل ہے خواہ جہاں بھی ہو اسے قتل کیا جائے)، اس واقعہ کو ضحاک اور دیگر مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو، تفسیر "مجمع البیان" جلد سوم صفحہ ۹۲)۔

اسی مضمون سے ملتی جلتی روایت ابن عباس، سعید بن جبیر اور ان کے علاوہ دیگر حضرات سے بھی منقول ہے۔

اسامہ بن زید کا واقعہ

تفسیر قمی میں آیہ مبارکہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ......." کے ضمن میں مذکور ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ خیبر سے واپس آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کو ایک

گروہ کے ہمراہ فدک کے علاقہ میں یہودیوں کی کسی بستی میں بھیجا تا کہ اُنہیں اسلام کی دعوت دیں، وہاں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام مرداس بن نہیک فدکی تھا، جب اسے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ حضرت رسولِ خداؐ کی طرف آئے ہیں تو اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کو پہاڑ کے دامن میں چھوڑ کر خود اسامہ کے پاس آیا اور یہ کلمہ وردِ زبان کیا: ''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں) وہ جوں ہی اسامہ کے قریب پہنچا تو اسامہ نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا، پھر اسامہ حضرت رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کو واقعہ کی اطلاع دی، حضرت رسولِ خداؐ نے اس سے ارشاد فرمایا: تو نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں) (قتلت رجلاً شھد ان لا الہ الا اللہ، وانی رسول اللہ؟) اسامہ نے یہ سن کر جواب دیا: یارسول اللہ انما قالھا تعوّذاً من القتل، اے اللہ کے رسول، اس نے یہ الفاظ قتل ہونے کے ڈر سے کہے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''فلا کشفت الغطاء عن قلبہ ولا ما قال بلسانہ قبلت، ولا ما کان فی نفسہ علمت'' (تو نے نہ تو اس کے دل کا پردہ اُٹھا کر دیکھا کہ اس کے دل میں کیا ہے، اور نہ تو نے اس کی زبان پر اعتبار و اعتماد کیا اور نہ ہی تجھے اس کے دل میں چھپی بات کا علم ہوا) تو اس کے باوجود تو نے یہ کیوں کیا؟ اس کے بعد اسامہ نے قسم کھائی کہ وہ کسی اس شخص کو قتل نہ کرے گا جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے، اسی بناء پر اس نے حضرت امیر المومنینؑ کے ہمراہ کسی جنگ میں شرکت نہ کی بلکہ مسلمانوں کے جس گروہ نے آپؑ سے جنگ کی اس میں اسامہ نے روگردانی کی، تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا...... '' (اور تم اس شخص سے کہ جو تم پر سلام کرے (اسلام کا اظہار کرے) یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں، تم دنیاوی زندگی کا مال و متاع چاہتے ہو)

(ملاحظہ ہو، تفسیر القمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۴۸)

مذکورہ بالا مطلب طبری نے اپنی تفسیر میں سدّی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، اور سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں اس آیۂ مبارکہ کے شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات ذکر کی ہیں کہ جن میں سے بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ واقعہ مقداد بن اسود سے مربوط ہے اور بعض روایات میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ابوالدرداء سے ہے۔ بعض روایات میں اسے محلم بن جثامہ سے مربوط قرار دیا گیا ہے اور بعض روایات میں قاتل و مقتول دونوں میں سے کسی کا نام ذکر نہیں کیا گیا بلکہ نہایت مبہم صورت میں واقعہ کو بیان کیا گیا ہے، لیکن جہاں تک اسامہ بن زید کے قسم کھانے اور حضرت علی علیہ السلام سے معذرت خواہی کرتے ہوئے جنگوں میں شریک نہ ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کتب تاریخ گویا ہیں اور ان میں واضح و صریح بیان کے ساتھ اس کا جنگوں میں حاضر نہ ہونا مذکور ہے، واللہ اعلم۔

آیات ۹۵ تا ۱۰۰

○ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

○ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾

○ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾

○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

○ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ

○ ''مؤمنین میں سے جو افراد کسی مجبوری کے بغیر گھروں میں بیٹھے رہیں (جہاد کو نہ جائیں) اور جو افراد اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کریں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھ جانے والوں پر فضیلت عطا کی ہے درجہ بلند کر کے! اور سب سے اللہ نے اچھے انجام کا وعدہ کیا ہے جبکہ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ جانے والوں پر برتری دے کر اجر عظیم سے نوازا ہے۔''

(۹۵)

○ ''اللہ کی طرف سے بہت سے درجات، مغفرت اور رحمت عطا ہوگی، اور اللہ نہایت مغفرت والا، رحمت والا ہے۔''

(۹۶)

○ ''یقیناً فرشتے جن ایسے لوگوں کی جانیں قبض کرتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا، فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر لیتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بُرا مقام ہے۔''

(۹۷)

○ ''لیکن جو مرد، عورتیں اور بچے مستضعف ہیں کہ جو نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی راستہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

(۹۸)

○ ''ایسے افراد کو امید ہے کہ اللہ معاف کر دے اور ان سے درگزر کرے، اللہ تو ہے ہی نہایت درگزر کرنے والا، نہایت بخش دینے والا!۔''

(۹۹)

○ ''اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت اختیار کرے تو وہ روئے زمین پر بہت زیادہ جگہ اور وسیع مقام پائے گا، اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والا بن کر نکلے اور پھر اسے موت آئے تو اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے، اور اللہ نہایت مغفرت عطا کرنے والا، نہایت رحمت والا ہے۔''

(۱۰۰)

تفسیر و بیان

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے

○ ''لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ.......''

(برابر نہیں ہیں گھر بیٹھ جانے والے (جہاد کو نہ جانے والے).........)

اس آیت میں جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں ان کے معانی یہ ہیں: ''الضرر'' اس سے مراد وہ جسمانی کمزوری و نقص ہے جو جہاد و قتال وغیرہ سے مانع ہو، یعنی اس کی وجہ سے میدانِ جنگ میں جانا ممکن نہ ہو مثلاً اندھا پن (نابینائی)، لنگڑا پن اور بیماری، جہاد بالاموال سے مراد یہ ہے کہ دشمنانِ دین پر غلبہ و کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اور جہاد بالانفس سے مراد میدانِ جنگ میں قتال کرنا ہے۔

سب پر خدا کی عنایت

○ ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى''

(اور سب سے اللہ نے نیکی کا وعدہ کیا ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں ''الْقٰعِدُوْنَ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قتال کے لئے میدان میں جانے کو اس وقت ترک کیا جب ان کے جانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان کے علاوہ جو لوگ میدان کو گئے، وہ کافی تھے، یعنی جس قدر افراد کی ضرورت تھی وہ میدان کو چلے گئے، اس کے علاوہ مزید افراد کی ضرورت نہیں بنا برایں اس جملہ ''اور سب سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے'' (خواہ وہ قتال کے لئے گیا ہو یا نہ گیا ہو) سے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلانا ہے تاکہ وہ اس میں

ایک دوسرے پر سبقت لیں اور مسارعت وجلدی کریں، چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولی الضرر یعنی مجبور ومعذور افراد کو مستثنیٰ فرمایا ہے، پھر بیان فرمایا کہ گھر میں بیٹھ جانے والے یعنی میدان کو نہ جانے والے اور مجاہدین یعنی قتال کے لئے میدان کو جانے والے برابر نہیں جبکہ اولی الضرر یعنی مجبور ومعذور افراد مجاہدین فی سبیل اللہ یعنی میدان میں جانے والوں کے ساتھ یکساں نہ ہونے میں قاعدین یعنی میدان میں نہ جانے والوں اور گھر بیٹھ جانے والوں جیسے ہیں۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجبور ومعذور افراد کی خالص و پاکیزہ نیتوں کے صلہ میں انہیں مجاہدین کے برابر قرار دے کر اجر وثواب سے نوازتے ہوئے ان کی مجبوری کی تلافی کی ہے تب بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جہاد وشہادت اور خدا کے دشمنوں پر غلبہ پانا ان فضیلتوں میں سے ہے جن کے لئے وہ میدان کو نہیں جاسکا جبکہ اس کی نیت صاف و پاک تھی اور اسے اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اپنی اس مجبوری ومعذوری کی بناء پر جہاد کرنے سے محروم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاکیزہ نیت کی بناء پر اسے اجر وثواب سے نوازتے ہوئے اس طرح تلافی کردی کہ اگر وہ اپنی مجبوری کی وجہ سے میدان کو نہ جاسکا تو اسے وہی اجر ملے گا جو جہاد کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ تاہم اس کے باوجود میدان میں جا کر قتال کرنے اور دشمنانِ خدا پر غلبہ پانے یا شہادت پانے کی عظمت وشان اور فضیلت سے انکار نہیں ہوسکتا، خلاصہ کلام یہ کہ آیۂ مبارکہ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دلانے اور اس کے لئے آمادہ رہنے کی تاکید کرتی ہے اور ان کی رُوحِ ایمانی کو خیر وفضیلت کے حصول کے لئے سبقت لینے کی بابت بیدار کرنے کے بیان پر مشتمل ہے۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کی برتری

○ ''فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً''

(اللہ نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کو جانے والوں کو قتال کیلئے نہ جاسکنے والوں پر برتری عطا کی ہے)

اس جملہ میں ''لَا يَسْتَوِي'' (برابر نہیں ہیں) کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ اسی لئے ان دو جملوں کے درمیان حرف عطف وغیرہ نہیں ذکر ہوا، اور ''دَرَجَةً'' سے مراد رتبہ ومنزلت ہے۔ اور ''درجات'' کا رتبہ پر رتبہ اور منزلت پر منزلت، یعنی کئی درجے ورتبے، اور جملہ ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' (اور سب سے اللہ نے نیکی کا وعدہ کیا ہے) کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میدان کو نہ جاسکنے والوں اور مجاہدین دونوں کے ساتھ نیکی واحسان اور عنایت کا وعدہ کیا ہے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ مجاہدین کو خاص عنایت سے نوازے گا اسی طرح جہاد وقتال کے لئے میدان میں نہ جاسکنے والوں کو بھی خاص عنایت سے نوازے گا۔ کیونکہ ان کی نیتیں صاف و پاک ہیں اور وہ اپنی مجبوری ومعذوری کی وجہ سے میدان کو نہ جاسکے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ میں یہ مقصود ہو کہ اللہ نے نہ جانے اور نہ جاسکنے اور جانے والوں میں سے ہر ایک کے ساتھ نیکی واحسان اور عنایت کا وعدہ کیا

ہے (جو کہ خداوند عالم کی طرف سے مؤمنین پر عمومی عنایت کی دلیل ہے)۔

لفظ ''اَلْحُسْنٰی'' اس جملے میں وصف ہے کہ جس کا موصوف ذکر نہیں ہوا (وصف محذوف الموصوف) لہٰذا یہاں اس کے ساتھ فہم المعنٰی کے لئے یوں تصور کرنا ہوگا: ''العاقبة الحسنٰی'' یا ''المثوبة الحسنٰی'' یا اس کے مشابہ امور، یہ جملہ دراصل ایک مفروضہ کے ردو جواب کے طور پر ہے کیونکہ جو مؤمن جہاد و قتال کو نہ نکلا ہو تو وہ ''لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ'' کے الفاظ سن کر یہ سوچ سکتا ہے کہ اس صورت میں وہ ہر اجر و ثواب سے محروم ہوا اور اسے اس کے ایمان اور دیگر اعمال صالحہ سے کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا اس طرح کے غلط خیال اور مفروضہ کو رد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے اللہ نے نیکی و احسان کا وعدہ فرمایا ہے (وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى)

مجاہدین کیلئے درجات، مغفرت ورحمت

○ ''وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً''

(اور اللہ نے مجاہدین کو فضیلت عطا کی جو کہ عظیم اجر، اپنی طرف سے درجے و منزلتیں اور بخشش و رحمت ہے)

ان جملوں میں جو فضیلت و برتری مذکور ہے وہ پہلے ذکر کی گئی فضیلت و برتری کی تشریح و تفصیلی بیان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرا فائدہ بھی ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے اس مطلب کی طرف اشاراتی تذکرہ ہے کہ مؤمنین اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی بناء پر کہ جو اس نے جملہ ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' میں سب سے نیکی و احسان اور عنایت کا وعدہ فرمایا ہے، سستی و کوتاہی اور کاہلی و بے توجہی کا مظاہرہ نہ کریں اور ایسا نہ ہو کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی بابت بے رغبتی برتیں بلکہ ان پر واجب و لازم ہے کہ اعلائے کلمۂ حق اور باطل کو مٹانے کی بابت بھرپور سعی و کوشش کریں کیونکہ مجاہدین کو قاعدین (جہاد کو نہ جانے والوں پر) جو فضیلت و برتری حاصل ہے اسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں مغفرت و رحمت کا جو وعدہ ہوا ہے اسے معمولی قرار دیا جا سکتا ہے۔

آیت کی اہم ترین خصوصیات

آیۂ مبارکہ کا سیاق عجیب صورتحال کی ترجمانی کرتا ہے اور وہ اس طرح سے ہے:

(۱) اس میں مجاہدین کو تین چیزوں سے مربوط و وابستہ کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ ا۔ ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کہ ان کا جہاد اللہ

کی راہ میں ہوا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ ۲۔ دوبارہ ان الفاظ میں تذکرہ ہے: "بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ" اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ ۳۔ تیسری بار یوں مذکور ہے: "فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ" مجاہدوں کو برتری دی، اس میں اموال و انفس کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) مجاہدین کو قاعدین پر فضیلت و برتری کے تذکرہ میں پہلے یوں ارشاد ہوا: "عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً" قاعدین پر ایک درجہ دے کر برتری دی پھر یوں ارشاد ہوا: "دَرَجٰتٍ مِّنْهُ" اپنی طرف سے کئی درجے ومنزلتیں دے کر! اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی حکمت کیا ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ اس میں فضیلت و برتری کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: "وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ" (اللہ نے انہیں فضیلت و برتری عطا کی جو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام بیان اس کا متقاضی ہے کہ جہاد کرنے کو اس کے نہ کرنے پر برتر ہونے کو واضح کیا جائے اور یہ کہ جہاد کو اسی صورت میں فضیلت حاصل ہے جب وہ اللہ کی راہ میں ہو نہ یہ کہ کسی مادی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے ہو، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اسی صورت میں فضیلت کا حامل ہوگا جب اپنی عزیز ترین چیز کی قربانی دے کر کیا جائے مثلاً مال و دولت کہ انسان کی زندگی میں مرغوب ومحبوب ترین چیز ہوتی ہے، اور اس سے بھی زیادہ عزیز ترین چیز جان ہے کہ جو مال سے بھی زیادہ قیمتی اور پیاری ہوتی ہے، اسی لئے جہاد فی سبیل اللہ کو "بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ" کے ساتھ وابستہ کر کے ذکر فرمایا، تو جب انسان اپنی ان عزیز ترین چیزوں کو اللہ کی راہ میں قربان کردے تو اس کو ان پر فضیلت و برتری حاصل ہوگی جو ایسا نہ کریں یا نہ کرسکیں، اسی لئے پہلے یوں ارشاد ہوا: "وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ" تاکہ اس موضوع کی بھرپور وضاحت ہوجائے اور اس حوالہ سے ہر طرح کی غلط فہمی دور ہو، اور پھر جب دوبارہ یوں کہا گیا: "**وفضل الله المجاهدين باموالهم وانفسهم على القاعدين درجة**" تو یہاں دوبارہ ان امور کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی (یعنی "فی سبیل اللہ" ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، یعنی نہ سب کے سب امور اور نہ ہی اُن میں سے بعض امور، کسی کی ضرورت نہ تھی اس لئے سب کے بیان کو چھوڑ دیا گیا۔

اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: "فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً" تو اس میں لفظ "دَرَجَةً" کو نصب (زبر) کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلام میں "تمیز" کے لئے ہے یعنی اس کے ذریعے یہ بیان مقصود ہے کہ فضیلت و برتری درجہ ومنزلت کی بناء پر ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور اس میں یہ بات مذکور وملحوظ نہیں کہ وہ درجہ ومنزلت ایک ہے یا زیادہ ہیں اس لئے اس کی وضاحت مطلوب تھی لہٰذا یوں ارشاد ہوا: "وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ" گویا لفظ "فضل" عطا وعنایت اور اس طرح کے معنی پر

مشتمل ہے اور ''دَرَجٰتٍ مِّنْهُ'' کا بدل یا عطف بیان ہے کہ جس کی بناء پر جملہ ''اَجْرًا عَظِیْمًا'' آیت کا معنٰی یوں ہوگا:

''واعطی اللّٰه المجاهدین اجراً عظیماً مفضلاً ایّاهم علی القاعدین مُعطیًا أو مُثیبًا لهم اجراً عظیماً وهو الدرجات من اللّٰه'' اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو اجر عظیم عطا فرمایا کہ اُنہیں گھر بیٹھ جانے والوں پر فضیلت و برتری عطا کی کہ انہیں جو اجر عظیم عنایت کیا وہ اللہ کی طرف سے حاصل ہونے والے درجات و منزلتیں ہیں، بنابرایں کلام کا پہلا حصہ اس پر مشتمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو قاعدین پر خدائی منزلت و مقام عطا کر کے فضیلت دی ہے، تو اس میں اس خدائی مقام و منزلت کے ایک یا ایک سے زیادہ ہونے کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں، اور پھر سلسلۂ بیان کے آخر میں اس مطلب کو واضح طور پر ذکر کر دیا کہ یہ ایک منزلت نہیں بلکہ کئی منزلتیں اور درجات ہیں اور وہی اجر عظیم ہے کہ جو مجاہدین کو عطا کیا گیا اور انہیں اس سے نوازا گیا۔

اس بیان و وضاحت سے ان حضرات کی غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے جو انہیں آیت کے الفاظ سے لاحق ہوئی اور وہ یہ اعتراض کرنے لگے کہ پہلے ''دَرَجَةً'' ذکر ہوا اور پھر ''دَرَجٰتٍ مِّنْهُ'' ذکر ہوا کہ اس میں تناقض پایا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت الامر اس سے مختلف ہے اور اعتراض کرنے والے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ البتہ بعض مفسرین کرام نے اس اعتراض کے جواب میں جو امور ذکر کئے ان میں سے اکثر یا سب کے سب غیر ضروری زحمت پر مبنی ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱) آیت کی ابتداء میں جس برتری کا ذکر ہے وہ مجاہدین کی مجبور و معذور افراد پر برتری ہے جبکہ آیت کے ذیل میں جس برتری کا ذکر ہے وہ مجاہدین کی غیر مجبور اور غیر معذور افراد پر برتری ہے اور پہلی برتری ایک درجہ کی بنیاد پر جبکہ دوسری برتری کئی درجات کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان کوئی تناقض وٹکراؤ نہیں پایا جاتا۔

(۲) آیت کی ابتداء میں جس ''دَرَجَةً'' کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد دُنیاوی منزلت ہے جیسے مال غنیمت اور نیک نامی وغیرہ جبکہ ''دَرَجٰتٍ'' سے مراد اُخری منزلتیں ہیں جو کہ دُنیاوی منزلتوں سے کہیں زیادہ ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ'' ______ سورۂ اسریٰ، آیت ۲۱ ______ (اور یقیناً آخرت بڑے درجات والی ہے)۔

(۳) ''دَرَجَةً'' سے مراد وہ مقام و منزلت ہے جو لوگوں کو اللہ کے پاس حاصل ہے جو کہ معنوی و روحانی امور میں ہے جبکہ ''درجات'' بہشت کی منزلتیں و درجے ہیں جو کہ مادی و محسوس امور میں سے ہیں۔

یہ ہیں وہ اقوال جو مفسرین نے آیۂ مبارکہ میں مذکور الفاظ ''دَرَجٰتٍ'' کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، لیکن قارئین کرام اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان میں سے کسی بھی قول ورائے کی تصدیق آیت مبارکہ سے نہیں ہوتی۔

اور ''منہ'' میں ''ہ'' کی ضمیر کی برگشت ممکن ہے اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسا کہ اس کا ثبوت ''وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً'' کے الفاظ سے ہوتا ہے لیکن یہ بات تب درست ہوگی جب ان الفاظ (وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً) کو ''درجات'' کی وضاحت کا حامل قرار

دیا جائے اور کہا جائے کہ درجات سے مراد مغفرت ورحمت ہے چونکہ مغفرت ورحمت کا سرچشمہ خداوند عالم ہے اور وہی یہ سب عطا کرنے والا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی برگشت ''اَجْرًا عَظِیْمًا'' کی طرف ہو، پہلی صورت میں ''درجات'' سے مراد مغفرت ورحمت جبکہ دوسری صورت میں اس سے مراد اجر عظیم ہوگا۔

مغفرت اور رحمت

آیت مبارکہ ''وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً'' سے بظاہر یہ مراد ہے کہ یہ درجات کے بیانی الفاظ ہیں یعنی درجات سے مغفرت ورحمت مراد ہے کیونکہ ''درجات'' جو کہ خدائی مرتبے ومنزلتیں ہیں خواہ جو بھی ہوں وہ مغفرت اور رحمت کا مصداق ہیں، اور قارئین کرام سابقہ مباحث میں اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ رحمت جو کہ خدا کی طرف سے نعمت کی عطا سے عبارت ہے اس بات پر موقوف ہے کہ اس سے سرفراز و بہرہ مند ہونے کی راہ میں جو چیز حائل و مانع ہو اسے برطرف کر دیا جائے کہ جسے ''مغفرت'' کہتے ہیں، یعنی مغفرت، رحمت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کر دینے سے عبارت ہے، کہ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر نعمتوں کے مراتب ومنزلتوں میں ہر مقام ومرتبہ اور درجہ وبلند منزلت اپنے بعد والے مرتبہ ومنزلت اور اپنے مافوق مرتبہ ومنزلت کی نسبت ''مغفرت'' ہے، اس بناء پر یہ کہنا قرین صحت ہے کہ اُخروی درجات خواہ جو بھی ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت ورحمت ہے، اور قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر جہاں رحمت اور اس سے مشابہ امور ذکر کئے گئے ہیں ان کے ساتھ ساتھ مغفرت بھی مذکور ہے، مثلاً:

- سورۂ مائدہ، آیت: ۹

  ''مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ'' (مغفرت اور عظیم اجر)

- سورۂ انفال، آیت: ۴

  ''وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ'' (مغفرت اور پاکیزہ رزق)

- سورۂ ہود، آیت: ۱۱

  ''مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ'' (مغفرت اور بڑا اجر)

- سورۂ حدید، آیت: ۲۰

  ''وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ'' (اور اللہ کی طرف سے مغفرت ورضا)

- سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸۶

''وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا''(اور ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں ان دونوں کا ذکر باہم ہوا ہے۔

زیر بحث آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوا: ''وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' (اور اللہ ہے ہی معاف کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا)۔تو ان دو ناموں (غفور، رحیم) کے ذکر کرنے کی وجہ ومناسبت آیت کے مضمون کے تناظر میں ظاہر و واضح ہے خاص طور پر یہ کہ آیت کے ذیل میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً''

اپنے اوپر ظلم کرنے والے

- ''اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ''

(وہ لوگ کہ فرشتے جن کی روحیں قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوتا ہے)

لفظ''توفاهم''کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے ایک ماضی کے صیغہ کے طور پر، اور دوسرے مضارع کے صیغہ کے طور پر، مضارع کا صیغہ قرار دیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ اصل میں''تتوفاهم''تھا، اور دو میں سے ایک حرف''تا''کو تکلم وقرائت میں آسانی وتخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا اس کی مثال درج ذیل آیۂ مبارکہ میں ملاحظہ ہو کہ جس میں حرف''تا'' کو حذف نہیں کیا گیا:

- سورہ نحل، آیت: ۲۸

''اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ''

(وہ لوگ کہ فرشتے جب ان کی روحیں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کے مرتکب ہوئے تھے تو وہ)

زیر نظر آیت مبارکہ میں ظلم سے مراد جیسا کہ اس جیسی آیت یعنی سورۂ نحل کی آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ انہوں نے اللہ کے دین سے روگردانی کی، اور بلادِ شرک اور کفار کے درمیان زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جس کے نتیجہ میں دینی احکام کی عملی پاسداری سے محروم رہے کیونکہ اس ماحول میں ان کے پاس کوئی وسیلہ ہی نہ تھا جس کے ذریعے دینی علوم ومعارف کی تعلیم حاصل کرتے اور ان فرائض کی انجام دہی کا اقدام کرتے جو مقتضائے بندگی ہے، تو اس طرح اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کیا، یہی وہ معنٰی ہے جس کا ثبوت آیت کے سیاق میں پایا جاتا ہے جس میں یوں مذکور ہے: ''قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ'' کہ جب فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کہاں تھے اور کہاں زندگی گزاری، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم روئے زمین پر مستضعف و کمزور بنا دیئے گئے تھے،

(مزید تفصیل وتصدیق اور تاکید کے لئے ان تین آیتوں (۹۷،۹۸،۹۹) کے آخری جملوں تک مطالعہ کریں)۔

ظلم کرنے والوں کے بارے میں خداوند عالم نے سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ ان سے مراد کون لوگ ہیں جبکہ ان آیتوں میں ان کے بارے میں یہ مذکور نہیں کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا یا دوسروں پر ظلم کیا، آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ اعراف، آیت ۴۵ اور سورۂ ہود، آیت: ۱۹:

''لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا''

(اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر، وہ کہ جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا کرنے کے درپے ہوتے ہیں)

ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان میں ''ظلم'' سے مراد دین خدا سے روگردانی اور اس میں کجی و تحریف کرنا ہے۔

قبر میں ظالموں سے پوچھ گچھ

○ ''قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ''

(وہ پوچھیں گے تم کہاں تھے؟)

جملہ ''تم کہاں تھے'' یا ''کس حال میں تھے''؟ سے مراد یہ ہے کہ تم دینداری کے حوالہ سے کس حالت میں تھے؟ اور حرف میمؔ (فیم) دراصل حرف استفہام ہے (ما) اس کا الف، بیان واظہار میں تخفیف کی غرض سے حذف کیا گیا ہے۔

آیت میں فی الجملہ اس امر کا ثبوت ملتا ہے جو کہ روایات میں قبر کے سوال وجواب سے موسوم ہوا ہے، یعنی جب کوئی شخص مرتا ہے اور اسے قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو فرشتے اس سے سوالات کرتے ہیں، یہاں آیت میں بھی اسی کا تذکرہ ہوا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے:

○ سورۂ نحل، آیت: ۲۸ تا ۳۰

''الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ''

(وہ لوگ کہ جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کیا ہوتا ہے وہ ان کے سامنے سرخم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم برے اعمال بجا نہیں لاتے تھے، ہاں خدا بخوبی آگاہ ہے اس سے کہ جو تم عمل

کرتے تھے، پس اب دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں ہمیشہ رہو، تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ بہت ہی برُا ہے، اور تقویٰ اختیار کرنے والوں سے پوچھا گیا کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے، انہوں نے کہا، خیر! جن لوگوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے نیکی (نیک جزا) ہے اور آخرت کا ٹھکانہ خیر (بہتر) ہے۔

مستضعف ہونے کا بہانہ

○ ''قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا''

(وہ کہیں گے کہ ہمیں زمین میں مستضعف و کمزور بنا دیا گیا تھا، وہ (فرشتے) کہیں گے: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی تم اس میں ہجرت کر لیتے)

فرشتوں کا یہ پوچھنا کہ تم کس حال میں تھے (فِيْمَ كُنْتُمْ)؟ دراصل زندگی میں ان کی دینداری کی بابت ہے کہ تم کس حد تک دین دار تھے؟ اور وہ لوگ زندگی میں چونکہ دینداری کی عام مطلوب حالت پر نہ تھے بلکہ دینداری کے حوالہ سے ناپسندیدہ صورت کے حامل تھے، لہٰذا وہ جواب میں اپنی دینداری کے بارے میں بتانے کی بجائے اپنی حالت کے سبب کا اظہار کریں گے، یعنی مُسبّب کی بجائے سبب کو بیان کریں گے اور وہ یہ کہ وہ ایسی سرزمین و علاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے کہ ان کے لئے دین پر عمل کرنا اور دینداری کی اعلیٰ صورت اختیار کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس علاقہ والے طاقتور مشرکین تھے لہٰذا اُنہوں نے ہمیں مستضعف و کمزور کر دیا اور وہ ہمارے اور دین کی تعلیمات پر عمل کرنے میں حائل ہوتے تھے۔

اور چونکہ ان کا یہ کہنا کہ ہمیں کمزور بنا دیا گیا تھا (اگر وہ اپنی اس بات میں سچے ہوں) اس وجہ سے تھا کہ وہ مشرک لوگوں کے علاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور مشرک لوگ اس علاقہ میں بااثر تھے کہ مشرکین کے ہاتھوں سے بچنا اور ان کے مظالم سے چھٹکارا پانا اُن کے لئے مقدور نہ تھا کہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ میں نقل مکانی بھی ان کے بس میں نہ تھی، ان کی یہ بات قرین صحت نہیں کیونکہ صرف اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مستضعف و کمزور ظاہر کریں درست نہیں، لہٰذا فرشتے ان کے مستضعف و کمزور ہونے کے دعوے کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع تھی اور تم نے خود کو جس طرح اس علاقہ میں مقید و محدود کر لیا اس میں تم مجبور نہ تھے اور تمہارے بس میں تھا کہ کسی دوسرے علاقہ میں چلے جاتے اور وہاں زندگی بسر کر لیتے کہ جہاں کوئی شخص تم پر دینداری اختیار کرنے میں مانع و حائل نہ ہوتا، لہٰذا فرشتے ان سے کہیں گے کہ تم حقیقت میں مستضعف و کمزور نہ تھے بلکہ خود ساختہ مستضعف تھے اور تم نے غلط فیصلہ کر کے اس علاقہ میں قیام کرنا اختیار کیا جبکہ وہاں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ آباد ہونا ممکن تھا۔

بنا برایں فرشتوں کا یہ کہنا کہ ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر لیتے'' (اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا) دراصل استفہام یعنی پوچھنا ان کی سرزنش کی غرض سے تھا جیسا کہ جملہ ''فِيۡمَ كُنۡتُمۡ'' (تم کس حال میں تھے) میں ملحوظ ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا سوال (فِيۡمَ كُنۡتُمۡ) حقیقی معنی میں سوال ہو اور ان کی دینداری کی حالت معلوم کرنے کے لئے ہو جیسا کہ سورۂ نحل کی مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہر مرنے والے سے سوال ہوگا خواہ وہ ظالم ہوں یا متقی ہوں، اور دوسرا سوال یقیناً سرزنش کے طور پر ہے کیونکہ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ظالم تھے تو اب ان سے یہ پوچھنا کہ کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی؟ یہ صرف ان کی توبیخ کے لئے ہے۔

فرشتوں کے سوال میں یہ الفاظ کہ ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی؟'' اس میں زمین کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے، تو اس میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ اس میں اشارۃً یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی زمین میں وسعت قرار دی ____ زمین کو وسیع خلق فرمایا ____ اور پھر لوگوں کو ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دی جیسا کہ دو آیتوں کے بعد والی آیت اس کا ثبوت پیش کرتی ہے جس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنۡ يُّهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً'' (اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے تو وہ زمین میں بہت زیادہ ٹھکانے اور وسعت پائے گا)۔

اور زمین کے وسیع ہونے کا حوالہ ہی ''ہجرت'' کے الفاظ استعمال کرنے کا موجب بنا ''فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا'' تو اس کا معنی یہ ہے کہ زمین کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ کی طرف ہجرت کر لیتے، اگر زمین کی وسعت ملحوظ نہ ہوتی تو یوں کہا جاتا: ''فتھاجروا منھا'' کہ جہاں تھے وہاں سے ہجرت کر لیتے لیکن اس کی بجائے ''فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا'' کہا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں ہجرت کرنے کا بیان ہے، ''اس میں'' اور ''اس سے'' ہجرت کرنے کے الفاظ میں موجود معنوی باریکی کی طرف توجہ کرنے سے مقصود واضح ہو جاتا ہے۔

پھر جب فرشتوں کا سوال کرنا اور مرنے والوں کا جواب دینا بیان ہو چکا تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''فَاُولٰٓٮِٕكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا'' کہ بس یہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے، یعنی جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ ظالم ہیں تو اب ان کے انجام کے بارے میں واضح و صریح الفاظ میں بیان کیا گیا کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

مستضعفین کا استثنائی تذکرہ

○ ''اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ''

(سوائے مستضعفین کے، جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے ہوں)

اس جملے میں جن افراد کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ استثنائے منقطع کی بناء پر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جن افراد کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ مستثنیٰ منہ میں شامل نہ تھے، اور انہیں مستضعفین قرار دینے میں یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ جن ظالموں کا تذکرہ ہو چکا ہے وہ مستضعفین میں شمار نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو مستضعفین کے زمرے سے باہر نکالنے پر قادر تھے لہٰذا حقیقی معنیٰ میں مستضعف وہی ہیں جن کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ہوا ہے چنانچہ ان کا تفصیلی بیان ''رجال''، ''نساء'' اور ''ولدان'' (مرد، عورتیں، بچے) کے الفاظ میں ہوگا تاکہ حکم الٰہی واضح و روشن صورت میں پیش ہو اور کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہونے پائے۔

اس کے ساتھ ساتھ مستضعفین کے بارے میں یوں ارشاد ہوا: ''لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا'' (وہ نہ تو کوئی حیلہ اختیار کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی راہ نکال سکتے ہیں)، لفظ ''حِیْلَةً'' گویا اس طرح کے حائل ہونے کے معنیٰ میں ہے اور پھر اسے اس آلہ میں استعمال کیا جانے لگا جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہونے میں کام آتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ایک حالت سے دوسری حالت کے حصول سے تعبیر کیا جائے۔ البتہ اس کا عام استعمال مخفی و پوشیدہ کام میں ہوتا ہے بلکہ مذموم و ناپسندیدہ امور و اعمال میں زیادہ استعمال ہوتا ہے، اور جیسا کہ راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ اس کے اصل الفاظ میں تغیر وتبدل کا معنیٰ پایا جاتا ہے، بنا بر ایں آیت ''لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اس بات کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ مشرکین کی طرف سے انہیں جس طرح کمزور و مستضعف بنا دیا گیا ہے اس سے چھٹکارا پانے کا کوئی حیلہ تلاش کر سکیں اور نہ ہی کوئی ایسی راہ پا سکتے ہیں جو انہیں اس حالت سے نجات عطا کرے کہ جو مشرکین نے ان کی بنا دی ہے (استضعاف)، یہاں ''سبیل'' کہ جس کا معنیٰ راستہ ہے اس سے مراد اس کا وسیع معنیٰ ہے کہ جس میں عام مادی راستہ بھی شامل ہے اور غیر ماڈی راستہ بھی! عام مادی راستہ سے مراد یہ ہے کہ مکہ کے مسلمانوں میں سے جو مدینہ ہجرت کا ارادہ رکھتا ہوا سے مدینہ کا راستہ نہ مل سکے اور غیر مادی راستہ سے مراد ہر وہ کام جس کے ذریعے مشرکین سے نجات حاصل ہو سکے اور ان کے شر و فتنہ سے خلاصی ملے، گویا آیت میں مستضعفین سے وہ افراد مراد لئے گئے ہیں جو نہ تو مدینہ جانے کا راستہ جانتے ہیں اور نہ ہی مشرکین سے خلاصی پانے کا کوئی حل اُن کے پاس ہے۔

مستضعف کا معنیٰ کیا ہے؟

آیۂ مبارکہ سے یہ مطلب معلوم و واضح ہوتا ہے کہ دینی معارف و امور سے ناآگاہی و جہالت اگر قاصر و ناتواں ہونے کی وجہ سے ہو کہ جس میں انسان خود قصوروار نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا عذر قابل قبول ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ دین سے جہالت و ناآگاہی اور دینی شعائر و عبادات کی انجام دہی میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈالنے کو ظلم قرار دیتا ہے کہ جسے وہ معاف نہیں کرتا، پھر اس عمومی حکم سے مستضعفین کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ان

کے استضعاف کی وجہ سے ان کی معذوری کو قبول کرتا ہے، اس کے بعد مستضعف ہونے کے معنی سے اس طرح آگاہی دلاتا ہے کہ اس میں شامل تمام افراد کا تعین ہو سکے اور وہ یہ کہ مستضعف اسے کہتے ہیں جو اپنی راہ میں حائل موانع کو دور نہ کر سکتا ہو، بنا بر ایں وہ سب لوگ اس میں شامل ہیں جو مادی موانع کا شکار ہیں یا غیر مادی موانع سے دوچار ہیں، مثلاً وہ شخص بھی مستضعف کہلاتا ہے جو کسی ایسی مملکت و علاقہ میں مقیم ہو جہاں دینی معارف سے آگاہ ہونے کی کوئی سبیل نہ بن سکتی ہو جیسے وہاں کوئی عالم موجود نہ ہو کہ جس سے دین کی تعلیمات پوری طرح حاصل کی جا سکیں یا یہ کہ معاشرتی صورتحال اس قدر سنگین ہو کہ دینی تعلیمات پر عمل کرنا سخت دشوار ہو اور وہاں سے کوچ کرنا بھی آسان نہ ہو بلکہ وہاں سے ہجرت کرنے میں شدید مشکلات درپیش ہوں کہ جن کو دور کرنا اس کے بس میں نہ ہو مثلاً فکری کمزوری، بیماری، جسمانی نقص، یا مالی طور پر فقر و ناداری جیسے امور حائل ہوں کہ جن کے باعث اس علاقہ سے ہجرت کر کے اسلامی مملکت اور مسلمانوں کے علاقہ میں منتقل نہ ہو سکے، اسی طرح وہ شخص بھی مستضعف کہلاتا ہے جو اپنی ذہنی حالت کی وجہ سے دینی معارف و حقائق سے آگاہ ہونے سے قاصر ہو اور اس کی سوچ دین حق کی طرف جاتی ہی نہ ہو جبکہ وہ نہ تو حق سے کسی طرح کی دشمنی رکھنے والوں میں سے ہو اور نہ ہی حق کو قبول و تسلیم کرنے سے ڈھٹائی کرنے والوں میں سے ہو بلکہ ان لوگوں میں سے ہو کہ اگر حق اس کے سامنے ظاہر و ثابت ہو جائے تو وہ یقیناً اس کا اتباع کرے لیکن مختلف عوامل و اسباب کی وجہ سے حق و حقیقت اس سے پوشیدہ ہوئی اور وہ دین کی تعلیمات و حقائق سے آگاہ نہ ہو سکا۔ تو وہ بھی مستضعف ہے کہ وہ نہ تو کوئی حیلہ و چارہ تلاش کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے جسے اختیار کر کے اس سنگین صورتحال سے چھٹکارا پا سکے، البتہ اس کا سبب یہ نہیں کہ اس نے راستہ تو ڈھونڈ لیا ہے مگر اس پر چل نہیں سکتا کیونکہ حق و حقیقت اور دین کے دشمنوں نے تلوار کے زور پر اسے گھیرے میں لے رکھا ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ عوامل ایسے پیدا ہوئے جن کی عملداری کے نتیجہ میں اس پر غفلت چھا گئی کہ جس کا منطقی اثر یہ ہے کہ اس کے باعث وہ ہر طرح کی توانائی کھو چکا ہے اور اس کی جہالت و ناآگاہی کے باعث اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا، یعنی غفلت کے ساتھ طاقت اور جہالت کے ساتھ ہدایت اکٹھی ہو ہی نہیں سکتی۔

اور آیہ میں جو اطلاق پایا جاتا ہے اسی کے نتیجہ میں مادی و غیر مادی دونوں طرح کا استضعاف اس میں شامل ہوتا ہے کیونکہ آیت کے بیانی اطلاق سے استضعاف کی عمومی علت (وجہ و سبب) کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ یہی عمومی علت دیگر آیات سے بھی ثابت ہوتی ہے مثلاً

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸۶

"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"

(اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتا (مکلف نہیں کرتا) ہر شخص کو اس کے نیک عمل کی جزا اور اس کے بُرے عمل کی سزا ملے گی)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کے بارے میں انسان غفلت کا شکار ہو وہ اس کی قدرت سے خارج ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اس سے باز پُرس نہیں کرے گا، یہی حال اس چیز کا ہے جس سے انسان کو روک دیا گیا ہو کہ وہ اس کی انجام دہی سے قاصر ہوتا ہے تو خدا اس سے اس کی بابت باز پرس نہیں کرے گا۔

بنابرایں زیر نظر آیۂ مبارکہ جس طرح کسی کام کی انجام دہی کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تکلیف یعنی اسے انجام دینے کا حکم مرتفع ہونے کو ثابت کرتی ہے اسی طرح انجام دینے میں معذوری کے موارد کی تشخیص کے قاعدہ کلیۃ سے بھی آگاہی دلاتی ہے اور وہ یہ کہ ہر کام کی انجام دہی کو انسان کی اپنی اختیار کردہ قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی کسی حکم پر عمل نہ کرنے میں اسے قصوروار قرار دیا جاسکتا ہے، بنابرایں جو شخص دین کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو یا اس کی تعلیمات و معارف حقہ میں سے بعض سے نا آگاہ ہو تو اگر اس کی جہالت و نا آگاہی اس کی اپنی تقصیر و کوتاہی اور غلط فیصلہ کا نتیجہ ہو تو اس کا دینی فرائض ادا نہ کرنا گناہ و معصیت قرار پائے گا اور وہ اس کا ذمہ دار ہوگا اور اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، لیکن اگر اس کی جہالت و نا آگاہی اس کی تقصیر اور کوتاہی کی وجہ سے نہ ہو یا تقصیر و کوتاہی کے بعض ابتدائی لازمی امور سے مربوط نہ ہو بلکہ ان عوامل کا نتیجہ ہو جو اس کے اختیار میں نہ ہوں کہ جو اس کی دینی معارف سے جہالت یا غفلت یا فرائض کی عدم ادائیگی کا سبب بنے ہوں تو اس صورت میں اس کا کسی فریضہ کو ترک کرنا اس کا ارادتی و اختیاری قرار نہیں پائے گا اور نہ ہی اسے معصیت کار، جان بوجھ کر نافرمانی کرنے والا، حق کا منکر اور اس سے روگردانی کا مرتکب سمجھا جائے گا، لہٰذا وہ جو نیک عمل انجام دے اس کی جزاء اسے ملے گی اور جو بُرا عمل انجام دے اس کی سزا پائے گا لیکن اگر اپنے قصد و اختیار سے کوئی کام انجام نہ دے یعنی اس کام کے اچھا یا بُرا ہونے سے غافل و بے خبر ہو تو نہ اس کی جزا پائے گا اور نہ ہی سزا!

ان مطالب سے واضح ہوتا ہے کہ مستضعف سے مراد تہی دست ہے یعنی خالی ہاتھ، کہ اس کے پاس کچھ نہیں (بے چارہ) نہ کوئی جزا اس کے لئے ہے اور نہ ہی کوئی سزا، کیونکہ اس نے گویا کچھ کیا ہی نہیں، نہ اپنے عمل کے خیر ہونے سے باخبر ہے کہ جس کی جزا پائے اور نہ ہی اس کے شر ہونے سے آگاہ ہے کہ جس کی سزا پائے، لہٰذا اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ اسی زیر نظر آیت کے آخری الفاظ سے ثابت ہوتا ہے جن میں یوں ارشاد ہوا: ''فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا'' (انہی لوگوں کے بارے میں ممکن ہے اللہ ان سے درگزر کرے اور اللہ ہی ہے درگزر کرنے والا، معاف کرنے والا) اور اسی کے مانند درج ذیل آیت میں یوں ارشاد ہوا۔

O سورۂ برائت، آیت: ۱۰۶

''وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ''

(اور دیگر افراد کا معاملہ اللہ کے فیصلہ سے وابستہ ہے کہ یا وہ انہیں سزا دے اور یا انہیں معاف کردے، اور اللہ آگاہ

ترو دانا ہے)۔

اور چونکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ انہیں اپنی رحمت سے نواز کر ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔

عفوو درگزر کی امید

○ ''فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ''

(انہی لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ اللہ ان سے درگزر کرے)

وہ لوگ اگرچہ جان بوجھ کر کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ وہ اپنی جہالت و ناآگاہی کی وجہ سے بے قصور ہیں لیکن ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر شخص شقاوت و بدبختی اور سعادت وخوش بختی کے دوراہے پر کھڑا ہے اور اس کی شقاوت و بدبختی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے لئے سعادت کے حصول کو یقینی نہ بنا سکے، اس وجہ سے کوئی انسان اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کے عفوودرگزر سے بے نیاز نہیں کیونکہ اس کے ذریعے شقاوت کے آثار محو ہو جاتے ہیں خواہ وہ انسان نیک وصالح ہو یا برے اعمال کا مرتکب ہو یا نیک و بداعمال میں سے کچھ بھی نہ کرنے والا ہو۔ ہر حال میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا محتاج ہوتا ہے، اسی بناء پر خداوند عالم نے ان کے عفوودرگزر کئے جانے کی امید کا تذکرہ فرمایا ہے (عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ)۔

یہاں ایک اہم نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ ان کے معاف کئے جانے کی امید کا تذکرہ کرنے کے فوراً بعد ارشاد فرمایا: ''وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا'' کہ اللہ تو ہے ہی عفوودرگزر کرنے والا، معاف کرنے والا! تو اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مستضعفین کو عفو الٰہی ضرور حاصل ہوگی کیونکہ اُنہیں ان ظالموں سے مستثنیٰ کر کے ذکر کیا گیا ہے کہ جنہیں نہایت بُرے انجام یعنی دوزخ کے ٹھکانہ کی وعید دی گئی ہے۔ گویا امید کے ساتھ ان سے درگزر کئے جانے کا تذکرہ اور پھر اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا حوالہ کہ وہ درگزر کرنے والا، معاف کرنے والا ہے دراصل مستضعفین کی استثنائی صورت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ اُنہیں ظالموں کی طرف سے جس طرح سختیوں کا نشانہ بنایا گیا اور وہ کمزور ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کرے گا کیونکہ وہ تو ہے ہی درگزر کرنے والا! ـــــ م

اللہ کی راہ میں ہجرت

○ ''وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً''

(اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے تو وہ زمین میں ۔۔۔۔)

راغبؒ نے کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے کہ ''رغام'' (ر پر زبر کے ساتھ) کا معنیٰ نرم مٹی ہے، اور عام طور پر جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے یعنی ''رغم أنف فلان رغمًا'' (اس نے فلاں شخص کی ناک زمین پر رگڑ دی) تو اس میں کہنے والا اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، اور جملہ ''ارغمه غيره'' میں بھی یہی مقصود ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

اذا رغمت تلك الأنوف لم أرضها

ولم اطلب العتبى ولكن أزيدها

(جب میں ناکیں رگڑ دوں گا تو انہیں خوش نہیں ہونے دوں گا، اور میں معذرت خواہی بھی نہیں چاہوں گا بلکہ ان کی سختیوں میں اضافہ کر دوں گا)

اس شعر میں ''رغم'' کا تقابل ''رضی'' سے ہوا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد ناراضگی اور ناراض کرنا ہے کیونکہ بابِ افعال اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ''رَغم'' کو ''اِرغام'' کے صیغہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے: ''أرغم الله انفهٗ'' (خدا نے اس کی ناک مٹی پر رگڑ دی) تو اس میں ''ارغم'' ''اسخط'' کا معنیٰ دیتا ہے اور ''راغم'' بھی ''ساخط'' (ناراض) کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ اس کا مورد یہ ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے کی ناک زمین پر رگڑنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس لفظ کا استعمال باہمی نزاع کے مورد میں مجازاً ہوتا ہے، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے: ''يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا'' (وہ زمین میں رہنے سہنے کے کھلے مقامات بہت زیادہ پائے گا)، تو اس سے مراد یہ ہے کہ اسے بہت سی راہیں مل جائیں گی کہ جب اسے کسی غلط کام یا گناہ و معصیت کا سامنا ہوگا کہ جس پر وہ غضب ناک ہو تو اس سے بچ نکلنے کی راہ اسے مل جائے گی چنانچہ اسی بناء پر کہا جاتا ہے: ''غضبت الى فلان من كذا'' (میں فلاں وجہ سے اس پر ناراض ہوا) اسی طرح یوں بھی کہا جاتا ہے: ''رغمت اليه'' تو اس میں غضب و رغم دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں، (یہاں تک راغب کا بیان تمام ہوا)۔

بنا بر ایں آیت مبارکہ کا معنیٰ یہ ہے: ''وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' (جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے) یعنی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے علمی و عملی طور پر دینی تعلیمات سے آراستہ ہو تو وہ اپنے لئے روئے زمین پر بہت زیادہ مقامات پائے گا کہ جب کوئی چیز اس کی راہ میں مانع و حائل ہوگی کہ جس کی وجہ سے وہ اللہ کے دین پر قائم رہنے اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کی بابت دشواریاں دیکھے گا تو اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کر لے گا اور اس طرح وہ حائل ہونے والے کی ناک زمین پر رگڑ دے گا اور اسے شدید غضب و غصہ سے دوچار کر دے گا، یا یہ کہ اس طرح اس سے نزاع کرے گا کہ اس وقت اسے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی زمین میں اس کے لئے کھلی جگہیں موجود ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات مبارکہ میں ارشاد

فرمایا: ''اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً'' (کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی؟) تو اس کے بعد اگر یوں ارشاد ہوتا: ''وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً'' (جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے تو وہ زمین میں وسعت پائے گا) تو بات بظاہر پوری ہو جاتی، لیکن اس میں ''مُرٰغَمًا كَثِيْرًا'' کا اضافہ کیا گیا جو کہ زمین میں وسعت کا لازمی امر ہے تو اس کی حکمت بظاہر یہ لگتی ہے کہ اسی سے آیت کا اصل مقصود اور کلام کی غرض و غایت کا حصول ممکن بلکہ یقینی ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو مؤمنین بلادِ کفر و شرک میں رہتے ہیں اور حالات کے سبب نا امیدی کا شکار ہیں اُنہیں نصیحت و رہنمائی کی جائے اور اُنہیں ہجرت کرنے پر آمادہ کرتے ہوئے ان کے اطمینان و تسلی کا سامان کیا جائے۔

ہجرت کا نتیجہ و اجر

○ ''وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ''

(اور جو شخص اپنے گھر سے نکلے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والا بن کر.......)

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کا جو ذکر ہوا ہے اس سے کنایۃً بلادِ اسلامیہ کی طرف ہجرت کرنا مراد ہے کہ جہاں قرآنِ مجید اور سنت نبوی ﷺ سے آگاہی اور اس پر عمل کرنے کی راہیں اور مواقع میسر آتے ہیں۔

اور جملہ ''ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ'' (پھر اسے موت درک کر لے) سے استعارۃً اس مطلب کی طرف کنایہ و اشارہ ہے کہ موت واقع ہو جائے یا ناگہانی آ جائے۔ کیونکہ درک کرنے کا لفظی طور پر یہ معنیٰ ہے کہ جو شخص پیچھے رہ گیا ہو وہ اس سے مل جانے کی کوشش کرے جو آگے نکل چکا ہے کہ اس تک پہنچ جائے، اسی طرح جملہ ''فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ'' (کہ بے شک اس کا اجر اللہ پر لازم ہو گیا) بھی استعارۃً اس مطلب کی طرف کنایہ و اشارہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنے والے کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس یقینی و محفوظ ہے کہ اللہ نے اسے اپنے ذمہ میں لے لیا ہے لہٰذا وہ بندہ اللہ سے یقینی طور پر وہ اجر پائے گا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں اس بندہ کے لئے اجر جمیل اور ثواب جزیل مقرر ہے کہ وہ شخص لامحالہ اس سے بہرہ ور ہو گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے مقام خدائی کے ساتھ اس شخص کو پورا پورا اجر و ثواب اور جزا عطا فرمائے گا کیونکہ کوئی چیز اس کے دست قدرت سے خارج نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اسے ناتواں و عاجز کر سکتی ہے بلکہ جس چیز کا وہ ارادہ کرے اسے کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ خداوند عالم اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور جملہ ''وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' پر

سلسلۂ بیان کا اختتام اس لئے ہوا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ جمیل کی بابت تاکید ہو جائے کہ وہ یقینی طور پر اجر وثواب عطا فرمائے گا اور ہجرت کرنے والے عبد کو پوری پوری جزا سے نوازے گا۔

مؤمنین کی مختلف اقسام

زیر نظر آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین یعنی دار الایمان اور دار الشرک میں بسنے والوں کے ادعائے ایمان کے حوالہ سے ان کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی حالت وحیثیت کے مطابق اس کی جزاء کو بھی بیان فرما دیا تا کہ پند ونصیحت اور دار الشرک میں بسنے والوں کو دار الایمان کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب وتشویق کا سبب بنے کہ وہاں ایک ایمانی معاشرہ تشکیل پائے اور سب کے یکجا ومجتمع ہونے سے ایک مضبوط اسلامی دنیا وجود میں آ سکے کہ جس میں اعمالِ صالحہ اور تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ باہمی تعاون و یکجہتی کو فروغ حاصل ہو اور پرچم حق سربلند ہو اور ہر طرف توحید و دین اسلام کے جھنڈے لہراتے ہوئے دکھائی دیں۔

اِدّعائے ایمان کرنے والوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جس نے دار الاسلام میں قیام کیا اور وہی ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے ہیں۔ ان میں سے دوسرا گروہ وہ ہے جو کسی قابل قبول عذر کے بغیر جہاد سے روگردانی کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے، اور انہی میں سے تیسرا گروہ وہ ہے جو قابلِ قبول عُذر کی بناء پر جہاد کو جانے کی بجائے گھروں میں بیٹھ گئے، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے اچھا وعدہ فرمایا ہے جبکہ گھر بیٹھ جانے والوں پر ان لوگوں کو فضیلت وبرتری عطا فرمائی جو جہاد کو نکلے اور اللہ کی راہ میں دشمنانِ دین سے نبرد آزما ہوئے۔

ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جو دار الشرک میں مقیم ہوئے، ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جنہوں نے جان بوجھ کر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے سرتابی کی کہ اس طرح اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے جو کہ نہایت بُرا ٹھکانہ ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے اپنے کمزور وناتواں یعنی مستضعف ہونے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کی کہ نہ تو وہ کوئی راستہ ڈھونڈ پائے اور نہ ہی کوئی راہِ حل انہیں مل سکی، امید ہے ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا۔

تیسرا گروہ وہ جو مستضعف نہ تھے بلکہ اپنے گھروں سے نکلے یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی مگر انہیں راستہ ہی میں موت نے گھیر لیا تو ایسے افراد کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہو گیا۔

ان تمام مطالب کے باوجود یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ زیر نظر آیات مبارکہ اپنے مندرجات کے حوالہ سے ہر دور پر

منطبق ہوتی ہیں اگر چہ ان کا زمانہ نزول عہد نبوی ﷺ ہے جس میں جزیرۃ العرب میں مقیم مسلمانوں کے حالات اور زمینی حقائق ملحوظ قرار پائے جو کہ آنحضرت ﷺ کی مدینہ کو ہجرت کرنے اور فتح مکہ کے دوران کا زمانہ ہے، اس دور میں خطۂ ارضی دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالشرک، دارالاسلام یعنی مملکت اسلامیہ کہ جس میں اہل اسلام اپنے دینی فرائض نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتے تھے وہ مدینہ اور اس کے اطراف کا علاقہ تھا، اس علاقہ میں کوئی مشرک اہل اسلام کے کسی بھی کام میں کوئی دخل اندازی نہ کرتا تھا اور نہ ہی ان سے الجھاؤ اور نزاع کرتے تھے، جبکہ دوسری جانب دارالشرک تھا جس میں مشرکین بستے تھے جو اپنی بت پرستی پر قائم تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور ان کے امور دینی معاملات میں ان سے نزاع کرتے رہتے تھے بلکہ ان کی بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو اذیت و آزار دے کر انہیں کفر کی طرف پلٹا دیں۔

لیکن جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ زیر نظر آیاتِ مبارکہ میں جو معیار مورد توجہ ہے وہ دائمی صورت میں ہمیشہ ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ اس معیار پر پورا اترتے ہوئے دینی تعلیمات حاصل کرے، دینی شعائر کی عملی پاسداری کرے اور دینی احکام پر عمل کرے، اس کے ساتھ ساتھ اس پر لازم ہے کہ ان ممالک وعلاقوں سے ہجرت کرے اور انہیں خیر باد کہے جہاں دینی امور واحکام اور معارف وتعلیمات سے آگاہ ہونے کے اسباب و ذرائع موجود نہ ہوں اور نہ ہی دینی فرائض کی ادائیگی ممکن وآسان ہو خواہ وعلاقے وممالک دارالاسلام کہلائیں یا دارالشرک کہلائیں، ناموں کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل مسئلہ کام کا ہے کیونکہ دورِ حاضر میں ناموں میں اس قدر تبدیلی واقع ہو چکی ہے کہ صرف نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں ان کی حقیقتیں ختم ہو گئی ہیں، ان کی طرف توجہ وعملی التفات باقی ہی نہیں رہا اور صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ دین کا نام صرف شناختی نشانی کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اسلام برائے نام باقی ہے اور اس کی تعلیمات اور اعتقادی حقائق کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا اور نہ ہی اس کے احکام ودستورات پر عمل کیا جاتا ہے۔

اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو وہ اسلام کی اصل بنیاد وحقیقت کو مورد توجہ قرار دیتا ہے اور اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعتقاد وعمل پر آثار مرتب کرتا ہے، یعنی قرآنی آیات مبارکہ میں لوگوں کو دین پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ دین پر عمل کرنا ہی کرنے کا اصل کام اور اسلام کی حقیقی روح ہے ظاہری صورت کی کوئی حیثیت نہیں، اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں کہ جن میں عمل کو اصل واساس اور حقیقی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۲۴

”لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ ؕ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ ۙ وَ لَا یَجِدۡ لَہٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا ﴿۱۲۳﴾ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا ﴿۱۲۴﴾“

(تمہاری خواہشوں اور نہ ہی اہل کتاب کی خواہشوں کی کوئی حیثیت ہے بلکہ جو شخص بُرا عمل انجام دے اسے اس کی سزا ملے گی اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا دوست و مددگار نہ پائے گا، اور جو شخص نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مؤمن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۶۲

''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲''

(جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہیں، اور نصرانی ہیں اور صابئین ہیں ان میں سے جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور عمل صالح انجام دیئے تو ایسے لوگوں کا اجر ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)۔

روایات پر ایک نظر!

ابن عباس کی زبانی تاریخی حقائق

تفسیر ''در منثور'' میں ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ سے، اور بیہقی نے اپنی کتاب السنن میں ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ اسلام لائے مگر وہ اپنا اسلام لانا پوشیدہ رکھتے رہے، یہاں تک کہ جنگ بدر واقع ہوگئی تو مشرکین اُنہیں مشرک سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ میدان میں لے گئے کہ جن میں سے بعض زخمی ہوئے اور بعض مارے گئے، تو مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے وہ مسلمان بھائی تھے کہ جنہیں زبردستی میدان میں گھسیٹا گیا، لہٰذا وہ ان کے لئے مغفرت کی دعائیں مانگنے لگے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ.......''

ابن عباس نے اپنے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس آیت کو لکھ کر مکہ میں پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کے لئے بھیجا گیا کہ اب ان کے پاس اس کے بعد کوئی عذر باقی نہیں، لہٰذا وہ گھروں سے نکل پڑے، راستہ میں مشرکوں نے انہیں گھیر لیا اور ان پر تشدد کیا، تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللهِ...... الخ" (لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں مگر جوں ہی وہ لوگوں کی طرف سے سختی و تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ ان لوگوں کی اذیت و آزار کو اللہ کے عذاب کی مانند سمجھنے لگتے ہیں.....) ___ سورۂ عنکبوت، آیت ۱۰ ___ جب مکہ کے مسلمان اس آیت سے باخبر و آگاہ ہوئے تو بہت افسردہ ہوئے اور ہر خیر سے ناامید ہونے لگے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (پھر تیرا پروردگار ان لوگوں کے لئے کہ جنہوں نے اذیت و آزار اور سختی و تکلیف سے دوچار ہونے کے بعد جہاد کیا اور شدتوں میں صبر سے کام لیا مغفرت و رحمت والا ہے، بے شک تیرا پروردگار بہت مغفرت والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے) ___ سورۂ نحل، آیت ۱۱۰ ___، اس آیت کو بھی مسلمانوں نے مکہ کے مسلمانوں کو لکھ کر بھیج دیا اور اس کے ساتھ اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مشرکین سے نجات کا راستہ بنا دیا ہے لہٰذا تم موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مکہ سے باہر نکل آؤ، چنانچہ مکہ کے مسلمان وہاں سے نکل پڑے مگر اس دفعہ بھی مشرکوں نے ان کا تعاقب کیا تو ان میں سے کچھ بچ نکلے اور کچھ مارے گئے۔ (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۲۰۵)

ضحاک کا بیان

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے روایت کی ہے کہ ضحاک نے زیر نظر آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ منافقین کے اس گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے وقت روگردانی کی اور مکہ سے مدینہ کو نہ گئے جبکہ وہ جنگ بدر میں مشرکین کے ساتھ نکل پڑے اور انہیں قریش کے ان مشرک افراد کے ساتھ دیکھا گیا جو اس جنگ میں مارے گئے کہ خداوند عالم نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی (لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ.......)

قول و فعل میں تضاد

زیر نظر آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں ابن جریر نے ابن زید کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور ان کے ساتھ ایمان ظہور پذیر ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ نفاق نے بھی سر اٹھا لیا، اس وقت کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! اگر ہمیں ان مشرکوں سے ڈر نہ ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ برا سلوک کریں گے اور ہمیں اذیت و آزار کا نشانہ بنائیں گے تو ضرور اسلام قبول کر لیتے لیکن ہم آپ کے سامنے گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (نشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله) وہ لوگ یہ بات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اکثر کرتے رہتے تھے مگر جب جنگ بدر کا دن آیا تو مشرکین سامنے آگئے اور کہنے لگے کہ تم میں سے جس نے بھی ہمارا ساتھ نہ دیا اور ہمارے ساتھ جنگ میں نہ نکلا تو ہم اس کا گھر بار تباہ و برباد کردیں گے اور اس کا مال و دولت اس سے چھین لیں گے، چنانچہ ان کے اس اعلان کے بعد وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے تھے کافروں کے ساتھ ہوگئے کہ جن میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ قیدی ہوگئے، تو جو لوگ مارے گئے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ'' کہ ان سے کہا گیا: ''اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا'' (کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرلیتے، ان لوگوں کے لئے دوزخ ہے جو کہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے) یعنی تم ہجرت کرلیتے اور جن لوگوں نے تمہیں کمزور و مستضعف بنادیا انہیں چھوڑ دیتے____، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں سے ان افراد کا عذر قبول کرتے ہوئے کہ جنہوں نے سچ بولا اور کہا کہ ہم مجبور تھے اور ہمارے سامنے کوئی چارۂ کار باقی نہ تھا، یوں ارشاد فرمایا: ''فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ'' (ان لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ اللہ ان سے درگزر کرے) یعنی خداوند عالم ان افراد کو معاف کردے جنہیں مستضعف بنادیا گیا تھا اور وہ مجبوراً مشرکین کے ساتھ قیام پذیر تھے، اور جو لوگ قید ہوگئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ سے عرض کرتے تھے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں اور ہم ان لوگوں (مشرکین) کے ساتھ ان کے ڈر کی وجہ سے نکلے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ...... وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ'' (سورۂ انفال، آیت: ۷۰) ____اے نبی! جو لوگ آپ کے ہاتھوں میں قید ہوچکے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں خیر و اچھائی پائے تو تمہیں اس سے کہیں بہتر عطا کرے گا جو تم سے لے لیا گیا ہے اور تمہیں معاف کردے گا____ تمہارا وہ گناہ بخش دے گا کہ تم مشرکین کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کرنے نکل پڑے تھے____ اور اگر ان کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت کرنے کا ارادہ ہو تو انہوں نے اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ سے خیانت کی____ کہ مشرکوں کے ساتھ ہوگئے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان پر تسلط عطا کیا اور آپ نے ان پر قابو پالیا۔

عکرمہ نے منافقین کی نشاندہی کی

عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کی ہے کہ عکرمہ نے آیۂ مبارکہ: ''اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ..... الخ'' کے ضمن میں کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے: قیس بن فاکہ

بن مغیرہ، حارث بن زمعہ بن اسود، قیس بن ولید بن مغیرہ، ابوالعاص بن منبہ بن حجاج اور علی بن امیہ بن خلف، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب قریش کے مشرکین اور ان کے ساتھی ابوسفیان بن حرب کی حمایت و دفاع میں مکہ سے نکلے تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کا راستہ روکیں کہ وہ ابوسفیان کے لشکر پر حملہ نہ کرسکیں، اور نخلہ کے دن کا بدلہ لیں تو اپنے ہمراہ چند جوان بھی لے آئے کہ جوان کے ساتھ جانا پسند نہ کرتے تھے کیونکہ وہ اسلام لاچکے تھے تو اچانک انہیں لشکر اسلام کا سامنا ہو گیا تو وہ بدر میں مارے گئے جبکہ انہوں نے کفر اختیار کر لیا تھا اور اسلام سے منحرف ہو گئے تھے (یہاں تک عکرمہ کا بیان تمام ہوا)۔

مذکورہ بالا روایات کے لئے ملاحظہ ہو، تفسیر ''در منثور'' جلد دوم۔ ص ۲۰۵، ۲۰۶)

مذکورہ روایات کے ہم معنی متعدد دیگر روایات بھی عامہ کی کتب میں ذکر کی گئی ہیں، اگر چہ ان روایات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مندرجات تطبیقی حیثیت رکھتے ہیں یعنی واقعہ و افراد کے تعین کا کام دیتے ہیں جو کہ ایک اچھا تطبیقی عمل ہے، تاہم جو اہم ترین مطلب ان روایات سے اور زیر نظر آیات مبارکہ میں تدبر سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد مکہ میں منافقین موجود تھے، یہ مطلب ہماری بحث اور جاری سلسلۂ بیان میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس سے مربوطہ مطالب سورۂ برائت کی تفسیر میں ذکر کئے جائیں گے انشاءاللہ تعالیٰ۔

دورانِ ہجرت مرنے والے کا اجر

تفسیر ''در منثور'' میں مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: مکہ میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام ضمرہ تھا اور وہ قبیلۂ بنی بکر سے تعلق رکھتا تھا، وہ بیمار تھا اور اس نے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ مجھے مکہ سے باہر لے جاؤ کیونکہ یہاں سخت گرمی کی وجہ سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، اس کے اہل خانہ نے اس سے پوچھا کہ کہاں چلیں تو اس نے اپنے ہاتھ سے مدینہ کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ وہ اسے وہاں سے لے چلے مگر وہ مکہ سے دو میل دور فوت ہو گیا، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ'' جو شخص اپنے گھر سے نکلے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والا بن کر، پھر اس پر موت آجائے تو اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا ــــــ، (تفسیر ''در منثور'' ج ۲ ص ۲۰۷)

اس سلسلہ میں کثیر روایات وارد ہوئی ہیں لیکن ان میں اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون تھا؟ بعض روایات میں اس کا نام ضمرہ بن جندب لکھا ہے اور بعض روایات میں اکثم بن صیفی مرقوم ہے۔ بعض روایات میں ابوضمرہ بن

غیص زرقی مذکور ہے جبکہ بعض میں ضمرہ بن عیص لیثی (قبیلۂ بنی لیث) لکھا ہے، بعض روایات میں جندع بن ضمرہ جندعی جبکہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت خالد بن حزام کے بارے میں نازل ہوئی کہ جو ہجرت کر کے مکہ سے حبشہ جا رہا تھا کہ راستہ میں سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ انتقال کر گیا۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ وہ اکثم بن صیفی تھا، راوی نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا کہ اگر ایسا ہے تو لیثی کا واقعہ کیا ہے؟ تو اُنہوں نے جواب میں کہا کہ یہ واقعہ لیثی کے واقعہ سے بہت پہلے رونما ہوا، اور یہ آیت خاص بھی ہے اور عام بھی ہے، (خاص شخص کے بارے میں بھی ہے اور عمومی ضابطہ کی نشاندہی بھی کرتی ہے) یعنی خاص طور پر اکثم کے بارے میں نازل ہوئی پھر ایک عمومی قاعدۂ کلیہ کی صورت اختیار کر گئی، بہر حال روایات سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین مسلمان ہجرت کے دوران انتقال کر گئے تھے: (۱) اکثم بن صیفی، (۲) لیثی (۳) خالد بن حزام، اب یہ کہ آیت ان میں سے کس کے بارے میں نازل ہوئی اس کی تطبیق راویوں نے اپنے اپنے حوالہ سے کی ہے۔

مستضعف کون؟

کافی میں زرارہ بن اعین سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے پوچھا کہ مستضعف سے مراد کون ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: هو الذی لا یستطیع حیلة الی الکفر فیکفر، ولا یهتدی سبیلاً الی الایمان، لا یستطیع ان یؤمن ولا یستطیع ان یکفر، فمنهم الصبیان ومن کان من الرجال والنساء علی مثل عقول الصبیان مرفوع عنهم القلم، مستضعف وہ ہے جسے کفر سے بچنے کا کوئی راستہ و ذریعہ نہیں ملتا لہٰذا وہ کفر ہی پر رہتا ہے اور نہ ہی ایمان لانے کی راہ پاتا ہے، لہٰذا وہ نہ تو ایمان لاتا ہے اور نہ ہی کفر اختیار کرتا ہے، چنانچہ بچے بھی انہی میں سے ہیں اور جو مرد اور عورتیں بچوں جیسی عقلیں رکھتی ہیں وہ بھی مستضعف ہیں کیونکہ وہ مرفوع القلم ہیں یعنی ان پر کوئی دینی وعبادتی فریضہ عائد نہیں ہوتا (اصولِ کافی، جلد ۲ صفحہ ۴۰۴)

یہ روایت متعدد اسناد سے زرارہ کے حوالہ سے منقول ہے ــــ اسے علمی اصطلاح میں مستفیضہ کہتے ہیں ــــ چنانچہ اسے کلینیؒ، صدوقؒ، العیاشیؒ اور دیگر محدثین نے مختلف ومتعدد اسناد سے زرارہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی تصدیق

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے اسماعیل جعفی کی روایت ذکر کی ہے جس میں اُنہوں نے کہا کہ میں نے

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ وہ دین کیا ہے جس سے کوئی بندہ ناآگاہ نہیں رہ سکتا؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: الدین واسع ولکن الخوارج ضیقوا علی انفسهم من جهلهم. (دین وسعت رکھتا ہے لیکن خوارج نے اپنی جہالت کی وجہ سے اس کی بابت اپنے آپ کو تنگی میں مبتلا کر دیا ہے) میں نے عرض کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی خدمت میں بیان کروں کہ جس دین پر میں ہوں اس کے بارے میں میرا عقیدہ کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کی: اشهد ان لا اله الا الله وان محمداً عبدهٗ ورسولهٗ، والاقرار بما جاء به من عند الله تعالیٰ، واتولاکم وابرء من اعدائکم ومن رقب رکابکم وتأمر علیکم وظلمکم حقکم. (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اور اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ آنحضرت ﷺ لائے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور میں آپ اہل بیت کی ولایت کا دم بھرتا ہوں، اور میں ہر اس سے بیزاری و برائت کا اظہار کرتا ہوں جو آپ کا دشمن ہے اور جس نے بھی آپ کو محکوم بنایا اور آپ کو اپنی آمریت کا نشانہ بنایا اور آپ کا حق چھین کر آپ پر ظلم کیا) امامؑ نے ارشاد فرمایا: والله ما جهلت شيئاً، هو والله الذی نحن علیه (اللہ کی قسم، تم کسی چیز سے جاہل نہیں ہو، خدا کی قسم یہی وہ دین ہے جس کے ہم معتقد ہیں) میں نے پوچھا کہ جو شخص ان امور سے آگاہی نہ رکھتا ہو کیا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکتا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: الا المستضعفین، ہاں جو مستضعف ہوں وہ بچ سکتے ہیں، میں نے عرض کی کہ وہ کون ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: نساؤکم واولادکم (تمہاری خواتین اور تمہارے بچے) پھر امامؑ نے فرمایا: تم ام ایمن کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ میں تو گواہی دیتا ہوں کہ وہ جنتی ہیں حالانکہ وہ اس قدر تفصیلی معرفت نہ رکھتی تھیں جو تم لوگ رکھتے ہو (فانی اشهد انها من اهل الجنة، وما کانت تعرف ما انتم علیه) (اصولِ کافی، جلد ۲ صفحہ ۴۰۵)

مستضعفین کے بارے میں وضاحتی بیان

تفسیر العیاشی میں سلیمان بن خالد سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے مستضعفین کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: البلهاء فی خدرها والخادم تقول لها: صلی فتصلی، لا تدری الا ما قلت لها، والجلیب الذی لا یدری الا ما قلت لهٗ، والکبیر الفانی، والصبی والصغیر، هٰؤلاء المستضعفون، فاما رجل شدید العنق جدل خصم یتولی الشراء والبیع لا تستطیع ان تعینه، فی شئ تقول: هٰذا المستضعف؟ لا، ولا کرامة (اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اپنے پردوں میں رہتی ہیں (پردہ نشین

نادان خواتین) اور وہ خادمہ کہ جس سے آپ کہتے ہیں: نماز پڑھو، تو وہ نماز پڑھتی ہے۔ اسے سوائے آپ کے حکم و فرماں کے، کچھ معلوم نہیں، اسی طرح وہ غلام کہ جو آپ کی زبان کے حرکت میں آنے کا منتظر ہوتا ہے، اور وہ نہایت بوڑھا شخص کہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہوتا ہے، اور وہ کمسن بچہ و بچی کہ جو ابھی بالغ نہیں ہوئے اور انہیں اپنے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی، ___ تو یہ سب مستضعف ہیں، لیکن وہ شخص جو موٹی گردن والا اور اپنے مدمقابل کے سامنے ڈٹ جاتا ہو اور اپنے تمام معاملات خود ہی انجام دے سکتا ہو تو کیا آپ اسے مستضعف قرار دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، ایسا شخص ہرگز مستضعف کہلانے کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۰۷)

امام صادقؑ کا واضح بیان

کتاب معانی الاخبار میں سلیمان کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ ''اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ..... الخ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: یاسلیمان! فی هؤلاء المستضعفین من هو اثخن رقبة منك، المستضعفون قوم يصومون، ويصلون، تعف بطونهم وفروجهم، ولا يرون ان الحق فی غيرنا، آخذين باغصان الشجرة، فاولئك عسى الله ان يعفو عنهم اذا كانو آخذين بالاغصان، وان يعرفوا اولئك فان عفا الله عنهم فبرحمته، وان عذبهم فبضلالتهم.

اے سلیمان، ان مستضعفین میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو تجھ سے زیادہ طاقتور ہیں، مستضعفین وہ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، عفت و پاکدامنی کے خوگر ہیں۔ اپنے آپ کو حرام کھانے اور حرام کرنے سے بچا کر رکھتے ہیں۔ اور وہ ہمارے سوا کسی کو حق پر نہیں سمجھتے۔ وہ شجرۂ نبوت سے پیوستہ و وابستہ ہیں۔ انہی لوگوں سے امید ہے کہ اللہ درگزر فرمائے گا بشرطیکہ وہ شجر نبوت کی ٹہنیوں کو تھامے رکھیں اور اُن کی معرفت سے آراستہ ہوں، اگر خداوند عالم اُن سے درگزر فرمائے تو یہ اس کی رحمت ہے اور اگر ان پر عذاب نازل کرے تو یہ ان کی اپنی گمراہی کا نتیجہ ہوگا۔ (معانی الاخبار، صفحہ ۲۰۲)

امام صادقؑ کے فرمان ''ولا يرون ان الحق فی غيرنا'' (وہ ہمارے علاوہ کسی کو حق پر نہیں سمجھتے) میں ان لوگوں کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اہل بیتؑ کے علاوہ دوسروں کو حق پر سمجھتے ہوئے ناصبیت (اہلِ بیتؑ سے دشمنی) کے مرتکب ہوتے ہیں یا مقصر یعنی اہل بیتؑ کو اُن کے مقام و مرتبہ سے نیچے لانے کا قبیح عمل انجام دیتے ہیں وہ مستضعف و بے چارے نہیں، چنانچہ اس مطلب کی وضاحت عنقریب ذکر کی جانے والی روایات میں ہوگی۔

کتاب معانی الاخبار ہی میں ایک روایت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے

ارشاد فرمایا کہ مستضعفین کی کئی قسمیں ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں سے بعض، دوسرے بعض کے خلاف ہیں، لیکن اہل قبلہ یعنی مسلمانوں میں سے جو شخص ناصبی (اہل بیتؑ کا دشمن) نہ ہو وہ مستضعف ہے۔ (معانی الاخبار، صفحہ ۲۰۰)

ناتواں لوگوں کا انجام

کتاب معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: "لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً" سے مراد یہ ہے کہ وہ ناصبیت سے چھٹکارا پانے میں ناتواں ہیں اور انہیں اس قبیح عمل سے نجات پانے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا، اور "وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا" کا مطلب یہ ہے کہ اُنہیں حق کی طرف آنے کا راستہ ہی نہیں ملتا (وہ راہِ حق پانے سے عاجز و قاصر ہیں)، کہ اگر اس طرح کے لوگ نیک اعمال انجام دینے اور حرام کاموں سے اجتناب برتنے کے نتیجہ میں بہشت کے حقدار بھی ہوں تب بھی "ابرار" یعنی خدا کے خالص و مخلص نیک بندوں کے درجات نہیں پاسکتے۔ (معانی الاخبار، صفحہ ۲۰۱، تفسیر العیاشی جلد اوّل، صفحہ ۲۶۸)

ناصبیوں کا بُرا ٹھکانہ

تفسیر قمی میں ضریس کنانی کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشادِ گرامی قدر منقول ہے جس میں انہوں نے کہا کہ میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری جان آپ پر قربان ہو! مجھے آگاہ فرمائیں کہ جو لوگ خدا کی توحید اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں مگر گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے ہیں اور وہ مرتے دم تک نہ تو کسی امام سے آگاہی رکھتے ہیں اور نہ ہی آپ (اہل بیتؑ) کی ولایت سے بہرہ ور ہیں، تو ان کا معاملہ کیسا ہوگا؟ (**جعلت فداك، ماحال الموحدين المقرين بنبوة محمد (ص) من المذنبين الذين يموتون وليس لهم امام ولا يعرفون ولايتكم؟**) امامؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: **اما هؤلاء فانهم فى حفرهم لا يخرجون منها، فمن كان له عمل صالح ولم يظهر منهم عداوة فانه يخدله خدا الى الجنة التى خلقها الله بالمغرب فيدخل عليه الروح فى حفرته الى يوم القيامة حتى يلقى الله فيحاسبه بحسناته وسيئاته، فاما الى الجنة واما الى النار، فهؤلاء الموقوفون لامر الله، قال و كذلك يفعل بالمستضعفين والبله والاطفال واولاد المسلمين الذين لم يبلغوا الحلم، فاما النصاب من**

اهل القبلة فانهٔ یخدلهم خد الی النار التی خلقها الله بالمشرق فیدخل علیه اللهب والشرر والدخان وفورة الحمیم الیٰ یوم القیامة ثم مصیرهم الی الجحیم (جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جن کے بارے میں تو نے کہا ہے تو وہ اپنے گڑھوں (قبروں) ہی میں پڑے رہے ہیں اور ان سے باہر نہیں نکلیں گے، البتہ ان میں سے جس نے اعمالِ صالحہ بجالائے ہوں اور اس نے اہلِ بیتؑ سے دشمنی کا اظہار بھی نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے لئے انہی گڑھوں سے اس بہشت کی طرف راستہ بنائے گا جسے اس نے مغرب میں خلق فرمایا ہے، ان لوگوں کی روحیں انہی گڑھوں میں قیامت تک رہیں گی یہاں تک کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جائیں گے اور وہ ان کی نیکیوں و برائیوں دونوں کا پورا پورا حساب کرے گا کہ اگر وہ بہشت کے حقدار ہوں گے تو بہشت میں داخل کرے گا اور اگر دوزخ کے مستحق ہوں گے تو دوزخ میں بھیج دے گا۔ تو وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمان وفیصلہ کے منتظر ہیں، یہی صورتحال مستضعفین کی ہوگی کہ جن میں ابلہ و نادان افراد، بچے اور مسلمانوں کی نابالغ اولاد شامل ہے۔ لیکن جہاں تک اہل قبلہ میں سے ناصبیوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے انہی گڑھوں (قبروں) سے ان کے لئے اس دوزخ کا راستہ بنائے گا جو اس نے مشرق میں خلق کی ہے اور وہ قیامت تک اس میں چنگاریوں، شعلوں (ہوا اور دوزخ کی تپش) کا شکار ہوں گے یہاں تک کہ اُن کا ٹھکانہ دوزخ میں قرار پائے گا)۔

بہشت کے آٹھ دروازے

کتاب الخصال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی منقول ہے جس میں اُنہوں نے اپنے پدر گرامی قدر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام، اور اپنے جد (حضرت امام زین العابدینؑ) کے حوالہ سے امیر المومنین امام علی بن ابی طالب علیہ السلام کا بیان ذکر فرمایا کہ اُنہوں نے کہا:

"ان للجنة ثمانية ابواب: باب يدخل منه النبيّون والصديقون، وباب يدخل منه الشهداء والصالحون، وخمسة ابواب يدخل منها شيعتنا ومحبونا............وباب يدخل منه سائر المسلمين ممن يشهد ان لا اله الا الله ولم يكن فى قلبه مثقال ذرة من بغضنا اهل البيت(ع)"

بہشت کے آٹھ دروازے ہیں: ایک دروازہ وہ ہے جس سے انبیاء وصدیقین داخل ہوں گے، ایک دروازہ سے شہداء وصالحین داخل ہوں گے، پانچ دروازوں سے ہمارے شیعہ و پیروکار اور محبین داخل ہوں گے..... اور ایک دروازے سے دیگر تمام مسلمان داخل ہوں گے کہ جو اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں اور ان کے دلوں میں ہم اہل بیتؑ سے ذرہ بھر

بغض وعداوت نہیں پائی جاتی۔(خصال، (شیخ صدوقؒ، صفحہ ۴۰۷)

کتاب معانی الاخبار اور تفسیر العیاشی میں حمران کے حوالہ سے منقول ہے، اُنہوں نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے "إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: هم اهل الولاية، وہ اہل ولایت ہیں۔ میں نے پوچھا: ای ولاية؟ کون سی ولایت؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: أما أنها ليست بولاية في الدين، ولكنها الولاية في المناكحة والموارثة والمخالطة، وهم ليسوا بالمؤمنين ولا بالكفار، وهم المرجون لامر الله عزّوجل، اس سے مراد دینی ولایت نہیں ہے، بلکہ اس سے نکاح و وراثت اور باہمی معاشرت کے امور میں ولایت مراد ہے، ایسے افراد نہ تو مؤمن ہیں اور نہ ہی کافر ہیں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے (وہ اللہ کے فیصلہ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں)۔(کتاب معانی الاخبار، صفحہ ۲۰۲، تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۶۹)

امامؑ کے فرمان میں "وهم المرجون لامر الله عزّوجلّ" سے سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۶ کی طرف اشارہ ہے جس میں یوں مذکور ہے: "وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ........."

(اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اللہ کے حکم و فیصلہ کی اُمید پر ہیں کہ یا وہ اُنہیں عذاب میں مبتلا کرے گا یا اُن کی توبہ قبول کرے گا)۔

اس آیت کے ذیل میں مربوطہ مطالب عنقریب ذکر کئے جائیں گے۔ انشاءاللہ

نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی قدر ہے: ولا يقع اسم الاستضعاف على من بلغته الحجة فسمعتها اذنهٗ ووعاها قلبهٗ اسے مستضعف نہیں کہا جا سکتا جس کے پاس حق کی دلیل آ چکی ہو اور اس نے اپنے کانوں سے اس سے سن لیا ہو اور اس کے دل نے اسے محفوظ کر لیا ہو (نہج البلاغہ، صفحہ ۲۷۹)

امام موسیٰ کاظمؑ کا فرمان

کتاب کافی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشادِ گرامی قدر منقول ہے جس میں آپؑ نے اس سوال کے جواب میں کہ "ضعفاء" سے کون مراد ہیں؟ فرمایا: الضعيف من لم يرفع له حجة، ولم يعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فليس بضعيف، ضعیف وہ ہے جس کے پاس حق کی حجت و دلیل نہ پہنچی ہو اور وہ اختلاف سے آگاہی نہ رکھتا ہو، پس اگر وہ اختلاف سے آگاہ ہو (حق و باطل کے درمیان تمیز دے سکتا ہو) تو وہ ضعیف (مستضعف) نہیں۔

(اصولِ کافی، جلد دوم، صفحہ ۴۰۶)

کتاب اصول کافی ہی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے ''مستضعفین'' کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا جبکہ آپ پر نہایت دکھی کیفیت طاری تھی: کیا تم کسی کو مستضعف قرار دے سکتے ہو؟ مستضعف کہاں ہیں؟ خدا کی قسم! تمہارا دین تو ذرہ ذرہ تک پہنچ چکا ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں حق کی بات نہ پہنچی ہو، بلکہ مدینہ کے راستہ میں بیٹھی ہوئی وہ خواتین بھی اس کے بارے میں بحث و گفتگو کرتی رہتی ہیں جو مسافروں اور گزرنے والوں کو پانی پلاتی ہیں۔(اصولِ کافی، جلد ۲ صفحہ ۴۰۴)

ابن اسحاق کی ایک روایت

کتاب معانی الاخبار میں عمر ابن اسحاق کی روایت مذکور ہے کہ اس نے کہا: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ مستضعف کسے کہتے ہیں کہ جس کے بارے میں خداوند عالم نے قرآنِ مجید میں تذکرہ فرمایا ہے تو امامؑ نے ارشاد فرمایا، مستضعف اسے کہتے ہیں جو قرآن مجید کی ایک سورت بھی صحیح طور پر نہ پڑھ سکتا ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اس صورت میں پیدا کیا ہے کہ کسی کو روا نہیں کہ اسے صحیح طور پر نہ پڑھ سکے۔(معانی الاخبار، صفحہ ۲۰۲)

مستضعفین کے معنی و مصداق کی بابت ہماری مذکورہ بالا روایات کے علاوہ بھی دیگر روایات وارد ہوئی ہیں لیکن جو ہم نے بیان و ذکر کی ہیں وہ تمام مربوطہ روایات کی جامع ہیں، اور اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں اگرچہ وہ بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں لیکن ان کے بیانات و مندرجات سے قطع نظر سب کی سب مستضعف ہونے کے مراتب و درجات و خصوصیات کے حوالہ سے ایک ہی مقصد کو بیان کرتی ہیں جو کہ زیر نظر آیۂ مبارکہ کے اطلاق سے سمجھا جا سکتا ہے جس کی بابت ہم مربوطہ مطالب بیان کر چکے ہیں اور وہ عبارت ہے اس سے کہ تقصیر و عمداً کوتاہی کے بغیر حق کی ہدایت سے محروم ہونا، یعنی مستضعف وہ ہے جو حق کی بابت ناآگاہ ہو مگر اس کی ناآگاہی اس کی طرف سے جان بوجھ کر کوتاہی و تقصیر اور بے پرواہی وغیرہ کی وجہ سے نہ ہو۔

آیات ۱۰۱ تا ۱۰۴

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾

وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۰۲﴾

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

وَ لَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ

○ "اور جب تم زمین میں سفر کو نکلو تو اگر تمہیں یہ خوف لاحق ہو کہ کافر تمہیں گھیرے میں لے کر تم پر حملہ کر دیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز کو قصر کرو، یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔"
(۱۰۱)

○ "اور جب آپؐ ان میں موجود ہوں اور آپؐ خود انہیں نماز پڑھائیں تو ایک گروہ آپؐ کے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لے لیں اور جب وہ سجدہ کر لیں تو وہ آپ لوگوں کے پیچھے آ جائیں، اور پھر وہ دوسرا گروہ کہ جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز نہ پڑھی ہو ان کی جگہ پر آ کر نماز پڑھے اور اپنی زرہیں اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لے لیں، کافروں کی خواہش ہے کہ آپ لوگ اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہوں تو وہ ایک دم آپ لوگوں پر حملہ کر دیں، اور اگر آپ لوگ بارش کی وجہ سے تکلیف میں ہوں یا بیمار ہوں تو اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دیں البتہ اپنی زرہیں و سامانِ حفاظت اپنے ساتھ رکھیں یقیناً اللہ نے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر کر رکھا ہے۔"

(۱۰۲)

○ ''پھر جب آپ لوگ نماز پوری کر لیں تو اللہ کو یاد کریں کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے یعنی ہر حالت میں ذکر خدا کریں اور جب پوری طرح مطمئن ہو جایں تو نماز قائم کریں، یقیناً نماز ادا کرنا مؤمنین پر واجب کر دیا گیا ہے کہ اس کے اوقات معین ہیں۔''

(۱۰۳)

○ ''اور آپ لوگ ان لوگوں (کافروں) کا پیچھا کرنے میں سستی سے کام نہ لیں کہ اگر آپ کو کوئی تکلیف وزحمت کا سامنا ہو تو انہیں بھی اسی طرح تکلیف وزحمت کا سامنا ہوتا ہے جس طرح آپ لوگوں کو تکلیف کا سامنا ہوتا ہے جبکہ آپ لوگ جس طرح اللہ سے امید رکھتے ہیں اس طرح وہ لوگ اُمید نہیں رکھتے، اور اللہ بخوبی آگاہ ودانا ہے۔''

(۱۰۴)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں سفر کی حالت میں نمازِ خوف اور قصر کا حکم بیان کیا گیا ہے، اور ان کے اختتام پر مؤمنین کو مشرکین کا پیچھا کرنے اور ان پر قابو پانے کی ترغیب دلائی گئی ہے، اس حوالہ سے ان آیات مبارکہ کا تعلق سابقہ آیات سے واضح ہوتا ہے جن میں جہاد اور اس سے مربوطہ موضوعات و امور کے احکام مذکور ہیں۔

نماز قصر کا حکم

○ ''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ''

(اور جب تم زمین میں سفر پر جاؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو)

لفظ ''جُنَاحٌ'' کے تین معانی ذکر کئے گئے ہیں (۱) گناہ (۲) حرج و تنگی (۳) روگردانی۔

لفظ ''قصر'' کا معنی کمی ہے، یہاں نماز میں کمی کرنا مراد ہے (اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ)

تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ ''قصر الصلاۃ'' کو تین طرح سے پڑھا جاتا ہے:

(۱) قَصَرْتُ الصَّلَاةَ اَقْصَرُهَا میں نے نماز کو قصر کیا (اس کو کم پڑھا بہت کم) یہ قرآنی لغت ہے۔

(۲) قَصَّرْتُ الصَّلَاةَ تَقْصِيْرًا میں نے نماز کو قصر کیا (اسے نیچا کر دیا، بہت نیچا)

(۳) اَقْصَرْتُ الصَّلَاةَ اِقْصَارًا میں نے نماز کو قصر کیا (اسے نیچا کر دیا، بہت نیچا) (ملاحظہ ہو، تفسیر ''مجمع البیان''، جلد سوم۔ صفحہ ۱۰۰)

قرآنی لغت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ جب تم سفر پر جاؤ تو تمہارے لئے کوئی حرج و مانع نہیں کہ تم نماز میں کچھ کم کرو۔

یہاں اس نکتہ کا ذکر ضروری ہے کہ جملہ ''فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ'' اگرچہ بظاہر قصر کا جواز ثابت کرتا ہے لیکن اس سے وجوب مراد لینے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اس کی قرآنی مثال واضح طور پر اس کی گواہی دیتی ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۸

''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا''

(بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ بجالائے تو اس کے لئے کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے)

اس آیت میں صفا و مروہ کے درمیان طواف (سعی) کو فلا جناح علیہ (اس پر کوئی حرج و گناہ نہیں) کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے جبکہ ان کے درمیان سعی کرنا واجب ہے، تو واجب عمل کو ان الفاظ میں بیان کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ مقام ہی صریح و متعین حکم کے بیان کا مقام ہے کہ جسے تشریع و قانون گزاری کا مقام کہتے ہیں۔ اور اس مقام میں اصل حکم کے بیان و اظہار کا حوالہ ہی ملحوظ ہوتا ہے اس کی تمام خصوصیات و مربوطہ جہات کا بیان مقصود نہیں ہوتا یعنی اصل حکم بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا وجوب و جواز بیان نہیں کیا جاتا جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت ۱۵۸ میں سعی کے بارے میں مذکور ہے۔ اگر اس سے ظاہری الفاظ کو ملحوظ قرار دے کر معانی کا تعین ہو تو جواز مراد لیا جائے گا جبکہ اس کا واجب ہونا قطعی و یقینی ہے، لہٰذا زیر نظر آیت مبارکہ میں بھی ''فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ'' سے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے کہ اگر تم سفر پر جاؤ تو تم پر واجب ہے کہ نماز کو قصر کرو، چنانچہ اس طرح کی ایک مثال درج ذیل آیت میں بھی پائی جاتی ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴

''وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ''

(اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمہارے لئے بہتر ہے)

اس میں روزہ رکھنے کو بہتر ہونے سے موسوم کیا گیا ہے، جبکہ اس کا واجب ہونا قطعی و یقینی ہے، تو اس طرح کے اسلوب بیان سے اصل حکم کا اظہار مقصود ہوتا ہے دیگر مربوطہ خصوصیات ملحوظ نہیں ہوتیں (لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں نماز کو قصر کرنا واجب ہے)۔

فتنۂ کفار کا خوف

○ ''اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا''

(اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر دیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا)

لفظ ''فتنہ'' کے متعدد مختلف معانی ذکر کئے گئے ہیں لیکن قرآن مجید میں اسے جہاں بھی کفار و مشرکین سے منسوب

ذکر کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد تشدد کی تمام صورتیں ہیں جن میں قتل، مار پیٹ اور اس طرح کے اعمال شامل ہیں، چنانچہ یہاں کلامی قرائن سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ بنا برایں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا۔ ان خفتم ان یعذبو کم بالحملة والقتل (اگر تمہیں ڈر ہو کہ وہ تمہیں اذیت وتشدد کا نشانہ بنائیں گے کہ تم پر دھاوا بول دیں گے اور قتل کردیں گے)۔

یہ جملہ ''اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'' دراصل جملہ ''فلا جناح علیکم'' کی قید وشرط کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز میں قصر کا حکم سب سے پہلے فتنہ کے خوف کی صورت میں جاری ہوا۔ یعنی جب تمہیں کفار کی طرف سے قتل کا خوف لاحق ہو تو نماز میں قصر کردو، لیکن اس سے قصر کے حکم کی دوسرے مرحلہ میں عمومی صورت میں صادر ہونے کی نفی نہیں ہوتی کہ جس میں ہر شرعی سفر شامل ہو خواہ اس میں خوف نہ پایا جائے یعنی پہلے خوف کی صورت میں قصر کا حکم صادر ہوا اور پھر اسے وسعت وعمومیت دے کر ہر شرعی وجائز سفر میں جاری کیا گیا، تو قرآن مجید نے اس کی صورت کو بیان کیا جبکہ سنت نے اس حکم کے تمام صورتوں میں جاری ہونے کو بیان کیا کہ عنقریب اس کی مزید وضاحت ''روایات پر ایک نظر'' میں ہوگی۔

نمازِ خوف کی کیفیت

○ ''وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ............وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ''

(اور جب آپ ان میں موجود ہوں.......اور وہ اپنی زرہیں اور اپنے ہتھیار اٹھالیں)

اس آیت میں نماز خوف کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اور اس میں ''وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ'' کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیتے ہوئے انہیں نمازِ خوف کی امامت کرانے والے کے طور پر بات کی گئی ہے، یہ اسلوب دراصل مثال کے ذریعے مقصود ومطلوب کو بیان کرنے کی ایک صورت ہے تاکہ مسئلہ واضح طور پر معلوم ہوسکے۔ جبکہ قرآنی اسلوب بیان اپنی ترتیب وترکیب کے ساتھ نہایت جامع اور خوبصورت ترین ہے۔

بنا برایں جملہ ''فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ'' میں نماز سے مراد جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ہے۔

اور جملہ ''طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ'' سے مراد ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنا ہے اور انہیں اسلحہ ہمراہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور جملہ ''فَاِذَا سَجَدُوْا'' سے مراد یہ ہے کہ جب وہ سجدہ سے فارغ ہوں اور نماز کو پورا کرلیں، اور یہ اس لئے ہے کہ وہ سجدوں اور نماز مکمل کرنے کے بعد پیچھے کھڑے ہوں تاکہ دوسرا گروہ نماز ادا کرلے۔

اس طرح جملہ ''وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے والا دوسرا گروہ اپنی زرہیں اور اسلحہ اُٹھالے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں آیت کا معنیٰ ______ واللہ اعلم ______ یہ ہے کہ اے اللہ کے رسول! جب آپ ان میں موجود ہوں جبکہ خوف کی حالت ہو اور آپ اُنہیں نماز پڑھائیں یعنی ان کی نماز جماعت کی امامت کریں تو وہ سب کے سب نماز جماعت میں اکٹھے نہ ہوں بلکہ ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ اور آپ کی اقتداء میں نماز پڑھے اور وہ اپنا اسلحہ بھی اپنے ہمراہ رکھیں، اور یہ بات واضح ہے کہ دوسرا گروہ ان کی اور ان کے ساز وسامان کی حفاظت کرے گا، پھر جب آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے فارغ ہو جائیں تو وہ آپ لوگوں کے پیچھے کھڑے ہوں اور آپ کی اور آپ کے ساز وسامان کی حفاظت کا کام کریں اور پھر دوسرا گروہ کہ جنہوں نے نماز ادا نہیں کی وہ آئے اور آپ کے ساتھ نماز ادا کریں، تو جس طرح پہلے گروہ والوں نے اپنی زرہیں اور اسلحہ اپنے ساتھ لیا تھا اسی طرح یہ دوسرا گروہ بھی اپنی زرہیں اور اسلحہ اپنے ہمراہ لے۔

ایک ادبی نکتہ

زیر نظر آیۂ مبارکہ میں لفظ ''طَآئِفَةٌ'' کی صفت ''أُخْرَىٰ'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کی گئی ہے جبکہ اس کے بعد تمام ضمیریں جمع مذکر کی ذکر کی گئیں: ''لَمْ يُصَلُّوا'' (جنہوں نے نماز نہیں پڑھی) ''فَلْيُصَلُّوا'' (وہ نماز پڑھیں) ''وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ'' (اور وہ اپنی زرہیں اور اسلحہ اٹھالیں)، تو ان تمام ضمیروں کی بازگشت ''طَآئِفَةٌ'' کی طرف ہے جبکہ بظاہر ان تمام موارد میں مؤنث کی ضمیریں ذکر کرنی چاہئیں تھی لیکن مذکر کی ضمیروں کے ذکر کرنے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس میں لفظ اور معنی دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی ایک حوالہ سے لفظ اور دوسرے حوالہ سے معنی کو مدنظر قرار دیا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ لفظ ''طَآئِفَةٌ'' کی مناسب سے ''أُخْرَىٰ'' جبکہ معنی کے حوالے سے لفظ ''هُمْ'' ذکر کیا گیا، کیونکہ ''طَآئِفَةٌ'' کا معنی گروہ اور افراد کا مجموعہ ہے اور جملہ ''وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ'' میں نہایت لطیف استعارہ پایا جاتا ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے وہ یہ کہ ''حذر'' (زرہ) کو دفاعی آلہ قرار دیا گیا اور اسے ''اسلحہ'' کی مانند قرار دے کر لفظ ''اخذ'' (وَلْيَأْخُذُوا) کے ساتھ یکجا ذکر کیا گیا (یعنی دونوں کو اخذ یعنی اُٹھایا جانے والا اسلحہ قرار دیا گیا)۔

اور جملہ ''وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ ۔۔ وَاحِدَةً'' ابتدائے آیت میں مذکور اس حکم کی علت وسبب کے بیان پر مشتمل ہے جس میں نمازِ خوف کی کیفیت ذکر کی گئی تھی تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں نماز خوف پڑھنے کا جو مخصوص حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کفار چاہتے ہیں کہ تم لوگ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاؤ اور اپنے ساز وسامان اور اسلحہ سے غافل ہو تو وہ تم پر دھاوا بول دیں۔

مخصوص حکم کی دوسری جہت

''وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۔۔۔۔۔''

اس جملہ کے ذریعے نمازِ خوف میں دوسری جہت سے تخفیف وآسانی کا حکم بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر انہیں بارش یا بیماری کی وجہ سے زرہ واسلحہ اٹھانے میں تکلیف وزحمت کا سامنا ہو تو وہ اپنے ہتھیار نہ اُٹھائیں لیکن ان پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی زرہیں اپنے ساتھ رکھیں اور کفار سے ہرگز غافل نہ ہوں کیونکہ وہ پورے طور پر ان کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ یعنی وہ ہر طرح سے ان کے درپے ہیں کہ انہیں کمزور کریں اور ان پر حملہ کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

نماز کے بعد تاکیدی حکم

○ ''فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ''

(پس جب تم نماز پوری کر لو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے)

اس جملہ میں ''قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا'' دونوں یا جمع کے صیغے ہیں یا مصدر ہیں۔ البتہ ''فَاذْكُرُوا'' (صیغۂ امر) سے حال ہیں۔ اسی طرح ''وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ'' بھی صیغۂ امر (فَاذْكُرُوا) سے حال ہے (یعنی ان تینوں حالتوں میں اللہ کا ذکر کرو) ان تینوں حالتوں میں ذکر کرنے کا حکم دراصل خدا کی یاد میں رہنے سے کنایہ ہے اور مقصد یہ ہے کہ تم ہر حال میں اللہ کی یاد میں رہو، اللہ کا ذکر کرتے رہو (نماز پوری کرنے کے بعد اللہ کے ذکر سے غفلت نہ کرو)۔

اطمینان اور اقامۂ نماز

○ ''فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ''

(پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز اقامہ کرو)

یہاں ''اطمینان'' سے مراد استقرار ہے، اور چونکہ یہ جملہ پہلے جملہ ''وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ'' کے مقابل میں ذکر ہوا ہے لہٰذا اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ''اطمینان'' سے مراد یہ ہے کہ جب تم جنگ سے فارغ ہو کر وطن واپس پہنچ جاؤ، لہٰذا اقامۂ صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ جب تم وطن پہنچ جاؤ تو پوری نماز ادا کرو کیونکہ نمازِ خوف کو قصر سے تعبیر کرنا اس مطلب کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خوف ختم ہونے کے بعد پوری نماز پڑھو۔

نماز کے وجوب کا واضح بیان

○ ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا''

(یقیناً نماز مومنین پر واجب کردی گئی ہے اوقات کے ساتھ!)

یہاں نماز کی فرضیت کو لفظ ''کِتٰبًا'' کے ذریعے بیان کیا گیا ہے، لفظ ''کتابت'' (لکھنا، لکھ دیا جانا) اس کے واجب ولازمی ہونے سے کنایہ کے طور پر ہے۔ اس کی مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے،

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۳

''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ''

(تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں جس طرح اُن لوگوں پر لکھ دیئے گئے تھے، جو تم سے پہلے تھے)

اس میں لکھ دیئے جانے سے مراد، واجب کیا جانا ہے۔

''مَّوۡقُوۡتًا'' کا اشتقاق ''وقت'' سے ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کے لئے وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز مقررہ وقت کے لئے واجب کی گئی ہے کہ اسے اس کے معینہ اوقات ہی میں ادا کرنا ضروری ہے۔

البتہ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ملحوظ ہے کہ نماز میں وقت مقررہ کا ذکر اس کے ثبات اور عدم تغیر وتبدل سے کنایۃً ہوا ہے، اس بناء پر یہ کہا جائے گا کہ یہاں اس مطلب کا بیان مقصود نہیں کہ نماز مقررہ وقت کے لئے واجب کی گئی ہے بلکہ یہ مقصود ہے کہ نماز نا قابل تبدل وتغیر فریضہ ہے کہ اس کے وجوب میں ہرگز کوئی تبدیلی ممکن نہیں یعنی وہ کسی بھی حال میں ساقط نہیں ہوگی، اس طرح کے بیان واظہار کو علمی زبان میں ''اطلاق الملزوم علی اللازم'' کہتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلقہ امر پر خود اس چیز ہی کو ذکر کر دیا جائے، جیسا کہ یہاں وقت کا ذکر ہوا ہے جو کہ نماز کا متعلقہ امر ہے لیکن اس کی جگہ اصل نماز کو ذکر کر کے یوں کہا گیا ''کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا'' یعنی کتاب ہی کو ''موقوت'' کہا گیا، جبکہ وقت اس کا لازمی متعلقہ امر ہے، لہٰذا یہاں ''کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا'' سے مراد یہ ہے کہ نماز ثابت و نا قابل تبدیلی فریضہ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ ''مَّوۡقُوۡتًا'' سے یہ مراد لینا کہ اس میں نماز کے مقررہ وقت پر فرض کئے جانے کا بیان مقصود ہے بظاہر آیت کے سابقہ مضمون سے موزونیت نہیں رکھتا کیونکہ اس مطلب کے بیان کی ضرورت ہی نہیں کہ نماز ایسی عبادت ہے جو معینہ

اوقات میں واجب کی گئی ہے جبکہ ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ'' اپنے پہلے جملہ ''فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ'' کی وجہ وسبب کے بیان پر مشتمل ہے، بنا برایں ''کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا'' سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ ثابت و نا قابل تبدیلی فریضہ ہے جو کسی بھی حال میں ساقط نہیں ہوتی اور اور نہ ہی اسے کسی دوسری چیز میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ روزہ کی جگہ فدیہ دینے کی گنجائش موجود ہوتی ہے، نماز ایسا قطعی ولازمی فریضہ ہے جسے نہ تو کسی دوسرے عمل سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی حال میں ساقط ہوتی ہے۔

ہمت نہ ہارنے کا حکم

○ ''وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ''
(کافروں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو)

لفظ ''وھن'' کا معنیٰ ضعف وکمزوری ہے۔
''ابْتِغَآءِ'' کا معنیٰ طلب کرنا ہے۔ یہاں مراد پیچھا کرنا ہے۔
''الم'' کا معنیٰ تکلیف ہے جو کہ ''لذت'' کے مقابلے میں آتا ہے۔

جملہ ''وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ'' عبارت میں ''لَا تَهِنُوْا'' کی ضمیر جمع غائب سے حال ہے کہ جسے اردو زبان میں ''حالانکہ'' اور ''جبکہ'' کے لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ فریقین کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک تکلیف میں ہے یعنی جنگ میں دونوں فریق جس سختی وتکلیف کا شکار ہوتے ہیں وہ یکساں ہے لیکن تم (اے مؤمنین) اپنے دشمنوں سے زیادہ سختی وتکلیف میں نہیں ہو بلکہ تم ان کی نسبت اچھے اور سعادتمند حال میں ہو کیونکہ تم اپنے پروردگار کی طرف سے فتح وکامیابی اور مغفرت کی امید رکھتے ہو جو کہ تمہارا مولیٰ وآقا ہے جبکہ تمہارے دشمنوں کا کوئی مولیٰ وآقا اور سہارا نہیں اور نہ ہی انہیں کسی سے کوئی امید وابستہ ہے جس سے ان کے نفوس کو اطمینان حاصل ہو اور وہ اپنے عمل میں کوئی خوشی ونشاط پائیں کہ جو انہیں ان کے عمل سے مطلوبہ مقصد کے حصول کی راہ پر لا کھڑا کرے، اور خداوند عالم مصلحتوں وحقیقی مقاصد سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے اور اپنے اوامر ونواہی میں مضبوط وقوی حکمت والا ہے۔

روایات پر ایک نظر

نمازِ خوف کے حکم کا تاریخی حوالہ

تفسیر قمی میں مذکور ہے کہ نمازِ خوف کے حکم پر مشتمل آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ کی طرف روانہ ہوئے تا کہ مکہ مکرمہ پہنچیں۔ جب قریش کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے خالد بن ولید کو دوسو سپاہیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ روکنے کے لئے بھیج دیا، چنانچہ وہ پہاڑوں پر چڑھ کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں آجاتا تھا، یہاں تک کہ راستہ میں نماز ظہر کا وقت ہوگیا تو بلال نے اذان دی اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نماز ادا کی، اس وقت خالد بن ولید نے اپنے ساتھیوں سے کہا، اگر ہم اسی حالت میں ان پر حملہ کردیں جبکہ وہ نماز میں مصروف ہوں تو ان پر قابو پالیں گے کیونکہ وہ نماز کو نہیں توڑتے، لیکن اب ان کی دوسری نماز ہونے والی ہے اور وہ اپنی آنکھوں کے نور سے کہیں زیادہ نماز کو دوست رکھتے ہیں لہٰذا جب وہ نماز شروع کریں گے تو ہم ان پر دھاوا بول دیں گے، اس وقت حضرت جبرائیل حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے اور نمازِ خوف کا حکم پہنچایا، اسی کا ذکر آیت مبارکہ ''وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ...... '' میں ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۵۰)

مجمع البیان کی دو روایتیں

(۱) تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیہ مبارکہ ''وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ..... '' کے ذیل میں مذکور ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عسفان میں تھے جبکہ مشرکین ضجنان میں تھے اور فریقین اپنے اپنے مقام پر قرار پائے ہوئے تھے، اس وقت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے نمازِ ظہر پورے رکوع و سجود کے ساتھ ادا فرمائی تو مشرکین نے کوشش کی کہ ان پر دھاوا بول دیں اور انہیں نماز سے روگردان کردیں، تو ان میں سے بعض نے کہا کہ اس نماز (ظہر) کے بعد ان کی دوسری نماز بھی ہے جسے وہ اس نماز سے بھی زیادہ دوست رکھتے ہیں یعنی نماز عصر، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نمازِ عصر کو

نمازِ خوف کی طرح ادا فرمایا، یہی بات خالد بن ولید کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

(۲) ابو حمزہ ثمالی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلۂ بنی انمار سے جنگ کی اور اللہ نے انہیں شکست دی چنانچہ وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے بچے اور اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان ساتھی وہاں اتر گئے جبکہ دشمنوں میں سے کوئی بھی وہاں دکھائی نہ دیا، لشکر اسلام نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قضائے حاجت کے لئے دور نکل گئے اور اپنا اسلحہ وہیں چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کے درمیان ایک وادی بیابان تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت دور چلے گئے اور قضائے حاجت سے فراغت تک وہیں رہے اور وہ بیابان ایسا تھا کہ اس کا کچھ حصہ بلند اور کچھ نیچا تھا یعنی ناہموار تھا، اس دوران میں بارش شروع ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کے درمیان بیابان حائل تھا، اس اثناء میں دشمن کے لشکر سے غورث بن حارث کی نظر آپؐ پر پڑ گئی تو غورث کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ اے غورث! یہ محمد ہے جو کہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا ہے اب موقع پا کر اسے قتل کر دو تو اس نے کہا کہ خدا مجھے مارے اگر میں اسے قتل نہ کروں، چنانچہ وہ پہاڑ سے نیچے بھاگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آ کھڑا ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تلوار تان لی، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا اے محمد، اب کون تجھے مجھ سے بچائے گا؟ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: اللہ، یہ سن کر غورث منہ کے بل زمین پر گر پڑا، اس وقت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے اور اس کی تلوار اٹھائی اور اسے اس پر تان کر فرمایا: اب تو بتا کہ تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: کوئی بھی نہیں، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں؟ اس نے جواب دیا: نہیں، لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی جنگ نہیں کروں گا اور نہ ہی آپ کے کسی دشمن کی مدد کروں گا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اس کی تلوار واپس کر دی اس وقت غورث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: خدا کی قسم، آپ مجھ سے بہتر ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اسی کا حقدار ہوں، غورث واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا، اس کے ساتھیوں نے اس سے کہا: اے غورث! ہم نے دیکھا کہ تو اس کے سر پر کھڑا تھا تو اسے قتل کرنے میں تجھے کیا چیز مانع ہوئی؟ اس نے جواب دیا: اللہ، میں نے اُس پر تلوار تان لی تھی کہ اس پر حملہ کروں گا مگر مجھے معلوم نہیں کس نے مجھے پیچھے سے کھینچا اور میں منہ کے بل گر گیا اور میری تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی، اس وقت محمد نے آگے بڑھ کر وہ تلوار اُٹھائی، پھر بارش رک گئی اور بیابان کا راستہ صاف ہو گیا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس واپس لوٹ آئے اور انہیں واقعہ کی خبر دی اور سارے ماجرا سے مطلع فرمایا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی: "ان کان بکم اذی من مطر ....الخ" (تفسیر مجمع البیان، جلد سوم، صفحہ ۱۰۳)

امام جعفر صادقؑ کا بیان

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں عبدالرحمان بن ابی عبداللہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ ذات الرقاع میں اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز ادا کی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ترتیب دی کہ اپنے اصحاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک گروہ کو دشمن کے مقابل میں کھڑا کیا جبکہ دوسرے گروہ کو اپنے پیچھے کھڑا ہو کر نماز ادا کرنے کا حکم دیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی تو انہوں نے بھی تکبیر کہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرائت کی تو انہوں نے بھی قرائت کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع میں گئے تو وہ بھی رکوع میں گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں گئے تو وہ بھی سجدے میں گئے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے اور اصحاب نے خود ہی اپنی نماز کو پورا کیا۔ یعنی دوسری رکعت انہوں نے خود ہی ادا کی، اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کہہ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلے گئے اور دشمن کے مقابلے میں اس کے روبرو آ گئے، اس کے بعد دوسرا گروہ آیا اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی تو انہوں نے بھی تکبیر کہی اور خاموش ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرائت کی تو وہ سنتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع میں گئے تو وہ بھی رکوع میں گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں گئے تو وہ بھی سجدے میں گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھ گئے اور تشہد پڑھا اور انہیں سلام کہا، پھر وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے دوسری رکعت خود ہی ادا کی پھر انہوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا، تو یہ وہی نمازِ خوف ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے اس آیت میں فرمایا: ''وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ............ كِتَابًا مَّوْقُوتًا''

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: جو شخص مغرب کی نماز دوسرے افراد کے ہمراہ ادا کرے تو وہ نمازِ خوف کی طرح ادا کرے اور وہ اس طرح کہ ایک رکعت پہلے گروہ کے ساتھ پڑھے اور دوسری رکعت دوسرے گروہ کے ساتھ پڑھے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی قدر

کتاب ''تہذیب الاحکام'' میں مولفؒ نے اپنے اسناد سے زرارہ کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام سے نمازِ خوف اور نمازِ قصر کے بارے میں پوچھا کہ آیا دونوں قصر ہوں گی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا، ہاں، نمازِ خوف، نمازِ سفر سے زیادہ حق رکھتی ہے کہ اسے قصر پڑھا جائے کیونکہ نمازِ سفر میں کوئی خوف نہیں ہوتا، یعنی، جب نماز سفر میں خوف نہ ہونے کے باوجود اسے قصر پڑھا جاتا ہے تو نمازِ خوف کو بطریق اولیٰ قصر پڑھا جائے گا۔

(تہذیب الاحکام، جلد سوم، صفحہ ۳۰۲)

سفر میں نماز کی کیفیت وکمیت

کتاب ''من یحضرہ الفقیہ'' میں مولفؒ نے اپنے اسناد سے زرارہ اور محمد بن مسلم کے حوالہ سے ذکر کیا کہ انہوں نے کہا: قلنا لا بی جعفر (ع) ما تقول فی صلاۃ السفر؟ کیف ھی؟ و کم ھی؟ ہم نے امام ابوجعفر (محمد باقرؑ) سے نمازِ سفر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس طرح ادا کی جائے اور کتنی رکعت ہے؟ فقال: ان اللہ عزوجل یقول: ''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ'' فصار التقصیر فی السفر واجبًا امامؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے حکم دیا کہ جب تم سفر کرو تو تم پر لازم ہے کہ نماز کو قصر ادا کرو، لہٰذا سفر میں نماز کا قصر ادا کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح وطن میں پوری پڑھنا واجب ہے قالا: قلنا: انما قال اللہ عزوجل: ''فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ'': ولم یقل افعلوا، کیف اوجب ذٰلك کما اوجب التمام فی الحضر، انہوں نے کہا کہ ہم نے امامؑ کی خدمت میں عرض کی کہ خداوند عالم نے تو فرمایا ''فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ'' (تم پر کوئی حرج و گناہ نہیں) اور یہ نہیں فرمایا ایسا کرو (افعلوا) تو اس سے سفر میں قصر پڑھنے کا وجوب کیونکر ثابت ہے؟ فقال(ع): اولیس قد قال اللہ: ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا'' الا ترون ان الطواف بھما واجب مفروض؟ لان اللہ عزوجل ذکرہ فی کتابہ وصنعہ نبیہ و کذلك التقصیر فی السفر شیئ صنعہ النبی (ص) ذکرہ اللہ تعالیٰ فی کتابہ. امامؑ نے ارشاد فرمایا: کیا خداوند عالم نے یہ نہیں فرمایا: صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج و گناہ نہیں (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ) کہ وہ ان دونوں کا طواف و (سعی) کرے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ان دونوں (صفا و مروہ) کا طواف (سعی) واجب و لازمی فریضہ ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنی کتاب میں فرمایا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے انجام دیا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا: قال: فعلنا لہ: ''فمن صلی فی السفر اربعًا ایعید ام لا؟'' راویوں نے کہا کہ ہم نے امامؑ سے عرض کی کہ جو شخص سفر میں چار رکعت پڑھ لے تو کیا اس پر واجب ہے کہ دوبارہ نماز ادا کرے یا واجب نہیں؟، قال(ع) ان کان قد قرئت علیہ آیۃ التقصیر و فسرت لہ فصلی اربعاً اعاد، وان لم تکن قرئت علیہ ولم یکن یعلمھا فلا اعادۃ علیہ، امامؑ نے ارشاد فرمایا: اگر اس کے سامنے نمازِ قصر والی آیت پڑھی گئی اور اس کی تفسیر بھی اسے بتائی گئی، اس کے باوجود اس نے چار رکعت پڑھی تو دوبارہ پڑھے، اور اگر اس کے سامنے وہ آیت نہیں پڑھی گئی اور وہ اس سے ناآگاہ تھا تو اس پر دوبارہ پڑھنا واجب نہیں۔ والصلوٰت کلھا فی السفر الفریضۃ رکعتان الا المغرب فانھا ثلاث لیس فیھا تقصیر ترکھا رسول اللہ (ص) فی السفر والحضر ثلاث رکعات تمام فریضہ نمازیں سفر میں دو رکعت پڑھی جاتی ہیں سوائے نماز مغرب کے کیونکہ وہ تین رکعت نماز ہے جس میں قصر نہیں ہوسکتی، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سفر اور حضر دونوں میں تین رکعت ہی ادا فرمایا۔

تفسیر ''درمنثور'' کی چار روایتیں

(۱) تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جارود، ابن خزیمہ، طحاری، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور نحاس نے اپنی کتاب ناسخ میں اور ابن حبان نے یعلی بن امیہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ میں نے عمر بن خطاب سے پوچھا کہ قرآن مجید میں نمازِ قصر کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: ''فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کہ تم پر کوئی حرج نہیں کہ اگر تمہیں کافروں کی طرف سے فتنہ کا خوف ہو کہ وہ تم پر حملہ کر دیں گے تو نماز کو قصر ادا کرو، تو اس میں قصر نماز کا حکم خوف کی صورت میں صادر ہوا ہے، جبکہ اب لوگ کسی خوف میں مبتلا نہیں بلکہ امن وامان میں ہیں تو پھر سفر میں نماز قصر کیوں پڑھیں؟ تو عمر نے جواب دیا کہ جس طرح تمہیں تعجب ہے اس طرح مجھے بھی تعجب تھا تو میں نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں پوچھا تھا تو انہوں نے ارشاد فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر نرمی و آسانی کی غرض سے ''صدقہ'' ہے لہٰذا تم اس کے دیئے ہوئے صدقہ کو قبول کرو یعنی سفر میں نماز قصر ادا کرو خدا کا دیا ہوا صدقہ (عطیہ) قبول کرنا واجب ہے۔

(۲) عبد بن حمید، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن'' میں امیہ بن خالد بن اسد کی روایت ذکر کی ہے کہ اس نے ابن عمر سے پوچھا: کیا آپ سفر میں نماز قصر کا عقیدہ رکھتے ہیں جبکہ اس کے بارے میں قرآنِ مجید میں ہمیں کوئی حکم نہیں ملتا، بلکہ صرف نماز خوف کے بارے میں قصر کا حکم مذکور ہے؟ تو ابن عمر نے جواب دیا کہ اے میرے بھائی، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا جبکہ ہمیں کسی چیز کا علم نہ تھا، ہم تو اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عمل کرتے دیکھا، اور سفر میں قصر نماز پڑھنا ایسی سنت ہے جسے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا۔

(۳) ابن ابی شیبہ و ترمذی نے اس روایت کو صحیح قرار دے کر ذکر کیا ہے اور نسائی نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: صلینا مع رسول الله (ص) بین مكة والمدينة و نحن اٰمنون لا نخاف شيئاً ركعتين ہم نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر کرتے ہوئے (نمازِ قصر) دو رکعتیں ادا کیں جبکہ ہم امن میں تھے اور ہمیں کسی چیز کا خوف لاحق نہ تھا۔

(۴) ابن شیبہ، احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حارثہ بن وهب خزاعی کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے متعدد لوگوں کے ساتھ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں نماز ظہر و عصر منیٰ میں ادا کی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھائیں۔ (ملاحظہ ہو، تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۲۰۹)

قطعی و نا قابل تبدیلی فریضہ

کتاب ''کافی'' میں کلینی مرحوم نے اپنے اسناد سے داؤد بن فرقد کی روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے آیۂ مبارکہ ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا'' کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا'' سے مراد ''کتابًا ثابتًا'' ہے (یعنی قطعی و نا قابل تبدیلی فریضہ) اور ایسا نہیں کہ اگر تو اس میں تھوڑی جلدی یا تھوڑی دیر کردے تو وہ تجھے ضرر رساں ہو بلکہ جب تک تو اسے کلی طور پر نظر انداز نہ کرے اور آیۂ مبارکہ ''اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا'' (جن لوگوں نے نماز کو ضائع کردیا اور خواہشات کی پیروی کی تو وہ بہت جلد اس کی سزا پائیں گے) کا مصداق نہ ہو جائے تو تجھے کوئی نقصان نہ ہوگا (فروع کافی، جلد سوم، صفحہ ۲۷۰)

اس روایت میں امامؑ نے اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ فریضہ نمازوں کی ادائیگی میں وقت کے حوالہ سے وسعت پائی جاتی ہے، جیسا کہ دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

تفسیر العیاشی کی تاکید مزید

تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم کی روایت مذکور ہے انہوں نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ میں سے ایک شخصیت کے حوالہ سے بیان کیا کہ امامؑ نے سفر میں نمازِ مغرب کی بابت ارشاد فرمایا: اگر اس میں کچھ تاخیر ہو جائے تو اسے ترک نہ کرو، پھر اسے عشاء کی نماز کے ساتھ ادا کرلو اور اگر چاہو تو اپنے کام کاج کو چلے جاؤ یہاں تک کہ شفق ختم ہو جائے تو اس وقت پڑھ لو، کیونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو یکجا ادا فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی اول وقت پڑھتے تھے اور کبھی قدرے تاخیر سے ادا کرتے تھے، اور اللہ کے فرمان ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا'' سے اس کا مؤمنین پر واجب ہونا مراد ہے اس کے علاوہ کچھ مقصود نہیں، اور اگر لوگوں کی یہ بات درست ہوتی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کی ادائیگی میں کوئی تاخیر نہیں کی تو مذکورہ بالا روایت میں آنحضرتؐ کا عمل مذکور نہ ہوتا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احکام الٰہی سے آگاہ تر اور باخبر تر تھے، اگر ایسا کرنا بہتر ہوتا جس طرح بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ نمازوں کو ہر حال میں الگ الگ پڑھنا واجب ہے تو حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا حکم صادر فرماتے، اور جنگ صفین میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا کہ جو لوگ حضرت امیر المومنینؑ کے ساتھ نماز ظہر و عصر اور مغرب و عشاء ادا کر نہ سکے تو حضرت علی امیر المؤمنین علیہ السلام نے انہیں حکم دیا کہ خواہ سوار ہو یا پیادہ ہو تکبیر و تہلیل و تسبیح (اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، سبحان اللہ) ادا کرو، اور آپؑ نے اس

آیت مبارکہ سے تمسک اختیار فرمایا: ''فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا'' (پس اگر تمہیں دشمن کی طرف سے حملہ کا خوف ہوتو پا پیادہ اور سواری پر، دونوں صورتوں میں نماز ادا کرلو) سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۹، تو لوگوں نے آپؐ کے حکم کے مطابق عمل کیا (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۷۳)

مذکورہ بالا روایات سے ہمارے سابق الذکر بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور اس مطلب پر مشتمل کثیر روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے منقول ہیں کہ ان میں سے بطور نمونہ چند روایات ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور اہل سنت کے اسناد سے جو روایات منقول ہیں وہ مذکورہ روایات سے متصادم ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی ذکر کردہ روایات ایک دسرے کی نفی بھی کرتی ہیں، بہرحال ان روایات پر کہ جن میں نمازِ خوف کی کیفیت کا بالخصوص اور سفر میں قصر نماز کا بالعموم تذکرہ ہوا ہے تحقیقی نظر ڈالنا اور ان کی بابت بحث کرنا علم فقہ کا موضوع ہے۔

تفسیر قمی میں آیہ مبارکہ ''وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ......الخ'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ یہ آیت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ (اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ) کی طرف عطف ہے، ہم نے وہاں آیت کے نزول کا سبب ذکر کردیا ہے۔

آیات ۱۰۵ تا ۱۲۶

○ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾

○ وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا‌ ۚ‏ ﴿۱۰۶﴾

○ وَلَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِيۡنَ يَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ خَوَّانًا اَثِيۡمًا ۚ ۙ‏ ﴿۱۰۷﴾

○ يَّسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمۡ اِذۡ يُبَيِّتُوۡنَ مَا لَا يَرۡضٰى مِنَ الۡقَوۡلِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطًا‏ ﴿۱۰۸﴾

○ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَۤاءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فَمَنۡ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا‏ ﴿۱۰۹﴾

○ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡۤءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا‏ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ

O ''بے شک ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ پر نازل کی ہے تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کریں جو اللہ نے آپ کو آگاہ کیا ہے، اور آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار و حامی نہ بنیں۔'' (۱۰۵)

O ''اور اللہ کے حضور استغفار کریں، اللہ تو ہے ہی معاف کرنے والا، نہایت مہربان۔'' (۱۰۶)

O ''اور آپ ان لوگوں کا دفاع نہ کریں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، بے شک اللہ کسی خیانت کرنے والے، گناہ کے مرتکب کو پسند نہیں کرتا۔'' (۱۰۷)

O ''یہ لوگ (خیانت کار و گنہگار) اپنے اعمال لوگوں سے چھپاتے پھرتے ہیں مگر وہ اللہ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتے، اللہ اس وقت بھی اُن کے پاس ہوتا ہے جب وہ رات کی تاریکی میں ایسی گفتگو کرتے ہیں جسے اللہ پسند نہیں کرتا، جبکہ اللہ ان کے تمام اعمال کو اپنے احاطۂ علم و قدرت میں رکھتا ہے۔'' (۱۰۸)

O ''ہاں، تمھی نے دُنیاوی زندگی میں ان کا دفاع و طرفداری کی، مگر قیامت کے دن اللہ کے پاس کون ان کا دفاع کرے گا یا کون ان کی وکالت کرے گا؟'' (۱۰۹)

O ''اور جو شخص کوئی عمل انجام دے یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو وہ اللہ کو معاف کر دینے والا، نہایت مہربان پائے گا۔'' (۱۱۰)

○ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱۱﴾

○ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿۱۱۲﴾

○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ ۚ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿۱۱۳﴾

○ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۱۴﴾

○ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿۱۱۵﴾

○ ''اور جو شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اپنے ہی نقصان کا سامان کرتا ہے، اور اللہ نہایت آگاہ اور دانا ہے۔'' (۱۱۱)

○ ''اور جو شخص کوئی غلط کام یا گناہ کرے پھر اسے کسی بے قصور شخص پر اس کا الزام لگا دے تو اس نے تہمت و بہتان اپنے سر لیا اور کھلے گناہ کا طوق گلے میں ڈال لیا۔'' (۱۱۲)

○ ''اور اگر آپ پر اللہ کا کرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان لوگوں میں سے ایک شخص آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کوشاں تھا حالانکہ وہ تو صرف خود اپنے آپ کو غلط فہمی و گمراہی کا شکار کرتے ہیں اور آپ کو کسی طرح سے نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل کی اور آپ کو اس چیز کا علم عطا کیا جس سے آپ آگاہی نہیں رکھتے تھے، اور آپ پر اللہ کا فضل و کرم بہت بڑا ہے۔'' (۱۱۳)

○ ''ان لوگوں کی اکثر سرگوشیاں خیر و اچھائی سے خالی ہیں سوائے اس کے کہ جو شخص صدقہ یا نیکی یا لوگوں کے درمیان اصلاحِ احوال کی ترغیب دلائے اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرے تو ہم بہت جلد اسے عظیم اجر عطا کریں گے۔'' (۱۱۴)

○ ''اور جو شخص راہ حق کی شناخت کے باوجود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا ہوگا اور اسے دوزخ کی آگ میں جلائیں گے جو کہ نہایت بُرا ٹھکانہ ہے۔'' (۱۱۵)

○ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

○ إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿١١٧﴾

○ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾

○ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿١١٩﴾

○ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾

○ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾

O ''اللہ ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دے تو وہ گمراہی کے دور راستہ پر چل نکلا۔'' (۱۱۶)

O ''وہ اللہ کو چھوڑ کر عورتوں جیسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں وہ تو بس سرکش و باغی شیطان کی پوجا کرتے ہیں'' (۱۱۷)

O ''اللہ نے اسے (شیطان کو) لعنت کا طوق پہنایا اور اس (شیطان) نے کہہ دیا کہ میں تیرے بندوں میں اپنا واجبی حصہ ضرور لوں گا۔'' (۱۱۸)

O ''اور میں انہیں ضرور گمراہی سے دوچار کروں گا اور انہیں تمناؤں وہوس رانیوں کا اسیر کردوں گا اور انہیں حکم دوں گا تو وہ جانوروں کے کانوں کو چیر دیں گے اور میں حکم دوں گا تو وہ میرے حکم پر عمل کرتے ہوئے اللہ کی تخلیق میں بگاڑ و تبدیلی پیدا کریں گے، اور جس نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا حاکم بنالیا تو واضح نقصان کا شکار ہوگا۔'' (۱۱۹)

O ''وہ (شیطان) انہیں (اللہ کے بندوں کو) وعدوں ہی وعدوں میں گھیرے رکھتا ہے اور امیدیں دلاتا رہتا ہے جبکہ شیطان کے وعدے دھوکہ کے سوا کچھ نہیں۔'' (۱۲۰)

O ''انہی لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے کہ وہ جس سے چھٹکارا پانے کی جگہ نہ پائیں گے۔'' (۱۲۱)

○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

○ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٢٣﴾

○ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ﴿١٢٤﴾

○ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿١٢٥﴾

○ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطًا ﴿١٢٦﴾

○ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو ہم بہت جلد اُنہیں ایسے باغات میں لے جائیں گے جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہی رہیں گے، اللہ کا وعدہ برحق ہے اور اللہ سے زیادہ کون سچی بات کرنے والا ہے۔'' (۱۲۲)

○ ''نہ تمہاری خواہشوں کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی اہل کتاب کی تمنائیں ان کے کام آئیں گی، بلکہ جو شخص برا عمل انجام دے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی اور وہ اپنے لئے اللہ کے علاوہ کوئی سرپرست اور نہ ہی کوئی مددگار پائے گا۔'' (۱۲۳)

○ ''اور جو شخص نیک اعمال انجام دے خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو ایسے لوگوں کو بہشت ملے گی اور ان پر ذرہ بھر زیادتی نہ ہوگی۔''

(۱۲۴)

○ ''اور اس شخص سے بہتر دیندار کون ہوسکتا ہے جو اپنا رخ اللہ ہی کی طرف کرے اور وہ نیک عمل کرنے والا ہو اور پورے اخلاص کے ساتھ آئین ابراہیمؑ کا اتباع کرے، اللہ نے تو ابراہیمؑ کو خلیل بنایا ہے۔''

(۱۲۵)

○ ''اور اللہ ہی کے دائرۂ اقتدار و اختیار میں ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر کامل اختیار رکھتا ہے۔''

(۱۲۶)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا سیاق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قضاوت و فیصلہ کرنے میں عدل اختیار کرنے کی تاکید اور قاضی کو فیصلہ صادر کرنے میں عدل سے دوری اختیار کرنے کی ممانعت اسی طرح حاکم کو حکم صادر کرنے میں ناحق لوگوں کا ساتھ دینے اور حقداروں کو خواہ جو بھی ہوں محروم کرنے کی نہی ہے۔

اس مطلب سے آگاہی، آیات کے نزول کے وقت رونما ہونے والے بعض اوقات پر غور کرنے اور پھر ان کے تناظر میں دینی حقائق اور ان کے لازم الاتباع ہونے کی عملی پاسداری کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ اس مطلب پر بحث کرنے پر موقوف ہے کہ مؤمنین کو متنبہ و آگاہ کیا جائے کہ دین صرف نام نہیں بلکہ حقیقت ہے لہٰذا اس پر عمل پیرا ہونا ہی مفید ہوسکتا ہے صرف نام کی حد تک اس سے نسبت رکھنا کافی نہیں۔

بظاہر یہ وہی واقعہ ہے جس کا اشارہ اس آیت مبارکہ میں ہوا ہے: ''وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا'' کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں کچھ ایسے معاصی و گناہ لوگوں سے سرزد ہوئے تھے جن میں دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً چوری یا قتل یا لوٹ کھسوٹ یا ڈاکہ و تشدد اور اس طرح کے دیگر جرائم، اور یہ بھی متوقع تھا کہ ان جرائم کے مرتکب افراد، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فیصلہ صادر کرنے میں اپنے تئیں گمراہ کرنے کی مذموم کوشش کریں جبکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح کی مذموم کوششوں میں لوگوں سے بچانے والا ہے۔

اور ظاہراً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی واقعہ کی طرف پہلی آیات میں اشارہ ہوا ہے مثلاً ''وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا'' (اور آپ خیانت کرنے والوں کے حامی نہ ہوں) ''يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ'' (وہ لوگوں سے شرم کھاتے ہیں) ''هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ'' (ہاں، تم ہی نے ان کا دفاع کیا) کیونکہ خیانت اگرچہ بظاہر ودیعتوں اور امانتوں میں تصور کی جاتی ہے لیکن آیہ مبارکہ: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ'' (بے شک اللہ کسی خیانت کار گنہگار کو پسند نہیں کرتا، وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے ہیں) کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں خیانت سے مراد چوری اور اس جیسے کاموں میں سرزد ہونے والا فعل ہے کیونکہ مؤمنین نفس واحدۃ یعنی ایک جان کی طرح ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کے پاس جو مال ہے اس کی بابت دوسروں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی عزت و آبرو اور مال کی حفاظت کریں اور ایک دوسرے کا دفاع و حمایت کریں، بنابرایں اُن میں سے بعض کا

دوسرے بعض کے اموال پر ہاتھ دھونا دراصل خود اپنے آپ پر زیادتی کرنے کے برابر ہے۔

بہرحال اس واقعہ میں تدبر اور اچھی طرح غور وفکر کرنے سے اس مطلب کے اشارے ملتے ہیں کہ کسی نے کسی کا مال چرایا، پھر وہ معاملہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا تو اصل چور نے اس فعل کی نسبت ایک بے گناہ شخص کی طرف دے دی اور کہا کہ فلاں شخص نے چوری کی ہے، پھر اصل چور کے دوستوں وساتھیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اصرار کیا کہ نامزد چور کو سزا دیں اور انہوں نے اپنی بھرپور کوشش کی اور ہر لحاظ سے آپؐ پر دباؤ ڈالنے میں لگ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بے گناہ شخص کے خلاف فیصلہ صادر کریں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور اس بے گناہ شخص کو جسے غلط نامزد کیا گیا تھا لوگوں کی طرف سے عائد کئے گئے الزامات سے بری کر دیا۔

مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیات اس واقعہ پر ہی منطبق ہوتی ہیں جو ان کے سبب نزول کی بابت ذکر کیا گیا ہے یعنی ابوطعمہ بن ابریق کی چوری کا واقعہ، تاہم آیات کے اسباب نزول کے بارے میں ہم متعدد بار ذکر کر چکے ہیں کہ ان میں سے اکثر وہی واقعات ہیں جو روایات میں مذکور ہیں یعنی ان واقعات کی تطبیق ان سے موزوں آیات پر ہوتی ہے۔ ان آیات مبارکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کا حجت وحرف آخر ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت و دیگر حقائق ثابت ہوتے ہیں کہ ان تمام امور کی بابت ہم عنقریب مربوط مطالب ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قضاوت کے منصب کا اظہار

''اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮكَ اللّٰهُ''

(بے شک ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جس سے اللہ نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے)

اس آیت مبارکہ میں لوگوں کے درمیان حکم وفیصلہ صادر کرنے سے مراد بظاہر ان کے درمیان تنازعات ومخاصمات اور لڑائی جھگڑوں میں فیصلہ کرنا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں عدالتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے اختلافات کے خاتمہ کو یقینی بنایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان قضاوت وفیصلے کرنے ہی کو کتاب نازل کرنے کا مقصد و بنیادی غرض قرار دیا ہے لہٰذا اس آیت کا مضمون درج ذیل آیہ مبارکہ کے معنی ومقصود پر منطبق ہوتا ہے کہ اس کی تفصیل اس کے مربوط مقام پر ذکر ہو چکی ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۳

''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ''

(لوگ امت واحدہ تھے، تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبریاں دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر، اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی حق کے ساتھ، تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں حکم صادر کریں (فیصلہ وقضاوت کریں) جس کی بابت وہ آپس میں اختلاف کرتے ہوں)۔

بنابرایں زیر نظر آیہ مبارکہ یعنی ''إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ۔۔۔'' اپنے خاص مورد میں مذکورہ بالا آیت مبارکہ ''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً۔۔۔'' کی مانند ہے کہ جس میں عمومیت پائی جاتی ہے البتہ اس اضافہ کے ساتھ کہ زیر نظر آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم وفیصلہ صادر کرنے کا اختیار عطا فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کو حجت اور حرف آخر قرار دیا ہے کیونکہ لفظ ''حکم'' (لتحکم'' کا معنی فیصلہ صادر کر کے نزاع وخصومت کو ختم کرنا ہے اور یہ کام حکم وفیصلہ صادر کرنے والے شخص (قاضی) کی مضبوط رائے وپختہ یقین پر موقوف ہوتا ہے کہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے عمومی احکام اور خصومت ونزاع کے موارد میں مقررہ قوانین سے بھرپور علم وآگاہی حاصل ہوتی ہے، اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کلی وعمومی احکام اور حقوق الناس کا عالم ہونا، ان احکام وقوانین کو متنازعہ امور میں یقینی طور پر منطبق وجاری کرنا دو الگ الگ مسئلے ہیں، یعنی قانون کا علم رکھنا اور ہے اور اس قانون کا مخصوص مورد پر لاگو ہونے یا نہ ہونے کا علم رکھنا اور ہے۔

لہذا جملہ ''ما اریك الله'' میں دکھانے سے مراد احکام وقوانین شریعت کی تعلیم دینا نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے اس کا احتمال دیا ہے بلکہ اس سے مراد رائے قائم کرنے کی قوت اور فیصلہ کرنے کی عملی صلاحیت وتطبیقی آگاہی عطا کرنا ہے، اس بناء پر آیت کے سیاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتاب نازل کی اور آپ کو اس کے احکام وقوانین اور حکم وفیصلہ صادر کرنے کے اصول بتائے تا کہ آپ اس میں اپنی خداداد قوت فیصلہ کے ساتھ لوگوں کے تنازعات میں آخری فیصلہ صادر کریں اور اس طرح ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا خاتمہ کریں۔

خائن کی طرفداری نہ کرنے کا حکم

''وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا''

(اور خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنیں)

یہ جملہ سابق جملہ خبریہ پر عطف ہے یعنی اس کی بازگشت اس کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ خبریہ ہونے کے باوجود

انشائیہ ہے یعنی اس میں حکم صادر فرمایا گیا ہے لہٰذا اس کا معنی یوں کیا جائے گا کہ گویا اس طرح کہا گیا ہے ''فاحکم بین الناس ولا تکن للخائنین خصیماً'' آپ لوگوں کے درمیان فیصلے صادر کریں اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری نہ کریں، لفظ ''خصیم'' سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دعوے یا اس طرح کے امور میں مدعی کی طرفداری کرے، اس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیانت کاروں کی طرفداری کرنے کی نفی کی گئی ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ حقداروں کے مقابلے میں ان لوگوں کا ساتھ نہ دیں جو حق پر نہ ہوں کہ ایسا کرنے سے حقداروں کے حقوق پامال ہوتے ہیں،

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ''وَلَا تَكُنْ لِلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا'' چونکہ اپنے ماقبل جملہ ''لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ'' کی طرف عطف ہے کہ جس میں فیصلہ صادر کرنے کا عمومی فرمان ہے لہٰذا یہاں خیانت سے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا مراد ہو، امانتوں میں خیانت کرنا مراد نہ ہو، اگرچہ بعض موارد میں کسی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خاص کو عام پر عطف کر دیا جاتا ہے لیکن یہاں اس طرح کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ خاص کو عام پر عطف کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں عام کو عام پر عطف کیا گیا ہے، بہرحال اس سلسلہ بحث کا تتمہ عنقریب ذکر کیا جائے گا۔

استغفار کا حکم

''وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا''

(اور آپ اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے)

بظاہر یہاں ''استغفار'' سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کریں کہ وہ انسان کی طبع وجودی میں پائے جانے والے جذبہ حق تلفی و نفس پرستی پر پردہ ڈال کر اس کے گناہوں کو معاف فرمائے، چنانچہ کئی مرتبہ یہ مطلب ذکر ہو چکا ہے کہ کلامِ الٰہی میں ''عفو'' اور ''مغفرت'' کے الفاظ ان مختلف امور کی بابت استعمال ہوئے ہیں جو ''گناہ'' کہلاتے ہیں کہ جس سے مراد حق سے دوری اختیار کرنا ہے خواہ اس کا سبب جو بھی ہو۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ کا معنی۔ واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ آپ خیانت کاروں کے طرفدار نہ بنیں اور نہ ہی ان کی طرف جھکاؤ کریں اور خدا سے چاہیں کہ وہ آپ کو اس کی توفیق عطا کرے اور آپ کو خیانت کاروں کی طرفداری کرنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔

آیت مبارکہ میں استغفار سے اس معنی کے مراد ہونے کی دلیل وہ الفاظ ہیں جو زیر نظر آیات مبارکہ کے ذیل (آیت ۱۱۳) میں ذکر ہوئے ہیں ''وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

وَ مَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ۔۔۔'' (اور اگر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے پوری کوشش کر کے آپ کو گمراہ کرنے کی ٹھان لی تھی، جبکہ وہ اپنے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے، اور آپ کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچا سکتے)، اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ خیانت کار لوگ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے خواہ وہ اپنی توانائیاں جس قدر بھی بروئے کار لائیں اور اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کریں کہ آپ کے احساسات کو باطل پرستی اور حق سے انحراف کے راستہ پر لائیں، مگر وہ اپنی کوششوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر طرح کے ضرر و نقصان اور گناہ و معصیت سے حفظ و امان میں ہیں اور اللہ انہیں ان امور سے بچانے والا ہے لہٰذا وہ اپنے کسی بھی فیصلہ میں جور و ناانصافی نہیں کرتے اور نہ ہی جور و ناانصافی کی طرف ان کا رجحان و جھکاؤ ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں جبکہ یہ بات جور و ناانصافی اور نفس پرستی سے عبارت ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں طاقتور اور کمزور، دوست و دشمن، مؤمن و کافر ذمی یا نزدیکی اور دور شخص کے درمیان فرق کریں، اس سے ثابت و معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استغفار کا جو حکم دیا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ (معاذ اللہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایسے گناہ و معصیت کے مرتکب ہوئے ہوں کہ جس کی سزا سخت ترین عذاب ہے یا آپؐ کا جھکاؤ ناشائستہ اعمال کی طرف ہوا ہو، ہرگز ایسا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ سے یہ چاہیں کہ انہیں ہمیشہ نفسانی خواہشات پر غالب رکھے۔ البتہ اس کے باوجود یہ حقیقت واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصمت کی منزل پر فائز ہونے کے باوجود ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و کرم اور عطا و عنایت کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہے انجام دیتا ہے۔

اور یہ مطلب واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ بالا عصمت ان اعمال کی بابت ہے جو اطاعت و معصیت اور تعریف و مذمت کے باب میں آتے ہیں ان کا وقوع پذیر ہونے والے امور سے کوئی تعلق نہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات شریفہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفسانی خواہشوں کی پیروی اور باطل کی طرف جھکاؤ کی بابت معصوم ہیں کہ وہ نہ تو اپنی خواہشات کا اتباع کرتے ہیں اور نہ ہی ناحق کی طرف جھکاؤ اور اس کا ساتھ دیتے ہیں لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن میں وہ قضاوت کرتے ہیں اور فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ جن کی قانون گزاری وہ خود کر چکے ہیں اور ظاہری احکام وضع فرما چکے ہیں مثلاً یہ کہ ''مدعی پر لازم ہے کہ وہ دلیل و ثبوت پیش کرے اور انکار کرنے والے (مدعی علیہ) پر لازم ہے کہ وہ قسم کھائے'' (البینة علی المدعی والیمین علی من انکر) تو ان امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر فیصلہ اصل حق و حقیقت پر مبنی ہو کہ جس کے نتیجہ میں حقدار غالب اور غلط دعویدار مغلوب ہو اس کا ثبوت زیر نظر آیات میں نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ظاہری قوانین و احکام اصل حق اور واقع الامر و حقیقت الامر کے یقینی اثبات میں مؤثر ہوتے ہیں کیونکہ وہ تو صرف اکثر اوقات حق و ناحق کے درمیان تمیز کرنے کی علامات و نشانیاں قرار پاتی ہیں نہ یہ کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہو اور کسی

چیز کا اکثر اوقات کسی اثر کو ظاہر کرنا اس کے ہمیشہ ایسا ہونے کو ثابت نہیں کرتا، یہ ایسی نا قابل انکار حقیقت ہے کہ عملی طور پر اس کا ثبوت کسی مزید بیان و وضاحت کا محتاج نہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں جو ظاہری احکام وقوانین وضع کئے گئے ہیں وہ کسی خاص مورد و موضوع میں حق وحقیقت اور اصل واقع الامر کو عموماً تو ثابت کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا ہمیشہ ایسا ہی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کی اثر گزاری مبنی برظاہر ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے ہیں یعنی مدعی کے پیش کردہ ثبوت اور مدعی علیہ کے جواب (قسم وغیرہ) کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں تو کبھی وہ فیصلہ اصل حقیقت کے مطابق ہوتا ہے لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ ظاہری دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بعض مفسرین کی وہ بات جو انہوں نے ''واستغفر اللہ'' کی بابت کہی وہ درست نہیں کہ جس میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا اور وہ حکم اس لئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں اس خائن و مجرم شخص کی حمایت کا خیال پیدا ہوا تھا جس کا اشارہ اس آیت میں ہوا ہے (وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرفداری کی کوشش کی کیونکہ مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی طرفداری کرنے اور یہودی کے مقابلے میں اس کی حمایت کرنے کی درخواست و مطالبہ کیا تھا، جبکہ اگر اس سلسلہ میں اچھی طرح غور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ناحق مطالبہ کے زیر اثر آ گئے تھے جو کہ ہرگز درست نہیں بلکہ یہ مذموم عمل ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی اثر پذیری کی ہر صورت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفی فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہوا ''وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ'' (اور وہ خیانت کرنے والے آپ پر ذرہ بھر منفی اثر نہیں ڈال سکتے)۔

اپنے آپ سے خیانت کرنے والے!

''وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ''

(اور ان لوگوں کا دفاع نہ کریں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں)

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں خیانت کرنے کی نسبت خود اپنے آپ سے دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خیانت کرنے کا وبال وعذاب نفس ہی کو پہنچتا ہے، یا یہ کہ ہر معصیت و گناہ نفس ہی سے خیانت کہلاتا ہے۔ خیانت کرنے والے کی طرف سے خود اپنے آپ سے خیانت کرنا قرار پاتا ہے جیسا کہ ہر معصیت و گناہ نفس ہی پر ظلم کرنا کہلاتا ہے اس آیت کی مانند درج ذیل آیت میں بھی اسی طرح کا تذکرہ ہوا ہے۔

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۷

''عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ''

(خدا کو معلوم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے)

زیر نظر آیۂ مبارکہ اور سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کو یکجا کر کے یہ مطلب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں مؤمنین کو نفس واحدہ (یک جان) قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا مال سب کا مال ہے کہ سب پر واجب ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور اسے تلف وضائع ہونے سے بچائیں، لہٰذا اگر ان میں سے کوئی شخص کسی کا مال چوری وڈاکہ زنی کے ذریعے ہتھیالے تو گویا اس نے خود اپنے ساتھ اور سب کے ساتھ خیانت کی اور آیت کے ذیلی جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا'' (اللہ کسی خیانت کرنے والے گناہگار کو دوست نہیں رکھتا) میں یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی خیانت کاری کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے وہ مسلسل خیانت کے مرتکب ہوتے تھے چنانچہ اس کی تائید وتصدیق لفظ ''اثیم'' سے ہوتی ہے کیونکہ یہ لفظ معنی کے حوالہ سے لفظ ''آثم'' (گناہ کرنے والا) سے زیادہ تاکید پر مبنی ہے کیونکہ وہ صفت مشبہ ہے کہ جو استمرار وتسلسل پر دلالت کرتی ہے جبکہ لفظ ''آثم'' اسم فاعل ہے کہ جو ایک بار انجام دینے پر بھی صادق آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جملہ ''تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ'' بھی استمرار وتسلسل کا ثبوت دیتا ہے ''تَخْتَانُوْنَ'' فعل مضارع ہے اور اس میں زمانہ حال ومستقبل دونوں ملحوظ ہوتے ہیں، اسی طرح لفظ ''لِلْخَآئِنِيْنَ'' (خیانت کرنے والے) سے بھی استمرار کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس میں انہیں اس ''وصف'' وحالت کا حامل قرار دیا گیا ہے اور یوں نہیں کہا گیا ''للذین خانوا'' (جن لوگوں نے خیانت کا ارتکاب کیا) جیسا کہ درج ذیل آیت میں مذکور ہے:

○ سورۂ انفال، آیت ۷۱

''فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ''

(انہوں نے اس سے پہلے بھی اللہ سے خیانت کی تو اللہ نے ان پر قابو پالیا)

مذکورہ بالا قرائن وشواہد اور ان جیسے دیگر امور کے تناظر میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر آیۂ مبارکہ کا معنی اس کے شانِ نزول کی روشنی میں یہ ہے کہ ان لوگوں کے طرفدار نہ بنیں اور نہ ہی ان کی طرف سے دفاع وحمایت کریں کیونکہ وہ خیانت پر تلے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مسلسل ارتکاب کے رسیا ہو چکے ہیں کہ اب گناہ کرنا ان کی طبیعتوں میں رس بس گیا ہے جبکہ اللہ کسی بھی خیانت کرنے والے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بات ان آیات کے اسباب نزول کی بابت وارد ہونے والی روایات کی تصدیق وتائید کرتی ہے کہ جن میں مذکور ہے کہ یہ ابوطعمہ بن ابیرق کے بارے میں نازل ہوئیں، اس کی مزید وضاحت عنقریب پیش کی جائے گی۔

البتہ شانِ نزول سے مربوط واقعہ سے قطع نظر آیۂ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنی قضاوت اور فیصلہ صادر کرنے میں

ان لوگوں کی طرفداری ودفاع نہ کریں جو خیانت کے ارتکاب پر مسلسل ڈٹے ہوئے ہیں اور گناہ کرنا ان کی طبع ثانوی بن چکا ہے کیونکہ اللہ خیانت کرنے والے گناہ کے رسیا شخص کو دوست نہیں رکھتا اور جس طرح اللہ زیادہ خیانت کو پسند نہیں کرتا اسی طرح تھوڑی خیانت کو بھی پسند نہیں کرتا اللہ خیانت کو کسی بھی صورت میں ہو پسند نہیں کرتا خواہ کم ہو یا زیادہ، اگر یہ ممکن ہوتا کہ اللہ کم خیانت کو پسند کرتا تو زیادہ خیانت کو پسند کرنا بھی خارج از امکان نہ ہوتا، یعنی اگر وہ کم گناہ کرنے والے کو پسند کرتا تو زیادہ گناہ کرنے والے کو بھی پسند کرلیتا کیونکہ گناہ، گناہ ہے خواہ جس قدر ہو، بنابراین اللہ تعالیٰ جس طرح کثیر الخیانت شخص کی طرفداری سے منع کرتا ہے اسی طرح قلیل الخیانت شخص کی حمایت وطرفداری سے بھی منع کرتا ہے البتہ اگر کوئی شخص کسی سلسلہ میں خیانت وگناہ کرے مگر کسی دوسرے سے اس سلسلہ میں نزاع کرے کہ جس میں وہ حق پر ہو تو ایسے شخص کی حمایت وطرفداری اس چیز میں کہ جس میں وہ حق پر ہو جائز وبلامانع ہے اور آیہ شریفہ ''وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا'' کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا یعنی ان کے بارے میں یہ حکم لاگو نہیں ہوتا۔

کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں

''يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ''

(وہ لوگوں سے چھپاتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے)

یہ جملہ بھی انہی شواہد میں سے ایک ہے کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام آیات (۱۰۵ تا ۱۲۶) کا سیاق ایک ہی ہے اور وہ سب اس ایک ہی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کہ جس کا اشارہ جملہ ''وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا'' میں ہوا کیونکہ ''استخفاء'' (چھپانا) انہی اعمال کے بارے میں موزونیت رکھتا ہے جن میں کسی دوسرے کی نسبت دینا ممکن ہو مثلاً چوری اور اس جیسے دیگر اعمال وافعال، بنابراین یہ احتمال وممکنہ خیال قرین صحت قرار پاتا ہے کہ یہ آیت اور اس سے ماقبل آیات جس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ وہی ہے جس کی طرف جملہ ''وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا'' اشارہ کرتا ہے۔

اور جہاں تک کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے چھپانے کا تعلق ہے تو یہ ایک محال وناممکن بات ہے کیونکہ کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ ومخفی نہیں خواہ زمین میں ہو یا آسمان میں ہو، اور جب کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں بلکہ کسی چیز کا اللہ سے پوشیدہ کرنا محال وناممکن ہے تو اس کا مقابل امر یعنی پوشیدہ نہ کرنا بھی کسی کے بس میں نہیں۔ یعنی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے فلاں چیز اللہ تعالیٰ سے چھپائی ہے یا نہیں چھپائی لہٰذا جب چھپانا اور نہ چھپانا دونوں کسی کے بس میں نہیں تو کسی کو بھی ان دونوں میں سے کسی ایک پر مورد ملامت قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی مذمت کی جاسکتی ہے جیسا کہ ظاہر الآیہ سے ثابت ومعلوم ہوتا

ہے لیکن جو مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ''استخفاء'' کا لفظی معنی یہاں مقصود و مدنظر نہیں بلکہ اس کا مرادی معنی ملحوظ ہے یعنی ''استحیاء'' (شرمندہ ہونا)، یہی وجہ ہے کہ ''وَ لَا یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ'' کو پہلے جملہ ''وَ ھُوَ مَعَھُمۡ اِذۡ یُبَیِّتُوۡنَ مَا لَا یَرۡضٰی مِنَ الۡقَوۡلِ'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رات کو تدبیریں کرتے تھے کہ کس طرح اس مذموم خیانت سے اپنے آپ کو بری قرار دیں اور ایسی باتیں کرتے تھے جو خداوند عالم کو ہرگز پسند نہیں، پھر جملہ ''وَلَا یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ'' کو اس جملہ کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا: ''وَ کَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطًا'' تو اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال واحوال کہ جن میں سے ان کی وہ حالت بھی ہے جس میں انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا سب پر محیط ہے یعنی اس کے قبضہ اقتدار و اختیار میں ہے، ادبی و علمی حوالہ سے یہ دونوں جملے یعنی ''وَھُوَ مَعَھُمۡ'' اور ''وَ کَانَ اللّٰہُ'' درحقیقت خاص کے بعد عام کے ذریعہ مقصودہ معنی و مطلوبہ مفہوم کو مقید کرنے کی غرض سے ہیں اور ایسا کرنا حقیقت میں ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے کچھ چھپا نہ سکنے کی دو وجوہات کو بیان کرنے کی غرض سے ہے کہ پہلے خاص وجہ کے ذریعے اور پھر عام وجہ کے ذریعہ ایسا کیا گیا۔

دنیا و آخرت کے دو مختلف حوالے:

''ھٰاَنۡتُمۡ ھٰۤؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡھُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا''

(ہاں، تم ہی نے دنیاوی زندگی میں ان کا دفاع کیا)

اس آیت میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ ان خیانت کرنے والوں کی طرفداری وحمایت کا کوئی نتیجہ واثر نہیں اور اس کا انہیں ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوگا، اگرچہ یہاں استفہامی جملہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کی طرفداری اور ان کا دفاع کرنا اگر فائدہ مند بھی ہو تب بھی صرف دنیاوی زندگی میں ہوگا کہ جس کی اللہ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں، لیکن جہاں تک اُخروی زندگی کا تعلق ہے کہ جس کی قدر و منزلت اللہ کے نزدیک بہت زیادہ ہے اور قیامت کا دن ہی اصل میں دفاع و جوابگوئی کا دن ہے تو وہاں ان کا دفاع کرنے والا کوئی بھی نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص ان خیانت کرنے والوں کی حمایت و طرفداری اور ان کا ساتھ دے گا بلکہ کوئی شخص بھی ان کی طرف سے وکیل و نمائندہ بن کر ان کے امور کی بابت کوئی اقدام نہ اٹھائے گا اور نہ ہی ان کے معاملات کی درستگی پر توجہ دے گا۔

استغفار کا ترغیبی بیان:

''وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ''

(اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے۔۔۔)

اس آیت میں خیانت کرنے والوں کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ استغفار کر کے اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آئیں اور اس کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں۔

یہاں برے عمل کا ارتکاب اور اپنے اوپر ظلم کرنے کو (اَو) یعنی ''یا'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کرنے میں بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان اعمال کی تدریجی انجام دہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خواہ وہ دوسروں پر ظلم کریں (وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا) یا خود اپنے اوپر ظلم کریں (اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ) پھر اپنے رب سے مغفرت طلب کریں تو اللہ کو معاف کر دینے والا پائیں گے۔

کیونکہ یہاں ''سُوْٓءً'' (برائی) سے مراد دوسروں پر زیادتی کرنا اور ''ظلم'' سے مراد خود اپنے آپ پر زیادتی کرنا ہے یا یہ کہ ''سُوْٓءً'' (برا عمل) ''ظلم'' سے کمتر ہے کہ جس کی حیثیت صغیرہ گناہ جیسی ہے کہ جو کبیرہ گناہ کے مقابلے میں کمتر ہوتا ہے (''سُوْٓءً'' کو صغیرہ گناہ اور ''ظلم'' کو کبیرہ گناہ کے طور پر تصور کیا گیا ہے لہٰذا ان دونوں کا ذکر حرف ''اَوْ'' کے ساتھ ہوا جس کا ترجمہ ''یا'' ہے کہ اس سے یہ مطلب ملحوظ ہے کہ خواہ وہ صغیرہ گناہ کے مرتکب ہوں یا کبیرہ گناہ انجام دیں دونوں صورتوں میں جب وہ اللہ سے مغفرت طلب کریں تو اللہ کو معاف کر دینے والا، رحم کرنے والا پائیں گے)۔ واللہ اعلم۔

یہ آیت اور اس کے بعد والی دو آیتیں ایک ہی مطلب کے بیان پر مشتمل ہیں اور وہ یہ کہ انسان جس عمل کا مرتکب ہوتا ہے اس کا گناہ اپنے سر لیتا ہے، تو ان تین آیتوں میں سے ہر آیت اس گناہ کی ایک جہت کو بیان کرتی ہے اور وہ اس طرح کہ پہلی آیت یہ مطلب بیان کرتی ہے کہ انسان جس گناہ و معصیت کا مرتکب ہو اس کے اثرات اس کی لوح نفس پر ثبت و نقش ہو جاتے ہیں اور اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیئے جاتے ہیں اور اگر وہ شخص اس کی توبہ کر لے اور اللہ سے اس کی بخشش طلب کرے تو خداوند عالم کو معاف کر دینے والا، رحم کرنے والا پائے گا، اور دوسری آیت اس مطلب کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ جو شخص بھی کسی گناہ کا مرتکب ہو اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا اور وہ خود ہی اس کا ذمہ دار قرار پائے گا لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس گناہ کا اثر غلطی سے کسی دوسرے شخص پر پڑے اور کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے، تو کسی دوسرے کو اس کا مجرم ٹھہرانا اور اس کی طرف تہمت کے تیر پھینکنا ہرگز درست نہیں تیسری آیت میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو گناہ و خطا اور معصیت کوئی شخص انجام دے اور اس کی نسبت کسی دوسرے کی طرف دے تو اس کا ایسا کرنا اس اصل گناہ و معصیت کے بعد دوسرا گناہ شمار ہوگا تو اس سے دوہرے گناہ کی باز پرس ہوگی۔

گناہ: گناہگار کی گردن کا طوق:

''وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا''

(اور جو شخص گناہ کا مرتکب ہو تو اس نے اپنے آپ پر اس کی ذمہ داری ڈال دی، اور اللہ بخوبی آگاہ و دانا ہے)

اس آیت کے حوالہ سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کا تعلق بعد والی آیت سے ہے کہ جس میں اپنے کئے کی نسبت دوسروں کی طرف دینے اور تہمت لگانے کے بارے میں مربوطہ مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ تو یہ آیت بعد والی آیت کی تمہید و مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنابراین جملہ "فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ" گناہ کے مرتکب ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دینے کو متعین کرتا ہے کہ اس کی تمام تر ذمہ داری اور سزا اسی پر عائد ہوتی ہے اس کے علاوہ کوئی شخص اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، لہٰذا آیت اس شخص کو نصیحت پر مشتمل ہے جو کسی گناہ کا مرتکب ہو کر اس کی نسبت بے گناہ کی طرف دیتا ہے اور کسی بے قصور شخص کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوا سے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس نے جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے اور اس کی سزا اسے ہی بھگتنی ہوگی اس کے گناہ کا تعلق و ذمہ داری کسی دوسرے شخص پر عائد نہیں ہوتی اور اگر وہ اس کی نسبت کسی دوسرے کی طرف دے اور اسے اس کا مرتکب قرار دے تو اس کا ایسا کرنا بے فائدہ و بے نتیجہ ہے کیونکہ اللہ بخوبی آگاہ ہے کہ اس کا اصل مرتکب کون ہے اور اس کا انجام دینے والا وہ شخص نہیں جس کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے اور اللہ دانا ہے لہٰذا وہ کسی گناہ کی سزا صرف اس کے مرتکب شخص کو دے گا اور کسی کے گناہ کا بوجھ کسی پر نہیں ڈالے گا چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ اس مطلب کی واضح گواہی دیتی ہیں:

- سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶

"لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"

(ہر شخص اپنے اچھے عمل کی جزا پائے گا اور برے عمل کی سزا بھی اسی کو ملے گی)

- سورۂ انعام، آیت ۱۶۴

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"

(اور کوئی دوسرا کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا)

- سورۂ عنکبوت، آیت ۱۲

"وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ"

(اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہوں نے ایمان والوں سے کہا کہ تم ہمارے راستہ پر چلو اور ہم تمہارے گناہوں کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہیں جبکہ وہ ان کے گناہوں کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیں گے وہ جھوٹے ہیں)

تہمت و بہتان کی وضاحت:

''وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا''

(اور جو شخص کسی خطا یا گناہ کا مرتکب ہو پھر اس کی نسبت کسی بے قصور شخص کی طرف دے تو اس نے تہمت و بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر ڈال لیا)

مشہور لغت دان راغبؔ اصفہانی نے اپنی کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرے مگر اس سے اس کے علاوہ کسی چیز کا ارتکاب ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے خطا ہوئی، غلطی سے وہ کام ہو گیا اور اگر اس سے وہی کام انجام پائے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے درست انجام دیا اور اپنا مقصود حاصل کر لیا، اور اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کام کو صحیح طور پر انجام نہ دے یا اپنے کئے ہوئے ارادہ کو اچھی طرح پورا نہ کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی، اس نے غلطی کر لی، اس سے خطا ہوئی، اسی بناء پر کہا جاتا ہے ''اصاب الخطاء'' غلط راہ پر چلا اور ''اخطاء الصواب'' صحیح راستہ سے خطا کی، ''اصاب الصواب'' اور صحیح راہ پر چلا، ''اخطاء الخطاء'' غلط راہ سے خطاء کی، یعنی اس میں بھی غلطی کر گیا۔ تو یہ لفظ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کئی معانی میں مشترک ہے لہٰذا جو شخص حقائق تک رسائی کا خواہاں و کوشاں ہو اسے چاہیے کہ ہر مورد میں اچھی طرح غور کرے اور اس لفظ کے معنی کا تعین اس مورد کی مناسبت سے کرے۔ اور یہ بھی معلوم رہے کہ لفظ ''خَطِيئَةً'' اور لفظ ''سَيِّئَةً'' دونوں قریب المعنی ہیں لیکن لفظ ''خَطِيئَةً'' اکثر ان موارد و مقامات میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کوئی ایسا کام وقوع پذیر ہو جائے جو اصل مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسرے کام کے نتیجہ میں سرزد ہوا ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جانور کو شکار کرنے کی غرض سے تیر چلائے اور وہ تیر کسی انسان کو جا لگے، یا کوئی نشہ آور چیز کھا یا پی لے اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا مرتکب ہو جائے، البتہ سبب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ سبب کہ جو خود حرام ہے مثلاً شراب نوشی و نشہ آور چیز کا استعمال کہ جو کسی دوسرے حرام و غلط کام کا سبب بنے، دوسرا وہ سبب کہ جو خود حرام و ممنوع نہیں مثلاً شکار کرنے کے لیے تیر چلانا کہ جو کسی حرام کام جیسے کسی انسان کو قتل کرنے کا سبب بنے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے بارے میں ارشاد فرمایا ''وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ'' (اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس چیز کی بابت کہ جس میں تم سے خطا ہوئی۔ غلطی ہو گئی۔ لیکن تم پر اس کا گناہ ہے جو تمہارے دلوں نے جان بوجھ کر انجام دیا) اور فرمایا ''يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا'' (اور جو شخص غلطی کرے یا گناہ کا مرتکب ہو)، تو ان آیتوں میں ''خَطِيئَةً'' سے مراد وہ فعل ہے جو جان بوجھ کر انجام نہ دیا گیا ہو بلکہ غلطی سے سرزد ہو جائے۔ (کتاب المفردات، ص ۱۵۱)

راغبؔ اصفہانی کا بیان آپ نے ملاحظہ کیا، میرے خیال میں ''خَطِيئَةً'' (غلطی) ان اوصاف و کیفیتوں میں سے

ہے کہ جس کے استعمال کی کثرت کے باعث اس کے کسی موصوف و متعلقہ امر کے ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لہٰذا ''فعل خطیئۃ'' (غلطی والا کام) کہنے کی ضرورت نہیں، تو یہ لفظ بھی انہی الفاظ کی مانند ہے جو عام طور پر استعمال میں آتے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کے موصوف و متعلقہ امر کو ذکر نہیں کیا جاتا مثلاً مصیبت، رزیت، سلیقہ اور اس طرح دیگر الفاظ اور جو لفظ ''فعیل'' کے وزن پر آتا ہے اس سے اس کے معنی و واقعہ کا رونما ہونا اور استقرار و بقاء کا ثبوت ملتا ہے، بنا برایں ''خَطِیْئَۃً'' اس عمل کو کہتے ہیں جس میں خطا و غلطی گھر کر چکی ہو، اور ''خطاء'' اس فعل کو کہتے ہیں جس کی انجام دہی انسان کا مقصود نہ ہو مثلاً قتل الخطاء، غلطی سے کسی شخص کو قتل کرنا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا مثال میں بیان ہوا ہے کہ کسی حیوان کا شکار کرتے ہوئے غلطی سے کسی انسان کو وہ تیر لگ جائے جس سے وہ قتل ہو جائے۔ تو لفظ ''خطاء'' کا یہ وہ معنی ہے جو لغت واصل میں مقرر ہے، اس کے بعد اس کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسے ہر اس کام کے لیے استعمال کیا جانے لگا جس کا ارادہ کرنا کسی بھی شخص کو روا نہیں، یعنی جو کام انجام دینا درست نہ ہو وہ انجام پا جائے کہ جس کا ارادہ نہ تھا تو وہاں لفظ ''خَطِیْئَۃً'' استعمال ہوتا ہے۔ گویا ہر وہ کام یا اس کا اثر کہ جو مقصود و مراد نہ ہوا سے خطاء و غلطی سے واقع ہونے والا کام کہا جاتا ہے تو ایسا کام معصیت شمار نہیں ہوتا، یا وہ کام کہ جس کی انجام دہی کا ارادہ کرنا صحیح نہیں تو اس کا انجام پذیر ہونا گناہ و معصیت یا اس کی سزا و وبال شمار ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ''خَطِیْئَۃً'' کے ساتھ ''یَّکْسِبْ'' کے الفاظ ذکر کے اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ کام ہے جسے یہ جانتے ہوئے انجام دیا جائے کہ اس کا انجام دینا صحیح نہیں اور اسے ہرگز انجام نہیں دینا چاہیے لہٰذا اسے معصیت قرار دیا جائے گا تو آیت مبارکہ میں لفظ ''خَطِیْئَۃً'' سے مراد وہ فعل ہے جو عمداً و ارادۃً انجام پذیر ہو جبکہ اس کا ارادہ کرنا ہی صحیح نہ ہو۔

ان مطالب کی تصدیق سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ ''قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ'' (کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ ہے) سے ہوئی ہے کہ جس کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ''اثم'' (گناہ) اس عمل کو کہتے ہیں جس کے برے اثر سے کثیر خیر سے محرومی دامنگیر ہوتی ہے مثلاً شرابخوری، جواء بازی اور چوری وغیرہ کہ اس طرح کے اعمال انسان کی زندگی میں خیر اور نیکیوں کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور انسان کی معاشرتی زندگی میں اس کے مقام و منزلت اور وقار و اعتماد کے سلب ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

بنا برایں زیر نظر آیہ مبارکہ میں لفظ ''خَطِیْئَۃً'' اور لفظ ''اثم'' کو حرف ''او'' کے ساتھ ذکر کیا جانا اور دونوں کو ''کسب'' (وَمَنْ یَّکْسِبْ) کے ساتھ ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص مورد کے لحاظ سے خاص معنی رکھتا ہے لہٰذا آیت کا معنی۔ واللہ اعلم۔ یہ ہوگا کہ جو شخص کسی ایسی معصیت کا مرتکب ہو کہ جس کا عذاب و وبال اس کے مورد ہی تک محدود رہے مثلاً بعض واجبات کو ترک کرنا جیسے روزہ یا بعض حرام کاموں کو انجام دینا جیسے خون کھانا، یا کسی ایسی معصیت کا مرتکب ہو جس کا عذاب و وبال باقی رہنے والا ہو جیسے کسی شخص کو ناحق قتل کر دینا اور کسی کا مال چرا لینا اور پھر اس کی نسبت کسی دوسرے بے قصور شخص کی طرف دینا تو اس طرح کے اعمال تہمت و بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لینے سے عبارت ہیں یعنی ایسا

کرنے والا الزام تراشی اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

زیر نظر آیت میں کسی برے عمل کو کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرنے کو "رمی" سے تعبیر کیا گیا ہے (ثم یرم بہ بریئاً) جبکہ لفظ "رمی" تیر پھینکنے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح بہتان کا گناہ سر لینے کو "احتمال" یعنی "اٹھانا" سے موسوم کیا گیا ہے تو یہ ایک لطیف استعارہ کی صورتیں ہیں کہ گویا افتراء و تہمت لگانے والا شخص، جب کسی بے گناہ و بے قصور شخص پر الزام تراشی کرتا ہے تو گویا اس کی طرف بغیر وجہ و سبب کے تیر چلا کر اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایسا کرنا اس پر نہایت سنگین بوجھ ڈال دیتا ہے کہ پھر اسے زندگی بھر ہر "خیر" سے محروم کر دیتا ہے اور ہمیشہ اس پر حاوی رہتا ہے کہ کسی بھی مرحلہ میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہو گیا کہ ان آیات مبارکہ میں معصیت کو مختلف الفاظ سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے کہ کہیں اسے "اثم" (گناہ) کہا گیا، کہیں "ضلالت" (گمراہی) سے موسوم کیا گیا، کہیں "سوء" (برائی) کہیں "ظلم" اور کہیں "خیانت" کا نام دیا گیا، تو واضح ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کا مخصوص معنی ہے کہ جسے اس کے مناسب مقام پر استعمال کیا جاتا ہے اور وہی معنی مقصود و ملحوظ قرار پاتا ہے۔

اللہ کے فضل وعنایت کا نتیجہ:

"وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ۔۔۔"

(اور اگر آپ پر اللہ کا فضل وعنایت اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو۔۔۔)

آیت مبارکہ کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گمراہ کرنے کی کوشش سے مراد یہ ہے کہ ان کی کوشش و خواہش یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کی طرفداری و حمایت پر راضی کریں جنہیں ابتدائے آیات میں "خائنین" (خیانت کار لوگ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کا ساتھ دینے سے منع کیا گیا ہے (وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا) (ولا تجادل عنہم)۔ بنا بر ایں یہاں گمراہ کرنے کی کوشش کرنے والے گروہ سے مراد وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں ان الفاظ سے خطاب ہوا ہے "هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" ان لوگوں سے مراد ابوطعمہ کی قوم و قبیلہ کے افراد ہیں کہ اس سلسلہ میں مربوطہ روایت عنقریب ذکر کی جائے گی۔

اور جہاں تک جملہ "وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ" کا تعلق ہے تو اس سے اس کے بعد والے جملہ "وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ" کے تناظر میں مراد یہ ہے کہ ان کا گمراہ کرنا خود ان کے اپنے سوا کسی پر اثر انداز نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی

اثر ہوگا، لہٰذا اس طرح کی کوشش وفیصلہ کرنے میں وہ خود گمراہ ہیں کیونکہ ان کا ایسا کرنا معصیت اور ہر معصیت گمراہی ہے۔

البتہ اس جملہ ''وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ'' کا ایک معنی اور بھی ہے کہ جس کا تذکرہ سورۂ آل عمران آیت ۶۹ ''وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ'' کی تفسیر میں ہو چکا ہے (ملاحظہ ہو: جلد ۳ صفحہ ۵۹۶) لیکن وہ بیان یہاں موزونیت نہیں رکھتا۔

اور جملہ ''وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ'' میں اُن کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کی نفی ہوئی ہے کہ وہ ہرگز اور کسی بھی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضرر نہیں پہنچا سکتے، اس میں مطلق نفی ہوئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گمراہ کرنے کی ان کی مذموم کوشش کسی بھی حوالہ سے نتیجہ بخش ثابت نہیں ہو سکتی البتہ اس مطلق نفی کو آیت کا ظاہر السیاق جملہ ''وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ'' کو جملہ ''وَمَا يَضُرُّوْنَكَ'' کی ضمیر سے حال قرار دیں اور یوں معنی کریں کہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے حالانکہ اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی ہے، اگرچہ علم النحو کے ماہرین کہتے ہیں کہ عام طور پر جو جملہ فعلیہ، فعل ماضی سے شروع ہو تو اس کا کلام میں حال ہونا اس پر حرف ''قد'' لگانے سے واضح ہوتا ہے بنابرایں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سیاق، لوگوں کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضرر و نقصان پہنچانے کی مطلق نفی کے بیان پر مشتمل ہے کہ وہ نہ تو علم میں اور نہ ہی عمل میں کسی بھی طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اور جملہ ''وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اپنے ماقبل جملہ ''وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ'' کی وجہ وسبب کے بیان پر مشتمل ہے بہر حال دونوں صورتوں میں ان جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان نہ پہنچا سکنا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گمراہ کرنے کی کوششوں میں ناکام ہونا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی ہے جو کہ لوگوں کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کی راہ میں رکاوٹ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ضرر و نقصان سے بچاتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کا ثبوت دیتی ہے۔

عصمت کا معنی ومفہوم؟

آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ وترکیب سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کی اصل واساس اور سرچشمہ وجود ایک طرح کا علم ہے کہ جو اس علم کے حامل شخص کو معصیت وغلط کام کرنے سے روکتا ہے اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ علم ہی ہے جو گمراہی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے دیگر نفسانی و وجودی صفات مثلاً شجاعت وبہادری، عفت و پاکدامنی اور سخاوت وتوانگری کہ ان میں سے ہر ایک صفت ایسی ہے جو لوح نفس پر ثبت ہو کر اپنے متعلقہ آثار کی وجود پذیری کو یقینی بناتی ہے اور ان چیزوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے جو ان آثار کے منافی ومتضاد ہوتے

ہیں مثلاً بزدلی جو کہ بہادری کے مقابل میں ہے اور بے حیائی و بدکاری جو کہ عفت و پاکدامنی کے مقابل میں ہے اور بخل و کنجوسی جو کہ سخاوت و توانگری کے مقابل میں ہے تو ان تمام منفی و متضاد صفات کی راہ میں جو چیز رکاوٹ ثابت ہوتی ہے وہ اس شخص کا ''علم'' ہے کہ جس کی وجہ سے اس کے باطن میں پاکیزہ صفتیں نقش ہو جاتی ہیں اور ان صفات کے نتیجہ میں ان کی مقابل منفی صفتیں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتیں یعنی علم ان صفتوں کو پنپنے ہی نہیں دیتا۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اگرچہ علم اور حکمت دونوں ہی ایسی عظیم قوتیں ہیں جو اپنی تمام تر بلندیوں اور مثبت اثر گزاریوں کے ساتھ اپنے حامل افراد کو ہلاکت خیزیوں، پست افعال کی تباہ کاریوں اور معصیت و گناہ کی گندگی و غلاظت میں آلودہ ہونے سے بچاتی ہیں جیسا کہ معاشرے میں یہ حقیقت ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ اہل علم و صاحبان حکمت افراد کہ جو تقویٰ و دینداری کی اعلیٰ و پاکیزہ صفات سے متصف ہیں وہ گناہوں کی آلودگی سے مبرّا ہوتے ہیں لیکن علم و حکمت کی اثر گزاری کی یہ صورت اکثر تو ہوتی ہے ہمیشہ نہیں ہوتی یعنی ایسا نہیں کہ ہر وہ شخص جو علم و حکمت کا حامل ہو وہ ان کی اثر گزاری سے مستفیض ہو کیونکہ یہ بھی عالم طبیعت میں پائے جانے والے دیگر عام اسباب جیسے ہیں کہ جن کی اثر گزاری ان کے حامل افراد میں دائمی نہیں ہوتی بلکہ ان کی کمالی حیثیت کے عین مطابق ہوتی ہے کہ وہ جس قدر کسی چیز میں کمال رکھتے ہیں اس کے مطابق نواقص و خطا سے محفوظ رہتے ہیں، تو یہ صورتحال ان تمام اسباب میں پائی جاتی ہے جو عموماً ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور ان کا ایسا ہونا اس بناء پر ہے کہ انسان کے وجود میں جو مختلف شعوری قوتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے بعض ایسی ہیں جو دوسری بعض قوتوں کی عملداری کا راستہ روک دیتی ہیں یا ان کی طرف توجہ کرنے کے احساس کو کم کر دیتی ہیں چنانچہ اس کی مثال واضح ہے کہ تقویٰ جیسی پاکیزہ صفت کا حامل شخص جب تک اپنی اس عظیم صفت کی طرف متوجہ رہتا ہے اس وقت تک وہ کسی بھی ناپسندیدہ شہوانی عمل کی طرف رغبت ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے تقویٰ ہی کی راہ پر گامزن رہتے ہوئے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں منہمک ہوتا ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ نفسانی خواہشات کی آگ کے شعلے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اسے اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ وہ اپنی تقوائی حیثیت ہی بھول جاتا ہے اور اس کی آنکھوں پر اس طرح پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ تقویٰ کی عظمت کا مشاہدہ ہی نہیں کر سکتا یا تقویٰ کا شعور و احساس اتنا کم ہو جاتا ہے کہ وہ تقویٰ کے منافی عمل کی انجام دہی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اور پھر بدکاری کے ارتکاب سے اپنے دامن حیات کو داغدار کر دیتا ہے۔ بنابرایں تمام وہ شعوری اسباب جو انسان کے وجود میں ہیں ان کی اثر گزاری کی صورتحال اسی طرح کی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان وجودی شعوری اسباب میں سے جس سبب کا تصور کریں وہ ایسا ہے کہ اگر اس کی طرف کامل توجہ و التفات برقرار رہے تو وہ اپنا مثبت اثر ظاہر کرتا ہے اور کوئی چیز اس کی اثر گزاری میں مانع نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام تر انحرافات کی اصل وجہ تقویٰ اور وجودی شعوری اسباب کا ٹکراؤ اور ان میں سے ایک کا دوسرے پر غالب آ جانا ہے اگر تقویٰ غالب آ جائے تو نیکیاں انجام

پذیر ہوتی ہیں اور اگر تقویٰ مغلوب ہو تو معصیت و گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس قوت کو ''عصمت'' سے موسوم کیا جاتا ہے وہ ایک شعوری و علمی سبب ہے کہ جو کبھی کسی سے مغلوب نہیں ہوتا یعنی کوئی سبب اس پر غلبہ نہیں پا سکتا، اگر اس کا شمار عام شعوری اسباب میں ہوتا تو یقیناً اس میں بھی ''خلاف ورزیوں'' کی راہ نکل آتی اور عین ممکن تھا کہ اس کی اثر گزاری کا دروازہ ہی بند ہو جاتا اور وہ بے اثر ہو جاتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''علم'' دیگر علوم و ادراکات کے باب سے نہیں کہ جن میں اکتساب و تعلم کا حوالہ پایا جاتا ہے یعنی وہ کسبی نہیں بلکہ وھبی ہے چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی خاص عنایت کا ذکر فرمایا: ''وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' (اور اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل کی اور آپ کو وہ کچھ تعلیم کیا جس کا علم آپ کو نہ تھا) حقیقت یہ ہے کہ ہم اس فرمانِ خداوندی کو اچھی طرح سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ ہم فہم المعانی کا وہ ذوق ہی نہیں رکھتے کہ جس کے ذریعے اس طرح کے علم وشعور کا ادراک کر سکیں البتہ اس سلسلہ میں دیگر آیات مبارکہ میں کلام الٰہی کے ذریعے بعض امور و مطالب سے آگاہ ہونا ممکن ہے۔ مثلاً

- سورۂ بقرہ، آیت: ۹۷

''قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ''

(کہہ دیجئے کہ کون ہے جو جبریل کا دشمن ہو، اس نے ہی تو آپ کے دل پر قرآن نازل کیا ہے)

- سورۂ شعراء، آیت: ۱۹۳

''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾''

(روح الامین نے اسے (قرآن کو) آپ کے دل پر عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ آپ انذار کرنے والوں میں سے ہوں)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نازل کرنا علم ہی کے باب سے ہے اور دوسری جانب اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ نازل کرنے کی مذکورہ صورت وحی اور کلام کرنے کے ذریعے تھی، چنانچہ درج ذیل آیات سے اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے:

- سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۳

''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى''

(اللہ نے تمہارے لئے وہی شریعت قرار دی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی آپ کی طرف بھیجی اور جس کا حکم ابراہیم اور موسیٰ وعیسیٰ کو دیا)۔

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۶۳

''اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ''

(ہم ہی نے آپ کی طرف وحی بھیجی جس طرح ہم نے نوح اور ان کے بعد والے نبیوں پر وحی کی)

○ سورۂ انعام، آیت: ۵۰

''اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ''

(میں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے، کہ جو میری طرف وحی کی جاتی ہے)

○ سورۂ اعراف، آیت: ۲۰۳

''اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ''

(میں صرف اسی چیز کا اتباع کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ اپنے مختلف حوالوں کے ساتھ اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ نازل کرنے (انزل) سے مراد وحی ہے اور کتاب وحکمت کی وحی ہے اور کتاب وحکمت کی وحی اللہ کی طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم دینے کی خاص ومخصوص صورت سے عبارت ہے، البتہ جملہ ''وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم کا دائرہ صرف کتاب وحکمت تک محدود نہیں بلکہ اس سے وسیع تر ہے کیونکہ شانِ نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لوگوں کے نزاعات میں قضاوت وفیصلہ کرنا اور اپنی مخصوص رائے کے ذریعے لوگوں کے متنازعہ امور کو حل کرنا ہے جو کہ کتاب وحکمت کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی علم اور مخصوص رائے پر مبنی ہے اگر چہ اس کی بنیاد کتاب وحکمت ہی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص طرزِ فہم کو موضوعیت وبنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ان حقائق کے تناظر میں یہ بھی واضح وظاہر ہوجاتا ہے کہ آیت مبارکہ ''وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ'' میں نازل کرنے (انزل) اور تعلیم دینے (علم) سے مراد علم کی دو قسمیں: ایک وحی کے ذریعے تعلیم دینا اور روح الامین کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچانا، اور دوسری دل پر مخصوص طریقہ سے القاء کرکے تعلیم دینا اور پوشیدہ طور پر الہام کے ذریعے علم عطا کرنا ہے کہ جس میں فرشتہ بھیج کر تعلیم دینا شامل نہیں اور انہی دو قسموں کی تائید وتصدیق ان روایات سے ہوتی ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے بارے میں مطالب مذکور ہیں۔

بنابرایں جملہ ''وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو خاص علم عطا کیا ہے کہ اگر وہ علم آپ کو نہ دیا جاتا تو وہ اسباب آپ کی ہرگز کفایت نہ کرتے جو عام طور پر علم حاصل کرنے میں اختیار کئے جاتے ہیں۔

اب تک ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت وعطا کہ جسے ہم

''قوتِ عصمت'' سے موسوم کرتے ہیں وہ ایک طرح کا مخصوص علم وشعور ہے جو اس حوالہ سے کہ دیگر تمام علوم سے مختلف ہے کہ کوئی شعوری قوت اس پر غالب نہیں آسکتی بلکہ وہ ہر قوت پر غالب آتی ہے اور اس سے کام لیتی ہے۔ اسی وجہ سے اس قوت کا حامل شخص ہر گمراہی وخطا کاری سے محفوظ ہوتا ہے، اس حوالہ سے روایات میں مذکور ہے کہ نبی وامام کو ایک خاص روح حاصل تھی کہ جسے روح القدس کہا جاتا ہے اور وہ انہیں معصیت وگناہ سے بچاتی تھی کہ اسی کی طرف درج ذیل آیت میں اشارہ ہوا ہے:

○ سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۲

''وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا''

(اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے امر سے ایک روح کو وحی کیا، آپ کو کتاب اور نہ ہی ایمان سے کچھ آگاہی حاصل نہ تھی، لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا کہ اس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے جسے ہم چاہیں ہدایت کرتے ہیں)

اس آیت سے اس کے ظاہری الفاظ اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کلمۂ روح نازل فرمایا کہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم وہدایت کی نعمت سے بہرہ ور کردیا، اسی مطلب پر مشتمل درج ذیل آیت مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا:

○ سورۂ انبیاء، آیت: ۷۳

''وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾''

(اور ہم نے اُنہیں امام قرار دیا، وہ ہمارے امر کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کی طرف نیکیاں انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا اور وہ ہمارے ہی عبادت گزار ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا کہ اس میں مقصود یہ ہے کہ روح القدس ہی وہ قوت ہے جو نبی وامام کو نیکیوں کی انجام دہی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانے کی راہ پر لاتی ہے۔

اب رہی کتاب وحکمت کی بات، تو مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوگیا کہ جملہ ''وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' میں کتاب سے مراد وہ وحی ہے جو لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور متنازعہ امور کو حل کرنے کے لئے نازل ہوئی کہ جس کی بابت درج ذیل آیت میں مربوطہ مطالب مذکور ہیں:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۳

''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ''

(اور لوگ سب امت واحدہ ہے، پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبریاں دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر، اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی حق کے ساتھ تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کو دور کرنے کے لیے فیصلہ کریں)۔

اس آیت کی تفسیر میں متعلقہ مطالب المیزان جلد دوم میں ذکر ہو چکے ہیں۔

اور حکمت سے مراد دیگر وہ تمام معارف الٰہیہ ہیں جو وحی کے ذریعے نازل ہوئے کہ جو لوگوں کی دنیاوی و اخروی زندگی میں فائدہ مند ہیں، اور جملہ ''وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' سے کتاب وحکمت کے علاوہ دیگر عمومی مطالب مراد ہیں، چنانچہ کتاب وحکمت سے مرادی معانی کی بابت بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ کتاب سے مراد قرآنِ مجید اور حکمت سے مراد اس میں مذکور احکام ہیں، اور جملہ ''مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' سے مراد احکام اور غیب کا علم ہے۔ بعض مفسرین نے کتاب وحکمت سے قرآن و سنت مراد لیا ہے اور ''مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ'' سے شریعتیں اور سابقہ انبیاء سے مربوطہ حالات و واقعات اور دیگر علوم مراد ہیں۔ ان اقوال کا کمزور و نادرست ہونا ہمارے سابق الذکر مطالب کے تناظر میں واضح ہو جاتا ہے لہٰذا دوبارہ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور جملہ ''وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا'' میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خاص عنایت و احسان کا حوالہ ملحوظ ہے۔

نجویٰ و راز گوئی کے حوالہ سے!

○ ''لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾''

(ان کے اکثر نجویٰ و راز گوئیوں میں اچھائی نہیں پائی جاتی سوائے اس شخص کے، کہ جو صدقہ یا نیکی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دے)

نجویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں: ''ناجیته'' (میں نے اس کے ساتھ نجویٰ کیا) تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ چھپ کر بات کی، راز گوئی کی اس کا

لفظی اشتقاق ''نجوۃ'' سے ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ کسی کے ساتھ کسی جگہ خلوت وتنہائی میں ہوں (المفردات، صفحہ ۴۸۴) بنابراین لفظ ''نجویٰ'' کا معنی خلوت وتنہائی میں راز ونیاز کرنا ہے۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لفظ، نجویٰ کرنے والے دوافراد کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ اس کی قرآنی مثال درج ذیل آیت میں پائی جاتی ہے:

O سورۂ اسراء، آیت: ۴۷

''وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ'' (اور جب وہ نجویٰ تھے)

اس سے مراد نجویٰ کرنے والے ہیں۔

زیر بحث آیۂ مبارکہ میں جملہ ''لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ'' (ان کے اکثر نجویٰ میں خیر واچھائی نہیں پائی جاتی) کی بازگشت اس سے پہلے مذکور جملہ ''إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ'' کی طرف ہوتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان آیات کو ایک دوسری سے متصل ووابستہ قرار دیں کیونکہ ماقبل جملہ میں بظاہر نجویٰ وراز گوئی کو گفتگو کرنے تک محدود کر کے ذکر کیا گیا جبکہ آیات کے اتصال وباہمی پیوستگی کی بناء پر اسے گفتگو کرنے اور دیگر طریقوں سمیت سب پر استعمال کیا جاسکتا ہے یعنی خواہ علیحدگی وتنہائی میں راز گوئی کریں یا اس کے علاوہ کسی صورت میں کریں، اس عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اس میں ''خیر نہ ہونے'' کا بیان راز گوئی کی ہر صورت سے مربوط ہے اور اس کے علاوہ دیگر صورتیں بھی ''خیر نہ ہونے'' میں شامل ہیں۔ چنانچہ یہی مطلب بعد والی آیت میں ''وَمَن يُشَاقِقِ'' میں بھی ملحوظ ہے کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کا تذکرہ عمومیت کا حامل ہے کہ اسے نجویٰ کے ساتھ محدود نہیں کیا گیا بلکہ اس میں نجویٰ وراز گوئی کی مذکورہ صورت اور اس کے علاوہ دیگر ہر ممکن وقابل تصور صورت شامل ہے۔ یعنی خواہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی نجویٰ کر کے یا کسی دوسرے طریقہ پر کرے سب کا انجام یکساں ہے۔

اور جہاں تک آیت میں استثناء کا تعلق ہے (''إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ'') تو یہ استثناء منقطع ہے۔ استثناء منقطع کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے اس چیز میں شامل نہ تھی جس سے اسے مستثنیٰ کیا گیا، اس کی عام مثال یہ دی جاتی ہے کہ ''ماجاءنی احد من الناس الا الحمار'' (میرے پاس لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا سوائے گدھا کے) تو اس میں گدھا، لوگوں میں شامل ہی نہ تھا، لہٰذا اس طرح کے جملوں میں استثناء کو منقطع کہتے ہیں، تو آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ ان کے اکثر نجویٰ میں خیر واچھائی نہیں البتہ جو شخص صدقہ کرنے یا نیکی کرنے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے، یعنی اس کے حکم کرنے میں خیر واچھائی ہے۔

آیت مبارکہ میں خیر کی طرف دعوت دینے کو ''امر'' یعنی حکم سے تعبیر کیا گیا ہے تو ایسا کرنا مبنی بر استعارہ ہے، گویا خیر ونیکی کی طرف دعوت دینے والے کو عزت دی گئی اور اس کی بات کو حکم سے موسوم کیا گیا۔

یہاں ''خیر'' کو جس کا حکم اہل نجویٰ دیں اس کی بابت تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں: (۱) صدقہ (۲) نیکی (۳) اصلاح۔

جبکہ ''صدقہ'' خود نیکی کی ایک قسم اور اس کا مصداق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صدقہ دینا، چونکہ ''معروف'' یعنی نیکی کا کامل فرد ہے لہٰذا اس میں نجویٰ کی ضرورت دوسرے امور سے کہیں زیادہ ہے اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

نجویٰ اور رضائے الٰہی

○ ''وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ''

(اور جو شخص اسے اللہ کی رضا کے حصول کے لئے انجام دے)

اس جملہ میں نجویٰ کا تذکرہ اس کے آثار یعنی ثواب وعقاب کے حوالہ سے کیا گیا ہے تاکہ اس مطلب کی وضاحت ہوجائے کہ نجویٰ کی کون سی صورت میں ''خیر'' وبھلائی ہے اور کس صورت میں خیر وبھلائی نہیں۔

گویا یہاں نجویٰ کرنے والے کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ کہ جو اسے اللہ کی رضا وخوشنودی کی غرض سے انجام دے کہ لامحالہ ایسا شخص نیکی کی طرف دعوت دینے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے والا کہلائے گا کہ جو یہ سب کچھ قربۃً الی اللہ انجام دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اسے عظیم اجر سے نوازے گا۔ دوسرا وہ کہ جو مؤمنین کے طرزِ عمل سے بالکل دور اور ان کے راستہ کو چھوڑ کر نجویٰ کرتے ہوئے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کی باتیں کرتا ہے کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ اس کے حال پر چھوڑ کر پوری طرح مہلت دیتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے انجام دے اور پھر اسے دوزخ میں ڈالے گا جو کہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کا انجام

○ ''وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ''

(اور جو شخص رسول سے دشمنی کرے جبکہ اس پر ہدایت واضح ہوچکی ہو اور وہ مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کسی راہ پر چل پڑے)

''مشاقہ'' لفظ ''شق'' سے بنا ہے کہ جس کا معنیٰ کسی چیز سے جدا ہونے والا ٹکڑا ہے، اس حوالہ سے ''مشاقہ'' اور ''شقاق'' سے مراد یہ ہے کہ آپ کسی ایک جانب ہوں اور آپ کا مدمقابل دوسری جانب ہو، تو یہ لفظ کنایۃً دشمنی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعد رسول سے مشاقہ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرنا اور

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت نہ کرنا ہے۔ بنابراین جملہ "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ" سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرنے کی صورت کو دوسرے الفاظ میں بیان کرنا ہے اور "سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ" (ایمان والوں کا راستہ) سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے کہ جس کی بابت واضح وصریح الفاظ میں ارشاد ہوا:

○ سورۂ نساء، آیت: ۸۰

"مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ"

(جو رسول کی اطاعت کرے گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

بنابراین ایمان والوں کا راستہ (سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ) جو کہ ان سب کا ایمان پر اکٹھا ہو جانا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ان کا یکجا ہونا ہے یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ان سب کا متفق ہو جانا اور اکٹھا ہو جانا ہے، اور وہی ان کے درمیان وحدت کا ضامن اور ان سب کو اس پر قائم رہنے کی راہ پر لانے والا ہے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ان سب کے لئے قدر مشترک ہے، چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۱ تا ۱۰۳

"وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللّٰهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۰۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا"

(اور تم کیونکر کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تم ہی ہو کہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کا رسول تم میں موجود ہے، اور جو شخص اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو گویا اسے سیدھی راہ کی ہدایت حاصل ہو گئی، اے ایمان والو، تقوائے الٰہی اختیار کرو جیسا کہ اس کا حق ہے، اور تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں! اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)

اس آیت کی تفسیر میں مربوطہ مطالب اسی کتاب (المیزان) کی تیسری جلد میں ذکر ہو چکے ہیں۔

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۵۳

"وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ"

(اور یہ میرا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے، بس تم اسی پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں کی طرف نہ جاؤ کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے، اسی بات کی تاکید وہ تمہیں کرتا ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ)

ان آیات مبارکہ کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ کا راستہ، تقویٰ کا راستہ ہے اور مومنین کو اسی راستہ

کے اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے لہٰذا نتیجتاً مؤمنین کا راستہ تقویٰ پر ایک دوسرے سے تعاون کا راستہ ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ مائدہ، آیت:۲

''تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''

(اور تم نیکی وتقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ وزیادتی پر ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو)

یہ آیت مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ اللہ کی نافرمانی اور اسلامی معاشرہ کی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے سے نہی کرتی ہے اور یہی وہ معنیٰ ہے جو ہم نے سبیل المؤمنین کی بابت ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیر نظر آیہ مبارکہ یعنی ''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کے معنی کی برگشت درج ذیل آیت کی طرف ہوتی ہے:

○ سورۂ مجادلہ، آیت:۹

''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى''

(اے ایمان والو! جب تم آپس میں نجویٰ اور راز گوئی کرو تو گناہ ومعصیت اور رسول کی نافرمانی پر نجویٰ نہ کرو بلکہ نیکی وتقویٰ پر نجویٰ کرو)

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

○ ''نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى''

(ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ خود پھرا)

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جیسا اس نے عمل کیا ہوگا اور اس نے سبیل المؤمنین کے علاوہ جس راہ کو اختیار کیا ہم اسے اسی سے جانے دیں گے (جبر نہیں کریں گے)، اسی سلسلہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

○ سورۂ اسراء، آیت:۲۰

''كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَاۤءِ وَهٰۤؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا''

(ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور اُن کی بھی مدد کرتے ہیں، یہ تیرے پروردگار کی دین ہے اور تیرے رب کی عطا کا

راستہ روکا نہیں جا سکتا)

اس جملے کے بعد ارشاد ہوا۔

○ ''وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا''

(اور ہم اسے دوزخ کی آگ میں جلائیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)

اس میں حرف ''واو'' کے ذریعے سابق الذکر جملہ ''نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى'' کی طرف عطف ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی برتاؤ ملحوظ ہے یعنی اس کے کئے کے مطابق برتاؤ اور اسے دوزخ میں جلانا، دونوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ جس میں سے بعض کا تعلق دنیاوی زندگی سے ہے اور بعض کا تعلق اخروی زندگی سے ہے، دنیاوی زندگی سے تعلق کے حوالہ سے ارشاد ہوا: ''نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى'' اور اخروی زندگی کے حوالہ سے ارشاد ہوا: ''وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا''

شرک: ناقابل معافی جُرم

○ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ''

(یقیناً اللہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے........)

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سابقہ آیت میں مذکور مطالب کی وجہ ذکر کی گئی ہے یعنی ''نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ'' کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کے گناہ کو معاف نہیں کرتا، البتہ یہ معنیٰ اس صورت میں درست ہوگا جب ان آیات کا باہمی ربط و اتصال اور پیوستگی تسلیم کی جائے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ سابقہ و لاحقہ آیتیں معنیٰ و مفہوم کے حوالہ سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں تو اس صورت میں اس آیت (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ) کو سابقہ آیت (نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى) میں مذکور مطالب کی وجہ کے بیان پر مشتمل قرار دیا جائے گا، تو اس طرح ان کا مجموعی معنیٰ یہ ہوگا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی اللہ کے ساتھ شرک سے عبارت ہے اور اللہ اپنے ساتھ کئے ہوئے شرک کا گناہ معاف نہیں کرتا۔ یہی مطلب درج ذیل تین آیات سے بھی معلوم ہوسکتا ہے:

○ سورۂ محمد، آیت: ۳۲ تا ۳۴

''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَاۗقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْــــًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝''

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اللہ کی راہ روکتے ہیں اور تمام تر ہدایت واضح ہوجانے کے باوجود رسول سے دشمنی کرتے ہیں تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال خاک میں ملا دے گا (۳۲) اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو (۳۳) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا پھر مر گئے جبکہ وہ کافر تھے تو اللہ ہرگز انہیں معاف نہیں کرے گا (۳۴)

ان تین آیتوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تیسری آیت، دوسری آیت میں مذکور مطلب کی وجہ بیان کرتی ہے کیونکہ دوسری آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور تیسری آیت میں کفر کو ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے دائرہ سے باہر جانا کفر ہے کہ جس کی کبھی معافی نہیں ہوسکتی، اور اسی کو شرک کہتے ہیں۔

یہاں ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ آیات کے سیاق وسباق سے ثابت ہوتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ" کے فوراً بعد جملہ "وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ" کہہ کر بات کو مکمل کیا گیا ہے اور اس طرح اس گناہ و معصیت اور مذموم عمل یعنی دشمنیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شدت کا اظہار کیا گیا ہے، اس آیت سے مربوطہ بعض مطالب اس کتاب (المیزان) کی چوتھی جلد کے آخر میں ذکر کر چکے ہیں۔

باطل خداؤں کی حیثیت

○ "اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا"

(وہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے سوائے اناث کے)

لفظ "اناث" جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد "انثیٰ" ہے، اور اس کے استعمالی موارد میں یوں کہا جاتا ہے: "انث الحدید انثاً" لوہا نرم ہوگیا اور اب ہتھوڑا اس پر اثر کرے گا، اسی طرح "انث المکان" جگہ ہموار ہوگئی یعنی اس زمین میں سبزہ جلد اگ گیا اور وہ کاشت کے لئے تیار ہوگئی۔ ان استعمالی موارد سے معلوم ہوتا ہے اس لفظ میں نرمی و اثر پذیری کا معنی پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مادہ جانور کو "انثیٰ" (عورت) کہا جاتا ہے، جہاں تک بتوں اور اللہ کے علاوہ جن چیزوں کو معبود مانا جاتا ہے ان کے لئے لفظ "اناث" استعمال کئے جانے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ ان میں پائی جانے والی کمزوری اور دوسروں کی اثر پذیری کی حالت ہے کہ ان پر اثر انداز ہونا ممکن ہوتا ہے اور وہ خود نہ تو کچھ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے پرستاروں و پوجا کرنے والوں کی توقعات پوری کر سکتے ہیں چنانچہ درج ذیل آیتوں میں اس حوالہ سے یوں مذکور ہے:

- سورۂ حج، آیت: ۷۳ تا ۷۴

''اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡہُ مِنۡہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۷۴﴾''

(جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ وہ ایک مچھر بھی پیدا نہیں کر سکتے خواہ وہ اس کام کے لئے اکٹھے کیوں نہ ہو جائیں، اور اگر مچھر ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس سے چھڑوا بھی نہیں سکتے، طالب و مطلوب دونوں کمزور و ناتواں ہیں، انہوں نے اللہ کی کما حقہ قدر نہیں کی، یقیناً اللہ طاقت والا، غالب ہے)

- سورۂ فرقان: آیت ۳

''وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا ﴿۳﴾''

(اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر جو معبود بنائے ہوئے ہیں وہ کچھ بھی خلق نہیں کر سکتے وہ تو خود خلق کئے ہوئے ہیں، اور وہ خود اپنے لئے نہ تو کسی نقصان و فائدہ کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی موت و حیات اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے میں سے کوئی چیز ان کے ہاتھوں میں ہے)

بنا برایں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کو ''اناث'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اثر پذیر ہیں جو کہ کسی مخلوق کی خالق (اللہ تعالیٰ) سے نسبت میں ملحوظ ہوتا ہے۔ مخلوق خود کچھ بھی خلق نہیں کر سکتی اور اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے خلق کر سکتا ہے، تو یہی بنیادی فرق ہے خالق اور مخلوق کے درمیان! بت خود مخلوق ہونے کی بناء پر کچھ بھی خلق نہیں کر سکتے اور انہیں تو خود اپنے اوپر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں، اور صرف اثر پذیر ہونا مخلوق ہونے کی سب سے بڑی اور بنیادی صفت و نشانی ہے، یہ بات اس قول سے بہتر ہے جو بتوں کو ''اناث'' سے موسوم کرنے کے بارے میں کہی گئی ہے کہ چونکہ ان (بتوں) سے لات، عزیٰ اور منات سے ــــــ تین بڑے بت ــــــ اور ان جیسے دیگر بت مراد ہیں، کیونکہ ہر قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا کہ جسے وہ اپنے نام سے موسوم کر کے یوں کہتے تھے: ''انثیٰ بن فلان'' یعنی فلاں قبیلہ کا بت، تو اس نامگزاری میں وہ لوگ لفظ ''انثیٰ'' (مؤنث) استعمال کرتے تھے جو کہ ''اناث'' کا صیغۂ مفرد ہے، یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بتوں کے نام مؤنث ہیں، یا یہ کہ وہ جمادات ہیں اور جمادات کے لئے مؤنث کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، یعنی جماد کی جمع مؤنث کے لفظ میں ہوتی ہے: ''جمادات''!

لیکن مذکورہ بالا وجوہات میں سے جو وجہ ہم نے ذکر کی ہے کہ وہ صرف اثر پذیر ہوتے ہیں جو کہ مخلوق کی مخصوص صفت ہے، اس لئے ان کے لئے ''اناث'' کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، وہ اس لئے بہتر ہے کہ دیگر آراء آیت کے الفاظ سے مطابقت

نہیں رکھتیں کیونکہ آیت میں حصر مذکور ہے: ''اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا'' (وہ اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے (معبود مانتے) سوائے اناث کے) تو اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ جسے بھی پکارتے (پوجتے اور معبود مانتے) ہیں وہ اناث (عورتیں) ہیں جبکہ اللہ کے علاوہ معبود قرار دیئے جانے والوں میں مرد بھی شامل ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ بن مریم، برہما اور بوذا، کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اناث میں سے نہیں تھا بلکہ ''ذکور'' تھے۔

یاد رہے کہ ''اناث'' کا لفظی ترجمہ عورتیں ہیں لیکن یہاں مجازی طور پر بتوں کو اناث سے موسوم کیا گیا ہے اس کی وجہ مؤلف کے بیان سے واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں اثر پذیری کی جو صفت پائی جاتی ہے وہ انوثیت سے مشابہت رکھتی ہے، ورنہ بتوں کے مرد یا عورت ہونے کا حوالہ قرین صحت نہیں بنتا۔

شریر و سرکش شیطان

○ ''اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا''
(وہ نہیں پکارتے مگر ذلیل شیطان کو)

''مَرید'' (م پر زبر کے ساتھ) کا معنیٰ شریر و سرکش اور ہر خیر سے عاری ہے یا ہر چیز سے عاری (خالی و عریان)! بیضاوی کا کہنا ہے: مارد اور مرید اسے کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ پائی جاتی ہو، کسی خیر سے اس کا تعلق نہ ہو، یہ اصل میں ملامست کے لئے وضع ہوا ہے اور اس کی ترکیب میں ملامست ملحوظ ہے چنانچہ اسی حوالہ سے کہا جاتا ہے: ''صرع ممرّد'' (نرم ولطیف تختی، رسی کی لڑی)، ''غلام امرد'' (بغیر داڑھی والا جوان)، ''شجرۃ مرداء'' (بے پتوں کا درخت) تو یہ تمام الفاظ ''مَرد'' سے مشتق ہیں۔

یہ جملہ بظاہر سابقہ جملہ کی وضاحت و تکمیل کے طور پر ہے کیونکہ جملہ ''یَدۡعُوۡنَ'' (وہ پکارتے ہیں) جو کہ ''دعوۃ'' سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اور یہاں ''دعوۃ'' کنایۃً عبادت کے معنی میں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کی بنیاد ہی لوگوں کو اپنی ہی حاجتیں پیش کرنے کے لئے اس کے سامنے حاضر ہونے کی دعوت ہے جو ان کی حاجتیں پوری کرنے والا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اطاعت کو عبادت سے موسوم کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ یٰسین، آیت: ۶۱

''اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۝''
(کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا اے اولادِ آدم، کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)

بنا برایں زیر نظر جملہ (اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا) کے معنیٰ کی برگشت اس مطلب کی طرف ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ جس کی عبادت کرتے ہیں وہ اصل میں شیطان کو پکارتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت کرنا شیطان کی اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے۔

اللہ کی لعنت

○ ''لَعَنَهُ اللّٰهُ''

(اسے اللہ نے لعنت کی)

''لعنت'' کا معنیٰ رحمت سے دور کرنا ہے، یہاں یہ شیطان کی دوسری صفت سیئہ ہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہے یعنی اسے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی صفت سیّئہ یہ ہے کہ وہ خیر سے عاری ہے اور دوسری صفت سیّئہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہے دوسری صفت دراصل پہلی صفت کی وجہ کے طور پر ہے اور وہ یوں کہ شیطان اس لئے ہر خیر سے عاری ہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اسے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا ہے۔

شیطان کی دھمکیاں

○ ''وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِكَ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا''

(اور میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور امیدوں میں گھیرے رہوں گا)

یہ جملہ گویا شیطان کی طرف سے دی جانے والی اس دھمکی کی طرف اشارہ ہے جسے اللہ نے درج ذیل آیت میں ذکر کیا ہے۔

○ سورۂ ص، آیت: ۸۳

''فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ''

(مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکاؤں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے!)

شیطان کے بیان میں ''مِنۡ عِبَادِكَ'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ خواہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آ بھی جائیں تب بھی ''اللہ کے بندے'' ہونے کا عنوان اس لئے ان پر صادق آتا ہے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اور وہی ان کے بارے میں جو چاہتا ہے حکم و فیصلہ کرتا ہے۔

گمراہ کرنے اور ورغلانے کا اعلان

○ ''وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ''

(اور میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور امیدوں میں گھیرے رہوں گا.......)

اس آیت میں شیطان کی طرف چار کاموں کا صریح اعلان مذکور ہے کہ اس نے کہا کہ میں (۱) انہیں گمراہ کروں گا (۲) انہیں امیدیں دلا کر گھیرے میں لوں گا (۳) انہیں حکم دوں گا کہ وہ جانورں کے کان چیریں (۴) اُنہیں حکم دوں گا کہ وہ خلق اللہ میں تغیر وتبدل پیدا کریں۔

گمراہ کرنے اور اُمیدوں میں گھیرنے کے بعد جانوروں کے کان چیرنے کا حکم دینا مذکور ہے کہ جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا: وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ ،عربی زبان میں ''تبتیل'' کا معنیٰ چیرنا ہے، چنانچہ اس معنی کی تطبیق جیسا کہ منقول ہے اس طرح ممکن ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں رسم تھی کہ وہ اس اونٹی کے کہ جس نے پانچ مرتبہ بچے پیدا کر لئے ہوں اور اسے ''بحیرہ'' کہا جاتا ہے۔جس کی جمع ''بحائر'' آتی ہے اور ''سائبہ'' یعنی وہ اونٹی کہ جسے وعدہ وفا کرنے کی بناء پر چھوڑ دیتے تھے ان کے کان چیر دیتے تھے تا کہ ان کے گوشت کھانے کی حرمت کا مسئلہ واضح ہو سکے۔

بہر حال وہ تمام امور کہ جن کا ذکر آیہ مبارکہ میں ہوا ہے وہ سب کے سب ''ضلال'' وگمراہی کی قسمیں ہیں لہٰذا ان امور کو بیان کرنے کے ساتھ ''اضلال'' یعنی گمراہ کرنے کا حوالہ دینا درحقیقت مصادیق کو ذکر کرنے کے ساتھ عمومی عمل کو ذکر کرنے کی ایک صورت ہے کہ جسے ذکر العام قبل ذکر الخاص کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں ان مصادیق کو ''اضلال'' کے بعد ذکر کیا گیا ہے جبکہ وہ چاروں ہی گمراہی وضلال کے مصداق ہیں، گویا اس میں یہ امر ملحوظ ہے کہ متکلم ان امور کے بارے میں خاص اہمیت وتوجہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے: لاضلنهم بالاشتغال بالآمال والامانی التی تصرفهم عن الاشتغال بواجب شانهم وما يهمهم من امرهم ولآمرنهم بشق آذان الانعام و تحريم ما احل الله سبحانه، ولآمرنهم بتغيير خلق الله وينطبق على مثل الاخصاء وانواع المثلة واللواط والسحق (میں انہیں اس طرح گمراہ کروں گا کہ انہیں غیر اللہ کی عبادت میں مشغول کر دوں گا اور گناہوں کے ارتکاب کی راہ پر لگا دوں گا، اور انہیں اس طرح بہکاؤں گا کہ آرزؤں وامیدوں کہ جو انہیں ان کے واجب امور واعمال انجام دینے اور جو کچھ ان کے لئے اہمیت کا حامل ہے اس کی ادائیگی سے باز رکھیں، ان میں مصروف کر دوں گا، اور انہیں جانوروں کے کان چیرنے اور اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ جانوروں کو حرام کرنے کا حکم دوں گا، اور اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق میں تبدیلیاں کرنے کا اس طرح حکم دوں گا کہ اس کام کو یوں انجام دیں کہ مردوں کو خصی ونامرد کر دیں، اور انسانوں کو مثلہ کریں یعنی ان کے ہاتھ

پاؤں اور جسم کے اعضاء کاٹیں، اور لواطت و مساحقہ کریں یعنی مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتیں کے ساتھ ہم جنس بازی کریں۔)

یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق میں تبدیلی سے مراد فطرت سلیمہ کے دائرہ سے باہر نکلیں اور دین حق سے روگردانی کریں، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ '' سورۂ روم، آیت: ۳۰ (پس اپنا رخ دین کے لئے خالص کرلو، کہ وہی اللہ کی فطرت ہے کہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی مضبوط دین ہے)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بلاوے کا ذکر کیا جس سے مراد اس کی دعوت و بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اسے اپنا حاکم مان کر اس کی اطاعت کرنا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَمَنۡ يَّتَّخِذِ الشَّيۡطٰنَ وَلِيًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِيۡنًا '' (اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو حاکم قرار دے تو وہ واضح نقصان سے دوچار ہوا)۔

اگر اس مطلب کو یوں بیان کیا جاتا: ''وَمَنۡ يَّتَّخِذِ الشَّيۡطٰنَ وَلِيًّا'' (اور وہ کہ شیطان جس کا ولی ہو) تو اس سے صرف شیطان کی ولایت و حاکمیت کا حوالہ ملحوظ ہوتا جبکہ اللہ ہی سب کا ولی ہے اس کے علاوہ کسی کو کسی چیز پر ولایت حاصل نہیں خواہ کسی کو ولی مان بھی لیا جائے، تو سابقہ آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ولایت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی وہی سرچشمہ ولایت ہے، اگر وہ خود کسی کو ولی قرار دے تو گویا اس میں اصل ولایت اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

شیطان کے وعدے، دھوکہ ہی دھوکہ

○ ''يَعِدُهُمۡ وَيُمَنِّيۡهِمۡ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا''

(وہ ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں تمنائیں دلاتا ہے لیکن شیطان انہیں دھوکہ و فریب کے سوا کچھ نہیں دیتا)

آیت کے سیاق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سابقہ آیت کے جملہ ''فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِيۡنًا'' کی اصل وجہ کے بیان پر مشتمل ہے، اور وہاں اس خسارہ و نقصان سے بڑا خسارہ و نقصان کیا ہوگا کہ کسی کی حقیقی سعادت اور وجودی کمال جھوٹے وعدوں اور خیالی تمناؤں کی بھینٹ چڑھ جائے، یعنی کمال نقص میں اور فائدہ نقصان میں بدل جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشادِ گرامی قدر ہے:

○ سورۂ نور، آیت: ۳۹

''وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۢ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ

فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ ''

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کے اعمال اس سراب جیسے ہیں جو کسی بیابان میں ہو کہ پیاسہ اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف جائے مگر اسے وہاں کچھ بھی نہ ملے بلکہ خدا کو وہاں پائے تو اللہ اس کے اعمال کا پورا پورا حساب اس کے سامنے رکھ دے گا اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے)

شیطان کے وعدوں سے مراد اس کے وہ وسوسے ہیں جو وہ بلا واسطہ لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے اور تمناؤں سے مراد ان وسوسوں کے آثار ہیں جن سے اوہام و افکار لطف اندوز ہوتے ہیں، اسی وجہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: '' وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا '' (اور شیطان ان سے کچھ بھی وعدہ نہیں کرتا سوائے دھوکہ دینے کے!) شیطان کے وعدے دھوکہ بازی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لہٰذا شیطان کے وعدوں کو دھوکہ بازی قرار دیا گیا ہے جبکہ اس کی طرف سے تمنائیں دلانے کو دھوکہ دہی سے تعبیر نہیں کیا گیا، اس میں جو اصل وجہ پائی جاتی ہے وہ نہایت واضح ہے اور کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے وعدوں و تمناؤں کو بیان کرنے کے بعد ان کے انجام و عاقبت کا ذکر کیا چنانچہ ارشاد ہو: '' اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا '' (انہی لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ اس سے چھٹکارا نہیں پائیں گے)

'' محیص '' کا معنیٰ بھاگنے کی جگہ، فرار کا راستہ، روگردانی کا مقام، اور پیادہ گاہ وغیرہ ہے۔

ان مطالب کو بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا جو شیطان کے وعدوں و تمناؤں کی بھینٹ چڑھنے والوں کے مدمقابل قرار پاتے ہیں یعنی مؤمنین! تو سلسلۂ بیان کے تکمیلی حوالہ سے مؤمنین کے بارے میں خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا: '' وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ......... '' (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ انجام دیئے عنقریب ہم انہیں باغہائے بہشت میں داخل کریں گے...... الخ)

ان آیات میں خطاب کے صیغوں میں تبدیلی ہوئی ہے اور وہ اس طرح کہ پہلے متکلم مع الغیر (جمع متکلم) کے صیغے استعمال کئے گئے (نصلہٖ، نولہٖ) پھر ان سے ہٹ کر غائب کے صیغے اختیار کئے گئے (ان اللہ لا یغفر، لعنہ اللہ، من دون اللہ) یعنی پہلے کہا: ہم ایسا کریں گے اور پھر کہا، اللہ ایسا کرے گا، تو طرزِ خطاب کی اس تبدیلی کی عمومی وجہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت مقام کی طرف اشارہ و توجہ دلانا ہے لہٰذا جمع متکلم کی ضمیر کے بجائے لفظ جلالہ یعنی '' اللہ '' ذکر کیا گیا، اور پھر جب مقصود پورا ہو گیا اور خطاب کی غرض حاصل ہو گئی (بات پوری ہو گئی) تو سابقہ طرزِ بیان کی طرف پلٹ کر جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی گئی اور یوں کہا گیا: '' سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ '' (ہم بہت جلد انہیں باغہائے بہشت لے جائیں گے)۔

اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں سے قریب تر ہے اور ان سے ہرگز کسی طرح بھی پوشیدہ نہیں، وہ تو ان کا ولی ہے۔

اللہ کا سچا وعدہ

○ ''وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا''

(اللہ کا وعدہ حق ہے اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچی بات کرنے والا)

اس جملے میں اللہ تعالیٰ کے حق و سچ وعدے کا ذکر دراصل شیطان کے جھوٹے وعدوں کے مقابل میں ہوا ہے اور اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ شیطان نے جو وعدے کئے اور ان وعدوں کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے وہ سب دھوکہ و فریب ہے اس کے سوا کچھ نہیں جبکہ اللہ کے وعدے سچے اور حق ہیں اور اس کی ہر بات سچ ہے۔

اس جملے میں تقابلی حوالہ ملحوظ ہے کہ جس کی عملی گواہی بنی نوع آدم کی عمومی حیات میں مختلف موارد کے تناظر میں ملتی ہے کہ وہ شیطانی وسوسوں سے مغلوب ہو کر خدا کی معصیت کی راہ پر چلتے ہیں کہ پھر ان کے سامنے کوئی راہِ نجات باقی نہیں رہتی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے جو وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں بہشت عطا کرے گا تو وہ سچا وعدہ ہے اور پھر اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اللہ سے زیادہ سچی بات کرنے والا کون ہوسکتا ہے)

خیالی تمناؤں کی بے وقعتی

○ ''لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ............''

(نہ تمہاری آرزوؤں اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں کی کوئی وقعت ہے..........)

اس آیۂ مبارکہ میں ابتدائے کلام کی طرف لوٹ کر گویا سابق الذکر تفصیلی مطالب سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو بیان کرنا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ بعض مؤمنین کے جن اعمال و اقوال کا تذکرہ ہوا اور یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اصرار کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان امور میں دوسروں کے مقابلے میں ان کی طرفداری و حمایت اور مدد کریں کہ جن میں ان کے اور دوسروں کے درمیان نزاع و اختلاف واقع ہو، وہ اس لئے ایسا کہتے تھے کہ ان کے خیال میں ان کے ایمان لانے کی وجہ سے اُنہیں خدا کی بارگاہ میں بہت بڑا مقام و منزلت اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کا خاص حق قرار پاتا ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر واجب و لازم ہے کہ وہ ان کی طرفداری کریں اور دوسروں کے مقابلے میں اُنہیں ترجیح دیں خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر ہوں اور خواہ ان کی طرفداری کرنا عدل کے مطابق ہو یا ظلم و زیادتی ہو ان کا اس طرح سوچنا درحقیقت اسی طرح سے ہے جیسے گمراہ پیشواؤں کے پیروکاروں اور ظالم و آمر حکمرانوں کے درباریوں کا طرزِ تفکر ہے، چنانچہ اس طرزِ تفکر کے حامل افراد کی روش یہ ہے کہ ان میں سے

جسے بھی دیکھیں وہ ایک طرف اپنے پیشوا و سردار پر منت و احسان جتلاتا ہے اور دوسری طرف اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی انکساری و کمتری کے عملی مظاہرے کرتا ہے کہ جس کی بناء پر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے اپنے پیشوا و سردار پر حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی حمایت و طرفداری کرتے ہوئے اس کے مدمقابل پر اسے ترجیح دیں اور ہر صورت میں اس کا ساتھ دیں خواہ وہ حق پر نہ بھی ہوں۔ اس طرح کا طرزِ فکر اہل کتاب کا تھا کہ جس کا تذکرہ درج ذیل آیات میں ہوا ہے:

- سورۂ مائدہ، آیت: ۱۸

  ''وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ''

  (یہودیوں اور نصرانیوں نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

- سورۂ بقرہ، آیت: ۱۳۵

  ''وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا''

  (اور انہوں نے کہا کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے)

- سورۂ آل عمران، آیت: ۷۵

  ''قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ''

  (انہوں نے کہا امیوں کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں)

اسی وجہ سے زیر نظر آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے اس طرزِ فکر کو رد کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کی اس سوچ کو رد کرتے ہوئے اس طرزِ فکر کو ''امانی'' سے موسوم فرمایا جو ایک طرح سے استعارہ کے طور پر ہے کیونکہ اس طرح کا طرزِ فکر ''امانی''، یعنی ان آرزوؤں کے مانند ہے جو خیالی صورتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتیں کہ حقیقت میں ان کی کوئی حیثیت و اثر نہیں ہوتا بلکہ ''دل بہلاوے'' سے زیادہ انہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! یا مسلمانوں میں سے بعض وہ افراد جو اس طرح کا طرزِ فکر رکھتے ہیں، تمہاری یہ سوچ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ ہی اہل کتاب کی یہ سوچ کوئی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اصل دارومدار عمل پر ہے کہ اگر عمل نیک ہو تو اس کا نتیجہ بھی نیک ہوگا اور اگر عمل بُرا ہو تو اس کا نتیجہ بھی بُرا ہوگا، آیت میں برے عمل کو نیک عمل سے پہلے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ عموماً ان لوگوں کے طرزِ فکر کی عملی صورت برے اعمال ہی میں ظاہر ہوتی تھی۔

بُرے کا بُرا انجام

- ''مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا''

(جو شخص بُرا عمل کرے اسے اس کی سزا دی جائے گی اور وہ اپنے لئے اللہ کے سوا کسی کو ولی و مددگار نہ پائے گا)

یہ جملہ اپنے ماقبل جملے کے بعد کسی ربط وعطف کے بغیر ذکر ہوا ہے یعنی اسے حرف عطف ''واؤ'' سے شروع نہیں کیا گیا بلکہ الگ صورت میں ذکر کیا گیا ہے کہ اسے ادبی زبان میں ''فصل'' کہا جاتا ہے جو کہ ''وصل'' کے مقابل میں آتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ جملہ ایک فرضی سوال کے جواب کے طور پر ہے کہ گویا یوں کہا گیا ہے کہ جب زبان سے شہادتین (توحید و رسالت کی گواہی دینا) اور دائرہ اسلام و ایمان میں داخل ہو جانا اور اسی طرح یہودیت و نصرانیت کی پیروی کرنا فائدہ مند ثابت نہ ہو تو پھر کس راستہ کو اختیار کیا جائے؟ اور انسان کا انجام کار کیا ہوگا؟ تو اس کے جواب میں یوں فرمایا گیا: ''مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ۝ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ...... الخ'' (جو شخص بُرا عمل انجام دے اسے اس کی سزا دی جائے گی اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا سرپرست و مددگار نہ پائے گا، اور جو شخص نیک اعمال انجام دے ...... الخ) تو اس میں جملہ ''مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ'' میں اطلاق پایا جاتا ہے کہ جس میں دنیاوی سزائیں اور اخروی عذاب دونوں ملحوظ ہیں یعنی وہ سزائیں جو شریعت اسلامیہ میں مقرر کی گئی ہیں مثلاً قتل میں قصاص، چوری میں ہاتھ کاٹنا، زنا و بدکاری میں کوڑے یا سنگسار کرنا وغیرہ اور اسی طرح سیاسی وغیر سیاسی احکام وغیرہ بھی شامل ہیں، اسی طرح وہ اُخروی عقاب و عذاب بھی شامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے باخبر کیا ہے۔

بنابرایں آیاتِ مبارکہ کے شانِ نزول اور تطبیق مورد کی مناسبت بھی اسی کی متقاضی ہے کہ جملہ کو اطلاق کا حامل قرار دیا جائے چنانچہ ان آیات کے اسباب نزول کے بارے میں روایات میں مذکور ہے کہ وہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئیں جس نے چوری کا ارتکاب کیا اور پھر ایک یہودی یا مسلمان پر اس کا الزام لگا دیا، لہٰذا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر زور دینے لگے کہ اس جرم کی سزا اس یہودی یا مسلمان کو دیں جس پر الزام لگایا گیا ہے۔

اور جملہ ''وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا'' بھی اطلاق کا حامل ہے جو کہ دنیاوی و اخروی دونوں سزاؤں میں کسی سرپرست و مددگار کی نفی کرتا ہے یعنی برے عمل کی دنیاوی سزا سے بچانے میں نبیؑ یا ولی الامر کی مدد حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان کا قرب اور اسلام و دین سے نسبت رکھنا مجرم کو سزا سے بچا سکتا ہے بلکہ شریعت اسلامیہ میں جو سزا کسی بُرے عمل کی مقرر کر دی گئی ہے اس سے مجرم بچ نہیں سکتا اور کوئی بھی اسے اس سے بچا نہیں سکتا، اسی طرح اُخروی سزا سے بھی بچانے والا کوئی نہیں، سوائے ان لوگوں کے کہ جن کے بارے میں بعد والی آیت میں مذکور ہے یعنی عمل صالح بجالانے والے ہی آخرت میں اچھی جزا پائیں گے۔

اچھے عمل کی اچھی جزاء

○ ''وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا''

(اور جو شخص نیک عمل انجام دے خواہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ وہ مؤمن ہو تو ایسے لوگ بہشت میں جائیں گے اور ان پر ذرہ بھر زیادتی نہ ہوگی)

اس آیۂ مبارکہ میں موضوع کی دوسری شق کو بیان کیا گیا ہے یعنی عمل صالح بجالانے والے کی جزاء جو کہ بہشت ہے، البتہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اس جزاء کو ایک نہایت کڑی شرط کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اسے دوسرے حوالہ سے وابستہ کر دیا۔

جہاں تک اس شرط کا تعلق ہے جو اس جزاء یعنی بہشت کے حصول سے مربوط ہے تو وہ یہ ہے کہ عمل صالح بجالانے والا شخص مؤمن ہونا چاہیے کیونکہ اچھی جزاء اچھے اور نیک عمل پر ملتی ہے جبکہ کافر کے عمل کی کوئی حقیقت ہی نہیں بلکہ اس کا کفر اس کے عمل صالح کو برباد کر دیتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

O سورۂ انعام، آیت: ۸۸

''وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ''

(اور اگر وہ شرک کریں تو ان کا عمل برباد ہو جائے گا)

O سورۂ کہف، آیت: ۱۰۵

''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا''

(وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور قیامت کے دن اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے منکر ہوئے ان کے اعمال برباد ہو جائیں گے کہ جس کے نتیجہ میں ہم قیامت کے دن انہیں کوئی قدر و قیمت عطا نہیں کریں گے)

اور آیت میں وسعت سے مربوط دوسرا حوالہ یہ ہے کہ اس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ'' (اور جو شخص نیک اعمال میں سے کچھ انجام دے) اس میں حرف ''مِن'' (مِنَ الصّٰلِحٰتِ) ذکر ہوا ہے جو کہ بعض اعمال کی طرف اشارہ کے لئے ہے۔ اسے تبعیضیہ کہتے ہیں۔ اس میں تمام اعمال کی بجائے بعض اعمال ملحوظ ہیں۔ یعنی جو شخص بعض نیک اعمال انجام دے اس کی جزاء بہشت ہے، گویا اس میں بہشت کے وعدہ میں وسعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر یوں کہا جاتا: ''ومن یعمل الصالحات'' (اور جو شخص اعمال صالحہ انجام دے) تو اس سے یہ سمجھا جاتا کہ بہشت صرف اس کو ملے گی جو ایمان لائے اور ہر عمل صالح کو انجام دے اس کا ہر عمل صالح ہو) مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ یوں کہا گیا: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ'' (اور جو شخص اعمال صالحہ میں سے کوئی عمل انجام دے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی عنایت کا دائرہ وسیع ملحوظ ہے اور نیک جزاء یعنی بہشت کا وعدہ اس شخص سے کیا گیا ہے جو ایمان لائے اور بعض نیک اعمال انجام دے تو اس میں اس کے دیگر اعمال صالحہ بھی شامل ہوں

گے یا ان گناہوں کی تلافی بھی ہو جائے گی جو اس سے سرزد ہوئے اور پھر اس نے توبہ کر لی یا اسے شفاعت حاصل ہو گئی، چنانچہ اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے:

○　سورۂ نساء، آیت: ۱۱۶

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ"

(یقیناً اللہ ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے لیکن اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)

اس آیت کی تفسیر میں توبہ سے مربوطہ مطالب، سورۂ نساء کی آیت ۱۷ (اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ) میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو، جلد ۴ صفحہ۔ ۴۷۷

اور شفاعت سے مربوطہ مطالب سورۂ بقرہ، آیت ۴۸: "وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا" میں ذکر کئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو جلد اول، صفحہ۔ ۳۷۳

اس کے علاوہ یہ اہم نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" (مرد ہو یا عورت)، اس میں عمل کے حوالہ سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ذکر کیا گیا بلکہ دونوں کو یکساں حیثیت کا حامل قرار دیا گیا ہے کہ شرعی احکام کے حوالہ سے ان کے درمیان فرق نہیں پایا جاتا، اس طرح ان لوگوں کے غلط و بے بنیاد پروپیگنڈوں کی قلعی کھل جاتی ہے جنہوں نے زمانۂ قدیم میں یہ تاثر دینے کی مذموم کوشش کی کہ اسلام عورتوں کے اعمال کو کوئی قدر و منزلت نہیں دیتا اور نہ ہی ان کے نیک اعمال پر ان کے لئے جزا و ثواب کا قائل ہے، ان لوگوں میں مختلف اقوام و مسالک کے پیروکار شامل ہیں مثلاً اہل ہند و مصر اور دیگر بت پرست قومیں، اسی طرح اس بیان سے یہودیوں اور نصرانیوں کے ان نظریات کی بھی نفی ہوتی ہے جن میں وہ عزت و احترام اور مقام و منزلت صرف مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک عورتیں ذلیل و پست ہیں کیونکہ ان کی تخلیق ہی میں نقص رکھا گیا ہے یعنی وہ ناقص الخلقت ہیں اور ان کے نیک اعمال کا اجر و ثواب بھی ناچیز و بے وقعت ہے۔ اسی طرح کے نظریات و عقائد کو عربوں نے بھی اپنا لیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دونوں صنفوں کو یکساں قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: "مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" یعنی نیک عمل کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کو یکساں اجر ملے گا۔

شاید اسی وجہ سے "فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ" کے بعد یوں فرمایا: "وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا" (اور ان پر ذرہ بھر ظلم و زیادتی نہیں کی جائے گی) اس سے مقصود یہ ہے کہ پہلے جملہ سے یہ مطلب پایۂ ثبوت کو پہنچے اور اس جملہ سے یہ ثابت ہو کہ ثواب کی مقدار میں زیادہ یا کم ہونے کے حوالہ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، جیسا کہ درج ذیل آیات مبارکہ میں ارشاد ہوا۔

○　سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

"فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ"

(ان کے رب نے ان کی دعا کو پورا کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی بھی عمل صالح بجالانے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، کیونکہ تم سب ایک دوسرے سے ہو)

دین و دیندار کی برتری کا راز

O ''وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ.......''

(اور اس شخص سے زیادہ اچھا دیندار کون ہے جو اپنی جبین عمل اللہ کے سامنے خم کردے اور وہ نیک عمل کرنے والا ہو)

اس آیت میں ایک ممکنہ سوال کا جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی مسلمان کا اسلام قبول کرنا یا کسی اہل کتاب کا ایمان لانا اس کے لئے کسی خیر کا سبب نہیں بنتا اور اس کے لیے مفید و نفع بخش نہیں یعنی جب اللہ اور اس کی آیات پر ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے گا اور اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں تو پھر اسلام کی قدر و قیمت کیا باقی رہ جاتی ہے اور ایمان کی خصوصیت کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں کہا گیا ہے کہ دین کی عظمت و بزرگی ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، اس کی بابت کسی طرح کے منفی حوالہ کا تصور ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا جمالِ حقیقت کسی بھی بابصیرت شخص سے پوشیدہ نہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس جملہ ''وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا'' (اور کون ہے اس شخص سے زیادہ اچھے دین والا) کہہ کر سوالیہ انداز میں اس مسلمہ حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ اسلام ہی حقیقی معنی میں اچھا دین ہے، اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ ہر انسان کو زندگی میں دین سے وابستگی ناگذیر ہے یعنی کوئی شخص دین اختیار کئے بغیر زندگی گزار ہی نہیں سکتا، اور بہترین دین یہ ہے کہ انسان اپنی جبینِ نیاز اس معبود کی دہلیز ربوبیت پر خم کردے کہ جو آسمانوں اور زمین کی ہر شے کا مالک ہے۔ اور اس کے حضور عبودیت و بندگی کے تقاضوں کو پورا کرے۔ آئین ابراہیمیؑ جو کہ عین فطرت ہے اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کی راہ وروش کا تعین کرے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنا رخ بندگی نہایت پاکیزگی و خوبصورتی کے ساتھ اللہ کے حضور خم کردیا اور فطرت سلیمہ کی حقیقی پیروی کا عملی ثبوت دیا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال دل میں ہرگز نہیں لانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا خلیل ہونا اسی طرح سے ہے جیسے لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کا خلیل ہونا مرسوم ہے جس میں حق و باطل دونوں حوالے و بنیادیں پائی جاتی ہیں، یعنی کبھی خلت و دوستی حق کی بنیاد پر ہوتی ہے اور کبھی باطل کی بنیاد پر! کہ جس کے نتیجہ میں جھوٹ، فریب اور دھوکہ بازی کا بازار گرم ہوتا ہے اور ان کے درمیان جبر وجور کی راہیں کھل جاتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ مالک ہے مملوک نہیں اور غالب ہے مغلوب نہیں لیکن اس کے

برعکس مخلوق میں پائے جانے والے حکمران وارباب اقتدار اور سلاطین وملوک ایسے نہیں اور انہیں اپنے غلاموں ورعایا پر مالکیت کا کوئی حق حاصل نہیں اور اگر وہ ان کی کسی چیز پر مالکیت کا حق جتلاتے ہیں تو اس کے مقابلے میں انہیں بھی کچھ دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ذریعے اپنا غلام بناتے ہیں اور اپنے مخصوص ہمنواؤں وحاشیہ نشینوں کے ذریعے دوسروں پر آمریت کے تیر چلاتے ہیں مگر جب ان کے اور انہی ہمنواؤں وحاشیہ نشینوں کے درمیان فکری تضاد وتصادم پیدا ہوجائے کہ وہ ان کا ساتھ نہ دیں بلکہ ان کے مخالف ہوجائیں تو پھر ان حکمرانوں کی بساطِ حاکمیت اُلٹ جاتی ہے اور ان کی آمریت لوگوں کے پاؤں تلے روندی جاتی ہے کہ پھر وہ معاشرہ میں اپنا مقام ومنزلت کھودیتے ہیں، گویا وہ کہیں کے نہیں رہتے۔

انہی مطالب سے یہ راز بھی کھل جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ ''وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا'' کے تسلسل میں آخری الفاظ یہ کیوں فرمائے: ''وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا'' (اور اللہ کے لئے ہی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر شے پر غالب واختیار والا ہے)

روایات پر ایک نظر!

بشیر، بشر اور مبشر کا واقعہ

تفسیر قمی میں مذکور ہے کہ ان آیات مبارکہ یعنی ''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ......الخ'' کا سبب نزول یہ ہے کہ انصار میں سے قبیلۂ بنی ابیرق کے تین بھائی، بشیر، بشر اور مبشر جو کہ منافقین تھے انہوں نے قتادہ بن نعمان جو کہ جنگ بدر کے سپاہیوں میں شامل تھا اس کے چچا کے گھر پر نقب زنی کی اور وہاں سے اس کے کھانے پینے کی اشیاء جو اس نے اپنے اہل و عیال کے لئے جمع کر رکھی تھی اور اس کی تلوار اور زرہ چرا کر لے گئے، قتادہ نے اس کی شکایت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کی اور کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کچھ لوگوں نے میرے چچا کے گھر نقب زنی کی ہے اور اس نے جو کھانے پینے کی اشیاء اپنے اہل وعیال کے لئے اکٹھی کی ہوئی تھیں اور ایک تلوار اور ایک زرہ چرا کر لے گئے ہیں اور ان لوگوں کا تعلق برے خاندان سے ہے اور ان کے ساتھ ایک مؤمن شخص بھی شریک تھا جس کا نام ''لبید بن سہل'' ہے، لیکن اب بنی ابیرق والے کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ لبید بن سہل کا کیا دھرا ہے، جب یہ بات لبید کو معلوم ہوئی تو وہ تلوار اُٹھا کر نکل پڑا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس

نے ان سے کہا: اے بنی ابیرق! کیا تم مجھے چوری کا الزام دیتے ہو؟ جبکہ تم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس طرح کے قبیح اعمال تمہارا ہی شیوہ ہے، تم لوگ منافق ہو اور تم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کرتے ہو اور ان پر طعن و تشنیع اور ان کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والے ہو اور پھر اپنے کیے کی نسبت قریش کی طرف دیتے ہو، اب تم اصل صورتحال کو واضح کرو ورنہ میں اپنی اس تلوار سے تمہیں خاک و خون میں نہلا دوں گا، بنی ابیرق نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس سے نہایت ونرمی و انکساری کے ساتھ کہنے لگے کہ آپ واپس جائیں، اللہ آپ کو اپنی رحمت وعنایت سے نوازے، آپ اس عمل سے بری ہیں۔

اس کے بعد بنی ابیرق کے لوگ اپنے قبیلہ کے ایک شخص کے پاس آئے کہ جس کا نام ''اسید بن عروہ'' تھا اور وہ نہایت چرب زبان اور خوب بات کرنے کا ماہر تھا، وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قتادہ بن نعمان نے ہمارے خاندان کے ایک گھرانے کے پاس جا کر ان پر چوری کا غلط الزام لگا دیا ہے جبکہ وہ نہایت شریف اور حسب ونسب کے حوالہ سے احترام والے لوگ ہیں وہ اس طرح کی غلط حرکتیں کرنے والے نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی بات سن کر سخت مغموم ہوئے۔ چنانچہ جب قتادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر ناراض ہوئے اور اس سے فرمایا: تو نے ایک شریف اور پاکیزہ حسب ونسب والے گھرانے پر چوری کا الزام لگا دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سخت ڈانٹا جس سے قتادہ بہت دکھی ہوا اور اپنے چچا کے پاس واپس آگیا اور اس سے کہنے لگا کہ کاش میں مر جاتا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں بات نہ کرتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے نہایت سختی وتلخی سے بات کی ہے، اس کے چچا نے کہا: اب اللہ ہی مدد کرنے والا ہے اور اسی سے مدد مانگتے ہیں کہ اسی سے مدد مانگا ہی درست ہے۔

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ .... تا اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ'' قمی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہاں ''قول'' سے مراد فعل ہے یعنی وہ اپنا کام کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں، چنانچہ ارشاد ہوا: ''هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.......... وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗــــًٔـا'' یہ لبید بن سہل تھا کہ جس نے تہمت لگائی اور بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا: ''فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا'' (تفسیر قمیؒ، جلد اول صفحہ ۱۵۰)

ابوجارود کی روایت

تفسیر قمیؒ میں ابوجارود سے روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، بشیر کے قریبی رشتہ

داروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے دوست کے بارے میں بات کریں یا ان سے اپنے دوست کے بے قصور ہونے کو ثابت و واضح کریں اور ان سے کہیں کہ وہ بے گناہ ہے اس نے چوری کا ارتکاب نہیں کیا، لیکن جب آیہ مبارکہ: ''يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ...... الخ'' نازل ہوئی تو بشر کے قبیلہ والے اس کے پاس گئے اور اس سے کہا: اے بشر! اللہ سے استغفار کرو اور اپنے گناہوں کی توبہ کرو، بشر نے جواب دیا: مجھے اس کی قسم، کہ میں ہمیشہ ہی اس کی قسم کھاتا ہوں، قتادہ کے چچا کا مال لبید بن سہل کے علاوہ کسی نے نہیں چُرایا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا'' (اور جو شخص کسی غلطی کا مرتکب ہو یا گناہ کرے پھر اس کا الزام کسی بے قصور شخص پر لگائے تو اس نے اپنے لئے بہتان اور گناہ اپنے سر لے لیا)۔

اس کے بعد بشر کافر ہو گیا اور مکہ چلا گیا، اور جن لوگوں نے بشر کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کی اور اسے بے گناہ قرار دیا اُن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ............ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا'' (اور اگر آپ پر اللہ کا کرم و رحمت نہ ہوتی تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے بھرپور کوشش کی کہ آپ کو گمراہ کریں........ اور اللہ کا کرم آپ پر بہت عظیم ہے) (تفسیر قمیؒ، جلد اول صفحہ ۱۵۲)

''درمنثور'' کی تفصیلی روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ترمذی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور حاکم کہ انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے نے قتادہ بن نعمان کی روایت ذکر کی ہے کہ اُنہوں نے کہا: ہمارے قبیلہ سے ایک خاندان کہ جس کا نام ''بنی ابیرق'' ہے وہ تین بھائی تھے: بشر، بشیر، مبشر، ان میں سے بشر ایک منافق آدمی تھا اور وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں ان کی ہجو و عیب گیری پر مشتمل شعر کہتا تھا اور پھر ان شعروں کو بعض عربوں کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ شعر فلاں نے کہا ہے اور یہ شعر فلاں نے کہا ہے، مگر جب وہ اشعار اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ اللہ کی قسم! یہ اشعار اس خبیث (بشر) کے علاوہ کوئی نہیں کہہ سکتا، چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام ان اشعار کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں اور ان کی نسبت بشر کی طرف دیتے ہیں تو اس نے ان کے جواب میں یہ شعر کہا:

او كلما قال الرجال قصيدة

اضموا فقالوا ابن ابيرق قالها

(کیا یہ بات صحیح ہے کہ جو قصیدہ بھی لوگ کہیں کچھ لوگ اسے میری طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ ابن ابیرق نے کہا ہے)۔

قتادہ نے کہا کہ یہ خاندان (بنی ابیرق) زمانۂ جاہلیت اور عصر اسلام دونوں میں ایک فقیر و نادار گھرانہ تھا، مدینہ کے باسیوں کی عام خوراک کھجور اور جو ہوتی تھی لیکن جب بھی شام سے کھانے پینے کا سامان لے کر قافلے آتے تو یہ شخص (بشر) اپنے لئے بہترین صاف ستھرا آٹا خریدتا تھا مگر اس کے اہل و عیال کھجور اور جو ہی پر گزارہ کرتے تھے، ایک دن شام سے ایک قافلہ آیا (عربی زبان میں "ضافطہ" بار بردار یعنی سامان اٹھانے والے اونٹ کو کہتے ہیں کہ جس کا ترجمہ ہم نے قافلہ کیا ہے یعنی خرید و فروخت کا سامان لانے والے اونٹوں کا قافلہ) تو میرے چچا رفاعہ بن زید نے صاف ستھرے آٹا والا ایک اونٹ خرید لیا اور اسے اپنے گھر میں حوضخانہ یعنی پینے والے پانی کے اکٹھا رکھنے کی جگہ میں رکھ دیا، اتفاق سے اس کی دو تلواریں، دوزرہیں اور دیگر جنگی ساز و سامان بھی وہیں رکھا تھا۔ ایک رات چوروں نے دیوار میں نقب زنی کر کے سارا سامان اور اسلحہ چرا لیا، صبح ہوئی تو میرے چچا نے میرے پاس آکر کہا کہ بھتیجے جان! تمہیں معلوم ہے کیا ہوا ہے؟ گذشتہ رات کو چوروں نے ہمارے گھر کے حوض خانہ کی دیوار میں نقب زنی کر کے کھانے پینے کا سامان اور اسلحہ لے گئے ہیں۔

قتادہ کا کہنا ہے کہ ہم گھر گھر کی تلاش میں نکل پڑے اور پوچھ گچھ شروع کر دی، اس دوران ہم سے کہا گیا کہ ہم نے بنی اُبیرق کو دیکھا ہے کہ وہ گذشتہ شب دیگیں پکا رہے تھے اور اس میں تمہاری ہی اشیاء خورد و نوش اور جو آٹا وغیرہ جو تم کہہ رہے ہو وہی دیکھا گیا۔

ابھی ہم لوگ گھر کی تلاشی میں مصروف تھے اور گھر کے افراد سے پوچھ گچھ کر رہے تھے کہ بنی ابیرق نے کہا، خدا کی قسم! یہ کام ہم میں سے صرف لبید بن سہل ہی کا ہے جو کہ ہمارے گھرانہ سے ہے اور ایک نیک مسلمان ہے، اس کے علاوہ ہمیں کوئی دوسرا شخص اس طرح کی حرکت کرنے والا نظر نہیں آتا، جب لبید کو اس بات کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور بنی ابیرق کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا: کیا تم مجھے چور سمجھتے ہو؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار کو تمہارے خون سے بھر دوں گا ورنہ صاف صاف بتاؤ کہ یہ چوری کس نے کی ہے؟ بنی ابیرق نے جواب دیا کہ اے شخص! ہماری جان چھوڑو ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم نے یہ مال نہیں چرایا، بہرحال ہم گھر کے افراد سے سوال و جواب کرتے رہے اور بالآخر ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کام بنی ابیرق ہی کا ہے، میرے چچا نے مجھ سے کہا: بھتیجے جان! جب تمام صورتحال واضح ہو چکی ہے تو بہتر ہے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر سارا واقعہ انہیں بتائیں۔

قتادہ نے کہا کہ ہم حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے قبیلہ میں سے ایک گھرانہ بہت ہی برا اور غلط کاموں میں شہرت رکھتا ہے، انہوں نے میرے چچا رفاعہ کے گھر نقب زنی

کر کے ان کا سارا مال چرالیا ہے اور کھانے پینے کی اشیاء اور اسلحہ وغیرہ سب کچھ اُٹھا کر لے گئے ہیں، آپ حکم دیں کہ ہمارا اسلحہ ہمیں واپس کر دیں، کھانے پینے کی اشیاء بے شک خود رکھ لیں ہمیں ان کی ضرورت نہیں، حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں اس کے بارے میں غور کرتا ہوں، بنی ابیرق کو پتہ چلا کہ ان کی شکایت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچا دی گئی ہے، وہ اپنے ایک شخص جس کا نام اُسیر بن عروہ تھا، کے پاس آئے اور اس سلسلہ میں اس سے بات چیت ومشاورت کی، گھر کے تمام افراد اس کے پاس جمع ہو گئے اور اسے ساتھ لے کر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قتادہ بن نعمان اور اس کے چچا نے ہمارے قبیلہ کے ایک گھرانہ پر تہمت لگائی ہے اور کسی ثبوت وگواہی کے بغیر ان پر چوری کا الزام عائد کر دیا ہے حالانکہ وہ نیک وصالح مسلمان گھرانہ ہے۔

قتادہ نے کہا کہ اس دوران میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں بات کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس گھرانہ کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے اور کسی گواہ ودلیل کے بغیر ان پر چوری کی تہمت لگا رہا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نیک وصالح افراد ہیں۔

قتادہ نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سن کر بہت پریشان ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ کاش! میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں بات ہی نہ کرتا اور اپنے مال ہی سے اپنے چچا کا نقصان پورا کر دیتا، چنانچہ جب میرا چچا رفاعہ میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے کہا: بھتیجے جان! تم نے کیا کیا ہے؟ میں نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات بتائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے، تو میرے چچا نے کہا: اللہ المستعان۔ اللہ ہی ہے جس سے مدد طلب کریں ''ابھی کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ یہ آیات نازل ہوئیں: ''اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا'' (یعنی بنی ابیرق کے طرفدار نہ بنیں) واستغفر اللہ (یعنی قتادہ کے بارے میں تو نے جو کچھ کہا ہے اے اُسیر بن عروہ! اس پر اللہ سے استغفار کر) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ خداوند معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (یعنی اے ابن عروہ! تو ان لوگوں کا دفاع وحمایت نہ کر جنہوں نے اپنے آپ سے خیانت کی ہے) تا ''يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' (یعنی قبیلہ بنی ابیرق والے اگر اللہ سے استغفار کریں تو اللہ کو معاف کر دینے والا، نہایت رحم کرنے والا پائیں گے۔'' وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓــَٔةً اَوْ اِثْمًا...... تا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا'' (یعنی انہوں نے خود ہی گناہ کا ارتکاب کیا اور پھر اسے لبید کی طرف منسوب کر دیا تو انہوں نے بڑا بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر لیا) وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ (یعنی اُسیر بن عروہ اور اس کے ساتھیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اگر اللہ کا فضل وکرم اور اس کی رحمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہ ہوتی تو وہ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے) فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ان آیات کے نزول کے بعد اصل حقیقت واضح ہوگئی لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ اسلحہ ان

سے لے کر رفاعہ کے سپرد کر دیا۔

قتادہ نے کہا: میں وہ اسلحہ لے کر آیا اور اپنے چچا کے سپرد کر دیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا کہ میرے خیال میں تو ابھی زمانہ جاہلیت کی راہ و رسم میں گھرا ہوا تھا اور سچا مسلمان نہیں ہوا تھا، جب میں نے اسے وہ اسلحہ دیا تو اس نے فوراً کہا: بھتیجے جان! میں اسے اللہ کی راہ میں دیتا ہوں۔ اس کی بات سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سچا مسلمان ہے۔

جب ساری صورتحال واضح ہو گئی اور چور کی شناخت ہو گئی تو بشر مدینہ سے نکل گیا اور مکہ جا کر مشرکین کے ساتھ ملحق ہو گیا، مکہ میں وہ سلافہ بنت سعد کے گھر میں قیام پذیر ہوا، اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں: ''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى......... تا......... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا'' جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ بشر، سلافہ کے گھر قیام پذیر ہوا ہے تو مشہور شاعر حسان بن ثابت نے سلافہ کی مذمت میں اشعار کہے، سلافہ نے دیکھا کہ اس کی عزت خطرے میں ہے تو اس نے بشر کا سامان اٹھایا اور سر پر رکھ کر گھر سے نکل پڑی اور اسے نالے میں پھینک کر اس سامان کے مالک کی طرف رخ کر کے کہا: تو نے مجھے حسان کا شعر ہدیہ و تحفہ دیا ہے، اس سے بہتر تو مجھے دے بھی کیا سکتا تھا؟ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۱۵)

یہ واقعہ دیگر اسناد سے بھی مروی ہے، اسی کتاب تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۲۱۷ میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے ابن زید سے روایت کی ہے کہ انہوں نے زیر نظر آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں بیان کیا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ایک شخص نے ایک زرہ چوری کی اور اسے ایک یہودی کے گھر میں پھینک دیا اور جب اس یہودی کو پکڑا گیا تو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اے ابوالقاسم! اللہ کی قسم! میں نے چوری نہیں کی ہے بلکہ کسی نے وہ زرہ میرے گھر میں پھینکی ہے، اور امر واقعہ بھی یہی تھا کہ ایک شخص نے وہ زرہ چوری کی اور اس کے ہمسایوں نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے اسے بری قرار دیئے جانے کی غرض سے وہ زرہ اس یہودی کے گھر میں پھینک دی اور پھر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر گواہی دینے لگے کہ یہ خبیث یہودی کہ جو خدا کا منکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و وحی کا بھی انکار کرتا ہے ـــــ اسی نے چوری کی ہے ـــــ ان لوگوں نے اس یہودی کے خلاف اس قدر زہر اُگلا اور اس کے بارے میں بُرا بھلا کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی باتیں سن کر اس یہودی کے بارے میں سرزنش آمیز الفاظ کہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت پیغمبر اسلام پر یہ آیات نازل فرمائیں:

''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ'' (ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے، اور آپ خیانت کاروں کے طرفدار نہ بنیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کریں) اس چیز کے بارے میں جو آپ نے یہودی کے

بارے میں کہی ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا" (یقیناً اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس چور کے ہمسایوں کو مخاطب قرار دے کر ارشاد فرمایا: "هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَاۤءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فَمَنۡ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا" (یہ تم ہی ہو کہ دنیاوی زندگی میں ان کی طرفداری کرتے ہوئے ان کا دفاع کرتے ہو، مگر قیامت کے دن کون ہوگا جو اللہ کے حضور ان کا دفاع کرے یا کون ان کا نگہبان ونگران ہوگا؟)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توبہ کے حوالہ سے فرمایا: "وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡۤءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ" (اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو معاف کردینے والا، نہایت مہربان پائے گا، اور جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا وہ اپنے ہی خلاف کام کرتا ہے) ــــــ تو اے لوگو، کیا وجہ ہے کہ تم اس شخص کے گناہ میں اپنے آپ کو آلودہ کرتے ہو ــــــ "وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ خَطِيۡۤـئَةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ يَرۡمِ بِهٖ بَرِيۡۤـئًا" (اور جو شخص کوئی غلطی کرے یا گناہ کا مرتکب ہو پھر کسی بے قصور شخص پر اس کا الزام لگادے) خواہ وہ بے قصور شخص مشرک ہی ہو۔ "فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا......... تا.......... وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى الخ" (تو اس نے ایک بہتان اپنے سر لے لیا... اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرے جبکہ اس کے پاس ہدایت کا راستہ واضح ہو چکا...... الخ) ابوزید نے کہا، بشر نے اس توبہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا جس کی اللہ نے اسے پیشکش کی تھی اور مدینہ سے چلا گیا اور مکہ جاکر مشرکین کے ساتھ رہنے لگا، وہاں بھی اس نے ایک گھر کی نقب زنی کی تاکہ چوری کرے مگر اللہ نے وہ گھر اس پر گرادیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہی مطلب متعدد راویوں کے حوالہ سے، مختلف عبارتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

خدا معاف کرنے والا ہے

تفسیر العیاشی میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ما من عبد اذنب ذنبًا فقام و توضّا واستغفر اللہ من ذنبہ الا کان حقیقًا علی اللہ ان یغفر لہٗ لانہٗ یقول: من یعمل سوءًا او یظلم نفسہٗ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفوراً رحیماً"

"جو بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہو پھر کھڑا ہوجائے اور وضو کرے اور اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرے تو اس وقت اس کا اللہ پر حق بنتا ہے کہ اسے معاف کردے، کیونکہ اللہ ارشاد فرماتا ہے: جو شخص برا عمل انجام دے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے وہ اللہ کو معاف کردینے والا، نہایت مہربان پائے گا۔"

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:

ان اللہ لیبتلی العبد وھو یحبّہ لیسمع تضرعہٗ

خداوند عالم جس بندے کو دوست رکھتا ہے اس کی آزمائش کرتا ہے تا کہ اس کی تضرع وزاری کو سنے)

اور ارشاد فرمایا:

ما کان اللہ لیفتح باب الدعاء ویغلق باب التوبہ. لانہٗ یقول: "ادعونی استجب لکم" وما کان لیفتح باب التوبۃ ویغلق باب المغفرۃ وھو یقول: من یعمل سوءاً او یظلم نفسہٗ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفوراً رحیماً

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ دعا کا دروازہ کھولے مگر توبہ کا دروازہ بند کردے کیونکہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے: تم مجھ سے دعا مانگو، میں تمہاری دعا کو پورا کروں گا، اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ توبہ کا دروازہ کھولے اور بخشش کا دروازہ بند کردے جبکہ وہ فرماتا ہے: جو شخص برا عمل انجام دے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر اللہ سے طلب مغفرت کرے تو وہ اللہ کو معاف کردینے والا، نہایت مہربان پائے گا (بحوالہ تفسیر برہان جلد اول، صفحہ ۴۱۴)

غیبت وتہمت کا فرق

عبداللہ بن حماد انصاری نے عبداللہ بن سنان کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

الغیبۃ ان تقول فی اخیك ما ھو فیہ مما قد ستر اللہ علیہ فاما اذا قلت ما لیس فیہ فذلك قول اللہ: فقد احتمل بھتاناً واثماً مبیناً

غیبت یہ ہے کہ تو اپنے مؤمن بھائی کے اس گناہ وعیب کو برملا کرے جس پر اللہ نے پردہ پوشی کی ہے، لیکن اگر اس کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اس میں نہ ہو وہ تہمت وبہتان ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ایسا کرنے والا تہمت اپنے سر لیتا ہے اور کھلے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے (تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۷۵)

سرگوشی کی بجائے پردہ پوشی

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ "لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ..... الخ" کی تفسیر میں ایک روایت مذکور ہے مؤلف نے اپنے

والد کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے ابن ابی عمیر سے حماد کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے حلبی کی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "تمحل" کا حکم دیا ہے (ان اللہ فرض التمحل فی القرآن) میں نے پوچھا: وما التمحل جعلت فداك (میری جان آپ پر فدا ہو، تمحل سے کیا مراد ہے؟) تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: تیرا رخ اپنے مؤمن بھائی کے رخ سے زیادہ باوقار ہونا چاہیے (تو اپنی عزت سے زیادہ اپنے بھائی کی عزت کا خیال رکھ) اور اس کے لئے اچھی تدبیر کر! کہ اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ" (ان کی سرگوشیوں میں اچھائی نہیں ہوتی)

قرآن ہی اصل اساس ہے

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن سنان کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے ابوجارود کے حوالہ سے بیان کیا کہ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، میں جب بھی تم سے بیان کروں تو اس کی قرآنی دلیل بھی پوچھ لیا کرو، (اذا حدثتكم بشيئ فاسالوني عنه من كتاب الله) پھر امامؑ نے اپنے بیان میں ارشاد فرمایا: "ان رسول الله نهىٰ عن القيل والقال، وفساد المال و كثرة السؤال" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین چیزوں سے منع فرمایا ہے: (۱) قیل وقال کرنا (بحث و گفتگو میں الجھنا) مال کو ضائع کرنا اور زیادہ سوال و جواب کرنا، تو امامؑ سے پوچھا گیا کہ یہ سب کچھ قرآن مجید میں کہاں مذکور ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اللہ کا ارشاد گرامی ہے: "لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ" (ان کے اکثر نجویٰ کرنے میں اچھائی نہیں پائی جاتی، سوائے اس شخص کے کہ جو صدقہ کا حکم دے یا نیکی کرے یا لوگوں کے درمیان صلح و اصلاح کرے) اور خدا نے ارشاد فرمایا: "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا" (اور تم نادانوں کو ان کے وہ اموال نہ دو جن کا اختیار اللہ نے تمہیں دیا ہے) اور ارشاد فرمایا: "لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ" (تم ان چیزوں کے بارے میں مت پوچھو کہ اگر وہ ظاہر ہو جائیں تو تمہیں تکلیف ہوگی) (کافی، جلد اول، صفحہ ۶۰)

نیکی یعنی قرض؟

ابراہیم بن عبدالحمید نے بعض معتمد افراد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ مبارکہ "لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس میں "معروف"

سے مراد قرض ہے (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۷۵)

یہی روایت تفسیر قمی میں بھی اسی اسناد سے ذکر کی گئی ہے اور یہی بات اہل سنت کے اسناد سے بھی منقول ہے، بہر حال یہ مطلب ''جری'' وتطبیق کے باب سے ہے اور اس میں ''معروف'' کا ایک مصداق ذکر کیا گیا ہے۔

زبان پر قابو رکھنا

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے سفیان بن عبداللہ ثقفی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ایسا کام بتائیں کہ میں اپنے عقیدۂ اسلام میں ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ رہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امنت باللہ کہو اور پھر اس پر استقامت کرو عملی طور پر قائم رہو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ مجھ سے کس چیز کی بابت زیادہ فکر مند ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اس سے! اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی زبان سے کہ اس پر قابو رکھنا ہی کرنے کا اصل کام ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۲۰)

شیعہ وسنی کتب میں کثرت کے ساتھ روایات ذکر کی گئی ہیں جن میں زیادہ بولنے کی مذمت اور کم بولنے وخاموش رہنے کی تعریف کی گئی ہے اور ان سے مربوطہ مطالب ذکر کئے گئے ہیں۔

جنت: اجر عظیم!

ابونصر سنجری نے کتاب ''الابانہ'' میں انس کا بیان ذکر کیا کہ اُنہوں نے کہا: ایک اعرابی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا: اے اعرابی! اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل فرمائی ہے: ''لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ.......... تا..........فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا'' تو اس میں اجر عظیم سے مراد بہشت ہے، اعرابی نے یہ سن کر کہا: الحمد للہ الذی ھدانا للاسلام، اللہ کی حمد وثناء ہے کہ جس نے ہمیں اسلام کی راہ دکھائی (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۲۲)

اسی کتاب میں آیۂ مبارکہ ''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ.........الخ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ترمذی نے اور بیہقی نے کتاب ''الاسماء والصفات'' میں عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا، اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہے لہٰذا جو شخص جماعت سے دوری اختیار کرے وہ خود

دوزخ میں جائے گا۔

اسی طرح کی ایک روایت ابن عباس سے منقول ہے جسے ترمذی اور بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کو ــــــ یا یوں فرمایا: اس امت کو ــــــ ہرگز گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہے۔

یہ روایت مشہور و معروف احادیث میں شمار ہوتی ہے اور امام علی نقی علیہ السلام نے بھی اسے اپنے اس خط میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے ذکر فرمایا ہے جو اہل اہواز کے نام بھیجا اور اس خط کا متن بحار الانوار کی تیسری جلد میں موجود ہے، اس روایت کا معنیٰ ہم اپنے سابقہ بیان میں ذکر کر چکے ہیں کہ امت کے گمراہی میں یکجانہ ہونے سے کیا مراد ہے!

تفسیر العیاشی کی روایت

حریز کے حوالہ سے منقول ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے دو اماموں یعنی امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے ایک سے نسبت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب حضرت امیر المومنینؑ کوفہ میں مقیم تھے تو ایک مرتبہ کچھ لوگ آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمارے لئے کوئی امام جماعت مقرر کریں جو ماہِ رمضان میں ہمیں با جماعت نماز پڑھائے۔ آپؑ نے انکار کر دیا اور انہیں ماہِ رمضان میں اکٹھا ہونے سے منع فرمایا، وہ لوگ چلے گئے اور جب شام ہوئی تو وہ اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ رمضان میں گریہ و بکاء کرو، چنانچہ انہوں نے ''وارمضاناہ'' (ہائے رمضان!) کی آوازیں بلند کرنا شروع کر دیں۔ اس وقت حارث بن اعور کچھ لوگوں کو لے کر حضرت امیر المومنینؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! لوگ چیخ و پکار کر رہے ہیں اور آپ کے جواب سے سخت نالاں ہیں، امامؑ نے ارشاد فرمایا، اگر ایسا ہے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، وہ جسے چاہیں اپنا پیش نماز بنا لیں، اس وقت امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **فمن یبتغ غیر سبیل المؤمنین نولّه ما تولّی ونصله جهنم وساءت مصیراً**، جو شخص مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کسی راستہ کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ خود پھرا ہو، اور اسے دوزخ کی آگ میں جلائیں گے جو کہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۷۵)

جنگ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطاب

تفسیر ''درمنثور'' میں آیہ مبارکہ ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ بیہقی نے کتاب الدلائل میں

عقبہ بن عامر کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں عقبہ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنگ تبوک کے لئے جانا اور اس کی تفصیل بیان کی، اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کے وقت تبوک پہنچ گئے اور پہنچتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کی حمد وثناء کی اور اس طرح کے کلمات ادا فرمائے کہ جو حمد الٰہی کے شایانِ شان ہیں اور پھر ارشاد فرمایا:

امابعد، سچا ترین کلام، اللہ کی کتاب ہے، مضبوط ترین وسیلہ کلمۂ تقویٰ ہے، بہترین دین، دین ابراہیمؑ ہے، بہترین راہ وروش، سنتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، پاکیزہ ترین بات اللہ کا ذکر ہے، خوبصورت ترین داستان یہی قرآن ہے، بہترین کام وہ ہے جو دینی اصولوں کے مطابق ہو اور براترین کام وہ ہے جو خودساختہ وبدعتوں پر مشتمل ہو، عمدہ ترین ہدایت انبیاءؑ کی ہدایت و رہنمائی ہے اور باعزت ترین موت شہداء کا قتل ہونا ہے، سب سے زیادہ اندھاپن، ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوجانا ہے، بہترین علم وہ ہے جو فائدہ مند ہو، بہترین ہدایت وہی ہے جس کی پیروی کی جائے، دل کا اندھا ہونا سب سے برا اندھاپن ہے، اونچا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ جو کم ہو اور کفایت کرے وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو تباہی کا سبب بنے، سب سے بری معذرت ومعافی طلب کرنا اس وقت ایسا کرنا ہے جب موت کے سایے سر پر منڈلا رہے ہوں، سب سے بری ندامت وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی، کچھ لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ نماز میں سب سے آخر میں آتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا ذکر الٰہی کرنا لقلقۂ زبان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، جھوٹی زبان سب سے بڑا گناہ ہے، دل کا بے نیاز ہونا ہی سب سے بے نیازی کی بہترین صورت ہے، تقویٰ ہی بہترین زادِراہ ہے، دل میں خداخوفی دانائی کا سرچشمہ ہے، یقین پختہ دلی کا نام ہے، شک کفر کے باب سے ہے، ناحق گریہ وبکاء زمانۂ جاہلیت کی باقیات سے ہے، دھوکہ دہی دوزخ کی چوٹیوں میں سے ہے، مالِ دنیا کی خزانہ داری جہنم کی آگ کا ایندھن ہے، لغو وبیہودہ شعرگوئی شیطانی بانسری ہے، شراب ہر گناہ کی جڑ ہے۔ (تمام گناہوں کی یکجا صورت ہے) عورت شیطان کی کنڈی ہے، جوانی دیوانی ہے، سب سے بری تجارت سودی کاروبار ہے، یتیم کا مال کھانا سب سے برا کھانا ہے، جو شخص کسی دوسرے سے نصیحت پائے وہ خوش قسمت ہے اور بدبخت تو وہ ہے جو ماں کے شکم ہی میں بدبخت ہوا ہو، تمہاری آخری منزل چار گز زمین ہی ہے، ہر کام کا انجام ہی اس کی حیثیت کا تعین کرتا ہے، عمل کا معیار اس کے اواخر وآثار سے ظاہر ہوتا ہے، جھوٹی باتوں کو پھیلانا نہایت بری روایت ہے، جس چیز نے آنا ہے وہ نزدیک ہے، مؤمن کو گالیاں بکنے والا شخص فاسق ہے، مؤمن سے لڑائی کرنا کفر ہے، مؤمن کا گوشت کھانا (غیبت کرنا)، اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہونا ہے، مؤمن کا مال اس کے خون ــــ جان ــــ کی طرح احترام رکھتا ہے، جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے خدا اس کی تکذیب کرتا ہے، جو شخص دوسروں کو معاف کرے اسے بھی معاف کردیا جاتا ہے، جو شخص دوسروں سے عفو ودرگزر سے کام لے تو اللہ اس سے عفو ودرگزر کرتا ہے، جو شخص غصہ پر قابو پائے اللہ اسے اجر عطا کرتا ہے، جو شخص مصیبت پر صبر کرے تو اللہ اسے اس کا صلہ عطا کرتا ہے، جو شخص خودنمائی کا خواہاں ہو اللہ اسے ریاکاری میں

مبتلا کردیتا ہے، جوشخص صبر اختیار کرے تو اللہ اسے کئی گنا عطا کرتا ہے اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرے اللہ اسے عذاب میں مبتلا کرے گا، اے اللہ مجھے اور میری امت کی مغفرت فرما۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ تین بار دُہرایا، میں اپنے اور تمہارے لئے خدا کی بارگاہ میں مغفرت کا طلبگار رہوں۔

"ان اصدق الحدیث کتاب اللہ، واوثق العریٰ کلمۃ التقویٰ، وخیر الملل ملۃ ابراھیم، وخیر السنن سنۃ محمد، واشرف الحدیث ذکر اللہ، واحسن القصص ھٰذا القرآن، وخیر الامور عوازمھا، وشر الامور محدثاتھا، واحسن الھدیٰ ھدی الانبیاء، واشرف الموت قتل الشھداء، واعمی العمی الضلالۃ بعد الھدیٰ، وخیر العلم ما نفع، وخیر الھدیٰ ما اتبع، و شر العمی عمی القلب، والید العلیا خیر من الید السفلیٰ، وما قل و کفیٰ خیر مما کثر والھیٰ، وشر المعذرۃ حین یحضر الموت، و شر الندامۃ یوم القیامۃ، ومن الناس من لایأتی الصلاۃ الا دبراً ومنھم من لا یذکر اللہ الا ھجراً، واعظم الخطایا اللسان الکذوب، وخیر الغنی غنی النفس، وخیر الزاد التقویٰ، ورأس الحکمۃ مخافۃ اللہ عزوجل، وخیر ما وقرفی القلوب الیقین، والارتیاب من الکفر، والنیاحۃ من عمل الجاھلیۃ، والغلول من جثاجھنم، والکنز کی من النار، والشعر من مزامیر ابلیس، والخمر جماع الاثم، والنساء حبالۃ الشیطان، والشباب شعبۃ من الجنون، وشر المکاسب کسب الرباء، وشر الماکل مال الیتیم، والسعید من واعظ بغیرہ، والشقی من شقی فی بطن امہ، وانما یصیر احدکم الیٰ موضع اربع اذرع، والامر بآخرہ، وملاک العمل خواتمہٗ، وشر الروایا روایا الکذب، وکل ما ھو اٰتٍ قریب، وسباب المؤمن فسوق، وقتال المؤمن کفر، واکل لحمہ من معصیۃ اللہ، وحرمۃ مالہٖ کحرمۃ دمہٖ، ومن یتال علی اللہ یکذبہ، ومن یغفر یغفرلہ، ومن یعف یعف اللہ عنہ، ومن یکظم الغیظ یاجرہ اللہ، ومن یصبر علی الرزیۃ یعوضہ اللہ، ومن یبتغ السمعۃ یسمع اللہ بہٖ، ومن یصبر یضعف اللہ لہٗ ومن یعص اللہ یعذبہ اللہ، اللھم اغفرلی ولامّتی قالھا ثلاثاً استغفر اللہ لی ولکم (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۲۲۴)

خدا کے حکم میں تبدیلی

تفسیر العیاشی میں محمد بن یونس کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اُنہوں نے اپنے بعض دوستوں کے حوالہ سے امام جعفر

صادق علیہ السلام کا فرمان اور جابر کے حوالہ سے امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا کہ انہوں نے آیۂ مبارکہ "وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: شیطان، لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ نے جو حکم بھی اُنہیں دیا ہے اسے تبدیل کردیں۔

اسی کتاب میں ایک روایت جابر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ" میں خلق اللہ سے مراد دین اللہ ہے، (یعنی شیطان لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ کے دین میں تبدیلیاں کریں) (تفسیر العیاشی، جلداول، صفحہ ۲۷۶)

ان دونوں روایتوں کی برگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہوتی ہے، اور اس کی بابت ہم سابقہ بیان میں ذکر کرچکے ہیں کہ اس سے مراد دین فطرت ہے۔

جانوروں کے کان کاٹنا

تفسیر "مجمع البیان" میں آیۂ "فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ" کے ذیل میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے مذکور ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جانوروں کے کان تہہ سے کاٹیں۔ (مجمع البیان جلد سوم، صفحہ ۱۱۳)

گناہوں کی بخشش کا ذریعہ

تفسیر العیاشی میں آیۂ مبارکہ "لَيۡسَ بِاَمَانِيِّكُمۡ......الخ" کے ذیل میں مذکور ہے کہ محمد بن مسلم نے حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی: "مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ" (جو شخص برا عمل انجام دے اسے سزا دی جائے گی) تو بعض صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ یہ آیت کس قدر سخت ہے! اس پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا تمہارے اموال و جانوں اور اولاد کے ذریعے تمہاری آزمائش نہیں ہوتی؟ اُنہوں نے عرض کی: جی ہاں، کیوں نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ آزمائشیں تمہارے لئے اچھی جزاؤں کے حصول اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں۔ انہی سے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی عنایات سے نوازے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ (تفسیر العیاشی، جلداول، صفحہ ۲۷۷)

مذکورہ بالا مطلب اہل سنت کی جوامع الاحادیث میں متعدد اسناد کے ساتھ صحابہ کرام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

گناہوں کا کفارہ

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ احمد، بخاری، مسلم اور ترمذی نے ابوسعید خدری کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مایصیب المؤمن من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا اذی ولا غم حتی الشوکة یشاکها الا کفر الله من خطایاہ'' مؤمن جس تکلیف و دکھ اور غم و حزن اور اذیت و آرام سے دوچار ہو یہاں تک کہ اگر کوئی کانٹا بھی اسے چبھے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی خطاؤں و گناہوں کا کفارہ قرار دیتا ہے، (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۲۸)

یہ مطلب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام سے بہ کثرت روایات میں ذکر ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی خلت کا راز

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حسین بن خالد کی روایت ذکر کی ہے جس میں اُنہوں نے حضرت امام علی رضاؑ کا ارشاد گرامی قدر بیان کیا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے پدر بزرگوار سے سُنا کہ وہ اپنے پدر گرامی قدر کا یہ فرمان بیان کررہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل قرار دیا کہ اُنہوں نے نہ تو کبھی کسی سائل کو رد کیا اور نہ ہی خداوند عالم کے علاوہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا (عیون اخبار الرضاؑ، جلد ۲ صفحہ ۷۶)

یہ روایت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلیل اللہ قرار پانے سے متعلق روایات میں سے صحیح ترین روایت ہے کیونکہ اس میں مذکورہ سبب لفظ ''خلیل'' سے بھرپور معنوی مناسبت کا حامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''خلت'' کا معنیٰ حاجت و ضرورت ہے لہٰذا آپ کا خلیل وہی ہے جو آپ سے اپنی ہر حاجت کی بات کرے اور آپ سے اس حاجت کو پورا کرنے کا متمنی ہو، البتہ اس نام کی وجہ تسمیہ کی بابت دیگر روایات میں بھی مطالب ذکر کئے گئے ہیں۔

آیات ۱۲۷ تا ۱۳۴

○ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

○ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

○ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

○ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

ترجمہ

○ ''اور وہ آپ سے خواتین کے احکام پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تمہیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور جو کچھ کتاب میں ہے تمہارے سامنے پڑھا جاتا ہے کہ وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں جنہیں تم ان کا وہ حق ادا نہیں کرتے جو ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے جبکہ ان سے نکاح بھی کرنا چاہتے ہو، اور وہ حکم ان بے بس بچوں کے بارے میں ہے، اور وہ یہ کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف سے کام لو، اور تم جو اچھا کام کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔'' (۱۲۷)

○ ''اور اگر کسی خاتون کو اپنے شوہر کی طرف سے بے اعتدالی یا بے رغبتی کا اندیشہ لاحق ہو تو مناسب یہ ہے کہ آپس میں اچھے طریقہ سے صلح و مصالحت کر لیں اور صلح کرنا ہی اچھا ہے، اور ہر نفس میں بخل رکھ دیا گیا ہے، اور اگر تم نیکی و احسان اور اچھا عمل کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔'' (۱۲۸)

○ ''اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتے ہو خواہ جس قدر کوشش کرو، البتہ ان میں سے کسی کو اس طرح بے رغبتی کا نشانہ نہ بناؤ کہ اسے بے سہارا چھوڑ دو، اور اگر باہمی امور کو سلجھاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ معاف کر دینے والا، نہایت مہربان ہے۔'' (۱۲۹)

○ ''اور اگر وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں تو اللہ اپنی وسیع رحمت سے ان سب کو غنی کر دے گا اور اللہ وسیع رحمت والا نہایت دانائی والا ہے۔'' (۱۳۰)

○ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

○ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

○ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

○ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع

○ ''اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور ہم نے تم سے پہلے نصیحت وتاکید کی ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی اور تمہیں بھی کہ تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، اور اگر تم نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ آسمانوں وزمین میں موجود تمام موجودات کا مالک ہے، اور اللہ غنی وہر طرح کی تعریف والا ہے۔''

(۱۳۱)

○ ''اور اللہ ہی اس کا مالک ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور اللہ ہی سرپرستی کے لئے کافی ہے۔''

(۱۳۲)

○ ''اگر وہ چاہے تو اے لوگو! تم سب کو ختم کردے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے اور اللہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔''

(۱۳۳)

○ ''جو شخص صرف دنیاوی اجر کا طلبگار ہو تو اسے جاننا چاہیے کہ اللہ کے پاس دُنیا وآخرت دونوں کا اجر موجود ہے، اور اللہ سب کچھ سننے والا، ہر شے کو دیکھنے والا ہے۔''

(۱۳۴)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان کی بازگشت ان مطالب کی طرف ہوتی ہے جو اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں خواتین سے مربوط مسائل کی بابت ذکر ہو چکے ہیں کہ جن میں تحریم (یعنی کن عورتوں سے نکاح حرام ہے) اور وراثت وغیرہ کے احکام شامل ہیں، ان آیات کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا نزول سابقہ آیات کے بعد ہوا ہے کیونکہ سابقہ آیات کے نازل ہونے کے بعد لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خواتین سے مربوطہ مسائل دریافت کرتے تھے اور ان کا ایسا کرنا اس وجہ سے تھا کہ نازل شدہ آیاتِ مبارکہ میں عربوں کے ہاں مُروّجہ رسومات کی یکسر نفی ہوئی اور ان کے اموال و معاشرت وغیرہ کے امور میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کا جو سلسلہ عام تھا اس پر سُرخ لکیر کھینچ دی گئی، بنابر ایں اللہ تعالیٰ نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ لوگوں کو آگاہ کریں کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے حقوق کی بابت جو احکام صادر ہوئے ہیں وہ خدائی دستورات ہیں۔

ان احکام میں ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی عمل دخل نہیں، اور نہ صرف انہی احکام میں بلکہ تمام شرعی احکام میں کہ جن میں یتیم عورتوں کے مسائل بھی شامل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی خواہش و فیصلہ شامل نہیں، تمام احکام اللہ کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام خدائی احکام لوگوں تک پہنچا دینا ہے، اور جو احکام ان آیات مبارکہ میں ذکر کئے گئے ہیں صرف انہی میں یہ قاعدہ کلیہ ملحوظ و منحصر نہیں بلکہ کلی طور پر اللہ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے بارے میں عدل و انصاف سے کام لیں۔

اس کے بعد ان آیات میں شوہر اور بیوی کے درمیان ہونے والے ان اختلافات کی بابت چند احکام ذکر کئے گئے ہیں جو کہ عام طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

خواتین سے مربوط مسائل

''وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ''

(اور وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں استفسار کرتے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ ان کی بابت اللہ تمہیں آگاہ کرتا ہے)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ لفظ ''فتیا'' اور ''فتویٰ'' (جو کہ ''یَسْتَفْتُوْنَكَ'' کا مصدر ہے) اس سے مراد وہ جواب ہے جو مشکل احکام کی بابت سوال پر دیا جائے (جس موضوع کا حکم معلوم نہ ہو یا واضح نہ ہو یا اس کے سمجھنے میں دشواری ہو) اور کہا جاتا ہے: ''استفتیة فافتانی بکذا'' (میں نے اس سے فتویٰ پوچھا تو اس نے مجھے یہ فتویٰ دیا)۔ (المفردات صفحہ ۳۷۳)

اس لفظ کے استعمالی موارد پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ اس جواب کو کہتے ہیں جو مشکل امور کی بابت سوال پر دیا جائے، یا وہ نظریہ وموقف کہ جسے انسان اپنے اجتہاد وتحقیق اور غور وفکر سے متعین کرے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ہر اس نظریہ کو ''فتویٰ'' سے تعبیر کہا جا سکتا ہے جو ابتدائی مرحلہ ہی میں طے ومتعین ہو، چنانچہ اس کا ثبوت اس لفظ کا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونا ہے (اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ـــــ (اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے) تو اس میں ''فتویٰ'' سے مراد اجتہادی وتحقیقی رائے وموقف نہیں بلکہ اصولی فیصلہ وحکم ہے۔م،

یہاں یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ اس آیت کی بابت مفسرین نے اس کے ذیلی جملہ ''وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ'' کے تناظر میں جن مختلف جہتوں کو زیر بحث قرار دیا ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف معانی کا احتمال وامکان پیدا ہوتا ہے لیکن اس آیت کو سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں مذکور خواتین کے احکام کے تناظر میں دیکھیں تو اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ یہ آیت ان آیات مبارکہ کے بعد نازل ہوئی۔

اور اس کے ان آیات کے بعد نازل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں نے عورتوں کے حقوق ومسائل کی بابت جو سوالات کئے اور استفتاء کیا وہ ان امور سے مربوط تھا جو اسلام نے خواتین کے حقوق کے بارے میں پیش کئے کہ ان احکام کی مثالیں اس زمانہ میں موجود نہ تھیں اور وہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں جاری رسموں کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ خواتین کے حقوق کی بابت خدائی احکام ودستورات ان کے لئے انوکھے ونامانوس تھے۔ ان احکام کا تعلق میراث وازدواج کے عمومی مسائل سے تھا کہ جن میں عورتوں کے حقوق کا تحفظ ملحوظ ویقینی تھا، وہ احکام صرف یتیم عورتوں سے مختص ومخصوص نہ تھے کہ ان کے علاوہ ان کا دیگر خواتین سے تعلق نہ ہو ایسا نہ تھا بلکہ لوگوں کا استفتاء خواتین سے مربوط تمام امور وحقوق کی بابت تھا کہ جن میں میراث وغیرہ کے مسائل بھی شامل تھے، البتہ جو جملہ صرف یتیم عورتوں کے احکام سے مربوط ملحوظ ہے وہ یہ ہے: ''وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ'' ورنہ عمومی طور پر لوگوں کے استفتاء اور احکام وفتاویٰ دریافت کرنے کا دائرہ وسیع تھا۔

بنا برایں جملہ ''قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ'' (کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے) سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں بیان فرمائے ہیں، اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے استفتاء کے جواب میں فتویٰ صادر کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بجائے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ لہٰذا اس آیت کا معنیٰ

یوں کیا جائے گا: یسألونك ان تفتیهم فی امرهن، قل الفتوىٰ الی الله وقد افتا کم فیهن بما افتیٰ فیما انزل من اٰیات اول السورۃ، وہ آپ سے چاہتے ہیں کہ آپ عورتوں کے بارے میں فتویٰ صادر کریں، کہہ دیجئے کہ فتویٰ کا اختیار اللہ کے پاس ہے اور اس نے عورتون کے بارے میں تمہیں سورت کی ابتدائی آیات میں فتویٰ دے دیا ہے۔

یتامیٰ و مستضعفین کے احکام

○ ''وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ.........وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ''

(اور جو کچھ کتاب میں موجود تمہارے سامنے پڑھا جاتا ہے، یتیم عورتوں کے بارے میں......... اور مستضعف بچوں کے بارے میں)

آیت مبارکہ کے ظاہر السیاق کے تناظر میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہاں یتیم عورتوں اور مستضعف بچوں کے احکام خواتین کے احکام کے ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں جیسا کہ سورہ کی ابتدائی آیات میں ایسا ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے بارے میں بھی لوگ استفتاء کرتے تھے بلکہ ان کے اتصالی تذکرہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے، ورنہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صرف خواتین کے حقوق و امور کے بارے میں استفتاء کرتے تھے۔ لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جملہ ''وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ.... ''اس ضمیر مجرور کی طرف عطف ہے جو ''فِيْهِنَّ'' میں ہے۔ البتہ یہ رائے مشہور ماہر علم النحو ''فراء'' کی ہے جبکہ اکثر علمائے نحو نے اسے رد کیا ہے کہ کسی جملہ کو ضمیر کی طرف عطف کیا جائے، بنا برایں۔ ''فراء'' کے قول کے مطابق جملہ ''وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ.........'' سے مراد وہ احکام و مطالب ہیں جو یتیم عورتوں اور بچوں کے بارے میں سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کئے گئے ہیں، اور ''یتلی''میں تلاوت کے حوالہ سے یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ اس کا استعمال جس طرح پڑھنے اور زبان سے الفاظ ادا کرنے پر ہوتا ہے اسی طرح الفاظ کے معانی پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا آیت کا معنیٰ یوں کیا جائے گا: ''قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى النِّسَآءِ'' کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں ان احکام کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے جو یتیم عورتوں کی بابت کتاب (قرآن) میں تم پر پڑھے جاتے ہیں۔

عطف کے بارے میں دیگر اقوال

جملہ ''وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ.........'' کا عطف کس لفظ یا ضمیر کی طرف ہے اس کی بابت متعدد اقوال ذکر کئے گئے ہیں

جن میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) بعض مفسرین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جملہ ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' کو ''فِیْهِنَّ'' کی جگہ عطف کرتے ہیں اور وہ اس بناء پر کہ ''واللہ یفتیکم'' میں ''افتاء'' (فتویٰ دینے) سے مراد ''تبیین'' یعنی واضح کرنا ہے۔ لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا: ''قل اللہ یبین لکم ما یتلیٰ علیکم فی الکتاب'' کہہ دیجئے کہ اللہ تمہارے لئے واضح کرتا ہے اسے جو تمہارے سامنے کتاب میں تلاوت کیا جاتا ہے، یعنی خواتین کے احکام وحقوق کی بابت جو کچھ کتاب میں تمہارے سامنے پڑھا جاتا ہے اسے اللہ واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

(۲) بعض حضرات نے اس سلسلہ میں جو ترکیب ذکر کی ہے وہ نہایت بے ربط اور نا قابل تطبیق ہے مثلاً انہوں نے کہا: ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' کا عطف، جملہ ''قُلِ اللّٰهُ'' کی طرف ہے یا اس ضمیر کی طرف ہے جو جملہ ''یُفْتِیْکُمْ'' میں ہے۔

(۳) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جملہ ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' کا عطف، جملہ ''فی النسآء'' میں لفظ ''نساء'' کی طرف ہے۔

(۴) بعض حضرات نے کہا ہے کہ جملہ ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ'' میں حرف ''واؤ'' استیناف کی غرض سے ہے یعنی ایک نئے جملہ کا آغاز، لہٰذا یہ جملہ مستانفہ یعنی نیا مستقل جملہ ہے، اس بناء پر ''مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' مبتداء اور ''فِی الْکِتٰبِ'' اس کی خبر ہے، اور یہ کتاب کی عظمت وحرمت کے اظہار کے لئے ہے، بنابراین جملہ ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' ماقبل جملہ یا کسی لفظ وحرف کی طرف عطف نہیں۔

(۵) بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ ''وَمَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' میں حرف ''واؤ'' قسم کا معنیٰ دیتا ہے اور جملہ ''فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ'' دراصل جملہ ''فِیْهِنَّ'' کا بدل ہے لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہے: ''قل اللہ یفتیکم ــــ اقسم بما یتلیٰ علیکم فی الکتاب ــــ فی یتامی النسآء'' کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ میں اس چیز کی قسم کھاتا ہوں جو تمہارے سامنے کتاب میں یتیم عورتوں کے بارے میں پڑھی جاتی ہے ــــ اللہ یتیم عورتوں کے بارے میں تمہیں اپنے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔

یہ وہ آراء واقوال ہیں جو مفسرین حضرات نے آیۂ مبارکہ میں عطف کی بابت پیش کئے ہیں کہ ان سب کا بے ربط ہونا کسی بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

غیر انسانی رسوم کی نفی

○ ''الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا کُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْهُنَّ.........''

(وہ کہ جنہیں تم ان کا وہ حق نہیں دیتے جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے اور تم ان سے مناکحت پر مائل ہو)

اس فقرہ میں یتیم عورتوں کا تذکرہ ہوا ہے اور اس میں ان کی اس محرومیت کی طرف اشارہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مخصوص احکام صادر فرمائے کہ جس کے نتیجہ میں ان کی بابت معاشرے میں جاری رسم وظالمانہ طرزِ عمل پر سرخ لکیر پھیر دی اور ان پر جو سختیاں و معاشرتی جبر مسلط تھا اسے ختم کر دیا، اور وہ رسم وظالمانہ طرزِ عمل اس طرح سے تھا کہ ان کے مرد یتیم و بیوہ عورتوں پر اپنا تسلط جما کر ان میں سے جو عورت خوبصورت و مالدار ہوتی تھی اس سے شادی کر لیتے تھے اور اس کے حسن و جمال سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے لیکن اگر وہ بدصورت ہوتی تو اس سے شادی نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی کے ساتھ اسے شادی کرنے دیتے تھے تا کہ اس کا مال و دولت ہڑپ کر سکیں۔

ان مطالب سے دو اہم نکتے واضح ہوتے ہیں:

(۱) ''مَا كُتِبَ لَهُنَّ'' سے مراد تخلیقی و تکوینی طور پر مقررہ حق ہے کہ جسے مقدر اور خدائی تقدیر کہا جاتا ہے اور اس میں سے ایک یہ حق ہے کہ جب کوئی شخص مرد ہو یا عورت بالغ ہو تو شادی کرے یعنی اپنی زندگی کی فطری راہ پر گامزن ہو جائے اور آزادی کے ساتھ اپنے مال و دولت ہی میں تصرف کرے۔ اسے اپنے استعمال میں لائے اور اس سے اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرے، لہٰذا اسے ازدواجی زندگی تشکیل دینے سے روکنا اور اس کے اپنے ہی مال و سرمایہ کو استعمال میں لانے سے منع کرنا درحقیقت اسے اپنے ان فطری و تکوینی حقوق سے محروم کرنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔

(۲) ''وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ'' میں حرفِ جر ''عن'' محذوف ماننا ہوگا۔ تا کہ مقصود واضح ہو سکے، لہٰذا یہاں ان سے شادی کرنے سے بے رغبتی اور ان سے روگردانی کرنا مراد ہے ان سے شادی کرنے میں رغبت مراد نہیں کیونکہ اس سے پہلے مذکورہ فقرہ ''لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ'' اور اس کے بعد والے فقرہ ''وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ'' کے تناظر میں یہاں بے رغبتی و روگردانی مراد لینا ہی موزوں و مناسبت کا حامل ہے۔ کیونکہ ان فقروں میں مذکور مطالب کے پیش نظر یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ان کی بے رغبتی کا اظہار مقصود ہو (یاد رہے کہ عربی زبان) میں ''رغبت'' جب حرف ''فی'' کے ساتھ متعدی و مذکور ہو تو اس کا معنیٰ توجہ والتفات اور چاہت و خواہش اور جھکاؤ ہوتا ہے لیکن جب حرف ''عن'' کے ساتھ متعدی و مذکور ہو تو اس کا معنیٰ بے رغبتی و عدم توجہ اور روگردانی و بے التفاتی ہوتا ہے، جیسا کہ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ...... الخ'' (اور کون ہے جو ملت ابراہیمؑ سے منہ پھیرے سوائے اس کے کہ جو اپنے آپ سے بے وقوفی کا مرتکب ہو) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۳۰، اور سورۂ مریم: آیت ۴۶ میں یوں ارشاد ہوا: ''قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ'' (اس نے کہا کہ آیا تو میرے معبودوں سے منہ پھیرنے والا ہے اے ابراہیم!، اور حرف ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہونے میں بھی توجہ و التفات کا معنیٰ پایا جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: سورۂ توبہ، آیت: ۵۹ ''اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ'' (ہم

اپنے پروردگار کی طرف رغبت کرنے والے ہیں) مترجم

اور جملہ "وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ" کا عطف جملہ "يَتٰمَى النِّسَآءِ" کی طرف ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ یتیم بچوں کو کمزور کرتے تھے اور انہیں اس بہانہ پر وراثت سے محروم کرتے تھے کہ وہ نہ تو میدانِ جنگ میں جا کر دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت و دفاع کر سکتے ہیں۔

یتیموں کے ساتھ انصاف کا حکم

○ "وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ"

(اور یہ کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف سے کام لو)

یہ فقرہ "فِيْهِنَّ" کے مقام کی طرف عطف ہے، لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا: کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف سے کام لو۔

یہ فقرہ خاص حکم کو چھوڑ کر عمومی حکم کی طرف لوٹنے کی ایک صورت ہے یعنی اس سے پہلے یتیم عورتوں سے متعلق خاص حکم مذکور تھا جبکہ اس فقرہ میں ہر یتیم کے بارے میں انصاف کرنے کا عمومی حکم مذکور ہے کہ اس کے مال اور دیگر امور میں انصاف برتا جائے۔

خدا ہر چیز سے آگاہ ہے

○ "وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا"

(اور تم جو نیک عمل انجام دو تو اللہ اس سے بخوبی آگاہ ہے)

اس فقرہ میں لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عورتوں اور یتیموں کے بارے میں جو احکام صادر فرمائے ہیں ان میں انہی کے لئے خیر و بہتری ہے اور اللہ اس سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے، یہ توجہ اس لئے دلائی گئی ہے تاکہ لوگوں کو ان احکام پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی جائے کیونکہ اسی میں ان کے لئے خیر و بہتری ہے اور انہیں ان احکام کی خلاف ورزی کرنے سے ڈرایا جائے اور اس کے خطرناک انجام سے باخبر کیا جائے۔ کیونکہ اللہ ان کے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

بے اعتدالی یا بے رخی کا اندیشہ

○ ''وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا''

(اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بے اعتدالی یا بے رخی کا اندیشہ ہو........)

اس آیت میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ استفتاء اور سوال کرنے والوں کے کسی سوال کا جواب نہیں بلکہ ان کے سوالوں سے مناسبت و ربط کی بناء پر اسے یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کی مثال بعد والی آیت ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا'' (اور تم ہرگز عدل نہیں کر سکو گے) میں مذکور حکم کی ہے۔

یہاں بے اعتدالی و بے رخی کے وقوع پذیر ہونے کے بجائے ان کا اندیشہ لاحق ہونے کو اصلاح کا موضوع قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر اسے ان دونوں میں سے کسی چیز کا اندیشہ لاحق ہو تو وہ دونوں آپس میں مصالحت کر لیں کہ صلح بہتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صلح کا موضوع اسی لحہ تحقق پذیر ہو جاتا ہے جب اس کے خوفناک آثار ظاہر ہونا شروع ہو جائیں (یعنی صلاح کی ضرورت اس وقت ہی یقینی ہو جاتی ہے جب بے اعتدالی یا بے رخی کا اندیشہ لاحق ہونے لگے)، کلام کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ صلح سے مراد عورت کا اپنے بعض یا تمام ازدواجی حقوق سے دستبردار ہونا ہے تاکہ اس طرح شوہر کے انس و محبت اور باہمی اتفاق کو یقینی بنایا جا سکے اور جدائی کا راستہ روکا جا سکے، اور صلح ہی میں بہتری ہے۔

بخل، ایک نفسیاتی صفت

○ ''وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ''

(اور بخل کو نفسوں کے ساتھ ساتھ قرار دیا گیا ہے)

''شح'' سے مراد بخل ہے، یہاں اس کے استعمال سے یہ مطلب مقصود ہے کہ بخل ایک نفسیاتی صفت ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت وجودی کا حصہ قرار دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تخلیقی مقاصد کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے اور ان سے محرومی کا راستہ روکا جا سکے، بنا برایں یہ صفت ہر نفس میں پائی جاتی ہے جو ہر آن اس میں موجود و اثر آفرین رہتی ہے، لہٰذا ہر عورت اپنے ازدواجی حقوق یعنی نان و نفقہ، لباس و خوراک اور مباشرت و مجامعت میں بخل سے کام لیتے ہوئے ان کی حفاظت کرتی ہے اور انہیں ضائع ہونے اور ان سے محروم ہونے کی راہ روکتی ہے، لیکن ہر مرد جب معاشرت کو ناپسند کرتا ہو اور جدائی کا خواہاں ہو تو اپنی بیوی سے محبت و چاہت میں بخل سے کام لیتا ہے لہٰذا اس صورت میں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ باہمی صلح کریں اور وہ اس طرح سے کہ اُن میں سے ایک یا دونوں اپنے بعض حقوق سے چشم پوشی کریں۔

احسان وتقویٰ کا حکم

○ ''وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا''

(اور اگر تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

اس فقرہ میں مردوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ نیکی واحسان کی حدود میں رہیں اور اللہ کے راستہ کو ہی اختیار کئے رکھیں اور اس حقیقت کو ملحوظ و مدنظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہر عمل سے بخوبی آگاہ ہے اور معاشرت میں ظلم و ناروا صورت نہ اپنائیں اور انہیں اپنے مسلمہ حقوق سے چشم پوشی پر مجبور نہ کریں اگرچہ وہ خود ایسا کرنے کا حق رکھتی ہیں۔

حقیقی عدل: ناممکن

○ ''وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ..........''

(اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں کر سکتے خواہ اس کے جس قدر خواہاں کیوں نہ ہو)

اس فقرہ میں بیویوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھنے کے اس حکم کا تذکرہ ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مردوں پر عورتوں کی بابت صادر فرمایا کہ جس کا ذکر اسی سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیتوں میں یوں ہوا: ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' (اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر پاؤ گے تو بس ایک!) آیت ۳____، اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سابقہ آیت ''وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا'' میں توجہ دلائی گئی ہے، تو اس میں ایک طرح کی دھمکی پائی جاتی ہے کہ جس سے عورتوں کے درمیان حقیقی عدل روا رکھنے کی بابت غیر واضح صورت پیدا ہوتی ہے، اور ''عدل'' افراط وتفریط کے درمیان پائی جانے والی درمیانی صورت کا نام ہے اور اس کی تشخیص نہایت دشوار اور مشکل ترین امور میں سے ہے بالخصوص ان سے قلبی محبت کے تعلق کے حوالہ سے! کیونکہ قلبی محبت اور دلی لگاؤ ہمیشہ انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

بنابرایں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے درمیان عدل کی حقیقی صورت کو واضح فرمادیا اور وہ یہ کہ عدل اس درمیانی صورت کا نام ہے جو حقیقی معنی میں انسان کے بس میں نہیں خواہ وہ اس کی بابت جس قدر کوشش کرے اور اپنی تمام تر توجہات اس کی طرف مرکوز کردے، لہٰذا اس صورتحال میں مرد پر واجب ہے کہ کسی ایک ہی طرف اپنی تمام تر توجہات مرکوز نہ کرے یعنی افراط وتفریط میں سے کسی ایک ہی کو اختیار نہ کئے رکھے بالخصوص تفریط کی جانب، اور وہ اس طرح کہ بیوی کو اس طرح لٹکائے رکھے و بے سہارا قرار دے کہ وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی غیر شادی شدہ ہو یعنی شوہر دار ہوتے ہوئے بھی شوہر دار نہ ہو، نہ تو اپنے شوہر سے اپنے ازدواجی حقوق لے سکتی ہو اور نہ ہی بیوہ ہو کہ دوسرا شوہر کر سکے یا اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے کہ

کس طرح زندگی بسر کرے۔

لہٰذا مرد پر واجب ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کے ساتھ سلوک کرے اور ان کے درمیان مساوات قائم رکھتے ہوئے عملی طور پر ان کے حقوق اس طرح ادا کرے کہ ہر ایک کو برابری کی نگاہ سے دیکھے اور ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے دوسری کے حقوق پامال نہ کرے اور نہ ہی کسی ایک کو دوسری پر عملی طور پر ترجیح دے، یہ ہے واجب عادلانہ عمل کی صورت! اور مستحب یہ ہے کہ ان سب کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، ہر ایک کے ساتھ حُسنِ سلوک روا رکھے اور کسی کے ساتھ معاشرت کرنے میں بے رغبتی کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی کسی سے بداخلاقی کرے کیونکہ حُسنِ سلوک اور اچھی معاشرت واخلاق کریمہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت واسوۂ حسنہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ کرتے تھے۔

اہم نکتہ:

زیرنظر موضوع کی بابت ایک قول یہ ہے کہ اس آیت کا ذیلی فقرہ: ''فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' اس حقیقت کی دلیل ہے کہ جملہ ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ'' (اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں کر سکتے خواہ تم اس کی جس قدر ہر ممکن کوشش کرو) سے مراد ہر طرح سے عدل قائم رکھنے کی نفی نہیں کہ جس کی بناء پر جملہ ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً......... '' (اور اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو صرف ایک بیوی!) سے یہ مراد لیا جائے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت نہیں۔

لیکن یہ بات اس لئے درست نہیں کہ آیت کے ذیلی فقرہ: ''فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جملہ ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا......... '' (اور تم ہرگز ان کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتے) میں حقیقی وواقعی عدل کی نفی ہوئی ہے کہ جس میں کسی بھی صورت میں کسی حوالہ سے ترجیحی پہلو نہ پایا جاتا ہو اور وہ یوں کہ افراط وتفریط میں سے حقیقی درمیانی صورت اختیار کی جائے، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عملی طور پر ایسی روش اختیار کی جائے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ اسے حقیقی عدل کے بجائے تقریبی عدل کہا جاتا ہے، اور اسی کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہد رسالت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک سے زیادہ شادیاں ہونے اور مسلمانوں کے درمیان اس کی مروجہ صورت سے ملتا ہے۔

یہاں ایک اہم مطلب یہ بھی قابل توجہ ہے کہ ابتدائے آیت میں ایک سے زیادہ شادیوں (تعدّدِ ازواج) سے متعلق فقرہ ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'' (نساء، آیت: ۳) کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں صرف ایک خیالی وتصوراتی وفرضی چیز کا ذکر ہوا ہے ورنہ اس کی مصداقی صورت وجود میں نہیں آسکتی، تو یہ جاہلانہ وباطل نظریہ ہے کیونکہ کلام الٰہی

اس طرح کے بیانات سے بالاتر ہے، یعنی یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی بات کرے جس کا عملی طور پر وجود میں آنا محال ہو۔

اور آیت کے آخر میں فقرہ ''وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا'' میں مردوں کو ترغیب وتاکید کی گئی ہے کہ جب آپس میں بے رغبتی واختلاف کا ماحول بننے لگے تو اصلاح کی راہ اختیار کریں اور وہ اس طرح سے کہ تقویٰ اختیار کریں اور تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی طرف سے مغفرت ورحمت کے دروازے کھول دیتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ (وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا) سے پہلے ''وَالصُّلْحُ خَیْرٌ'' (اور صلح بہتر ہے) اور ''وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا'' (اور تم نیکی واحسان سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو) مذکور ہے۔

اگر طلاق واقع ہو!

○ ''وَ اِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ''

(اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ سب کو اپنی وسیع رحمت کے ذریعے بے نیاز کردے گا)

اس آیت میں شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی وطلاق واقع ہونے کی صورت میں خدائی عنایت کا تذکرہ ہوا ہے کہ اگر وہ آپس میں اکٹھے نہ رہ سکیں اور معاملہ جدائی وطلاق تک پہنچ جائے تب بھی ان دونوں پر اللہ کی رحمت میں کمی نہ آئے گی بلکہ اللہ انہیں اپنی وسیع رحمت سے نوازتے ہوئے ان کے تمام امور پورے کردے گا اور انہیں بے نیاز کردے گا، یہاں ''اغناء'' یعنی بے نیاز کردینے سے مراد تمام ازدواجی امور ہیں کہ جو ان کے درمیان پائے جاتے تھے مثلاً باہمی انس و الفت، مقاربت، لباس اور نان ونفقہ کہ جو مرد پر عورت کو دینا واجب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام امور میں ان کی کفایت فرمائے گا اور ان کی یہ تمام ضرورتیں پوری کردے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں کیا کہ اگر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو ان میں سے کسی کو زندگی بھر اپنا ساتھی اور شریک حیات مل ہی نہ سکے، ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک فطرتی حقیقت اور تخلیقی سنت ونظام ہے جو بنی نوع انسان کے افراد کے درمیان جاری وساری ہے کہ ہر فرد فطرتی طور پر اس کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وسیع رحمت وعظیم حکمت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا: ''وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا، وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ'' (اور اللہ وسیع رحمت والا، نہایت دانائی والا ہے، اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) یہ الفاظ اس بات کی حقیقی وجہ وسبب کو بیان کرتے ہیں جو فقرہ ''یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ'' (اللہ سب کو اپنی وسیع رحمت کے ذریعے بے نیاز کردے گا) تو اس بے نیاز کرنے کا سبب یہ ہے کہ اللہ اپنی وسیع

رحمت وعظیم حکمت کے ساتھ پوری کائنات کا مالک اور آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات پر کامل اختیار رکھتا ہے۔

تقوائے الٰہی اختیار کرنے کا تاکیدی حکم

○ ''وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ''

(اور ہم نے تاکید کی ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی تھی تم سے پہلے اور تمہیں بھی کہ تم تقوائے الٰہی اختیار کرو)

اس آیۂ مبارکہ میں لوگوں کو ازدواجی زندگی اور ہر حال میں تقوائے الٰہی اختیار کرنے کی تاکید مزید کی گئی ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تقویٰ کو ترک کرنا اللہ کی نعمت کا کفران ہے کیونکہ تقویٰ جو کہ اللہ کی اطاعت سے حاصل ہونے والی پاکیزہ صفت کا نام ہے وہ خدائی نعمتوں کی عملی شکرگزاری کے سوا کچھ نہیں، یا یہ کہ تقویٰ کو ترک کرنے کا سبب کفر کے سوا کچھ نہیں، خواہ ظاہری کفر ہو جیسا کہ کفار و مشرکین کا کفر ہے یا باطنی و پوشیدہ کفر ہو جیسا کہ فاسق مؤمنوں میں ہوتا ہے۔

ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے اس فقرے کا مطلب و معنیٰ بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہوا: ''وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ'' (اور اگر تم کفر اختیار کرو تو ـــــ جان لو کہ ـــــ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) یعنی اگر تم اس حکم پر عمل نہ کرو جو ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو دیا اور ہمارے تاکیدی فرمان کو نظرانداز کر کے تقویٰ اختیار نہ کیا تو وہ اللہ کا انکار اور کفر ہے یا اس کی نعمتوں کا کفران ہے، تاہم تمہارا ایسا کرنا اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اسے تمہاری اور نہ ہی تمہارے تقویٰ کی ضرورت ہے وہ تو آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات کا مالک و مختار ہے اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور لائق ستائش!

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر آیۂ مبارکہ کے حوالہ سے ایک سوال ممکن ہے کہ اس میں ایک ہی فقرہ یعنی ''لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ'' کو بار بار کیوں ذکر کیا گیا ہے چنانچہ اسے تین بار ذکر کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے ہر فقرہ ایک حوالہ رکھتا ہے اور وہ یہ کہ پہلا فقرہ اس فقرہ کی تعلیل یعنی اس کی وجہ وسبب کے بیان پر مشتمل ہے: ''وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیْمًا'' یعنی اللہ چونکہ وسیع رحمت و عظیم حکمت والا ہے لہٰذا اس کے لئے ہی

ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

اور دوسرا فقرہ دراصل اس شرط کے جواب کے مقام میں ہے جو ان الفاظ میں مذکور ہے ''وَاِنْ تَكْفُرُوْا'' (اگر تم کفر اختیار کرو) تو جان لو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر شے کا مالک ومختار ہے، یعنی اگر تم کفر اختیار کرو تو اللہ کو اس کی پروا نہیں کیونکہ وہ تم سے بے نیاز ہے اور اس کے ساتھ یہ فقرہ اس جواب کی وجہ بیان کرتا ہے جو ''وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا'' میں مذکور ہے۔ اور تیسرا فقرہ اپنی مستقل حیثیت کے ساتھ فقرہ ''اِنْ يَّشَاْ'' میں پائے جانے والے مفہوم کی حقیقی بنیاد کو واضح کرتا ہے۔

اللہ کی مالکیت و کامل اختیار

○ ''وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا''

(اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے، اور اللہ ہی سرپرستی کے لیے کافی ہے)

اللہ تعالیٰ کی مالکیت کا معنیٰ کئی مرتبہ ذکر ہو چکا ہے، اور وہ مضبوط سہارا اور سرپرست ہے جو اپنے بندوں کے تمام متعلقہ امور کا ذمہ دار ہے۔ اور وہی سرپرستی میں کافی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کسی معاون و مددگار کا محتاج نہیں، لہٰذا اگر کسی قوم کے اعمال پسند نہ ہوں اور وہ ان کے کردار سے راضی نہ ہو بلکہ ان کے اعمال اس کی ناراضگی کا باعث بنیں تو ان لوگوں کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کے اختیار و قدرت میں ہے کہ انہیں محو و نابود کر کے ان کی جگہ دوسری مخلوق کو لے آئے، انہیں عذاب میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دے اور دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ آباد کرے، یا یہ کہ انہیں پیچھے دھکیل دے اور دوسروں کو آگے لے آئے، اس مطلب کی تائید و تصدیق بلکہ دلیل و ثبوت اس آیت میں مذکور مطلب سے مربوط سیاق میں موجود ہے جو کہ بعد والی آیت کے اس جملہ میں پایا جاتا ہے: ''اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ'' (اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے (تباہ کر دے) اے لوگو!)۔

اللہ کی قدرت کاملہ

○ ''اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ''

(اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اے لوگو! اور دوسروں کو لے آئے)

ان آیات کا سیاق و اسلوب سخن جو کہ تقویٰ اختیار کرنے کی اس خدائی دعوت و حکم سے عبارت ہے جس کی تاکید اللہ نے اس امت اور ان سے پہلے اہل کتاب کو فرمائی، اس حقیقت کا ثبوت دیتا ہے کہ ''اِنْ يَّشَاْ'' کے الفاظ سے اللہ نے اپنے بے

نیاز ہونے اور کسی کا محتاج نہ ہونے کا جو اظہار فرمایا ہے وہ تقویٰ کے سلسلہ میں ہے۔ لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ نے تم سب کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے کہ اسے ہی ہر حال میں اپنے اعمال و زندگی کے تمام امور کی اساس و بنیاد قرار دو، اور اگر تم نے کفر اختیار کیا تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، اور وہ ہر چیز کا مالک ہے، وہ ہر شے میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے، اور جب اس نے چاہا یا چاہے اس کی پرستش کی جائے اور اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے لیکن لوگ اس کا یہ حق ادا نہ کریں اور صحیح طور پر اس کی بابت قیام و اقدام نہ کریں تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں پیچھے اور ان دوسروں کو آگے کر دے کہ جو وہی کچھ کریں جو اسے پسند ہو اور جس سے وہ راضی ہو، اور اللہ ایسا کرنے پر بھرپور قدرت رکھتا ہے۔

بنابرایں یہ آیت لوگوں کی تبدیلی کے اشاراتی تذکرہ پر مشتمل ہے کہ غیر متقی لوگوں کی جگہ متقی لوگ آ جائیں جو کہ فکری و عملی تقویٰ کے حامل ہوں، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک روایت تفسیر بیضاوی میں بھی مذکور ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک سلمان فارسی کی پشت پر مارا اور فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم، (یعنی جو غیر متقی لوگوں کی جگہ پر آئے ہیں) اس سے مذکورہ معنی کی تائید ہوتی ہے، اس پر مزید تدبر و غور و فکر کرنا قارئین کرام کی اپنی ذمہ داری ہے۔

اور اس سلسلہ میں بعض مفسرین نے جو احتمال وممکنہ نظریہ پیش کیا ہے کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تمہیں نیست و نابود کر دے اور تمہاری جگہ دوسری مخلوق جو کہ غیر انسان ہوں لے آئے، تو یہ آیت کے سیاق سے مطابقت نہیں رکھتا، البتہ یہ بات درج ذیل آیت سے سمجھی جا سکتی ہے:

○ سورۂ ابراہیم، آیت: ۱۹ تا ۲۰

''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝''

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق خلق کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے، اور ایسا کرنا اللہ پر سخت و دشوار نہیں)

دنیا وآخرت کا اجر وثواب

○ ''مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا''

(جو شخص دنیا کا اجر وثواب چاہے تو اللہ کے پاس دنیا وآخرت دونوں کا اجر وثواب موجود ہے، اور اللہ سب کچھ دیکھنے اور جاننے والا ہے)

اس فقرے میں دوسرے الفاظ کے ساتھ اس شخص کی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے جو تقوائے الٰہی کو ترک کرے اور

اللہ کے تاکیدی ارشاد کو نظر انداز کر دے کہ اگر وہ ایسا کرے کہ صرف دنیا کا اجر چاہے اور اسی کی لذتیں حاصل کرنے کا متمنی و خواہاں ہو تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے کیونکہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا اجر وثواب موجود ہے اور سب کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے تو اس شخص کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنی نظریں نہایت پست چیز کی طرف رکھتا ہے اور اس سے بہتر و برتر یا دونوں کا طلبگار کیوں نہیں ہوتا؟

یہ بھی ایک قول ہے لیکن اس سے زیادہ مضبوط رائے یہ ہے ____ واللہ اعلم ____ کہ یہاں اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ دنیا و آخرت اور ان دونوں کی سعادت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لہٰذا اسی سے وابستہ ہونا چاہیے اور اسی کا تقرب اختیار کرنا چاہیے یہاں تک کہ جو شخص صرف دنیاوی زندگی میں اجر وثواب اور سعادت کا خواہاں ہو وہ بھی خدا ہی سے وابستہ ہو کیونکہ حقیقی سعادت تقوائے الٰہی کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتی اور تقویٰ کا حصول اللہ کے دین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ نے اس دین کو اپنی مخلوق کے لئے مقرر فرمایا ہے لہٰذا دین، حقیقی سعادت ہی کا راستہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں، تو کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی عطا وعنایت کے بغیر کسی اجر وثواب سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتا ہے اور اللہ ہی ہے جو سب کچھ بخوبی سننے والا ہے اور ہر شے سے بخوبی آگاہ ہے۔

روایات پر ایک نظر

زمانۂ جاہلیت کی رسموں کا بُطلان

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر اور ابن منذر نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: زمانۂ جاہلیت میں صرف بالغ مرد ہی وراثت کا حقدار بنتا تھا کیونکہ وہ مال کی دیکھ بھال اور اسے استعمال میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے، لہٰذا نابالغ اور عورت کو وراثت میں کچھ بھی نہ ملتا تھا، جب وراثت کے بارے میں سورۂ نساء کی آیات نازل ہوئیں تو لوگوں پر شاق گزرا اور وہ کہنے لگے کہ کیا بچہ بھی میراث میں حصہ پائے گا جبکہ وہ مال کی دیکھ بھال کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور یہی حال عورت کا ہے ، تو کیا وہ دونوں اسی طرح وارث قرار پائیں گے جس طرح مرد وارث بنتا ہے، چنانچہ وہ کسی آسمانی ندا کے منتظر ہو گئے کہ کوئی نیا حکم نازل ہو جو اس حکم کو منسوخ کر دے، مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ اس سلسلہ میں کوئی نیا حکم آنے والا نہیں تو کہنے لگے: اگر یہی حکم قطعی ہے تو اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں، پھر اُنہوں نے آپس میں مشورہ

کیا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی اس کی بابت دریافت کریں چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: ''وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ..... ''
(وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں اُن کے بارے میں حکم صادر کرتا ہے اور جو کچھ تمہارے سامنے کتاب میں پڑھا جاتا ہے) یعنی ان یتیم عورتوں کے بارے میں ابتدائے سورہ میں حکم مذکور ہے جنہیں تم ان کے واجب شدہ حقوق وحصے نہیں دیتے اور ان سے شادی کرنے سے منہ موڑتے ہو۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۲۳۱)

اسی تفسیر میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید اور ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی شخص فوت ہوتا تو اس کے وارثوں میں اگر کوئی چھوٹی یتیم بچی ہوتی کہ جو بدصورت ہوتی تو وہ اسے میراث میں سے کچھ بھی نہ دیتے تھے اور اسے شادی نہ کرنے دیتے تھے یہاں تک کہ وہ مرجاتی اور وہ اس کا مال ہڑپ کر لیتے تھے ـــــــ اس کی شادی میں اس لئے ممانعت کرتے تھے کہ وہ جب مرے گی تو اس کا مال ہڑپ کرلیں گے۔ تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل متعدد روایات شیعہ وسنی اسناد سے ذکر ہوئی ہیں کہ جن میں سے بعض روایات اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر کے ابتدائی صفحات میں ذکر ہو چکی ہیں۔

امام محمد باقرؑ کا فرمان

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ ''الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ اس میں ''مَا كُتِبَ لَهُنَّ'' سے مراد ان کا وراثت میں مقررہ حصہ ہے۔ یہ بیان حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے (مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۱۱۸)

ابن مسلمہ کی بیٹی کا واقعہ

تفسیر ''قمی'' میں آیۂ مبارکہ ''وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا........ '' کے شان نزول کی بابت مذکور ہے کہ یہ آیت محمد بن مسلمہ کی بیٹی کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ رافع بن خدیج کی زوجہ تھی، جب وہ بوڑھی ہوگئی تو رافع نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر کے اس پر سوکن ڈال دی، اور وہ نوجوان لڑکی محمد بن مسلمہ کی بیٹی سے زیادہ رافع کے دل میں جگہ کر گئی اور وہ اسے اس سے زیادہ پسند کرتا تھا، محمد بن مسلمہ کی بیٹی نے رافع سے کہا: کیا ایسا نہیں ہے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتے اور اپنی جوان بیوی کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو؟ رافع نے جواب دیا کہ ہاں، وہ تو نوجوان عورت ہے اور مجھے بہت پسند ہے، میں اسے

تم سے زیادہ چاہتا ہوں، لیکن اگر تم چاہو تو ہم اس طرح طے کر لیتے ہیں کہ میں دو یا تین دن اس کے پاس رہوں اور ایک دن تمہارے پاس رہوں، محمد بن مسلمہ کی بیٹی نے اس کی تجویز مسترد کر دی اور اس پر راضی نہ ہوئی، تو رافع نے اسے طلاق دے دی، پھر دوبارہ طلاق دی تو اس نے کہا: قسم بخدا، میں ہرگز اس بات پر راضی نہ ہوں گی کہ تم میرے اور اس کے درمیان برابری قرار دو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ'' (اور دلوں کو بخل سے نزدیک تر کر دیا گیا) محمد بن مسلمہ کی بیٹی اپنا حصہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی اور اس پر بخل سے کام لیا، تو رافع نے اسے پیشکش کی کہ یا وہ راضی ہو جائے یا وہ اسے تیسری طلاق دے، ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے، اس خاتون نے اپنے حق کی بابت اپنے شوہر کے ساتھ بخل کیا اور راضی ہو کر اس سے مصالحت کر لی، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ'' (ان کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ آپس میں اچھی طرح صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے) لیکن جب وہ راضی ہو گئی اور اس سے صلح کر لی اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی تو وہ ان دونوں کے درمیان عدل قائم نہ کر سکا تو یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' (اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتے خواہ جس قدر کوشش کرو، لہٰذا تم پورے طور پر بے رغبتی کا مظاہرہ نہ کرو کہ زوجہ کو بے سہارا و سرگرداں چھوڑ دو) یعنی ایسا نہ ہو کہ ان میں سے ایک کو تو گلے لگائے رکھو اور دوسری کو یکسر چھوڑ دو کہ نہ بیوہ ہو اور نہ ہی شوہر والی ہو، یہی طریقہ و طرزِ عمل اس صورت میں بھی ملحوظ و معمول ہو گا جب عورت اپنی ازدواجی زندگی کا سلسلہ جاری رکھنے اور شوہر کے پیش کردہ مصالحتی امور پر راضی ہو تو اس صورت میں نہ عورت پر اور نہ ہی مرد پر کوئی گناہ نہیں ہو گا لیکن اگر عورت اس کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کا سلسلہ جاری رکھنے پر راضی نہ ہو تو اس کا شوہر یا اسے طلاق دے دے یا اس کے اور دوسری زوجہ کے درمیان برابری کا سلوک کرے، اس کے علاوہ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ (تفسیر ''قمی'' جلد اول، صفحہ ۱۵۴)

اس روایت کو تفسیر ''درمنثور'' (جلد ۲ صفحہ ۲۳۲) میں بھی مالک، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور حاکم (کہ انہوں نے اسے صحیح السند قرار دیا ہے) کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

امام علیؑ کا ارشاد گرامی قدر

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ طیالسی، ابن ابی شیبہ، ابن راھویہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور بیہقی نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اُن سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا: وہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کی دو بیویاں ہوں کہ جن میں سے ایک بوڑھی ہو یا بدصورت ہو اور وہ اس سے جدا ہونا چاہے مگر وہ اس کے ساتھ اس طرح مصالحت کر لے کہ وہ ایک شب اس کے پاس رہے اور دیگر راتیں دوسری بیوی کے پاس رہے اور

اس طرح اسے طلاق نہ دے، لہٰذا اگر وہ عورت راضی خوشی اسے قبول کرلے تو ٹھیک، ورنہ وہ ان دونوں کے درمیان برابری کا برتاؤ کرے۔(تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۳۲)

مصالحت کی بہتر صورت

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حلبی کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے آنجناب سے اس آیت کا معنٰی دریافت کیا: ''وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا'' تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا شوہر اسے ناپسند کرتا ہو اور اس سے کہے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں، وہ عورت اس سے کہے کہ ایسا نہ کرو کیونکہ مجھے پسند نہیں کہ لوگ مجھے طعنے دیں اور میں ان کے سامنے شرمندہ ہوں، البتہ تم ایسا کرو کہ میرے ساتھ شب باشی کے حوالہ سے تم جو چاہو خود ہی فیصلہ کرلو اور اس کے علاوہ دیگر امور و اوقات میں اپنے اختیار کے ساتھ عمل کرو اور مجھے اسی طرح اپنے عقد میں باقی رکھو، اسی مطلب کا ذکر اس فقرہ میں ہوا ہے: ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا'' (ان کے لئے کوئی حرج نہیں کہ آپس میں مصالحت کرلیں) اور یہی ہے صلح کا طریقہ! (فروع کافی، جلد ۶ صفحہ ۱۴۵)

اس مطلب پر مشتمل دیگر روایات بھی موجود ہیں جو کافی اور تفسیر العیاشی وغیرہ میں ذکر کی گئی ہیں۔

تفسیر قمی میں ''وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہر نفس میں بخل پایا جاتا ہے مگر کوئی اسے اختیار کرتا ہے اور کوئی اسے اختیار نہیں کرتا (تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۵۵)

عدل کا مورد

ہشام بن سالم سے روایت منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ'' (اور تم عورتوں کے درمیان ہرگز عدل قائم نہیں کرسکتے خواہ جس قدر کوشش کرو) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مودت و محبت اور قلبی لگاؤ میں عدل مراد ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۷۹)

ایک سے زیادہ شادیوں کا مسئلہ

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے نوح بن شعیب اور محمد بن حسن کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ ابن ابی العوجاء نے ہشام بن حکم سے کچھ سوالات کئے کہ جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ آیا خداوند عالم حکیم و دانا نہیں؟ ہشام نے

جواب دیا: ہاں وہ احکم الحاکمین ہے۔ ہر دانا سے زیادہ دانا تر ہے۔ ابن ابی عوجاء نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے: ''فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' (پس تم عورتوں میں جو تمہیں بھلی لگیں ان سے شادی کرو دو اور تین اور چار، اور اگر تم عدل نہ کرنے سے ڈرتے ہو تو پھر ایک ہی سے شادی کرو) تو کیا خدائی حکم نہیں؟ ہشام نے کہا: ہاں، یہ خدائی حکم ہے، یعنی تم ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتے ہو، ابن ابی العوجاء نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد خداوند عالم کے اس فرمان کا مطلب کیا ہے: ''وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا کَالْمُعَلَّقَةِ'' (اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں کر سکتے خواہ جس قدر کوشش کرو، پس تم ان میں سے کسی سے کلی طور پر بے رغبتی و لاتعلقی نہ کرو کہ اسے بے سہارا چھوڑ دو) تو یہ دونوں باتیں ایک دوسری سے متصادم ہیں اور کون سا دانا ایسی باتیں کر سکتا ہے؟ ایک طرف تو عدل قائم کرنے کی شرط پر دو، تین اور چار شادیوں کی اجازت دے اور دوسری طرف یہ کہے کہ تم ہرگز عدل نہیں کر سکتے؟ ہشام اس کی اس بات کا جواب نہ دے سکے اور فوراً مدینہ روانہ ہو گئے، اور حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، امامؑ نے ہشام سے پوچھا کہ آپ حج و عمرہ کے موسم کے علاوہ مدینہ آئے ہیں؟ خیریت تو ہے؟ ہشام نے عرض کی: ہاں آقا، میری جان آپ پر قربان ہو، ایک نہایت اہم کام کے لئے حاضر ہوا ہوں اور وہ یہ کہ ابن ابی العوجاء نے ایک مسئلہ مجھ سے پوچھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا، امامؑ نے فرمایا: وہ کیا مسئلہ ہے؟ ہشام نے سارا ماجرا امامؑ کی خدمت میں ذکر کر دیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جہاں تک اس فقرے کا تعلق ہے: ''فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' تو اس میں عدل سے مراد نان ونفقہ میں عدل کرنا ہے، اور جہاں تک اس فقرہ کا تعلق ہے: ''وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا کَالْمُعَلَّقَةِ'' تو اس میں عدل سے مراد محبت و مودت اور قلبی لگاؤ میں عدل کرنا ہے۔

امامؑ کا جواب سن کر ہشام نے واپس آ کر ابن ابی العوجاء کو بتایا تو اس نے کہا: خدا کی قسم! یہ بات تیری اپنی نہیں۔ (فروع کافی، جلد پنجم، صفحہ ۳۶۲)

اسی طرح کی ایک روایت تفسیر قمی میں بھی مذکور ہے کہ کسی دہریے نے ابوجعفر الاحول سے یہی مسئلہ پوچھا تو وہ فوراً مدینہ آیا اور امام جعفر صادقؑ سے اس کا جواب مانگا، امامؑ نے وہی جواب دیا جو ہشام کو دیا تھا، ابوجعفر نے واپس آ کر اس دہریہ کو بتایا تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ جواب تم حجاز سے لے کر آئے ہو (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۵۵)

تفسیر مجمع البیان میں آیہ مبارکہ ''فَتَذَرُوْهَا کَالْمُعَلَّقَةِ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم جس عورت کو ناپسند کرتے ہو اسے اس طرح چھوڑ دو کہ جیسے نہ تو وہ شوہر دار ہو اور نہ ہی بیوہ ہو، مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ روایت حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں سے منقول ہے۔

اور اسی کتاب (تفسیر مجمع البیان) میں مذکور ہے کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایام ازواج کے درمیان تقسیم فرماتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے: **اللّٰھم ھٰذہ قسمتی فیما املك فلا تلمنی فیما تملك ولا املك**، اے اللہ! یہ تقسیم میری اس چیز میں ہے جس کا میں مالک ہوں (یعنی میرے اختیار میں ہے) اور جس چیز میں تو مالک و مختار ہے اور اس میں میرا کوئی اختیار نہیں اس میں میرا مؤاخذہ نہ کرنا (مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۱۲۱)

اس روایت کو اکثر محدثین نے متعدد اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ "**ما تملك ولا املك**" (جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں) سے مراد قلبی محبت ہے، البتہ یہ روایت شبہ سے خالی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ کسی کا مؤاخذہ اس چیز کی بابت کرے جو اس کے اختیار ہی میں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا" (سورۂ طلاق، آیت: ۷) اللہ کسی کو بھی کوئی ذمہ داری نہیں دیتا مگر صرف اسی حد تک کہ جو اس نے اسے اس کی ادائیگی کی توانائی دی ہو، اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر بلند و عظیم ہے تو وہ اپنے پروردگار کے مقام و منزلت سے بخوبی آگاہ ہیں اور وہ کیونکر اپنے رب سے اس طرح کی دعا کر سکتے ہیں۔

عاصم بن حمید کی روایت

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابن ابی لیلیٰ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: عاصم بن حمید نے بیان کیا کہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر تھا کہ ایک شخص امامؑ کی خدمت میں آیا اور آپؑ سے اپنے فقر و ناداری کی شکایت کی، امامؑ نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا، اس نے شادی کر لی مگر اس کے فقر و ناداری میں اضافہ ہو گیا اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور امامؑ کی خدمت میں آیا تو امامؑ نے اس سے اس کا حال پوچھا تو اس نے اپنی حالتِ زار بیان کی، امامؑ نے فرمایا: اس سے جدا ہو جا، چنانچہ اس نے امامؑ کے حکم کے مطابق عمل کیا اور اسے چھوڑ دیا، پھر امامؑ کی خدمت میں آیا تو امامؑ نے اس کا حال پوچھا، اس نے عرض کی کہ اب میری حالت بہت اچھی ہے اور میں مالدار بن گیا ہوں، امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: میں نے تجھے دو کاموں کا حکم دیا تھا کہ جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، ایک یہ کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: "وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (سورۂ نور، آیت: ۳۲) اور تم اپنے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو غیر شادی شدہ نیک افراد ہوں ان کی شادی کر دو کہ اگر وہ فقیر و نادار ہوئے تو اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں غنی کر دے گا اور اللہ وسیع رزق دینے والا، نہایت آگاہ ہے، اور دوسرا یہ کہ اس نے ارشاد فرمایا: "وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ" (اور اگر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ان سب کو اپنی وسیع رحمت سے غنی کر دے گا) سورۂ نساء، آیت: ۱۳۰

آیت ۱۳۵

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

ترجمہ

○ ''اے ایمان والو! عدل قائم کرنے والے بنو، اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو خواہ وہ تمہارے لئے یا تمہارے والدین و قریبیوں کے لئے نقصان دہ کیوں نہ ہو، اگر وہ غنی و مالدار ہو یا فقیر و نادار ہو مگر اللہ ان دونوں سے اولیٰ (مقدم، برتر و بالاتر) ہے، پس تم نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ کہیں حق سے منحرف و روگرداں نہ ہو جاؤ، اور اگر تم گواہی میں رد و بدل کرو یا گواہی دینے سے منہ موڑو تو اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے''

(۱۳۵)

تفسیر و بیان

قیام عدل کا تاکیدی حکم

○ ''یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ''

(اے ایمان والو! قیام عدل کے رسیا بن جاؤ، اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو)

لفظ ''قسط'' کا معنی عدل و انصاف ہے، اور عدل قائم کرنے سے مراد اس پر عمل کرنا اور اسی کی پاسداری و تحفظ کا اقدام کرنا ہے۔ لہٰذا ''قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ'' سے مراد، عدل قائم کرنے والے ہیں کہ جو کامل و مکمل عدل قائم کریں، ہر جہت میں عدل، ہر حال میں عدل، ہر چیز میں عدل، قول و فعل میں عدل، عدل ہی عدل، اور سراسر عدل و یکسر عدل، اور قیام عدل میں کوئی چیز ان کا راستہ نہ روک سکے مثلاً نفسانی خواہشات، جذبات و احساسات، خوف و طمع یا دیگر عوامل قیام عدل میں مانع نہ بن سکیں۔

قیام عدل ایک ایسی پاکیزہ صفت ہے جو انسان کو یقینی اور کامل طور پر حق کی پیروی کرنے اور اسے پامال ہونے سے بچانے کے مضبوط ترین عوامل و قوی ترین اسباب میں سے ہے، اور اس کی فرع و عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدل قائم کرنے والا شخص ہمیشہ و ہر حال میں سچ بولتا ہے اور سچی گواہی دیتا ہے بلکہ سچی گواہی کا علمبردار بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت آیۂ مبارکہ کی کلامی ترتیب و ترکیب سے ملتا ہے کہ اس کی ابتدا ہی قیام عدل کے حکم سے ہوئی ہے جبکہ اس آیت کا اصل موضوع ''حق کی گواہی'' ہے لیکن گواہی کا ذکر بعد میں اور قیام عدل کا ذکر پہلے ہوا، تو یہ تدریجی بیان یا بیان کی تدریجی صورت ہے کہ پہلے ایک عمومی صفت کا تذکرہ ہوا اس کے بعد اس کی ایک فرع یا عملی نتیجہ کو ذکر کیا گیا، گویا یوں کہا گیا: ''**کونوا شهداء لله، ولا يتيسر لكم ذلك الا بعد ان تكونوا قوامين بالقسط فكونوا قوامين بالقسط حتى تكونوا شهداء لله** (تم اللہ کے لئے گواہ بنو، اور یہ کام تمہارے بس میں نہیں جب تک کہ عدل قائم کرنے والے نہ بنو، لہٰذا عدل قائم کرنے والے بنو تاکہ خدا کے لئے گواہی دینے والے بن سکو)۔

اور فقرہ ''شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'' سے حرف لام غرض و مقصد کا معنیٰ دیتا ہے۔ یعنی تم ایسے گواہ بنو کہ تمہاری گواہی اللہ کے لئے ہونی چاہیے۔ گواہی دینے میں تمہارا مقصد خدا ہی خدا ہو اس کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ اس کی مثال سورۂ طلاق کی آیت ۲ میں موجود ہے۔ جہاں ارشادِ حق تعالیٰ ہوا: ''**واقيموا الشهادة لله**'' (اور تم اقامۂ شہادت کرو اللہ کے لئے) اور اللہ کے لئے گواہی

دینے کا مطلب یہ ہے کہ گواہی کا مقصد حق کا اتباع و پیروی اور اس کا اظہار و احیاء ہے جیسا کہ فقرہ ''فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا'' (اور نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو ورنہ حق سے روگرداں ہو جاؤ گے) سے اس مطلب کی وضاحت ہوتی ہے۔

حق کی گواہی کا مطلق حکم

○ ''وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ''

(خواہ وہ تمہارے یا والدین وقرابتداروں کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو)

اس فقرے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حق کی گواہی دو خواہ اس سے تمہارے، تمہارے والدین اور قریبیوں کے مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے مفادات کا تحفظ یا والدین وقریبیوں کی محبت تمہیں حق کی گواہی دینے سے روکے اور تم حق بات کرنے سے گریز کرو۔ بنا برایں اپنے یا والدین وقرابتداروں____ قریبیوں____ کے خلاف گواہی دینے سے مراد یہ ہے کہ جو بات یا واقعہ تمہیں معلوم ہو اور اس کی گواہی دینے لگو اور وہ اصل بات کہنا تمہارے یا تمہارے والدین اور قریبیوں کے لئے نقصان دہ ہو تو اس کی پروا نہ کرو خواہ تم جس کے خلاف گواہی دے رہے ہو اسے بالواسطہ نقصان پہنچے یا بلا واسطہ نقصان پہنچے، بلا واسطہ نقصان کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کا والد اور کوئی دوسرا شخص آپس میں تنازعہ و جھگڑا رکھتے ہوں اس صورت میں اس دوسرے شخص کے حق میں گواہی دینا والد کے نقصان کا باعث ہوگا۔ تو اس کی پروا نہ کرے اور حق بات کہہ دے اور بالواسطہ نقصان کی مثال یہ ہے کہ دو اشخاص آپس میں نزاع و جھگڑا کر رہے ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف گواہی دینا جو کہ حق وحقیقت پر مبنی ہو۔ اس سے عین ممکن ہے کہ گواہی دینے والے کو بھی نقصان پہنچے اور دوسرے فریق کی طرح اسے بھی نقصان کا سامنا ہو، مگر اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہر صورت میں حق کی گواہی دینی چاہیے۔

اللہ سب سے بڑا غنی ہے

○ ''اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا''

(اگر وہ غنی و مالدار ہو یا فقیر و نادار ہو، مگر اللہ ان دونوں سے بالاتر و برتر ہے)

اس فقرے میں ''بِهِمَا'' کی ضمیر (هما) غنی وفقیر دونوں کی طرف لوٹتی ہے جبکہ آیت کے الفاظ میں حرف ''واؤ''

(اور) کی بجائے حرف ''اَوْ'' ذکر ہوا ہے جس کا معنیٰ ''یا'' ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ''غنی'' اور ''فقیر'' سے مراد فرضی طور پر ان کا دو ہونا ہے نہ کہ حقیقی طور پر! یعنی جس کے حق میں گواہی دی جائے خواہ وہ غنی ہو یا فقیر ہو، اس میں دو شخص مراد نہیں بلکہ ایک ہی شخص کی دو حالتیں ذکر کی گئی ہیں کہ ایک صورت میں وہ غنی اور دوسری میں فقیر و نادار ہو، تو فرضی صورت میں ایسا کیا گیا ہے نہ یہ کہ حقیقی و واقعی صورت میں کسی معین شخص کے بارے میں ایسا کہا گیا ہو، لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جس کے لئے گواہی دی گئی ہو خواہ وہ غنی و مالدار ہو یا فقیر و نادار، خداوند عالم اس کے غنی ہونے کے باوجود اس سے اولیٰ ہے اور اس کے نادار ہونے کے باوجود اس سے اولیٰ ہے۔

بنابرایں آیت کا مرادی معنیٰ یہ کیا جائے گا ـــــــ واللہ اعلم ـــــــ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں کسی غنی و مالدار کا مالدار ہونا حق کی گواہی دینے سے مانع ہو جائے یا کسی کا فقیر و نادار ہونا اس سے ہمدردی کی بناء پر تمہیں حق بات کہنے اور حق کی گواہی دینے سے روکے، بلکہ تم ہر صورت میں اللہ کے لئے گواہی دو (حق کا ساتھ دو اور حق بیان کرو) اور جب معاملہ اللہ اور اس شخص خواہ غنی و مالدار ہو یا فقیر و نادار کے درمیان ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان دونوں (غنی و فقیر) سے زیادہ مہربان اور مقدم ہے، اور یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے حق کی پیروی کو واجب و لازم قرار دیا ہے اور قیام عدل کی دعوت دی ہے، (عدل قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور اسی قیامِ عدل اور اتباع حق ہی کے نتیجہ میں نوع انسانی کی سعادت یقینی ہوتی ہے کہ جس سے غنی و مالدار مزید قوی و مستحکم ہو جاتا ہے اور فقیر و نادار کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک ایسا ہے کہ اگر کسی واقعہ و سلسلہ میں اس کے حق میں غلط گواہی دی جائے تو اسے اس میں فائدہ حاصل ہو سکتا ہے یا ایک سے زیادہ متعدد واقعات و سلسلوں میں اس کے لیے دی جانے والی ناحق گواہی کا فائدہ اسے پہنچے لیکن ان ناحق گواہیوں کے نتیجہ میں معاشرتی طور پر حق کمزور اور عدل و انصاف کی امیدیں دم توڑ جائیں گی اور پھر صورتحال یہ ہو جائے گی کہ باطل طاقتور اور ظلم و جور کا دور دورہ ہوگا جو کہ ناقابل علاج بیماری اور انسانیت کی ہلاکت و تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

خواہشوں کی پیروی کی ممانعت

○ ''فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا''

(پس تم نفسانی خواہشوں کا اتباع نہ کرو کہ کہیں عدل سے روگرداں نہ ہو جاؤ)

اس فقرہ میں یہ مطلب مقصود ہے کہ تم نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو کیونکہ اس میں یہ اندیشہ اور خوف پایا جاتا

ہے کہ اس کے نتیجہ میں کہیں حق سے روگردانی کے مرتکب نہ ہو جاؤ اور قیام عدل کا راستہ ہی چھوڑ دو، لہٰذا ''اَنْ تَعْدِلُوْا'' عبارت میں ''**مفعول لهٗ**'' قرار پائے گا، جس کے ذریعے اس کام کی غرض و مقصد کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر حرف جر (لام) فرض کر کے فہم المراد کے لئے یوں پڑھا جائے: ''**لان تعدلوا**'' اس صورت میں اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم نفسانی خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ حق سے منحرف ہو جاؤ۔

حق کی گواہی دینے سے روگردانی

○ ''وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا''

(اور اگر تم نے ہیر پھیر کی یا گواہی دینے سے منہ موڑا، تو اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

''تَلْوٗٓا'' کا مصدر ''لیّ'' ہے اور شہادت و گواہی دینے میں اس سے مراد تحریف اور ہیر پھیر کرنا ہے، یہ ''**لی اللسان**'' یعنی زبان کو پھیر کر بات کرنے کے معنیٰ میں ہے، لہٰذا فقرہ ''وَاِنْ تَلْوٗٓا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم نے دیکھا اور تمہیں معلوم ہوا اگر اس میں ردّ و بدل کر کے گواہی دو، اور فقرہ ''اَوْ تُعْرِضُوْا'' کا معنیٰ سرے سے گواہی نہ دینا ہے۔

بعض حضرات نے ''وَاِنْ تَلْوٗٓا'' کو لام پر پیش اور واو پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور کہا ہے کہ ''**وَلِیَ یَلِیْ**'' یعنی ''ولایت'' سے مشتق ہے، لہٰذا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر گواہی دینے کا معاملہ تمہارے اختیار میں آجائے اور تم اسے اچھی طرح ادا کرو یا اس سے روگرداں ہو جاؤ دونوں صورتوں میں اللہ تمہارے ہر عمل سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

مؤمن کے مؤمن پر حقوق

تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشادِ گرامی قدر مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''**ان للمؤمن علی المؤمن سبع حقوق، فاوجبها ان یقول الرجل حقاً ولو کان علیٰ نفسه او علیٰ والدیه فلا یمیل لهم**

عن الحق'' (مومن کے مؤمن پر سات حقوق ہیں جن میں سے سب سے زیادہ واجب حق یہ ہے کہ اس سے حق بات کرے، سچ بولے خواہ اس سے خود اسے یا اس کے والدین کو نقصان پہنچے، لہٰذا ان کی وجہ سے حق سے منہ موڑنا درست نہیں) اس وقت امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا'' اور فرمایا کہ فقرہ ''اَنْ تَعْدِلُوْا'' سے مراد حق سے منہ موڑنا ہے (تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۵۶)

اس روایت میں شہادت و گواہی دینے کے معنیٰ کا دائرہ وسیع ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں صرف گواہی دینا ہی نہیں بلکہ ہر بات کرنا شامل ہے۔ اور یہ مطلب فقرہ ''كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ'' (تم عدل قائم کرنے والے بنو) کے تناظر میں ملحوظ ہے۔

امام محمد باقرؑ سے منقول بیان

تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ فقرہ ''اِنْ تَلْوٗٓا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم تبدیل کرو اور اس میں رد و بدل کرو، اور فقرہ ''اَوْ تُعْرِضُوْا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ ''یا تم گواہی کو چھپاؤ''

یہ بات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے (تفسیر ''مجمع البیان'' جلد سوم، صفحہ ۱۲۸)

آیات ۱۳۶ تا ۱۴۷

○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

○ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَۨا ﴿۱۳۸﴾

○ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

○ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ﴿۱۴۰﴾

○ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ

قَالُوٓا اَلَمۡ نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَيۡكُمۡ وَنَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

○ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ ۚ وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۴۲﴾

○ مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ اَتُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۴۴﴾

○ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا ﴿۱۴۵﴾

○ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَاَخۡلَصُوۡا دِيۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ وَسَوۡفَ يُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۴۶﴾

○ مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيۡمًا ﴿۱۴۷﴾

ترجمہ

- ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے، اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل کی، اور جو شخص انکار کرے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہوا۔''

(۱۳۶)

- ''جو لوگ ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، اللہ انہیں نہ تو معاف کرے گا اور نہ ہی انہیں ہدایت کا راستہ دکھائے گا۔''

(۱۳۷)

- ''منافقوں کو خبردار کر دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے۔''

(۱۳۸)

- ''وہ (منافق) مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں، کیا وہ عزت حاصل کرنے کے خواہاں و کوشاں ہیں، حالانکہ عزت تو سب کی سب اللہ کے لئے ہے''

(۱۳۹)

○ ''اور اللہ نے تو کتاب میں یہ حکم نازل کر دیا ہے کہ تم جب سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ایسا کرنے والوں کے ساتھ مت بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسری بات میں مصروف نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے، یقیناً اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکٹھا کرنے والا ہے''

(۱۴۰)

○ ''وہ (منافقین) تمہاری حالت کے منتظر رہتے ہیں کہ اگر اللہ تمہیں فتح و کامیابی سے نوازے تو وہ کہتے ہیں کہ آیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی مل جائے تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر قابو نہ پا سکتے تھے اور کیا ہم نے تمہیں ایمان لانے والوں سے بچایا نہیں ہے؟ پس اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ کافروں کو مؤمنوں پر ہرگز غالب نہیں کرتا''

(۱۴۱)

○ ''منافقین اپنے تئیں اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ اللہ انہیں خود ان کے فریب میں مبتلا کر دیتا ہے، اور وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نہایت سستی ــــــ بے رغبتی ــــــ کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، وہ ریا کاری کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم''
(۱۴۲)

○ ''وہ تذبذب کا شکار ہیں، نہ ان (مومنوں) کی طرف ہیں اور نہ ہی ان (کافروں) کی طرف ہیں، اور اللہ جسے راہِ حق سے دوری کی راہ میں چھوڑ دے تو آپ اس کے لئے کوئی راستہ نہیں پا سکتے''
(۱۴۳)

○ ''اے ایمان والو! تم مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ خود ہی اللہ کے پاس اپنے خلاف ثبوت اور واضح دلیل قرار دو''
(۱۴۴)

○ ''منافقین تو یقیناً جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور آپ کسی کو ان کا مددگار نہیں پائیں گے''
(۱۴۵)

○ ''سوائے ان لوگوں کے کہ جو توبہ کریں، اپنی اصلاح کریں اور اللہ سے وابستہ رہیں اور اپنے دین کو خاص طور پر اللہ کے لئے قرار دیں تو ایسے لوگ مومنین کے ساتھ ساتھ ہوں گے، اور اللہ بہت جلد مومنین کو عظیم اجر عطا کرے گا''
(۱۴۶)

○ ''اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان پر قائم رہو تو اللہ کو تمہیں عذاب دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اللہ تو خود شاکر اور ہر شے سے بخوبی آگاہی رکھنے والا ہے''
(۱۴۷)

تفسیر و بیان

دو مرتبہ ایمان لانے کا حکم

○ ''یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ''

(اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی)

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں (مؤمنین) کو دوبارہ ایمان لانے کا حکم دیا ہے، دوبارہ ایمان لانے کے حکم کا ثبوت دو باتوں سے ملتا ہے، پہلی یہ کہ دوسرے ایمان سے مربوط امور کی تفصیل ذکر کی گئ ہے اور یوں ارشاد ہوا: ''اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ..... الخ'' (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی) اور دوسری بات یہ کہ ان چیزوں میں سے کسی ایک پر ایمان نہ لانے کے سنگین نتائج بیان کئے گئے ہیں اور یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا'' (اور جو شخص انکار کرے اللہ کا، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا، اور آخرت کے دن کا، تو وہ سخت گمراہی سے دوچار ہوا) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے ایمان سے مراد اجمالی طور پر ان امور پر ایمان لانا ہے اور دوسرے ایمان سے مراد ان تمام امور پر تفصیلی ایمان لانا ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں ذکر کئے گئے ہیں، بنا برایں اس آیۂ مبارکہ کا حاصل معنیٰ یہ ہے کہ مؤمنین اپنے اجمالی ایمان کو تفصیلی ایمان کے ساتھ مربوط و مرتبط قرار دیں، کیونکہ جو امور تفصیلی صورت میں ذکر کئے گئے ہیں وہ ان معارف سے عبارت ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ حقائق کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم قرار پاتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے لئے ہی ہیں اچھے اچھے نام اور بلند پایہ صفات کہ جو اس امر کا موجب بنیں کہ اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کرے اور انہیں اس چیز کی ہدایت فرمائے جو ان کی بھلائی و سعادت کی ضامن ہو اور پھر انہیں جزا کے دن کے لئے دوبارہ زندہ کرے، اور یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب بشارت و انذار کرنے والے پیغمبروں کو بھیجے اور کتابیں نازل کرے کہ جن کے ذریعے وہ پیغمبر لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو دور کر سکیں، اور لوگوں کو مبداء و معاد اور خدائی احکام و دستورات سے آگاہی دلا سکیں۔

لہٰذا ان امور وحقائق میں سے کسی ایک پر ایمان لانا کافی نہیں بلکہ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا درست نہیں، اور اگر ایسا کیا گیا یعنی ان میں سے بعض کو تسلیم اور بعض کا انکار کیا گیا تو اگر اس کا اظہار ہوا تو یہ کفر ہوگا اور اگر اسے پوشیدہ کیا گیا تو نفاق کہلائے گا، اور نفاق یہی ہے کہ مؤمن ایسی روش اختیار کرے کہ جس سے ان امور میں سے کسی ایک کا انکار لازم آتا ہو مثلاً مؤمنین کے گروہ ومعاشرت کو چھوڑ کر کفار کے گروہ اور ان سے معاشرت و پیوستگی کو اختیار کرے، مؤمنین کے بجائے کفار سے دوستی ومحبت کی راہ ورسم بڑھائے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ایمان اور اہل ایمان کی تکذیب کرے یا جس طرح وہ حق اور اہل حق کا مذاق اڑاتے ہیں ان کے ساتھ شریک عمل ہو جائے تو یہ نفاق کی بدترین صورت ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیہ مبارکہ میں منافقین کے برے حال کو بیان کرتے ہوئے ان کے لئے دردناک عذاب مقرر کئے جانے کا ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ تذکرہ خالی از فائدہ نہیں کہ آیت شریفہ کا جو معنیٰ ہم نے ذکر کیا ہے وہ ہی اس کے ظاہر سے مطابقت رکھتا ہے اور وہ ان تمام معانی سے زیادہ بہتر ہے جو دیگر مفسرین کرام نے ذکر کئے ہیں مثلاً بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا'' میں دو مرتبہ ''اٰمِنُوْا'' کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو اور ظاہری طور پر اللہ ورسول اور دیگر امور پر ایمان رکھتے ہو، باطنی طور پر بھی اُن چیزوں پر ایمان لے آؤ تا کہ تمہارا ظاہر و باطن یکساں ہو۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ دوسرے ''اٰمَنُوْا'' سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو(اثبتوا علی ایمانکم)۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا'' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اے اہل کتاب یعنی تورات وانجیل اور جن انبیاء پر یہ کتابیں نازل کی گئی ہیں ان پر ایمان لانے والو! تم اللہ پر اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اور اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کی ہے۔

مذکورہ بالا تمام معانی اپنے طور پر درست ہیں لیکن کلامی قرائن سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ ان کے برعکس ثبوت ملتا ہے، اور ان تمام معانی میں سب سے زیادہ کمزور و ناپختہ بلکہ بے بنیاد و بے ربط معنیٰ، آخری معنی ہے۔

بعض امور کا انکار بھی کفر ہے

○ ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا''

(اور جو شخص انکار کرے اللہ کا اس کے فرشتوں کا اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ دور

کی گمراہی کا شکار ہو گیا)

اس فقرے سے ماقبل فقرے میں چونکہ یہ ارشاد ہوا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا........ (اے ایمان والو! ایمان لاؤ) تو اس میں تمام امور کو یکجا کرنے اور سب پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ سب امور ایسے ہیں جن میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور وہ ایک ہی مجموعہ مرکب کی طرح ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا دوسرے فقرے ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ'' میں مذکوران امور کو فہم المعنیٰ کے لئے یوں فرض کیا جائے گا: ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ'' یعنی جو شخص انکار کرے اللہ کا، یا اس کے فرشتوں کا، یا اس کی کتابوں کا، یا اس کے رسولوں کا، یا آخرت کے دن کا، یعنی جو شخص ایمان کے مجموعۂ مرکب کے ان اجزاء میں سے کسی ایک کا انکار کرے تو وہ دور کی گمراہی کا شکار ہو گیا (فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا)

بنا بر ایں حرف ''واؤ'' جو کہ عطف کے لئے ہے یہاں تمام امور کے یکجا ہونے کا معنیٰ نہیں دیتا، یعنی ایسا نہیں کہ جو شخص ان سب کا انکار کرے وہ کافر ہے اور گمراہی کا شکار ہے بلکہ قرآنی آیات مبارکہ سے بخوبی واضح و آشکار ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے وہ کافر و گمراہ ہے، گویا یہاں حرف ''واؤ'' کو حرف ''یا'' کے معنی میں لیا جائے گا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص صرف ایک کا انکار کرے جبکہ دیگر امور پر ایمان رکھتا ہو وہ گمراہ کہلائے گا۔

بار بار کافر ہونے کا نتیجہ

○ ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا''

(جو لوگ ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ اُنہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کرے گا)

اگر اس آیت کو ماقبل آیت سے بالکل الگ صورت میں دیکھیں تو اس سے ان لوگوں کے بارے میں سخت سزا کا حوالہ ملتا ہے جو مرتد ہو جائیں اور وہ اس طرح کہ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کریں، پھر دوبارہ ایمان لائیں اور پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں اور پھر ان کا کفر بھڑتا ہی چلا جائے اور وہ کفر میں شدید تر ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے لوگوں کو سخت سزا دینے، ان کے ایسا کرنے کو نا قابل معافی جرم قرار دینے اور اُنہیں سیدھی راہ کی ہدایت سے محرومی کی خبر دی ہے۔ اور ان سے اللہ کی رحمت کا سزاوار ہونے کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ ایمان پر قائم رہتے ہی نہیں بلکہ اللہ کے امور کو کھیل کود کا میدان بناتے ہیں، تو جس شخص کا حال ایسا ہو وہ سنجیدہ طور پر اس ایمان پر قائم نہیں رہ سکتا جو اس سے قابل قبول ہو، اور اگر وہ سنجیدہ طور پر ایمان لاتے تو اللہ کی طرف سے مغفرت و ہدایت ان کے شامل حال ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حقیقی ایمان کے

ساتھ توبہ کی جائے تو اللہ اسے ہرگز رد نہیں کرتا جیسا کہ اُس نے اس سلسلہ میں اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا، چنانچہ اس موضوع کی بابت سورۂ نساء آیت ۱۷ ''اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ '' کی تفسیر میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے (ملاحظہ ہو، المیزان جلد چہارم)

بہر حال اس آیۂ شریفہ میں بار بار ایمان لا کر پھر کفر اختیار کرنے کے نتیجہ میں ان کی خدا کی رحمت و مغفرت سے محرومی کا جو تذکرہ ہوا ہے وہ طبعاً و عادۃً ہے۔ یعنی عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس سے کسی استثنائی صورت کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے باوجود یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایمان لا کر اس پر استقامت اختیار کرے اور انہی لوگوں میں سے کہ جو بار بار ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں کوئی شخص ایسا بھی ہو جو اپنے ایمان پر قائم و ثابت قدم رہے جیسا کہ درج ذیل آیت سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۹۰

''كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۸۶﴾ .... تا......... اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُهُمۡ‌ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾''

(اللہ کیسے ان لوگوں کو ہدایت کرے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے حالانکہ اُنہوں نے گواہی دی کہ رسول حق ہے اور وہ ان کے پاس واضح دلائل و معجزات لے کر آیا ہے، اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا...... تا........ سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی، تو اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے، یقیناً جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور وہی گمراہ ہیں)

ان آیات سے ___ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض کا استثناء مذکور ہے کہ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور مغفرت و ہدایت سے محرومی کا شکار ہوئے، ان میں سے بعض کے مستثنٰی ہونے کا ذکر ان کے ایمان پر ثابت قدم رہنے کے حوالہ سے ہے اس استثناء کی گنجائش کا ذکر کرنے کے بعد اُن لوگوں کی توبہ کی عدم قبولیت کا تذکرہ بھی ہوا ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر کے اپنے کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں چنانچہ ابتدائے آیات اُنہی افراد کے بارے میں ہے جو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر ہوئے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کی گواہی دینے اور واضح دلائل و معجزات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود روگردانی کر لی، تو ان کا ایسا کرنا عناد و دشمنی اور لجاجت و ہٹ دھرمی پر مبنی ہے اور اس میں بڑھتے چلے جانا بھی اس وجہ سے ہے کہ وہ اس دشمنی اور سرکشی پر ڈٹ گئے اور ان کے دلوں میں نافرمانی و غرور نے گھر کر لیا لہٰذا جس شخص کی حالت ایسی ہو وہ عام طور پر توبہ کی توفیق نہیں پاتا اور اگر کبھی زبان سے توبہ کر بھی لے لیکن وہ اس پر

ثابت قدم نہیں رہتا کیونکہ وہ حقیقی توبہ نہیں ہوتی۔

جو مطالب یہاں تک ذکر ہو چکے ہیں وہ سب زیر نظر آیۂ مبارکہ ہی کے سیاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے موضوع کی وضاحت کے حامل ہیں لیکن اگر تمام آیات کو ایک دوسری کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب ایک ہی سیاق کی حامل ہیں اور ایک دوسری سے وابستہ و مرتبط ہیں، بنا برایں فقرہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا'' دراصل فقرہ ''وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ...... تا...... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا'' کی علت وسبب کے بیان پر مشتمل ہے، لہٰذا ان دونوں آیتوں کا ایک ہی مصداق ہے اور وہ یہ کہ جو شخص انکار کرے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا، دراصل وہی ہے جو ایمان لایا پھر کافر ہو گیا پھر ایمان لایا پھر کافر ہو گیا پھر کفر میں بڑھتا چلا گیا، اور وہی شخص ان منافقین میں شمار ہوگا جن کے بارے میں ارشاد ہوا: ''بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا...... الخ'' (منافقوں کو آگاہ کر دیجئے کہ اُن کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے)۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں فقرہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا......'' کا مرادی معنیٰ، مذکورہ معنی سے مختلف ہو جائے گا، تو اس کے معنی کا تعین اس فقرہ کے معنی پر منحصر و موقوف ہوگا: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِهٖ......'' گویا اس فقرہ کے معنی میں تعین سے فوق الذکر فقرہ کے معنی کا تعین ممکن ہوگا لہٰذا ذیل میں اس کی چند صورتیں ذکر کی جاتی ہیں جن میں سے کسی ایک کے تعین کے بعد اصل صورتحال واضح ہو سکے گی:

(۱) اگر اس کا معنیٰ اس طرح کیا جائے کہ اے ایمان والو! تم باطن میں بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح ظاہر میں ایمان لائے ہو، تو اس میں ایمان لانے اور پھر کافر ہو جانے، پھر ایمان لانے اور پھر کافر ہو جانے سے وہی حالت مراد ہوگی جو عام طور پر منافقین کی ہوتی ہے کہ جب وہ مؤمنوں سے ملتے ہیں تو ایمان والے ہونے کا اظہار کرتے ہیں اور جب کفار سے ملتے ہیں تو کفر والے ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔

(۲) اگر ''اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِهٖ'' کی تفسیر یوں کی جائے کہ اے ایمان والو! تم اس ایمان پر ثابت قدم رہو جو تم نے اختیار کیا ہے تو آیت میں ایمان لانے اور پھر کفر اختیار کرنے، پھر ایمان لانے اور پھر کافر ہو جانے سے بار بار مرتد ہونا مراد ہوگا کہ جس کا معنیٰ مشہور ہے۔

(۳) اور اگر اس کی تفسیر یوں کی جائے کہ اس میں اہل کتاب کو اللہ اور اس کے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے تو آیت میں ایمان لانے اور پھر کفر اختیار کرنے، پھر ایمان لانے اور پھر کفر اختیار کرنے سے مراد، حضرت موسیٰؑ پر ایمان پھر بچھڑے کی عبادت کر کے حضرت موسیٰؑ کا انکار کرنا، پھر حضرت عزیرؑ پر ایمان لانا یا حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانا پھر ان کا انکار کرنا اور پھر اس انکار (کفر) میں بڑھتے ہوئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار اور جو کچھ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کی طرف سے لائے اس کا انکار کرنا مراد ہوگا، جیسا کہ بعض مفسرین کا قول ہے۔

(۴) اور اگر اس کی تفسیر یوں کی جائے کہ اے وہ لوگو! جو اجمالی طور پر ایمان لائے ہو تفصیلی طور پر ایمان لے آؤ اور دین کی حقیقتوں میں سے سب پر یقین قائم کرو۔ جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کو پسند کیا ہے۔ تو اس صورت میں فقرہ ''اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا'' ان منافقین کی حالت پر تطبیقی ثبوت قرار پائے گا جن کا تذکرہ بعد میں ہوا ہے کہ جنہیں اس فقرہ کا مصداق قرار دیا گیا ہے: ''الَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ'' (وہ کہ جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستی قائم کرتے ہیں) کیونکہ جو شخص کافروں کے ساتھ میل جول رکھے اور مؤمنوں سے معاشرت ترک کر دے تو وہ یقیناً اُن کی محفلوں میں حاضر ہوگا اور ان کے ساتھ مانوس رہے گا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوگا اور ان کی بعض ان باتوں میں ان کا حامی ہوگا جو وہ آپس میں کرتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں یعنی ان کی وہ باتیں جو وہ غلط طور پر دین اور اولیائے دین کی طرف منسوب کر کے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ان کی ہتک حرمت کرتے ہیں۔ اس طرح کا شخص جب مؤمنوں کے پاس بیٹھتا ہے اور اُن کے ساتھ دینی مراسم میں شریک ہوتا ہے تو خود کو دیندار ظاہر کرتا ہے اور جب کافروں کی محفل میں جاتا ہے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو کفر اختیار کر لیتا ہے، تو وہ اسی طرح ہمیشہ کبھی ایمان لاتا ہے اور کبھی کفر اختیار کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی یہ عادت اس میں راسخ ہو جاتی ہے تو وہ اس طرح کفر میں مزید آگے جاتا رہتا ہے، کفر میں بڑھتے رہنے کا مطلب یہی ہے، واللہ اعلم۔

تو اس طرح کے افراد کہ جن کی حالت بدلتی رہتی ہے اور وہ کسی ایک حالت پر قائم و باقی نہیں رہتے، ان کی توبہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے کیونکہ توبہ جو کہ ندامت و پشیمانی کا نام ہے وہ ہر آن بدلتی حالت کے ساتھ تحقق پذیر نہیں ہوسکتی۔ البتہ اگر ایسا ہو کہ وہ توبہ کرنے کے بعد اپنے کئے پر پشیمان رہے تو حالات کا بدلنا اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا اور نہ ہی نفسانی خواہشات کے طوفانوں سے اس کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے منافق کی قابل قبول توبہ کو چند ایسی شرائط کے ساتھ مُقیّد کر دیا ہے کہ جو تغیر و تبدل کے تمام راستوں کو مسدود کر دیتی ہیں چنانچہ استثنائی صورت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہوا: ''اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ اعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰہِ وَ اَخۡلَصُوۡا دِیۡنَہُمۡ لِلّٰہِ'' (سوائے اُن لوگوں کے کہ جو توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں اور اللہ کے ساتھ وابستگی اختیار کریں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لئے قرار دیں۔ اللہ ہی کا دین اپنائیں)۔

منافقوں کے لئے سخت عذاب

○ ''بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ بِاَنَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمَا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ''

(منافقوں کو بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے، وہ کہ جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں)

اس آیت میں منافقوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی بناتے ہیں تو ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے، البتہ یہ بات منافقوں اور دیگران افراد میں عمومی طور پر پائی جاتی ہے جو قلبی طور پر ایمان لانے کی بجائے صرف زبانی طور پر ایمان لاتے ہیں اور اس میں وہ مؤمنین بھی شامل ہیں جو ہمیشہ کافروں کے ساتھ دوستی کے رشتے قائم کرتے ہیں اور مؤمنوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس طرح کا عمل کرنے والے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی موجود تھے جو باطنی طور پر کافروں سے تعلقات قائم کئے ہوئے تھے اور ان سے راز و نیاز کرتے تھے۔

اس سے یہ راز بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت مبارکہ میں جن منافقین کا ذکر ہوا ہے وہ وہی مؤمنین ہیں جو اپنے ایمانی بھائیوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرتے ہیں چنانچہ اس کا مزید تاکیدی ثبوت بعد والی آیت میں بھی پایا جاتا ہے جس میں ارشاد ہوا: ''وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ '' (اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسری بات میں مصروف ہو جائیں ورنہ تم انہی جیسے ہو جاؤ گے) تو اس میں منافقین کو خبردار کئے جانے کی مزید تاکید پائی جاتی ہے جبکہ اس میں اصل خطاب مؤمنین سے ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ آیت ۱۴۲ میں منافقین کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے یعنی ''وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا '' (وہ اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم) اس سے بھی مذکورہ بالا مطلب کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں، ان کی طرف سے ذکر الٰہی کا ثبوت ملتا ہے خواہ بہت کم ہی ہو، لہٰذا اس سے وہ منافقین مراد لینا مشکل ہے جو دل سے ہرگز ایمان نہیں لائے۔

عزت صرف اللہ کے پاس ہے

○ ''اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا''

(کیا وہ اپنے ہاں عزت کے متلاشی ہیں، ہر عزت تو اللہ کے لئے ہے)

اس فقرے میں جو سوال کیا گیا ہے وہ حقیقی سوال نہیں بلکہ فرضی سوال ہے کہ جسے علمی و ادبی اصطلاح میں استفہام انکاری کہتے ہیں، پھر اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور وہ یوں کہ اگر وہ لوگ عزت کے خواہاں ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ

عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے کیونکہ "عزت" ملکیت کی فرع ہے اور حقیقی و ہر طرح کی ملکیت اللہ تعالیٰ سے مخصوص و مختص ہے کہ جس کا ذکر درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی ہوا ہے:

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۲۶

"قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ"

(کہہ دیجئے کہ اے مالک الملک! تو ہی ملک (ملکیت واقتدار) دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تو ہی ملک چھین لیتا ہے جس سے چاہتا ہے، تو ہی عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تو ہی ذلیل کرتا ہے جسے چاہتا ہے)

کفار کے ساتھ دوستی کا نتیجہ

○ "وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ......"

(اور اللہ نے کتاب میں تم پر حکم نازل کر دیا ہے کہ اگر تم سنو........)

اس آیت میں جس حکم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے کتاب میں نازل کیا گیا ہے وہ سورۃ انعام میں مذکور حکم ہے جو آیت ۶۸ میں ہے: "وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" (اور جب آپ دیکھیں ان لوگوں کو جو ہماری آیات کے بارے میں چوں و چرا کر رہے ہیں تو ان سے روگردانی کرلیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی بات میں مصروف ہو جائیں، اور اگر شیطان کبھی یہ بات آپ کو بھلوا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ ہم نشینی نہ کریں)۔

یاد رہے کہ سورۂ انعام مکہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے جبکہ سورۂ نساء مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے۔لہٰذا سابقہ سورت میں مذکور حکم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں یہ اہم ترین نکتہ ملحوظ رہے کہ سورہ انعام کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کے بعض وہ خطابات جو خاص طور پر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئے ہیں ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی مراد ومخاطب نہیں، بلکہ وہ پوری امت کے لئے ہیں اور فقرہ "اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ" اس نہی کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے جو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں کفار کے ساتھ ہم نشینی سے اس لئے منع کیا ہے کہ اگر تم ان کے ساتھ بیٹھو گے تو تم ان جیسے ہو جاؤ گے کہ تم سب جہنم میں جاؤ گے لہٰذا ارشاد ہوا کہ خدا کافروں اور منافقوں کو دوزخ میں اکٹھا کرے گا

"اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ"

منافقین کا طرزِ عمل

○ ''اَلَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ''

(وہ تمہارا انتظار کرتے ہیں، اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح نصیب ہو)

''تربص'' کا معنیٰ انتظار کرنا ہے، اور ''استحواذ'' کا معنیٰ غلبہ پانا اور مسلط ہونا ہے، یہ منافقوں کے طرزِ عمل کی دوسری صورت ہے کہ وہ دونوں فریقوں یعنی مؤمنوں اور کافروں سب سے اپنی تعلق داری کو قائم و برقرار رکھتے ہیں، وہ فریقین سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور اس تاک میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کس کی مالی حالت دوسرے سے بہتر ہے تو اس سے قریب تر ہو جاتے ہیں، لہٰذا اگر مؤمنوں کو فتح حاصل ہو تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے! لہٰذا مال غنیمت میں سے ہمیں بھی حصہ دو اور اس کے علاوہ جو کچھ تمہیں ملے اس میں ہم تمہارے ساتھ شریک ہیں، اور اگر کافروں کو کچھ حاصل ہو جائے تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ہی نے تمہیں ان پر غالب نہیں کیا ہے اور کیا ہم ہی نے تمہیں مؤمنوں سے نہیں بچایا ہے؟ یعنی کیا ہم نے تمہیں اس چیز پر ایمان لانے سے نہیں روکا تھا جس پر وہ (مؤمنین) ایمان لائے لہٰذا جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے اس میں سے ہمارا حصہ ہمیں دو، یا یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تم پر جو احسان کیا ہے اس کے صلہ میں اس مال میں ہمارا بھی حصہ ہے جو تمہارے ہاتھ لگا ہے۔

یہاں ایک نہایت اہم کلامی نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ آیت میں مؤمنین کو حاصل ہونے والی کامیابی کو ''فَتۡحٌ'' جبکہ کافروں کو حاصل ہونے والے غلبہ کو ''نَصِیۡبٌ'' کے الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کافروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے ان کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے کہ جب انہیں ''کچھ'' ملتا ہے گویا ان کے فتح پانے کو نہایت معمولی و ناچیز قرار دیتے ہوئے اسے ''کچھ'' کے الفاظ سے ذکر کیا گیا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے فتح کا وعدہ فرمایا کہ وہ اپنی طرف سے انہیں فتح عطا کرے گا (فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ) یعنی اگر مؤمنوں کو اللہ کی طرف سے فتح عطا ہو کہ اللہ مؤمنوں کا ولی و سرپرست ہے لہٰذا ''فَتۡحٌ'' کا لفظ مؤمنین کے لئے اور نصیب یعنی کچھ حاصل ہونے کا لفظ کافروں کے لئے ذکر کیا گیا۔

قیامت کے دن کا فیصلہ

○ ''فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا''

(پس اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ کافروں کو مؤمنوں پر ہرگز فوقیت نہیں دے گا)

اس فقرے میں ''بَيْنَكُمْ'' (تمہارے درمیان) کی ضمیر ''کم'' کی برگشت ''مؤمنین'' کی طرف ہے، یعنی انہیں مخاطب قرار دیا گیا ہے، لیکن اس میں مذکورہ مطلب دونوں کے لئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مؤمنوں اور کافروں سب کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

اور فقرہ ''وَلَنْ يَّجْعَلَ اللهُ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن کافروں کے مقابلے میں مؤمنین کے حق میں فیصلہ کرے گا اور اس کے برعکس ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا، تو اس میں منافقوں کے لئے مایوسی کا پیغام ہے کہ وہ آخرت میں یہ امید نہ رکھیں کہ انہیں فوقیت یا کوئی مقام ملے گا بلکہ اس دن کافروں پر مؤمنوں ہی کو غلبہ و فوقیت حاصل ہوگی۔

یہاں یہ بات بھی ممکن ہے کہ کافروں کو مؤمنوں پر غلبہ نہ دیئے جانے سے مراد صرف قیامت کے دن فوقیت دینا مراد نہ ہو بلکہ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کی نفی مقصود ہو اور وہ اس لئے کہ مؤمنین ہی ہمیشہ اللہ کے فضل و کرم سے غالب ہوں گے بشرطیکہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہیں اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کریں، جیسا کہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت میں واضح طور پر ارشاد ہوا:

- سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۳۹

''وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ''

(اور تم سستی کا شکار نہ ہو اور نہ ہی دکھی ہو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن رہے)

منافقین کی دھوکہ دہی

- ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ''

(منافقین اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ وہ ان کا مخادعہ کرتا ہے)

''يُخٰدِعُوْنَ'' جو کہ ''مخادعہ'' بابِ مفاعلہ سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اس کا معنیٰ زیادہ یا سخت دھوکہ دہی ہے البتہ یہ معنیٰ اس صورت میں کیا جائے گا جب یہ کہا جائے کہ مبانی کا زیادہ ہونا معانی کے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بار بار دھوکہ دہی کرتا ہو وہ اس میں ماہر اور سخت دھوکہ دینے کا تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی فعل مضارع میں استمرار کا معنیٰ پایا جاتا ہے کہ جس سے مسلسل دھوکہ دہی کا اشارہ ہو جاتا ہے۔

اور فقرہ ''وَهُوَ خَادِعُهُمْ'' جملہ حالیہ ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ ''حالانکہ وہ انہیں دھوکہ دینے والا ہے، یہ لفظی ترجمہ ہے، یعنی وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ انہیں دھوکہ دے رہا ہوتا ہے، اس معنیٰ کی بازگشت اس طرف ہے کہ وہ لوگ (منافقین) اپنی منافقت کی بناء پر جو اعمال انجام دیتے ہیں کہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں، مؤمنوں سے قرب کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے

ان کی محفلوں واجتماعات میں شریک ہوتے ہیں اس سے وہ اپنے تئیں گمان کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنوں کو) دھوکہ دے رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے ظاہری ایمان ومنافقانہ اعمال کے ذریعے ان سے اپنے مفادات حاصل کریں حالانکہ وہ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ ان کے اور ان کے اعمال کے درمیان جس نے انہیں مہلت کا راستہ دیا ہے، اور ان پر جبر نہیں کیا بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا ان کے ساتھ ایسا کرنا ایک طرح سے ''خدعہ'' ہے جو کہ ان کی بدنیتی اور اعمال کی ناپاکی پر انہیں سزا دینے کی ایک صورت ہے۔ لہٰذا ان کا دھوکہ دینا دراصل خدا کا ان کو دھوکہ میں رکھنا ہے۔

''خُدعہ'' کے حوالہ سے یہ مطلب ملحوظ رہے کہ اردو زبان میں اگر اسے اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اپنے خیال و گمان میں اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ اللہ انہیں ان کے دھوکہ میں رکھتا ہے اور اللہ کا ایسا کرنا ان کے باطل وغلط گمان کی سزا کی صورت میں ہے، تو معنیٰ درست قرار پائے گا۔

عبادت میں ریاکاری

○ ''وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا''

(اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کے دکھاوے کے لئے ایسا کرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں)

اس آیت میں منافقوں کی ایک اور روش وطرز عمل کو ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں جب بھی کھڑے ہوتے ہیں کہ نماز پڑھیں تو نہایت سستی و بے دلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کو دکھاوے کے لئے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں حالانکہ نماز سب سے افضل عبادت ہے کہ جس میں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، اگر ان کے دل اپنے پروردگار کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہوتے اور وہ اپنے رب پر ایمان میں پختگی کے حامل ہوتے تو انہیں اللہ کو یاد کرنے اور اس کا ذکر کرنے میں سستی وکوتاہی نہ گھیرتی اور وہ لوگوں کے دکھاوے کے لئے ایسا نہ کرتے بلکہ اللہ کو زیادہ یاد کرتے جو کہ دل کی وابستگی اور فکر کی پیوستگی کا تقاضہ ہے یعنی جو شخص ہمیشہ اللہ کی یاد میں رہے اس کا دل اس سے ہرگز جدا نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ہر حال میں اپنے رب کی یاد میں رہتا ہے۔

نہ اِدھر کے اور نہ اُدھر کے!

○ ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ''

(وہ اس کے بیچ میں سرگرداں ہیں، نہ ان لوگوں کی طرف ہیں اور نہ ہی اُن لوگوں کی طرف ہیں)

مجمع البیان میں مذکور ہے کہ جب عرب اس طرح کہتے ہیں:

''ذبذبته''فذبذب، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اسے حرکت دی تو وہ حرکت میں آ گیا، لہٰذا یہ لفظ کسی لٹکی ہوئی چیز کو حرکت دینے (ہلانے) کا معنیٰ دیتا ہے، (ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۱۲۸) بنابرایں کسی چیز کے مذبذب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں کے درمیان گھومتی رہتی ہے اور کسی ایک جانب قرار نہیں پاتی، تو یہ ہے منافقون کا طرز عمل کہ وہ ان دو طرفوں یعنی ایمان اور کفر کے درمیان سرگرداں رہتے ہیں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر جاتے ہیں، وہ نہ صرف اس طرف ہیں اور نہ صرف اُس طرف ہیں یعنی نہ حقیقی طور پر مؤمنین کے ساتھ ہیں اور نہ ہی صرف کافروں کے ساتھ ہیں کہ بس انہی جیسے ہوں، بلکہ سرگرداں رہتے ہیں اور کبھی مؤمنوں کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو کبھی کافروں کی جماعت کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ حقیقت میں نہ اُن کے ساتھ ہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ ہیں ______ م۔

منافقین کی گمراہی

○ ''وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا''

(اور جسے اللہ گمراہی سے دوچار کر دے تو آپ اس کے لئے کوئی راہ نہیں پا سکتے)۔

اس فقرے میں منافقوں کے تذبذب کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کا مؤمنوں اور کافروں میں سے کسی ایک کے ساتھ حقیقی و واقعی طور پر نہ ہونا اللہ کی طرف سے انہیں گمراہی سے دوچار کر دینے کا نتیجہ ہے یعنی ان کی منافقت اور دھوکہ دہی کے نتیجہ میں اللہ انہیں ان کی گمراہی کی حالت کا شکار رہنے دیتا ہے کہ پھر وہ اپنے لئے کوئی راہ نہیں پاتے بلکہ کبھی ادھر تو کبھی اُدھر سرگرداں رہتے ہیں، اس وجہ سے یوں ارشاد ہوا: ''مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ'' (وہ اس کے درمیان سرگرداں رہتے ہیں) جبکہ یوں نہیں فرمایا: ''متذبذبین بین ذلك'' تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے عذاب نے انہیں اس طرح سرگرداں کر دیا ہے کہ وہ کسی جانب قرار نہیں پاتے بلکہ ہمیشہ سرگردانی اور ادھر ادھر پھرتے رہنے کا شکار ہوتے ہیں۔

کافروں کو ''اپنا'' مت بناؤ

○ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ''

(اے ایمان والو، کافروں کو دوست نہ بناؤ.........)

اس میں لفظ ''سُلْطٰنًا'' ذکر ہوا ہے جس کا مطلب حجت و دلیل ہے، اور لفظ ''درک'' (دال اور راء پر زبر کے ساتھ) اور

کبھی رَ پر جزم آتی ہے اس کا معنیٰ کرتے ہوئے راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ''درک'' لفظوں میں ''درج'' کی طرح ہے اور اس کے ہم معنی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ''درج'' یعنی سیڑھی میں اوپر کی طرف جانا ملحوظ ہوتا ہے جبکہ ''درک'' میں نیچے کی طرف جانا ملحوظ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یوں کہا گیا ہے: **درجات الجنة ودركات النار**، اور دوزخ کی پستی کے تناظر میں اسے ''**هاوية**'' سے موسوم کیا گیا ہے ''**هاوية**'' جو کہ ''**هوى**'' سے ماخوذ ہے اس میں پستی کا معنیٰ پایا جاتا ہے (المفردات، ص ۱۶۷)

اس آیت میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں مؤمنوں کو کافروں کی دوستی اختیار کرنے اور مؤمنوں کی دوستی ترک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس کے منطقی انجام کو ذکر کیا گیا ہے جس میں منافقوں کو سخت سزا کی خبر دی گئی ہے (کہ منافقین دوزخ کی آگ کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے اور آپ ان کا مددگار بھی نہیں پائیں گے) اور یہ نہی و ممانعت اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عمل کو ''نفاق'' قرار دیتا ہے اور مؤمنوں کو اس کا شکار ہونے سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

آیت کا سیاق اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جملہ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا......'' سابق الذکر مطالب سے حاصلہ نتیجہ کے طور پر ہے یا ان کی فرع ہے جو ان سے مربوط ہے، گویا صراحت کے ساتھ کمزور ایمان اور بیمار دل مؤمنین کی حالت بیان کرتے ہوئے انہیں منافقین کے نام سے موسوم کیا گیا یا کم از کم منافقین میں شامل قرار پانے والوں میں ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد مؤمنین کو نصیحت کی گئی کہ وہ اس خطرناک وادی کے نزدیک بھی نہ جائیں اور اللہ کی ناراضگی مول نہ لیں، اور اپنے ہی خلاف خدا کو ایسا ثبوت نہ دے دیں ورنہ وہ انہیں گمراہی کے میدان میں کھلا چھوڑ دے گا اور انہیں ان کے دھوکہ میں مبتلا کر دے گا اور انہیں دنیاوی زندگی میں تذبذب و سرگردانی سے دوچار کر دے گا، پھر انہیں اور کافروں کو اکٹھا ہی دوزخ میں ڈال دے گا، پھر انہیں جہنم کی آگ کے سب سے نچلے طبقہ میں جگہ دے گا اور ان کے اور ان کی مدد و شفاعت کرنے والوں کے درمیان قطع ربط کر دے گا کہ کوئی ان کی مدد نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی ان کے بارے میں شفاعت کر پائے گا۔

مذکورہ بالا دو آیتوں سے دو مطالب واضح ہوتے ہیں:۔

(۱) اللہ کی طرف سے منافقوں کو ان کی گمراہی میں چھوڑ دینا، ان کے دھوکہ میں انہیں مبتلا رکھنا اور اس طرح کے عذاب و ناراضگی کی تمام صورتیں ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں کہ جس سے ان کے خلاف اس طرح خدائی عذاب کا ثبوت و جواز فراہم ہوتا ہے، تو اللہ کی طرف سے اس طرح کا سلوک درحقیقت انہیں ان کے کیفر کردار تک پہنچانا اور ان کے کئے کی سزا کے طور پر ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ وہ کسی کو بلاوجہ عذاب و سزا دے اور کسی کے بُرے اعمال کے بغیر ہی اسے شقاوت و بدبختی سے دوچار کر دے۔ یہ ممکن ہی نہیں، بنابراین فقرہ ''اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا'' (کیا

تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف واضح ثبوت دے دو) دراصل اس فقرہ کی مانند ہے: ''وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ'' (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۶)۔ اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے فاسق و بدکار لوگوں کے!۔

(۲) دوزخ میں دوزخیوں کے لئے مختلف مقامات ہیں کہ جن میں سے بعض پست و نچلی سطح میں اور بعض پست ترین اور سب سے نچلی سطح میں ہیں۔ تو یہ پستیاں و سختیاں ان پر خدائی عذاب کی مختلف صورتیں ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ''درکات'' سے موسوم کیا ہے۔

توبہ واصلاح کرنے والوں کا ذکر

○ ''اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ''

(سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور اللہ سے پیوستہ و وابستہ رہے اور اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر دیا)

اس آیت مبارکہ میں اس عذاب سے مستثنیٰ لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے جو منافقین کے بارے میں ان الفاظ میں ذکر ہوا تھا: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے) اور اب جن افراد کا ذکر ہوا ہے وہ منافقین کے گروہ سے باہر آنے والے لوگ ہیں کہ جو مؤمنین کے ساتھ ملحق ہو گئے، اسی وجہ سے آیت کے ذیل میں استثنائی تذکرہ کے ساتھ ان افراد کا مؤمنین کے ساتھ ہو جانا مذکور ہے (فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ) اور اس کے ساتھ ان سب کا اکٹھا اجر بھی ذکر کیا گیا ہے: (وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا)۔ اور اللہ بہت جلد مؤمنوں کو عظیم اجر عطا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین سے مستثنیٰ افراد کے تذکرہ میں نہایت ثقیل و بھاری اور سخت ترین امور کا ذکر فرمایا ہے جو کہ ان کے اندر منافقت کے جنم لینے کی اساس و بنیادیں ہیں لہٰذا ان امور سے چھٹکارا پانے کے لئے جو صفات ذکر کی گئی ہیں وہ بھی مضبوط ہیں مثلاً توبہ جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور یہ لوٹ کر آنا صرف اسی صورت میں نفع بخش و مؤثر واقع ہو سکتا ہے جب وہ اپنے باطن اور ظاہری اعمال کو خراب کرنے والے عوامل کا قلع قمع کرے اور اپنی اصلاح نفس کرے، اور اصلاح کا عمل صرف اسی صورت میں مفید و نتیجہ بخش ثابت ہو سکتا ہے جب وہ اللہ کے ساتھ وابستگی اختیار کریں یعنی اس کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا اتباع کریں کیونکہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ اس کے علاوہ کوئی نہیں جو خود اس نے معین فرما دیا ہے اور اس کے معین کردہ راستہ کے علاوہ ہر راستہ شیطان کا راستہ ہے۔ اور اللہ سے وابستگی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب وہ اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر دیں کیونکہ اللہ کا دین اللہ سے وابستگی کا ضامن

ہے اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی اللہ سے وابستہ ہونے سے عبارت ہے۔ اور جہاں تک اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا تعلق ہے تو وہ سراسر ظلم ہے کہ جس سے درگزر کرنا اور اسے معاف کئے جانے کی ہرگز گنجائش نہیں پائی جاتی، بنا برایں جب وہ اللہ سے توبہ کریں یعنی اللہ کی طرف لوٹ آئیں اور اپنے تمام فاسد امور کی اصلاح کریں اور اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جائیں اور اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کر دیں تو اس وقت صحیح معنی میں ''مؤمنین'' قرار پائیں گے کہ جن کے ایمان پر شرک اثر انداز نہیں ہو سکتا اور وہ نفاق کی دلدل میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائیں گے اور ہدایت کی نعمت سے مالا مال ہوں گے چنانچہ اس سلسلہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

○ سورۂ انعام: آیت: ۸۲

''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ''

(جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آمیختہ نہ کیا تو ایسے لوگوں کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

آیت کے سیاق سے یہ بات واضح و ظاہر ہوتی ہے کہ ''مؤمنین'' سے مراد صرف وہی افراد ہیں جن کا ایمان پختہ اور اخلاص والا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کا تعارف اس طرح کروایا ہے کہ انہوں نے توبہ کی، اپنی اصلاح نفس کی، اللہ کے ساتھ وابستگی اختیار کی اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کر دیا، اور یہ ایسی صفات ہیں جو ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایمان والوں کی بابت ذکر فرمائی ہیں مثلاً:

○ سورۂ مومنون، آیات: ۱۔۲۔۳

''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝''

(یقیناً کامیابی ان کا مقدر ہے جو ایمان لائے، وہ اپنی نمازوں میں خضوع و خشوع کرتے ہیں اور وہ لغو و بیہودہ باتوں سے منہ موڑتے ہیں)

○ سورۂ فرقان: آیت ۶۴

''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا''

(اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں تو وہ ان کے جواب میں صحیح بات کرتے ہیں، اور وہ راتوں کو اپنے پروردگار کے حضور سجدہ ریزی اور قیام و قعود میں مصروف ہوتے ہیں)۔

○ سورۂ نساء، آیت: ۶۵

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا''

(نہیں نہیں، تیرے پروردگار کی قسم، وہ ہرگز ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اس چیز میں فیصل قبول نہ کریں جو ان کے درمیان پیش آئی ہے، پھر آپ جو فیصلہ کر دیں اس کی بابت دل تنگی کا شکار نہ ہوں بلکہ اس کے سامنے اس طرح سرتسلیم خم کر دیں جس طرح سر خم کرنے کا حق ہے)

تو یہ لفظ ''مؤمنین'' کا حقیقی معنیٰ ہے کہ جہاں بھی قرآنِ مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا اور اس کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ و اشارہ موجود نہ ہو کہ جس سے اس معنیٰ کے علاوہ کوئی معنیٰ ثابت ہوتا ہو تو یہی معنیٰ مراد لیا جائے گا۔

یہاں ایک اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَأُولٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ'' (تو وہی مؤمنین کیساتھ ہیں)، اور یہ نہیں فرمایا: ''فَأُولٰئِكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ'' (تو وہی مؤمنین میں سے ہیں!) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ان اوصاف کے حامل ہونے کے بعد ابتدائی مرحلہ میں مؤمنین کے ساتھ ملحق قرار پائیں گے ـــــ یعنی ان کا شمار مؤمنوں میں ہوگا لیکن وہ مؤمنین میں سے اس وقت تک شمار نہیں ہوں گے جب تک یہ اوصاف ان میں گھر نہ کر لیں اور وہ ان پر ثابت قدمی کا عملی مظاہرہ نہ کریں (اس نکتہ پر بخوبی غور کریں)۔

اللہ کو عذاب کی جلدی نہیں

○ ''مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ''

(اللہ کو تم پر عذاب کرنے سے غرض نہیں اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان پر قائم رہو)

اس فقرہ میں بظاہر مؤمنین سے خطاب ہوا ہے کیونکہ سلسلۂ کلام انہی سے ہو رہا ہے اور یہاں اس خطاب میں انہیں ان کے ایمان سے قطع نظر کرتے ہوئے بات کی گئی ہے اور انہیں ایمان سے عاری فرض کر کے اصل حکم بیان کیا گیا ہے جو کہ اس طرح کے خطابات و بیانات میں عموماً ہوتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اس مطلب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ کو ان پر عذاب نازل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر وہ خود شکر گزاری اور ایمان کا راستہ نہ چھوڑیں تو اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا کیونکہ اسے اُن پر عذاب نازل کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا جس کے لئے وہ عذاب کرنے اور نہ کرنے میں سے عذاب کرنے کو ترجیح دے اور نہ ہی ان کی وجہ سے اسے کوئی نقصان لاحق ہوتا ہے کہ جس سے بچنے کے لئے وہ انہیں عذاب میں مبتلا کرے۔ لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر تم شکر

گزاری کرو اور وہ اس طرح کہ اس کی نعمتوں کا شکر اس کا واجب حق ادا کر کے کرو اور اس ایمان پر قائم رہو تو اسے تم پر عذاب نازل کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں اور اللہ تو اپنے شکر گزار مؤمن بندوں کا شکر گزار ہوتا ہے۔ یعنی ان پر نعمتیں نازل کرتا ہے اور انہیں جزا عطا فرماتا ہے اور وہ ان کے بارے میں بخوبی علم و آگاہی رکھتا ہے کہ شکر گزار اور ناشکرے کے درمیان اشتباہ وغلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

بنابرایں اس آیۂ مبارکہ میں اس امر کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ جن لوگوں پر اللہ کا عذاب آتا ہے وہ خود اس کا سبب بنتے ہیں خدا اس کا سبب نہیں۔ اس طرح ہر وہ چیز جو عذاب کا سبب بنتی ہے وہ خود انہی کی اپنی کارستانی ہے مثلاً گمراہی یا شرک یا معصیت و نافرمانی اور اگر ان میں سے کوئی چیز اللہ کی طرف سے ہوتی تو اس پر عذاب بھی اس کی طرف سے ہوتا کیونکہ ہر مسبب کی نسبت اس کے سبب کی طرف ہوتی ہے۔

روایات پر ایک نظر

تفسیر العیاشی کی تین روایتیں

پہلی روایت: زرارہ، حمران اور محمد بن مسلم کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے آیۂ مبارکہ: ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی کہ جسے عثمان نے مصر بھیجا پھر وہ اپنے کفر میں اس قدر بڑھتا چلا گیا کہ اس میں ذرہ بھر ایمان باقی نہ رہا۔

دوسری روایت: ابوبصیر سے منقول ہے کہ اُنہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا انہوں نے آیۂ مبارکہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا........'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: **من زعم ان الخمر حرام ثم شربها ومن زعم ان الزنا حرام ثم زنا، ومن زعم ان الزكاة حق ولم يؤدها**، یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ شراب حرام ہے مگر اسے پیئے، اور جو شخص یہ جانتا ہو کہ زنا حرام ہے مگر اس کا مرتکب ہو اور جو شخص جانتا ہو کہ زکوٰۃ واجب ہے مگر وہ ادا نہ کرے۔ تو اس طرح کا شخص ایمان کے بعد کفر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس روایت میں کفر اختیار کرنے کی بابت عمومیت ذکر کی گئی ہے جس میں کفر کی تمام اقسام و مراتب شامل ہیں کہ جن میں سے ایک واجبات کو ترک کرنا اور محرمات کو انجام دینا ہے۔ اس سے سابق الذکر مطالب کی تصدیق ہوتی ہے۔

تیسری روایت، محمد بن فضیل کے حوالہ سے منقول ہے اُنہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابوالحسن رضا علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ کے بارے میں پوچھا "وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ........ تا........ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ" تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اذا سمعتم الرجل یجحد الحق و یکذب به ویقع فی اهله فقم من عنده ولا تقاعده (جب تم سنو کہ کوئی شخص حق کا انکار کر رہا ہے اور حق کو جھٹلا رہا ہے اور اہل حق کو برا کہہ رہا ہے تو اس کے پاس سے اٹھ کر چلے جاؤ اور اس کے ساتھ ہم نشینی نہ کرو) (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۱۸۰)

مذکورہ بالا مطلب پر مشتمل دیگر روایات بھی منقول ہیں۔

کافروں کو مؤمنوں پر حجت نہیں

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابوصلت ہروی کے حوالہ سے حضرت امام رضا علیہ السلام کا ارشادِ گرامی قدر ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے آیۂ مبارکہ: "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" کی تفسیر میں فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو مؤمنوں پر ہرگز (علمی و اعتقادی) غلبہ عطا نہیں کرے گا یعنی جب وہ آپس میں بحث کریں گے تو کافروں کو مؤمنوں پر حجت حاصل نہیں ہوگی، اس سے جنگ میں غلبہ مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ہاتھوں ان کے انبیاء کے ناحق قتل کئے جانے کے واقعات سے آگاہ فرمایا ہے لیکن ان کے ایسا کرنے کے باوجود اُنہیں اپنے انبیاء پر عقیدتی غلبہ حاصل نہیں ہوسکا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مؤمنوں پر حجت قائم کرنے سے محروم کیا ہے۔ (عیون اخبار الرضاؑ، جلد دوم، صفحہ ۲۰۴)

امام علیؑ کا فرمان

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے حضرت امام علی علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ آنجنابؑ نے "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد آخرت میں برتری ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں کافروں کو مؤمنوں پر برتری نہیں دے گا۔ (درِمنثور، جلد ۲ صفحہ ۲۳۵)

ہم پہلے اس مطلب کو بیان کر چکے ہیں کہ آیت کے سیاق سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آخرت میں عدم برتری کا ذکر ہے، تاہم اگر اسے عمومیت کے حوالہ سے دیکھیں اور آیت کے الفاظ ہی کو ملحوظ رکھ کر نتیجہ گیری کریں تو اس سے دنیا

و آخرت دونوں میں عدم برتری کا ثبوت ملتا ہے۔

اللہ دھوکہ نہیں دیتا

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں مؤلف نے اپنے اسناد سے حسن بن فضال کا بیان ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے اس آیت کا معنیٰ پوچھا ''یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ'' (وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ اللہ انہیں دھوکہ دینے والا ہے) تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''الله تبارك و تعالىٰ لا يخادعهم ولكنّه يجازيهم جزاء الخديعة'' اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ کسی کو دھوکہ دے، وہ انہیں دھوکہ نہیں دیتا بلکہ ان کے دھوکہ دہی کے عمل کی انہیں سزا دیتا ہے (عیون اخبار الرضاؑ، صفحہ ۲۱۲)

نجات کا راستہ

تفسیر العیاشی میں مسعدہ بن زیاد سے روایت مذکور ہے کہ اُنہوں نے جعفر بن محمد کے حوالہ سے ان کے والد کا بیان ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: قیامت کے دن عذاب سے نجات کا راستہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''النجاة ان لا تخادعوا الله فيخدعكم فانهٔ من يخادع الله يخدعهٔ ويخلع منه الايمان ونفسه يخدع لو يشعر'' حصولِ نجات کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ فریب کاری نہ کرو ورنہ وہ تمہارے ساتھ فریب کاری کرے گا کیونکہ جو شخص اللہ کو دھوکہ دے تو اللہ بھی اسے دھوکہ دیتا ہے اور اس کے دل سے ایمان کو نکال باہر کرتا ہے، تو گویا وہ شخص خود اپنے آپ ہی سے دھوکہ کر رہا ہوتا ہے کہ جس کا وہ شعور نہیں رکھتا۔ اس میں اللہ کی طرف فریب کاری کی نسبت سے مراد یہ ہے کہ اللہ انہیں ان کے فریب ہی میں چھوڑ دیتا ہے اور اس کی سزا انہیں دیتا ہے اور دھوکہ دینے سے بھی یہی معنی مراد ہے۔

کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کوئی شخص کس طرح اللہ کو دھوکہ دے سکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''يعمل بما امر الله ثم يريد به غيرهٔ فاتقوا الرياء فانهٔ شرك بالله ان المرائى يدعى يوم القيامة باربعة اسماء: ياكافر، يافاجر، يا غادر، ياخاسر، حبط عملك، وبطل أجرك، ولا خلاق لك اليوم، فالتمس اجرك من كنت تعمل لهٔ'' اللہ کو دھوکہ دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص عمل تو اسی طرح کرتا ہے

جس طرح اللہ نے حکم دیا، پھر وہ اس عمل سے غیر اللہ کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے (ریاکاری) جو کہ اللہ کے ساتھ شرک سے عبارت ہے، قیامت کے دن ریاکار کو چار ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا، اے کافر، اے بدکار، اے دھوکہ باز، اے نقصان اُٹھانے والا! تیرا عمل ضائع ہوگیا، تیرا اجر ختم ہوگیا، اور آج کے دن تجھے کچھ بھی نہ ملے گا لہٰذا تو اپنا اجر اس سے مانگ جس کے لئے تو نے عمل کیا ہے (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۸۳)

ظاہر و پوشیدہ ذکر الٰہی

کتاب اصولِ کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابوالمعزا الخصاف کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ اُنہوں نے کسی راوی کا حوالہ دیئے بغیر حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا بیان ذکر کیا کہ آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا: ''من ذکر اللہ عزوجل سراً فقد ذکر اللہ کثیراً ان المنافقین کانوا یذکرون اللہ علانیہ ولا یذکرونہٗ فی السر فقال اللہ عزوجل: یرائون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلاً''، جو شخص خلوت و پوشیدگی میں اللہ کا ذکر کرے تو گویا اس نے اللہ کا ذکر کثیر کیا، اور منافقین اللہ کو ظاہر بظاہر بہت زیادہ یاد کرتے تھے مگر خلوت و پوشیدگی میں بالکل اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے تو خداوند عالم نے اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے ایسا کرتے ہیں جبکہ اللہ کو بہت کم ہی یاد کرتے ہیں'' (اصولِ کافی، جلد ۲، صفحہ ۵۰۱)

اس روایت میں ''قلیلاً'' کا جو معنٰی کیا گیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔

امام علیؑ کا لطیف فرمان

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن المنذر نے حضرت امام علیؑ کے حوالہ سے بیان کیا آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''لایقل عمل مع تقویٰ و کیف یقل ما یتقبل''

(کوئی عمل جو تقویٰ کے ساتھ ہو وہ کم نہیں ہوتا، اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو چیز بارگاہِ الٰہی میں موردِ قبول قرار پائے وہ کمتر شمار ہو)۔

یہ معنٰی بھی اپنے موضوع کے حوالہ سے نہایت لطیف ہے اور اس کی برگشت بالآخر حقیقی طور پر اسی معنی کی طرف ہوتی

ہے جو سابق الذکر روایت میں بیان کیا گیا ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسی کتاب یعنی تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ مسلم، ابوداؤد نے اور بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن'' میں انس سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اذاقاموا فی الصلوٰۃ قالوا کسالیٰ.... '' سے مراد منافقین کا نماز پڑھنا ہے کہ منافق کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ سورج کے غروب کرنے کا منتظر ہوتا ہے اور جوں ہی سورج شیطان کے دو سینگوں میں قرار پاتا ہے تو وہ (منافق) نماز کے لئے کھڑا ہوجاتا اور پھر اپنا سر چار مرتبہ زمین پر اس طرح مارتا ہے جس طرح کوا اپنی چونچ دانہ اٹھانے کیلئے زمین پر مارتا ہے، تو وہ شخص اس طرح جلدی میں نماز پڑھتا ہے کہ اس میں اللہ کا ذکر بہت کم کرتا ہے۔

کم ذکر کرنے کا یہ دوسرا معنٰی ہے کیونکہ اس طرح کے نمازی کا ذکر الٰہی کرنا اللہ کے حضور نماز ادا کرنے کی غرض سے صرف کھڑا ہونا ہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں جبکہ اس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذکر الٰہی میں اس طرح محو ہوجائے کہ وہ سراپا ذکر بن کر نہایت سکون واطمینان کے ساتھ اپنی نماز ادا کرے۔

منافق کی مثال

تفسیر ''درمنثور'' میں ہی ہے کہ عبد بن حمید نے اور بخاریؔ نے کتاب التاریخ میں اور مسلمؔ، ابن جریر اور ابن منذر نے عبداللہ بن عمرؔ کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مثل المنافق مثل الشاۃ العائرۃ بین الغنمین تعیر الیٰ ھذہ مرۃ والیٰ ھذہ مرۃ لا تدری ایّھا تتبع''

(منافق کی مثال اس آوارہ بکری جیسی ہے کہ جو دو بکریوں کے درمیان پھرتی رہتی ہے، کبھی اس طرف جاتی ہے اور کبھی دوسری بکری کی طرف جاتی ہے اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس کے ساتھ ہو)۔

حجت و دلیل

اسی کتاب تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ عبدالرزاق، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ اُنہوں نے کہا: قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ''سلطان'' ذکر ہوا ہے اس سے مراد حجت و دلیل ہے۔

اسی کتاب میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اور مروزی نے کتاب ''زوائد الزھد'' میں، اور ابوالشیخ بن حبان نے مکحول سے روایت ذکر کی ہے، اُنہوں نے کہا: میں نے سنا ہے کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بندہ چالیس دنوں تک اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں خالص رکھے تو حکمت و دانائی کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر پھوٹ پڑتے ہیں۔

یہ روایت مشہور روایات میں سے ایک ہے اور اسے لفظاً و معنیً دونوں طرح سے مختلف اسناد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اسی کتاب میں ہے کہ حکیم ترمذی نے کتاب ''نوادر الاصول'' میں زید بن ارقم کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من قال لا اله الا الله مخلصًا دخل الجنة'' جو شخص خلوصِ دل کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے وہ بہشت میں داخل ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا گیا: وما اخلاصها؟ ایسا کہنے میں اخلاص سے کیا مراد ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان تحجزهٗ عن المحارم، اس سے مراد یہ ہے کہ اُس کا ایسا کہنا اُسے ہر اس چیز سے باز رکھے جو حرام ہے (مذکورہ بالا تمام روایات تفسیر ''درِ منثور'' جلد دوم صفحہ ۲۳۶ اور صفحہ ۲۳۷ میں مذکور ہیں)

آخری روایت متعدد اسناد کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ جسے شیعہ و سنی دونوں کی کتب حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ جو آئمہ اہل بیتؑ اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالوں سے ذکر کی گئی ہیں کہ ہم ان میں مذکور اہم ترین الفاظ مناسب و موزوں مقامات پر پیش کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

یاد رہے کہ زیر نظر آیات مبارکہ کے ذیل میں ان کے شان نزول کی بابت مختلف روایات ذکر کی گئی ہیں مگر ہم نے اس لئے ان سب کو یہاں ذکر نہیں کیا کیونکہ ان میں سے اکثر جری و تطبیق یعنی مصداق کی نشاندہی پر مبنی ہیں، حقیقت الامر سے خدا ہی بہتر آگاہ ہے۔

آیات ۱۴۸ تا ۱۴۹

○ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

○ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

ترجمہ

○ ''اللہ کھلم کھلا برائی بیان کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس شخص سے کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ نہایت سننے والا، بہت ہی آگاہ ہے۔''

(۱۴۸)

○ ''اگر تم کسی نیکی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو، تو یقیناً اللہ عفو و درگزر کرنے والا، نہایت قدرت والا ہے۔''

(۱۴۹)

تفسیر و بیان

مظلوم کی پکار

O ''لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ''

(اللہ کھلم کھلا برائی بیان کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس شخص سے کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو)

مشہور لغت دان راغبؒ اصفہانی نے المفرداتؒ میں لکھا ہے کہ ''**جھر**'' بہت زیادہ ظاہر ہونے کو کہتے ہیں خواہ وہ آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو یا قوتِ سماعت پر ظاہر ہو، آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے میں یوں کہا جاتا ہے: ''رأیته جھارا'' میں نے اسے واضح طور پر دیکھا ہے، اس سلسلہ میں قرآنی حوالہ ملاحظہ ہو:

O سورۂ بقرہ، آیت: ۵۵

''لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَهْرَةً''

(ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں)

O سورۂ نساء، آیت ۱۵۳

''اَرِنَا اللّٰہَ جَهْرَةً''

(تو ہمیں اللہ کو ظاہر بظاہر دکھا)

یہ دونوں آیتیں بنی اسرائیل کے بیان پر مشتمل ہیں جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا!

یہ آنکھوں سے دیکھنے کے حوالہ سے ہے، اور جہاں تک کانوں سے سننے کے حوالہ سے ظاہر ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں درج ذیل آیت ملاحظہ ہو:

O سورۂ رعد، آیت: ۱۰

''سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ''

(اللہ کے لئے برابر ہے خواہ تم مخفیانہ کوئی بات کرو اور یا کوئی شخص اسے ظاہر کرے)

''السُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ'' (بری بات) کے الفاظ وہاں استعمال کئے جاتے ہیں جہاں کوئی ایسی بات کی جائے کہ جس

کے بارے میں وہ بات کی گئی ہو وہ اسے سن کر دکھی ہو اور اسے اس سے تکلیف پہنچے مثلاً کسی کو بددعا دی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے ــــــ گالیاں دی جائیں ــــــ اور اس کے بارے میں وہ عیوب بیان کئے جائیں جو اس میں پائے جاتے ہوں یا نہ پائے جاتے ہوں (غیبت وتہمت) تو یہ سب کچھ ایسے امور ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اظہار کو پسند نہیں کرتا، اور جہاں تک پسند اور دوست رکھنے اور ناپسند اور دوست نہ رکھنے کا تعلق ہے تو ان کے جو معانی ہمارے ہاں رائج و معمول ہیں اور ہم نوع انسانی اور دیگر ہم جنس حیوانات کے درمیان پائے جاتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ و بالاتر ہے، چنانچہ جب ہم کسی چیز کا امر کرتے ہیں یا کسی چیز سے نہی کرتے ہیں تو ان کا سرچشمہ ہماری طبع وجودی میں پائی جانے والی حُب اور بغض یعنی پسند و چاہت اور ناپسندی ہوتا ہے کہ جسے ہم ارادہ و کراہت سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی کیفیات سے مُنَزّہ ہے۔

اور فقرہ ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ'' (خدا بری بات کو دوست نہیں رکھتا) دراصل اس مطلب کا کنایۃً اظہار ہے کہ شریعت الٰہیہ میں اس طرح کے اعمال کو ناپسند کیا گیا ہے تو اس ''ناپسندی'' میں حرام ومکروہ دونوں حوالے پائے جاتے ہیں۔

اور فقرہ ''اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' میں مظلوم کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو کہ استثنائے منقطع ہے جس کا معنیٰ ''لیکن'' ہے لہٰذا آیت کا یوں معنیٰ کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی سخت بات کو پسند نہیں کرتا لیکن جس شخص پر ظلم کیا گیا ہو وہ ظالم کے بارے میں اور جو اس پر ظلم ہوا ہے اس کی بابت برے الفاظ کہنے اور کھلے اظہار کی ممانعت سے مستثنیٰ ہے، تو اس سے اشارۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ مظلوم کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا کھلے طور پر اظہار کرے اور ظالم کے بارے میں برے الفاظ استعمال کرے لیکن جہاں تک اس دائرہ سے باہر جانے کا تعلق ہے تو آیت میں مذکور استثنائی حکم سے اس کا ثبوت نہیں ملتا یعنی اس پر جو ظلم ہوا ہے اس کے علاوہ ظالم کے بارے میں اس کے دیگر غلط اعمال وغیرہ کا تذکرہ کرنے کا مجاز نہیں یعنی جو باتیں اس پر ہونے والے ظلم سے تعلق نہیں رکھتیں ان کے بارے میں لب کشائی کا جواز اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مفسرین اگرچہ ''السوء من القول'' کے معنی میں اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ جن میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد بددعا کرنا ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد اسی ظلم وزیادتی کا زبان پر لانا ہے جو اس پر ہوئی ہو، لیکن یہ تمام معانی آیت مبارکہ سے سمجھے جاسکتے ہیں اور یہ سب آیت کے اطلاق میں شامل ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو مقصود قرار دے کر اس میں منحصر قرار دینا صحیح نہیں۔

فقرہ ''وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا'' (اور اللہ بہت ہی سننے والا، نہایت آگاہ ہے) سے اس نہی کی تاکید ثابت ہوتی ہے جو ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ'' میں مذکور ہے، لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ جس کام سے منع کیا گیا ہے یعنی سخت و برے الفاظ زبان پر لانا، وہ مظلوم کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں اور جو ایسا کرے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والا ہے اور ہر

چیز سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔

خدا کی عفو وقدرت کا بیان:

''اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا''

(اگر تم اچھائی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا برائی سے درگزر کرلو تو اللہ عفو ودرگزر کرنے والا ،نہایت قدرت رکھنے والا ہے)

یہ آیت اپنی ماقبل آیت سے بے ارتباط نہیں کیونکہ اس میں خیر اور اچھائی کو ظاہر کرنے اور پوشیدہ رکھنے کا تذکرہ ہوا ہے لہٰذا اس میں اس اچھائی ونیکی کا اظہار بھی شامل ہے جو کسی احسان ونیکی کرنے والے کی شکر گزاری کی غرض سے ہو جیسے کسی نعمت عطا کرنے والے کا اس نعمت عطا کرنے پر شکر وشکریہ ادا کیا جاتا ہے اور اس میں ظالم کی زیادتی وظلم سے درگزر کرنا بھی شامل ہے کہ ظالم کے خلاف بری زبان استعمال نہ کی جائے اور اس کے بارے میں نازیبا الفاظ زبان پر نہ لائے جائیں۔ بنا برایں ''اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا'' میں خیر کا ظاہر کرنا مقصود ہے خواہ وہ کسی فعل کی صورت میں ہو جیسے مستحق افراد پر انفاق کرنا اور اسی طرح ہر وہ نیک کام جو لوگوں میں دینی اقدار وتعلیمات کے فروغ کا موجب بنے اور لوگ نیکی کی راہ پر گامزن ہوں، یا کسی قول کی صورت میں ہو جیسے کسی نعمت عطا کرنے والے کی شکر گزاری اور اس کے بارے میں اچھے کلمات زبان پر لانا کہ جس سے دوسرے اہل نعمت اسی طرح کے اعمال انجام دیں۔

اور ''تُخۡفُوۡهُ'' سے جو معنیٰ فوری طور پر ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اچھے عمل کو پوشیدہ رکھا جائے کہ اس میں ریاکاری ودکھاوے کا دور دور تک رنگ دکھائی نہ دے، اس سلسلہ میں درج ذیل آیت مبارکہ میں دونوں صورتوں کا تذکرہ ان الفاظ میں ہوا:

O سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۱

''اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ''

(اگر تم صدقات کو ظاہر بظاہر دو کہ جس سے دوسروں کو اس کی تشویق ہو تو وہ بہت اچھا ہے اور اگر انہیں چھپا کر دو اور فقراء و ناداروں کو عطا کرو تو وہ بھی تمہارے لئے ''خیر'' ہے اور وہ تمہاری خطاؤں سے درگزر کئے جانے کا سبب ہوگا)۔

اور فقرہ ''تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ'' سے مراد برائی کی پردہ پوشی ہے اور وہ اس طرح سے کہ نہ تو زبان سے ظالم اور اس کے ظلم کا تذکرہ کریں اور نہ ہی لوگوں کے سامنے اس کی برائی کریں کہ جس سے لوگوں میں اس کی بدنامی ہو یعنی اس کے بارے میں برے الفاظ استعمال نہ کریں، اور نہ ہی عملی طور پر کوئی ایسا کام کریں جس سے اس کی ہتک حرمت ہوتی ہو اور نہ اس سے بدلہ وانتقام لینے کا اقدام کریں خواہ شرعاً اس کے ساتھ ایسا کرنا روا ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۴

''فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ''

(پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی طرح کی زیادتی کرو جو اس نے تم پر کی ہے اور تقوائے الٰہی اختیار کرو)

اور فقرہ ''فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا'' (کہ اللہ عفو و درگزر کرنے والا، نہایت قدرت والا ہے) دراصل اس سبب پر مشتمل ہے جو مسبب کی جگہ ذکر ہوا ہے، بنا برایں فہم المعنیٰ کی غرض سے آیت کو اس طرح فرض کرنا ہوگا: ''ان تعفوا عن سوء فقد اتصفتم بصفة من صفات الله الكمالية وهو العفو على قدرة فان الله ذو عفو على قدرته'' (اگر تم کسی کے برا کرنے سے درگزر کرلو تو گویا تم نے اللہ تعالیٰ کی کمالی صفات میں سے ایک صفت کو اپنا لیا جو کہ بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود عفو و درگزر کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہے کہ وہ طاقت رکھنے کے باوجود گناہگاروں و خطاکاروں سے درگزر کرتا ہے) لہٰذا آیت میں ''فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا'' کلام میں مذکور تین شرائط میں سے صرف ایک شرط کی جزاء پر مشتمل ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری دو شرطوں کا تعلق ہے یعنی ''خیر'' کو ظاہر کرنا اور اسے پوشیدہ رکھنا، تو اگرچہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں کیونکہ وہ خدا ہے، لیکن آیت کے الفاظ صرف آخری مذکورہ صفت یعنی عفو و درگزر کرنے اور طاقت کے باوجود معاف کردینے سے مربوط ہیں، اور ممکن ہے کہ اسی سے کلام میں اشاراتی تذکرہ ہو اور تمام شرائط کہ جو آیت میں ذکر کی گئی ہیں ان کی جزاء کے طور پر ''فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا'' کہا گیا ہو۔

روایات پر ایک نظر

امام محمد باقرؑ کا فرمان

تفسیر ''مجمع البیان'' میں ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ..........'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں کہ کوئی شخص کسی سے بدلہ و انتقام لیتے ہوئے اسے برا بھلا کہے سوائے اس کے کہ جو حقیقی معنیٰ میں مظلوم واقع ہوا ہو اس پر ظلم کیا گیا ہو تو اس کے لئے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ انہی حدود میں رہتے ہوئے کہ جن کی شریعت نے اجازت دی ہو، یہ بیان حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ (مجمع البیان، جلد سوم، صفحہ ۱۳۰)

امام جعفر صادقؑ کا فرمان

ابوالجارود سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے "اَلْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ" کا معنیٰ ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "الجهر بالسوء من القول ان يذكر الرجل بما فيه" "اونچی آواز میں کسی کی برائی بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے اس عیب کو بیان کیا جائے جو اس میں پایا جاتا ہو۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۸۳)

تفسیر قمی کی روایت

زیر نظر آیۂ مبارکہ (لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ........) کی تفسیر میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس میں امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"ان جاءك رجل و قال فيك ما ليس فيك من الخير و الثناء و العمل الصالح فلا تقبله منه و كذبه فقد ظلمك"

اگر تیرے پاس کوئی شخص آئے اور تیرے بارے میں ان خوبیوں، اچھائیوں اور نیک اعمال کا تذکرہ کرے (تیری تعریف کرے) جبکہ وہ چیزیں تجھ میں نہ ہوں تو تو اس کی تصدیق نہ کر، بلکہ اس کی تکذیب کر، کیونکہ اس نے تجھ پر ظلم ڈھایا ہے۔ (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۵۷)

بری مہمانداری ظلم ہے

تفسیر العیاشی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ فضل بن ابی قرہ کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ فرمان ذکر کیا جو آپؑ نے آیۂ مبارکہ "لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص کچھ لوگوں کی ضیافت و مہمانداری کرے مگر اس میں برا رویہ اختیار کرے یعنی ان کی بُری مہمانداری کرے تو گویا اس نے اُن پر ظلم کیا، لہٰذا وہ لوگ اس کے بارے میں جو کچھ کہیں وہ کہہ سکتے ہیں (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۸۳)

یہی روایت تفسیر مجمع البیان میں کسی اسناد کے بغیر ذکر ہوئی ہے اور اہل سنت کی کتب میں اسے مجاہدؔ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، بہرحال یہ تمام روایات آیت کے وسیع معنیٰ پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

آیات ۱۵۰ تا ۱۵۲

○ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾

○ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾

○ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ

○ ”جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروں کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں۔“ (۱۵۰)

○ ”وہی حقیقی معنی میں کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب مقرر کیا ہے۔“ (۱۵۱)

○ ”اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں اور وہ ان میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو اللہ بہت جلد ان کا اجر عطا کرے گا، اور اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے۔“ (۱۵۲)

تفسیر و بیان

ان آیات میں اہل کتاب کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور ان کے کفر کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی، اس کے ساتھ ساتھ ان کے مظالم و گناہوں اور غلط باتوں کو واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ اور رسولوں کا انکار کرنے والے

○ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ''

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں)

اس آیت میں کافروں سے مراد اہل کتاب ہیں یعنی یہودی و نصرانی، یہودی حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرتے ہیں، جبکہ نصاریٰ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرتے ہیں، ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بعض رسولوں کا انکار نہیں کرتے بلکہ وہ صرف بعض رسولوں کا انکار کرتے ہیں، انہیں اللہ اور اس کے تمام رسولوں کا منکر قرار دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے فقرہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ'' میں جو اطلاق وعمومیت پائی جاتی ہے اس کی مزید وضاحت وتشریح کی ضرورت ہے۔

آیت میں فقرہ ''وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ'' (اور وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی ڈالیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں) کو حرف عطف ''وَ'' کے ذریعے پہلے فقرہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ'' پر عطف کیا گیا ہے، اس تفسیری عطف اور معطوف کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس آیت کے بعض حصے دوسرے بعض حصوں کی تفسیر کرتے ہیں بنابرایں وہ لوگ کافر ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں، نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ (ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں)۔

وہ یہ کہہ کر اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی کرتے ہیں لہٰذا وہ اللہ پر تو ایمان رکھتے ہیں اور اس کے بعض رسولوں کو بھی مانتے ہیں مگر اس کے بعض رسولوں کا انکار کرتے ہیں جبکہ وہ جس کا انکار کرتے ہیں وہ بھی اللہ کے رسولوں میں

سے ہے کہ اس کا انکار اللہ کا انکار ہے۔ اسے نہ ماننا اللہ کو نہ ماننا ہے۔

پھر اس مطلب کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے مزید واضح صورت میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا'' (اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ بنالیں) درمیانی راستہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانے اور اللہ اور اس کے تمام رسولوں کا انکار کرنے (کفر) کے درمیان راستہ نکالیں اور وہ یہ کہ اس کے بعض رسولوں پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا خیال غلط و بے بنیاد ہے کیونکہ اللہ پر ایمان کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر رسول اپنے رسول ہونے میں اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے وہ نہ تو خود رسول بنتا ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں اسے کسی طرح کا کوئی اختیار حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اس پر ایمان لانا اللہ پر ہی ایمان لانا ہے اور اس کا نکار کرنا اللہ ہی کا انکار کرنا ہے۔

بنا بر ایں بعض رسولوں کا انکار کرنا، اور بعض رسولوں اور اللہ پر ایمان لانا اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی ڈالنے کے سوا کچھ نہیں گویا اس طرح کا عقیدہ یعنی بعض رسولوں کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا ایسا ہے کہ اس میں کسی چیز کا تعلق اللہ سے نہیں، نہ ایمان لانے کا، اور نہ ہی کفر اختیار کرنے کا، یعنی یہ عقیدہ ایمان و کفر کا درمیانی راستہ ہے۔ اور یہ اس لئے غلط و نادرست ہے کہ کسی کو رسول ماننا اللہ پر ایمان لانے سے کیونکر بے ارتباط ہوسکتا ہے اور کسی کا انکار کرنا اللہ کے انکار سے کیونکر بے تعلق ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جس میں کسی طرح سے شک وشبہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ اس طرح کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ آیت مبارکہ میں ملاحظہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جب یہ بیان فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے بعض رسولوں پر ایمان لانے اور بعض رسولوں کا انکار کرنے سے یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی کریں اور اس طرح اس کے درمیان راستہ نکالیں، تو اس کے بعد ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہی حقیقی معنی میں کافر ہیں چنانچہ ارشاد ہوا: ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' پھر انہیں سخت عذاب کی وعید دی ''وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا'' (اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر کر رکھا ہے)۔

ایمان والوں کا تذکرہ

○ ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ''

(اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر، اور انہوں نے ان میں سے کسی ایک کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا)۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کافر قرار دینے کے بعد کہ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی ڈالنے کا اقدام کیا ان لوگوں کا تذکرہ کیا جو ان کے مقابل میں ایمان والے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی نہیں ڈالتے، دونوں گروہوں کا تقابلی تذکرہ موضوع کے تکمیلی حوالہ پر مبنی ہے۔

یہاں ایک ادبی نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ زیرِ نظر تین آیتوں میں طرزِ بیان میں تبدیلی ہوئی ہے اور وہ اس طرح سے کہ پہلی آیت میں غائب اور پھر دوسری آیت میں متکلم مع الغیر ''وَاَعْتَدْنَا'' کا اندازِ سخن اختیار کیا گیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد ہوا: ''اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ'' شاید اس تبدیلی کی وجہ یہ ہو کہ کفار کی سزا کی نسبت خود متکلم یعنی خداوندعالم کی طرف دینا مقصود ہو کیونکہ ایسا کرنا سننے والے کے ذہن میں مقصود معنی کو راسخ کرنے میں زیادہ مؤثر واقع ہوتا ہے جبکہ غائب کی طرف نسبت دینے میں ایسا نہیں ہوتا، اور یہی بات دوسری آیت میں اندازِ بیان کی تبدیلی میں ملحوظ ہے کیونکہ اس بیان میں کہ جس میں وعدۂ جمیل مذکور ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے یقیناً پورا فرمائے گا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے بات کرنا اس وعدہ کے جلد پورا ہونے کی نشانی ہے۔

آیات ۱۵۳ تا ۱۶۹

○ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

○ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

○ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

○ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

ترجمہ

○ ''اہل کتاب (یہودی) تجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے کتاب نازل کریں جبکہ انہوں نے موسیٰؑ سے اس سے بڑا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو ظاہر بظاہر دکھاؤ، ان کے اس ظالمانہ مطالبہ کی وجہ سے ان پر آسمانی بجلی ٹوٹ پڑی، پھر انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی (اسے خدا بنالیا) حالانکہ ان کے پاس واضح نشانیاں و دلیلیں آچکی تھیں مگر پھر بھی ہم نے ان کی اس زیادتی سے درگزر کیا اور ہم نے موسیٰؑ کو غلبہ عطا کیا۔'' (۱۵۳)

○ ''اور ہم نے ان کے عہد و پیمان کے مطابق ان پر کوہ طور کو بلند کیا اور ہم نے ان سے کہا کہ تم سجدہ کی حالت میں دروازہ سے اندر داخل ہو اور ہم نے ان سے کہا کہ تم ہفتہ کی زیادتی چھوڑ دو اور ان سب کاموں کے لئے ہم نے ان سے پختہ وعدہ لے لیا۔'' (۱۵۴)

○ ''پھر ان کی طرف سے عہد شکنی و وعدہ خلافی، اور اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے اور یہ کہنے کہ ہمارے دل بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایمان نہیں لائیں گے سوائے معدودے چند افراد کے۔'' (۱۵۵)

○ ''اور ان کے کفر اور مریم پر بہت بڑی تہمت لگانے کی وجہ سے۔'' (۱۵۶)

○ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿۱۵۷﴾

○ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۵۸﴾

○ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿۱۵۹﴾

○ فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ﴿۱۶۰﴾

○ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۶۱﴾

○ لَٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ ۚ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَٰئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۶۲﴾

○ ''اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ ہی پھانسی کے تختہ پر لٹکایا بلکہ ان کے سامنے کسی دوسرے کو اس کے مانند کر دیا گیا (یا یہ کہ وہ اشتباہ) کا شکار ہو گئے اور جن لوگوں نے اس کی بابت اختلاف رائے کیا وہ اس سلسلہ میں شک میں مبتلا ہو گئے، وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ صرف اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں، انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا۔'' (۱۵۷)

○ ''بلکہ اللہ نے اسے اپنے پاس اٹھالیا ہے اور اللہ ہی طاقتور و دانا ہے۔'' (۱۵۸)

○ ''اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان لائے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔'' (۱۵۹)

○ ''یہودیوں کے ظلم کرنے کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں اور ان کی طرف سے بہت زیادہ اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے۔'' (۱۶۰)

○ ''اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے جبکہ انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کے اموال غلط و ناجائز طریقہ سے کھاتے تھے، اور ان میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا تو ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب مقرر کر دیا ہے۔'' (۱۶۱)

○ ''البتہ ان میں سے جو افراد علم میں مہارت رکھتے ہیں اور ایمان والے ہیں کہ جو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوا اور جو آپ سے پہلے نازل ہوا، اور وہ نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ و قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، انہی لوگوں کو ہم بہت جلد عظیم اجر عطا کریں گے۔'' (۱۶۲)

○ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ﴿۱۶۳﴾

○ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

○ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

○ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۭ﴿۱۶۶﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ﴿۱۶۸﴾

○ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

- ''ہم نے آپ پر وحی نازل کی جس طرح نوح اور اس کے بعد والے نبیوں پر وحی کی تھی، اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل و اسحاق، یعقوب و اسباط (بنی اسرائیل کے نواسوں) اور عیسیٰ و ایوب و یونس و ہارون و سلیمان پر وحی نازل کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔'' (۱۶۳)
- ''اور کچھ رسولوں کے واقعات ہم آپ کو اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور کچھ رسولوں کے واقعات ہم نے آپ کو بیان نہیں کئے، اور اللہ نے موسیٰؑ سے اچھی طرح بات کی۔'' (۱۶۴)
- ''وہ رسول خوشخبریاں دینے والے اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے تھے تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رے اور اللہ نہایت طاقتور و دانا ہے۔'' (۱۶۵)
- ''لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے آپ پر نازل کیا ہے اس نے اپنے علم سے نازل کیا، اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں، اور اللہ خود گواہی میں کافی ہے۔'' (۱۶۶)
- ''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا تو ایسے لوگ گمراہی کی آخری حدوں کو پہنچے ہوئے ہیں۔'' (۱۶۷)
- ''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کے مرتکب ہوئے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں کسی راہ کی ہدایت کرے گا۔'' (۱۶۸)
- ''سوائے دوزخ کے راستہ کے، کہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ایسا کرنا اللہ کے لئے آسان ہے۔'' (۱۶۹)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں اس مطالبہ کا ذکر ہے جو اہل کتاب نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا کہ ان پر آسمان سے کتاب نازل کی جائے، کیونکہ وہ جبریل کے ذریعے وحی کے ساتھ تدریجی طور پر نازل ہونے والی آیات پر مطمئن نہیں تھے، اُن کے مطالبہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی بات کا جواب بھی مذکور ہے۔

اہل کتاب کے مطالبہ کا تذکرہ

○ ''يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ''

(آپ سے اہل کتاب مطالبہ کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے کتاب نازل کی جائے)

اس میں ''اہل کتاب'' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں کیونکہ قرآنی استعمال میں اس طرح کے موضوعات و موارد میں جب اہل کتاب کا تذکرہ ہو تو اس سے یہی دو گروہ مقصود ہوتے ہیں، لہٰذا اس طرح کا مطالبہ کرنے والے دونوں ہی گروہ ہیں نہ کہ صرف یہودی!

البتہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں جن مظالم کا ذکر ہوا ہے وہ صرف یہودیوں نے انجام دیئے مثلاً خدا کو ظاہر بظاہر دیکھنے کا مطالبہ، بچھڑے کو خدا بنانا اور اس کی پوجا کرنا، کوہ طور پر جاتے ہوئے جو وعدہ حضرت موسیٰ سے کیا تھا اس کو توڑنا، سجدہ کا حکم دینا اور پیر کے دن زیادتی کا مرتکب ہونا وغیرہ، لیکن ان امور کے باوجود اہلِ کتاب سے دونوں گروہ مراد لینے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ کیونکہ دونوں گروہوں کا سلسلہ ایک ہی اصل سے ملتا ہے اور وہ قوم اسرائیل کہ جن کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ مبعوث ہوئے، اگرچہ حضرت عیسیٰ کی قوم نے جو مظالم آنجناب پر ڈھائے وہ اُن مظالم سے کم نہ تھے جو حضرت موسیٰ کی قوم نے حضرت موسیٰ پر روا رکھے، اور چونکہ دونوں قوموں کی اصل ایک تھی لہٰذا یہودیوں کو خود انہی کے اپنے کئے کی سزا کا حوالہ دیتے ہوئے خطاب کیا گیا اور یوں ارشاد ہوا ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ'' (اور ان مظالم کی وجہ سے جو یہودیوں نے ڈھائے ہم نے ان پر وہ پاک چیزیں حرام کر دیں جو اُن کے لئے حلال کی گئی تھیں) اور پھر اسی وجہ سے بعد والی تین آیتوں میں حضرت عیسیٰ کا نام پیغمبروں کی فہرست میں ذکر کرتے ہوئے ان کا حوالہ بھی

حضرت موسیٰؑ کی طرح دیا گیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر صرف یہودیوں کو مخاطب کیا گیا ہوتا تو حضرت عیسیٰؑ کا نام اس طرح ذکر نہ کیا جاتا کیونکہ وہ لوگ یعنی یہودی تو حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہی نہیں ــــ چنانچہ ان آیات کے بعد یوں کہا گیا: ''یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ...... '' (اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور نہ ہی اللہ کے بارے میں سوائے حق کے کوئی بات کرو، بے شک مسیح.......)

بنا برایں تمام قرائن وشواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ زیرِ نظر آیات مبارکہ میں تمام اہل کتاب کے بارے میں عمومی طور پر مطالب ذکر کئے گئے ہیں اور ان سب کو مخاطب قرار دیا گیا ہے نہ کہ صرف یہودیوں کو! لہٰذا جملہ ''یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ..... '' میں سوال کرنے والوں سے مراد تمام اہل کتاب ہیں، اور یہودیوں کو خاص طور پر اس لئے مخاطب قرار دے کر بات کی گئی ہے کیونکہ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تمام ناحق اعمال میں باہم شریک ہیں جو کہ ان کی قومی خصلت ہے مثلاً دھونس ودھمکی، ناحق بات پر ڈٹ جانا، بیہودہ باتیں کرنا، اور عہد و پیمان کی عملی پابندی نہ کرنا وغیرہ تو ان امور واعمال کے تذکرہ میں جب کہیں کسی مخصوص گروہ کے اعمال کا حوالہ آتا ہے تو خطاب کا رُخ اس طرف کر دیا جاتا ہے۔

اور اہل کتاب نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو مطالبہ کیا وہ یہ تھا کہ ان پر آسمان سے کتاب نازل کی جائے، انہوں نے یہ مطالبہ قرآن مجید نازل ہونے سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کے سامنے آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت کرنے سے پہلے نہیں کیا اور نزولِ قرآن سے پہلے اس طرح کا مطالبہ وہ کر ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ ان کا یہ مطالبہ مدینہ میں ہوا جبکہ نزولِ قرآن کا آغاز مکہ میں ہوا اور بعض حصہ مدینہ میں بھی نازل ہو چکا تھا، بلکہ ان کے مطالبہ کا پس منظر یہ تھا کہ وہ لوگ قرآنِ مجید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی دلیل تسلیم ہی نہ کرتے تھے اور اسے آسمانی کتاب ہی نہ مانتے تھے حالانکہ قرآنِ مجید میں جو کچھ نازل ہو چکا تھا اُس میں اہل کتاب سمیت سب کو چیلنج کیا گیا تھا کہ اگر وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں تو اس جیسی کتاب پیش کریں جیسا کہ اس حوالہ سے ان سورتوں میں واضح بیان موجود ہے، سورۂ اسریٰ، یونس، ہود، بقرہ اور یہ تمام سورتیں سورۂ نساء سے پہلے نازل ہوئیں۔

بنا برایں ان کا یہ مطالبہ کہ کوئی آسمانی کتاب اُن پر نازل کی جائے جبکہ وہ قرآن کے نزول کی حقیقت کا مشاہدہ کر چکے تھے ایک طرح کا نہایت غیر معقول و بے ہودہ مطالبہ تھا جو کہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو حق کو جانتے و پہچانتے ہوئے بھی اس کا انکار کرے اور حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو، اس کا اس طرح کا مطالبہ کرنا نہایت بے بنیاد اور ہٹ دھرمی و بیجا ضد کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ اپنے شیطانی نفس کی اندھی پیروی کرنے میں مصروف ہوتا ہے، اور یہودیوں کا مطالبہ بھی قریش واہل مکہ جیسا تھا کہ جنہوں نے قرآن نازل ہوتا دیکھ کر اور اس کی حق وصحیح دعوت کے باوجود جو کچھ کہا اسے اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانی قرآنِ مجید میں ذکر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

○ سورۂ یونس، آیت: ۲۰

''لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ''

(اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی آیت نازل کیوں نہیں ہوتی؟)

○ سورۂ اسریٰ، آیت ۹۳

''اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ''

(یا تو آسمان کی طرف پرواز کر جا، اور ہم تیرے آسمان کی طرف پرواز کرنے کے باوجود بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تو ہم پر آسمان سے کوئی کتاب نازل نہ کرے کہ جسے ہم پڑھ سکیں)

انہی وجوہات کی بناء پر کہ جو ہم نے ذکر کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کے جواب میں ارشاد فرمایا:

(۱) یہ لوگ سرکش اور اپنی جہالت و گمراہی میں ضدی ہیں اسی وجہ سے وہ کسی بڑے بڑے ظلم سے بھی اجتناب نہیں کرتے اور نہ ہی کفر وہٹ دھرمی کو چھوڑتے ہیں خواہ ان کے پاس حق وحقیقت کی جتنی دلیلیں آجائیں بلکہ وہ اپنے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنے سے بھی باز نہیں آتے خواہ جس قدر پختہ کیوں نہ کر چکے ہوں اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی بھی حوالہ سے جھوٹ، تہمت اور ناروا کاموں سے دریغ نہیں کرتے، تو اس صورتحال کے ساتھ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مطالبہ کا مثبت جواب دے اور ان کی باتوں کو اہمیت دے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے یعنی قرآن کریم، اس کی حقانیت کی گواہی خود اللہ تعالیٰ اور فرشتوں نے اس کے نزول کے ساتھ ساتھ دی ہے، اور وہی کتاب اپنی متعدد آیات کریمہ میں بار بار ان لوگوں کو چیلنج کرتی ہے کہ اس جیسی کتاب پیش کرو۔

ذیل میں وہ آیات کریمہ ذکر کی جاتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے مطالبہ کے جواب میں جو ارشاد فرمایا وہ درج ذیل آیات میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو:

○ سورۂ بقرہ، آیات ۵۵، ۵۶　　　سورۂ اعراف، آیت: ۱۵۵

''فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ'' یعنی انہوں نے موسیٰؑ سے اس بھی بڑا مطالبہ کیا تھا یعنی کتاب نازل کرنے سے بھی بڑا مطالبہ!ـــــ ''فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً'' یعنی انہوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو ظاہر بظاہر دکھاؤ کہ ہم اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں، تو اس طرح کی بات کسی انسان کی پرلے درجے کی جہالت، بیہودگی وسرکشی کا ثبوت دیتی ہے۔ ''فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ'' تو ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر آسمانی بجلی ٹوٹ پڑی۔

اور سورۂ بقرہ کی آیت ۵۴ میں اس سلسلہ میں جو مطالب مذکور ہیں وہ یہ ہیں:

''ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ'' (پھر انہوں نے واضح دلائل آنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کرنا شروع کردی) اس سے مراد ان کا بت پرستی کے باطل و ناجائز ہونے کے ثبوت کے بعد بچھڑے کی پرستش کرنا ہے یا اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ایسا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیات اور حادث ہونے سے مُنزّہ و پاک ہے، تو اس طرح کے اعمال بشری جہالتوں کی بدترین صورت ہے۔ ___ ''فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا'' (پھر ہم نے ان کے اس عمل سے درگزر کرلیا اور ہم نے موسیٰؑ کو واضح دلیل عطا کی ___ چنانچہ موسیٰؑ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے خالق کے حضور توبہ کریں اور ایک دوسرے کو قتل کردیں، اور جب وہ ایک دوسرے پر دھاوا بول کر ٹوٹ پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں معاف کردیا اور انہیں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے عمل کو پورا نہیں ہونے دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سب کے سب مارے جائیں، عفو و درگزر کرنے اور معاف کرنے سے مراد یہی ہے۔ اور موسیٰؑ کو سلطانِ مبین عطا کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنجنابؑ کو بچھڑے کی پوجا کرنے والوں اور سامری اور اس کے بچھڑے پر غلبہ عطا کیا۔

یہی واقعہ دو مرتبہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے ملاحظہ ہو آیات مبارکہ ۶۳، ۹۳ کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ''مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ'' (اور ہم نے ان پر طور حاوی کردیا ان کے میثاق کی بناء پر!) اس میں اسی عہد و پیمان کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا کہ پھر ان پر طور مسلط کردیا۔

اور سورۂ بقرہ کی آیات ۵۸، ۶۵ میں اس طرح مذکور ہے: ''وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا'' (اور ہم نے ان سے کہا کہ تم دروازہ میں داخل ہو جاؤ سجدہ کرتے ہوئے، اور ہم نے ان سے کہا کہ تم ہفتہ کے دن زیادتی نہ کرو، اور ہم نے ان سے نہایت پختہ عہد لے لیا)۔

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۱، ۱۶۳ میں بھی مذکور ہے، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ میثاق کا تعلق دو مختلف واقعات سے ہو یا ان کے علاوہ دیگر واقعات سے ہو کیونکہ قرآن مجید میں ان سے لئے گئے میثاق کا تذکرہ کئی بار ہوا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۸۳ میں یوں ذکر ہوا: ''وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ'' (اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا) اور سورۂ بقرہ ہی آیت ۸۴ میں یوں مذکور ہے: ''وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ'' (اور جب ہم نے تم سے عہد لے لیا کہ تم آپس میں خوں ریزیاں نہ کروگے اور نہ ہی اپنوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کروگے، پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم نے اس کی گواہی بھی دی)۔

عہد شکنی و ناروا اعمال

○ ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ''

(اور ان کی عہد شکنی کی وجہ سے)

فَبِمَا پر حرف فا تفریع کی غرض سے ہے۔ یعنی سابقہ مطلب کی فرع اور اس سے مربوط ہے۔ اور مجرور یعنی نَقْضِهِمْ کا تعلق بعد والی چند آیات سے ہے کہ جن میں اُن کے جرائم ذکر کیے گئے ہیں جو کہ ''حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ'' سے شروع ہوتی ہیں، تو ان آیات میں ان کے ناروا اعمال و جرائم کی دُنیاوی و اُخروی سزاؤں کو بیان کیا گیا ہے اور اسی میں ان کے بعض ان جرائم و بری عادات کو بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس سے پہلے بیان نہیں کی گئیں تھیں۔

پہلا جرم: فقرہ ''وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ'' میں بنی اسرائیل کی طرف سے کفر کی مختلف صورتوں کے ارتکاب کو یکجا ذکر کیا گیا ہے کہ جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے عہد میں انجام دیئے اور جو ان کے بعد انجام دیئے، یعنی اُنہوں نے جو بھی کافرانہ اعمال انجام دیئے سب کا ذکر اس ایک ہی جملہ میں کیا گیا ہے۔ ان اعمال میں سے اکثر کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے اور ان میں سے دو موارد زیرِ نظر آیاتِ مبارکہ کی ابتداء میں ان الفاظ میں ذکر کیے گئے:

(۱) ''فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً''

(۲) ''ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ''

ترجمہ: (۱) تو انہوں نے موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا، انہوں نے کہا کہ ہمیں اللہ ظاہر بظاہر دکھاؤ۔

(۲) پھر اُنہوں نے بچھڑے کو خدا بنا لیا بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح دلائل آ چکے تھے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا دو کافرانہ اعمال کا ذکر ابتدائی آیات میں پہلے جبکہ زیر نظر آیت میں آخر میں ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مقامات موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا ان دونوں کے مقامی تقاضے بھی مختلف ہیں کیونکہ ابتدائے آیات میں ان کا یہ اعتراض و مطالبہ مذکور ہے کہ اُن پر آسمان سے کتاب کیوں نازل نہیں کی جاتی، اور اس سے بڑا مطالبہ یہ کہ ہمیں اللہ ظاہر بظاہر دکھائیں اور پھر ان کا بچھڑے کو خدا بنا لینا، تو ان دو کافرانہ مطالبوں کا تذکرہ مقامی موزونیت کا حامل ہے، جبکہ زیر نظر آیت اور اس کے بعد والی آیات میں اُن کے ان اعمال کی سزائیں مذکور ہیں جن کا ارتکاب اُنہوں نے دعوت حق قبول کرنے کے بعد کیا، اور اس آیت میں چونکہ اُن کے برے اعمال کے اسباب کا تذکرہ ہوا، لہٰذا ان کی طرف سے عہد شکنی کا تذکرہ اسی جگہ ہی موزوں و مناسب تر ہے۔

دوسرا جرم: فقرہ ''وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ'' (اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا) میں نبیوں کے لفظ سے حضرت

زکریاؑ و حضرت یحییٰؑ اور ان کے علاوہ دیگر انبیاءؑ مراد ہیں جن کے قتل کا اجمالی تذکرہ ان کے نام لئے بغیر قرآن مجید میں ہوا ہے

تیسرا جرم: فقرہ "وَّ قَوۡلِہِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ" (اور ان کا یہ کہنا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں) میں لفظ "غُلۡفٌ" اغلف کی جمع کا صیغہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ہم دعوتِ نبویہ کو سن ہی نہیں سکتے اور حق کو قبول کرنے سے قاصر ہیں، یہودیوں کا یہ اظہار درحقیقت حق کی دعوت کو رد کردینے کا اظہار ہے کہ جسے وہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، گویا وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اُن کے دل پردوں میں ہیں، یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ حق کے علاوہ کسی بھی دوسری دعوت کو قبول نہ کرنے میں وہ بے اختیار ہیں اور یہ ان کے بس میں ہی نہیں کیونکہ اللہ نے انہیں پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی دعوت کو قبول کر ہی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اظہارات کو رد کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: "بَلۡ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیۡہَا بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا" (بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے سوائے چند افراد کے!) اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ ان کا دعوت حقہ کو قبول نہ کرنا اور اس پر کان نہ دھرنا اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس حالت میں قرار دینے کا نتیجہ ہے لیکن یہ اس طرح نہیں جس طرح وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں، بلکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس لئے اس حال سے دوچار کیا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور حق قبول کرنے سے انکاری ہوئے، لہٰذا اسی کا اثر و نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ سوائے ان میں سے چند افراد کے، ایمان نہیں لاتے۔

یہاں "اِلَّا قَلِیۡلًا" کے ذریعے جس استثنائی صورت کا تذکرہ ہوا ہے اس کی بابت سابقہ بیانات میں مربوطہ مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کا عذاب نازل کرنے کی بات ان کی قومی و اجتماعی حیثیت و حوالہ سے ہے، تو ان پر عذاب دراصل ان کے ایک قوم کے لحاظ سے نازل ہوا یعنی مجموعی صورت میں ان پر عذاب و سزا کا حوالہ ملحوظ ہے کہ وہ مجموعی طور پر ایسے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہریں لگا دی گئی ہیں جس کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے، لہٰذا ان میں سے معدودے چند افراد کا ایمان لانا اس سے مستثنیٰ کیا گیا کہ جس سے اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی ان پر من حیث القوم سزا نازل ہوئی جبکہ ان میں سے بعض افراد مستثنیٰ ہوئے جو ایمان والے ہیں۔

چوتھا جرم: فقرہ "وَّ بِکُفۡرِہِمۡ وَ قَوۡلِہِمۡ عَلٰی مَرۡیَمَ بُہۡتَانًا عَظِیۡمًا" میں ان کی طرف سے اس الزام و تہمت کا تذکرہ ہے جو اُنہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر لگا کر انہیں زنا کی مرتکب قرار دیا کہ جس سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ جبکہ ان کا ایسا کرنا کفر اور بہتان دونوں ہی ہیں حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی ولادت کے ابتدائی لمحات ہی میں اُن سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا: "اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا" (میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا) سورۂ مریم، آیت: ۳۰

پانچواں جرم: فقرہ ''وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ'' (اوران کا یہ کہنا کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے حالانکہ انہوں نے اسے نہ قتل کیا اور نہ ہی سولی پر لٹکایا بلکہ ان کے سامنے ان کی مثل ایک صورت قرار دی گئی) میں مذکورہ مطالب کے حوالہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مربوط جو واقعات ذکر ہوئے ان کا تذکرہ سورۂ آلِ عمران میں ہو چکا ہے کہ ان کے درمیان آپس میں حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی کیفیت کی بابت اختلاف پیدا ہوا کہ آیا انہیں سولی پر لٹکایا گیا یا نہیں لٹکایا گیا؟ چنانچہ زیر نظر آیۂ مبارکہ میں پہلے یہ بیان ہوا کہ انہوں نے کہا: ہم نے اسے قتل کیا ہے، تو ان کے اس بیان کے ساتھ اُن کے اس مجرمانہ وکافرانہ عمل کی کیفیت کا حوالہ دے کر یوں ارشاد ہوا کہ نہ تو انہوں نے اسے قتل کیا اور نہ ہی اسے سولی پر لٹکایا، تو ان دونوں کا یکجا بیان کیا جانا اُن لوگوں کے اظہارات اور دعووں کی سراسر نفی کی غرض سے ہوا تا کہ اس سلسلہ میں کسی بھی حوالہ سے شک کی گنجائش نہ پائی جائے کیونکہ جہاں تک سولی پر لٹکایا جانے کا تعلق ہے جو کہ مجرموں کو سزا دینے اور اُنہیں کیفر کردار تک پہنچانے کی ایک صورت ہے وہ قتل میں ہمیشہ معمول نہیں ہوتی یعنی صرف اسی صورت میں قتل کرنا منحصر نہیں، اور نہ ہی لفظ ''قتل'' کے استعمال کے وقت ہمیشہ اسی صورت کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی بابت اس کی کیفیت میں اختلاف رائے پیدا ہوا لہٰذا صرف ''قتل'' کی نفی سے ان کے دعوے کی کامل نفی نہ ہو سکتی تھی بلکہ اس میں اس تاویل کی گنجائش باقی رہ جاتی کہ شاید انہوں نے عام طریقہ سے قتل نہ کیا بلکہ سولی پر چڑھایا ہو لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں دونوں حوالے ذکر کئے، پہلے ارشاد فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوۡهُ'' (اُنہوں نے اسے قتل نہیں کیا) اور پھر اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا: ''وَمَا صَلَبُوۡهُ'' (اور نہ ہی اُنہوں نے اسے سولی پر لٹکایا) یہ اس لئے ہوا تا کہ صراحت کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت ہو سکے اور اس حقیقت کا واضح ثبوت اور نص و دلیل سامنے آ سکے کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھوں قتل نہیں ہوئے اور نہ ہی اُن کے ہاتھوں سولی پر لٹکائے گئے، بلکہ ان کے سامنے حضرت عیسیٰؑ کی صورت قرار دی گئی، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی بجائے کسی شخص کو پکڑا اور اسے قتل کر دیا یا سولی پر لٹکا دیا، اور ایسا ہونا عام طور پر بعید بھی نہیں کیونکہ اس طرح کے وحشیانہ معاشروں میں جب کسی جگہ ہنگامہ خیزی ہو اور مار پیٹ وقتل وغارت کا بازار گرم ہو تو اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اصل مجرم کی بجائے کسی دوسرے شخص پر دھاوا بول دیا جائے اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص جو حضرت عیسیٰؑ سے مشابہ تھا رومی سپاہیوں نے اسے قتل کیا اور وہ حضرت عیسیٰؑ کو بخوبی نہیں پہچانتے تھے۔ لہٰذا اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ اُنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی بجائے کسی دوسرے شخص کو پکڑ کر قتل کر دیا پھر اس کے باوجود روایات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے شخص کو حضرت عیسیٰؑ کی شکل میں قرار دیا کہ جسے اُنہوں نے پکڑا اور اسے حضرت عیسیٰؑ سمجھ کر قتل کر دیا۔

البتہ بعض محققین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے جن واقعات کو ذکر کیا اور ان کی دعوت حقہ اور ان کے دور کے حکام وارباب اقتدار سے مربوط مطالب بیان کئے وہ سب کے سب مجموعی طور پر دو افراد پر منطبق ہوتے ہیں کہ جن کا

نام ''مسیح'' تھا۔ ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کا زمانی فاصلہ تھا کہ ان میں پہلا حق پر تھا (حضرت عیسیٰؑ) کہ جسے قتل نہیں کیا گیا جبکہ دوسرا باطل پر تھا اور اسے سولی پر لٹکایا گیا (یاد رہے کہ اس محقق کے نزدیک موجودہ مروّجہ عیسوی تاریخ بھی مشکوک ہے اور وہ اسے درست قرار نہیں دیتے)۔

بنا برایں قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ قرار دیئے جانے کا تذکرہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم رسول اللہؑ کے ساتھ اس مسیح کی تشبیہ دی گئی جسے سولی پر لٹکایا گیا۔ واللہ اعلم

یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے حوالہ سے جس اختلاف کا حوالہ دیا گیا اس سلسلہ میں یوں ارشاد ہوا: ''وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ'' یعنی جن لوگوں نے اس کی بابت اختلاف رائے کیا یا اس کے قتل کے بارے میں مختلف آراء قائم کیں ''لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ'' وہ اس سلسلہ میں شک کا شکار ہیں، یعنی اس کے بارے میں حقیقت الامر سے ناآگاہ ہیں ''مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ'' وہ اُنہیں کچھ معلوم نہیں سوائے گمان کی پیروی کرنے کے! یعنی تخمینی طور پر اور اپنے ہی اندازوں و مفروضوں کے مطابق یا ایک دوسرے کی باتیں وافواہیں سن کر رائے قائم کرتے ہیں۔

اور فقرہ ''وَ مَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا'' سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اسے یقینی طور پر پہچانتے ہوئے قتل نہیں کیا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اسے یقیناً وہرگز قتل نہیں کیا، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ''وَ مَا قَتَلُوْهُ'' میں ضمیر ''ہُ'' کی برگشت علم کی طرف ہے۔ یعنی اُنہوں نے علم کو یقیناً قتل نہیں کیا، اور لغت میں علم کو قتل کرنے سے مراد اس کا شک وغیر یقینی کیفیت سے مبّرا کیا جانا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ضمیر ''ہُ'' کی برگشت ''علم'' کی بجائے ''ظن'' کی طرف ہوتی ہے اس بناء پر اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے عقیدہ ونظریہ میں ناپختہ گمان کے علاوہ کوئی مضبوط دلیل نہیں رکھتے، اگر یہ قول لغت کے حوالہ سے قرین صحت بھی مان لیا جائے تب بھی اسے قرآنی استعمالات پر محمول نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ ایک نامانوس اور ذوق فصاحت الکلام سے اجنبی معنی ہے کہ جو قرآنی الفاظ و انداز سے معنوی مطابقت نہیں رکھتا۔

حضرت عیسیٰؑ کا آسمان پر اُٹھایا جانا

○ ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا''

(بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اُٹھالیا، اور اللہ غالب ودانا ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا سورۂ آلِ عمران آیت ۵۵ میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

''اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ''

(جب اللہ نے کہا، اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں)

اس میں پہلے "مُتَوَفِّیْكَ" فرمایا اور پھر "رَافِعُكَ" فرمایا، یہاں "توفی" سے مراد دنیا میں وقت پورا کرنا ہے۔

سیاق الکلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں یہودیوں کے دعووں کی نفی ہوئی ہے کہ جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل و سولی پر لٹکانے کی بابت کئے اور اس حقیقت کو بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نہ تو ان کے قتل اور نہ ہی سولی پر لٹکائے جانے میں سے کسی ایک کا بھی شکار نہیں ہوئے، اور آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے جسے قتل کرنے یا سولی پر لٹکانے کا دعویٰ کیا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اسے ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم کے ساتھ اپنی طرف اُٹھایا اور اسے دشمن سے محفوظ کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کے جسم و روح دونوں کے ساتھ آسمان پر اُٹھایا گیا اور ایسا نہیں کہ پہلے اُنہیں موت دی گئی ہو اور پھر ان کی روح کو آسمان کی طرف لے جایا گیا ہو جیسا کہ عام افراد بشر میں ہوتا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر صرف روح کے آسمان کی طرف لے جانے کا بیان مقصود ہو تو آیت کے ظاہری الفاظ اس سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ صرف روح کا آسمان کی طرف لے جایا جانا قتل، سولی پر لٹکانے اور عام صورت میں وفات پانے میں یکساں صورت رکھتا ہے۔ یعنی خواہ کسی کو طبعی موت آئے یا اسے قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے ہر حال میں اس کی روح آسمان کی طرف لے جائی جاتی ہے، لہٰذا یہ کہنا بے معنی ہوگا کہ یوں کہا جائے: بلکہ ہم نے اسے اپنی طرف اٹھایا ہے (بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ) لفظ "بَلْ" سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو روح و بدن کے ساتھ آسمان پر لے جایا گیا۔

بنابرایں "رفع" یعنی آسمان پر لیجایا جانا ایک طرح سے نجات دلانا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص انداز میں یہودیوں سے نجات دلانے کے لئے اختیار کیا، تو اس میں نجات دلانے کے طور طریقہ کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا کہ خواہ روح قبض کرنے سے ہو یا نہ ہو اور اس میں سولی پر لٹکانے کی صورت بھی نہ پائی جاتی بلکہ کسی دوسری صورت میں ہو کہ جس کی کیفیت کا علم ہمیں نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لقاء اللہ کی مخصوص صورت میں وہ اللہ کے پاس زندہ و باقی ہوں اور ہم اس کی کیفیت سے آگاہ نہ ہو سکیں، تو اس میں دونوں احتمالات پائے جاتے ہیں۔ یعنی "توفی" اور "رفع" میں تمام امکانی صورتوں کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن اُن صورتوں میں سے کسی ایک کا یقینی طور پر معلوم ہونا اور اس کی کیفیت سے آگاہ ہونا یہ ہمارے مقدور میں نہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ کا وقت پورا کر دے اور انہیں اپنے پاس لے جائے اور ان کی حفاظت کرے، یعنی اس کا وقوع پذیر ہونا محال نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کا وقت پورا کر دیا ہو اور انہیں اپنی طرف لے گیا اور انہیں اپنی حفاظت و پناہ میں لے لیا ہو یا یہ کہ ان کی زندگی کی اس طرح حفاظت کر رہا ہو جو ہمارے ہاں زندگی کی بقاء کے حوالہ سے معمول نہیں ہے یعنی ہماری زندگی کی کیفیات سے قطعی مختلف ہو۔

اور یہ کام ان معجزاتی واقعات کے مقابلے میں زیادہ سخت نہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے فرمایا ہے مثلاً ان کی اعجاز آمیز ولادت کہ غیر شادی شدہ ماں سے پیدا ہوئے اور پھر اپنی ولادت کے چند لمحوں بعد اپنی نبوت اور اپنی ماں کی عصمت کی گواہی میں بیان دیا۔ اور اپنی قوم میں رہتے ہوئے دیگر اعجاز آمیز امور انجام دیئے۔ اسی طرح قرآنِ مجید میں جو معجزات حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت صالحؑ اور دیگر انبیاءؑ کے حوالہ سے مذکور ہیں، تو ان سب کا وقوع پذیر ہونا اور عملی طور پر سامنے آنا ایک ہی اصول اور قاعدہ کی بناء پر ہے کہ جس کی صحت و وقوع پر قرآن مجید کے ناقابل انکار بیانات موجود ہیں، البتہ بعض حضرات نے بلا وجہ تاویل و توجیہ کا سہارا لینے کی کوشش کر کے معجزہ اور خارق العادت امر کے وقوع پذیر ہونے کے نظریہ سے بچنے کی راہ نکالی تا کہ یہ کہا جا سکے کہ اس طرح کے امور سے اس عام قانون کی نفی ہوتی ہے جو عالم مادی پر حاکم و نافذ ہے یعنی علت و معلول کا قانون کہ جس کی بناء پر ہر چیز اپنے وجود میں آنے کے سبب سے وابستہ ہوتی ہے کہ اس کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی، معجزہ اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہم نے اس کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلی بحث کی ہے اور مربوطہ مسائل و امور کو واضح طور پر ذکر کیا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعد والی آیت (۱۵۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت اس امر کی اشاراتی دلیل ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں اور وہ ہرگز نہیں فوت ہوئے۔

حیاتِ عیسیٰؑ کا قرآنی حوالہ

○ ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا''

(اہل کتاب میں سے ہر شخص اس پر اس کے مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ ان سب پر قیامت کے دن گواہی دیں گے)۔

اس آیت کے حوالہ سے لفظی و معنوی دونوں طرح سے بحثیں ہوئی ہیں، ملاحظہ ہوں:

یہاں حرف ''اِنۡ'' نافیہ ہے (نفی کا معنیٰ دیتا ہے) اور اس کا مبتداء محذوف ہے کہ جس کا ثبوت اسی سلسلہ میں ذکر ہونے والے مطالب ہیں یعنی نفی کے سیاق میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں مبتداء محذوف ہے لہٰذا جملہ کو یوں فرض کرنا ہوگا: ''وان احد من اهل الکتاب الا لیؤمنن به''، یعنی لفظ ''احد'' محذوف قرار دیا جائے گا اور یوں معنیٰ کیا جائے گا کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہوگا جو ان پر ان کی موت سے پہلے ایمان نہ لائے۔

اور ''بِهٖ'' اور ''يَكُوۡنُ'' میں ضمیر کی بازگشت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہوتی ہے۔ البتہ ''قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' میں ضمیر کی بابت اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کی بازگشت اسی مبتداء کی طرف ہے جس کے محذوف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یعنی ''احد'' اس بناء پر یوں معنیٰ کیا جائے گا، اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے پہلے حضرت

عیسیٰؑ پر ایمان لائے گا یعنی اسے حالت احتضار اور قبض روح سے پہلے اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جائے گی کہ حقیقی معنی میں عیسیٰؑ اللہ کے رسول اور اس کے عبد تھے۔ اگر چہ اس کا یہ ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان سب کے خلاف گواہی دیں گے خواہ ان میں سے کوئی ان پر جس طرح سے بھی ایمان لایا ہو جیسا کہ موت کے وقت ایمان لانے والا، تو حضرت عیسیٰؑ ان سب کے بارے میں گواہی دیں گے اور ان کی بدنیتی کا اظہار کریں گے۔

اس نظریہ کی تصدیق و تائید کہ ''قَبْلَ مَوْتِهٖ'' میں ضمیر (ہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے ان روایات سے ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور وہ نہیں مرے اور یہ کہ وہ آخر الزمان میں آسمان سے نیچے تشریف لائیں گے تو اہل کتاب میں سے یہود و نصاریٰ ان پر ایمان لائیں گے۔

لیکن اس نظریہ کے حوالہ سے ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ضمیر کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف لوٹایا جائے تو اس سے آیت میں تخصیص لازم آئے گی اور اس کی وہ عمومیت فقرہ ''وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' میں موجود ہے کہ جس میں ہر اہل کتاب شامل ہے خواہ وہ عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے کے زمانہ میں موجود ہو یا ان کے واپس آنے کے بعد کے دور میں ہو جبکہ مذکورہ بالا نظریہ کی بناء پر صرف وہی اہل کتاب مقصود قرار پائیں گے جو آنجنابؑ کے آسمان سے اترنے کے وقت موجود ہوں تمام اہل کتاب مقصود نہیں ہوں گے، یعنی جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے کے بعد فوت ہو گئے وہ اس میں شامل نہیں ہوں گے، تو اس طرح آیت کی عمومیت کا دائرہ تنگ ہو جائے گا کہ جس کی کوئی ظاہری دلیل موجود نہیں۔ اسے علمی اصطلاح میں تخصیص بلا مخصص کہتے ہیں، یعنی کسی عام سے خاص مراد لینا جبکہ خاص مراد لینے کی کوئی وجہ و دلیل موجود نہ ہو۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰؑ ہی کی طرف لوٹتی ہے اور اہل کتاب کے ان پر ایمان لانے سے مراد یہی ہے کہ جب وہ آسمان سے اُتریں گے تو وہ لوگ ان پر ایمان لائیں گے، اس قول کی دلیل وہی روایت ہے جو ابھی ذکر ہو چکی ہے۔

یہ ہیں وہ اقوال جو ضمیر (ہ) کے حوالہ سے پیش کئے گئے ہیں لیکن اس سلسلہ میں بخوبی غور و فکر کرنے اور اس سے مربوطہ جہات کو ملحوظ خاطر قرار دینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فقرہ ''وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' چونکہ آیۂ مبارکہ ''وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' کے سیاق میں آیا ہے جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن ان کے خلاف گواہی دیں گے جیسا کہ وہ لوگ مرنے سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے حوالہ سے اس گواہی کا تذکرہ سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۷ میں ان الفاظ میں فرمایا: (عیسیٰؑ نے کہا) ''وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ'' (میں جب تک ان میں تھا تو میں ان پر گواہ تھا، پھر جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو تو خود ان پر نگران ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے) تو اس بیان میں حضرت

عیسیٰؑ نے اپنے گواہ ہونے کو اسی وقت تک محدود کر کے اس کا اظہار کیا جب وہ ان لوگوں میں زندگی گزارتے رہے یعنی اس سے پہلے تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وقت پورا کر دیا، اور اس آیت یعنی "وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ..... الخ" سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے اوپر ایمان لانے والے تمام افراد پر گواہ ہوں گے لہٰذا اگر اس زمانہ کے تمام لوگ ان پر ایمان لاتے تو وہ سب سے آخر میں دنیا سے جاتے، اس سے دوسرے معنی کا ثبوت ملتا ہے اور وہ یہ کہ آنجنابؑ ابھی زندہ ہیں اور دوبارہ ان لوگوں کی طرف لوٹ کر آئیں گے تا کہ وہ ان پر ایمان لائیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص ان کے دوبارہ واپس تشریف لانے کے زمانہ میں موجود نہ ہوگا وہ اپنی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا اور جو موجود ہوگا وہ اضطراری یا اختیاری کسی بھی صورت میں ان پر ایمان لے آئے گا۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ "وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ..." کے سیاق یعنی آیۂ مبارکہ "وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ....... بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا" کے بعد ذکر ہونے کے تناظر میں یہ بات زیادہ مناسب و موزوں ہے کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے کے بیان پر مشتمل قرار دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنجنابؑ زندہ ہیں کیونکہ اس کے علاوہ کوئی ایسی واضح غرض دکھائی نہیں دیتی جس کی بنیاد پر ان لوگوں کے اضطراری ایمان لانے اور آنجنابؑ کے ان کے خلاف گواہی دینے کی توجیہ و تاویل ہو سکے یا اس سے کسی خاص غرض کا استفادہ مقصود ہو۔

اس سے اس حقیقت کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ آیت مبارکہ میں ان تمام لوگوں کے آنجنابؑ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ آنجنابؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں گے۔

لیکن اس موضوع سے مربوط دیگر آیات مبارکہ میں مذکور مطلب اس احتمالی نظریہ کی نفی سے خالی نہیں، یعنی ان کے تناظر میں ہماری مذکورہ رائے کی نفی کا پہلو سامنے آتا ہے مثلاً:۔

سورۂ آل عمران، آیت: ۵۵

"اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ"

(جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور تجھے ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں قیامت کے دن کفر اختیار کرنے والوں پر فوقیت عطا کروں گا)۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے والے لوگ قیامت تک باقی ہوں گے۔

اسی طرح زیر نظر آیات میں آیت ۱۵۵ کے یہ الفاظ بھی مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل ہیں: "وَ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ

طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ''(اور ان کا یہ کہنا کہ ہمارے دل بند ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگادی ہے، لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے سوائے چند افراد کے!)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقمت و بدبختی ان کا مقدر بن چکی ہے لہٰذا ان کا یہودی معاشرہ اپنی یہودی حیثیت کے ساتھ یا اہل کتاب ہونے کے ناطے وہ قیامت تک ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ اسی آیت کا ذیل ''وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ''(اور میں جب تک ان میں موجود رہا تو میں ان پر گواہ ونگران تھا، پس جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو تو خود ہی ان پر نگران ہے)اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کے بعد بھی اپنے عقیدہ پر قائم ہیں۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ آیات مذکورہ بالا حقیقت کی نفی نہیں کرتیں کیونکہ آیت کے یہ الفاظ ''وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ''(اور میں قیامت کے دن ان لوگوں کو کفر اختیار کرنے والوں پر برتری وفوقیت عطا کروں گا جنھوں نے تیری پیروی کی)ان لوگوں کے قیامت تک اہل کتاب ہونے پر باقی رہنے کو ثابت نہیں کرتے۔

اسی طرح جملہ ''بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ......الخ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب ایمان نہیں لائیں گے، اور اگر کبھی وہ ایمان لے بھی آئے تب بھی ان کا ایمان لانا ان کی کثیر تعداد میں سے معدودے چند افراد ہی کو حاصل ہوگا، اور جہاں تک اس فقرہ کا تعلق ہے: ''وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ''(اور اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو اس پر مرنے سے پہلے ایمان نہ لائے)تو اگر اس سے یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اس کے مرنے سے پہلے اس پر ایمان لائیں گے تب بھی اس سے اصل ایمان لانا ثابت ہوگا لیکن آیا وہ ایمان قابل قبول اور غیر اضطراری بھی ہوگا اس کا ثبوت اس سے نہیں ملتا۔

اسی طرح جملہ ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ''میں ''عَلَيْهِمْ'' کی ضمیر ''ھم'' کی بازگشت اہل کتاب یا نصاریٰ کی طرف نہیں بلکہ تمام لوگوں کی طرف ہے کیونکہ ابتدائے کے کلام میں یوں ارشاد ہوا: ''وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ''(اور جب اللہ نے کہا: اے عیسٰی بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا ہے کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو دو معبود قرار دو؟) سورۂ مائدہ، آیت:۱۱۶_______، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مذکورہ مطلب کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ یہاں تمام لوگ مقصود ہیں اور یہ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اولوا العزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں کہ جنہیں تمام افراد بشر کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اور ان لوگوں کے اعمال کے بارے میں گواہی دینا بنی اسرائیل اور آپؑ پر ایمان لانے والوں سمیت سب کے لئے یکساں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ زیر نظر آیاتِ مبارکہ کے سیاق پر غور کرنے اور اس موضوع سے مربوط دیگر آیات کو ملحوظ رکھتے

ہوئے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا گیا اور نہ ہی سولی پر لٹکایا گیا بلکہ وہ اس طرح سے بھی دنیا سے نہیں گئے جس طرح ہم عام طور پر موت کی خاص کیفیت (روح کے بدن سے جُدا ہو جانے) کے ساتھ مرتے ہیں، جیسا کہ اس سلسلہ میں اشاراتی تذکرہ ہو چکا ہے چنانچہ اس حوالہ سے بعض اہم مطالب سورۂ آل عمران، آیت ۵۵ (یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) کی تفسیر میں ذکر کئے جا چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو المیزان جلد ۳۔

زمخشری کی انوکھی رائے

زیرنظر موضوع کی بابت زمخشری نے الکشاف میں انوکھی رائے کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے تمام اہل کتاب کے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں ان کی قبروں سے نکال کر دوبارہ زندہ کرے گا اور انہیں حضرت عیسیٰؑ کے نازل ہونے اور جو کچھ آنجنابؑ پر نازل کیا گیا اس کے بارے میں آگاہ فرمائے گا اور وہ سب آنجنابؑ پر ایمان لائیں گے جبکہ اس وقت اُنہیں ایمان لانا ہرگز کوئی فائدہ نہ دے گا (تفسیر الکشاف، جلد اول، صفحہ ۵۸۹)

زمخشری کا یہ قول درحقیقت عقیدۂ رجعت ہی کی ایک صورت ہے۔

بہرحال زیرنظر آیۂ مبارکہ (وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا) کے معنی کی بابت بعض دیگر مطالب بھی ذکر کئے گئے ہیں جو کہ بے بنیاد ہیں۔

ان مطالب میں سے ایک یہ ہے کہ جسے زجاج کے بیان سے اخذ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ''مَوْتِهٖ'' میں ضمیر ''ہ'' کی بازگشت کتابی یعنی اہل کتاب کی طرف ہے اور اس بنا پر جملہ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے، یعنی وہ اس بات پر ایمان لائے گا کہ آخرالزمان میں عیسیٰؑ کا ظہور ہوگا اور ہم سب اس پر ایمان لاتے ہیں۔

زجاج کا یہ قول نہایت بے معنی و ناقابل توجہ ہے کیونکہ زیرنظر آیاتِ مبارکہ یہودیوں کے اس دعویٰ کی نفی کے مقام میں ہیں جس میں انہوں نے کہا کہ اُنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کر دیا ہے اور اسے سولی پر لٹکایا دیا ہے۔ ان آیات کا ان لوگوں کے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے کے انکار سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کے اس اعتراف سے تعلق ہے جس میں اُنہوں نے آخر الزمان میں حضرت عیسیٰؑ کے ظہور پذیر ہونے اور اسرائیلی قوم کی نشاۃِ ثانیہ کا تذکرہ کیا، لہٰذا سلسلۂ بیان کو اس سے مربوط قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی واضح ہے کہ اگر آیۂ مبارکہ میں وہ معنیٰ ملحوظ و مقصود ہوتا جو زمخشری نے کہا ہے تو پھر

''قَبْلَ مَوْتِهٖ'' کے الفاظ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اس کے بغیر اصل مقصود حاصل تھا، اسی طرح ان الفاظ کی بھی ضرورت نہ ہوتی: ''وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' کیونکہ مذکورہ صورت میں اس طرح کے الفاظ کلام میں اضافہ قرار پائیں گے کہ جن کی ضرورت نہیں جبکہ اللہ کے کلام میں کوئی لفظ اضافی نہیں۔

بعض حضرات نے ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ'' کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے مراد ''محمد'' ہے یعنی اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔

یہ رائے بھی سابق الذکر رائے کی طرح نہایت بے بنیاد ہے کیونکہ آیت میں اس سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا جس کی بناء پر ضمیر ''بِهٖ'' کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے، اور نہ ہی موضوعِ سخن سے اس کا ثبوت ملتا ہے، لہٰذا یہ قول بلا دلیل ہے، البتہ اس کی بابت بعض روایات میں کچھ اشارے پائے جاتے ہیں اور عنقریب ''روایات پر ایک نظر'' میں وہ روایات ذکر کی جائیں گی لیکن وہ جری و تطبیق کے باب سے ہے کہ اس سلسلہ میں عنقریب اشاراتی تذکرہ ہوگا، تطبیقی موارد کا ذکر روایات میں کثرت سے پایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ہر اہل فکر و تحقیق آگاہ ہے۔

یہودیوں کے مظالم کا نتیجہ

○ ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ''

(اور یہودیوں کے مظالم کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لئے حلال کی گئی ہیں)

آیت میں حرف ''ف'' (فَبِظُلْمٍ) تفریع یعنی سابقہ مطالب کی نتیجہ گیری کے لئے ہے، اور لفظ ''ظلم'' کو نکرہ (الف ولام کے بغیر) کی صورت میں ذکر کرنے کا مقصد گویا اس عمل کے شدید ہونے یا اسے پردۂ ابہام میں قرار دینے کی غرض سے ہے کیونکہ کسی معین و مشخص ظلم کا حوالہ دینے میں خاص مقصد ملحوظ نہ تھا بلکہ ان کے مظالم ملحوظ تھے، لہٰذا لفظ ''ظلم'' ان کی طرف سے ڈھائے گئے ان مظالم کے بدل کے طور پر ذکر ہوا ہے جو سابقہ آیات میں ذکر کئے جا چکے ہیں، البتہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں لفظ ''ظلم'' بدل الکل من الکل ہے۔ یعنی ان کے تمام مظالم اس میں ملحوظ ہیں اور ان سب کے بدلے میں یہ لفظ ذکر ہوا ہے۔ جبکہ یہ رائے درست نہیں، اور صحیح قول یہ ہے کہ یہاں ''بدل البعض عن الکل'' ہے یعنی تمام مظالم میں سے بعض ملحوظ ہیں اور ان بعض کے بدلے میں اسے ذکر کیا گیا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ظلم کو ان پر پاکیزہ چیزیں حرام قرار دینے کا سبب بنایا ہے، اور جو کچھ ان پر حرام کیا گیا وہ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی میں حرام قرار دیا گیا جسے تورات میں آنجنابؑ پر نازل کیا گیا تھا اور اسی پر حضرت موسیٰؑ کی شریعت اختتام پذیر

ہوئی، اور یہودیوں کے جن مظالم کا ذکر کیا جاتا ہے اور جو انہوں نے ڈھائے وہ اس کے بعد تھے مثلاً حضرت مریمؑ پر الزام تراشی وغیرہ بنابرایں یہاں ''ظلم'' سے مراد ان کے وہ بعض مظالم ہیں جن کا ارتکاب اُنہوں نے کیا کہ وہ اس بات کا سبب ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان پر حلال کی گئی تھیں پھر اس کے ساتھ ساتھ اس فقرہ کا ضمیمہ کیا گیا: ''وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا'' (اور ان کا کثرت سے اللہ کی راہ سے روکنا) اس سے مراد ان کا بار بار اللہ کی راہ سے منہ موڑنا ہے اور ساتھ ہی یوں ارشاد ہوا: ''وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ'' (اور ان کا سود کھانا جبکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا، اور ان کے لوگوں کا اموال کو ناجائز طریقوں سے کھانا) تو ان تمام امور کا ذکر ان کے مظالم میں شمار کیا گیا۔

یہودیوں کی اُخروی سزا

○ ''وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا''

(اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لئے دردناک عذاب مقرر کیا ہے)

یہ فقرہ سابقہ فقرہ ''حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ'' پر عطف ہے، تو وہ لوگ اپنے مظالم کی وجہ سے دو طرح کے عذاب کے مستحق قرار پائے: ایک دُنیاوی عذاب جو کہ عام ہے یعنی پاکیزہ چیزوں کا حرام قرار دیا جانا: اور دوسری اُخروی سزا کہ جو ان میں سے کافروں کے لئے مخصوص ہے یعنی دردناک عذاب!

راسخون فی العلم کا استثناء

○ ''لَكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ''

(لیکن ان میں سے جو راسخون فی العلم ہیں اور ایمان لانے والے ہیں وہ ایمان لائیں گے اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا)

اس آیت میں اہل کتاب میں سے ''راسخون'' اور ''مؤمنین'' کا استثنائی تذکرہ ہوا ہے اور ایک بار پھر ان کے ایمان لانے کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں لفظ ''الرَّاسِخُونَ'' اور جو کچھ اس پر عطف ہوا ہے وہ سب مبتداء اور ''يُؤْمِنُونَ'' اس کی خبر ہے اور ''مِنْهُمْ'' کا تعلق ''الرَّاسِخُونَ'' سے ہے اور اس پر حرف ''مِنْ'' ''تبعیض'' کے لئے ہے۔

بظاہر لفظ ''الْمُؤْمِنُونَ'' اور ''الرَّاسِخُونَ'' معنوی حوالہ سے ''مِنْهُمْ'' سے تعلق رکھنے میں ایک دوسرے کے ساتھ

شریک ہیں، لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا: لیکن جو لوگ راسخون فی العلم ہیں اور اہل کتاب میں سے بھی مؤمنین ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا، اس مطلب کی تصدیق وتائید بعد میں ذکر کئے جانے والے ان الفاظ سے ہوتی ہے جن میں ان کے ایمان لانے کا سبب وعلت مذکور ہے: ''اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ...... '' (بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی جس طرح سے نوح کی طرف اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف وحی کی تھی......) چنانچہ آیت سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت پیش کی جائے گی کہ وہ لوگ آپ پر ایمان لائے کیونکہ اُنہوں نے آپ کی نبوت اور اس وحی کو جس سے ہم نے آپ کو نوازا ہے اس وحی سے مماثلت رکھتی ہے جو گذشتہ ادوار میں سابق انبیاء الٰہی لائے تھے یعنی نوح اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کرام، آلِ ابراہیم میں سے انبیاء، آلِ یعقوب میں سے انبیاء اور دیگر وہ انبیاء کہ جن کا تذکرہ ہم نے آپ سے نہیں کیا، سب کے سب ایک ہی جیسے تھے اور ان پر نازل ہونے والی وحی میں اور آپ پر نازل ہونے والی وحی میں کوئی فرق نہیں۔

یہ معنیٰ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کی توصیف کی بابت زیادہ موزوں ہے نہ کہ عربوں میں سے ان ایمان لانے والوں کے بارے میں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں ارشاد فرمایا: ''لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝ '' (تا کہ آپ ان لوگوں کو انذار کریں کہ جن کے آباء کو انذار نہیں کیا گیا کہ وہ لوگ غفلت میں ہیں) سورۂ یٰسین آیت: ۹

اور فقرہ ''وَالۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ '' کا عطف ''الرّٰسِخُوۡنَ '' کی طرف ہے اور اسے منصوب (یعنی راسخون پر عطف کے باوجود رفعی حالت (المقیمون) کی بجائے نصبی حالت (المقیمین) میں) ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان کی مدح و تعریف مقصود ہے۔ گویا اصل جملہ یوں تصور کیا جائے گا: ''امدح المقیمین الصلوٰۃ'' (میں نماز قائم کرنے والوں کی مدح کرتا ہوں)، یہی صورتحال ''وَالۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ '' کی ہے، اور فقرہ ''وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ '' مبتداء ہے کہ جس کی خبر یہ فقرہ ہے: ''اُولٰٓئِکَ سَنُؤۡتِیۡہِمۡ اَجۡرًا عَظِیۡمًا'' (انہی لوگوں کو ہم عنقریب عظیم اجر عطا کریں گے)، اور اگر ''وَالۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ '' بھی رفعی حالت میں ہوتا (والمقیمون الصلوٰۃ) جیسا کہ مصحف ابن مسعود کے حوالہ سے منقول ہے تو وہ اور اس پر عطف ہونے والے تمام فقرے مبتداء قرار پاتے کہ جس کی خبر ''اُولٰٓئِکَ '' ہوتی۔

ایک ادبی بحث

''وَالۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ '' کے حوالہ سے علم الادب کے ماہرین کے درمیان بحث ہوئی ہے کہ اس کے نصبی حالت میں

ذکر کئے جانے کی وجہ کیا ہے؟ چنانچہ تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ لفظ ''الْمُقِيمِينَ'' کے نصبی حالت میں ہونے کی بابت اختلاف رائے پایا جاتا ہے چنانچہ مشہور ماہر علم النحو سیبویہ اور بصری اہل لغت نے اس کے منصوب ہونے کی وجہ اس کا مدح و تعریف کے مقام میں ہونا ذکر کیا ہے کہ اسے اس طرح تصور کیا جائے گا: ''اعنی المقیمین الصلوٰۃ'' اس بناء پر ان کا کہنا ہے کہ جب آپ کہیں: ''مررت بزید الکریم'' (میں زید سخی کے ساتھ گزرا) جبکہ آپ یہ چاہتے ہوں کہ زید بخیل کے مقابلے میں زید سخی کا تعارف کروائیں اور سننے والے کو بتائیں کہ میں جس زید کے ساتھ گزرا وہ سخی ہے بخیل نہیں، لہٰذا آپ لفظ ''الکریم'' پر ''زید'' کی صفت ہونے کی وجہ سے جر یعنی زیر لگا کر بولیں گے۔ کیونکہ ''زید'' پر حرف جر (ب) ہے لہٰذا اس کی مناسبت سے جو اعراب زید پر آئے گا یعنی زیر، وہی ''الکریم'' پر آئے گا تا کہ صفت و موصوف کی مطابقت قائم و ظاہر ہو، اور آپ جب زید کی مدح و ثناء کرنا چاہیں تو رفع (پیش اور نصب زبر) دونوں طرح سے کہہ سکتے ہیں یعنی یوں بھی کہہ سکتے ہیں: مررت بزید الکریم (میں زید سخی کے ساتھ گزرا) تو گویا آپ نے یوں کہا: ''اذکر الکریم'' (مجھے زید سخی یاد آ گیا) اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں: مررت بزید الکریم، (میں زید کے ساتھ گزرا جو کہ سخی ہے) تو گویا اصل جملہ یوں ہے: مررت بزید هو الکریم، اس میں ''ھو'' ضمیر مبتداء محذوف اور اس کی خبر ''الکریم'' ہوگی۔

اور کسائی کا کہنا ہے کہ لفظ ''الْمُقِيمِينَ'' کا مقام، جر یعنی زیر کا ہے اور اس کا عطف ''بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ'' میں حرف ''ما'' پر ہے لہٰذا اصل جملہ یوں فرض کرنا ہوگا: ''وَبِالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ''۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ لفظ ''الْمُقِيمِينَ'' جملہ ''لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ'' میں ''مِنْهُمْ'' کے حرف ''هُمْ'' پر عطف ہے، لہٰذا جملہ یوں فرض کیا جائے گا: ''لکن الراسخون فی العلم منهم ومن المقیمین الصلوٰۃ''

بعض حضرات کا قول ہے کہ وہ ''اِلَيْكَ'' میں حرف ''ک'' پر عطف ہے یا ''قَبْلِكَ'' میں حرف ''کاف'' پر عطف ہے۔

بہرحال مذکورہ آخری اقوال بصری ماہرین لغت کے نزدیک اس لئے قرین صحت نہیں کہ اسم ظاہر کا ضمیر مجرور پر عطف درست نہیں جب تک کہ ضمیر پر جو حرف جر آیا ہو وہ دوبارہ اسم ظاہر پر نہ آ جائے۔ جبکہ یہاں آیت میں ایسا نہیں ہوا، لہٰذا عطف کی مذکورہ صورتوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

ان اقوال کو ذکر کرنے کے بعد مؤلف تفسیر مجمع البیان نے کہا ہے کہ عروہ کے حوالہ سے جو روایت عائشہ سے منقول ہے وہ درست نہیں کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ عروہ نے کہا: میں نے عائشہ سے پوچھا کہ ''وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ'' اور ''والصابئین'' پر حرف ''یا'' آیا ہے جبکہ ''ان هٰذان'' پر حرف ''یا (هٰذین) کی بجائے حرف الف (هٰذان) آیا ہے؟ حالانکہ حرف ''ان'' اصل میں حرف ''انّ'' کا مخفف ہے کہ جو اپنے اسم کو نصب دیتا ہے؟ عائشہ نے جواب دیا کہ اے میرے بھانجے (بہن کے بیٹے) یہ کاتبوں کی کارستانی ہے کہ اُنہوں نے آیات کی کتابت میں غلطیاں کی ہیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ کی کتابت میں کچھ ایسی چیزیں ہیں کہ بہت جلد عرب اپنی لغت کے لحاظ سے ان کی درستگی کر دیں گے، چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ ابن مسعود کے مصحف میں " وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ " کی بجائے "والمقیمون الصلوٰۃ" مذکور ہے۔

بہرحال یہ اقوال وآراء اس لئے قابل توجہ نہیں کہ اگر یہ درست ہوتیں تو صحابہ کرام کتابت کی ان غلطیوں کو نظر انداز نہ کرتے اور لوگوں کو ان غلطیوں کے ساتھ قرآن کی تعلیم نہ دیتے، بلکہ اس کی تصحیح کرتے کیونکہ وہ اس سلسلہ میں تقدم رکھتے ہیں اور انہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہِ راست قرآن حاصل کیا ہے۔

یہاں تک تفسیر مجمع البیان کی عبارت تمام ہوئی (ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۱۳۹)

خلاصہ کلام یہ کہ جملہ "لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" اہل کتاب میں سے مستثنیٰ ہے کیونکہ انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو مطالبہ کیا کہ ان پر آسمان سے کوئی کتاب نازل ہو تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کتاب وحکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے پیش کی کہ جو ان آیات الٰہی کی تصدیق کرتی تھیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انبیاء ومرسلین پر نازل ہوئیں اور ان میں انہیں حق کی پیروی اور اس پر قائم رہنے کی دعوت دی گئی تھی وہ لوگ اسے کافی نہ سمجھتے تھے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی حقانیت پر کسی دوسری دلیل کے خواہاں تھے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا وہ اس سے مختلف نہ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انبیاء کرامؑ نے پیش کیا تھا، اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز زندگی ومعاشرت میں سابقہ انبیاءؑ کے طرزِ زندگی ومعاشرت سے کوئی فرق پایا جاتا تھا بلکہ ان میں مماثلث و یکسانیت پائی جاتی تھی جیسا کہ اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

- سورۂ احقاف، آیت: ۹

"قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ"

(کہہ دیجئے کہ میں پیغمبروں سے انوکھا نہیں ہوں)

- سورۂ انبیاء، آیت: ۱۰

"وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ......... لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝"

(اور ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے مگر وہ مرد تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس تم اہل ذکر سے پوچھو اگر تم خود علم نہیں رکھتے ہو، اور ہم نے انہیں ایسے بدن عطا نہیں کئے کہ نہ تو وہ کھانا کھاتے ہوں اور نہ ہی ایسے کہ ہمیشہ باقی رہنے والے ہوں......... یقیناً ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی کہ جس میں تمہارے لئے ہدایت و

نصیحت ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟)

اس جاری سلسلۂ بیان میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ذکر فرمائی کہ اس طرح کا مطالبہ کرنے والے اہل کتاب وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تو حق کی پیروی کی عادت ہے اور نہ ہی حق پسندی پر ثبات وعزم ونظریہ رکھتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے کتنی ایسی واضح نشانیاں وروشن دلیلیں ہیں کہ جن سے روگردانی کا ناروا موقف اپنایا اور کتنے حق وحقیقت کے مظاہر ایسے ہیں کہ جن کے لوگوں تک پہنچنے میں رکاوٹیں کھڑی کیں، البتہ ان میں وہ افراد کہ جو راسخون فی العلم تھے کہ جو اپنے علم کے ذریعے حق وحقیقت کے رسیار ہے اور اس حوالہ سے ان کی فکر میں تزلزل پیدا نہیں ہوا، اسی طرح ان میں سے حقیقی ایمان والے افراد اپنی حق پرستانہ عادت اور حقیقت شعاری کی بنیاد پر اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل ہوا اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا کیونکہ انہوں نے آپ پر جو وحی نازل ہوئی اسے آپ سے پہلے نبیوں مثلاً نوحؑ اور ان کے بعد والے انبیاءؑ پر نازل ہونے والی وحی سے یکساں پایا۔

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے والے اہل کتاب کو راسخون فی العلم اور ''مؤمنین'' کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے پہلے آیات مبارکہ میں اہل کتاب کو مجموعی صورت میں راسخون فی العلم کی صفت سے عاری اور پختہ ترین وعدوں ومعاہدوں کے باوجود حق پر قائم نہ رہنے والے قرار دیا گیا تھا اور یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ وہ واضح وروشن نشانیوں ومضبوط دلائل کے باوجود اللہ کی آیات سے منہ موڑنے والے اور ان پر ایمان لانے سے گریزاں ہیں لہٰذا ان میں سے وہ افراد کہ جو اپنے علم میں پختہ اور حق کی پیروی کی عملی صفت کے حامل ہیں اُنہیں مستثنیٰ قرار دے کر ان دو صفتوں سے متصف قرار دیا گیا کہ وہ راسخون فی العلم اور حقیقی مؤمنین ہیں۔

(۲) یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ میں قرآن نازل کئے جانے کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ دیگر آسمانی کتب کے نازل کئے جانے کا ذکر اس لئے ہوا کہ یہاں ان سب کے درمیان یکسانیت اور عدم فرق کا بیان ضروری تھا۔

(۳) بعد والی آیت میں جملہ ''اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ .... '' اہل کتاب میں سے مستثنیٰ کئے جانے والے افراد کے ایمان لانے کی وجہ کو بیان کرتا ہے۔

وحی کی مطابقت ویکسانیت

○ ''اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ''

(بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی کی جس طرح نوح اور ان کے بعد والے نبیوں پر وحی کی ......)

یہ آیت جیسا کہ اس کی بابت ذکر ہو چکا ہے کہ اس جملہ کی علت و وجہ کے بیان پر مشتمل ہے جس میں ایمان لانے والوں کے بارے میں یوں ارشاد ہوا: ''یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ'' (وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا)۔

اس آیت کا حاصل معنٰی ___ واللہ اعلم ___ یہ ہے کہ وہ اس لئے اس پر ایمان لائے جو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے کیونکہ ہم نے آپ کو کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں دی جو آپ کے علاوہ سابقہ انبیاءؑ کے پاس موجود معارف ومعالم اور حقائق و مقاصد سے مختلف امور سے مختص ہو، بلکہ سب میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور ان میں کسی بھی حوالہ سے فرق واختلاف نہیں پایا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہی نے آپ کی طرف وحی کی جس طرح سے ہم نے نوح اور ان کے بعد والے نبیوں پر وحی کی تھی، اور نوح وہ پہلے نبی ہیں جو کتاب وشریعت لے کر آئے، اور جس طرح سے ہم نے وحی کی ابراہیم اور ان کے بعد ان کی آل میں سے نبیوں پر! اور اہل کتاب میں سے جو افراد مستثنٰی کئے گئے ہیں وہ ان انبیاء کی بخوبی معرفت رکھتے ہیں اور ان کی بعثت و دعوت الی الحق کی کیفیت سے آگاہی رکھتے ہیں: مثلاً ان انبیاء میں سے بعض کو کتاب عطا کی گئی جیسے داؤدؑ کو زبور دی گئی جو کہ نبوت ہی کی سنخ سے وحی پر بنی تھی، اور موسیٰؑ کو تکلم سے نوازا گیا ___ کلیم اللہ کا اعزاز ملا ___ جو کہ نبوت ہی سے مربوط وحی کی ایک صورت تھی، ان کے علاوہ اسماعیل واسحاق ویعقوب کو کتاب دیئے بغیر نبوت ورسالت کی ذمہ داریاں سونپیں جو کہ سب کی سب وحی ہی کی مختلف صورتیں تھیں۔

اور ان تمام انبیاؑ کی قدر مشترک اور تمام جہتوں کا جامع عنوان یہ ہے کہ وہ سب کے سب خداوند عالم کی طرف سے بھیجے ہوئے نمائندے تھے کہ جو لوگوں کو اطاعت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب کی بشارت وخوشخبری دیتے تھے اور معصیت ونافرمانی کی صورت پر اللہ کے عذاب وسزا سے انذار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس لئے بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو ان چیزوں سے آگاہ وباخبر کریں جو ان کے لئے دنیا وآخرت میں مفید یا نقصان دہ ہوں کہ اس طرح اتمامِ حجت ہو جائے اور قیامت کے دن لوگ اللہ کے سامنے بہانہ جوئی نہ کر سکیں کہ انہیں تو بتایا ہی نہ گیا تھا۔

اور آیت مبارکہ میں لفظ ''وَالْاَسْبَاطِ'' ذکر ہوا ہے، اس کی بابت سورۂ آل عمران، آیت ۸۴ ''وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ'' کے ذیل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ ان سے حضرت یعقوب کی نسل سے انبیاء مراد ہیں یا بنی اسرائیل کے اسباط مراد ہیں۔

اور جملہ ''وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا'' میں لفظ ''زبور'' کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد مکتوب یعنی لکھی ہوئی کتاب ہے، چنانچہ جب کوئی شخص کچھ لکھے تو عربی میں یوں کہا جاتا ہے: زَبَرَہٗ (اس نے لکھا) لہٰذا ''زبور'' کا معنٰی ''مزبور'' ہے یعنی لکھی ہوئی چیز!

مبشر و منذر پیغمبر

○ ''رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ''

(وہ پیغامبر کہ جو بشارت دینے والے، انذار کرنے والے ہیں)

یہاں تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ''رُسُلًا'' ''مُّبَشِّرِیْنَ'' ''مُنْذِرِیْنَ'' تو یا یہ تینوں ہی کلام میں حال ہیں۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ سب رسول، بشارت دینے والے، انذار کرنے والے ہیں۔ یا یہ کہ پہلا لفظ ''رُسُلًا'' حال ہے اور دوسرے دو الفاظ اس کی صفتیں ہیں، اس بناء پر معنیٰ یہ ہوگا وہ اس حال میں کہ رسول ہیں ان کی صفت یہ ہے کہ وہ خوشخبریاں دینے والے اور انذار کرنے والے ہیں، ہم نے اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ آیت ۲۱۳ کی تفسیر میں تفصیلی مطالب ذکر کئے ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ ارسال رسل یعنی رسول بھیجنے سے کیا مراد ہے؟ اور یہ بھی بیان کیا کہ خداوند عالم کی طرف سے بندوں پر اتمام حجت کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ بھی بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاءؑ کہ جو اس کے احکام و فرامین لوگوں تک پہنچانے کے لئے بھیجے گئے ہیں ان کے بغیر عقل، بنی نوع انسان کی رہنمائی کا کام اکیلا انجام نہیں دے سکتی۔

غلبہ و حکمت کا اختصاص

○ ''وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا''

(اور اللہ غلبہ و حکمت والا ہے)

چونکہ مطلق غلبہ اور مطلق حکمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص و مختص ہے لہٰذا کسی کا اس پر غالب آنا محال و ناممکن ہے اور کوئی شخص اسے کسی بھی حوالہ سے اپنی حجت و دلیل کے ساتھ مغلوب نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے: ''قل فلله الحجة البالغة'' (کہہ دیجئے، کہ اسی کے لئے قوی و رسا حجت ہے) سورۂ انعام، آیت: ۱۴۹

اللہ اور فرشتوں کی گواہی

○ ''لٰکِنِ اللّٰهُ یَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَشْهَدُوْنَ''

(لیکن اللہ گواہی دیتا ہے جو کچھ اس نے تیری طرف نازل کیا کہ اس نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے گواہی دیتے ہیں)

یہ فقرہ دراصل اس استثناء منقطع کی دوسری صورت ہے جو اہل کتاب کے اس مطالبہ کے جواب میں ذکر ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا کہ ان کی طرف آسمان سے کوئی کتاب نازل کی جائے، پہلے ان کے جواب میں ''لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' کہہ کر ان کے مطالبہ کے رد کی وضاحت ہوئی اور اب ''لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ...'' کہہ کر اسے رد کیا گیا ہے، کیونکہ ان کے مطالبہ کے رد میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا: ''فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ.........'' (ان لوگوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا) تو اس کا لازم الامر یہ تھا کہ ان کا مطالبہ انہی کی طرف پلٹایا جاتا ہے کہ جس طرح وہ مطالبہ باطل تھا اسی طرح یہ مطالبہ بھی باطل و ناروا ہے، اور وہ اس بناء پر کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ اپنے پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی لائے ہیں وہ اس سے مختلف نہیں جو دیگر انبیاء وحی کے ذریعے لائے تھے، لہٰذا جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ ان انبیاءؑ کی لائی ہوئی وحی پر ایمان رکھتا ہے تو اس پر لازم وضروری ہے کہ وہ اس پر بھی ایمان لائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں کیونکہ اس میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا اور وہ بھی ان کے درمیان فرق نہ کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس موضوع کا استدارک اس طرح سے کیا کہ اس کے ضمیمہ کے طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ اس کے باوجود اللہ گواہی دیتا ہے اس کی جو اس نے اپنے نبی پر نازل کیا اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں اور اللہ گواہی کے حوالہ سے کافی ہے ــــــ اللہ کی گواہی کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی گواہی کی بابت جو جملہ ارشاد فرمایا وہ یہ ہے: ''اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ'' (اس نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف نازل کرنا کافی نہیں ــــــ اس کے ساتھ ''بِعِلْمِهٖ'' اس لئے ضروری تھا کیونکہ ''نزول'' کی اقسام میں سے ایک قسم، شیاطین کی طرف سے وحی یعنی اشارہ کے ساتھ نزول بھی ہے اور وہ اس طرح کہ شیاطین اللہ تعالیٰ کے سلسلۂ ہدایت کو خراب کرنے کی غرض سے ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہِ حق کی جگہ راہِ باطل لوگوں کو دکھاتے ہیں یا حق و باطل کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پیش کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی واضح نہیں ہو پاتا بلکہ صورتحال مبہم ہو جاتی ہے چنانچہ اس کی نفی کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا: ''عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾'' ــــــ سورۃ الجن، آیت ۲۸ ــــــ (وہ غیب کا علم رکھتا ہے، وہ کسی کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا سوائے اس پیغمبر کے، جسے اس مقصد کے لئے چن لے، وہ اس پیغمبر کے آگے پیچھے نگران قرار دیتا ہے تاکہ جان لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے، اور جو کچھ ان کے پاس ہے خدا اس پر کامل نگاہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کی تعداد کو شمار کیا ہوا ہے) اور یوں ارشاد فرمایا: ''وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤی اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ'' سورۂ انعام، آیت ۱۲۱ ــــــ (اور شیاطین اپنے دوستوں و پیروکاروں کو وحی کرتے ہیں)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صرف قرآن کے نازل ہونے یا اسے نازل کرنے کی گواہی کافی نہیں اور نہ ہی اس سے اس کی بابت ابہامی صورت ختم ہو سکتی ہے لیکن جملہ ''بِعِلْمِہٖ'' کے ذریعے اصل مراد و مقصود واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے قرآن کو اپنے رسول پر نازل کیا اور وہ جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نگران ہے اور اسے شیاطین کی چالوں سے بچاتا ہے۔

اور یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ جب قرآن نازل کرنے کی گواہی دی جائے اور نازل کرنے کا عمل فرشتوں کے ذریعے انجام پائے تو وہ بھی اس کے گواہ قرار پائیں گے، اسی وجہ سے فرشتوں کے گواہ ہونے کا ذکر بھی اپنی گواہی کے ساتھ ساتھ فرمایا، درج ذیل آیاتِ مبارکہ پر غور کرنے سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے:

O سورۂ بقرہ، آیت: ۹۷

''مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ''

(کون ہے جو جبریل کا دشمن ہو، اس نے تو اسے (قرآن کو) آپ کے دل پر نازل کیا ہے)

اس جلیل القدر فرشتہ (جبریلؑ) کی تعریف میں یوں ارشاد فرمایا:

O سورۂ تکویر، آیت: ۲۱

''اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾''

(یہ کلام باعظمت نمائندہ و ترجمان کی زبانی بھیجا گیا ہے جو کہ طاقتور اور عرش والے خدا کے قرب میں مکین ہے، وہ فرمانروا، امانتدار ہے)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جبریل کے ماتحت دیگر فرشتے بھی ہیں جو اس کے فرامین کی اطاعت کرتے ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

O سورۂ عبس، آیت: ۱۶

''كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾''

(نہیں نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ نصیحتیں ہیں، تو جو شخص چاہے نصیحت پالے، یہ ان صحیفوں میں ہیں جو عظمت والے ہیں، بلند مرتبہ و عالی مقام ہیں، پاکیزہ ہیں، ایسے ترجمانوں کے ہاتھوں سے لکھی جاتی ہیں جو جلیل القدر و نیک ہیں)

المختصر یہ کہ قرآنِ مجید کا نازل کیا جانا چونکہ فرشتوں کے ذریعے انجام پذیر ہوا لہٰذا وہ اس سلسلہ میں اسی طرح گواہ ہیں جس طرح خود اللہ تعالیٰ گواہ ہے، اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا گواہ ہونا اُن آیات مبارکہ سے ثابت ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے حوالہ سے چیلنج کیا ہے مثلاً:

- سورۂ اسریٰ، آیت: ۸۸

''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝۸۸''

(کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ بنیں)۔

- سورۂ نساء، آیت: ۸۲

''اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝۸۲''

(آیا وہ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)

- سورۂ یونسؑ، آیت: ۳۸

''فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ''

(پس تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جسے بلا سکتے ہو بلا لو)

کافروں کا انجام: گمراہی ہی گمراہی

- ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا''

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا تو وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہوئے)

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمادیا کہ اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغام رسانی کے ذریعے لوگوں پر اپنی حجت پوری کردی اور اپنی طرف سے کتاب نازل کئے جانے کا ذکر کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ وہ اسی وحی کے باب سے ہے جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انبیاءؑ پر نازل کی اور یہ کہ اس کتاب کے نزول کو خود اس کی اپنی اور اس کے فرشتوں کی گواہی حاصل ہے تو اس کے بعد یہ مطلب قرین حقیقت قرار دیا ہے کہ جو شخص بھی اس کتاب کا انکار کرے اور اس سے روگردانی کرے خواہ وہ اہل کتاب کے کسی بھی گروہ سے ہو، یہودی ہو یا نصرانی، وہ گمراہ ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''وصدوا عن کتاب اللہ'' کی بجائے ''وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' فرمایا ہے جبکہ سلسلۂ گفتگو کا تعلق ''کتاب'' سے تھا تو اس میں ایک طرح سے مختصر وجامع بیان کی صورت پائی

جاتی ہے کہ گویا یوں کہا گیا ہے: ''ان الذین کفروا و صدوا عن ھٰذا الکتاب والوحی الذی یتضمنہٗ فقد کفروا وصدوا عن سبیل اللہ، والذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ فقد ضلوا ضلالاً بعیداً'' جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اس کتاب سے اور اس وحی (احکام) سے روکا جو اس میں ہے تو گویا وہ کافر ہیں اور انہوں نے اللہ کے راستہ سے روکا، اور جن لوگوں نے کفر اپنایا اور اللہ کے راستہ سے روکا تو وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہوگئے۔

ظالموں کے لئے معافی نہیں

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ......الخ''

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا تو ایسے لوگوں کو اللہ ہرگز معاف نہیں کرے گا)

اس آیت میں ایک بار پھر سابقہ آیت میں مذکور مطالب کا تاکیدی ذکر ہوا ہے اور کافروں کی گمراہی و ظلم کے بُرے انجام کا تذکرہ کیا گیا ہے، تو یہاں ''ظلم'' سے مراد اللہ کی راہ سے روکنا ہے چنانچہ آیت کے سیاق و سباق کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت سابقہ آیت میں مذکور مطالب کی وجہ و سبب کے بیان پر مشتمل ہو کہ وہ بہت دور کی گمراہی کا کیونکر شکار ہیں، بہرحال آیت کا معنیٰ واضح ہے۔

روایات پر ایک نظر

حضرت مریمؑ پر الزام تراشی

تفسیر ''البرہان'' میں آیت ''وَّ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا'' کے ذیل میں ایک روایت منقول ہے کہ ابن بابویہ نے اپنے اسناد سے علقمہ کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: ''الم ینسبوا مریم بنت عمران الی انھا حملت بصبی من رجل نجار اسمہٗ یوسف؟'' (کیا لوگوں نے حضرت مریم بنت عمران کی طرف غلط نسبت نہیں دی تھی کہ وہ ایک مستری (لکڑی کا کام کرنے والے شخص) کہ جس کا نام یوسف تھا اس سے بچہ کی ماں بنی ہے؟) (تفسیر البرھان، جلد اول صفحہ ۴۲۶)

امام محمد باقرؑ: چشمۂ علم وحکمت

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ: ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' کے ذیل میں مؤلفؒ نے ذکر کیا کہ مجھ سے میرے والد گرامی قدر نے قاسم بن محمد کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے سلیمان بن داؤد منقری سے سنا کہ ابوحمزہ نے شہر بن جوشب کی روایت ذکر کی انہوں نے کہا: حجاج بن یوسف نے مجھ سے کہا کہ قرآن مجید کی ایک آیت نے مجھے سرگرداں کرر کھا ہے! میں نے کہا: اے حاکم! وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے کہا: یہ آیت ہے: ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' (اہل کتاب میں سے کوئی بھی شخص باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ اس پر اس کی موت سے پہلے ایمان لائے گا) حجاج نے کہا: خدا کی قسم! میں حکم دوں گا کہ ہر یہودی ونصرانی کی گردن اُڑا دی جائے پھر میں اس کے سر پر کھڑا رہوں گا اور اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہوں گا کہ آیا اس کے لبوں میں حرکت باقی ہے یہاں تک کہ اس کا بدن ٹھنڈا ہو جائے، حجاج کی یہ بات سن کر میں نے کہا: اللہ تعالیٰ حاکم کی اصلاح کرے، بات وہ نہیں جو آپ نے سمجھی ہے، اس نے کہا: تو پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ میں نے کہا: حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن سے پہلے زمین پر اتریں گے تو اس وقت کوئی یہودی اور کسی بھی مذہب وملت کا پیروکار ایسا نہیں ہوگا جو ان کے مرنے سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے، اور حضرت عیسیٰؑ، امام مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے، حجاج نے پوچھا: یہ بات تجھے کس نے بتائی؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالبؑ نے بتائی، (یعنی امام محمد باقرؑ نے) یہ سن کر حجاج نے کہا: خدا کی قسم! تو نے علم وحکمت کے رواں دواں چشمہ سے فیض پایا ہے (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۵۸)

''درمنثور'' کی تین روایتیں

(۱) تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن منذر نے شہر بن جوشب کے حوالہ سے بیان کیا کہ اُنہوں نے کہا: حجاج نے مجھ سے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے جسے میں نے جب بھی پڑھا تو اس کے بارے میں میرے دل میں بعض سوالات پیدا ہوئے اور وہ آیت یہ ہے: ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' (اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنے مرنے سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے) حالانکہ جب جنگی قیدی لائے جاتے ہیں تو میں ان کی گردنیں اڑانے کا حکم دیتا ہوں مگر کسی کی زبان سے مرتے وقت کوئی بات نہیں سنتا، حجاج کی بات سن کر میں نے کہا کہ آیت کا صحیح مطلب آپ کو نہیں بتایا گیا، اصل بات یہ ہے کہ جب کسی عیسائی کی روح نکلنے لگتی ہے تو فرشتے اسے آگے پیچھے سے تھپڑ مارتے ہوئے کہتے ہیں: اے خبیث! حضرت عیسیٰؑ مسیح کہ جن کے بارے میں تو گمان کرتا تھا کہ وہ خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے یا تیسرا خدا ہے (خدا، مریمؑ، عیسیٰؑ)

وہ اللہ کا بندہ، روح خدا اور کلمۂ خدا تھا، یہ سن کر وہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لاتا ہے جبکہ اس وقت اس کا ایمان لانا اس کے لئے کوئی فائدہ مند نہیں ہوتا، اسی طرح جب کوئی یہودی مرنے لگتا ہے اور اس کی روح بدن سے جدا ہونے لگتی ہے تو فرشتے اسے آگے پیچھے سے تھپڑ مارتے ہوئے کہتے ہیں: اے خبیث! تو گمان کرتا تھا کہ تو نے عیسیٰؑ مسیح کو قتل کر دیا ہے حالانکہ وہ تو بندۂ خدا اور روح خدا تھے، تو وہ یہودی ان پر ایمان لے آتا ہے جبکہ اس وقت اس کا ایمان لانا اسے فائدہ نہیں دیتا، اور جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائیں گے تو یہود و نصاریٰ کے وہ افراد جو اس وقت زندہ ہوں گے اسی طرح ان پر ایمان لے آئیں گے جس طرح کہ ان کے مردہ (وہ لوگ جو مر گئے) ایمان لائے تھے، یہ باتیں سن کر حجاج نے پوچھا کہ یہ سب کچھ تو نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ باتیں مجھے محمد بن علی سے معلوم ہوئی ہیں؟ حجاج نے کہا: تو نے تو یہ سب کچھ علوم و حقائق کے معدن و خزانہ سے حاصل کیا ہے، شہر بن جوشب نے کہا: خدا کی قسم! میں نے یہ باتیں حضرت ام سلمہ سے سنی تھیں لیکن میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کا نام حجاج کا دل جلانے کے لئے لیا (تفسیر ''در منثور'' جلد دوم صفحہ ۲۴۱)

اس روایت کو خلاصۂ اسی کتاب (در منثور) میں عبد بن حمید اور ابن منذر کے حوالہ سے شہر بن جوشب کی نسبت سے ذکر کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے کہا: میں نے محمد بن علی بن ابی طالب سے سنا ہے یعنی محمد بن حنفیہ سے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بن جوشب نے محمد بن علی کے حوالہ سے بیان کیا مگر بعد میں اس کی بابت راویوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ محمد بن علی سے مراد ابن حنفیہ ہے یا محمد بن علی بن الحسین (امام محمد باقرؑ) ہیں، تاہم اس روایت سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو ہم آیت کے معنی کی بابت ذکر کر چکے ہیں۔

(۲) تفسیر ''در منثور'' ہی میں ہے کہ احمدؒ، بخاری، مسلم اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ جس میں راوی نے بیان کیا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہو گا؟

(۳) تفسیر ''در منثور'' میں ہے کہ ابن مردویہ نے ابو ہریرہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ وقت دور نہیں کہ ابن مریمؑ تم میں عادلانہ حکم کے ساتھ نازل ہوں اور وہ دجال کو موت کے گھاٹ اتاریں اور خنزیر (کہ جسے عیسائی حلال قرار دیتے ہیں) ختم کر دیں اور صلیب (کہ جو عیسائیوں کی مذہبی علامت ہے) کو توڑ دیں، اور جزیہ کا حکم نافذ کر دیں، اور اس طرح ان کے اموال اپنے قبضہ میں لے لیں، کہ پھر سجدہ صرف خدائے رب العالمین ہی کے لئے مخصوص ہو جائے گا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان ذکر کرنے کے بعد ابو ہریرہ نے کہا کہ اگر تم اس سلسلہ میں قرآنی بیان دیکھنا چاہو تو یہ آیت پڑھو: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ '''' اس میں عیسیٰؑ بن مریم کی موت کا ذکر ہوا ہے، ابو ہریرہ نے ''عیسیٰ بن مریم'' کی موت کے الفاظ کو تین دفعہ دہرایا۔ (تفسیر ''در منثور'' جلد ۲، صفحہ ۲۴۲)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت حضرت عیسیٰؑ بن مریم کا نازل ہونا اہل سنت کے متعدد راویوں کے حوالہ سے اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیتؑ کے اسناد سے کثرت سے روایات میں مذکور ہے۔

بحث کا دوسرا رُخ

تفسیر العیاشی میں حارث بن مغیرہ کے حوالہ سے آیۂ مبارکہ: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۸۳)

بظاہر یہ روایت ان آیات مبارکہ کے سیاق سے مطابقت نہیں رکھتی جو حضرت عیسیٰؑ کے تذکرۂ جمیل پر مشتمل ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ اس میں قرآنی اسلوب بیان کی مخصوص روش ملحوظ ہو اور وہ یہ کہ جب حضرت رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور وہ کتاب اور وہ شریعت لائے جس نے حضرت عیسیٰؑ کی شریعت کو منسوخ کر دیا تو ہر اہل کتاب پر لازم و ضروری ہو گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰؑ سمیت ان سے پہلے تمام انبیاءؑ پر ایمان لائے، لہٰذا اگر کسی اہل کتاب پر حالت احتضار یعنی زندگی و موت کے کشمکش وقت میں کہ جب روح بدن سے نکلنے والی ہو حضرت رسولِ خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اصل حقیقت واضح ہو جائے تو ضمناً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت بھی واضح ہو جائے گی، بنابرایں اس اہل کتاب کا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اصل حقیقت واضح ہونے کے بعد اس پر ایمان لانا دراصل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر ایمان لانا بھی شمار ہوگا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ایمان لانا اصل اور حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا اس کی فرع کہلائے گا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل کتاب جس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حقیقت میں ایمان لائیں گے اور وہ پیغمبر قیامت کے دن ان کی گواہی دے گا وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ جو اپنی بعثت کے بعد تمام بنی نوع بشر کے لئے اللہ کی حجت ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ تھے کہ وہ بھی اپنی بعثت کے بعد سب کے لئے اللہ کی حجت تھے، ان دو پیغمبروں کی نبوت میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ درج ذیل روایت بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے (ملاحظہ ہو)

ابن سنان نے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اہل کتاب کے ایمان لانے سے مراد ان کا حضرت

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا ہے (تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۲۸۴)

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں آیۂ مبارکہ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'' کی تفسیر میں جابر کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''ليس من احد من جميع الاديان يموت، الا رأى رسول الله (ص) وامير المؤمنين (ع) حقاً من الاولين والآخرين'' (تمام ادیان کے پیروکاروں میں اولین وآخرین میں کوئی ایسا شخص باقی نہ ہوگا جو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر المؤمنین علیؑ کی حقانیت کا اقرار نہ کرے) (بحوالہ مذکورہ بالا)

اس روایت کی بابت پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے مصداق پر تطبیق کے طور پر لیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا، یعنی جری و تطبیق کی وہ صورت کہ جسے علمی طور کسی کلی کو اس کے متعدد مصادیق میں سے کسی ایک مصداق پر منطبق کرنا کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ اس روایت کے الفاظ آیت کی تفسیر اور اس کے معنی ومقصود کے تعین کی بابت صریح نہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ امامؑ نے آیت کے ذیل میں کوئی دوسری بات ارشاد فرمائی ہو اور اس کا ایک حصہ یہاں ذکر کر دیا گیا ہو، چنانچہ اس کی مثالیں روایات میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

ایک روایت مفضل بن عمر کے حوالہ سے منقول ہے جس میں اُنہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' کا معنیٰ پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''هٰذه نزلت فينا خاصة. انه ليس رجل من ولد فاطمة يموت ولا يخرج من الدنيا حتى يقر للامام و بامامته كما اقرّ ولد يعقوب ليوسف حين قالوا: تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا'' (یہ آیت خاص طور پر ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ بنی فاطمہؑ میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اپنے مرنے اور اس دُنیا سے کوچ کرنے سے پہلے اپنے امام اور اس کی امامت کا اقرار نہ کرلے جیسا کہ فرزندان یعقوبؑ نے یوسفؑ کا اقرار کرتے ہوئے یوں کہا تھا: خدا کی قسم! اللہ نے تجھے ہم پر ترجیح دی (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۳)

یہ روایت ان روایات میں سے ہے جنہیں ''اخبار الآحاد'' کہا جاتا ہے (یعنی اس کا راوی فرد واحد ہے،) اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ ہے کہ یہ ان روایات میں سے ہے جن کا سلسلہ اسناد یکسر اتصال نہیں رکھتا بلکہ اس میں راویوں کے نام مذکور نہیں ہوتے کہ انہیں ''روایات مرسلہ'' کہتے ہیں البتہ اس کے ہم معنی دیگر روایات بھی ذکر ہوئی ہیں کہ آیۂ مبارکہ ''ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ'' کی تفسیر میں ان کی بابت تفصیلی تذکرہ ہوگا انشاءاللہ (سورۂ فاطر، آیت: ۳۳)

وحی کی یکسانیت وجامعیت

آیۂ مبارکہ " اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ " کی تفسیر میں زرارہ اور حمران کے حوالہ سے ایک روایت میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان مذکور ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرمایا: "میں نے تیری طرف اسی طرح وحی کی جس طرح نوح اور اس کے بعد والے پیغمبروں کی طرف وحی کی"، تو اس ارشاد گرامی قدر میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ کی طرف کی جانے والی وحی کی یکسانیت اور اس کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں یکجا ہونا بیان فرمایا۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۸۵)

اس روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو وحی نازل فرمائی وہ وحی کی تمام ممکنہ صورتوں کی جامع تھی اور کوئی قسم اس سے مختلف ایسی نہ تھی جس سے اصل غرض میں فرق پیدا ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیاءؑ کا راستہ ومقصد جدا جدا ہو جائے، لہٰذا اس روایت سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیاءؑ کی طرف وحی کے ذریعے نازل فرمایا وہ بعینہٖ تمام خصوصیات کے ساتھ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا کیونکہ اس طرح کا مطلب قرین صحت قرار نہیں پاتا، اور نہ ہی یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا گیا وہ سابقہ تمام شریعتوں کا مجموعہ مرکب تھا، کیونکہ یہاں جو بات مقصود ہے وہ اس سے مختلف ہے اور اس میں سابقہ انبیاءؑ کی طرف ہونے والی وحی وشریعتوں کی مخصوص صورتوں کے نازل کرنے کا بیان مطلوب نہیں، چنانچہ ہمارے بیان کی تصدیق درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:

کتاب کافی میں مولفؒ کے اپنے اسناد سے محمد بن سالم کے حوالہ سے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا بیان مذکور ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان جو انبیاء آئے ان میں کچھ ظاہر اور کچھ مخفی تھے، اسی وجہ سے ان سب کے نام قرآن مجید میں ذکر نہیں کئے گئے بلکہ صرف انہی کے اسماء گرامی قدر مذکور ہیں جن کی نبوت علانیہ وظاہر بظاہر تھی چنانچہ آیۂ مبارکہ " وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَكۡلِیۡمًا " (اور وہ رسول کہ جن کا تذکرہ ہم نے آپ کے سامنے نہیں کیا، اور اللہ نے موسیٰ سے بخوبی کلام کیا اسی مطلب کے بیان پر مشتمل ہے کہ اس میں گویا یوں ارشاد ہوا کہ میں نے مخفی انبیاءؑ کے نام اس طرح ذکر نہیں کئے جس طرح ظاہری انبیاءؑ کے نام ذکر کئے ہیں (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۸۵)

یہ روایت کافی میں علی بن ابراہیم کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے کہ اُنہوں نے اپنے والد کے حوالہ سے، انہوں نے حسن بن محبوب کے حوالہ سے، انہوں نے محمد بن فضیل کے حوالہ سے، انہوں نے ابوحمزہ کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقرؑ کا فرمان ذکر کیا، اس میں یہ اضافی مطلب مذکور ہے کہ جن انبیاءؑ کو مخفی بھیجا گیا یعنی اُنہوں نے اپنی نبوت کا اظہار لوگوں کے سامنے نہیں کیا ان کے نام قرآنِ مجید میں ذکر نہیں کئے گئے اور جس طرح اپنی نبوت کو علانیہ طور پر ظاہر کرنے والوں کے نام

ذکر ہوئے ان کے نام اس طرح ذکر نہیں ہوئے لہٰذا خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا: ''وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ'' (آپ سے پہلے جو رسول آئے ان میں سے بعض کا تذکرہ ہم نے آپ سے کیا اور بعض کا تذکرہ نہیں کیا) اس سے مراد یہ ہے کہ جن انبیاء نے اپنی نبوت کو پوشیدہ رکھا ان کے نام اس طرح نہیں لئے جس طرح ان انبیاء کے نام لئے جنہوں نے اپنی نبوت کو ظاہر کیا۔

بہرحال اس روایت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کا تذکرہ اس طرح نہیں کیا اور نہ ہی ان کے نام قرآن مجید میں ذکر کئے جس طرح ان انبیاءؑ میں سے بعض کا تذکرہ اور ان کے نام قرآن مجید میں ذکر کئے جنہوں نے اپنی نبوت کا اظہار کیا، البتہ عین ممکن ہے کہ جملہ ''میں نے ان کے نام ذکر نہیں کئے'' خود راوی کا اپنا بیان ہو۔

ایک تطبیقی مورد کا بیان

تفسیر العیاشی میں ابوحمزہ ثمالی کے حوالہ سے مذکور ہے اُنہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے سنا وہ ارشاد فرما رہے تھے: ''لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ آپ پر علیؑ کے بارے میں نازل کیا وہ اپنے علم کے ساتھ نازل کیا اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں، اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۸۵)

یہی مطلب تفسیر قمی میں مولفؒ نے اپنے اسناد سے ابوبصیر کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۵۹) تو یہ بات دراصل تطبیقی مورد کے بیان کی ایک صورت ہے کیونکہ قرآنِ مجید میں متعدد آیات امام علی بن ابی طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں، لہٰذا اس روایت سے مراد یہ نہیں کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے اور نہ ہی یہ مراد ہے کہ حضرت امام صادقؑ آیت کو اس طرح پڑھتے تھے، بلکہ مراد آیت کے ایک تطبیقی مورد کا بیان ہے، چنانچہ اس روایت کے مانند کافی میں اور تفسیر العیاشی میں امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے، اور تفسیر قمی میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے آیۂ مبارکہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا'' کو توضیحی و تفسیری صورت میں اس طرح بیان کیا: ''ان الذين كفروا وظلموا آل محمد حقهم لم يكن الله ليغفر لهم'' (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور آل محمد کا حق غصب کر کے ان پر ظلم کیا اللہ ایسے لوگوں کو ہرگز معاف نہیں کرے گا) ___ (ملاحظہ ہو: اصولِ کافی، جلد اوّل، صفحہ ۴۲۵، تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۸۵، تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۵۹)

اسی کے مانند ایک روایت تفسیر ''مجمع البیان میں امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے آیت مبارکہ ''قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ'' (رسول تمہارے پاس حق لے کر آیا ہے) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی ولایت کا حکم لے کر آئے ہیں جس کی ولایت کا حکم اللہ نے صادر فرمایا ہے (تفسیر مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۱۴۳)

آیات ۱۷۰ تا ۱۷۵

○ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

○ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰي مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰي بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

○ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

○ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ

○ ''اے لوگو! بتحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ رسول آیا ہے، پس تم ایمان لے آؤ تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر تم انکار کرو تو ___ جان لو کہ ___ اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ بخوبی آگاہ و دانا ہے۔''

(۱۷۰)

○ ''اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کے بارے میں سوائے حق کے، کچھ بھی نہ کہو، یقیناً مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جو اس نے مریم پر القاء کیا ہے اور اس کی روح ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، اور تین خداؤں کا عقیدہ نہ رکھو بلکہ اس سے باز آ جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے، یقیناً اللہ ایک ہے جو معبود ہے، اس کی ذات اس سے پاک و بالاتر ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہی نگرانی وحفاظت کے لئے کافی ہے۔''

(۱۷۱)

○ ''مسیح ہرگز اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ ہی فرشتے جو کہ مقرب درگاہِ الٰہی ہیں، اور جو شخص اللہ کی بندگی سے روگردانی کرے اور تکبر سے کام لے تو اللہ ان سب کو اپنے پاس محشور کرے گا۔''

(۱۷۲)

O ''تو وہ لوگ جو ایمان لائیں اور اعمال صالحہ بجالائیں تو اللہ ان کا اجر و ثواب پورا پورا ادا کرے گا اور انہیں اپنے فضل و کرم سے مزید عطا کرے گا، اور جو لوگ روگردانی کریں اور تکبر سے کام لیں تو اللہ انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا والی و مددگار نہ پائیں گے۔''

(۱۷۳)

O ''اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان و دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین نازل کیا ہے۔''

(۱۷۴)

O ''پس جو لوگ ایمان لائیں اللہ پر اور اسی کے ساتھ وابستہ رہیں تو اللہ بہت جلد اُنہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور اپنے فضل و کرم سے نوازے گا اور اُنہیں صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرے گا۔''

(۱۷۵)

تفسیر و بیان

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اس مطالبہ کا جواب دیا تھا جو اُنہوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا کہ ان پر آسمان سے کتاب نازل کی جائے، خداوند عالم نے اُن کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں وہ اپنے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کتاب وہ اپنے رب کی طرف سے لائے ہیں وہ مضبوط دلیل و ٹھوس حجت ہے کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں لہٰذا اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ تمام افرادِ بشر کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ کی کتاب کی پیروی کی دعوت دینا مبنی بر صحت ہے۔

قرآنِ مجید میں جہاں بھی انبیاءؑ کا تذکرہ جمیل ہوا ہے وہاں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے تمام انبیاء و مرسلین ــ کہ ان میں حضرت عیسیٰؑ کا نام بھی ذکر ہوا ہے ــــ ایک ہی طریقہ و روش کو اپناتے تھے کہ جس کے تمام مربوطہ پہلو ایک دوسرے سے مشابہت و مماثلت کے حامل تھے اور اس کا نام طریقۂ وحی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی تھی، بنا برایں عیسائیوں کو کہ جو اہل کتاب و پیروانِ وحی ہیں یہ دعوت دینا قرین صحت قرار پاتا ہے کہ ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے دین میں غلو و افراط سے کام نہ لیں اور وہ دیگر توحید پرست مؤمنین کے ساتھ ملحق ہو جائیں اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں وہی عقیدہ رکھیں جو وہ اور دیگر خدا پرست تمام انبیاء کے بارے میں رکھتے ہیں یعنی یہ کہ وہ سب ہی اللہ کے بندے اور اس کی طرف سے اس کی مخلوق کی طرف بھیجے گئے پیغمبر تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں تمام لوگوں کو اپنے پیغمبر گرامی قدر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی کیونکہ اس سے پہلے جو آیات ذکر ہوئیں مثلاً: ''اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صداقت واضح ہو چکی تھی، اس کے بعد عیسائیوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں غلو اور افراطی عقیدہ کو ترک کر دیں کیونکہ سابقہ آیات میں اس حوالہ سے مربوطہ مطالب واضح طور پر بیان ہو چکے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب یعنی قرآنِ مجید کی پیروی کرنے کی دعوت دی کیونکہ سابقہ آیات کے آخر میں اس سلسلہ میں واضح ہو چکا تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے مثلاً: ''لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ'' (لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ تیری طرف نازل کیا وہ اپنے علم سے نازل کیا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی دعوتِ عام

○ ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ''

(اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے رسول حق کے ساتھ آیا ہے پس تم ایمان لے آؤ تمہارے لئے بہتر ہے)۔

اس آیت میں اہل کتاب سمیت تمام افرادِ بشر کو مخاطب کیا گیا ہے البتہ یہ اس سابقہ بیان ہی کی فرع اور اس سے مربوط ہے جس میں اہل کتاب کو مخاطب قرار دیا گیا تھا، یہاں اسے عمومی صورت میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جس چیز کی طرف دعوت دی جارہی ہے وہ اس کی متقاضی وصلاحیت رکھتی ہے کہ اس کی بابت دعوتِ عام دی جائے یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا، اسی طرح ان کی رسالت وپیغمبری کے منصب کی عمومی ذمہ داری اس کی متقاضی ہے کہ سبھی اس پر ایمان لائیں اور سب کو اس کی دعوت دی جائے۔

جملہ ''خَیْرًا لَّكُمْ'' ایمان کی صفت ہے اور وہ جملہ حالیہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایمان کی ایسی صفت کہ جو اس سے پیوستہ ہے کہ ہر حال میں اس کے ساتھ ساتھ ہے اور وہ یہ کہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

جملہ ''وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (اور اگر تم انکار کرو تو اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم انکار بھی کرو تو تمہارا انکار کرنا تمہارے کسی کام نہ آئے گا اور نہ ہی اس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان ہوگا کیونکہ آسمانوں اور زمین اور ہر چیز اللہ کے لئے مخصوص ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی ملکیت میں کچھ کمی واقع ہو اور کسی چیز کی ملکیت اللہ تعالیٰ سے سلب کی جاسکے، اور ہر چیز کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اپنی طبع الوجودی کے ساتھ اللہ کی ملکیت ہے کہ اس ملکیت میں کوئی اللہ کا شریک نہیں لہٰذا کسی چیز کا موجود ہونا اور مملوک ہونا دراصل ایک ہی حقیقت ہے، تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کوئی چیز اپنی وجودی حیثیت کے ساتھ ــــــ یعنی یہ کہ وہ شیٔ ہے ــــــ اللہ کی ملکیت کے دائرہ سے باہر ہو؟ یعنی وہ موجود تو ہو مگر اللہ کی ملکیت نہ ہو، یہ کیونکر قابل تصور ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ ان جامع کلمات میں سے ایک ہے کہ اس کی بابت جس قدر غور وفکر اور تدبر و تفکر کریں اس کے معانی کی لطیف جہتیں واضح وروشن تر ہوتی چلی جاتی ہیں، اور اس کے مفاہیم ومقاصد مزید آشکار ہوتے چلے جاتے ہیں، لہٰذا خداوند عالم کا تمام موجودات اور ان کے آثار کا مالک ہونا ایمان وکفر اور اطاعت ومعصیت سے مربوط معانی کی باریکیوں سے پردہ اُٹھادیتا ہے، اس بناء پر قارئین کرام پر لازم وضروری ہے کہ اس مقدس آیت کے معانی پر غور کریں اور زیادہ سے زیادہ اس کی بابت اپنی قوتِ فکری کو عمل میں لائیں۔

غلو وافراطی عقیدہ کی ممانعت

○ ''یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ''

(اے اہل کتاب، تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو)

اس آیت میں اہل کتاب کو مخاطب قرار دیا گیا ہے (یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ) لیکن اس میں چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے حوالہ سے بات ہوئی ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں اہل کتاب سے بالخصوص نصاریٰ مراد ہیں، اور انہیں اہل الکتاب کے عنوان سے خطاب کرنے کی وجہ یہ ہے ___ جبکہ یہ عنوان یہود و نصاریٰ دونوں کے لئے مشترک ہے ___ کہ ان کا اہل کتاب ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اُن حدود سے تجاوز نہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیں اور ان کی بابت اپنی کتاب میں وضاحت کردی ہے، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب سے مراد دونوں گروہ ہوں یعنی یہودی اور نصرانی! کیونکہ یہودی بھی نصرانیوں کی طرح دین میں غلو کرنے اور اللہ کے بارے میں ناحق بات کرنے میں مشترک ہیں، اس سلسلہ سے مربوطہ آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ توبہ، آیت: ۳۰

''وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ''

(اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے)

○ سورۂ توبہ، آیت ۳۱:

''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ''

(انہوں نے اللہ کی بجائے اپنے علماء کو اور اپنے راہبوں کو رب قرار دے دیا)

(یہودوں نے احبار کو اور نصرانیوں نے راہبوں کو رب مانا)

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۶۴

''قُلْ یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ..... وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ''

(کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب، آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے..... اور ہم اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب قرار نہ دیں)

بنا برایں جملہ ''اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ'' عام خطاب کے بعد تخصیص پر مبنی ہے تاکہ مخاطب افراد میں سے خاص گروہ کا مخصوص فریضہ بیان کیا جائے۔

البتہ یہ ایک احتمال ہے لیکن یہ اس لئے قرین صحت معلوم نہیں ہوتا کہ جملہ ''اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ

اللهِ '' دراصل جملہ ''لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ'' کی تعلیل یعنی وجہ وسبب کے بیان پر مشتمل ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آیت میں صرف نصرانیوں کو مخاطب قرار دیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ یہاں لفظ ''الۡمَسِیۡحُ'' یعنی مبارک کہہ کر ''عیسیٰ بن مریم'' کہا گیا یعنی حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کا نام ذکر کیا گیا، یہ اس لئے ہوا تا کہ اس سے کوئی دوسرا معنیٰ کہ جو اس سے مختلف ہو نہ کیا جا سکے اور بیجا تفسیر و تاویل نہ ہو سکے، اور یہ بھی ثابت ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسرے ہر انسان کی طرح ماں کے شکم سے جنم لینے والی مخلوق ہیں۔

اور جملہ ''وَ کَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰهَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ'' دراصل لفظ ''کَلِمَتُهٗ'' کے معنیٰ کی تفسیر و وضاحت کے لئے ہے کیونکہ یہاں ''کَلِمَتُهٗ'' سے مراد تخلیق و ایجاد والا کلمہ ''کن'' ہے اور جب یہی کلمہ حضرت مریم البجول یعنی اس باکرہ خاتون پر القاء ہوا تو اس کلمہ کی عملداری میں وہ عام اسباب کارفرمانہ تھے جو عموماً اس سلسلہ میں معمول ہوتے ہیں مثلاً نکاح اور بچہ کے باپ کا وجود وغیرہ، جبکہ کلمہ ''کُن'' کی بابت واضح ارشاد الٰہی ہے: ''اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' سورۂ آل عمران، آیت: ۱۴۷ (جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے) یعنی وجود میں آ جاتی ہے، اس لحاظ سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ہر چیز کے وجود میں آنے میں عام اسباب کارفرما ہوتے ہیں جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت یہ خصوصیت تھی کہ ان کے پیدا ہونے میں عام معمولی اسباب کارفرمانہ تھے۔

اور جملہ ''وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ'' میں حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کی روح سے موسوم کیا گیا ہے اور روح کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اس کا تعلق امر سے ہے، چنانچہ خداوند عالم نے فرمایا: ''قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ'' (کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے (سورۂ اسریٰ، آیت: ۸۵) اور حضرت عیسیٰؑ چونکہ خود کلمہ ''کن'' تھے جو کہ تکوین و تخلیق سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا وہ خود امر اور خود روح بھی تھے اس بناء پر انہیں کلمہ، اور روح سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں روح کا عالم الامر سے مربوط ہونا بھی ملحوظ ہے۔

اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی خلقت کے بارے میں ہم المیزان جلد سوم میں مربوط مطالب ذکر کر چکے ہیں۔

توحید، ہاں، تثلیث: نہیں

○ ''فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ''

(پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، اور تین خدا نہ کہو، ایسے عقیدہ سے باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہے، بتحقیق اللہ یکتا معبود ہے)

اس آیت کی ابتداء حرف ''فا'' سے ہوئی ہے جو کہ تفریع کے لئے ہے یعنی سابقہ بیان کا نتیجہ ہے اور چونکہ پہلے بیان کو جملہ ''اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ'' کے ذریعے واضح کرتے ہوئے اس کی وجہ ذکر کی گئی تھی لہٰذا اب اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے یوں

ارشاد ہوا کہ جب صورتحال یہ ہے تو تم پر واجب و لازم ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ یعنی اللہ کی ربوبیت اور اس کے رسولوں ـــــ کہ جن میں سے ایک ـــــ عیسیٰؑ ہیں کی رسالت کا اقرار کرو اور تین خداؤں کی بات ہرگز نہ کرو کہ تمہارا تین خداؤں کے عقیدہ سے باز آجانا یا اللہ کی ربوبیت اور اس کے رسولوں کی رسالت پر ایمان لانا اور تین خداؤں کے عقیدہ کی نفی کرنا تمہارے لئے بہتر ہے ـــــ یعنی تمہاری بہتری اسی میں ہے۔

آیت میں لفظ ''ثَلٰثَةٌ'' (وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ) سے ''باپ، بیٹا اور روح القدس'' مراد ہیں کہ جن پر عیسائیوں کے عقیدہ کی بنیاد قائم ہے، جو آیات حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان کی تفسیر میں آنجنابؑ سے مربوط مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں، ملاحظہ ہوں آیات سورۂ آل عمران!

ذاتِ باری تعالیٰ کی پاکیزگی

○ ''سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ''

(اس کی ذات پاک و مبرا ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

لفظ ''سُبْحٰنَهٗ'' کلام میں مفعول مطلق ہے کہ جس کا فعل تقدیری یعنی فرض و تصور کیا ہوا ہے اور جملہ ''اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ'' کا اسی فعل سے تعلق ہے، اور ''سُبْحٰنَهٗ'' کو نصب یعنی زبر کے ساتھ ''سبحانَہ'' پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے جو فعل تصور کیا گیا ہے اس پر حرف جر کو تصور کیا جائے گا جو کہ ختم کر دیا گیا ـــــ اور علم النحو کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں جر (زیر) دینے والا عامل گر جائے (ختم کر دیا جائے) تو وہاں جس لفظ پر اس کا آنا تصور کیا گیا ہو اسے مجرور کی بجائے منصوب پڑھا جائے گا یعنی زیر کی بجائے زبر کی حالت کے ساتھ پڑھا جائے گا، بنا بر ایں یہاں جملہ یوں تصور کیا جائے گا: ''اسبّحہٗ للتسبیح ـــــ اسبحہٗ تسبیحًا وانزھہٗ تنزیھًا ـــــ'' تو معنی یوں کیا جائے، گا کہ میں اسے اس سے پاک و منزہ سمجھتا ہوں کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، یہ جملہ معترضہ تعظیم کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے، ـــــ یعنی اگر یہ جملہ معترضہ یہاں نہ ہوتا تو اصل آیت اس طرح ہوتی: ''ولا تقولوا ثلاثة انتھوا خیراً لکم، انما اللہ الہ واحد، لہٗ ما فی السماوات والارض.......'' (اور تم تین خداؤں کے قائل نہ بنو، اس عقیدہ سے باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہے، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔)

اور جملہ ''لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ'' کو جملہ حالیہ قرار دیں یا جملہ مستانفہ (یعنی نیا جملہ) دونوں صورتوں میں یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بیٹا ہونے کی نفی کی ٹھوس دلیل ہے (یعنی یہ کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں) کیونکہ بیٹا ـــــ خواہ اس کے بارے میں

جو کیفیت تصور کریں ___ وہ اس سے ذاتی سنخیت کا حامل ہوتا ہے جس سے وہ متولد ہوا ہو (انسان کا بیٹا اس کے ساتھ انسانیت میں ہم سنخ، حیوان کا بچہ حیوانیت میں اس سے ہم سنخ، پرندے کا بچہ پرندہ ہونے میں اس کا ہم سنخ، وغیرہ وغیرہ) لیکن جب کائنات کی ہر چیز اور آسمانوں وزمین کی تمام موجودات اپنی اصل ذات اور ذات کے آثار میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور وہ ہر چیز کا مالک ومختار ہے اور ہر چیز کی وجودی حیثیت وبقاء صرف اسی کے ہاتھ میں ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی چیز اس کے ساتھ ذاتی سنخیت رکھتی ہو اور اس کے ساتھ کسی طرح سے مماثلت کی حامل ہو، لہٰذا کوئی اس کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔

ایک اہم نکتہ: یہاں ایک نکتہ قابل ذکر ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام موجودات کا تذکرہ مقصود تھا لہٰذا ضروری ہے کہ جملہ ''مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ'' میں ایک طرح سے کائنات کی ہر چیز ملحوظ ہو کیونکہ آسمان اور زمین خود اس میں شامل ہیں اور یہ دلیل ان پر بھی حاوی ہے اگرچہ لفظوں کے حوالہ سے وہ ان میں پائی جانے والی موجودات میں شامل نہیں بلکہ ان کی اپنی وجودی حیثیت میں استقلال رکھتی ہے ___ لیکن اس مقام پر ''تمام موجودات'' کے عنوان میں وہ بھی شامل ہیں اور استدلال کے دائرہ میں آتے ہیں۔

اور چونکہ اس آیت میں امر ونہی کے تناظر میں لوگوں کو عمومی ہدایت اور انہیں ان کی دنیوی واخروی خیر کی طرف رہنمائی کرنا مقصود تھا لہٰذا سلسلۂ کلام کے ذیل میں ارشاد ہوا: ''وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہارے امور کی سرپرستی و تدبیر کے لئے کافی ہے، وہ تمہیں اس چیز کی ہدایت فرماتا ہے جو تمہارے لئے بہتر ہے اور وہ تمہیں صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے۔

مسیح کی الوہیت کی نفی کا دوسرا پہلو

○ ''لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ''

(مسیح ہرگز اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ ہی مقرب فرشتے اس کا انکار کرتے ہیں)

یہ آیت حضرت مسیحؑ کی الوہیت کی مطلق نفی کی دوسری دلیل ہے کہ خواہ عیسٰی مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیں یا تیسرا خدا مانیں لیکن خود حضرت مسیحؑ ہرگز اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں، یہ وہ حقیقت ہے کہ خود نصرانی بھی اس کا انکار نہیں کرتے کہ وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے اور جو انجیلیں ان کے درمیان رائج ہیں اُن میں بھی صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ وہ اللہ کی عبادت بجالاتے تھے، بنابرایں یہ کہنا بے معنٰی ہے کہ بیٹا جو کہ خود خدا ہے وہ اپنے خدا باپ کی عبادت کرتا ہو اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ کوئی خدا خود اپنی عبادت کرتا ہو، اور یہ بھی صحیح نہیں کہ جو خود تین خداؤں میں سے ایک ہو وہ دوسرے دو خداؤں کی عبادت کرتا ہو کیونکہ تین خداؤں کے مفروضہ کی بنیاد پر وہ خود اُن میں سے ایک قرار پاتا ہے، بہرحال اس سلسلہ میں تفصیلی بحث اس کے مقام پر ہو چکی ہے اور ہم نے مربوطہ مطالب ذکر کر دیئے ہیں۔

اور جملہ ''وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' کے ذریعے اصل موضوع کو وسعت دے کر فرشتوں کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ جو بات حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کی گئی وہ فرشتوں کے بارے میں بھی کی گئی اور وہ یوں کہ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، بنابرایں یہ جملہ بات سے بات نکلنے کے طور پر ہے کہ جسے علمی اصطلاح میں ''استطراد'' کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی موضوع زیر بحث ہو تو اس سلسلۂ بیان میں کسی ایسے موضوع کا ذکر کیا جائے جو اس سے مشابہ ہو، یہاں چونکہ عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بات ہو رہی تھی جس میں وہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں لہٰذا فرشتوں کی بات بھی کردی گئی کہ مشرکین عرب انہیں خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، تو اس مناسبت سے ضروری تھا کہ ان کا تذکرہ بھی کردیا جائے۔

خصوصیت کا اظہار

آیت مبارکہ میں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کی نفی کے بیان میں ان کے اور فرشتوں کے بارے میں خصوصیت کا اظہار ہوا اس کے حوالہ سے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کے مسیح ہونے اور فرشتوں کے بارے میں ان کے مقرب ہونے کی خصوصیت بیان کی گئی، چنانچہ ارشاد ہوا: ''لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ'' (ہرگز انکار نہیں کرے گا مسیح اس سے کہ وہ بندۂ خدا ہے اور نہ مقرب فرشتے انکار کریں گے) تو اس میں دونوں کے حوالہ سے مخصوص صفت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس صفت کے حامل ہونے کے باوجود اللہ کی بندگی سے کیونکر انکار کرسکتے ہیں، یعنی عیسیٰؑ، اللہ کی بندگی سے کیونکر انکار کرسکتے ہیں حالانکہ وہ تو مسیح یعنی مبارک ہیں؟ اور نہ ہی فرشتے ایسا کرسکتے ہیں کیونکہ وہ تو مقربِ درگاہِ الٰہی ہیں، اگر ان سے ایسا کرنے کی توقع ہوتی تو خداوند عالم نہ تو حضرت عیسیٰؑ کو ''مسیح''، یعنی مبارک قرار دیتا اور نہ ہی فرشتوں کو مقرب ہونے کا اعزاز عطا فرماتا، اس کے علاوہ درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی حضرت عیسیٰؑ مسیح کو مقرب ہونے کی صفت کا حامل قرار دیا گیا ہے:

- سورۂ آل عمران، آیت: ۴۵

''وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ''

(وہ دنیا و آخرت میں باوقار و مکرم ہے اور مقربین میں سے ہے)

عبادت الٰہی سے انکار کا انجام

- ''وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا''

(اور جو شخص اس کی عبادت سے انکار کرے اور تکبر و بڑائی کرے تو اللہ ان سب کو اپنے پاس لے آئے گا)

یہ جملہ حضرت مسیح اور فرشتوں کے حوالہ سے بیان کئے گئے مطالب سے مربوط ان کی حالت کے تذکرہ پر مبنی ہے، گویا ان کے انکار نہ کرنے کی وجہ کو بیان کررہا ہے یعنی مسیح اور فرشتے جو کہ مقرب ہیں وہ اللہ کی عبادت سے روگردانی کیونکر کرسکتے ہیں حالانکہ جو اس کی عبادت سے روگردانی کرتے ہیں اور جن وانس میں سے جو بھی اس حوالہ سے تکبر و بڑائی کرے تو وہ سب کے سب اللہ کی طرف محشور ہوں گے اور وہ اپنے کیفر کردار کو ضرور پہنچیں گے جبکہ مسیح اور فرشتے یہ سب کچھ جانتے ہیں اور اس پر ایمان و یقین رکھتے ہیں اور تقویٰ والے ہیں۔

ایک لطیف ادبی نکتہ

اس آیت میں جملہ ''وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ'' سے یہ مراد لینا کہ مسیح اور ملائکہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا اس بناء پر ہے کہ ''يَسْتَكْبِرْ'' سے پہلے ''يَّسْتَنْكِفْ'' ذکر ہوا ہے اور استنکاف اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہیں ہوتا جب تک اس کی وجہ استکبار نہ ہو جیسا کہ جاہلوں اور فکری مستضعف لوگوں کا معمول ہے کہ ان کا استنکاف، تکبر کی بناء پر نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک مسیحؑ اور ملائکہؑ کا تعلق ہے تو وہ اس لئے ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اپنے پروردگار کے مقام و منزلت سے بخوبی آگاہ ہیں ــــــ اور جو اس طرح کا علم و آگاہی رکھتا ہو وہ تکبر نہیں کرسکتا ــــــ، اسی لئے ان کی بابت صرف ''استنکاف'' ذکر ہوا، لہٰذا آیت کا معنٰی یوں ہوگا کہ مسیح اور فرشتے تکبر پر مبنی استنکاف کا ارتکاب نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اس حقیقت کا علم رکھتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی عبادت سے روگردانی کرے اور تکبر کرے تو خدا ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ بنا براین اس آیت سے یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ مسیح اور مقرب فرشتوں کے بارے میں اس طرح کا گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ تکبر کے ساتھ اللہ کی عبادت سے منہ موڑیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے والوں کا انجام کیا ہوگا لہٰذا اگر ان کی بابت استنکاف کا فرض و تصور کیا جائے تو وہ مبنی بر جہل و استضعاف نہ ہوگا بلکہ مبنی بر تکبر ہوگا جو کہ ان کے حوالہ سے ہرگز نہیں ہوسکتا ــــــ،

اور لفظ ''جَمِيْعًا'' سے اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو خواہ نیک و صالح افراد ہوں یا برے اعمال انجام دینے والے ہوں سب کو محشور کرے گا، اس سے بعد والے جملہ میں اہل ایمان کے تفصیلی تذکرہ کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے جس میں یوں ارشاد ہوا: ''فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ..... '' (مگر جو لوگ ایمان لائے اور انجام صالحہ انجام دیئے.........)

اور جملہ ''وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا'' (اور وہ اپنے لئے اللہ کے سوا کوئی سرپرست و مددگار نہ پائیں گے) میں دراصل مسیح و ملائکہ کی الوہیت کے باطل عقیدہ کا تقابلی حوالہ ملحوظ ہے۔

اللہ کی طرف سے اتمامِ حجّت

○ ''یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ کُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا''

(اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برھان ودلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف نور نازل کیا ہے)

مشہور ماہر لغت راغبؒ اصفہانی نے اپنی کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے ''کہ برھان'' کا معنٰی دلیل و حجت کو بیان وواضح کرنا ہے، اور یہ ''فعلان'' کے وزن پر ہے جیسے رجحان، ثنیان، بعض اہل ادب کا کہنا ہے کہ یہ مصدرؔ ہے اس کا فعل ماضی ''برہ'' اور فعل مضارع ''یبرہ'' ہے، جس کا معنٰی واضح وروشن ہونا ہے، بہرحال یہ مصدرؔ ہے، اور کبھی اسے فاعل کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اس وقت ہوتا ہے جب اس سے اصل دلیل وحجت مراد لی جائے یعنی جب اس کا اطلاق اصل دلیل پر ہو اور دلیل کو ہی برہان قرار دیا جائے تو اس لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اور ''نور'' سے مراد قرآن مجید ہی ہے کیونکہ اس کے لئے جملہ ''وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ'' استعمال ہوا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے بھی وہی برہان ودلیل مراد ہو تو اس صورت میں دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید پر مبنی قرار پائیں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''نور'' سے مراد حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر ہو چنانچہ اس بات کی تائید وتصدیق اس سے ہوتی ہے کہ یہ آیت مبارکہ ان آیات مقدسہ کے ذیل میں واقع ہوئی ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کا بیان اور قرآنِ مجید کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کا بیان ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اس مطلب کی تصدیق و تاکید کرتی ہے کہ اس آیت میں سابقہ آیات کی نتیجہ گیری ہوئی ہے اور یہ سابقہ آیات ہی کی فرع اور ان سے مربوط ہے، ان تمام امور کے علاوہ یہ مطلب بھی اس موضوع ونظریہ کو تقویت دیتا ہے کہ اس کے بعد ارشاد ہوا: ''وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ'' (اور جو اس کے ساتھ وابستہ رہے) چنانچہ اس سلسلہ میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۱ ''وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ'' (جو شخص اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو گویا وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت پا گیا) میں تفصیلی طور پر ذکر ہو چکا ہے کہ اعتصام یعنی وابستہ ہونے سے مراد کتاب اللہ یعنی قرآن مجید پر عمل کرنا اور حضرت پیغمبرِ اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنا ہے۔

ایمان باللہ کی جزاء

○ ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ.....''

(پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس سے وابستہ ہوئے)

اس آیت میں ان لوگوں کی جزاء وثواب کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ پر ایمان لائے، اپنے پروردگار کی طرف سے جو دلیل وبرہان آئی اور جو نور اللہ نے نازل فرمایا اس کی پیروی کی۔

یہ آیت گویا سابقہ آیت میں مذکور مطالب کے انتزاعی بیان پر مشتمل ہے کہ جس میں ایمان لانے والوں اور نیک اعمال انجام دینے والوں کی جزاء وثواب کو بیان کیا گیا اور یوں کہا گیا: ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ''(پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو اللہ انکا اجر وثواب پورا پورا دے گا اور ان پر اپنا فضل وکرم زیادہ فرمائے گا) شاید اسی بناء پر یہاں ان لوگوں کی سزا کا ذکر نہیں کیا جو برہان ونور کی پیروی سے روگردانی کریں کیونکہ اس کا تذکرہ پہلی آیت میں ہو چکا تھا کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا'' لہٰذا یہاں اس کے تکرار اور دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہ تھی جبکہ یہاں پیروی کرنے والوں کی جو جزاء وثواب ہے، وہی جزاء وثواب ان کے لئے وہاں ہے، اور دو ہی گروہ ہیں جو اس حوالہ سے قابل تصور ہیں، ایک وہ جو پروردگار کی دلیل وبرہان کی پیروی کرنے والے ہیں اور دوسرے وہ جو روگردانی وسرتابی کرنے والے ہیں۔

بنابرایں اس آیت میں جملہ ''فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ'' سابقہ آیت میں مذکور جملہ ''فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ'' کے برابر ہے کیونکہ یہاں ''رَحْمَةٍ'' مذکور ہے اور وہاں ''اجور'' (اجر وثواب) یعنی جنت مراد ہے کہ دونوں یکساں ہیں۔ اور اس آیت میں ''وَفَضْلٍ'' مذکور ہے جبکہ سابقہ آیت میں ''وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ'' مذکور ہے کہ دونوں برابر ہیں۔

اور جہاں تک جملہ ''وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا'' کا تعلق ہے تو وہ اللہ سے وابستہ ہونے (اعتصام باللہ) کا نتیجہ اور اس کے آثار میں سے ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۱ ''وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ''(اور جو شخص اللہ سے وابستہ رہا تو گویا وہ صراط مستقیم کی ہدایت پا گیا) میں اس سلسلہ میں واضح بیان موجود ہے۔

آیت ۱۷۶

○ يَسْتَفْتُونَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ

○ ''لوگ آپ سے فتویٰ (شرعی حکم) پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں شرعی حکم بتاتا ہے کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے کہ جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور صرف ایک بہن ہو تو وہ ترکہ کا نصف لے گی، اور ــــ اگر بہن فوت ہو جائے تو ــــ بھائی ہی اس کا وارث ہوگا اگر بہن کی کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کے لئے ترکہ سے دو ثلث ــــ ہوں گے اور اگر کئی بہن بھائی ہوں تو مرد کے لئے عورت سے دگنا حصہ ہوگا، یہ سب کچھ اللہ تمہیں واضح طور پر بتاتا ہے کہ کہیں تم گمراہ نہ ہونے پاؤ، اور اللہ ہر شے سے بخوبی آگاہ ہے۔''
(۱۷۶)

تفسیر و بیان

اس آیۂ مبارکہ میں ان رشتہ داروں کے میراث میں حصوں کو بیان کیا گیا ہے جو مرنے والے سے ماں باپ دونوں یا صرف باپ سے تعلق داری کی بناء پر وراثت پاتے ہیں کہ جنہیں ''کلالہ'' کہا جاتا ہے، البتہ سنت میں ''کلالہ'' سے صرف باپ کے رشتہ دار مراد لئے گئے ہیں، یہ بیان اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو ابتدائے سورہ میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے کلالہ کے وراثتی حصے ذکر کئے گئے تھے چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو حصے یہاں ذکر ہوئے ہیں وہ ان حصوں سے زیادہ ہیں جو وہاں بیان کئے گئے تھے، اور ان آیات سے ثابت و ظاہر ہوتا ہے کہ مَردوں کے حصے عورتوں سے زیادہ مقرر کئے گئے ہیں۔

کلالہ کی میراث؟

○ ''یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا ہَلَکَ لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ''

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتویٰ (شرعی حکم) پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اگر کوئی شخص مرجائے کہ جس کی کوئی اولاد نہ ہو.....)

اس آیت میں ''استفتاء'' اور ''افتاء'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں، ان دونوں کے معانی اسی سورہ مبارکہ کی سابقہ آیات میں بیان کئے جاچکے ہیں، اسی طرح لفظ ''کلالہ'' کا معنیٰ بھی بیان ہو چکا ہے۔

اور جملہ ''لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ'' میں ''ولد'' (اولاد) میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں کیونکہ جہاں لفظ ''ولد'' مطلق اور کسی اضافی قید و شرط کے بغیر ذکر ہو وہاں اس کا عام و وسیع معنیٰ مراد ہوتا ہے کہ جس میں مرد و عورت یعنی لڑکا اور لڑکی دونوں مراد ہوتے ہیں۔

تفسیر ''مجمع البیان'' میں ''لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ نہ اس کی اولاد ہو اور نہ ہی باپ ہو، اور یہاں باپ کو اس لئے شامل فرض کیا گیا ہے کہ اس پر اہل علم کا اجماع ہے، (مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۱۴۹) ہاں، اگر مرنے والے کے ماں باپ میں سے کوئی ایک موجود ہوتا تو آیت میں اس کا حصہ ضرور بیان کیا جاتا، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ اسی صورت میں میراث کے شرعی حکم کو بیان کر رہی ہے جب مرنے والے کے والدین میں سے کوئی ایک بھی موجود نہ ہو۔

اور جملہ ''لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ '' (اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لئے ترکہ سے آدھا حصہ ہے، اور وہ بھی اس کی وراثت میں حصہ لے گا اگر بہن کی اولاد نہ ہو) میں بہن کا بھائی کے ترکہ میں اور بھائی کا بہن کے ترکہ میں حصہ بیان کیا گیا ہے، اسی سے بہن کا بہن سے اور بھائی کا بھائی کے ترکہ سے حصہ بھی معلوم ہوجاتا ہے، کیونکہ اگر بہن کا بہن کے ترکہ سے اور بھائی کا بھائی کے ترکہ سے حصہ مذکورہ بالا حصہ سے مختلف ہوتا تو آیت میں اس کو ضرور بیان کیا جاتا۔

اور جملہ ''وَهُوَ يَرِثُهَا'' اس مطلب کے بیان میں ہے کہ اگر صورتحال اس سے برعکس ہو یعنی بہن فوت ہوجائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور وارثوں میں سے صرف بھائی ہو تو وہی پورے ترکہ کا وارث ہوگا،

اور جملہ ''فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ'' سے مراد دو بہنوں کا حصہ ہے، اور بھائیوں کے حصوں کے بیان میں یہ بات مذکور نہیں کہ مرنے والا شخص مرد ہو یا عورت ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصوں کے حوالہ سے مرنے والے کے مرد یا عورت ہونے کا کوئی دخل نہیں۔

بہر حال اس آیت مبارکہ میں جن حصوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۱) ایک بہن، (کہ مرنے والے کا کوئی اور وارث نہ ہو) (۲) ایک بھائی، (کہ مرنے والی بہن کا کوئی دوسرا وارث نہ ہو (۳) دو بہنیں (۴) بھائیوں اور بہنوں کے حصے (کہ دونوں صنفوں میں سے مرنے والے کے وارث موجود ہوں) ان کے علاوہ دیگر وارثوں کے حصے انہی حصوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے معلوم ہوجاتے ہیں کہ جن میں وہ صورت بھی شامل ہے جس میں مرنے والے کے وارث صرف اس کے دو بھائی ہوں کہ وہ تمام مال کے وارث ہوں گے اور آپس میں برابر تقسیم کریں گے، یہ حکم اسی صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اگر مرنے والے کا وارث صرف اس کا ایک بھائی ہو تو وہ سارے مال کا وارث ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ اس صورت کا حکم بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب صرف ایک بھائی اور ایک بہن وارث ہو کیونکہ لفظ ''اخوۃ'' میں یہ صورت بھی شامل ہے کیونکہ ان پر لفظ ''اخوۃ'' کا اطلاق درست قرار پاتا ہے جیسا کہ اس کی وضاحت ابتدائے سورت میں ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ روایات واحادیث میں ان تمام صورتوں کے احکام واضح طور پر بیان ہوئے ہیں۔

اور اس آیت میں جن حصوں کو بیان کیا گیا ہے وہ انہی موارد کے ساتھ مختص ہیں جہاں صرف پدری رشتہ دار یا پدر و مادر دونوں کے رشتہ دار موجود ہوں یعنی کلالۃ الاب یا کلالۃ الابوین، لیکن اگر دونوں ہی موجود ہوں مثلاً اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے وارثوں میں ماں باپ دونوں کی طرف سے ایک بہن ہو اور ایک بہن صرف باپ کی طرف سے ہو تو اس صورت میں پدری بہن حصہ نہیں لے گی، چنانچہ اس مسئلہ کی وضاحت اس صورت کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں ہوچکی ہے۔

بیانِ احکام کی غرض

○ ''یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا''

(اور اللہ تمہارے لئے احکام کو اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم کہیں گمراہ نہ ہو جاؤ)

اس آیت میں احکام بیان کرنے کی غرض و مقصد کو ذکر کیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ تم کہیں گمراہ نہ ہو جاؤ یا یہ کہ تا کہ تم گمراہ نہ ہو، اس طرح کا انداز سخن کلام عرب میں عام ہے چنانچہ عرب کے مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کا ایک مصرعہ ہے: ''فعجلنا القری ان تشتمونا'' کہ ہم نے تمہاری مہمان نوازی میں اس لئے جلدی کی کہ کہیں تم ہماری سرزنش نہ کرو، یعنی اس ڈر سے کہ کہیں تم ہماری شماتت نہ کرو۔

روایات پر ایک نظر!

جابر انصاری کا واقعہ

تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری نے بیان کیا کہ میں بیمار تھا اور میری نو ــــ یا سات ــــ بہنیں تھیں، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ پر دم کیا تو میری جان میں جان آگئی ــــ مجھے بیماری سے افاقہ ہو گیا ــــ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اجازت دیں تو میں اپنی بہنوں کے لئے اپنے ترکہ سے دو تہائی کی وصیت کرنا چاہتا ہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بہت خوب! میں نے عرض کی: اگر میں اپنے مال کا کچھ حصہ ان کے لئے وصیت کروں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بہت اچھا ہے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد تشریف لائے اور فرمایا: اے جابر! تم اس بیماری میں دنیا سے کوچ نہیں کرو گے اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہنوں کے حصوں کی بابت آیات نازل فرمائی ہیں کہ اُن کے لئے دو ثلث ہیں، اس کے بعد محدثین سے جابر نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی (مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۱۴۹)

اس روایت کے قریب المعنیٰ ایک روایت تفسیر ''درمنثور'' میں بھی ذکر کی گئی ہے، (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۴۹)

آخری سورت اور آخری آیت

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن ابی شیبہ، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ضریس، ابن جریر، ابن منذر اور بیہقی نے اپنی کتاب دلائل میں براء کے حوالہ سے بیان کیا کہ اُنہوں نے کہا: سب سے آخری سورت جو کامل طور پر نازل ہوئی وہ سورۂ برائت ہے اور سب سے آخری آیت جو نازل ہوئی وہ سورۂ نساء کی آخری آیت ہے یعنی: ''یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ..... الخ'' (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۲۵۱)

اسی کتاب تفسیر ''درمنثور'' میں متعدد روایات ذکر کی گئی ہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام اس آیت (یَسْتَفْتُوْنَكَ.... الخ) کو آیۃ الصیف کہتے تھے (موسم گرما والی آیت)، اور تفسیر مجمع البیان میں اس حوالہ سے مذکور ہے کہ کلالہ کے بارے میں دو آیتیں نازل ہوئیں: ایک سردیوں میں اور ایک گرمیوں میں، جو سردیوں میں نازل ہوئی وہ سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے اور جو گرمیوں میں نازل ہوئی وہ یہی آیت یعنی سورۂ نساء کی آخری آیت ہے (تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۱۴۹)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ابوالشیخ نے کتاب الفرائض میں براءؔ کے حوالہ سے ذکر کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: باپ اور بیٹے کے علاوہ سبھی کلالہ ہیں۔

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۵۰)

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی قدر

تفسیر القمی میں مولفؒ نے لکھا ہے کہ مجھے میرے والد نے ابن ابی عمیر کے حوالہ سے بیان کیا کہ ابن اذینہ نے بکیر کے حوالہ سے امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کی صرف ایک بہن ہو تو وہ اس کے نصف ترکہ کی وارث ہوگی، اس کی دلیل یہی آیت ہے (**یستفتونك عن الكلالة.......**) جیسا کہ اسی آیت کی رو سے یہ حکم ہے کہ اگر مرنے والے کی صرف ایک بیٹی ہو تو وہ نصف ترکہ پائے گی، اور باقی نصف بھی اسے ہی ملے گا لیکن فریضہ کے طور پر نہیں بلکہ خونی قرابت کی بنیاد پر! بشرطیکہ مرنے والے کا اس کے علاوہ کوئی قریبی ترین وارث موجود نہ ہو، لیکن اگر مرنے والے کا ایک بھائی ہو یعنی بہن نہ ہو بلکہ صرف ایک بھائی ہو تو پورے ترکہ کا وارث ہوگا کیونکہ ارشادِ

الٰہی ہے: "وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ" (اور وہی وارث ہوگا بشرطیکہ بہن کی اولاد نہ ہو) اور اگر دو بہنیں ہوں تو وہ دو ثلث ۲/۳ حصہ لیں گی جو کہ اس آیت کی رُو سے فریضہ کے طور پر ہوگا اور باقی ایک ثلث ۱/۳ خونی قرابت کی بنیاد پر لیں گی، اور اگر کئی بہن بھائی ہوں تو مرد کو عورت کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے، یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب مرنے والے کی اولاد یا والدین یا بیوی موجود نہ ہو (تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۵۹)

اس روایت کے ساتھ ساتھ متعدد روایات حضرت امام محمد باقر ؑ اور حضرت امام جعفر صادق ؑ کے حوالہ سے تفسیر العیاشی میں ذکر کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی جلد اول، صفحہ ۲۸۶)

میراث کا تفصیلی حکم

تفسیر العیاشی میں بکیرؔ کے حوالہ سے مذکور ہے، اُنہوں نے کہا کہ ایک شخص حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اس نے امامؑ سے پوچھا کہ ایک عورت مرگئی ہے اور اس کا شوہر اور مادری بہن بھائی اور ایک پدری بہن ہے، اس کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: شوہر کو ترکہ کا نصف (۳/۶) اور پدری بہن کو ایک تہائی (۱/۶) ملے گا، گویا کُل ترکہ کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا جس میں تین حصے شوہر، دو حصے مادری بہن بھائیوں اور ایک حصہ پدری بہن کو ملے گا ____،

یہ سن کر اس شخص نے کہا: اے ابوجعفرؑ! زیدؔ، ابن مسعود اور دیگر قاضیوں کا نظریہ اس سے مختلف ہے! وہ کہتے ہیں کہ پدری و مادری بہن کو چھ حصوں میں سے تین حصے ملیں گے اور باقی تین حصے شوہر کو ملیں گے، اور کل ترکہ کو چھ کی بجائے آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تا کہ مادری بہنوں کو بھی دو تہائی مل سکے، امامؑ نے فرمایا کہ وہ کس دلیل کی بناء پر ایسا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: اُن کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ" (اور اس کی بہن ہو تو وہ ترکہ کا نصف لے گی)، امامؑ نے فرمایا: اگر تم اللہ کے فرمان کو دلیل بناتے ہو تو پھر بھائی کا حصہ کیوں کم کرتے ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَلَهَا نِصْفُ" (بہن کا حصہ آدھا ہے) اور بھائی کے لئے فرمایا: "وَهُوَ يَرِثُهَآ" (اور وہ ہی اس کا وارث ہوگا) یعنی تمام مال اسی کو ملے گا، بشرطیکہ بہن کی اولاد نہ ہو (اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ) تو تم لوگ اپنے بعض مفروضوں میں اسے کچھ بھی نہیں دیتے جسے اللہ نے سارا ترکہ کا وارث قرار دیا ہے اور اس نے جس کے لئے نصف قرار دیا ہے اسے سارا مال دیتے ہو؟

(تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۸۷)

ابن عباس کا مدلل بیان

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ عبدالرزاق، ابن منذر اور حاکم وبیہقی نے ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اُن سے ایک شخص کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا کہ جب وہ فوت ہوا تو اس کی بیٹی، ایک پدری و مادری بہن تھی، اس کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

اُنہوں نے جواب دیا: بیٹی کو آدھا ترکہ ملے گا اور بہن کو کچھ بھی نہیں ملے گا اور جو کچھ باقی بچے گا وہ ''عصبہ'' یعنی پدری رشتہ داروں کو ملے گا، کسی نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ عبداللہ بن عمر نے تو بہن کے لئے نصف ترکہ قرار دیا ہے، ابن عباس نے کہا کہ آیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا اللہ؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ'' (اگر کوئی فوت ہو جائے کہ جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن موجود ہو تو اس کو ترکہ کا نصف ملے گا) مگر تم کہتے ہو کہ اسے نصف ترکہ ملے گا خواہ مرنے والے کی اولاد موجود کیوں نہ ہو (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۲۵۱)

سابقہ مطالب پر مشتمل دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

سورۂ مبارکہ مائدہ

یہ سورت مدنی سورتوں میں سے ہے اور اس کی ۱۲۰ آیات ہیں۔

آیات ۱ تا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ۬ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ ①

○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ②

○ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ③

ترجمہ

ابتداء اللہ کے نام سے، جو بہت رحمت عطا کرنے والا، ہمیشہ مہربان ہے

○ "اے ایمان والو، معاملات ولین دین اور معاہدوں کو پورے طور پر انجام دو، تمہارے لئے چرنے والے حیوانات حلال کئے گئے ہیں، سوائے اُن کے کہ جن کے بارے میں تمہیں آگاہ کرایا جائے گا، البتہ احرام کی حالت میں کئے گئے شکار کو حلال قرار نہ دو، یقیناً اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

(۱)

○ "اے ایمان والو، شعائر اللہ (اللہ کی نشانیوں) کی بیحرمتی کے مرتکب نہ ہو، اور نہ احترام والے مہینہ کی، اور نہ قربانی کے جانور کی، اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں نشانی کے پٹے ڈال دیئے گئے ہوں، اور نہ اُن لوگوں کی جو اللہ کے فضل وعنایت کی تلاش میں بیت اللہ کی طرف کوچ کریں، اور جب تم احرام اُتار دو تو شکار کرنا تمہارے لئے روا ہے، اور تمہیں ان لوگوں کی دشمنی کہ جنھوں نے تمہیں مسجد الحرام سے روکا کسی طرح کی زیادتی پر نہ اکسائے، تم نیکی وتقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ وزیادتی پر ایک دوسرے کی معاونت نہ کرو، اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، کہ اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔"

(۲)

○ ''تم پر حرام قرار دیا گیا ہے مُردار کو، خون کو، خنزیر کے گوشت کو، اور جو جانور اللہ کے علاوہ کسی کے لئے ذبح کیا گیا ہو، اور وہ جانور جسے گلا دبا کر مارا گیا ہو اور وہ جانور کہ جسے مار مار کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا ہو، اور وہ جانور جو اونچائی سے گر کر مرا ہو اور وہ جانور جسے کسی درندے نے کھا لیا ہو۔ یہ سب حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ سوائے اس جانور کے کہ جس کا تم تذکیہ کرلو۔ مرنے سے پہلے ذبح کرلو، اور وہ جانور بھی حرام قرار دیا گیا ہے جسے زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق بتوں کے لئے ذبح کیا گیا ہو، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم تیروں کے ذریعے (جوا کا مخصوص طریقہ) مال کی تقسیم کاری کرو، یہ سب کچھ فسق ہے آج کے دن کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے، لٰہذا تم ان سے مت ڈرو، بلکہ میری خشیت اختیار کرو، آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا ہے، پس جو شخص ان حرام کی گئی چیزوں میں سے کسی کے کھانے پر مجبور ہو جائے کہ جان بوجھ کر گناہ کے ارتکاب کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو ضرورت کی حد تک کھا لے تو یقیناً اللہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

(۳)

تفسیر و بیان

اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی اور آخری اور دیگر تمام آیات پر غور وفکر کیا جائے اور اس میں مذکورہ احکام و واقعات کی بابت تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کی جامع غرض و مقصد ہر قسم کے عہد و پیمان اور وعدوں و میثاق کی پاسداری و عملی وفاداری کا ثبوت دینے کی دعوت دینا ہے اور عہد شکنی اور وعدوں کے بارے میں لاپرواہی و بے توجہی کی شدید ممانعت اور اس سے بچنے کی تاکید کرنا ہے، اور اس مطلب کو بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی رحمت اور آسانیوں و نرمیوں سے ان لوگوں کو نوازتا رہتا ہے جو تقویٰ اختیار کریں، ایمان دار ہوں، ہر مرحلہ میں خدا خوفی اپنائیں اور احسان و نیکیاں کریں، اسی طرح جو لوگ عہد شکنی کریں، سرکشی و زیادتیاں کریں، اطاعتِ الٰہی کے عہد و میثاق کو توڑیں اور ان تمام امور میں وعدہ خلافی کا ارتکاب کریں جو دین کے حوالہ سے ان کے ساتھ طے پائے تھے تو ایسے لوگوں کو خدا کی طرف سے سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس سورۂ مبارکہ میں متعدد آیات دیکھتے ہیں جن کا تعلق احکام سے ہے مثلاً حدود و قصاص وغیرہ کے احکام، اور دسترخوان کا واقعہ، حضرت مسیحؑ کا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا کہ اس کے لئے اور اس کے ساتھیوں کے لئے آسمان سے مائدہ یعنی کھانا نازل فرمائے اور حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں کا واقعہ، اور بنی اسرائیل کے متعدد مظالم اور ان کی طرف سے عہد شکنی کے واقعات کا ذکر، اس کے علاوہ اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی نعمتوں کا تذکرہ ہے مثلاً دین کا مکمل کیا جانا، نعمتوں کا پورا کیا جانا، پاک و پاکیزہ چیزوں کا حلال کیا جانا، اور ایسے احکام صادر فرمانا کہ جن سے لوگوں کے نفوس کی تطہیر ہو اور وہ کسی طرح کی تنگی و پریشانی کا شکار بھی نہ ہوں۔

مذکورہ بالا تمام مطالب کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ تمام اہل دانش و اربابِ تحقیق کا اتفاق ہے کہ سورۂ مائدہ وہ مفصل سورت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایام حیات میں نازل ہوئی، اور فریقین کی کتب میں اس حوالہ سے جو روایات مذکور ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورت ناسخ ہے منسوخ نہیں ہے، بنا برایں یہ بات مناسب تھی کہ اس سورت میں ان وعدوں اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کی تاکید کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کئے ہیں اور ان پر عملی طور پر ثابت قدم رہنے پر زور دیا جائے۔

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم

○ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ''

(اے ایمان والو! عقود کو پورا کرو)

''عقود'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''عقد'' ہے جس کا معنیٰ گرہ ڈالنا اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس طرح سخت طریقہ سے جوڑنا و باندھ دینا ہے کہ اُن میں سے ایک کا دوسری سے جدا ہونا آسان نہ ہو جیسا کہ کسی ایک رسی کو دوسری رسی سے باندھا جاتا ہے یا ایک دھاگہ کو دوسرے دھاگہ سے باندھا جاتا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے، یہ عمل لوگوں کے درمیان محسوس و مادی چیزوں میں تو عام معمول رائج تھا پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کا دائرہ غیر محسوس و غیر مادی اور معنوی امور تک وسیع ہو گیا جیسے لوگوں کے درمیان انجام پانے والے معاملات و لین دین کے عقود مثلاً خرید و فروخت، اجارہ و کرایہ وغیرہ کے معاملات، اسی طرح دیگر تمام معاہدے اور باہمی طے پانے والے عہد و میثاق وغیرہ، تو ان سب پر لفظ ''عقد'' کا اطلاق ہونے لگا کیونکہ ان سب میں وہ معنیٰ پایا جاتا تھا جو عقد کی اصل وضع میں ملحوظ ہے یعنی دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہونا!

اور ''عقد'' یعنی عہد و میثاق ــــــ چونکہ ان تمام دینی وعدوں اور معاہدوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ساتھ کئے ہیں اور اس میں تمام دینی ارکان و اجزاء اور اصول و فروع شامل ہیں مثلاً توحید اور دیگر بنیادی عقائد اور عبادتی اعمال و احکام اصلی و فرعی کہ جن میں سے معاملات و لین دین وغیرہ کے عقود بھی شامل ہیں، اور آیت میں لفظ عقود پر الف ولام ہے: ''العقود'' تو ان تمام حوالوں کے پیش نظر مناسب و موزوں یہ ہے کہ یہاں لفظ ''العقود'' سے اس کا عمومی معنیٰ مراد لیا جائے یعنی ہر وہ چیز جسے ''عقد'' کہا جا سکے!

اس بیان سے یہ بات واضح طور پر نادرست ثابت ہو جاتی ہے کہ جن بعض مفسرین نے ''عقود'' سے صرف وہ عقود مراد لئے ہیں جو لوگوں کے درمیان عام رائج ہیں مثلاً عقد بیع (خرید و فروخت) عقد نکاح، اور عہد و معاہدہ، یا وہ عقد جو انسان خود اپنے ساتھ جوڑتا ہے مثلاً عقد الیمین (یعنی قسم کھاتا ہے کہ فلاں کام کرے گا یا نہ کرے گا) اسی طرح وہ بات بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے جو بعض دیگر مفسرین نے اس حوالہ سے کہی اور وہ یہ کہ یہاں ''العقود'' سے مراد ''العھود'' ہے یعنی وہ عہد و پیمان اور وعدے کہ جو زمانہ جاہلیت میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے کہ اگر کسی نے ان پر زیادتی کی یا دشمنی و بغاوت اور

جنگ کی تو وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور بھر پور مدد و دفاع کریں گے اور یہی وہ حلف اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی باہمی قسم کھانا ہے، جو ان کے درمیان رائج تھا، اسی طرح وہ قول بھی نادرست ثابت ہوتا ہے جو بعض حضرات نے اس سلسلہ میں پیش کیا ہے کہ یہاں ''العقوذ'' سے مراد وہ عہد و میثاق ہے جو اہل کتاب سے لیا جاتا تھا کہ وہ جو کچھ تورات و انجیل میں مذکور ہے اس پر عمل کریں۔

تو یہ وہ آراء و اقوال ہیں جن کی صحت و درستی کی کوئی دلیل ایسی موجود نہیں جو آیت کے الفاظ سے حاصل ہو سکے، اس کے علاوہ یہ کہ ''العقوذ'' جمع کا صیغہ ہے کہ جس پر الف ولام آیا ہے جو کہ بظاہر عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور ''العقوذ'' کا مطلق اور کسی قید و شرط کے بغیر ذکر کیا جانا مذکورہ آراء و اقوال سے مطابقت و موزونیت نہیں رکھتا کیونکہ جب یہ لفظ (عقد) مطلق ذکر ہو اور اس میں کوئی قید و شرط لفظوں میں مذکور نہ ہو تو اس سے ہر عقد سمجھا جاتا ہے، بنابرایں اس سے عمومیت کا حامل معنیٰ مراد لینا ہی قرین صحت ہے۔

''عقد'' کے معنی کی بابت ایک بحث

قرآنِ مجید میں جیسا کہ ''اوفوا بالعقوذ'' کے الفاظ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس بات کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقود کو پورا کرنے کا تاکیدی حکم صادر فرمایا ہے، اور یہ حکم عمومیت رکھتا ہے جو ہر اس عقد پر لاگو ہوتا ہے جسے عرفِ عام میں ''عقد'' سے موسوم کیا جاتا ہو کہ جو عملی وفا اور پورا کرنے کا متقاضی ہو، اور ''عقد'' ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جس میں عقد کا لغوی معنیٰ پایا جاتا ہو بلکہ وہ لغوی معنی کی عکاسی و ترجمانی کرے، اور عقد کا لغوی معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز سے اس طرح جوڑا اور ان کے درمیان اس طرح گرہ ڈالی جائے کہ وہ اس سے اس طرح پیوستہ ہو جائے کہ جدا نہ ہونے پائے مثلاً عقد البیع یعنی لین دین کا عقد جو کہ بیچی جانے والی چیز کا خریدار سے اس طرح ربط و مالکانہ تعلق و پیوستگی ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں اپنے ارادہ و مرضی کے ساتھ جو چاہے تصرف کرے اور اسے کام میں لائے اور اس عقد کے بعد بیچنے والے کا کوئی مالکانہ یا استعمال کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح عقد نکاح، کہ اس کے ذریعے عورت مرد کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہو جاتی ہے کہ مرد کو اس سے مناکحت و مباشرت کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور عورت اس عقد کے بعد اس مرد کے علاوہ کسی سے مباشرت و مناکحت نہیں کر سکتی، یہی حال اس عہد و پیمان کا ہے کہ جس میں عہد و معاہدہ کرنے والا شخص اس شخص کو اپنا اختیار دے دیتا ہے جس سے کسی چیز کا عہد و پیمان کرتا ہے اور اسے اس عہد کو توڑنے کا حق و اختیار باقی نہیں رہتا۔

قرآنِ مجید نے عقد و عہد کی اس کے تمام معانی کے ساتھ یعنی اس کا جو معنیٰ بھی کیا جائے وفاداری اور پورا کرنے کا

تا کیدی حکم دیا ہے اور اس فرمان کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اس میں عقد وعہد کی تمام صورتوں میں اسے پورا کرنے کی سخت ترین تاکید کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو عہد و میثاق کو توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور ایسے افراد کی نہایت سخت الفاظ میں سرزنش اور سزا کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس کے برعکس عہد و پیمان کو پورا کرنے والوں کی کثیر آیات مبارکہ میں مدح وستائش کی گئی کہ ان آیات کے یہاں ذکر کی ضرورت نہیں، اور آیات و روایات میں اس حوالہ سے جو مطالب ذکر کئے گئے اور جو انداز بیان اختیار کیا گیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد و پیمان کو پورا کرنا اور عہد شکنی نہ کرنا عقلی طور ایک فطری فیصلہ ہے، اور الحق کہ یہ ایسا ہی ہے، اور اس کی وجہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ عہد و پیمان اور اسے پورا کرنا ایسا عمل ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے کسی بھی سلسلہ میں اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا خواہ کوئی شخص ہو یا معاشرہ ہو، اور ہم جب انسان کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمیں جو آسائشیں وراحتیں حاصل ہوتی ہیں اور ہم اپنی معاشرتی زندگی میں ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اسی طرح جن عمومی وخصوصی حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے سکون واطمینان کے ساتھ اپنا سفر حیات طے کرتے ہیں ان سب کی بنیاد انہی اجتماعی معاہدات اور فرعی وضمنی عقود وعہود پر قائم و استوار ہوتی ہے جن کا ہماری اصل زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا ہم کسی عملی عقد ومعاہدہ کے بغیر نہ تو معاشرہ کے افراد کو کسی چیز کا مالک بنا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرف سے کسی چیز کے مالک بن سکتے ہیں خواہ ہم اس عقد وعہد کو زبان پر نہ بھی لائیں بلکہ صرف عملی طور پر اسے قائم کریں کیونکہ زبان پر لانے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب دوسروں کو اپنے عقد وعہد سے آگاہ کرنا مقصود ہو۔

ان مطالب سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عقد وعہد کی عملی پاسداری معاشرتی زندگی میں بنیادی ضرورت ہی نہیں بلکہ اصل واساس اور حقیقی روح ہے، لہٰذا اس کی بابت کسی طرح سے کوتاہی کرنا درست نہیں اور اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں کسی بھی وجہ سے عملی پاسداری نہ کرے اور کئے ہوئے عہد و پیمان اور عقد ومعاہدوں کو پورا نہ کرے خواہ اس کا ایسا کرنا اس کے طاقتور ہونے یا ریاستی واجتماعی قوت کے بل بوتے پر یا کسی خود ساختہ وخود بافتہ سبب کی بنیاد پر ہو ہر صورت میں اس سے معاشرتی عدل کو پامال کرنا اور اپنے ہی ہاتھوں معاشرتی انصاف کی دھجیاں بکھیرنے کے سوا کچھ نہیں کیونکہ معاشرتی عدل و انصاف ہی وہ واحد بنیاد ہے جس کے سہارے انسان ہر طرح کی استعماری طاقتوں کی اسارت اور ان کی ظالمانہ واستبدادی چالوں وحرکتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کی عملی پاسداری اور ان کی بابت وفاداری کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ واضح لفظوں میں ارشاد ہوا:

○ سورۂ اسریٰ، آیت: ۳۴

''وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا''

(اور تم عہد و پیمان کو پورا کرو کہ عہد ذمہ داری لاتا ہے اس کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی)

اس آیت مبارکہ میں ہر طرح کے عہد کو پورا کرنے کا حکم ملحوظ و مقصود ہے خواہ کوئی ایک شخص دوسرے شخص سے کرے خواہ کوئی قوم و قبیلہ اور ملت دوسری قوم و قبیلہ اور ملت سے کرے چنانچہ دیگر آیات مبارکہ میں بھی اسی موضوع کی تاکید وارد ہوئی ہے اور عہد و معاہدہ کو پورا کرنے پر مدح و ستائش اور اسے توڑنے اور اس کی عملی پاسداری نہ کرنے پر مذمت و سرزنش کی گئی ہے، بلکہ اگر اس سلسلہ میں بخوبی غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دین کی نظر میں فردی شخصی عہد و پیمان سے کہیں زیادہ اجتماعی و قومی معاہدوں کی پاسداری اہمیت کی حامل ہے کیونکہ دینی تعلیمات و دستورات میں معاشرتی عدل کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے اور اس کے توڑنے کو اجتماعی و عمومی مفاسد کا سبب قرار دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں عہد شکنی کو نہایت مذموم و پست ترین موارد میں شمار کرتے ہوئے اس کی ممانعت کے حوالے سے واضح و صریح الفاظ کے ساتھ اس طرح ارشاد ہوا:

○ سورۂ توبہ، آیت: ۱ تا ۵

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٣ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝٤ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٥

(برائت) کا اعلان کیا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں سے جن سے تم نے معاہدہ کیا (۱) پس تم اس دیار میں چار مہینے گھوم پھر لو، اور آگاہ رہو کہ تم اللہ کو عاجز و بے بس نہیں کر سکتے اور یہ (بھی جان لو) کہ اللہ کافروں کو ذلیل و رسوا کرنے والا ہے (۲) اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کھلا اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے برائت و لاتعلقی کرتا ہے اور اس کا رسول بھی ____ ان سے برائت کا اظہار و اعلان کرتا ہے ____، پس اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر روگردانی کرو تو آگاہ رہو کہ تم اللہ کو عاجز و بے بس نہیں کر سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب سے باخبر کر دو (۳) البتہ مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا، اس کے بعد اُنہوں نے تمہارے ساتھ کئے ہوئے عہد و معاہدہ میں سے کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی

تمہارے خلاف کسی کا ساتھ دیا تو تم ان کے ساتھ مقررہ وقت تک کئے ہوئے معاہدہ کو پورا کرو، یقیناً اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے، (۴) پھر جب احترام والے مہینے گزر جائیں ـــــ کہ جن میں تم نے ان سے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ تو پھر مشرکوں کو جہاں پاؤ ہلاک کر دو اور ان کو پکڑ لو اور انہیں گھیرے میں لے لو اور ہر مورچہ پر ان کو نظر میں رکھو، پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، یقیناً اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے (۵)

یہ آیات مبارکہ، جیسا کہ ان کے سیاق و اسلوب بیان سے ثابت ہوتا ہے فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں کہ جب اللہ نے مشرکوں کو نہایت ذلت و خواری سے دوچار کیا اور ان کی قوت و شوکت کو خاک میں ملا دیا، ان آیات میں مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ جس سرزمین پر ان کا تسلط قائم ہوا ہے اور وہ ان کے قبضہ و اختیار میں آ گئی ہے اسے شرک کی گندگی سے پاک کریں، اور کسی حیلہ و حجت کے بغیر مشرکوں کا قلع قمع کر دیں سوائے ان میں سے ان لوگوں کے، کہ جو ایمان لے آئیں، اس کے ساتھ ساتھ اس حکم میں مشرکین کے اُن افراد کو مستثنیٰ کیا گیا جن کے اور مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا ہے لہٰذا مسلمانوں کے لئے روا نہیں کہ وہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھائیں اور اُنہیں کسی بھی طرح سے اذیت و آزار کا نشانہ بنائیں حالانکہ وہ لوگ نہایت کمزور اور ذلیل و خوار اور بے بس ہو چکے تھے کہ ان کا کوئی یار و مددگار اور ان کی حفاظت و دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا، تو یہ استثنائی دستورات عہد و پیمان اور معاہدہ کی عملی پاسداری اور تقویٰ کے تقاضوں کی تکمیل کی بنیاد پر صادر ہوئے۔

ہاں، اللہ تعالیٰ نے عہد شکنی کرنے والے شخص کہ جو پختہ عہد کر کے اسے توڑ دے اس کے بارے میں یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ اس کے بعد اس کا عہد کالعدم ہو جائے گا اور اس کی کوئی شرعی حیثیت باقی نہ رہے گی اس کے ساتھ ساتھ اس پر زیادتی کرنا اسی حد تک کہ جس حد تک خود وہ زیادتی کرنے کا مرتکب ہوا ہے جائز و روا ہے، چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد ہوا:

O سورۂ توبہ، آیت: ۸ تا ۱۲

''كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝''

(مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد و معاہدہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ البتہ وہ لوگ کہ جن کے ساتھ

تم نے مسجد الحرام کے قریب بیٹھ کر معاہدہ کیا تو وہ جس حد تک تمہارے ساتھ اس معاہدہ کی پابندی کریں تم بھی اسی حد تک ان کے ساتھ چلتے رہو، یقیناً اللہ تقویٰ والوں کو دوست رکھتا ہے......وہ (مشرکین) کسی بھی مؤمن کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کی پرواہ نہیں کرتے اور وہ زیادتی کرنے والے ہی ہیں، پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم علم و آگاہی رکھنے والوں کے لئے آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، اور اگر وہ اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی و رخنہ اندازی کریں تو تم کفر کے رہبروں سے قتال کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار و حیثیت نہیں، ممکن ہے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں)۔

O سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۴

"فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ"

(پس جو شخص تمہارے ساتھ زیادتی کرے ــــــ تمہارے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کی حدود سے آگے بڑھ جائے، تجاوز کرے ــــــ تو تم بھی اس کے ساتھ اسی حد تک اسی طرح کا تجاوز کر سکتے ہو، اور تقوائے الٰہی اختیار کرو۔)

O سورۂ مائدہ، آیت: ۲

"وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَ تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ"

(اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں ان لوگوں کی دشمنی و زیادتی کہ جنہوں نے تمہیں مسجد الحرام سے روکا اس راہ پر لائے کہ تم ان پر زیادتی کرو، بلکہ تم نیکی و تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ و سرکشی پر ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو، اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام مطلقاً ہر شخص پر اپنے کئے ہوئے پختہ عہد و پیمان کے احترام اور اس پر عملی وفاداری و پاسداری کو لازم و واجب قرار دیتا ہے خواہ عہد و معاہدہ کرنے والے کو اس کا فائدہ حاصل ہو یا نقصان اُٹھانا پڑے کیونکہ اجتماعی عدل و انصاف کی پاسداری شخصی فوائد اور مخصوص مفادات کے تحفظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ لازم و واجب اور ضروری ہے، سوائے اس صورت کے کہ جہاں معاہدہ کرنے والے دو فریقوں میں سے ایک اپنے کئے ہوئے عہد کو توڑ دے تو دوسرے فریق کو حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی اپنے حصہ کے معاہدہ کو ختم کر دے اور اسی طرح اس سے سلوک کرے جس طرح اس نے کیا ہے بلکہ اسے یہ حق بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح دوسرے فریق نے زیادتی کی اسی حد تک اس جیسی زیادتی یعنی

معائدہ کی حدود سے تجاوز کرے کیونکہ کسی کے غیر عادلانہ واستعماری رویہ کے سدِّ باب کا طریقہ یہی ہے اور اس طرح کے غیر انسانی اعمال کی سخت ترین مذمت وارد ہوئی ہے کہ گویا دین کا قیام ہی ان کی بیخ کنی کے لئے ہوا ہے۔

مجھے اپنی زندگی کی قسم! عہد و پیمان کی وفاداری اور عہد شکنی سے اجتناب کرنا دین اسلام کی اعلیٰ ترین و بلند پایہ تعلیمات میں سے ایک ہے کہ جس کی بھرپور تاکید ہوئی ہے تا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی تکمیل اور عملی پاسداری کو یقینی بنانے کی راہ دکھائی جا سکے کہ جس کے نتیجہ میں معاشرتی عدل کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو کیونکہ اس کے بغیر انسانی معاشرہ کا وجود باقی رہ نہیں سکتا اور اس کی بقاء عدل کے قیام اور استحصالی نظام کے ظالمانہ اطوار کے خاتمہ پر موقوف ہے چنانچہ قرآنِ مجید نے اس کی بابت صراحت و وضاحت فرمائی ہے اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پاکیزہ سیرت میں اسے عملی صورت بخشی ہے، اگر ہماری بحث تفسیر کے دائرہ سے باہر ہوتی تو ہم ضرور ان واقعات کو ذکر کرتے جو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں رونما ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پاکیزہ زندگی میں وفائے عہد کی تابندہ مثالیں قائم و پیش کیں، قارئین کرام اس سلسلہ میں ان کتب کا مطالعہ کریں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور تاریخ حیات پر لکھی گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ جب وفائے عہد کی بابت اسلامی احکام و تعلیمات اور عملی دستورات کا دیگر متمدن و غیر متمدن اقوام کے طرزِ عمل اور اصول و ضوابط سے موازنہ کریں بالخصوص وہ مظاہر اور عملی نمونے جو ہر روز یہاں سننے کو ملتے ہیں اور ہم ان کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ طاقتور قومیں، کمزور قوموں کے ساتھ کئے گئے معاہدوں و معاملات میں صرف اپنے مخصوص مفادات اور اپنی حکومتوں و اقتدار کے تحفظ کو یقینی بنانے کو ملحوظ رکھتی ہیں اور معاہدوں کو توڑنے کی بیچار راہیں نکالتی ہیں، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی اور دیگر تعلیمات میں حق کی عملی پاسداری اور حقیقت کی خدمت گزاری کے حوالہ سے کس قدر فرق پایا جاتا ہے۔

ہاں، جو کچھ دین نے کہا وہ اسی کو زیبا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ دیگر قوموں نے کہا اور کیا وہ انہی کو زیبا ہے، کیونکہ دُنیا میں دو ہی نظریے و مکتب فکر ہیں: ایک نظریہ یہ ہے کہ ہر حال اور ہر قیمت پر حق کی حمایت و عملی پاسداری کی جائے خواہ اس کے لئے جو کچھ کرنا پڑے کیونکہ اسی میں معاشرتی بقاء و استحکام کا راز پوشیدہ ہے، دوسرا نظریہ و مؤقف یہ ہے کہ لوگوں کے مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جائے خواہ اس کے لئے جو کچھ کرنا پڑے اور حق و حقیقت کو پامال ہی کرنا پڑے، پہلا نظریہ و موقف دینی جبکہ دوسرا مؤقف و نظریہ غیر دینی معاشروں کا ہے خواہ غیر متمدن معاشرے ہوں یا متمدن ہونے کے دعویدار ہوں جیسے استعماری و آمریت نواز معاشرے اور ڈیموکریٹک و جمہوری یا کمیونیسٹ معاشرے وغیرہ۔

بہرحال آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلام نے وفائے عہد کی بابت اپنے دستورات میں اس کی کسی خاص قسم کو مشروط و ملحوظ قرار نہیں دیا بلکہ ہر عہد و معاہدہ کی پابندی اور اس کی عملی پاسداری کو یقینی بنانے کی بھرپور تاکید کی

ہے، اس سلسلۂ بحث کے دیگر پہلو بہت جلد آپ کو آئندہ ذکر کئے جانے والے مطالب میں معلوم ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

حلال کھانوں کے احکامات

○ ''اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ''

(تمہارے لئے حیوان چوپائے حلال کئے گئے ہیں سوائے اس کے، کہ جو آپ کو بتا دیئے گئے.......)

''اُحلت''، فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے جو بابِ افعال ''احلال'' سے مشتق ہوا ہے، اس کا معنٰی کسی چیز کو حلال و مباح کرنا ہے۔

لفظ ''بَھِیْمَۃُ'' کا معنٰی تفسیر مجمع البیان میں ہر صحرائی و دریائی چوپایہ کیا گیا ہے، بنابرایں لفظ ''بَھِیْمَۃُ'' کی ''انعام'' کی طرف اضافت نوع کی اپنی ایک صنف کی طرف اضافت کے باب سے ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں: نوع الانسان، جنس الحیوان۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں لفظ ''بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ'' سے مراد ''بھیمۃ جنین الانعام'' ہے، اس قول کی بناء پر یہاں اضافت لامیہ ہوگی یعنی اس پر حرف لام فرض و تصور کیا جائے گا۔

بہر حال جملہ ''اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ'' میں وہی آٹھ قسم کے حیوانات کے جوڑے مراد ہیں جن کا گوشت کھانا حلال کیا گیا ہے، اور جملہ ''اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' سے بعد میں آنے والے جملہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جس میں یوں ارشاد الٰہی ہے: ''حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللہِ بِہٖ'' (تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت، اور جو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر ذبح و قربان کیا جائے)۔

اور جملہ ''غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ'' جملہ ''اُحِلَّتْ لَکُمْ'' میں ضمیر خطاب (کم) سے جملہ حالیہ ہے لہٰذا اس بناء پر اس کا معنٰی یہ ہوگا کہ بہیمۃ الانعام یعنی چوپائے (چرنے والے مویشی) تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں سوائے ان کے کہ جو بعد میں آپ کو بتا دیئے جائیں گے اور یہ کہ جو حرام کئے گئے ہیں وہ اس حال میں کہ جب تم حالتِ احرام میں شکار کر رہے ہو، مثلاً جنگلی وحشی ہرن، گائے اور گدھا کا شکار کیا ہو____ تو اس صورت میں ان کا گوشت کھانا تمہارے لئے حلال نہیں____، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جملہ ''غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ'' جملہ ''اُحِلَّتْ لَکُمْ'' میں ضمیر مخاطب سے جملہ حالیہ نہیں بلکہ جملہ ''اَوْفُوْا'' یا جملہ ''یُتْلٰی عَلَیْکُمْ'' میں ضمیر مخاطب سے جملہ حالیہ ہے اور لفظ ''الصَّیْدِ'' مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے (یعنی جو کچھ شکار ہوا ہو)، جیسا کہ لفظ ''حرم'' حرف ح اور ر دونوں پر پیش کے ساتھ____ حرام سے جمع کا صیغہ ہے جبکہ مُحرِم____ ر کے نیچے زیر کے ساتھ____ اسمِ فاعل کا صیغہ ہے۔

سابقہ حکم کی تاکید مزید

○ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا''

(اے ایمان والو! شعائر اللہ کی بےحرمتی نہ کرو، اور نہ ہی احترام والے مہینہ کی، اور نہ قربانی کی، اور نہ گلے میں ڈالی گئی نشانیوں والی قربانیوں کی، اور نہ ان لوگوں کی جو بیت اللہ الحرام میں اپنے پروردگار کا فضل و کرم اور رضا وخوشنودی کے حصول کے لئے آچکے ہوں)۔

اس آیت میں ایک بار پھر سابقہ حکم کی تاکید مزید کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرمت والی چیزوں کی بابت کس قدر اہمیت ہے۔

''لَا تُحِلُّوْا'' کا مصدر ''اِحلال'' (بابِ افعال) ہے جس کا معنیٰ حلال ومباح قرار دینا ہے اس کا لازمی نتیجہ بےحرمتی وبے احترامی ہے، البتہ اس کا مخصوص معنیٰ اس چیز کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے جس کی طرف اس کی نسبت واضافت ہو، لہٰذا ''شعائر اللہ'' کو حلال ومباح قرار دینے کا مطلب ان کی حرمت کو پامال کرنا اوران کی نسبت بےاحترامی کرنا ہے، اور ''الشھر الحرام'' یعنی احترام والے مہینہ کو حلال ومباح قرار دینے کا مطلب اس میں جنگ کرنے کے حرام کئے جانے کے حکم کی پرواہ نہ کرنا ہے، اسی طرح دیگر امور کی بابت ان کی نسبت واضافت کوملحوظ رکھتے ہوئے ان کے معانی کا تعین ہوگا۔

''شعائر'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''شعیرہ'' ہے جس کا معنیٰ علامت ونشانی ہے، گویا یہاں حج کی علامات و نشانیاں اورمناسک واعمال مراد ہیں۔

''الشَّهْرَ الْحَرَامَ'' سے مراد وہ چار قمری مہینے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص احترام کا حامل قرار دیا ہے یعنی: محرم، رجب، ذی القعدہ اور ذی الحج، ان چار مہینوں میں جنگ وقتال کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔

''الھدی'' سے مراد وہ قربانی ہے جو حج کے لئے لائی جاتی ہے یعنی دنبہ وبکری، گائے واونٹ وغیرہ۔

''القلائد'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''قلادۃ'' ہے جس کا معنیٰ گردن بند، گلے کا ہار ___ ہے، یہاں اس سے مراد وہ چیز ہے جو اس کے قربانی ہونے کی نشانی کے طور پر اس کی گردن میں ڈالی جائے تاکہ اسے اسی کام کے لئے مختص رہنے دیا جائے اوراسے کسی دوسرے مقصد کیلئے استعمال کرنے کا اقدام نہ کیا جائے۔

''آمین'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''آم'' ہے جو کہ فعل ماضی ''اَمَّ'' سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کا معنیٰ قصد و ارادہ کرنا ہے، یہاں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ کی زیارت کا قصد وارادہ کرتے ہیں اور وہاں آتے ہیں۔

جملہ ''یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا'' (وہ فضل کے خواہاں ہوتے ہیں) ''آمّین'' کا جملہ حالیہ ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کا حال

یہ ہے کہ وہ اللہ کے گھر آ کر اس کے فضل کے طلبگار ہوتے ہیں، یا یہ کہ اس کا فضل حاصل کرنے کے لئے بیت اللہ آتے ہیں، ممکن ہے یہاں ''فضل'' سے مراد مال و دولت یا مالی فوائد ہوں چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیت ہے:

O سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۷۴

''فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ......''

(پس وہ پلٹ آئے اللہ کی نعمت اور فضل و عنایت کے ساتھ، انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی........)

اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی لفظ ''فضل'' ذکر ہوا ہے، اس سے مراد مال و دولت یا مالی فائدہ، یا اُخروی اجر یا دونوں ہیں۔

مفسرین کے درمیان آیت کے الفاظ کے معانی کی بابت اختلاف رائے پایا جاتا ہے چنانچہ ''شعائر''، ''قلائد'' اور دیگر الفاظ کے مختلف معانی کئے گئے ہیں، ان میں سے ہم نے جو معانی ذکر کئے ہیں وہی آیت کے سیاق سے مناسب تر ہیں لہٰذا ان کے علاوہ دیگر آراء و اقوال کے تفصیلی تذکرہ کی مزید ضرورت نہیں۔

شکار کی اجازت

O ''وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا''

(اور جب احرام اتار دو تو شکار کر سکتے ہو)

یہاں ''فَاصْطَادُوْا'' صیغۂ امر ہے جو کہ شکار کی ممنوعیت و حرام کئے جانے کے حکم کے بعد ذکر ہوا ہے اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ احرام کے بعد شکار کرنا ممنوع نہیں یعنی مباح و حلال ہے نہ یہ کہ واجب ہے، اس طرح کے جملہ کو علمی اصطلاح میں ''الامر بعد الحضر'' کہتے ہیں یعنی حرمت و ممنوعیت کے بعد حکم صادر کرنا ____ ، اور لفظ ''حلّ'' اور ''احلال'' دونوں کا معنیٰ یکساں ہے جبکہ پہلا لفظ (حلّ) ثلاثی مجرد اور دوسرا (احلال) ثلاثی مزید فیہ ہے لیکن دونوں کا معنیٰ احرام کی حالت سے باہر آ جانا ہے۔

زیادتی کرنے کی ممانعت

O ''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا''

(اور لوگوں کا تمہیں مسجد الحرام جانے سے روکنا ان پر زیادتی کرنے کا سبب نہ بنے)

عربی زبان میں جب ''جرمہ یجرمہ'' کہا جاتا ہے تو اس کا معنیٰ کسی کو کسی جرم کرنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے، اسی مناسبت سے معصیت و گناہ کو عربی زبان میں ''جریمۃ'' کہا جاتا ہے کیونکہ اسے انجام دینے والے پر اس کی سزا و عقاب کا بوجھ ڈالا جاتا ہے یعنی اس کی سزا کا بوجھ ڈالے جانے کی وجہ سے اسے اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور مالی وغیر مالی سزا کو بھی ''جریمہ'' کہتے ہیں کیونکہ اس کا بوجھ انجام دینے والے شخص پر ڈالا جاتا ہے۔

مشہور لغت دان راغب اصفہانیؒ نے ''جرم'' کا معنیٰ قطع کرنا لکھا ہے۔

لفظ ''شنآن'' کا معنیٰ عداوت و دشمنی ہے۔

جملہ ''اَنْ صَدُّوْكُمْ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اُنھوں نے تمھیں مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روک دیا ہے، یہ جملہ یا تو لفظ ''شنآن'' کا بدل ہے یا عطف بیان ہے۔

بہر حال آیت مبارکہ کا حاصل معنیٰ یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ دشمنانہ رویہ کہ اُنھوں نے تمھیں مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روک دیا ہے کہیں تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان پر غالب کر دیا ہے اور وہ تمہارے ہاتھوں میں آ گئے ہیں لہٰذا اب تم اُن پر زیادتی کرو۔

نیکی پر تعاون اور برائی پر عدم تعاون

○ ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''

(اور تم نیکی و تقویٰ پر ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ و معصیت پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

اس ارشاد گرامی کا معنی و مطلب واضح ہے اور یہ ایک اسلامی اصول کی بنیاد و اساس ہے، خداوند عالم نے قرآنِ مجید میں لفظ ''البر'' کی تفسیر عبادات و معاملات میں ایمان و احسان سے کی ہے۔

چنانچہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۷ میں ''وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ........'' میں اس کی بابت وضاحت ہو چکی ہے اور اس کے حوالہ سے مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

لفظ ''تقویٰ'' کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی عملی پاسداری کرنا ہے۔

بنا بر ایں نیکی و تقویٰ پر تعاون کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد تقوائے الٰہی کی بنیاد پر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ یکجا ہوں کہ اسی کو اجتماعی بہتری و اجتماعی تقویٰ کہتے ہیں۔ اس کے مقابل میں گناہ و معصیت پر تعاون ہے یعنی بُرے عمل کو اپنانا، کہ اس کا نتیجہ سعادتمند زندگی کے امور میں عدم پیشرفت بلکہ تنزلی ہی تنزلی ہے، اور عدوان پر تعاون کا نتیجہ بھی

یہی ہے کیونکہ عدوان کا معنی لوگوں کے مسلمہ حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے ان کی جانوں، عزت وناموس اور اموال پر ہاتھ ڈالنا ہے، اس موضوع سے مربوط بعض مطالب سورۂ آلِ عمران، آیت ۲۰۰ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا'' کی تفسیر میں ذکر کئے جا چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو المیزان جلد چہارم)

اثم (گناہ) اور عدوان (زیادتی) پر تعاون سے ممانعت کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت تاکید مزید کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ'' (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے) یہ جملہ گویا تاکید بر تاکید ہے۔

حرام کی گئی چار چیزوں کا بیان

○ ''حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ''

(تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور کہ جسے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے ____ دوسرے کے نام پر ____ ذبح کیا جائے)

اس آیۂ مبارکہ میں جن چار چیزوں کے حرام کئے جانے کا حکم مذکور ہے وہ اس سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے مثلاً سورۂ انعام اور سورۂ نحل جو کہ مکہ میں نازل ہونے والی سورتیں ہیں اور سورۂ بقرہ جو کہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی مفصل سورت ہے، آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۴۵

''قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ''

(کہہ دیجئے کہ جو کچھ مجھ پر وحی آئی ہے اس میں کوئی چیز کھانا کسی بھی کھانے والے شخص پر حرام نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سؤر کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے یا وہ جانور جسے غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، البتہ جو شخص مجبور و ناچار ہو کہ حکم الٰہی کی نافرمانی کرنے والا بھی نہ ہو اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ مقدار کھائے تو تیرا پروردگار معاف کر دینے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے)۔

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۳، سورۂ نحل، آیت: ۱۱۵

''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾''

(بے شک اللہ نے تم پر حرام کیا ہے مردار، خون، سؤر کا گوشت اور جو جانور اللہ کے علاوہ کسی کے لئے ذبح کیا جائے، مگر جو شخص مجبور و ناچار ہو کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی ضرورت کی حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ معاف کر دینے والا، نہایت مہربان ہے)

تمام مذکورہ آیات میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ان چاروں چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے جو زیر بحث آیت مبارکہ کی ابتداء میں مذکور ہیں، اور یہ آیت اپنے ذیلی جملہ کے حوالہ سے مذکورہ آیات کریمہ کے ذیلی جملہ سے مماثلت رکھتی ہے چنانچہ ان آیات کے ذیل میں یہ الفاظ مذکور ہیں:'' فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ '' اور اس آیت میں اس طرح ذکر ہوا: '' فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ '' (جو شخص کسی مشکل میں پھنس جائے کہ مجبور و ناچار ہو اور جان بوجھ کر گناہ نہ کرنے والا ہو تو یقیناً اللہ معاف کر دینے والا، نہایت مہربان ہے) بنا بر ایں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ مائدہ کی یہ آیت ان آیات میں مذکور مطالب میں مشترک ہونے کی بناء پر ان کی تاکید کے مقام میں ہے، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان چار چیزوں بالخصوص پہلی تین چیزوں یعنی مردار، خون اور سؤر کے گوشت کھانے کی ممنوعیت و حرمت کے حکم سورۂ انعام اور سورۂ نحل ـــــ جو کہ مکی سورتیں ہیں ـــــ کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوا کیونکہ سورۂ انعام کی آیت میں تین چیزوں یا بالخصوص سؤر کے گوشت کے حرام کئے جانے کی وجہ اس کا رجس و ناپاک ہونا ذکر کیا گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے پہلے رجس کو حرام قرار دیا گیا تھا، چنانچہ اس کی دلیل سورۂ مدثر کی آیت ۵ '' وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ '' (اور ناپاک کو چھوڑ دو) ہے اور یہ سورت اوائل بعثت میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے۔

اسی طرح ''منخقه'' (جو دم گھٹنے سے مر جائے)، ''موقوذة'' (چوٹ لگنے سے مرے)، ''متردية'' (اونچائی سے گر کر مر جائے)، ''نطيحة'' (کسی حیوان کے سینگ لگنے سے مر جائے) ''وما اكل السبع'' (جسے درندے نے کھایا ہو) یہ سب ''ميتة'' (مردار) کے مصادیق میں سے ہیں (ان سب کو ''مردار'' کہا جائے گا)، اس کا ثبوت جملہ ''الا ماذ كيتم'' ہے جو ان تمام حیوانوں کے ناموں کے بعد ذکر ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی زندہ حالت میں تمہارے ہاتھ آئے اور اسے ذبح کر لو تو تمہارے لئے حلال ہے، تو آیت مبارکہ میں ''میتہ'' یعنی مردار حیوانات میں سے بعض کے ناموں کا تذکرہ کر کے ایک طرح سے اصل موضوع اور اس سے مربوط حکم کی مخصوص انداز میں وضاحت مقصود تھی کہ اس طرح حرام کئے گئے بعض کھانوں کی بابت مزید بیان ہو جائے نہ یہ کہ کسی نئے حکم کی قانون گزاری کا اظہار مطلوب ہو، یہی حال دیگر اُن چیزوں کا ہے جو آیت میں حرام کی گئی اشیاء کی فہرست میں ذکر کی گئی ہیں یعنی: '' وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْأَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ '' (اور جو بتوں کے لئے ذبح کیا جائے اور جو مال تیروں کی نشانہ بازی کے

ذریعے کماؤ، وہ فسق ہے) تو یہ دو چیزیں اگرچہ قرآنِ مجید میں پہلی بار اسی سورۂ مبارکہ میں بیان کی گئی ہیں لیکن ان کی حرمت کی وجہ ــــــ یا بقولے ان میں سے آخری کی حرمت کی وجہ، فسق کو ذکر کیا گیا ہے جبکہ سورۂ انعام آیت ۱۴۵ میں ''فسق'' کی حرمت بیان ہو چکی ہے اور اسی طرح جملہ ''غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ'' میں آیت میں مذکور اشیاء کی حرمت کی وجہ ان کا ''اثم'' و گناہ ہونا ذکر ہوا ہے اور سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ میں ''اثم'' کی حرمت کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ اس کی بابت سورۂ انعام، آیت ۱۲۰: ''وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ'' (اور ظاہری و باطنی دونوں گناہوں کو چھوڑ دو) اور سورۂ اعراف، آیت ۳۳: ''قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ'' (کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی ہوں) میں واضح طور پر ان کی حرمت و ممنوعیت مذکور ہے۔

ان مطالب کے تناظر میں واضح و ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں جن حرام کردہ اشیاء کو ذکر کیا گیا ہے اس سے کسی نئے حکم کا بیان مقصود نہ تھا کیونکہ ان کی بابت سابقہ آیات میں جو کہ مکی و مدنی دونوں طرح کی سورتوں میں سے ہیں ان میں حرام کی گئی چیزوں اور حیوانات کے گوشت وغیرہ کی فہرست ذکر ہو چکی ہے۔

حرام کئے گئے حیوانات

○ ''وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ''

(اور جو دم گھٹنے سے مر جائے، چوٹ لگنے سے مر جائے، اُونچائی سے گرنے سے مر جائے، کسی حیوان کے سینگ لگنے سے مر جائے اور جسے درندے نے کھایا ہو)

''منخنققه'' اس حیوان کو کہتے ہیں جو دم گھٹنے سے مر جائے، خواہ اس کا دم گھٹنا اتفاقی طور پر ہو یا کسی کے جان بوجھ کر اس کا گلا گھونٹنے سے ہو، اور اس میں بھی کوئی فرق نہیں خواہ کسی آلہ وغیرہ کے ذریعے سے ہو جیسے رسّی، کہ جسے اس کی گردن میں سختی سے باندھ کر اس کے منہ پر اس طرح لگا دیا جائے کہ اس کا دم گھٹ جائے، یا اس کا سر دو لکڑیوں کے درمیان اس طرح قرار دیا جائے کہ اس کا گلا دب جائے اور وہ مر جائے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طریقۂ کار تھا۔

''موقوذة'' اس جانور کو کہتے ہیں جسے اس قدر مارا جائے کہ اس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔

''مُتردية'' اس جانور کو کہتے ہیں جو کسی اونچی جگہ مثلاً پہاڑ یا کنویں کے سرے وغیرہ سے گر کر مر جائے۔

''نطيحة'' اس جانور کو کہا جاتا ہے جسے کسی دوسرے جانور نے اپنے سینگ مار کر ہلاک کر دیا ہو۔

''وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ'' اس سے مراد وہ جانور ہے جسے کسی دوسرے جانور (درندہ) نے کھایا ہو یعنی اس کا گوشت کھایا ہو، ''اكل''، یعنی کھانا اس چیز سے مربوط ہے جسے کھایا گیا ہو یا کھایا جائے (ماکول) تو اس میں فرق نہیں کہ سارے

کا سارا کھایا ہو کہ کچھ بھی باقی نہ بچا ہو یا کچھ حصہ کھایا ہو۔

''السبع'' وحشی درندہ جانور کو کہتے ہیں مثلاً شیر، بھیڑیا، ریچھ وغیرہ۔

اور جملہ میں ''اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ'' مذکورہ حیوانات سے قابل تذکیہ جانوروں کو مستثنیٰ قرار دیئے جانے کا بیان ہے، دینی اصطلاح میں ''تذکیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گردن کی چار رگیں کاٹی جائیں بشرطیکہ ابھی وہ زندہ ہو (گردن کی چار رگوں سے مراد دو خون والی رگیں، ایک غذا والی نالی اور ایک سانس لینے والی نالی ہے)، اس کا ابھی زندہ ہونا اس وقت ثابت ہوگا جب اس کی گردن کی رگیں کاٹی جا رہی ہوں تو وہ حرکت کرے مثلاً دُم ہلائے یا منہ سے سانس لینے کی آواز نکالے وغیرہ۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ یہ استثنائی حکم کہ جو تذکیہ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق مذکورہ تمام حیوانات سے ہے لہٰذا اسے صرف مؤخر الذکر حیوان یعنی نطیحہ سے خاص قرار دینا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اور یہ پانچوں حیوانات کہ جن کا ذکر ہوا ہے یعنی ''منخنقه''، ''موقوذه''، ''متردیه''، ''نطیحه'' اور ''مَآ اَکَلَ السَّبُعُ'' سبھی ''میته'' (مردار) کے مختلف افراد و مصادیق ہیں اور وہ اس طرح کہ ''متردیه'' (جو حیوان کسی بلندی سے گر کر مر گیا ہو) اور ''نطیحه'' (وہ حیوان کہ جسے کسی دوسرے حیوان نے سینگ مار کر موت کے گھاٹ اُتار دیا ہو) یہ دونوں اس وقت حرام ہوں گے جب ان کی موت اسی سبب سے واقع ہو جو ذکر ہوا ہے یعنی ''متردیه'' کی کسی بلندی سے گرنے اور ''نطیحه'' کی کسی حیوان کے سینگ مارنے سے! چنانچہ ان کی حلیت کا ثبوت جملہ ''اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ'' ہے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حرام ہونا ان کے مرجانے کے بعد ہے کیونکہ یہ مطلب واضح ہے اور اس کے لئے کسی وضاحت و دلیل اور بیان و تفصیل کی ضرورت نہیں کہ جب تک کوئی حیوان زندہ ہو یعنی اس میں روح باقی ہو اس سے اس کا گوشت کھانا حرام ہے بلکہ اسے روح نکلنے کے بعد ہی کھایا جاتا ہے، جہاں تک روح نکلنے کا تعلق ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تذکیہ کے ساتھ! دوسری اس کے بغیر، اللہ تعالیٰ نے پہلی صورت یعنی تذکیہ کے ذریعے روح نکلنے کے بعد اسے حُرمت کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، بنابرایں وہ دونوں یعنی ''متردیه'' اور ''نطیحه'' اگر تذکیہ کے بغیر مرجائیں تو ان کا گوشت حرام ہوگا، یعنی ان کے گوشت کی حُرمت ان کے تذکیہ نہ ہونے میں منحصر ہوگی، لیکن اگر کوئی بکری ____ مثلاً ____ کنویں میں گر جائے پھر اُسے صحیح و سالم اور زندہ حالت میں نکال لیا جائے اور باہر آکر کچھ دیر یا زیادہ، زندہ بھی رہے اور اس کے بعد طبعی موت سے مرجائے یا ذبح کر کے اس کا تذکیہ ہو جائے تو اسے ''متردیه'' نہیں کہا جائے گا چنانچہ اس کی دلیل سیاقِ کلام ہے کیونکہ آیت میں جن حیوانات کی حُرمت مذکور ہے وہ صرف وہی ہیں جو اسی سبب سے مرجائیں جس کا ذکر ان کی طرف نسبت سے ہوا ہے مثلاً ''منخنقه'' میں انخناق یعنی دم گھٹنے ''موقوذه'' میں وقذ یعنی مار مار کر مارے جانے، ''متردیه'' میں تردّی یعنی کسی حیوان کے سینگ مارنے سے موت واقع ہوئی ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: ''میتة''یعنی مردار کے لاتعداد مصادیق میں سے صرف پانچ حیوانات کا ذکر آیت میں ہوا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خاص طور پر ان پانچ حیوانات کے نام اس لئے لئے گئے ہیں کہ اس طرح مرنے والے جانوروں کے بارے میں یہ گمان پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید وہ ''میتة'' کے مصادیق نہیں اور ان پر ''مردار'' کا عمومی حکم لاگو نہیں ہوتا، لہٰذا اس ممکنہ توہم کو دور کرنے کے لئے ان کا ذکر خاص طور پر ہوا کیونکہ اس طرح یعنی ان اسباب کے ذریعے مرنے والے حیوانات بہت کم ہوتے ہیں اس لئے عام طور پر میتہ کا لفظ سن کر طبعی موت مرنے والے اور بیماری وغیرہ سے مرنے والے جانور مراد لئے جاتے ہیں یعنی وہ جانور جو عام اسباب کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے ہلاک نہ ہوئے ہوں، بنابر ایں اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کے نام ذکر کئے تا کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو اور حرمت کا حکم بھی واضح ہوجائے اگر چہ ایسے جانور نادر، اور بہت کم ہوتے ہیں جو اس طرح کے اسباب سے مریں۔

بتوں کے لئے ذبح کئے جانے والے حیوانات

○ ''وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ''

(اور وہ جانور جسے بتوں کے روبرو ذبح کیا جائے)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے: نصب الشیٔ یعنی کسی چیز کو نصب کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اسے کسی ایسی بلند جگہ پر قرار دیا جائے کہ واضح و نمایاں ہو، مثلاً زمین میں نیزہ گاڑنا، بلند عمارت بنانا، زمین پر پتھر لگانا، نصیب اس پتھر کو کہتے ہیں جسے کسی چیز پر نصب کیا جائے کہ اس کی جمع کا صیغہ ''نصائب'' اور ''نُصب'' ہے، زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی رسم تھی کہ وہ کسی پتھر کو کہیں نصب کر کے اس کی پوجا کرتے تھے اور اس کے سامنے جانوروں کو ذبح کرتے تھے۔

چنانچہ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں ہوا ہے: ''كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ'' (المعارج، ۴۳) گویا کہ وہ بتوں کی طرف دوڑے جاتے ہیں، اور ارشاد ہوا: ''وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' (اور جو جانور بتوں پر ذبح کئے جائیں)، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کی جمع ''انصاب'' ہے، چنانچہ ارشاد ہوا: ''والانصاب والازلام'' اور لفظ ''نصب'' اور ''نَصب'' دونوں کا معنیٰ تعصب و مشقت ہے (المفردات، صفحہ ۴۹۴)

بتوں پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کا گوشت کھانے کی ممانعت اس لئے ہوئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی اس

فرسودہ رسم کو ختم کیا جائے کیونکہ عربوں کے ہاں عام عادات رائج تھی کہ وہ کعبہ کے اردگرد پتھروں کو نصب کردیتے تھے اور ان کی تقدیس کے عقیدہ کے ساتھ ان کے سامنے ادائے احترام کرتے اور انہی پتھروں پر اپنے جانور ذبح کرتے تھے جو کہ بت پرستوں کا طرزِ عمل تھا۔

جوئے کے تیروں کا حکم

○ "وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ"

(اور جو تم جوئے کے تیروں کے ذریعے حاصل کرو)۔

لفظ "ازلام" کا معنی فال نکالنے کے تیر یا جوئے کے تیر ہیں، آیت مبارکہ میں جوئے کے تیروں کے ذریعے اپنے حصے نکالنے کا طریقہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا اور وہ اس طرح کہ اونٹ یا کوئی دوسرا جانور لے کر اسے ذبح کرتے اور پھر اس کے متعدد حصے کرتے تھے، اس کے بعد حصوں کی تقسیم اور حصہ پانے اور نہ پانے والوں کی تشخیص کے لیے تیروں کے ذریعہ قرعہ اندازی کرتے تھے کہ جسے "میسر" یعنی جوا کہا جاتا ہے، چنانچہ اس کی بابت سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ "یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ......" (آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں......) کی تفسیر میں مربوط مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں (ملاحظہ ہو: المیزان جلد دوم، صفحہ ۳۸۳)

لفظ "قسم" کے بارے میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ اس کا معنٰی حصہ کو الگ کرنا ہے چنانچہ اس کی بابت یوں کہا جاتا ہے: "قسمت کذا قسماً وقسمةً" (میں نے اس طرح حصے کر دیئے اور تقسیم کر دیا) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے ہر حصہ کو دوسرے حصہ سے الگ کر دیا، یہی معنٰی میراث اور مال غنیمت کے حصے تقسیم کرنے کا ہے کہ ہر حقدار کا حصہ الگ کر دیا گیا، یہ لفظ قرآن مجید میں اس طرح استعمال ہوا ہے: "لِکُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ" (ہر دروازہ سے ان کا حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے) اور "وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ" (اور انہیں بتا دیجئے کہ ان کے درمیان پانی تقسیم شدہ ہے) القمر ۲۸، اور "وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ" (بقرہ: ۲۱۹) (ملاحظہ ہو: المفردات، صفحہ ۴۰۳)

البتہ "استقسام" کا معنٰی "قسم" (تقسیم کرنا) دراصل اس کے مصداق کی تطبیق کے باب سے ہے یعنی مقصود یہ ہے کہ اس کا اور اُس کا یعنی دونوں کا مصداق ایک ہے، جبکہ حقیقت میں استقسام کا معنٰی تقسیم کرنے کو طلب کرنا ہے اور آیت میں اس سے مُراد ان تیروں کے ذریعے حصے تقسیم کرنے کو طلب کرنا ہے کہ اسی مقصد کے لئے مخصوص تھے، بنابرایں آلہ یعنی تیروں کا استعمال درحقیقت ان کے ذریعے اصل کام کے حصول کو طلب کرنا ہے، اس معنٰی کی بنیاد پر اس سے مراد استفعال ہوگا یعنی

طلب فعل، لہٰذا استقسام بالازلام کہ جس کی ممانعت ہوئی ہے اس سے مراد یہ ہوگا ــــــ جیسا کہ ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے، کہ اونٹ یا کسی دوسرے حیوان کے جسم پر تیر مارا جائے اور وہ اسے جس جگہ لگے وہ حصہ تیر مارنے والے کا ہوگا۔

ایک قول اور اس کا جواب

''استقسام بالازلام'' (تیروں کے ذریعے تقسیم بندی) کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تیروں کے ذریعے افعال میں خیر وشر سے آگاہی حاصل کرنا اور کسی بھی کام کا فائدہ مند یا نقصان دہ ہونا معلوم کرنا ہے مثلاً جو شخص سفر پر جانا چاہے یا شادی کرنا چاہے یا کوئی نیا کام کرنا چاہے تو وہ ان کے ذریعے اپنے متعلقہ اُمور میں بہتری ہونے یا نہ ہونے کی تشخیص کرتا تھا، یہ رسم زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے درمیان عام تھی اور یہ ایک طرح کا فال نکالنا ہے، اس کی مزید وضاحت ''روایات پر ایک نظر'' میں پیش ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قول قرین صحت نہیں کیونکہ آیت کا سیاق اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس طرح الفاظ سے یہ معنٰی مُراد لینا صحیح قرار نہیں پاتا اور وہ اس طرح کہ آیت میں چند کھانوں کی حرمت کا حکم مذکور ہے اور اس سے پہلے جملہ ''اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ'' کے ذیل میں اس کی بابت اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دس حرام کی گئی چیزیں بیان ہوئیں: (۱) میتہ (مُردار) (۲) خون، (۳) خنزیر کا گوشت (۴) غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جانے والا جانور (۵) دم گھٹنے یعنی گلا دبنے سے مرنے والا جانور (۶) مار مار کر مارے جانے والا جانور (۷) بلند جگہ سے گر کر مر جانے والا جانور (۸) کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے ہلاک ہونے والا جانور (۸) درندے کے کاٹنے سے مر جانے والا جانور (۱۰) بتوں کے ناموں پر ذبح کئے جانے والا جانور۔ ان جانوروں کا تذکرہ کرنے کے بعد ''استقسام بالازلام'' ذکر ہوا کہ جس کے دو معنے ہیں: قمار یعنی جوئے کے ذریعے جانور کے گوشت کو تقسیم کرنا اور فال نکال کر کسی کام کا اچھا و برا معلوم کرنا، تو اس صورت حال میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح کے واضح سیاق الکلام اور پے در پے قرائن کے باوجود اس سے مقصود معنی کی بابت اس شک کی گنجائش ہو کہ اس میں جوئے کے تیروں کے ذریعے گوشت کی تقسیم مراد نہیں؟ کیا اس حوالہ سے کوئی اہل علم و دانش اور کلام کی باریکیوں سے آگاہ شخص کسی طرح سے شک وشبہ کا شکار ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال لفظ ''عمرہ'' سے دی جا سکتی ہے کہ جس کا ایک معنٰی عمارہ یعنی آبادی، آباد کرنا ہے اور دوسرا معنٰی خانۂ خدا کی زیارت کو جانا ہے۔ چنانچہ جب اس کی اضافت ''بیت اللہ'' کی طرف ہو تو لغوی حوالہ سے دونوں معنے درست قرار پاتے ہیں لیکن جب یوں کہا جائے: ''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ'' (اور تم حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو) سورۂ بقرہ آیت ۱۱۹ ــــــ تو اس سے پہلے معنی کا مراد و مقصود ہونا تصور میں نہیں آتا، بہر حال اس طرح کے الفاظ کی مثالیں کثرت سے پائی

جاتی ہیں۔

جملہ ''ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ''میں ایک احتمال یہ ہے کہ اس میں ضمیر ''ذٰلِكُمْ '' کا اشارہ مذکورہ تمام امور واشیاء کی طرف ہو اور استعمال کا اشارہ مذکورہ تمام امور واشیاء کی طرف ہو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا اشارہ آخری دو چیزوں کی طرف ہو کیونکہ ان دو اور دیگر اشیاء کے درمیان فاصلہ ہے، اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ سب سے آخری چیز کی طرف اشارہ ہو، البتہ ان تینوں احتمالات میں درمیانی احتمال زیادہ بہتر اور قرین قیاس لگتا ہے۔

کفار کی مایوسی اور تکمیل دین کا بیان

○ ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ''

(آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو بلکہ میری خشیت اختیار کرو)

اس آیت مبارکہ کا اس مقام پر واقع ہونا اور پھر اس کی دلالت دونوں عجیب ہیں، کیونکہ آپ جب آیت کے ابتدائی جملوں پر غور کریں یعنی: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ...... تا......ذٰلِكُمْ فِسْقٌ '' اور اس کے ساتھ ذیلی جملہ یعنی: ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ '' کا اضافہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک مکمل کلام ہے کہ جس سے مرادی معنٰی سے آگاہی کا حصول بعد والے جملہ یعنی ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ......الخ'' پر موقوف نہیں، اسی سے آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے کہ یہ ایک مکمل آیت ہے کہ جو ان آیات سے مماثلت رکھتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں کہ جن کا تذکرہ سورۂ انعام، سورۂ نحل، سورۂ بقرہ میں ہوا ہے اور ان میں حرام کئے گئے کھانوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ میں اس طرح مذکور ہے: ''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ '' (یقیناً تم پر حرام کیا گیا مردار کو، خون کو، سوٴر کے گوشت کو، اور اسے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، مگر جو شخص مجبور و بے بس ہو جائے کہ حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی زیادتی کا مرتکب ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے) اسی کی مانند سورۂ انعام اور سورۂ نحل کی آیات میں مذکور ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جملہ ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا.........الخ'' جملہ معترضہ ہے، کہ جو آیت مبارکہ کے درمیان میں ذکر ہوا ہے اور آیت کے الفاظ اپنی دلالت اور مطلوبہ معانی کی وضاحت کی بابت اس جملہ پر موقوف نہیں خواہ ہم یہ کہیں کہ یہ جملہ ابتدائے نزول ہی سے اسی جگہ تھا یا یہ کہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد میں کا تبانِ وحی کو حکم

دیا کہ اس جملہ کو اس جگہ قرار دیں جبکہ دونوں آیتیں نزولی حوالہ سے ایک دوسری سے مختلف اور جدا جدا ہیں۔

یا یہ کہیں کہ اسے یہاں قرار دینے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے آیات کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری سنبھالی اور انہوں نے اس حوالہ سے نزولی ترتیب کو ملحوظ قرار نہیں دیا، ان تینوں احتمالات میں سے کوئی بھی مذکورہ بالا نتیجہ کی نفی میں مؤثر نہیں ہوسکتا یعنی یہ کہ یہ جملہ معترضہ ہے کہ جب اس کا موازنہ آیت کے ابتدائی جملوں اور آخری جملوں سے کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جملہ کا ان سے کیا ربط ہے؟ چنانچہ ہمارے بیان کی تائید و تصدیق ان اکثر روایات ــــ اگر تمام روایات سے نہ بھی کہیں ــــ سے ہوتی ہے جو اس آیۂ مبارکہ (اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ....) کے شان نزول کی بابت نازل ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے اور شان نزول کی روایات میں اصل آیت کہ جس کی ابتداء جملہ ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ.... '' سے ہوئی کا حوالہ مذکور و ملحوظ نہیں، اسی سے اس مطلب کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ اس جملہ کا ربط نہ تو اصل آیت کی ابتداء سے ہے اور نہ ہی ذیلی الفاظ سے ہے، لہٰذا اس جملہ کا آیت کے وسط میں قرار پانا دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا، یا یہ کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے یہاں قرار دیا اور آیت کی ترتیب میں اسے یہاں ذکر فرمایا، یا یہ کہ بعد میں آیات کی تالیف و ترتیب کرنے والوں نے ایسا کیا، چنانچہ اس کی تصدیق و تائید تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور عبد بن حمید کے حوالہ سے شعبی کی روایت سے ہوتی ہے کہ اُنہوں نے کہا: یہ آیت ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ عرفہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن آیات کے بارے میں یہ اچھا لگتا کہ انہیں ابتدائے سورت میں قرار دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کر دیتے تھے (شعبی نے کہا:) حضرت جبریلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آیات کے بارے میں بتاتے تھے کہ کون سی آیت کہاں قرار دیں۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۲۵۸)

ان تمام تائیدی حوالوں کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ دونوں جملے یعنی ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ'' اور ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' مضمون و مطلب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہیں اور ان دونوں کے درمیان مفہومی ارتباط بھی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کیونکہ کفار کے مسلمانوں کے دین سے ناامید ہونے اور مسلمانوں کے دین کے مکمل ہونے کے درمیان گہرا تعلق و ربط پایا جاتا ہے اور دونوں جملوں کے مندرجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے مجموعہ مرکب ہونے کے حوالہ سے ان کا ایک ہی مضمون و مطلب پر مشتمل ہونا بھی قابل تصور ہے کہ دونوں کے اجزاء ایک دوسرے سے وابستہ اور دونوں کے معانی و مفاہیم ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، اس کے ساتھ ساتھ دونوں جملوں میں سیاق کے حوالہ سے بھی وحدت و یگانگی پائی جاتی ہے، چنانچہ اس بات کی تائید و تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ متقدمین و متاخرین مفسرین کہ جن میں صحابہ و تابعین اور آج تک آنے والے مفسرین کرام نے دونوں جملوں کو ایک دوسرے سے متصل

ومربوط اور ایک دوسرے کے تکمیلی جملے قرار دیا ہے کہ ان کے بعض حصے دوسرے بعض کا مقصود پورا کرتے ہیں، اور ان حضرات کا اس طرح قرار دینا ان دونوں جملوں سے اسی مطلب کے سمجھے جانے کی بناء پر ہے اور انہوں نے ان دونوں جملوں کے یکجا نازل ہونے پر اتفاق کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ یہ آیت کہ جو جملہ معترضہ ہے یعنی ''اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ..... تا....... وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' ایک ہی جملہ و بیان ہے کہ جس کے بعض حصے دوسرے بعض سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ مجموعی طور پر سب ایک ہی غرض وغایت پر مشتمل ہیں جو کہ دونوں جملوں میں ایک جامع حیثیت رکھتی ہے خواہ ہم اس غرض وغایت کے اصل آیت کہ جس کی ابتداء ''حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ'' سے ہوتی ہے سے ارتباط کے قائل ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کلام مجموعی طور پر ایک ہی غرض کا حامل ہو دو یا اس سے زیادہ اغراض رکھتا ہو، اور یہاں آیۂ مبارکہ میں لفظ ''یوم'' دو بار استعمال ہوا ہے: ''اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اور اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ'' ان دونوں جملوں میں ''یوم'' سے مراد ایک ہی یوم یعنی دن ہے کہ جس میں کفار کو مایوسی ہوئی اور اس میں دین کی تکمیل ہوئی۔

''یوم'' سے کونسا دن مُراد ہے؟

اب بحث یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ ''اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ'' میں ''یوم'' سے کون سا دن مراد ہے؟ آیا اس سے اسلام کے ظہور پذیر ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا دن مراد ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ اس بناء پر آیت سے مُراد یہ ہوگا کہ اللہ نے تم پر اسلام نازل کیا اور تمہارے لئے دین کو مکمل کیا اور تم پر نعمت کو پورا کر دیا کہ جس نے کفار کو اس سے مایوس کیا کہ وہ تمہیں اپنے باطل عقیدہ پر اپنے ساتھ ملا سکیں؟ لیکن اس سے وہ دن یا وہ زمانہ مراد لینا اس لئے قرین صحت نہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگوں کے پاس دین آچکا تھا اور کفار یہ چاہتے تھے کہ اس دین کو مٹا دیں اور اس کا راستہ پورے طور پر روک دیں یا کم از کم اُس میں تغیر و تبدل کر دیں کہ اس کی اصل صورت سامنے نہ آسکے، اس صورتحال میں مسلمانوں کو اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کہیں کفار اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو جائیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کافروں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور اُنہیں مایوسی کا شکار ہونا پڑا اور مسلمانوں کو اطمینان حاصل ہوا کہ اب اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں، چونکہ اسلام ابھی مکمل نہ ہوا تھا بلکہ اس میں کمی پائی جاتی تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُسے مکمل کر دیا اور مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کر دی، اس سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام سے پہلے مسلمانوں کے پاس کوئی دین ہی نہ تھا کہ جس کی بابت کفار کسی طرح کے غلط ارادے کی تکمیل کر سکتے یا اللہ اسے مکمل کرتا اور اس دین والوں پر اپنی نعمت تمام

کرنے کا اعلان کرتا، بنابراین اگر مذکورہ معنی کو درست قرار دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ'' کو ''اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' سے پہلے ذکر کیا جاتا تا کہ مقصودہ مطلب کی ترتیب وترکیب درست قرار پائے۔

دوسرا قول: ''اَلْیَوْمَ'' کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مُراد فتح مکہ کا دن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قریش کے مشرکین کی چالیس وسازشیں ناکام بنادیں اور اُن کے رعب و دبدبہ اور نام نہاد شان وشوکت کو مٹادیا، چنانچہ اس دن اللہ نے ان کے دین کی بنیادیں ہی منہدم کر دیں اور ان کے بت پاش پاش کر دیئے کہ جس کے بعد ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ اسلام کے مقابلے میں ٹھہرنے کے قابل ہی نہ رہے اور نہ ہی اُنہیں اسلام کے روز افزوں استحکام و پھیلاؤ کا راستہ رکنے کی ہمت باقی رہی۔

لیکن یہ قول بھی قرین صحت نہیں کیونکہ یہ آیت مبارکہ دین کے مکمل ہونے اور نعمت الٰہی کے تمام ہونے پر دلالت کرتی ہے جبکہ فتح مکہ کے وقت دین کی تکمیل نہیں ہوتی تھی کیونکہ فتح مکہ کا واقعہ آٹھ ہجری کو ہوا اور اس کے بعد متعدد دینی احکام نازل ہوئے اور اس وقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت تک کے دورانیہ میں کئی شرعی فرامین صادر ہوئے کہ جن میں کچھ حلال اور کچھ حرام امور سے مربوط تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ جملہ ''اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ'' (آج کے دن کافر مایوس ہو گئے تمہارے دین سے) میں کافروں سے مراد تمام عرب مشرکین ہیں جبکہ وہ سب کے سب مسلمانوں کے دین سے مایوس نہ ہوئے تھے، چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی ان کے وہ اکثر معاہدے اور عہد و پیمان اپنی اعتباری واحترامی حیثیت کے حامل رہے کہ وہ ایک دوسرے سے دست وگریباں نہ ہوں گے اور وہ لوگ اپنی مشرکانہ روش وطریقۂ کار کے مطابق زمانۂ جاہلیت والا حج بھی ادا کرتے تھے اور اُن کی عورتیں عریاں ومکمل طور پر لباس کے بغیر حج ادا کرتی تھیں کہ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولا علیؑ کو سورۂ برائت کی آیات دے کر بھیجا اور اُنہوں نے اُن کی باقیماندہ جاہلانہ رسومات کو باطل قرار دے کر ختم کر دیا۔

تیسرا قول: آیت میں ''اَلْیَوْمَ'' سے مُراد سورۂ برائت کے بعد والا زمانہ ہے کہ جب اسلام جزیرۂ عرب میں تقریباً پھیل چکا تھا اور شرک وجاہلیت کی رسومات وطرزِ زندگی کے آثار مٹ چکے تھے، یہاں تک کہ دینی اجتماعات ومناسک حج میں کوئی مشرک دکھائی نہیں دیتا تھا، اور تمام صورتحال آشکار ہوگئی اور اللہ نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف نکال کر اس کی جگہ امن وسکون قرار دے دیا تھا کہ وہ کھل کر اللہ کی عبادت بجالاتے تھے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں قرار دیتے تھے۔

لیکن یہ قول بھی درست نہیں کیونکہ یہ بات تو درست ہے کہ سورۂ برائت کی آیات نازل ہونے کے بعد مشرکین، مسلمانوں کے دین سے نااُمید ہو گئے تھے اور جزیرۃ العرب میں شرک کی بساط لپٹ گئی تھی اور زمانہ جاہلیت کی رسومات کے

نشانات مٹ گئے تھے لیکن اس سب کچھ کے باوجود ابھی دین مکمل نہیں ہوا تھا چنانچہ اس کے بعد بھی فرائض واحکام نازل ہونے کا سلسلہ جاری تھا کہ جس کا ثبوت اسی سورۂ برائت میں مذکورہ احکام ہیں جو بعد میں نازل ہوئے، اور تمام مکاتب فکر کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت عہد نبویؐ کے اواخر میں نازل ہوئی اور اس میں حلال وحرام اور حدود وقصاص کے کثیر احکام مذکور ہیں اس بنا پر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ مذکورہ بالا احتمال قرین صحت نہیں اور یہ نظریہ درست نہیں قرار دیا جاسکتا کہ آیت میں ''اَلْيَوْمَ'' سے اس کا وسیع معنیٰ مُراد ہے کہ جسے آیت کے معنیٰ ومفہوم سے موزونیت کا حامل قرار دیا جاسکے مثلاً دعوتِ اسلامیہ کے ظہور کا ابتدائی دور یا فتح مکہ کے بعد کا زمانہ، یا برائت کی آیات کے نزول کے بعد کا زمانہ، تو ان میں سے کسی بھی زمانہ کا مُراد لینا قرین صحت نہیں، البتہ یہ بات قرین صحت قرار دی جاسکتی ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ ''اَلْيَوْمَ'' سے مُراد آیت کے ہی نزول کا دن ہے جو کہ سورت کے نزول کا دور ہے بشرطیکہ جملہ ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کو جملہ معترضہ قرار دے کر اسے آیت کے ساتھ معنوی ارتباط کا حامل قرار دیا جائے، یا اس سے مُراد سورۂ مائدہ کے بعد کا زمانہ ہو جو عہد نبویؐ کے اواخر کا دور ہے اور وہ اس لئے کہ اس میں ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' کا جملہ مذکور ہے جو آنحضرتؐ کے آخری ایام میں نازل ہونے والی آیت ہے۔

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہاں ''اَلْيَوْمَ'' سے مراد بعینہ فتح مکہ والا دن ہے؟ یا بعینہ برائت کی آیات نازل ہونے والا دن ہے؟ ان دونوں احتمالات کا نادرست ہونا سابق الذکر دوسرے اور تیسرے احتمالات پر وارد ہونے والے اشکالات ہی کے تناظر میں واضح ہوجاتا ہے۔

چوتھا قول: ''اَلْيَوْمَ'' سے مُراد حجۃ الوداع کا یوم عرفہ ہے، جیسا کہ متعدد مفسرین نے لکھا ہے اور اس کی بابت بعض روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔

لیکن یہ قول بھی قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر یہ بات درست ہو کہ ''اَلْيَوْمَ'' سے حجۃ الوداع کا دن مُراد ہو تو کافروں کی مسلمانوں کے دین سے مایوسی سے کیا مُراد ہوگی؟ اگر دین سے مایوسی سے مُراد یہ ہو کہ مشرکین قریش مسلمانوں کے دین پر غلبہ پانے سے مایوس ہوئے، تو یہ کام تو ۸ ہجری کو فتح مکہ کے دن ہوچکا تھا اس کا ۱۰ ہجری یوم عرفہ سے کیا تعلق؟، اور اگر مُراد یہ ہو کہ اس سے مُراد مشرکین عرب کا مایوس ہونا ہے، تو یہ کام ۹ ہجری کو برائت کی آیات کے نزول کے وقت ہوچکا تھا، اور اگر اس سے مُراد یہ ہو کہ اس سے تمام کفار کی مایوسی مقصود ہے کہ جس میں یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ سب شامل ہیں کیونکہ ''الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کا اطلاق اس کا متقاضی ہے کہ ان سب کو مُراد لیا جائے، تو یہ اس لئے درست قرار نہیں پاتا کہ وہ سب مسلمانوں پر غلبہ پانے سے مایوس نہیں ہوئے تھے اور اس وقت جزیرۃ العرب سے باہر اسلام کی طاقت ودبدبہ اور غلبہ ظاہر ہی نہیں ہوا تھا، البتہ اگر یوں کہا جائے کہ دین کی تکمیل سے مُراد اس دن حج کے تمام احکام کا نزول ہے کہ جو آنحضرتؐ کی موجودگی میں ہوا اور آپؐ نے وہ تمام احکام عملی وقولی دونوں صورتوں میں لوگوں کو تعلیم دے دیئے،

تو یہ بھی درست قرار نہیں پا سکتا کیونکہ لوگوں کو صرف حج کے احکام تعلیم دینا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن اُنہیں صرف حج تمتع کا حکم دیا کہ جسے بہت ہی جلد ترک کر دیا گیا، اور اس سے پہلے دین کے بنیادی ارکان مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ کے احکام نازل ہو چکے تھے، دین کی تکمیل کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ دین کے بعض واجبات کی تعلیم کو دین کی تکمیل کا نام دیا جائے جبکہ صرف کسی ایک دینی واجب عمل کی تعلیم کو سارے کا سارا دین قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اس احتمال کو قرین صحت قرار دیا جائے تو پہلے فقرے یعنی ''اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ'' کا اس فقرے یعنی ''اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ'' سے ربط ہی منقطع ہو جاتا ہے، کفار کے دین سے مایوس ہونے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لوگوں کو حج تمتع کی تعلیم دینے کے درمیان کیا ربط بنتا ہے؟

ایک امکانی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یوں کہا جائے کہ دین کو مکمل کرنے سے مُراد یہ ہے کہ اس دن سورۂ مائدہ نازل کر کے شریعت کے حلال و حرام کے باقیماندہ احکام کو نازل کر دیا گیا کہ اس کے بعد حلال و حرام کا کوئی حکم صادر نہیں ہوا اور دین مکمل ہونے سے کافروں کے دلوں پر نا اُمیدی چھا گئی اور ان کے چہروں پر مایوسی کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔

لیکن اس احتمال کے تناظر میں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ آیت میں ''الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'' سے کون سے کفار مُراد ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان سے مُراد کفارِ عرب ہیں تو صحیح نہیں کیونکہ ان میں تو اسلام پھیل چکا تھا اور کوئی شخص ان میں سے ایسا نہ تھا جو اسلام کے علاوہ کسی دین کا اظہار کرتا ہو بلکہ سب ہی اسلام کے طرفدار بن چکے تھے اور یہی بات حقیقی اسلام کی نشانی ہے، تو اس صورتحال میں مایوس و نا اُمید ہونے والے کفار کون ہو سکتے ہیں؟ اور اگر ''کفار'' سے دیگر قوموں و نسلوں کے لوگ مُراد لئے جائیں تو قارئین کرام اس امر سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ اس دن مسلمانوں پر غالب آنے سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔

اب یہ بات غور طلب ہو گی کہ احکام شریعت کے نزول کا سلسلہ کب رُکا؟ آیا سورۂ مائدہ کے نزول اور حجۃ الوداع کے یوم عرفہ کے ساتھ ہی احکام نازل ہونے کا دروازہ بند ہو گیا، جبکہ کثرت کے ساتھ روایات موجود ہیں کہ جن کی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ان میں اس دن کے بعد احکام و فرائض نازل ہونے کا تذکرہ ہے مثلاً آیۃ صیف یعنی آیۃ کلالہ کہ جو سورۂ نساء کی آخری آیات میں سے ہے، اور سود والی آیت، یہاں تک کہ عمر بن خطاب کے ایک خطبہ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جس میں ربا (سود) کی حُرمت کے حکم پر مشتمل آیت کو قرآن مجید کی آخری نازل ہونے والی آیت قرار دیا گیا ہے اور اس میں حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو گئے مگر انہوں نے ہمیں اس حکم کی وضاحت نہیں کی، لہٰذا صرف اسی صورت کو حرام سمجھو جس کا تمہیں یقین ہے اور اس کے علاوہ اور کسی مشکوک صورت کی پروا نہ کرو۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت مذکور ہے کہ اُنہوں نے کہا: آخر آیۃ نزلت علی النبی (ص) آیۃ الربا، (حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی سب سے آخری آیت، ربا والی آیت ہے)۔ اس کے علاوہ بھی متعدد روایات اسی مطلب پر مشتمل ہیں۔

بنابرایں کسی محقق کو ان روایات کی تضعیف کا حق حاصل نہیں کہ اس بناء پر آیت کو ان پر مقدم قرار دے یعنی آیت اور روایات کے درمیان تقدم و تاخر کی بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں پائی جاتی جس کی بناء پر کوئی محقق اس تقابلی صورت کو اختیار کرتے ہوئے روایات کو ضعیف قرار دے، کیونکہ آیت میں نہ ہی صراحت پائی جاتی ہے اور نہ ہی وہ اس مطلب میں ظہور رکھتی ہے کہ اس میں "اَلۡیَوۡمَ" سے بعینہ فلاں دن مُراد ہے بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک احتمالی پہلو اور امکانی صورت ہے کہ جس کا تعین و تیقن اس پر موقوف ہے کہ اس کے منافی دیگر ممکنہ احتمالات کی نفی ہو اور جو روایات پیش کی گئی ہیں ان میں سند کے حوالہ سے تحفظات کی گنجائش بھی موجود ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ دین کی تکمیل سے مُراد یہ ہے کہ بیت اللہ کو مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور مشرکوں کو اس سے دور کر دیا گیا ہے تا کہ مسلمان ہی اس کا حج ادا کر سکیں کہ اُن کے ساتھ مشرکین اکٹھے نہ ہوں تو یہ بھی درست نہیں، کیونکہ بیت اللہ کا مسلمانوں کے لئے مخصوص و مختص قرار دیا جانا ایک سال پہلے قرار پا چکا تھا لہٰذا اسے لفظ "اَلۡیَوۡمَ" کے ساتھ (اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ) مقید کرنا بے معنی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بیت اللہ کے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کئے جانے کو نعمت کا پورا کرنا قرار دینا تو قابل تصور ہے لیکن اسے دین کی تکمیل قرار دینا مشکل ہے، بیت اللہ کے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص قرار دیئے جانے کا دین کی تکمیل سے کوئی معنوی ربط نہیں بنتا۔ دین تو عقائد و احکام کے مجموعہ مرکب کے علاوہ کسی چیز کا نام نہیں اور اس کی تکمیل اس کے سوا قابل تصور نہیں کہ اس کے اجزاء میں ایک جزء کا مزید اضافہ کر دیا جائے، لیکن جہاں تک بیت اللہ کے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص قرار دیئے جانے کا تعلق ہے تا کہ وہ احکام پر آسانی اور کسی طرح کی رکاوٹ کے بغیر عمل کر سکیں اور اپنے فرائض و واجبات ادا کر سکیں تو اسے دین کی تکمیل کسی بھی لحاظ سے نہیں قرار دیا جا سکتا، اس کے ساتھ ساتھ کفار کے دین سے مایوس ہونے کی بابت بھی اشکال اپنے مقام پر باقی رہے گا۔

ایک قول: اس بحث میں یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ دین مکمل کرنے سے آیت میں مذکورہ محرمات کا تفصیلی بیان مُراد ہو تا کہ مسلمان ان سے بخوبی آگاہ ہوں اور ان سے اجتناب برتیں، اور اس سلسلہ میں کفار سے ہرگز نہ گھبرائیں کیونکہ وہ مسلمانوں کے دین سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کا مسلمانوں کے دین سے مایوس ہونا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت و اعزاز سے نوازا ہے اور ان کے دین اور خود اُنہیں کفار پر غلبہ عطا فرمایا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ صدرِ اسلام میں چار چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر ہوا تھا یعنی مُردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے ذبح کیا گیا ہو، کہ ان کا اجمالی بیان بعض مکی سورتوں میں ہوا ہے اور ان کی بابت تفصیلات ذکر نہیں کی گئیں، تو تفصیل کے بجائے اجمالی بیان پر اکتفاء کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان امور کی بابت تدریجی طور پر احکام بیان کئے جائیں اور ان خبائث کی حرمت اور ان سے اجتناب برتنے کی بابت شدت کے احکامات دفعۃً کی بجائے

تدریجاً اس لئے بیان ہوں تا کہ اہل عرب اسلام سے دور نہ بھاگیں اور نہ ہی اسے سختی والا دین سمجھیں کہ اسے چھوڑ کر پہلے عقیدہ کی طرف پلٹ جائیں کیونکہ صدرِ اسلام میں جو لوگ اسلام لائے ان کی اکثریت غریب و نادار لوگوں کی تھی کہ جو کسی شدت و سختی کے متحمل نہیں تھے۔ اس لئے شریعت نے بیان احکام میں تدریجی انداز اختیار کیا اور ان محرمات کی تفصیلات اس وقت بیان کی گئیں جب اسلام طاقتور دین کی صورت اختیار کر گیا اور اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو عزت و غلبہ عطا فرمایا کہ جس کے بعد کافروں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اہل اسلام پر غالب آنے سے نا اُمید ہو گئے اور طاقت کے بل بوتے پر اسلام اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی ان کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

ان تمام مطالب کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں ''اَلْيَوْمَ'' سے حجۃ الوداع کا یوم عرفہ ہی مراد ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں وہ باقی احکام بھی بیان کئے گئے جن سے زمانہ جاہلیت کی فرسودہ رسومات اور خبائث و اوھام سے دل بستگی کے نظام پر سرخ لکیر پھر گئی اور اس کے ساتھ اس آیت میں مسلمانوں کو مشرکوں پر غلبہ پانے اور پورے طور پر فتح حاصل کرنے کی بشارت دی گئی کہ جس کے بعد اسلام و مسلمانوں کے زوال کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا اور نہ ہی انہیں کسی طرح کا خوف لاحق ہوگا۔

بنا بر ایں اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا کہ کفار خود ہی مسلمانوں کے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اب جبکہ اللہ نے ان کی کمزوری کو طاقت میں اُن کے خوف کو امن میں اور ان کی ناداری کو تو انگری میں بدل دیا ہے تو وہ اللہ کے علاوہ کسی سے خوف نہ کھائیں اور جن چیزوں سے اللہ نے اس آیت میں اُنہیں منع فرمایا ہے ان سے اجتناب برتیں کہ اسی میں ان کے دین کی کمالیت ہے، یہ مطالب بعض مفسرین نے اپنی تحقیق کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور ہم نے یہاں ان کو خلاصۃً ذکر دیا ہے۔

لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ جن صاحب نے یہ قول پیش کیا ہے اُنہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع کی بابت جو احتمالات ذکر کئے گئے ہیں اُن سب کے تناظر میں ایک جامع نظریہ قائم کیا جائے جس کے ذریعے آخری احتمال پر وارد ہونے والے تمام اشکالات و اعتراضات دور ہو سکیں۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں مختلف پیچیدگیوں کا شکار ہو کر آیت کے الفاظ اور اُن کے معانی کو ہی خراب کر بیٹھے، جس کے نتیجہ میں وہ یہ بات بھول گئے کہ اگر کافروں کے مایوس و نا اُمید ہونے سے مُراد یہ ہو کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ اور اس کی قوت و استحکام کے باعث اسلام اور مسلمانوں پر غلبہ پانے سے محروم ہوئے جو کہ فتح مکہ یا آیات برائت کے نزول کا زمانہ تھا، تو اس بناء پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیت ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ'' میں ''اَلْيَوْمَ'' سے ۱۰ ہجری کا یوم عرفہ مُراد ہے جبکہ وہ اس سے ایک یا دو سال پہلے اس حالت کا شکار ہو چکے تھے اور اس کے لئے ''اَلْيَوْمَ'' کی بجائے یہ الفاظ کہے جاتے ''قَدْ يَئِسُوْا'' (وہ مایوس ہو چکے ہیں) جیسا کہ اس نظریہ کے قائل نے

خود اپنے بیان میں معنیٰ کی وضاحت کرتے ہوئے اسی طرح ذکر کیا ہے، یا پھر یوں کہا جاتا ہے: ''اتھم ائسون'' (وہ مایوس ہیں)۔ اور وہ یہ بات بھی بھول گئے کہ انہوں نے حرام کی گئی اشیاء کی بابت احکام کے تدریجی نازل ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے شراب کی حُرمت کے حکم کے تدریجی نازل ہونے کا حوالہ دیا ہے اس میں اگر اُس کا مقصد و مُراد یہ ہو کہ حرام کی گئی اشیاء کے بارے میں حرمت کے احکام یکے بعد دیگرے نازل ہوئے یعنی پہلے بعض چیزوں کے حرام ہونے کے احکام نازل ہوئے پھر دیگر بعض اشیاء کے حرام کئے جانے کے احکام نازل ہوئے تو اس سلسلہ میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ آیت ان مطالب سے زیادہ کسی چیز پر دلالت نہیں کرتی جو حرام کی گئی اشیاء کے احکام پر مشتمل آیات میں مذکور ہیں یعنی سورۂ بقرہ، سورۂ انعام اور سورۂ نحل کی آیات، کہ جو اس آیت سے پہلے نازل ہوئیں، اور ''منخنقہ'' اور ''موقوذہ'' بھی انہی اشیاء میں شامل ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ احکام کے تدریجی نازل کئے جانے سے مُراد یہ ہے کہ اس میں اجمال و تفصیل ملحوظ ہے کہ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگ ذہنی طور پر آمادہ ہوں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ شروع ہی میں انکار کر دیں اور احکام کو ماننے سے سرتابی کریں، تو یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں جن اشیاء کی حرمت کا صریح و واضح الفاظ میں تذکرہ ہو چکا ہے یعنی مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جانے والے جانور تو وہ اشیاء منخنقہ اور موقوذہ وغیرہ سے زیادہ پائی جاتی ہیں اور لوگوں کو ان کے بارے میں زیادہ آگاہی و واسطہ پڑتا ہے جبکہ ''منخنقہ'' اور ''موقوذہ'' بہت ہی کم واقع ہوتے ہیں، اس صورتحال میں یہ بات کیونکر قرین صحت قرار پاسکتی ہے کہ جو چیزیں عام طور پر وجود میں آتی ہیں ان کا حکم صریح اور کسی طرح کے اندیشہ کو ملحوظ رکھے بغیر بیان ہو اور جو چیزیں کبھی کبھی اور شاذ و نادر پائی جائیں کہ جن کا موازنہ ان چار چیزوں سے ہو ہی نہ سکتا ہو ان کے احکام تدریجی طور پر بیان ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ کہیں عوام الناس ان احکام کو قبول کرنے سے انکار ہی نہ کر دیں؟

اور اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ ان دو قسم کے جانوروں کے احکام اسی وجہ سے تدریجی طور پر بیان ہوئے ہیں کہ اگر دفعتاً بیان ہوتے تو شاید لوگ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تو کیا اسے دین کی تکمیل سے موسوم کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ احکام کی تشریع و قانون گزاری کو ''دین'' اور ان احکام کے بیان و تبلیغ کو ''دین کی تکمیل'' کا نام دیا جائے؟ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ احکام کے بیان و تبلیغ کو ''دین کی تکمیل'' سے موسوم کرنا درست ہے اور خدا نے فرمایا ہو کہ ان احکام کی تبلیغ کے ذریعے آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے تو کیا صرف اسی دن سب احکام بیان ہوئے؟ بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ ۲۳ برسوں میں متعدد احکام مقرر اور بیان ہوئے تو یہ بات کیونکر قرین صحت قرار پاسکتی ہے کہ صرف چند احکام جو اس طرح بیان ہوئے ان کی وجہ سے دین کی تکمیل کا عنوان قائم ہوا اور نعمت کے

اتمام کا اظہار ہوا؟ یعنی صرف چند احکام کے بیان کو دین کی تکمیل اور نعمت کے اتمام کا نام دیا گیا؟

اور اگر دین کی تکمیل سے مُراد یہ ہو کہ اس کے بعد کوئی نیا حکم صادر نہ ہوگا اور اب یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے کہ ان احکام کے بعد کہ جو آج نازل اور بیان ہوئے کوئی فرمان جاری نہیں کیا جائے گا کیونکہ دین مکمل ہو گیا ہے تو اس طرح کا نظریہ رکھنے والوں سے سوال ہوگا کہ اگر یہ بات درست ہے تو ان احکام کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو سورۂ مائدہ نازل ہونے کے بعد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے پہلے نازل ہوئے؟ ان کی دینی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا وہ دین میں شامل نہیں؟ بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ جو احکام اس آیت کے بعد خود اسی سورت میں مذکور ہیں کیا وہ شریعت اسلامیہ کا حصہ نہیں؟ قارئین کرام ان آیات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے ان میں مذکورہ احکام سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر، اگر مذکورہ بالا امور قرین صحت قرار بھی دے دیئے جائیں تب بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان احکام کے بیان وتبلیغ سے سارے کا سارا دین مکمل ہو گیا بلکہ شاید یہ کہہ سکیں کہ دین کا بعض حصہ مکمل ہوا اور بعض نعمتیں مکمل ہوئیں نہ کہ سارا دین اور ساری نعمتیں! جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ''(آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے پورا کر دیا اور اپنی نعمت تم پر مکمل کر دی) تو اس میں کلام مطلق ہے کہ جس میں کوئی قید وشرط مذکور نہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام متعدد دنوں میں بیان فرمائے تو اس دن ہی میں نازل ہونے والے حکم کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ جس کی وجہ سے یا جس کے بیان وتبلیغ کے باعث اسے دین کی تکمیل اور نعمت کے اتمام سے موسوم کیا گیا؟

اور یہ بات بھی سوال طلب باقی رہ جاتی ہے کہ دین کی تکمیل کے حوالہ سے جو سوالات سامنے آئے کہ جن کے جوابات بظاہر قابل قبول قرار نہیں دیئے جا سکتے، ان سب کے باوجود اس جملہ کا مطلب کیا ہوگا: ''وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' (اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا)؟ کیونکہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے دن میں نے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا ہے تو کیا صرف انہی چند احکام کے بیان کی وجہ سے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا گیا؟ جبکہ ان میں کوئی ایسی غیر معمولی خصوصیت نہیں دکھائی دیتی جس کی وجہ سے اس دن کو یہ اعزاز حاصل ہو کہ اس میں اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا جائے۔

ان تمام مطالب کے پیش نظر یہ بات ملحوظ رہے کہ سابق الذکر نظریات پر جو اعتراضات وارد ہوئے تھے وہ سب یا ان سے بھی زیادہ اعتراضات زیر نظر رائے پر وارد ہوتے ہیں ہم ان تمام اعتراضات کو دوبارہ یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھے تا کہ کلام میں طوالت پیدا نہ ہو۔

پانچواں قول: "اَلْیَوْمَ" سے مُراد ۱۰ ہجری کے روزِ عرفہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ منورہ پہنچے کے درمیانی دنوں میں سے کوئی ایک دن ہے کیونکہ جو قرائن کفار کے مایوس ہونے اور دین کی تکمیل کے معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سامنے آتے ہیں ان کی روشنی میں اسی کی تائید ملتی ہے۔ لیکن اس قول پر بھی وہ تمام اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو سابق الذکر اقوال و آراء پر وارد ہوئے تھے۔

تو یہ ہیں وہ چند اقوال و آراء اور نظریات و احتمالات کہ جو زیرِ نظر آیۂ مبارکہ کے معانی کی تاویل میں ذکر ہوئے یا ذکر ہو سکتے ہیں لہٰذا اب ہم اپنے مخصوص طرزِ بحث کے ساتھ کہ جو اس کتاب میں ہم نے اپنائی ہے اس آیت کی بابت مربوطہ مطالب ذکر کرتے ہیں تو اس کا آغاز "اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ" سے کرتے ہیں:

لفظ "یأس" (نا اُمیدی) لفظ "رجاء" (اُمید) کے مقابل میں آتا ہے اور "دین" اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے ان احکام و معارف کے مجموعہ کا نام ہے جو تدریجی طور پر نازل ہوئے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار اپنے تیئں اس امید پر تھے کہ مسلمانوں کے دین یعنی اسلام کو ختم کر دیں گے اور انہیں یہ توقع تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اسلام زوال پذیر ہو جائے گا، اسی وجہ سے مسلمانوں میں بھی اسلام کی زوال پذیری کا اندیشہ پیدا ہو رہا تھا اور وہ اس خوف میں مبتلا ہو گئے تھے کہ کہیں ان کا دین ختم نہ ہو جائے۔ اس صورتحال میں مسلمانوں کا خوفزدہ ہونا بھی متوقع تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: "فَلَا تَخْشَوْهُمْ" (ان سے خوف نہ کھاؤ) درحقیقت مؤمنوں کو تسلی و اطمینان بلکہ ضمانت دینے کے طور پر تھا کہ وہ اسلام کی زوال پذیری کا خوف دل میں نہ لائیں، چنانچہ درج ذیل آیات میں مسلمانوں کو لاحق خطرات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں مطلع و آگاہ کیا گیا ہے کہ کفار ان کے خلاف کیا سوچتے اور منصوبہ بندیاں کرتے ہیں:

- سورۂ آلِ عمران، آیت: ۶۹

"وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَکُمْ"

(اہل کتاب کے کچھ لوگ اس بات کے خواہاں ہیں کہ تمہیں گمراہ کریں)

- سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۹

"وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"

(بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان سے دور کر کے دوبارہ کافر بنا دیں، ان کا ایسا کرنا ان کی طرف سے حسد کی بناء پر ہے جبکہ ان کے سامنے حق واضح و آشکار ہو چکا ہے، بس تم ان سے درگزر کرو اور روگردانی کر لو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم صادر فرمائے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اس مقام پر یہ حقیقت بھی کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ کفار کو مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں اس کے علاوہ کوئی غرض ملحوظ نہ تھی کہ ان کا دین انہیں ناگوار تھا اور وہ مسلمانوں سے اس لئے نالاں رہتے تھے کہ مسلمانوں کے دین نے ان لوگوں کی خود ساختہ عزتوں اور خود بافتہ منزلتوں پر پانی پھیر دیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اُن کی ان بے پدر و مادر آزادیوں کے راستے بھی بند کر دیئے تھے جن کی وجہ سے وہ شہوت پرستیوں و بداعمالیوں اور ہر طرح کی روک ٹوک کے بغیر اپنی عیاشیوں میں مصروف رہتے تھے، اسی وجہ سے ''دین'' انہیں ناپسند و ناگوار تھا اور نہ دین والوں سے انہیں کوئی غرض نہ تھی اور نہ ہی وہ ان کے بارے میں ذاتی عناد رکھتے تھے بلکہ انہیں مسلمانوں سے اس لئے دشمنی تھی کہ ان کا دین حق کفار کی غیر انسانی حرکتوں میں رکاوٹ تھا، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ خدا کے نور کو خاموش کر دیں اور دین حق کی بڑھتی ہوئی روشنی کو ختم کر کے شرک کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیں کیونکہ اسلام کی حقانیت کے پھیلاؤ نے ان کی اعتقادی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور شرک کا نظام ہچکولے کھانے لگا تھا، لہٰذا کافروں کا اصل ہدف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی راہ پر لا کھڑا کریں چنانچہ اس مطلب کا بیان اس جملے میں ہوا: ''لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا'' (کہ وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں) اور اسی بات کو درج ذیل آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے:

- سورۂ صف، آیت: ۹

''يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ''

(وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں جبکہ اللہ اپنے نور کا پورا کرنے والا ہے خواہ کافروں کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو، وہی ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غلبہ عطا کرے خواہ مشرکین اسے ناپسند کیوں نہ کریں)

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا:

- سورۂ مؤمن، آیت: ۱۴

''فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ''

(پس تم اللہ کو پکارو اسی کے لئے دین کو خالص قرار دے کر، خواہ کافروں کو ناگوار کیوں نہ ہو)

تو یہ وہ اصل وجہ تھی کہ کافر صرف یہ چاہتے تھے کہ اس شجرۂ طیبہ کو جڑ سے اکھاڑ دیں اور اس مضبوط و مستحکم دین کی بنیادیں ہی ختم کر دیں چنانچہ اپنے اس مذموم مقصد کے لئے اُنہوں نے مؤمنین کے درمیان تفرقہ ڈالنے، اُن میں نفاق کو ہوا دینے اور شبہات و خرافات کو جنم دے کر دین الٰہی کو محو و نابود کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا، اُنہوں نے شروع میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو مشکوک کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دینی مشن اور دعوتِ حق کو غیر معقول قرار دینے کے لئے بھرپور مال ودولت صرف کی اور اپنے تمام تر معاشرتی وسائل واجتماعی طاقت کو استعمال کیا، ان کی ان کاوشوں کے بارے میں درج ذیل آیت میں یوں مذکور ہے:

○ سورۂ ص، آیت:٦

''وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ''

(ان کے سردار باہر نکل آئے کہ چلو اور اپنے خُداؤں کے دفاع میں کمربستہ ہوجاؤ، کہ یہی کام ہم سے مطلوب ہے)

یعنی سرداران قریش لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ اپنے مال ومتاع کو اپنے خُداؤں (بتوں) کے دفاع وحمایت میں قربان کردیں، یا وہ لوگ ساز باز وسازشوں کے ذریعے دین اسلام کا راستہ روکتے تھے، کہ اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درج ذیل آیات میں مربوطہ مطالب بیان کئے گئے ہیں:

○ سورۂ قلم، آیت:۹

''وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ''

(وہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ جائیں تو وہ بھی اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ جائیں گے)

○ سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۷۴

''وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا''

(اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ بناتے تو ان کی کوشش تھی کہ آپ ان کی طرف ذرہ بھر جھکاؤ دکھائیں)

○ سورۂ کافرون، آیت:۱ تا ۳

''قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ''

(کہہ دیجئے کہ اے کافرو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ ہی تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں)

ان آیات مبارکہ کے شانِ نزول میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار ہر طرح سے کوشاں تھے کہ اسلام کی دعوتِ حق کا راستہ روک دیں اور اس مقصد کیلئے اُنہوں نے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا۔

کافروں کی آخری اُمید یہ تھی کہ جس سے دین اسلام کی زوال پذیری اور دعوتِ حق کا خاتمہ یقینی سمجھتے تھے وہ یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عنقریب دنیا سے چلے جائیں گے اور جب اس سلسلہ کا بانی ہی نہ رہے گا تو پھر اس کی بقاء کے تمام راستے بند ہو جائیں گے، اور ان کی موت سے دین بھی خود بخود مر جائے گا کیونکہ ان کی کوئی اولاد ونسل ہی نہیں ہے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ

ایک فرشتہ ہے جو نبوت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور دین ایک طرح کا سلطنتی نظام ہے جو دعوت و رسالت کے عنوان سے ظہور پذیر ہوا ہے لہٰذا اگر اس کا داعی دنیا سے چلا جائے یا اُسے قتل کر دیا جائے تو اس کا نام ونشان باقی نہ رہے گا اور اس کا اور اس کے دین کا ذکر کرنے والا ہی کوئی نہ ہوگا کیونکہ بادشاہوں اور جابر حکمرانوں کی تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ ان کی سلطنت وحکومت اور لوگوں پر جابرانہ تسلط خواہ جس قدر وسیع اور مضبوط کیوں نہ ہو ان کے مرنے کے ساتھ ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے اور کوئی اُنہیں یاد کرنے والا نہیں ہوتا اور ان کے تمام تر احکامات و دستورات اور لوگوں پر مسلط کئے گئے قوانین سب ہی ان کے ساتھ ان کی قبروں میں دفن ہو جاتے ہیں چنانچہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ''اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ'' (یقیناً تیرا دشمن ہی بے اولاد و بے نام ونشان ہے) سورۂ کوثر، آیت: ۳۔ اس آیت کا شان نزول بھی اسی مطلب کو واضح کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

تو یہ وہ مذموم خواہش اور اس جیسی دیگر آرزوئیں تھیں جن کی وجہ سے کفار کے دلوں میں دین کا چراغ بجھا دینے کی تمنائیں موجزن ہوئیں اور ان کے اوہام وافکار میں اس مقدس مشن کے بارے میں یہ خیالات جنم لینے لگے کہ اس دعوت و مشن کی حیثیت خاک کے اُڑتے ہوئے ذروں سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو حوادثِ زمانہ اور گردشِ ایام کی نذر ہو کر محو و نابود ہو جائے گا اور اس کا نام ونشان تک باقی نہ ہوگا لیکن اسلام کے تدریجی ظہور اور دیگر ادیان اور ان کے پیروکاروں پر اس کے غالب آنے اور اللہ کے دین کی روز افزوں قوت وشوکت نے کفار کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا اور وہ اپنی اس کوشش میں بُری طرح ناکام ہوئے کہ مال و دولت کے لالچ اور اور جاہ وجلال کی پیشکش کے ذریعے داعیٔ حق کو مغلوب ومحکوم کر پائیں گے چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر طرح سے شکست دینے کی کوشش کی مگر اُن کی کوئی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔

اسلام کی قوت وشوکت نے کفار کو مایوس و نا اُمید کر دیا اور اُن کے تمام منصوبے ناکامی سے دوچار ہو گئے، اب اُن کے سامنے صرف ایک چیز تھی جو اُنہیں اپنے مقاصد کے حصول کی اُمید دلا رہی تھی اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوت دینے والی شخصیت یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تو کوئی فرزند (مرد اولاد) نہیں جو اُن کی قائم مقام بنے اور اُن کی دعوت ومشن کو وسعت دے لہٰذا اُن کی وفات ہی سے اُن کے دین ونظام کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کوئی دین و آئین خواہ وہ اپنے احکام ومعارف میں جس قدر قوی و مستحکم کیوں نہ ہو اس کی بقاء خود بخود یقینی نہیں ہوتی یعنی وہ خود اپنی بقاء کو یقینی نہیں بناتا، اسی طرح کوئی سیرت وسنت اور نو پیدا دین وآئین اپنے تمام تر پیروکاروں کے باوجود خواہ وہ جس قدر زیادہ کیوں نہ ہوں، اپنی اصل حالت وکیفیت پر باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس سے متعلق امور وصفات لوگوں کے دلوں میں جگہ پاتے ہیں، اور اسی طرح ان کا خاتمہ بھی جبر وجور یا دھمکیوں یا فتنہ پروریوں یا استبدادی ہتھکنڈوں وغیرہ سے ممکن ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ان کے داعیوں، پاسداروں اور ان کے امور کی تدبیر کرنے والوں کے دُنیا سے کوچ کر جانے کے نتیجہ میں! یعنی جب وہ

افراد ہی دُنیا میں نہ رہیں جو کسی دین و آئین اور نظام کو لائے ہوں یا ان کی حفاظت و پاسداری کے ذمہ دار ہوں تو اس کی بقاء کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ کافروں کا مایوس ہونا اسی صورت میں حقیقی شکل پا سکتا ہے جب اس کا اصل سبب وجود پذیر ہو کہ جسے عقل کی تائید و تصدیق حاصل ہے اور وہ یہ کہ خُداوند عالم اس مقدس دین کے لئے کسی ایسے شخص کو منصوب و معین فرمائے جو دین کی حفاظت اور اس کے امور کی تدبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائم مقام ہو اور اُمت کی ہدایت و ارشاد کی بابت وہی طرز عمل اپنائے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنایا کہ اس کے نتیجہ میں کافروں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑے کیونکہ وہ اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیں کہ دین اب شخصی و فردی مرحلہ سے باہر آ کر نوعی مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے کہ اسی سے دین کو وجود میں آنے کے بعد بقاء کی صفت حاصل ہو اور یہ نعمت پوری ہو جائے، عین ممکن ہے کہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۹ میں یوں ارشاد ہوا ہو: ''وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' کہ اس آیت میں جملہ ''حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ'' سے مذکورہ بالا مطلب مُراد لیا جا سکتا ہے۔

یہی بات اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ وہ روایات صحیح ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے دن نازل ہوئی یعنی ۱۰ ہجری کی ۱۸ ذوالحج کو، جس میں مولا علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کیا گیا۔ بنا بر ایں آیت کے دونوں فقرے یعنی ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ'' اور ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ'' کا معنوی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پھر سابق الذکر اعتراضات کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔

ایک اہم نکتہ: اب جبکہ آپ اس مطلب سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں کہ آیت میں ''یأس'' یعنی نا اُمیدی کا معنیٰ کیا ہے تو یہ بات آپ پر واضح ہو جائے کہ ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ'' میں لفظ ''اَلْيَوْمَ'' فعل ماضی ''يَئِسَ'' کا ظرف زمانی ہے، اور اسے ''يَئِسَ'' سے پہلے اس لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس دن کی اہمیت و عظمت واضح ہو سکے اور یہ حقیقت معلوم و آشکار ہو جائے کہ دین اپنے داعی کی شخصی حیثیت کے مرحلہ کے بعد اب اس کی نوعی صورت میں آ چکا ہے اور ظہور و وجود پذیری کے مرحلہ کے بعد اب بقاء و دوام کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔

اور یہ مطلب بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اس آیت کا موازنہ، آیت ''اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ'' سے بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ان دونوں آیتوں کا سیاق ایک دوسرے سے مختلف ہے، چنانچہ ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ'' کا سیاق معترضہ جبکہ ''اَلْيَوْمَ أُحِلَّ'' کا سیاق مستانفہ ہے، ''معترضہ'' اس جملہ کو کہتے ہیں جو دو جملوں کے درمیان واقع ہو کہ جس کا ربط ماقبل و مابعد دونوں جملوں سے ہو اور ''مستانفہ'' نئے کلام کو کہتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ دونوں آیتوں میں مذکور احکام بھی مختلف ہیں: پہلی آیت میں مذکور

حکم، تکوینی ہے کہ جو ایک طرف سے خوشخبری اور دوسری طرف سے تحذیر و تہدید اور خوف دلانے پر مشتمل ہے اور دوسری آیت میں مذکور حکم تشریعی و قانونی حیثیت رکھتا ہے کہ جو اللہ کی طرف سے منت و احسان پر مشتمل ہے یعنی کافروں کا مسلمانوں کے دین سے مایوس ہو جانا اور ''الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' میں کافروں سے مراد جیسا کہ اس کی بابت اشارہ ہو چکا ہے۔ تمام کفار ہیں یعنی بت پرست، یہودی، عیسائی اور دیگر، کیونکہ الفاظ میں اطلاق پایا جاتا ہے یعنی کفار کے کسی مخصوص گروہ کی طرف کوئی لفظی اشارہ موجود نہیں۔ اور جہاں تک جملہ ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' کا تعلق ہے تو اس میں جو نہی مذکور ہے وہ ارشادی و ناصحانہ ہے حاکمانہ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے خطرہ تھا جب وہ ہی مایوس و نا اُمید ہو چکے ہیں تو پھر اُن سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟ اور یہ بات واضح و معلوم ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کے حصول سے مایوس ہو جائے تو اس کے بارے میں کچھ کرنے کا اقدام و اہتمام نہیں کرتا اور نہ ہی اس شے کے بارے میں سعی و کوشش کرتا ہے جس کی بابت اسے معلوم ہو کہ اس کی کوشش و کاوش بے نتیجہ ہوگی۔ اور تم مسلمانوں کو کافروں کی طرف سے کوئی خوف و خطرہ نہیں، لہٰذا ان کی طرف سے تمہیں اپنے دین کے بارے میں کوئی خوف دل میں لانے کی ضرورت نہیں، پس تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ''

اس بیان سے یہ مطلب بھی آشکار ہوتا ہے کہ سیاق کلام اس کا متقاضی ہے کہ ''وَاخْشَوْنِ'' سے مراد یہ لیا جائے کہ اگر کفار کا مایوس ہونا ملحوظ نہ ہوتا تو تمہیں جس چیز کی بابت اُن سے ڈر تھا اسی کی بابت اب مجھ سے ڈرو یعنی دین کے بارے میں! کہ کہیں وہ تمہارے ہاتھوں سے نکل نہ جائے اور تم اس نعمت سے محروم نہ ہو، تو یہ بات مسلمانوں کو ایک طرح سے تنبیہ اور ہوشیار باش ہے، اسی لئے ہم نے آیت کو امتنان و احسان پر محمول نہیں کیا، چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کی خشیت اور اس کی ناراضگی و عذاب سے ڈرنا تو ہر صورت میں واجب ہے اس کا تعلق کسی مخصوص حالت و خاص شرائط سے نہیں بلکہ ہر حال میں اور ہر صورت میں اس کی ناراضگی کا خوف دل میں رکھنا چاہیے، بنابرایں اس مقام پر جملہ ''وَاخْشَوْنِ'' (مجھ سے ڈرو) اگر کسی خاص مورد میں مخصوص ڈر کے بارے میں نہ ہوتا تو ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ'' ہی کافی تھا اس کے بعد ''وَاخْشَوْنِ'' کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی، اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس آیت کا قیاس و موازنہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۵ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ جس میں ارشاد ہوا ہے: ''فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'' (تم ان سے خوف نہ کھاؤ بلکہ مجھ سے خوف کھاؤ اگر تم مؤمن ہو)۔ کیونکہ اس آیت میں خوفِ خُدا کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے اور یہاں ارشادی و ناصحانہ حکم نہیں بلکہ حاکمانہ فرمان و دستور ہے کہ جس کا معنٰی یہ ہے کہ مؤمنین کے لئے یہ بات روا نہیں کہ وہ اپنے بارے میں کافروں سے خوفزدہ ہوں بلکہ ان پر لازم و واجب ہے کہ وہ صرف خدائے یکتا کا خوف دل میں رکھیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۂ آل عمران کی آیت، مومنوں کو اس کام سے منع کر رہی ہے جو ان کا حق نہیں بنتا یعنی یہ کہ ان کا کفار سے ڈرنا درست نہیں لہٰذا وہ ایسا نہ کریں خواہ انہیں خدا کے خوف کا حکم دیا جائے یا نہ دیا جائے، اسی وجہ سے اس حکم کو

دوسری مرتبہ اس کی علت کو بیان کرنے کے لیے مشروط صورت میں ذکر کرتے ہوئے کہا گیا: ''وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (اور مجھ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو)، جبکہ زیر بحث آیت میں یوں کہا گیا: ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' اس میں کوئی قید و شرط مذکور نہیں کیونکہ اس میں جو ''خشیت'' ملحوظ ہے وہ مؤمنین کی طرف سے اپنے دین کے بارے میں ہے اور وہ ایسی خشیت نہیں جو اللہ کو ناپسند ہو کیونکہ اس کی بازگشت بالآخر حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی چاہت کی طرف ہے۔ یعنی اس بات کا خوف کہ کہیں کفار ہمارے دین پر غلبہ نہ پالیں اور اسے مٹا نہ دیں درحقیقت اللہ سے محبت اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی غرض سے ہے، اور خداوند عالم کا مسلمانوں کو کافروں سے خوفزدہ نہ ہونے کا حکم اس وجہ سے صادر ہوا کہ ان کے خوفزدہ ہونے کا سبب یعنی کافروں کی یہ اُمید کہ وہ دین اسلام کو مٹا دیں گے، زائل ہو گیا اور اس کے آثار ختم ہو گئے، بنابرایں اس حکم میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ ارشادی و ناصحانہ ہے، اسی طرح اللہ کی خشیت کا حکم بھی ارشادی و ناصحانہ ہے، لہٰذا اس بیان میں مقصود و مطلوب یہ بات ہے کہ اے مسلمانو! تم پر واجب ہے کہ تم اپنے دین کی بابت خشیت رکھو کہ کہیں ایسا نہ ہونے پائے کہ کفار اسے تم سے چھین لیں، یہ خشیت و خوف اس دن تک تھا جب تمہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کفار تمہارے دین میں رخنہ ڈال دیں گے مگر آج وہ اس کام سے مایوس ہو گئے ہیں اور اب سب کچھ اللہ کے فیصلہ و تقدیر سے وابستہ ہو گیا ہے لہٰذا اب صرف اس کی خشیت دل میں رکھو، (قارئین کرام ان مطالب پر غور کریں)۔

بہرحال آیت مبارکہ کا جملہ ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' کی وجہ سے تہدید و تحذیر اور خبردار و ہوشیار باش سے خالی نہیں، کیونکہ اس میں مخصوص خشیت کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ اس عمومی خشیت کا کہ جو ہر حال میں اور ہر صورت میں ہر مؤمن پر واجب ہے لہٰذا ہمیں اس خشیت کی خصوصیت اور مخصوص پہلو پر غور کرنا چاہیے اور یہ جاننا چاہیے کہ اس کے واجب و لازم ہونے اور اس کی بابت صریح حکم و دستور صادر کئے جانے کی وجہ کیا ہے؟

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا کہ یہ دو فقرے یعنی ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ'' اور ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہیں اور دونوں میں ایک ہی غرض و مقصد کا بیان ملحوظ ہے چنانچہ اس سلسلہ میں سابق الذکر مطالب میں وضاحت کی جا چکی ہے۔ بنابرایں وہ دین کہ جس کی تکمیل اللہ نے آج کے دن کی اور وہ نعمت کہ جسے اللہ نے آج کے دن پورا کیا وہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ اور وہی چیز ہے جس کی بابت کفار برا ارادہ رکھتے تھے کہ اسے ختم کر دیں گے اور اسی کی بابت مؤمنین خوفزدہ تھے مگر اللہ نے کافروں کو ان کے ناپاک ارادہ میں مایوسی سے دوچار کر دیا اور دین کو مکمل اور نعمت کو پورا کر دیا، یعنی دین کو کمالیت عطا فرما دی، اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے مؤمنوں کو اس بات سے منع کر دیا کہ وہ اس کی بابت کسی طرح کا خوف و خطرہ دل میں لائیں، البتہ اسی کی بابت انہیں اس بات کا خوف کھانے کا حکم دیا کہ وہ صرف اللہ سے ڈریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ اس دین کو اُن سے چھین لے اور اس عطیہ و نعمت سے اُنہیں

محروم کردے۔، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے سلب کئے جانے کا سبب صرف اور صرف اس کا انکار اور کفران قرار دیا کہ اگر وہ اس کی ناشکری کے مرتکب ہوئے تو ان سے وہ نعمت سلب کر لی جائے گی، چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ انفال، آیت: ۵۳

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ''

(یہ اس لئے ہے کہ اللہ اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم پر کی ہو تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اسے تبدیل نہ کریں، اور یہ کہ اللہ بہت سننے والا، بہت جاننے والا ہے)

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۱

''وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ''

(اور جو شخص اللہ کی نعمت کو جبکہ اس کے پاس آ چکی ہو تبدیل کر دے تو اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی ایک کلی و جامع مثال بھی ذکر کر دی کہ جس کے تناظر میں ان نعمتوں کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ نحل، آیت: ۱۱۲

''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ''

(خدا نے مثال دی ہے ایک بستی کی، کہ جس میں ہر طرح کا امن و امان تھا اور اس کا رزق ہر طرف سے فراوانی کے ساتھ وہاں آتا تھا مگر اس بستی والوں نے اللہ کی نعمتوں کا کفران کیا تو اللہ نے ان کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں اُنہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا)

بنابرایں یہ آیہ مبارکہ: ''اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' اس حقیقت کے واضح و آشکار بیان پر مشتمل ہے کہ مسلمانوں کا دین، کافروں کی یلغار سے محفوظ و مامون ہے اور ان کی طرف سے ہر طرح کے خوف و خطرے سے امان میں ہے اور یہ کہ کفار کی طرف سے دین اسلام کی تباہی و نقصان وغیرہ کے لاحق ہونے کا کوئی ڈر نہیں البتہ اس پر جو آفت آئے گی وہ خود مسلمانوں کی اپنی طرف سے ہوگی اور وہ ان کی طرف سے اس کامل خدائی نعمت کی ناشکری اور اس خُدائی پسندیدہ کامل دین کو پس پشت ڈالنے کی صورت میں ہوگا، جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُنہیں اس نعمت سے محروم کر دے گا اور نعمت کو نقمت و عذاب میں بدل دے گا اور بھوک اور خوف کا لباس اُن پر ڈال دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں نے اس نعمت کا کفران کیا اور اللہ نے

اُنہیں اس سے محروم کر دیا۔

اس صورتحال سے بخوبی آگاہی حاصل کرنے اور مذکورہ بالا مطلب کی صداقت وحقانیت سے مطلع ہونے کے لئے عصر حاضر میں عالم اسلام کے موجودہ سنگین حالات پر نظر کی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ماضی میں رونما ہونے والے حوادث وواقعات اور مسلمانوں کی ابتری دراصل اُن کی طرف سے خُدائی نعمت کے کفران اور دین کو نظر انداز کردینے ہی کا نتیجہ تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمایا، ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' مگر مسلمانوں نے اس کے برعکس عمل کیا اور جس طرح ذلت اور بیچارگی سے دوچار ہوئے وہ کسی سے مخفی وپوشیدہ نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ولائق توجہ ہے کہ قرآن مجید میں جو آیات مبارکہ ولایت کے بیان پر مشتمل ہیں وہ پورے طور پر زیر بحث آیت سے مرتبط ہیں کہ ان میں بھی دین کو نظر انداز کرنے اور نعمت کے کفران کے نتیجہ میں اس سے محرومی کا شکار ہونے کی خبر دی گئی ہے اور یہ ایک واضح قرآنی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے ڈرانے میں جو لہجہ اختیار فرمایا وہ صرف ولایت کے باب میں ہے چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں بار بار ارشاد فرمایا ''وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ'' (اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے)۔ سورۂ آل عمران، آیت: ۲۸، ۳۰

اس موضوع کی بابت اس سے زیادہ بحث کرنا تفسیری مطالب کے دائرہ سے باہر جانے کے مترادف ہے لہٰذا اس پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

تکمیل دین واتمام نعمت کا اعلان

○ ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا''

(آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا)

آیت میں ''اِکمال'' اور ''اِتمام'' (اکملت، اتممت) مذکور ہے یہ دونوں الفاظ قریب المعنیٰ ہیں،

مشہور ماہر لغت راغبؔ اصفہانی نے لکھا ہے: کمال الشيئ حصول ما هو الغرض منه، و تمام الشيیء انتهائهٗ الی حد لا يحتاج الی شيیء خارج عنه، والناقص ما يحتاج الی شيیء خارج عنه۔

(کسی چیز کے کمال سے مراد یہ ہے کہ اس سے مطلوبہ غرض حاصل ہوجائے یعنی کسی چیز سے مقصود غرض کے حصول کو اس کا کمال کہتے ہیں اور کسی چیز کی تمامیّت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اپنی اس آخری حد کو پہنچ جائے کہ پھر اس سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت باقی

نہ رہے اس کے مقابل میں کسی چیز کے ناقص ہونے سے مُراد یہ ہے کہ وہ ابھی اپنے سے باہر کی کسی چیز کی محتاج ہے جو اس کے نقص کو دور کرے)۔

آپ ان دو لفظوں کے معنی سے مزید آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس طرح بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو اپنے وجود میں آثار کی حامل ہو اس کے آثار کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ کہ جو کسی چیز کے تمام اجزاء کے یکجا ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ چیز اجزاء کا مجموعہ ہو۔ تو اگر ان اجزاء میں سے کوئی ایک جزء بھی کم ہو یا اس کی شرائط میں سے ایک شرط نہ پائی جائے تو اس چیز کے مطلوبہ آثار ونتائج حاصل نہ ہوں گے، مثلاً روزہ کہ اگر اس کے کسی بھی حصہ میں امساک کو توڑ دیا جائے مثلاً ایک گھونٹ پانی پی لیا جائے یا ایک لقمہ منہ میں ڈال لیا جائے تو روزہ، روزہ نہیں رہے گا کیونکہ صوم یعنی روزہ کا نام ہی امساک ہے اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے رک جانے کو روزہ کہتے ہیں کہ اگر ان چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی انجام دیا جائے تو روزہ باقی نہ رہے گا۔ تو اس طرح کی چیزوں کے پورا ہونے کو "تمام" کہا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۷، (پھر تم روزہ کو رات تک تمام کرو)۔ اور ارشاد ہوا: "وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا" سورۂ انعام، آیت: ۱۱۵ (اور تیرے رب کی بات پوری ہوگئی سچائی وعدل کے ساتھ) اور دوسری قسم یہ ہے کہ کسی چیز کی اثر گزاری اس کے تمام اجزاء کے یکجا ہونے پر موقوف نہیں لہٰذا مجموعہ بحیثیت مجموعہ اپنے آثار ظاہر کرتا ہے اور جب ان سب میں سے کوئی ایک جزء بھی پایا جائے تو وہ اپنی حد تک اثر گزاری کرتا ہے اور اگر تمام اجزاء پائے جائیں تو اس سے تمام مطلوبہ آثار حاصل ہوں گے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:۔

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۶

"فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ"

(پس اگر قربانی میسر نہ آئے تو تین روزے حج کے دنوں میں اور سات روزے حج سے واپس آ کر رکھیں یہ پورے دس ہوں گے)

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۵

"وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ"

(تا کہ تم گنتی کو پورا کرو)

تو ان موارد میں جس طرح تمام اجزاء کا مجموعہ اثر گزاری کرتا ہے اسی طرح بعض اجزاء بھی اپنی حد تک اثر گزار ہوتے ہیں چنانچہ عام طور پر روزمرہ کے اظہارات میں کہا جاتا ہے: تم لفلان امرہ و کمل عقلہ، کہ فلاں شخص کا کام پورا ہو گیا اور اس کی عقل کامل ہو گئی، لیکن اس کے برعکس یوں نہیں کہا جاتا: تم عقلہ و کمل امرہٗ، اس کی عقل پوری ہو گئی

اور اس کا کام کامل ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''اکمال'' اور ''تکمیل'' میں کیا فرق ہے، اسی طرح ''اتمام'' اور ''تتمیم'' میں کیا فرق ہے، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ جو فرق باب ''اِفعال'' اور باب ''تفعیل'' میں ہے وہی فرق اکمال و تکمیل اور اِتمام و تتمیم میں ہے اور وہ یہ کہ لغت کی رُو سے ''اِفعال'' کسی کام کے دفعتاً ہونے اور ''تفعیل'' کسی کام کے تدریجاً انجام پانے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ہے ان دو ابواب کا لغوی فرق، اگرچہ عربی زبان کی وسعت پذیری اور لغت کے ارتقاء کے نتیجہ میں ان دونوں بابوں کے اصلی و وضعی معنوں میں اس قدر تصرف عمل میں آیا ہے کہ اب ان کے دفعی و تدریجی حوالوں سے ہٹ کر نئے معانی قرار پائے ہیں مثلاً اِحسان (باب اِفعال) اور تحسین (باب تفعیل)، اِصداق و تصدیق، اِمداد و تمدید، اِفراط و تفریط وغیرہ، تو ان کے استعمالی موارد کی خصوصیات کے پیش نظر نئے معانی پیدا ہو گئے ہیں کہ رفتہ رفتہ اور بار بار استعمال ہونے کی وجہ سے اب یہ الفاظ انہی معانی میں استعمال ہوتے ہیں، احسان کا معنی نیکی کرنا جبکہ تحسین کا معنی کسی کے نیک کام کو سراہنا، اِصداق کا معنی حق مہر دینا اور تصدیق کا معنیٰ کسی کی بات یا عمل کو درست قرار دینا، اِمداد کسی کی مدد کرنا جبکہ تمدید مقررہ مدت میں اضافہ کرنا، اِفراط حد سے بڑھنا جبکہ تفریط حد سے کم کرنا قرار پایا ہے، اس تبدیلی کی اصل وجہ یہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ اصلی و وضعی معانی کی روشنی میں استعمالی مواد کی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان معانی کا تعین ہو کہ اب جہاں بھی یہ الفاظ استعمال میں آتے ہیں وہاں یہی معانی مقصود و ملحوظ قرار پاتے ہیں۔

ان مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ'' میں اِکمال اور اِتمام کے معانی کے پیش نظر یہ مُراد لیا جا سکتا ہے کہ دین معارف و احکام شرعی کے مجموعہ کا نام ہے کہ جس میں ''آج'' بعض چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور ''نعمت'' خواہ جو بھی ہو اس سے مُراد ایک ہی چیز ہے جو کہ ناقص و بے اثر تھی کہ ''آج'' اسے پورا کر دیا گیا ہے اور اس کی اثر گزاری یقینی ہو گئی ہے۔

اور لفظ ''نعمۃ'' (فعلۃ) کے وزن پر، کسی چیز کی طبع وجودی سے موزونیت کی حامل شے کو کہا جاتا ہے کہ جس سے وہ چیز امتناع نہ کرے، اور جہاں تک عالم وجود میں پائی جانے والی اشیاء کا تعلق ہے تو وہ سب ایک ہی سلسلہ تدبیر و نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے باہمی ارتباط و وابستگی رکھتی ہیں ایک دوسرے سے موزونیت و ہمرنگی کی حامل ہیں لہٰذا وہ سب یا اکثر ایک دوسرے سے وابستگی کی بناء پر نعمتیں کہلاتی ہیں چنانچہ اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

O سورۂ ابراھیم، آیت: ۳۴

''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا''

(اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو ان کا احصاء نہیں کر سکتے)

○ سورۂ لقمان، آیت: ۲۰

''وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً''

(اور اس نے تمہیں اپنی نعمتیں فراوان کر دیں ظاہری اور باطنی)

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو برے اُوصاف کا حامل قرار دیا مثلاً شر، پست، لہو ولعب اور اس طرح مذموم عناوین۔

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۷۸

''وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ''

(اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے جو کچھ انہیں رزق وسیع عطا کیا ہے وہ ان کے لئے خیر و بہتر ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ وہ جتنا زیادہ گناہ کرنا چاہتے ہیں کرلیں کہ ان کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر ہے)

○ سورۂ عنکبوت، آیت: ۶۴

''وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ''

(اور یہ دنیا کچھ نہیں سوائے لہو ولعب کے اور آخرت کا ٹھکانہ ہی اصل زندگی ہے)

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۷-۱۹۶

''لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ''

(کفار کا اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا آپ کو حیران نہ کرے کیونکہ یہ متاعِ قلیل ہے پھر ان کی منزل دوزخ ہے جو کہ نہایت برا ٹھکانہ ہے)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ اشیاء کہ جو ان آیات میں ذکر کی گئی ہیں اس صورت میں ''نعمت'' کہلائیں گی جب وہ اس غرض و مقصد سے مطابقت رکھتی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق میں انسان کے لئے مقرر فرمایا ہو، کیونکہ ان اشیاء و موجودات کی تخلیق اس لئے ہوئی کہ وہ انسان کے لئے مددگار ثابت ہوں اور انسان ان سے استفادہ کر کے اپنی حقیقی سعادت مندی کو یقینی بنا سکے، اور حقیقی سعادت اللہ تعالیٰ کی عبودیت و بندگی اور اس کی ربوبیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس کا قرب حاصل کرنا ہے چنانچہ خداوند عالم نے فرمایا:

○ سورۂ الذاریات، آیت: ۵۶

''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ''

(اور میں نے پیدا نہیں کیا جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں)

بنابرایں جس چیز میں بھی انسان تصرف کرے اور اسے اس مقصد کیلئے استعمال میں لائے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرے اور اس کی رضا و خوشنودی سے بہرہ ور ہو وہ اس کے لئے نعمت ہوگی، اور اس کے برعکس صورت میں اگر وہی چیز اللہ سے دُوری کا سبب بنے اور اس کی ناراضگی و معصیت کا موجب قرار پائے تو وہ نعمت کی بجائے نقمت ہوگی۔ اس سے ثابت ہوا کہ موجودات عالم سب کی سب اپنی حیثیت میں نہ نعمت ہیں نہ نقمت، ان کا نعمت یا نقمت ہونا انسان کی اپنی عملداری کے نتیجہ میں معین ہوتا ہے کہ اگر ان کے استعمال میں رُوح عبودیت شامل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت و حاکمیت کے سایہ میں اسی نظام و آئین کے عین مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اُمور کی بابت قرار دیا ہے تو وہ نعمت ہوگا اور اس صورت میں اصل نعمت، ولایت الٰہیہ قرار پائے گی کہ جس کی وجہ سے کوئی چیز ''نعمت'' کی صفت سے متصف ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۷

''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ''

(اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو مؤمن ہیں، وہ اُنہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے)

○ سورۂ محمد، آیت ۱۱

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ''

(یہ اس لئے ہے کہ اللہ مولا ہے اُن لوگوں کا جو مؤمن ہیں اور یہ کہ کافروں کا مولا کوئی نہیں)

○ سورۂ نساء، آیت: ۶۵

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا''

(پس، تیرے رب کی قسم! وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہ آپ کو اپنے اختلافات میں فیصل قرار نہ دیں کہ پھر آپ کے کئے ہوئے فیصلہ کی بابت اپنے دلوں میں کوئی ناگواری نہ لائیں، اور اس طرح سر تسلیم خم کر دیں جیسے سر تسلیم خم کرنے کا حق ہے)

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا مطالب کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

بنابرایں اسلام اس حوالہ سے دین ہے کہ وہ ان احکام و دستورات کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس لئے نازل فرمائے کہ اس کے بندے ان احکام کی پیروی کے ساتھ اس کی عبادت و بندگی بجالائیں، اور چونکہ اسلام عملی حوالہ سے اللہ کی ولایت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آئمہ اطہارؑ کی ولایت پر مشتمل ہے لہٰذا ''نعمت'' ہے۔

اور یہ مطلب نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ولایت یعنی دین کے ذریعے اپنے بندوں کے اُمور کی تدبیر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کے بغیر مکمل نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد معصوم اولی الامر کی

ولایت کے بغیر نا تمام ہے، اور ان کی ولایت سے مُراد ان کا اُمت کے دینی اُمور کی اللہ کے اذن کے ساتھ تدبیر کرنا ہے اسی حوالہ سے ارشاد ہوا:

○ سورۂ نساء، آیت:۵۹

''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ''

(اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی جو تم سے ہیں)

اس آیت کے معنی کی بابت تفصیلی مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

○ سورۂ مائدہ، آیت:۵۵

''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ''

(یقیناً تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات ادا کرتے ہیں)

اس آیت کی تفسیر میں مربوطہ مطالب عنقریب ذکر کئے جائیں گے۔ خلاصہ سخن یہ کہ آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ آج وہ دن ہے جب کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں کیونکہ آج میں نے ان تمام دینی حقائق و معارف کہ جو میں نے تم پر نازل کئے انہیں ولایت کے ذریعے مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت جو کہ ولایت یعنی دینی امور کی سرپرستی اور ان کی خُدائی تدبر کے ساتھ انجام دہی کا عمل ہے اور وہ عمل آج کے دن تک اللہ اور اس کے رسول کی ولایت کے ساتھ جاری تھا یعنی جب تک وحی کا سلسلہ جاری رہا وہ عمل قائم رہا لیکن سلسلہ وحی کے منقطع ہونے کے بعد یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ اب رسول ہی باقی نہیں تو دین کا نظام کیونکر چل سکتا ہے لہٰذا اب ضروری ولازمی ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام کو جاری رکھنے کے لئے کوئی شخصیت معین و متعین ہو اور وہ ولی الامر ہی ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین واُمت کے امور کا ذمہ دار اور ان کی صحیح انجام دہی پر نگران ہے۔

بنابرایں ولایت ایک نظام کا نام ہے جو'' آج'' تک ناقص تھا اسے کمالیت حاصل نہیں تھی اور اب اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اس نظام کے ذمہ دار'' ولی الامر'' کا تعین ہو گیا تو سلسلہ ہدایت و نظام ولایت کامل ہو گیا۔ اور جب اللہ کی طرف سے ولی الامر کے تعین کے ساتھ دین مکمل ہو گیا اور نعمت ولایت تمام ہو گئی ہے تو میں نے تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا (رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) کہ جو توحیدی دین ہے کہ جس میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں اور اس میں کسی کی اطاعت نہیں ہو سکتی سوائے خدا اور اس کے کہ جس کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ خود دے یعنی رسول اور اولی الامر، ان مطالب کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آیہ مبارکہ اعلان کر رہی

ہے کہ مؤمنین آج امن وامان کی دولت سے مالا مال ہیں اور انہیں سابقہ خوف لاحق نہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس بات پر راضی ہوا کہ وہ اسلام کو اپنا دین قرار دیں جو کہ توحیدی دین ہے لہٰذا ان پر لازم ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کی اطاعت میں کسی کو شریک قرار نہ دیں سوائے اس کے کہ جسے اللہ نے خود اپنی اطاعت میں شریک کیا ہے یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولی الامرؑ۔

چنانچہ آپ قارئین کرام! اگر سورۂ نور کی آیت: ۵۵۔ ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' (اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں کہ اُنہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے مؤمنین کو عطا کی تھی، اور وہ ان کے لئے ان کے اس دین کو استوار و پائداری عطا کرے گا جسے اس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو امن میں تبدیل کردے گا کہ وہ میری ہی عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں اور جو شخص اس کے باوجود کفر اختیار کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں) کو زیر نظر آیت کے الفاظ: ''اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ'' سے مطابقت کر کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سورۂ مائدہ کی یہ آیت، اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی عملی تصویر اور ایک واضح مصداق ہے کہ جس کا ذکر سورۂ نور کی مذکورہ بالا آیت میں ہوا ہے اور وہ یوں کہ جملہ ''يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا'' اصل مقصد وغرض کے بیان پر مشتمل ہے جیسا کہ جملہ ''وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' بھی اسی طرح پر ہے یعنی اصل غرض وغایت کو بیان کرتا ہے۔

اور یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ سورۂ نُور، سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہوا چنانچہ اس کا ثبوت اس میں مذکور واقعہ افك (حضرت عائشہ پر بدکاری کی تہمت کا واقعہ) اور بدکاری کے مرتکب افراد کو کوڑوں کی سزا والی آیت اور حجاب والی آیت اور اس طرح کی دیگر آیات ہیں۔

اضطرار کی حالت میں!

''فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''

(پس جو شخص مضطر و مجبور ہو جائے بھوک کی وجہ سے، کہ جان بوجھ کر گناہ کا مرتکب نہ ہو تو اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے)۔

''مَخْمَصَةٍ'' کا معنی سخت بھوک ہے، اور ''تجانف'' (جؔ کے ساتھ) کا معنی جھکاؤ ہے جبکہ ''تحانف'' (حؔ کے

ساتھ) کا معنی بھی جھکاؤ ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ جؔ کے ساتھ ''تجانف'' کا معنی دونوں قدموں کا باہر آگے کی طرف بڑھنا اور حؔ کے ساتھ ''تحانف'' کا معنیٰ دونوں قدموں کا اندر یعنی پیچھے کی طرف جانا ہے، اس بناء پر ''غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ'' کا معنی یہ ہوگا کہ وہ بھوک کی شدت کی وجہ سے گناہ کی طرف بڑھنے والا نہ ہو، آیت کا سیاق تین اُمور پر دلالت کرتا ہے:

۱۔ یہ حکم، ثانوی واضطراری ہے۔

۲۔ جواز واباحت پر مبنی حکم اسی مقدار کھانے سے مشروط ہے جس سے اضطراری کیفیت ختم ہو اور بھوک کی تکلیف دور ہو جائے۔

۳۔ خداوند عالم کی دو صفتیں: مغفرت ورحمت جس طرح عذاب وعقاب کے موجب گناہوں میں ان کے محو کر دیئے جانے کا سبب بنتی ہیں اسی طرح ان کے اصل سبب سے بھی گہرا ربط رکھتی ہیں جو کہ عبارت ہے اُس حکم سے کہ جس کی خلاف ورزی، معصیت کہلاتی ہے کہ جو عقاب کی وجہ قرار پاتی ہے۔

ایک علمی بحث

اس علمی بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) گوشت خوری کے بارے میں عقائد وآراء

(۲) جانور کو ذبح کرنے کا جواز؟ جبکہ یہ عمل رحم ورأفت کے منافی ہے۔

(۳) تذکیہ کا فلسفہ کیا ہے؟

پہلی فصل: گوشت خوری کے بارے میں مختلف عقائد ونظریات!

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ انسان دیگر حیوانات اور نباتات کی طرح کھانے پینے کے جسمانی اعضاء کا حامل ہے کہ جو مادی اشیاء کو اپنے اندر جذب کر کے اسی حد تک اسے اپنا لیتے ہیں جس سے ان اشیاء کو اپنے وجود کا حصہ بنا سکیں کہ جس سے وجود کی بقاء کا ساماں ہو سکے، لہٰذا وہ ہر قابل ہضم اور نگلی جانے والی چیز کو کھا لیتا ہے سوائے ان غذاؤں کے کہ جو جسم کے لئے نقصان دہ ہوں یا طبع الوجود اُن سے نفرت کرتی ہو۔

جہاں تک اشیاء کے ضرر رساں ونقصان دہ ہونے کا تعلق ہے تو وہ یوں ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز اس

کے جسم کے لئے نقصان دہ ہے کیونکہ اس میں مسمومیت پائی جاتی ہے۔ اس کی تاثیر میں زہریلا پن ہے اس صورت میں انسان اسے کھانے سے اجتناب کرتا ہے یا یہ کہ اسے معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز معنوی و روحانی طور پر اس کے لئے مضر و نقصان دہ ہے مثلاً وہ چیزیں جو مختلف ادیان و مذاہب میں حرام قرار دی گئی ہیں تو اس طرح کی چیزوں سے اجتناب برتنا اور ان کے کھانے سے پرہیز کرنا طبعی نہیں بلکہ فکری و اعتقادی ہے۔ اور جہاں تک طبیعت کا ان اشیاء سے نفرت کرنے کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ بعض اشیاء ایسی ہیں جن کے قریب جانا بھی طبیعت پر ناگوار ہوتا ہے مثلاً انسان اپنے پاخانہ سے طبعی طور پر احساس نفرت کرتا ہے اور اسے کھانے سے اجتناب کی وجہ اس کا گندا و غلیظ ہونا ہے لہٰذا کوئی انسان یا حیوان اپنا پاخانہ نہیں کھاتا، البتہ اس کا مشاہدہ بعض بچوں اور دیوانوں میں ہوا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں لیکن طبع سلیم رکھنے والا انسان ہرگز ایسا نہیں کرتا اور اس کی دیگر مثالیں ان اشیاء کے حوالہ سے سامنے آتی ہیں جو دیگر عوامل کی بناء پر تحقق پذیر ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ مختلف معاشروں میں مختلف عادات و طرز ہائے عمل رائج ہونے یا مذہب کے اصولوں و دستورات کی وجہ سے بعض اشیاء سے اجتناب برتا جاتا ہے جیسا کہ اہل اسلام، خنزیر کا گوشت کھانے سے نفرت کرتے ہیں جبکہ عیسائی حضرات اسے پسندیدہ و پاکیزہ غذا قرار دیتے ہیں۔ تو اس طرح کی اشیاء میں اصل وجہ طبیعت کی بجائے مذہب و دیگر عوامل کی کارگزاری ہوتی ہے، اسی طرح مغرب کے باسی بعض چیزوں کو روزمرہ کی عام غذاؤں میں شمار کرتے ہیں جبکہ مشرق کے باسی ان سے نفرت کرتے ہیں مثلاً کیکڑا، مینڈک، چوہا وغیرہ، تو اس طرح کی چیزوں سے نفرت کرنا اور ان سے اجتناب برتنا طبع ثانوی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور طبع الوجود سے باہر کے عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بنابرایں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ انسان گوشت خوری میں مختلف طریقے اپناتا ہے اور گوناگوں معیاروں و اصولوں کو اپناتا ہے کہ جو ایک وسیع و عریض سلسلہ ہے جس میں ہر طرح کی آزادی اور کامل ممنوعیت دونوں شامل ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جسے جائز و مباح قرار دیتا ہے اس میں اس کی پسندیدگی شامل ہوتی ہے اور جس سے اجتناب کرتا ہے اس میں یا تو اس کا عقیدہ و نظریہ کارفرما ہوتا ہے یا اس کی طبع ثانوی اس کی متقاضی ہے۔

اور اگر گوشت خوری کی بابت افراط و تفریط پائی جاتی ہے کہ ایک طبقہ اسے سرے ہی سے ناجائز و نادرست قرار دیتا ہے جیسا کہ آئین بودائی میں ہر طرح کا گوشت کھانا حرام ہے تو یہ تفریطی پہلو ہے کہ اس کے مقابل میں افراطی پہلو یہ ہے کہ افریقی وحشی گروہ اور ان جیسے دیگر لوگ زمانہ قدیم میں ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے یہاں تک کہ انسان کا گوشت کھانا بھی ان کا معمول تھا اور وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ عرب اقوام کے ہاں ہر حیوان کا گوشت کھانا معمول تھا یہاں تک کہ وہ چوہے اور چھپکلیاں بھی کھاتے تھے اور ہر حیوان کو کھا لیتے تھے خواہ اسے جس طرح ذبح کیا گیا ہو یا اسے مارا گیا ہو، یعنی اسے شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہو یا اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو بلکہ مُردار اور اس طرح کے دیگر

حیوانات کو بھی کھاتے تھے کہ جن کے بارے میں آیہ مبارکہ میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: منخنقۃ، موقوذۃ، متردیۃ، نطیحۃ اور درندہ جسے کھالے، اوران حیوانات کو کھانے کا جواز پیش کرتے ہوئے اُن میں سے بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ کیا منطق ہے کہ تم جسے قتل کرو وہ حلال اور جسے خُدا ماردے (مُردار) وہ حرام ہے؟ چنانچہ اسی طرح کی باتیں آج بھی کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ گوشت، گوشت ہے کہ اگر کوئی گوشت ایسا ہو کہ جو انسانی جسم کیلئے نقصان دہ نہ ہو اسے کھایا جاسکتا ہے اور اگر نقصان دہ بھی ہو مگر اس کا نقصان دہ ہونا طبی علاج کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہو یعنی کوئی دواوغیرہ کے ذریعے تو اسے بھی کھایا جاسکتا ہے لہٰذا صرف وہی گوشت حرام ہوگا جسے جسم کا نظام غذا قبول نہ کرے۔ یعنی وہ غذائی نظام سے متصادم ہو ورنہ ہر طرح کا گوشت یکساں حیثیت رکھتا ہے!

اس کے علاوہ عربوں کے ہاں خون کھانا بھی مرسوم تھا اور وہ خون کو چربی کے ساتھ مخلوط کر کے اس سے کباب بناتے تھے اور خود بھی کھاتے اور اپنے مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان یہ رسم بھی تھی کہ وہ قحط سالی اور غذائی بحران میں اپنے اُونٹوں کے پیٹ میں تیز دھار آلہ سے سوراخ کر کے اس سے خون نکالتے اور اسے پیتے تھے، یہ رسمیں صرف قدیم دور میں ہی نہیں بلکہ عصر حاضر میں بھی متعدد غیر مسلم اقوام میں رائج ہیں اور چین کے بت پرستوں کے ہاں اس سے بھی وسیع تر رسومات ہیں چنانچہ اُن کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ کتے اور بلی سمیت ہر طرح کے حیوانات کھاتے ہیں یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے اور تمام حشرات کھانے سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔

لیکن اسلام نے ان افراطی وتفریطی طریقوں وطرز ہائے عمل اور رسومات سے قطع نظر ایک درمیانی راستہ اختیار کیا اور اسی گوشت کو مباح وحلال قرار دیا جسے معتدل طبع انسانی پسند کرے اور پاکیزہ واچھا سمجھے، پھر اس کی تفسیر و وضاحت میں چوپایوں میں سے بکری، بھیڑ، گائے اور اُونٹ جیسے جانوروں کا گوشت کھانا حلال قرار دیا جبکہ گھوڑے اور گدھے کا گوشت مکروہ قرار دیا اور پرندوں میں گوشت خور پرندوں کے علاوہ پوٹا والے پرندے، پر پھڑ پھڑانے والے پرندے کہ جن کے چنگل نہ ہوں وہ حلال ہیں اور دریائی جانوروں میں سے چھلکے دار مچھلیاں حلال ہیں ان سب کی تفصیلات فقہی کتب میں مذکور ہیں۔

پھر اسلام نے ان جانوروں کا خون حرام قرار دیا اور ان میں سے مُردار کو، کہ جو خود مر گیا ہو اور جسے اللہ کے علاوہ کسی کے لئے ذبح کیا گیا ہو حرام کیا ہے۔ اوران چیزوں کے حرام کئے جانے میں اصل غرض ومقصود فطرت سلیمہ کے تقاضوں کی تکمیل ہے کیونکہ انسان کی فطری طبع، گوشت خوری کی طرف رغبت ومیلان رکھتی ہے اور اس عقیدۂ صحیح وطبع سلیم کے عملی احترام کو ضروری قرار دیتی ہے جو ہر نقصان دہ چیز کے استعمال اور ان اشیاء سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے ہیں جن سے طبع بشری نفرت کرتی ہو اور ناگوار قرار دے۔

دوسری فصل: اسلام میں جانور کو ذبح کرنے کا جواز کیوں؟

عین ممکن ہے کہ یہ سوال کسی کے ذہن میں پیدا ہو کہ حیوان بھی ان ہی کی طرح روح رکھتا ہے کہ جسے بدن پر آنے والی ہر تکلیف محسوس ہوتی ہے اور وہ انسان ہی کی طرح موت کی تلخی سے گھبراتا ہے اور اپنے آپ سے محبت کا جو احساس وجذبہ ہمیں ہر ناپسندیدہ امر سے بچنے اور ہر تکلیف اور موت میں جانے سے اپنے آپ کو بچانے کی راہ دکھاتا ہے وہی جذبہ واحساس ہمیں دوسرے ہمنوع افراد کے بارے میں بھی اسی طرزِ عمل کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے کہ ہم ان کی بابت تکلیفوں اور مرنے کے حوالے سے خود اپنی طرح سوچیں کیونکہ جو چیز ہمیں ناگوار وتکلیف دہ ہے وہی ان کے لئے بھی تکلیف کا باعث ہے اور جس چیز کو ہماری طبع الوجود ناپسند کرتی ہے ان کی طبع الوجود بھی اسے ناپسند کرتی ہے اور وہ اس لئے کہ سب کے نفوس کی حقیقت یکساں ہے۔

یہی قاعدہ واصول دیگر انواع حیوانات میں بھی نافذ العمل ہے تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ہم انہیں اس تکلیف میں مبتلا کریں جس سے ہم خود اذیت کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کی مٹھاس کو موت کی تلخی میں بدل دیں اور انہیں بقاء کی نعمت سے کہ جو ہر نعمت سے برتر ہے محروم کر دیں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے تو اس نے کیونکر حیوانوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا کہ ان کے گوشت کھانے سے انسان لطف اندوز ہو حالانکہ وہ سب یعنی انسان اور حیوانات اللہ کی مخلوق ہونے میں برابر ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے حقائق واسرار کا موازنہ ظاہری احساسات وجذبات سے نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام ودستورات میں حقیقی مصلحتوں اور اعلیٰ ترین مقاصد کو ملحوظ رکھا ہے نہ کہ خیالی احساسات وجذبات کو!

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اگر آپ ان موجودات کا حتی المقدور جائزہ لیں جو عموماً آپ کے مشاہدہ میں آتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی وجودی تخلیق وتکوین اور بقاء تحول وتبدل کے نظام سے وابستہ بلکہ اس کے تابع ہے، لہٰذا موجودات عالم امکان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس میں اس نظام سے الگ حیثیت پائی جاتی ہو، اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہوتا اور مکھیاں، مچھر، کھٹمل وغیرہ انسان اور دیگر حیوانات کے خون سے اپنی غذا کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور پھر زمین ان سب کو کھا جاتی ہے اور اپنا لقمۂ وجود بنا لیتی ہے۔

بنابرایں تکوین وتخلیق کا نظام کہ جسے تمام موجودات عالم ہستی پر علی الاطلاق اور ہر طرح کی قید وشرط سے خالی حکومت حاصل ہے اسی نے غذائی سلسلہ میں گوشت خوری اور خورد ونوش کے اصول وضع کئے ہیں جن کی بنیاد پر کوئی چیز گھاس کھاتی ہے اور کوئی چیز گوشت کھاتی ہے اور ہر شے اسی نظام کی پیروی میں اپنی وجودی وبقائی احتیاجات کو دور کرتی ہے اور اسی کارخانہ تخلیق نے انسان کے وجود میں ایک صالح ونہایت منظم وصحیح تغذیاتی سلسلہ قرار دیا اور اسے ایسے قدرتی آلات عطا کر دیئے جن کے ذریعے وہ تمام حیوانات ونباتات سے اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرسکتا ہے، چنانچہ ان جسمانی آلات میں

سب سے مقدم دانتوں کا ایک منظم و پیوستہ سلسلہ ہے جس کے ذریعے انسان ہر شے کو کاٹنے، توڑنے، نوچنے اور پیسنے کا کام لیتا ہے کہ جو ''ثنایا''، ''رباعیات''، ''انیاب'' اور ''طواحن'' کہلاتے ہیں۔ (ثنایا یعنی سامنے والے اُوپر نیچے کے دو دو دانت، رباعیات یعنی سامنے کے چار دانت، انیاب یعنی بڑے بڑے دانت اور طواحن یعنی پیسنے والے دانت) اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انسان گائے اور بکری جیسا نہیں کہ جو کاٹنے و نوچنے کے آلات سے محروم ہیں اور نہ ہی درندوں جیسا ہے کہ جو پیسنے اور چبانے کی طاقت نہیں رکھتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان صرف گوشت خور نہیں بلکہ نباتات و سبزیاں بھی کھاتا ہے۔

پھر قوت ذائقہ کو دیکھیں کہ جو انسان کے منہ میں گوشت کی لذت محسوس کرنے اور اس کے اچھی یا بُری ہونے کی تشخیص کے لئے قرار دی گئی ہے، پھر قوت ہاضمہ کو دیکھیں کہ جس میں ہر گوشت کو ہضم کرنے کی صلاحیت واشتہاء موجود ہے اور وہ ایسا ہی کرتی ہے یعنی ہر قسم کے گوشت کو ہضم کر لیتی ہے تو یہ سب کچھ تکوینی ہدایت سے ہوتا ہے اور سرچشمہ خلقت کی طرف سے ملنے والی رہنمائی کے ساتھ انجام پاتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ تکوینی ہدایت اور اس کی عملداری و عمل پیرائی کے درمیان فرق و جدائی پائی جائے یعنی ان سب میں سے ایک کو تسلیم کریں جبکہ دوسری کا انکار کریں؟

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ دین فطرت ہے اور اس کا مقصد و کوشش اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان فطری آثار کو زندہ رکھا جائے جن پر انسان نے جہالت کے پردے ڈال دیئے ہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ اسلام ان چیزوں کے مُباح و حلال ہونے کا حکم دے کہ تکوین و تخلیق اور فطرت جن کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور ان کے مباح و حلال ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔

اور اسلام اپنے دستورات میں جس طرح مذکورہ بالا فطری فیصلہ کا احیاء کرتا ہے اسی طرح ان دیگر احکام کو بھی زندہ کرتا ہے جو سرچشمہ تکوین نے تدوین و صادر فرمائے ہیں کہ جن کی بابت سابق الذکر مطالب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے غذائی سلسلہ میں کھلی چھٹی نہیں دی بلکہ اس کے قواعد و ضوابط اور اصول مقرر کئے ہیں کہ جن کی بابت عقل بھی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ ہر اس گوشت کھانے سے اجتناب برتا جائے جو انسان کے لئے مادی و جسمانی یا معنوی و روحانی طور پر نقصان دہ ہو اسی طرح احساسات و جذبات اور باطنی عواطف بھی اسی کے متقاضی ہیں کہ جو چیزیں طبع سلیم کو ناگوار ہوں اور وہ ان سے نفرت کرتی ہو ان سے دوری اختیار کی جائے اور یہ دونوں تقاضے و فیصلے یعنی عقل و طبع کے احکام کا منتہا بھی اصولی طور پر تکوین و تخلیق ہی سے وابستہ ہے کہ اسلام نے ان دونوں کے احکام و فیصلوں کو قانونی حیثیت دے کر ان چیزوں کو حرام قرار دیا جو انسانی جسم کی نشو و نما اور صحت و سلامتی کے لئے مضر اور ان چیزوں کو بھی حرام و ممنوع قرار دیا جو انسانی معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہیں مثلاً وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جائیں اور جو جوئے اور تیروں کے مخصوص طریقے سے ہاتھ آئیں، اسی طرح ہر اس گوشت اور دیگر اشیاء کو حرام قرار دیا جن سے طبع انسانی نفرت کرتی ہے اور وہ اسے ناگوار ہیں۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسلام رحمت و رأفت کا دین ہے اور رحمت و رأفت جانوروں کو ذبح کرنے سے مانع ہے یعنی ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام رحمت والا دین ہے اور دوسری طرف بے زبان جانوروں کو ذبح کرنا جائز و مباح قرار دیا جاتا ہے یہ کس طرح قابل تاویل ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ رحم و رحمت ایک پاکیزہ تکوینی عطیہ ہے جو انسان اور متعدد حیوانات کہ جن کے بارے میں ہم آگاہی حاصل کر چکے ہیں ان میں فطرتاً قرار دی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ سرچشمہ تخلیق نے اسے مطلق اور کسی اصول و ضابطہ کے بغیر واجب الاطاعت قرار دے دیا ہو، چنانچہ سلسلہ تکوین و تخلیق ایسا نہیں کہ اس میں رحمت کا استعمال علی الاطلاق اور ہر طرح کے ضابطہ و اصول سے مُبرا ہو کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں درد و الم اور بیماریوں و مصائب اور طرح طرح کی تکلیفوں کا نام و نشان ہی نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ رحمت، انسانی وجود میں عدل کی طرح نہیں کہ جسے ہر حال میں فضیلت قرار دیا جائے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہم کسی ظالم کو اس کے ظلم کی سزا نہ دے سکتے یا کسی مجرم کو اس کے جرم پر مؤاخذہ نہ کر سکتے اور نہ ہی کسی زیادتی کرنے والے شخص کی زیادتی پر اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے میں حق بجانب ہوتے جبکہ ظالم کو اس کے ظلم پر سزا نہ دینا، مجرم کو اس کے کئے پر مؤاخذہ نہ کرنا اور زیادتی کرنے والے شخص کا مقابلہ کرنے کو ترک کرنا دنیا کی تباہی اور بنی نوع انسان ہی نہیں بلکہ روئے زمین کی تمام موجودات کی ہلاکت و نابودی کا باعث ہے۔

اس کے باوجود اسلام نے رحمت کو ایک تخلیقی عطیہ ہونے کے حوالہ سے مہمل قرار نہیں دیا بلکہ رحمت کے وسیع تر پھیلاؤ کا حکم دیا اور حیوان کو ذبح کرنے میں اس پر تشدد سے منع کیا ہے اور ذبح کئے جانے والے حیوان کے اعضاء کو اس کی رُوح نکلنے سے پہلے قطع کرنے کو ممنوع قرار دیا۔ چنانچہ منخنقہ اور موقوذہ کے احکام بھی اسی باب سے ہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اسلام نے کسی حیوان کو دوسرے حیوان کے سامنے ذبح کرنے سے بھی منع کیا ہے اور ذبح کئے جانے والے حیوان کے بارے میں نہایت نرمی اور رأفت پر مبنی احکام صادر فرمائے جن میں ذبح کرنے سے پہلے اسے پانی پلانا وغیرہ شامل ہیں کہ جن کی تفصیلات فقہی کتب میں مذکورہ ہیں۔

ان تمام اُمور کے باوجود یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ اسلام عقل و ہوشمندی کا دین ہے احساسات کا دین نہیں چنانچہ کسی بھی اسلامی دستور و فرمان میں احساسات کو عقل و ہوشمندی پر تقدم و فوقیت نہیں دی گئی بلکہ احساسات و عواطف کو عقلیات کے تابع کیا اور انسانی معاشرہ کے عمومی نظام کی بہتری و استحکام کے لئے احساسات کی بابت انہی امور کو اہمیت دی جن کی تائید و تصدیق عقل سے ہوتی ہو۔ گویا ان سب میں عقل ہی کی پیروی اصل و اساس ہے کہ سب کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے۔

اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ و مطلقہ کا تعلق ہے اور یہ کہ وہ ارحم الراحمین ہے تو اس نے حیوانات کو ذبح

کرنے کی اجازت کیونکر دی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مُراد نرم دلی و رحم دلی نہیں یا احساسات کی مخصوص کیفیت کا نام نہیں کہ جو رحم کرنے والے کے دل میں رحم کئے جانے والے شخص کی بابت ہوتی ہے کیونکہ اس طرح کی صفت جسمانی و مادی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی مادی و جسمانی صفات و کیفیات سے مبرا و منزہ اور بالاتر ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رحمت کے مستحق فرد کو اس کے استحقاق و حیثیت کے مطابق خیر سے نوازتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہم جس چیز کو عذاب سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہوتی ہے اور اسی طرح اس کے برعکس کہ ہم جسے رحمت تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ کا عذاب ہوتا ہے۔

بنابرایں یہ بات حکمت کے منافی ہے کہ شریعت کے احکام انسانی وجود میں پائے جانے والے جھوٹے جذبات و احساسات کے تابع قرار پائیں اور ان کی وجہ سے نظام ہستی کی عظیم مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا یہ کہ شرعی احکام کی حقائق سے منافی بنیادوں پر تدوین کی جائے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ مطلب واضح و آشکار ہوا کہ اسلام نے حیوانات کے حوالہ سے ان کے گوشت کھانے کو جائز و مباح قرار دینے میں فطرت کو بنیاد قرار دیا اور اس کے تقاضوں و فیصلوں کو ملحوظ رکھا، یعنی وہ فطرت کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی تخلیق فرمائی چنانچہ ارشاد ہوا: ''فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ''۔

تیسری فصل: حیوان کے تذکیہ کا ضروری ہونا کیوں ہے؟

یہ سوال سابقہ سوالوں ہی سے مربوط ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ گوشت کھانے کا جائز و مباح ہونا فطرت و خلقت ہی کے اصولوں و تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اسلام چونکہ فطرت کا دین ہے لہٰذا اس نے بھی گوشت خوری کو حلال قرار دیا ہے، البتہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب گوشت خوری حلال و جائز ہے تو اسلام نے اسے تذکیہ سے مشروط کیوں کیا ہے اور جو جانور طبعی موت سے مر جائے اس کا گوشت کیوں حرام قرار دیا ہے؟ کیونکہ اگر تذکیہ ضروری قرار نہ دیا جاتا تو تکوینی اصول اور رحمت دونوں کے تقاضے پورے ہو جاتے اور پھر حیوان کو ذبح کرنے اور اس کے گلے پر چھری پھیرنے کی ضرورت بھی ہوتی!

اس سوال کا جواب دوسری فصل میں مذکورہ مطالب کے تناظر میں واضح ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رحمت سے رحم دلی کا معنیٰ ملحوظ ہو تو اس کا اتباع ضروری نہیں بلکہ اُس کا اتباع حقائق کی پامالی اور حقوق کے ضیاع کا موجب بنتا ہے اور قارئین کرام اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلامی دستورات میں عقل و فطرت پر مبنی ہونے اور احساسات و عواطف کے تابع نہ ہونے کے باوجود ممکنہ حد تک عدل کی پاسداری و عملداری کو یقینی بنایا گیا ہے تاکہ نوع انسانی اس نہایت

لطیف عطیہ الٰہی سے بخوبی استفادہ کر سکے،

اس کے علاوہ یہ بات بھی نا قابل انکار ہے کہ صرف مردہ جانور اور اس طرح کے حیوانات مثلاً بلندی سے نیچے گر کر مرنے والے یا گلا دبانے سے ہلاک ہونے والے جانور ہی مباح وحلال قرار دیئے جاتے تو ان کا کھانا انسانی جسم کیلئے نقصان دہ اور طبع بشری کے سراسر منافی ہونے کے ساتھ ساتھ رحمت سے بھی متصادم ہوتا اور پھر افرادِ بشر اس طرح کے حیوانات ہی کو تلاش کرتے رہتے جو کہ عام طور پر نہایت دشوار ہے اور حرج ومرِج کا باعث ہے۔

روایات پر ایک نظر!

علیؑ: امیر المؤمنین

تفسیر العیاشی میں عکرمہ کے حوالہ سے ابن عباس کی روایت مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: مانزلت آیۃ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" الاوعلی شریفھا و امیرھا، ولقد عاتب اللہ اصحاب محمد (ص) فی غیر مکان و ما ذکر علیاً الا بخیر، قرآن مجید میں جہاں بھی "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کی آیت نازل ہوئی ہے اس میں مؤمنین کے بزرگ اور امیر علیؑ مُراد ہیں، خُداوند عالم نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو متعدد مقامات پر موردِ عتاب ومذمت قرار دیا مگر علیؑ کا ذکر خیر واچھائی کے علاوہ نہیں کیا (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ: ۲۸۹)

اسی روایت کے مانند تفسیر البرھان (جلد اوّل صفحہ: ۴۳۱) میں موفق بن احمد کے حوالہ سے عکرمہ کی روایت میں بھی ابن عباسؓ کا یہی بیان مذکور ہے کہ جو "و امیرھا" تک ہے اور تفسیر العیاشی میں اسی جملہ تک ایک روایت مذکور ہے جو عکرمہ ہی سے منقول ہے یہی حدیث ہم تفسیر "درمنثور" کے حوالہ سے پہلے ذکر کر چکے ہیں، البتہ ایک روایت حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے فرمایا "لیس فی القرآن" یا "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"، الا فی حقنا" کہ قرآن میں جہاں بھی "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" ذکر ہوا ہے وہ ہمارے ہی بارے میں ہے (تفسیر البرھان، جلد اوّل، صفحہ: ۴۳۱) تو اس طرح کی روایات درحقیقت ایک کلی کے ایک مصداق پر منطبق کرنے یا آیات کی باطنی تاویل کے باب سے ہے۔

تفسیر العیاشی ہی میں عبداللہ بن سنان کی روایت مذکور ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا

کہ ''يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' میں وفائے عقد سے کیا مُراد ہے؟ تو امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''اس سے مراد ہر عہد و پیمان ہے'' (مذکورہ بالا حوالہ)

اسی مطلب کو تفسیر قمی میں بھی ذکر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو: تفسیر القمی جلد اوّل صفحہ: ۱۶۰

''بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ'' کا مطلب:

کتاب تہذیب الاحکام میں محمد بن مسلم کی روایت مذکور ہے کہ انہوں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ''اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ'' کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا ''حیوانات کے وہ بچے جو اپنی ماں کے شکم میں ہوں اور پیدا نہ ہوئے ہوں، اگر ان کے بال اُگ آئے ہوں تو ان کا تذکیہ ان کی ماں کے تذکیہ کے ساتھ ہی شمار ہوگا یعنی جب ان کی ماں کو ذبح کیا جائے گا تو وہ بھی حلال قرار دیئے جائیں گے'' بہر حال یہ جملہ خداوند عالم کے مقصود و مُراد کی وسعت کا حامل ہے (تہذیب الاحکام، جلد ۹، ص ۵۸)

یہ روایت کتاب کافی میں اور کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام دونوں کے اسناد سے مذکور ہے اور تفسیر العیاشی میں یہی مطلب محمد بن مسلم کے حوالہ سے دونوں اماموں میں سے ایک کی طرف نسبت کے ساتھ مذکور ہے، اور زرارہ کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔ تفسیر قمی میں بھی اس روایت کو ذکر کیا گیا ہے اور تفسیر ''مجمع البیان'' میں اسے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

شعائر اللہ کے بارے میں حکم:

تفسیر القمی میں آیہ مبارکہ: ''يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ ''شَعَآئِرَ'' سے مُراد احرام، طواف، مقام ابراہیم میں نماز، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور تمام مناسک حج شَعَآئِرَ اللّٰهِ میں سے ہیں اور یہ بھی شَعَآئِرَ میں سے ہے کہ جب کوئی شخص اپنی قربانی اپنے ساتھ لے کر چلے اور اس پر نشان لگا دے یعنی اس کی کوھان یا کھال پر کٹ لگا دے یا اس کے گلے میں کوئی چیز لٹکا دے تا کہ لوگ جان لیں کہ وہ قربانی کا جانور ہے اور کوئی اسے چھیڑ نہ سکے اور شَعَآئِرَ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ ان کی بابت شعور و آگاہی حاصل کریں اور انہیں پہچان سکیں اور ''وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ'' سے مُراد ذی الحج کا

مہینہ ہے جو کہ چار محترم مہینوں میں سے ایک ہے اور ''وَلَا الْهَدْيَ'' میں ''هدی'' سے مُراد وہ قربانی ہے جو حاجی احرام پہن کر اپنے ساتھ لے چلتا ہے اور ''وَلَا الْقَلَائِدَ'' میں قلائد سے مُراد یہ ہے کہ حاجی نے جس جوتے کے ساتھ نماز پڑھی ہوا سے نشانی کے طور پر قربانی کے جانور کے گلے میں لٹکا دے، اور ''وَلَآ آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ'' سے مُراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ کا حج انجام دینے کیلئے آرہے ہوں، (تفسیر القمی، جلد اوّل صفحہ ۱۶۰)

امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان: تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ یہ آیت (يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ) بنی ربیعہ کے ایک شخص جس کا نام ''حطم'' بیان کیا گیا ہے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے لکھا کہ سدّی کا کہنا ہے کہ حطم بن ہند البکری حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے آیا تو اپنی سواری کو مدینہ سے باہر کسی جگہ پر باندھ دیا اور خود تنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن کیا ہے اور کیا دعوت دے رہے ہیں؟ جبکہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو آگاہ کر دیا تھا کہ آج قبیلہ بنی ربیعہ کا ایک شخص تمہارے پاس آئے گا اور شیطان کی زبان میں تم سے بات کرے گا، بہرحال جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سوال کا جواب دے دیا تو اس نے کہا: آپ مجھے مہلت دیں تاکہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلوں، ممکن ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد اسلام قبول کرلوں، یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا: ''وہ کافرانہ منہ کے ساتھ آیا تھا اور دھوکہ باز بن کر واپس چلا گیا''، حطم کو راستے میں مدینہ والوں کا ایک ریوڑ ملا تو وہ اسے اپنے ساتھ ہانکتا ہوا چل پڑا اور یہ رجز پڑھتا جا رہا تھا:

قد لفها الليل بسواق حطم ليس براعي ابل ولا غنم
ولا بجزار على ظهر و ضم باتوا انياماً و ابن هندلم ينم
بات يقا سيها غلام كالزلم خدلج الساقين ممسوح القدم

پھر وہ بعد والے سال حج کے لئے روانہ ہوا اور اس نے نشانی کے طور پر اپنی قربانی کے گلے میں جوتا لٹکا دیا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ اسے اپنے پاس بلائیں تو یہ آیت نازل ہوئی ''وَلَآ آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ''

یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد مؤلف تفسیر مجمع البیان نے لکھا ہے کہ ابن زید کا کہنا ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے دن ان مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بیت اللہ میں پناہ لینا چاہتے تھے جبکہ انہوں نے عمرہ کے بعد احرام اُتار دیا تھا تو مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ لوگ مکہ کے دیگر مشرکوں کی طرح ہیں، آپ اجازت دیں کہ ہم ان پر حملہ کریں، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، (تفسیر مجمع البیان جلد ۳، ص: ۱۵۳)

یہ واقعہ طبری نے سدّی اور عکرمہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور دوسرا واقعہ ابن زید کے حوالہ سے بیان کیا ہے، ملاحظہ

ہو: تفسیر طبری، جلد ۶، ص ۳۸، اور تفسیر ''درمنثور'' میں دوسرے واقعہ کو ابن ابی حاتم کے اسناد سے زید بن اسلم کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اور اس میں مذکور ہے کہ یہ واقعہ حدیبیہ کے دن وقوع پذیر ہوا، ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، ص ۲۵۴، لیکن یہ دونوں واقعے ارباب تحقیق اور مبصرین کے نزدیک مسلم الثبوت مطالب سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ یہ بات مسلم وقطعی ہے کہ سورۂ مائدہ کا نزول حجۃ الوداع میں ہوا لہٰذا اگر دو واقعے قرین صحت ہوں تو لازم آئے گا کہ سورۂ برائت کی آیت ۲۸ (اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا) اور اسی سورہ کی آیت ۵ (فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ) زیر نظر آیت میں جملہ ''وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ'' سے پہلے نازل ہوئی ہوں تو اس صورت میں مشرکوں کو بیت اللہ میں آنے سے روکنے کا جواز ہی باقی نہیں رہے گا، جبکہ یہ درست نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان دو واقعوں یا ان جیسے دیگر واقعات میں پائی جانے والی کوئی بات اس کا سبب بنی ہو کہ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ضحاک سے منسوب یہ بات پیش کی گئی کہ انہوں نے کہا: آیت ''وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ'' سورۂ برائت کی آیتوں (۵ اور ۲۸) کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے اور منسوخ ہونے کا ذکر تفسیر القمی میں بھی ہوا ہے اور اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت ہی کے الفاظ ہیں نہ کہ تفسیر کے مؤلف قمی مرحوم کے اپنے اظہارات!

البتہ ان تمام مطالب کے باوجود سورۂ مائدہ کا سورۂ برائت کے بعد نازل ہونا مذکورہ بالا تمام اقوال وآراء کو نادرست ثابت کرتا ہے اور حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہے کہ سورۂ مائدہ ناسخ ہے منسوخ نہیں چنانچہ آیۂ مبارکہ ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' اس مطلب کا واضح ثبوت ہے کہ اس سورۂ کی آیات کا منسوخ ہونا ناقابل قبول ہے کیونکہ دین کی تکمیل کے بعد بعض آیات کا منسوخ کیا جانا قرین صحت نہیں ہوسکتا، بنا برایں جملہ: ''وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ'' کی تفسیر بعد والے جملہ ''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا'' میں ہوئی ہے، یعنی تم اس لئے انہیں روک کر بیت اللہ کی حرمت کو پامال نہ کرو کہ انہوں نے تمہیں اس سے پہلے وہاں آنے سے روکا تھا اور نہ ہی ان کے علاوہ دیگر لوگوں کو کہ جنہوں نے تمہیں مسجد الحرام میں آنے سے روکا تھا تشدد وزیادتی کا نشانہ بناؤ یا انہیں قتل کرو بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو۔

تفسیر ''درمنثور'' کی تین روایات

(۱) احمد اور عبد بن حمید نے آیہ مبارکہ ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' کی تفسیر میں اور بخاری نے اپنی

تاریخ میں وابصہ کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ وابصہ نے کہا: میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہر نیکی و برائی کے بارے میں پوچھوں اور اس سلسلہ میں کوئی چیز سوال طلب باقی نہ رہے، مگر میں جوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تو چاہے تو میں تجھے بتاؤں کہ تو کیوں میرے پاس آیا ہے اور کیا پوچھنا چاہتا ہے؟ کیا تو خود پوچھے گا یا میں تجھے بتا دوں؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی فرمادیں! تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تو اس لئے میرے پاس آیا ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کے بارے میں مجھ سے سوال کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تین اُنگلیوں کو باہم ملا کر میرے سینہ پر مارتے ہوئے فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھ، اپنے دل سے پوچھ، نیکی وہ ہے جس کی بابت تیرے دل کو اطمینان ہو اور گناہ وہ عمل ہے جو دل میں اضطراب پیدا کرے خواہ لوگ پے در پے اس عمل کو درست کیوں نہ کہیں۔

(۲) احمد اور عبداللہ بن حمید، ابن حبان، طبرانی، حاکم کہ جس نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور بیہقی نے ابوامامہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ ایک شخص نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گناہ کے بارے میں دریافت کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو غلط خیالات تیرے دل میں آئیں وہ گناہ ہیں انہیں ترک کر دو، اس نے عرض کی کہ ایمان دار کسے کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جسے اس کا برا عمل، برا لگے اور اس کا نیک عمل اسے بھلا لگے وہ ایمان والا ہے۔

(۳) ابن ابی شیبہ، احمد، بخاری (کتاب ادب میں)، مسلم، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے کتاب ''الشعب'' میں نواس بن سمعان کے حوالہ سے بیان کیا کہ ایک شخص نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: ''الْبِرِّ'' (نیکی) اور ''(الْاِثْم) سے کیا مُراد ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''برّ'' یعنی نیکی سے مُراد حسن خلق ہے اور ''الْاِثْم'' یعنی گناہ سے مُراد ہر وہ کام ہے جس کا خیال تیرے دل میں پیدا ہو اور اگر اسے انجام دے تو تجھے یہ بات ناگوارِ خاطر ہو کہ لوگ اس سے آگاہ ہوں، یعنی تجھے پسند نہ ہو کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تو نے یہ کام کیا ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۲۵۵)

مذکورہ بالا روایات جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں، سورۂ شمس کی آیت ۸ کا تفسیری بیان ہے کہ جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا'' اسی سے اس معنٰی کی تائید و تصدیق ہوتی ہے جو ''اثم'' کی بابت ذکر ہو چکا ہے۔

تفسیر ''مجمع البیان'' کا حوالہ

تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ مفسرین جملہ: ''وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ'' کے بارے میں اختلاف رائے

رکھتے ہیں، اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جملہ اس جملہ کے ذریعے منسوخ ہو چکا ہے ''اقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ'' بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ یعنی سورۂ مائدہ کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی اور نہ ہی اس آیت کا کوئی فقرہ منسوخ ہوا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لئے روانہ تھا کہ وہ حرمت والے مہینوں میں مشرکوں سے قتال کریں مگر یہ کہ مشرکین قتال شروع کریں، مؤلف نے کہا کہ یہ بات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۳، صفحہ ۱۵۵)

محرمات کا بیان:

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابان بن تغلب کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت امام ابوجعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''میتۃ'' (مردار)، ''دم'' (خون) اور لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ (سؤر کا گوشت) مشہور چیزیں ہیں، اور ''مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ'' سے مُراد ہر وہ جانور ہے جسے بتوں کے لئے، بتوں کے قدموں میں، بتوں کی رضا کیلئے ذبح کیا جائے۔ ''منخنقہ'' یعنی گلا دبا کر مارا ہوا جانور، تو اس حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجوسی ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت نہیں کھاتے تھے جبکہ مُردار کا گوشت کھاتے تھے لہٰذا وہ گائے اور بھیڑ بکری کو گلا دبا کر مار دیتے تھے اور جب وہ گلا دبنے سے مرجاتے تو ان کا گوشت کھاتے تھے، اسی طرح وہ لوگ ''موقوذہ'' کا گوشت کھاتے تھے اور وہ اس طرح کہ جانور کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اتنا مارتے تھے کہ وہ مرجاتا تھا تو اس کا گوشت کھاتے تھے، ''متردیہ'' بھی اسی باب سے اس جانور کو کہتے ہیں جسے بلندی سے نیچے پھینکا جائے چنانچہ مجوس ایسا کرتے تھے کہ حیوان کو بلندی سے نیچے پھینکتے تھے اور جب وہ مرجاتا تو اس کا گوشت کھاتے تھے۔ ''نطیحہ'' اس جانور کو کہتے ہیں جو دوسرے جانور کے حملہ میں مارا جائے چنانچہ مجوس کے ہاں رسم تھی کہ وہ دو جانوروں کو آپس میں لڑاتے تھے اور ان میں سے جو مرجاتا تھا اس کا گوشت کھاتے تھے اور ''مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ'' یعنی وہ جانور جو درندوں مثلاً بھیڑیا، شیر اور ریچھ وغیرہ کے کاٹنے وکھانے سے مرجائے کہ مجوس اسے بھی کھاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو حرام قرار دیا، اور ''مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' یعنی بتوں پر ذبح کئے گئے جانور تو مشرکین کے ہاں رسم تھی کہ وہ بتوں کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے اور قریش چونکہ درختوں اور پتھروں کی پوجا کرتے تھے لہٰذا وہ ان کے لئے جانور قربانی کرتے تھے، کہ اللہ نے ان جانوروں کا گوشت کھانا حرام قرار دیا اور جہاں تک ''اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ'' کا تعلق ہے کہ اللہ نے اسے ''فسق'' (ذٰلِكُمْ فِسْقٌ) سے تعبیر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین، اُونٹ کو تیروں کے ذریعے تقسیم کرتے تھے اور اس کے دس حصے کرتے تھے پھر سب اکٹھے ہو کر قرعہ اندازی کرتے تھے کہ جس کا نام قرعہ میں نکلتا اسے اس کا حصہ دے دیتے تھے، تو ان دس حصوں میں سے سات قرعہ اندازی میں شامل ہوتے تھے اور تین شامل نہیں کئے

جاتے تھے، شامل کئے جانے والے سات حصوں کے نام یہ تھے: (۱) فذ، (۲) توأم، (۳) مسبل، (۴) نافس، (۵) جلس، (۶) رقیب، (۷) معلیٰ، ان کی تقسیم بندی اس طرح تھی کہ فذ ایک حصہ والا، توأم دو حصوں والا، مسبل تین حصوں والا، نافس چار حصوں والا، جلس پانچ حصوں والا، رقیب چھ حصوں والا، معلیٰ سات حصوں والا ہوتا تھا، اور بقیہ تین حصوں کے نام یہ تھے۔ (۱) سفیح، (۲) منیح، (۳) وغد، اور اُونٹ کی قیمت انہی تین حصوں والوں کے ذمہ ہوتی تھی کہ جو تقسیم میں نہیں آتے تھے، تو یہ قمار یعنی جوئے کی ایک صورت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا۔

اس روایت میں ''منخنقہ''، ''موقوذہ'' اور ''متردیہ'' کی جو تفسیر ذکر ہوئی ہے وہ ان کے فہم المعنی کے لئے مثال کے طور پر ہے لہٰذا اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے معانی معین صورت میں یہی ہیں، کیونکہ بعد والی روایت ان سے مختلف معانی کو بیان کرتی ہے، اور اسی طرح فقرہ ''اِلَّا مَاذَكَّيْتُمْ'' کا فقرہ ''وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ'' کے ساتھ اور فقرہ ''ذٰلِكُمْ فِسْقٌ'' کا فقرہ ''وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ'' کے ساتھ ذکر کیا جانا ان میں مذکورہ ذیلی الفاظ سے اصل حکم کے انہی سے مقید ہونے کی دلیل نہیں قرار پاتا۔

تفسیر العیاشی کی تین روایات:

(۱) تفسیر العیاشی میں عیّوق بن قسوط کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''المنخنقه'' اس جانور کو کہتے ہیں جس کے گلے میں رسی ڈال کر مارا گیا ہو، اور ''الموقوذة'' اس جانور کو کہتے ہیں جسے بیماری کی شدت کی وجہ سے ذبح کا درد محسوس نہ ہو اور نہ ہی تڑپے اور ہاتھ پاؤں مارے اور نہ اس کا خون باہر نکلے، اور ''متردیه'' اس جانور کو کہتے ہیں جو گھر کی چھت یا کسی بلندی سے نیچے گر جائے اور ''نطیحه'' اس جانور کو کہتے ہیں جو اپنے جیسے حیوان کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دے،

(۲) حسن بن علی الوشاء کے حوالہ سے منقول ہے انہوں نے کہا میں نے امام رضا علیہ السلام سے سنا آپؑ نے فرمایا: اگر بلندی سے گرنے والا حیوان (متردیہ) جسے درندے کھالیں اگر ان کی جان نکلنے سے پہلے ان کا تذکیہ کرلو۔ یعنی شرعی ضوابط کے مطابق ذبح کرلو تو ان کا گوشت کھا سکتے ہو۔

(۳) محمد بن عبداللہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اُنہوں نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ انہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: جعلت فداك، لم حرم الله الميتة والدم ولحم الخنزير؟ اللہ تعالیٰ

نے مُردار، خون اور سوٗر کو کیوں حرام قرار دیا ہے؟ فقال (ع): ان اللہ تبارک وتعالیٰ، لم یحرم ذلك علیٰ عبادہٖ واحل لھم ماسواہ من رغبۃ منہ۔ تبارک وتعالیٰ۔ فیما حرم علیھم، ولا زھد فیما احل لھم، ولکنہ، خلق الخلق وعلم مایقوم بہٖ ابدانھم وما یصلحھم فاحلہ، واباحہ، تفضلاً منہ علیھم لمصلحتھم وعلم مایضرھم فنھاھم عنہ و حرمہٗ علیھم، ثم اباحہ للمضطر وأحلہ لھم فی الوقت الذی لایقوم بدنہٗ الابہٖ فأمرہٗ ان ینال منہ بقدر البلغۃ لاغیر ذلك،

امامؑ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو کچھ حرام کیا اور جو کچھ حلال کیا وہ صرف اس لئے نہیں کہ اسے ایسا کرنا پسند ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے کچھ کھائیں اور کچھ نہیں کھائیں، بلکہ اس نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا ہے اور وہ خود اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ کون سی چیز ان کے جسموں کے لئے فائدہ مند اور ان کی قوت و استحکام کا باعث ہے لہٰذا اسے اس نے ان کے لئے حلال و مباح قرار دیا تا کہ اپنے فضل و کرم سے ان کی بہتری و بھلائی کے اسباب فراہم کرے، اسی طرح اسے معلوم ہے کہ کون سی چیز ان کے لئے نقصان دہ اور ان کے جسمانی نظام کی تباہی کا باعث ہے لہٰذا اس نے اسے ان کے لئے حرام قرار دیا سوائے ان لوگوں کے جو مضطر و مجبور ہوں کہ ان کے لئے حرام کی گئی چیزیں اسی وقت تک کے لئے حلال ہیں جب تک ان کی بقاء و سلامتی ان سے وابستہ ہو تا کہ مضطر و مجبور اور ناچار شخص ان سے استفادہ کر کے اپنی زندگی کا تحفظ کر سکے کہ اس سے زیادہ استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔

اما المیتۃ فانہٗ لایدنو منھا احد ولا یأکلھا الاضعف بدنہٗ، ونحل جسمہٗ، و وھنت قوتہٗ، وانقطع نسلہٗ، ولا یموت آکل المیتۃ الافجأۃ

جہاں تک مُردار کے حرام کئے جانے کا تعلق ہے تو وہ اس لئے ہے کہ جو بھی اس کے قریب جائے اور اس کا گوشت کھائے اس کے بدن میں کمزوری، جسم میں بے حسی، طاقت میں کمی اور وہ منقطع النسل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ مردار کھانے والا ناگہانی موت کا شکار ہوتا ہے۔

واما الدم فانہٗ یورث الکلب و قسوۃ القلب و قلۃ الرأفۃ والرحمۃ، لایؤمن ان یقتل ولدہٗ و والدیہ، ولا یؤمن علیٰ حمیمہ، ولا یومن علیٰ من صحبۃ،

اور خون کھانے و پینے والا شخص کتے کی طرح کا ہو جاتا ہے، اور وہ سنگدل و بے رحم ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے ہاتھ سے اس کی اولاد اور ماں باپ کا قتل کیا جانا بھی غیر متوقع نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے ساتھی و دوست اس کے ہاتھوں قتل کئے جانے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

واما لحم الخنزير فان الله مسخ قوماً في صورة شتّى شبه الخنزير والقرد والدب وما كان من الامساخ ثم نهى عن اكل مثله لكي لا ينتفع بها ولا يستخف بعقوبته

اور سؤر کا گوشت اس لئے حرام کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کو مختلف شکلوں میں مسخ کر دیا مثلاً سؤر، بندر، لومڑی و بھیڑیا اور اس طرح کے دیگر مسخ شدہ حیوانات بنا دیا، پھر ان مسخ شدہ جانوروں کے گوشت کھانے سے منع فرمایا تا کہ لوگ ان کے گوشت کو اپنی غذا اور اپنے جسموں کا حصہ نہ بنائیں اور نہ ان گناہوں کی سزا کو کم سمجھیں جن کی وجہ سے ان انسانوں کو مسخ کر کے ان حیوانوں کی شکلوں میں بدل دیا گیا۔

واما الخمر فانهٔ حرمها لفعلها و فسادها، وقال: ان مدمن الخمر كعابد وثن ويورثه ارتعاشاً ويذهب بنوره وتهدم مروّته، ويحمله على ان يكسب على المحارم من سفك الدماء وركوب الزنا، ولا يؤمن اذا سكر ان يثبت على حرمه وهولا يعقل ذلك، والخمر لم يؤد شاربها الا الى كل شر،

اور شراب کو اس کی بری تاثیر اور عقل و جسم کی صحت کو تباہ کر دینے کا باعث ہونے کی وجہ سے حرام کیا اور شراب پینے کا عادی شخص ایسا ہے جیسے بت پرست! شراب اس کے جسم میں ارتعاش و بے چینی پیدا کرتی ہے اور اس کا نورِ ایمان ختم کر دیتی ہے، اس کے اندر مروّت نام کی کوئی صفت باقی نہیں رہنے دیتی اور اسے حرام کاموں کے ارتکاب مثلاً قتل وغارت اور زنا کاری کی راہ پر لا کھڑا کرتی ہے اور جب اس کا نشہ کسی پر طاری ہوتا ہے تو اس سے کسی کی عزت و ناموس محفوظ نہیں ہوتی اور وہ ماں بہن کے ساتھ بدکاری کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ خود اپنے برے عمل کی برائی کو سمجھ نہیں سکتا اور اسے پتہ ہی نہیں لگتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، شراب ایسی بری چیز ہے کہ شرابخور کو ہر گناہ و برے کام کے انجام دینے پر اُکساتی ہے (تفسیر العیاشی، جلد ا،ص:۲۹۱)

روایات پر ایک اور نظر

کتاب ''غایۃ المرام'' میں مذکور ہے کہ ابو مؤید موفق بن احمد نے کتاب ''فضائل علیؑ'' میں لکھا ہے کہ انہیں سیّد الحفاظ شہردار بن شیرویہ بن شہردار دیلمی نے بتایا کہ اس نے ہمدان سے مجھے ایک خط لکھا کہ ابوالفتح عبدوس بن عبداللہ بن عبدوس ہمدانی نے اپنے خط میں مجھے آگاہ کیا ہے کہ عبداللہ بن اسحاق بغوی نے حسین بن علیل غنوی کے حوالہ سے اور اس نے محمد بن عبدالرحمان زراع کے حوالہ سے، اس نے قیس بن حفص کے حوالہ سے، اس نے علی بن الحسین کے حوالہ سے، اس نے ابوھریرہ کے حوالہ سے اور اس نے ابوسعید خدری کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس دن لوگوں کو

غدیر خم کے مقام پر اکٹھا ہونے کا حکم دیا تو فرمایا کہ وہاں پر موجود درخت کے نیچے کانٹے وغیرہ کو ہٹا کر بیٹھ جائیں وہ جمعرات کا دن تھا اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو علی علیہ السلام کی پیروی کرنے کا فرمان جاری کیا، علیؑ کا بازو تھام کر اسے بلند کیا اور اُسے اُونچا کیا کہ لوگوں کو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیر بغل سفیدی بھی دکھائی دے رہی تھی، پھر وہ دونوں (حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام) ابھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' (آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا)۔ اس آیت کے نزول پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''الله اكبر علىٰ اكمال الدين واتمام النعمة ورضا الرب برسالتي والولاية لعلي، اللهم وال من والاه وعاد من عاداه وانصر من نصره واخذل من خذله (اللہ اکبر، اللہ کبریائی کا سزاوار ہے کہ اس نے دین مکمل کر دیا، نعمتیں پوری کر دیں، میری رسالت اور علی کے لئے ولایت پر اپنی رضا و خوشنودی ظاہر کر دی، (پھر حضور نے دعا کی) اے اللہ! جو علی کی ولایت کا دم بھرے تو اُسے دوست رکھ اور جو اُس سے دشمنی کرے تو اُسے دشمن جان اور جو اس کی نصرت و مدد اور اس کا ساتھ دے تو اس کی نصرت و مدد اور اس کا ساتھ دے، اور جو اس سے منہ موڑے اور اسے رسوا کرنے کی راہ پر چلے تو اسے رسوا کر!''

اس وقت عرب کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں کچھ شعر کہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں، کہو کہ اللہ بھی وہی نازل فرمائے گا، تب حسان بن ثابت نے یہ شعر پڑھے:

ينا ديهم يوم الغدير نبيهم بخم واسمع بالنبى منا دياً
بانى مولا كم نعم و وليكم فقالوا ولم يبدو اهناك التعاميا
الهك مولانا وانت و لينا ولاتجدن فى الخق للامر عاصياً
فقال له قم يا على فانئى رضيتك من بعدى اماماً و هادياً

ان کا نبیؐ غدیر کے دن انہیں خم کے میدان میں ندا دے رہا تھا اور میں نبیؐ کی آواز سن رہا تھا کہ وہ پکارا کر کہہ رہے تھے کہ میں تمہارا مولا و ولی و سرپرست ہوں، اور آپؐ کی بات سن کر تمام لوگ واضح لفظوں میں کہہ رہے تھے کہ تیرا معبود ہمارا مولا اور تو ہمارا اولی و سرپرست ہے، اور کوئی شخص اس امر کا مخالف و نافرمان نہ تھا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یا علی، کھڑے ہو جاؤ کہ میں اپنے بعد تیرے امام و ہادی ہونے پر اپنی رضایت و پسندیدگی کا اعلان کرتا ہوں۔

کتاب ''نزول القرآن فی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب'' (علی بن ابی طالب کی شان میں قرآنی آیات)، تألیف حافظ ابونعیم نے قیس بن ربیع کے اسناد سے ابوھارون عبدی کے حوالہ سے ابوسعید خدری کی مذکورہ بالا روایت کو ذکر کیا

اور کہا کہ حسان بن ثابت نے اپنے اشعار کے آخر میں یہ دو شعر پڑھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

فمن کنت مولاہ فھذا ولیہ فکونوا لہٗ انصار صدقٍ موالیاً
ھناک دعا اللھم وال ولیہ وکن للذی عاد علیاً معادیاً

(پس جس جس کا میں مولا ہوں تو یہ (علی) اس کا ولی ہے، لہٰذا تم اس کے سچے ساتھی و مددگار بنو اس کی ولایت کا دم بھرنے والے بن کر) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں دعا فرمائی: ''اے اللہ! اس کی ولایت کا دم بھرنے والے اس کے دوست سے دوستی اور اس سے منہ موڑنے والے دشمن سے دشمنی کر''۔

کتاب ''نزول القرآن فی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب'' ہی میں مؤلف نے علی بن عامر کے اسناد سے ابوالحجاف کے حوالہ سے اعمش کی سند سے عطیہ کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: آیۃ مبارکہ ''یَآاَیُّھَاالرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی جو کہ علی بن ابی طالب کے بارے میں ہے اور اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' یعنی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے حکم کے مطابق علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرما دیا تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے اسلام کو تمہارے لئے پسندیدہ دین قرار دے دیا ہے۔

ابراہیم بن محمد حموینی سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ مجھے شیخ تاج الدین ابو طالب علی بن الحسین بن عثمان بن عبداللہ الخازن نے بتایا کہ ہمیں امام برھان الدین ناصر بن ابی المکارم المطرزی نے مجھے اس بات کو دوسروں سے بیان کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں امام خطب خوارزم ابومؤید موفق بن احمد مکی الخوارزمی نے بتایا کہ مجھے سیّد الحفاظ نے ہمدان سے بھیجے ہوئے اپنے مکتوب میں رئیس ابوالفتح کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے عبداللہ بن اسحاق بغوی کے بیان سے مطلع کیا کہ اُنہوں نے کہا: ہمیں حسن بن عقیل الغنوی نے بتایا کہ محمد بن عبداللہ زراع نے قیس بن حفص کی روایت ذکر کی جس میں انہوں نے علی بن الحسین العبدی کی ابوھارون العبدی کے حوالہ سے ابوسعید الخذری کی بیان کردہ روایت بیان کی جو کہ مذکورہ بالا پہلی روایت کی مانند ہے،

حموینی نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد کہا: اس حدیث کی متعدد اسناد و حوالے ہیں جو ابوسعید سعد بن مالک الخذری الانصاری تک پہنچتے ہیں اور کتاب ''المناقب الفاخرۃ'' تألیف سید رضی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ محمد بن اسحاق نے ابوجعفر (امام محمد باقر علیہ السلام) کا یہ بیان ذکر کیا جسے اُنہوں نے اپنے پدر بزرگوار اور اپنے جد نامدار کے حوالہ سے فرمایا کہ جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر واپس تشریف لا رہے تھے تو ایک جگہ رک گئے اور اپنے قافلہ کو وہاں ٹھہرا دیا، اس علاقہ کا نام ''ضوجان'' بتایا جاتا ہے، وہاں یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی: ''یَآاَیُّھَاالرَّسُوْلُ

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ''(اے رسول! وہ حکم پہنچا دیجئے جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا، اور اگر آپ نے وہ کام نہ کیا تو گویا اپنے رب کا کوئی پیغام نہ پہنچایا، کار رسالت انجام نہ دیا۔ اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے)، اس آیت کے نزول کے بعد چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے شر سے محفوظ ہونے کی ضمانت دی گئی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''الصلوٰۃ جامعۃ'' کا اعلان کر دیا کہ سب لوگ نماز جماعت کے لئے اکٹھے ہو جائیں، چنانچہ سب لوگ اکٹھے ہو گئے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''من اولیٰ منکم بانفسکم؟'' کون ہے جو خود تم سے تم پر اولویت رکھتا ہے؟ اس پر سب نے پکارا کر کہا: اللہ ورسولہ، اللہ اور اس کا رسول، یہ سن کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب کا ہاتھ تھاما اور فرمایا: ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال من والاہ، وعاد من عاداہ، وانصر من نصرہ، واخذل من خذلہ لانہ منی وانا منہ، وھو منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔'' (جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے، اے اللہ! تو اسے دوست رکھ (اس کا مولا بن) جو علی کی ولایت کا دم بھرے، اور اس سے دشمنی کر جو علی سے دشمنی کرے، اور جو علی کا ساتھ دے تو اس کا ساتھ دے اور جو اس سے منہ موڑے تو اسے ذلیل ورسوا کر کیونکہ وہ (علی) مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور اسے میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی اس فرق کے ساتھ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔

اور یہ وہ آخری فریضہ اور واجب العمل حکم الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہؐ کے لیے صادر فرمایا، پھر اس کے بعد یعنی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا ہے)

ابوجعفر نے فرمایا: چونکہ تمام لوگوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ تمام احکام خداوندی اور فرائض و واجبات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج سب کو تسلیم کیا لہٰذا اس آخری فرمانِ خداوندی کی بھی تصدیق کی، ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ میں نے ابوجعفر (ع) سے پوچھا: یہ واقعہ کب ہوا؟ انہوں نے فرمایا: اُنیس ذی الحج کی رات (تفسیر البرھان میں مذکور ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا ذی الحج کے سترہ دن گزر چکے تھے) دس ہجری تھی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج الوداع سے فارغ ہو کر واپس مدینہ تشریف لے جا رہے تھے، اور اس واقعہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے درمیان ایک سو دنوں کا فاصلہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں بارہ (آئمہؑ) کے نام بھی ذکر کئے۔

کتاب المناقب، تالیف ابن المغازلی میں مذکور ہے کہ ابوھریرہ نے کہا: ''من صام یوم ثمانیۃ عشر من

ذی الحجة کتب الله لهٔ صیامهٔ ستین شهراً وھو یوم غدیر خم بها اخذ النبی (ص) بیعة علی ابن ابی طالب، وقال: من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللهم وال من والاہ وعاد من عاداہ، وانصر من نصرہ واخذل من خذلهٔ، فقال لهٔ عمر بن الخطاب: بخ بخ لك یا بن ابی طالب، اصبحت مولای و مولا کل مؤمن و مؤمنة فانزل الله تعالیٰ: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' (جو شخص ۱۸ ذی الحج کے دن روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں ساٹھ مہینوں کے روزے لکھے گا، اور غدیر خم کا دن وہ ہے کہ جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالبؑ کی بیعت لی، اور فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے، اے اللہ! تو اسے ہی دوست رکھ جو علی کی ولایت کا دم بھرے، اور اسے دشمن جان جو علی سے دشمنی کرے، اور اس کی مدد فرما جو علی کی مدد کرے اور اسے رسوا کر جو علی کو رسوا کرنا چاہے، یہ سن کر عمر بن خطاب نے علی بن ابی طالب سے کہا: مبارک ہو، مبارک ہو آپ کو اے ابوطالب کے فرزند! آپ میرے اور ہر مؤمن مرد اور مؤمنہ عورت کے مولا ہو گئے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا ہے۔)

یہی روایت کہ جو ابوسعید خدری سے منقول ہے ابن مردویہ نے کتاب المناقب میں اور کتاب سرقات الشعر میں مرزبانی نے بھی ذکر کی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں تفسیر ''درمنثور'' میں ابوسعید خدری اور ابوھریرہ کے حوالہ سے مذکور ہیں، البتہ تفسیر ''درمنثور'' میں ان دو حدیثوں کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ مطلب کثیر اسناد کے ساتھ صحابہ کرام سے منقول ہے، کہ اگر ان میں بخوبی غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تمام صحابہ کرام کی روایات کا سلسلہ عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، معاویہ اور سمرہ تک پہنچتا ہے۔ اور ان سب میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت مبارکہ حج الوداع کے یوم عرفہ میں نازل ہوئی جو کہ جمعہ کا دن تھا، اور ان روایات میں سے معتبر ترین روایت اسے قرار دیا گیا ہے جو عمر بن خطاب سے منقول ہے کہ جسے تفسیر ''درمنثور'' میں حمیدی، عبد بن حمید، احمد البخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن حبان اور بیہقی (اپنی کتاب السنن میں) کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ طارق ابن شہاب نے عمر بن خطاب کی روایت بیان کی اور ابن راھویہ نے اپنی مسند میں اور عبد بن حمید نے ابی عالیہ کے حوالہ سے عمر کا بیان ذکر کیا ہے اسی طرح ابن جریر کے اسناد سے قبیصہ بن ابی ذوئیب کی سند سے عمر کا بیان ذکر کیا، اور بزاز سے ابن عباس کا بیان منقول ہے جو کہ بظاہر عمر بن خطابؓ کی روایت ہے ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور، جلد ۲، ص: ۲۵۸''

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو حدیثوں کی اسناد کے ضعیف ہونے کا جو اظہار ہوا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ اگر اصل مطلب پر غور کیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور اس سے حدیثوں کے متن و مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ ہم

نے سابق الذکر مطالب میں واضح کر دیا ہے کہ آیہ مبارکہ جس مطلب و معنی کو بیان کرتی ہے وہ اس کی بابت پیش کئے گئے کسی بھی احتمال کو قرین صحت قرار نہیں دیتا لہٰذا یہ دونوں روایتیں اور ان کے علاوہ دیگر روایات جو ان کی ہم معنیٰ ہیں وہ سب قرآنِ مجید سے موافقت و مطابقت رکھتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ قابل قبول ہیں،

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ یہ احادیث اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ بالخصوص مسئلہ ولایت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ان کے علاوہ بیس احادیث سے زیادہ ایسی بھی ہیں جو شیعہ و سنی دونوں اسناد سے وارد ہوئی ہیں جن میں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کا شان نزول اعلان ولایت ہے اور وہ روایات ان روایات سے مطابقت رکھتی ہیں جو آیہ مبارکہ ''یَاۤ اَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ'' (سورۂ مائدہ، آیت: ۶۷)۔ کے شانِ نزول کی بابت کتب معتبرہ میں مذکور ہیں جن کی تعداد پندرہ سے زیادہ ہے اور مجموعی طور پر وہ ۳۵ حدیثیں واقعہ غدیر سے مربوط ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت و مولائیت کا اعلان فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کئے ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' (جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے) اور یہ الفاظ ان احادیث متواترہ میں سے ہیں جو صحابہ کرام کے جمِ غفیر سے مروی ہیں اور ان کے قطعی و یقینی ہونے پر فریقین کے کثیر علماء کے اعترافات موجود ہیں، اور سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف واپسی کے موقع پر ہوا، اور یہ ولایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ ان فرائض میں سے ایک فریضہ ہے کہ جس کا ثبوت متعدد واضح قرآنی آیات میں پایا جاتا ہے، اس بناء پر یہ بات درست قرار نہیں پا سکتی کہ اس فریضہ کا تعین آیہ مبارکہ ''اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ'' سے متاخر ہو یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ آیت پہلے نازل ہوئی ہو اور ولایت کا فریضہ اس کے بعد آیا ہو، بنا بریں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ولایت کا فریضہ عائد ہونے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، کہ اعلانِ ولایت کے بعد دین مکمل ہو گیا ہے لہٰذا اگر کوئی روایت اس سے منافی ہو تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ ساقط الاعتبار و فاقد الاعتماد ہے۔

اور جہاں تک سیوطی کے دیگر روایات ذکر کرنے کا تعلق ہے تو ان کی بابت سابق الذکر مطالب کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے اور اس پر غور کرنا لازمی ہے کہ ان دو آیتوں یعنی ''یَاۤ اَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ'' کہ اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت عنقریب پیش کی جائے گی اور ''اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ'' اور ان احادیث متواترہ پر بخوبی غور و فکر کیا جائے جو ان دو آیتوں کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں واقعہ غدیر کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایام کی معاشرتی صورتحال کو مدنظر قرار دیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ ولایت کا فرمان غدیر کے دن سے کئی دنوں پہلے نازل ہوا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے اعلان کی بابت یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں لوگ اسے قبول کرنے سے انکار نہ کر دیں یا ان کے بارے میں بدگمانی کا شکار نہ ہوں

جس کے نتیجہ میں اسلام کے دعوتی مشن کو ٹھیس پہنچے گی لہٰذا اس فرمان کے اظہار و اعلان میں تاخیر سے کام لیا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان جاری فرمادیا "یَاأَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَیْكَ مِن رَّبِّكَ" اے رسول! جو حکم آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فرمان کا کسی تاخیر کے بغیر اعلان فرمادیا کیونکہ اس کے اعلان میں کسی تاخیر کی گنجائش ہی نہیں تھی"۔

بنا برایں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی بیشتر آیات کو جن میں آیہ مبارکہ "اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" بھی شامل تھی، ولایت کے فریضہ کے ساتھ عرفہ کے دن نازل فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولایت کے اعلان کو غدیر خم کے دن تک مؤخر فرمایا اور اس پر مشتمل آیت کو عرفہ کے دن تلاوت کیا اور جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن میں آیہ ولایت کے غدیر کے دن نازل ہونے کا تذکرہ ہے تو یہ اس لئے بعید از قیاس نہیں کہ عین ممکن ہے اس دن بھی اس لئے نازل ہوئی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تلاوت اس دن فرمائی کیونکہ اس دن ولایت کے اعلان کا حکم صادر ہوا (بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَیْكَ)، اور آیت مبارکہ اسی کے بارے میں مطالب پر مشتمل تھی، لہٰذا روایات میں ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا بعض وہ روایات کہ جن میں اس آیت کے نزول کی بابت مذکور ہے کہ وہ ولایت کے فرمان پر مشتمل ہے اور وہ روایات کہ جن میں اس کا نزول عرفہ کے دن اعلان ولایت کی بابت ذکر کیا گیا ہے کہ جو عمر، علی، معاویہ اور سمرہ سے منقول ہیں ان کے درمیان ایک دوسرے کی نفی کا پہلو موجود نہیں کیونکہ ان میں نفی کا پہلو تب پایا جاتا جب ان میں سے ایک آیت کے نزول کو غدیر خم کے دن اور دوسری اس کے نزول کو عرفہ کے دن بیان کرتی،

اور جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہ آیت مبارکہ اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ حج کا حکم نازل ہونے کے ساتھ ہی دین مکمل ہوا، تو یہ اور اس طرح کی دیگر روایات سے راویوں کے اپنے ذوق فہم کی نشاندہی ہوتی ہے ورنہ نہ ہی کتاب اللہ سے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان سے، اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور ہمارے مذکورہ بیان کی تصدیق اس روایت سے ہو سکتی ہے جو تفسیر العیاشی میں جعفر بن محمد بن محمد الخزاعی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا آپ نے فرمایا "لما نزل رسول الله (ص) عرفات یوم الجمعة اتاه جبرئیل فقال له: ان الله یقرئك السلام و یقول لك: قل لأمتك: الیوم اکملت لکم دینکم بولایة علی بن ابی طالب و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً ولست انزل علیکم بعد هذا، وقد انزلت علیکم الصلاة و الزکاة و الصوم و الحج وهی الخامسة ولست اقبل علیکم بعد هذه الاربعة الابها" (جب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفات میں جمعہ کے دن پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور فرمایا ہے: اپنی اُمت سے کہیں، آج میں نے تمہارا دین علی بن ابی طالب کی ولایت کے ساتھ مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا اور اس کے بعد میں تم پر کوئی حکم نازل نہیں کروں گا میں نے تم پر نماز، زکات، روزہ، حج کے فرائض عائد کئے اور یہ پانچواں فریضہ ہے اور میں ان چاروں میں سے کوئی فریضہ اس کے بغیر قبول نہیں کروں گا، ہر فریضہ کی قبولیت اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔)۔ (تفسیر العیاشی جلد ا،ص: ۲۹۳)

اس کے علاوہ وہ روایات جو عمر بن خطاب سے منقول ہیں کہ ان میں آیت کے یوم عرفہ نازل ہونے کو بیان کیا گیا ہے ان میں دوسرے حوالہ سے اشکال پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ان سب میں یہ مذکور ہے کہ کسی اہل کتاب نے بعض روایات میں ہے کہ کعب نے عمر سے کہا: ''ان فی القرآن اٰیة لونزلت مثلها علینا معشر الیهود لاتخذنا الیوم الذی نزلت فیه عیداً'' وهی قولهٗ: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' فقال لهٗ عمر: ''والله انی لاعلم الیوم وهو یوم عرفة من حجة الوداع'' (قرآن میں ایک آیت ایسی ہے کہ اگر اس جیسی آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن قرار دیتے جس دن میں وہ نازل ہوئی، عمر نے اس سے کہا: بخدا قسم، مجھے اس دن کا بخوبی علم ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن تھا)۔

یہی روایت ہے کہ جسے ابن راھویہ اور عبد بن حمید نے ابوالعالیہ کے حوالہ سے بیان کیا اس میں یوں مذکور ہے کہ کچھ اصحاب حضرت عمر کے قریب بیٹھے تھے اور وہاں اس آیت کے بارے میں گفتگو ہوئی تو وہاں ایک اہل کتاب نے کہا: ''لوعلمنا ای یوم نزلت هٰذه الآیة لاتخذناه عیداً'' (اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ آیت کس دن نازل ہوئی تو ہم اس دن عید مناتے) فقال عمر: الحمد لله الذی جعلهٗ لنا عیداً والیوم الثانی. نزلت یوم عرفة والیوم الثانی، یوم النحر، فأكمل لنا الامر فعلمنا ان الامر بعد ذلك فی انتقاص، عمر نے جواب دیا اللہ کی حمد ہے جس نے ہمارے لئے اس دن کو عید قرار دیا اور دوسرے دن کو بھی! یہ آیت عرفہ کے دن نازل ہوئی اور اس کے بعد والا دن عید قربان کا دن ہے تو اللہ تعالیٰ نے دین کو ہمارے لئے مکمل کر دیا اور ہم جان گئے کہ اب اس سلسلہ میں کمی آئے گی،

اس روایت کا آخری فقرہ اس سے مختلف الفاظ میں بھی بیان ہوا ہے چنانچہ تفسیر ''درمنثور'' میں ابن ابی شیبہ اور ابن جریر کے اسناد سے عنترہ کی روایت مذکور کہ جب آیہ مبارکہ ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' نازل ہوئی تو اس دن حج اکبر کا دن تھا، حضرت عمر رونے لگے تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ان کے رونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا مجھے یہ بات رلا رہی ہے کہ ہمارے دین میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو کہ اب مکمل ہو گیا ہے اور جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو پھر اس میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ بات صحیح

ہے'' (تفسیر در منثور جلد دوم، صفحہ ۲۵۸)

اس روایت کے مانند ایک دوسری روایت بھی تفسیر ''در منثور'' میں احمدؔ کے حوالہ سے علقمہ بن عبداللہ المزنی کے اسناد سے منقول ہے کہ اس نے کہا: مجھے ایک شخص نے بتایا کہ میں عمر بن خطاب کی مجلس میں موجود تھا تو عمر نے وہاں موجود حضرات میں سے ایک شخص سے پوچھا: کیا تو نے سنا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کے بارے میں کس طرح تعارف کرواتے تھے؟ اس نے کہا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ وہ فرما رہے تھے: اسلام اپنی ابتداء میں اُونٹ کے بچہ کی طرح تھا، پھر اُونٹ کے دو سالہ بچہ جیسا ہو گیا، پھر چار سالہ، پھر چھ سالہ اور بالآخر اپنی کمالیت کی حد کو پہنچ گیا، یہ سن کر عمر نے کہا: کمال تک پہنچنے کے بعد کمی کی طرف جانا ہی ہوتا ہے (تفسیر ''در منثور'' جلد ۲، صفحہ: ۲۵۹)

تو ان روایات میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اس مطلب کو بیان کرنا مقصود قرار پایا ہے کہ اس آیہ مبارکہ کا نزول عرفہ کے دن ہوا تا کہ لوگ اس بات کی طرف توجہات مبذول رکھیں کہ اسلام کس قدر وسعت و طاقت کا حامل ہے اور حج کے موسم میں مکہ مکرمہ اسلام کی شوکت کا کس قدر عظیم منظر پیش کر رہا ہے، اور یہ بھی جانیں کہ اکمالِ دین و اتمام نعمت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب مکہ میں ہر طرف اسلام کا نور پھیلا ہوا ہے اور اللہ کا دین سر بلند دکھائی دے رہا ہے، چنانچہ مکہ میں اب کوئی مشرک دکھائی نہیں دیتا بلکہ ہر طرف مسلمان ہی مسلمان نظر آتے ہیں اور اسلام کے علاوہ کسی دین کا اتباع نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اب مسلمانوں کو دشمنان اسلام سے کوئی خوف و خطرہ لاحق محسوس نہیں ہوتا۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دین کے کامل ہو جانے اور نعمت کے پورا ہو جانے سے مُراد یہ ہے کہ مسلمان جو اعمال بظاہر انجام دیتے ہیں وہ مکمل ہو گئے اور اب ان کی انجام دہی میں انہیں کسی قسم کا خوف اور دشمنوں کی طرف سے حملوں کا خدشہ لاحق نہیں کیونکہ اب کوئی کافر ان کے درمیان موجود نہیں لہٰذا یہاں کمالِ دین سے مُراد ان احکام و معارف کے جاری سلسلہ کا مکمل ہونا نہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق کے لئے مقرر تھا، اس اسلام سے مُراد وہی ظاہری اسلام ہے جس کی بناء پر لوگ ''مسلمان'' کہلاتے تھے، تو ''دین'' و ''اسلام'' کا یہ معنیٰ ایسا ہے کہ اس میں کمالیت کے مقام پر پہنچنے کے بعد نقص و کمی کی طرف واپس جانا قابل تصور ہے، لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ احکام و دستورات اور معارف کا تعلق ہے تو کسی بھی صورت میں اضافہ کے بعد کمی ان میں قابل تصور نہیں لہٰذا اس روایت میں مذکور یہ قول کہ ''انہٗ لم یکمل شیئ قط الّا نقص'' (کوئی چیز ایسی نہیں جو کمال حاصل کرے مگر یہ کہ اس میں دوبارہ کمی و نقص پیدا ہو جاتا ہے) قرین صحت نہیں، اس بناء پر یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کر دیا اور اپنا آخری حکم بھی نازل فرما دیا تو اب اس میں کمی و نقص کا واقع ہونا ممکن نہیں، یعنی حضرت عمر نے جس قاعدہ کلیہ کو دلیل کے طور پر پیش کیا اس کی تطبیق دین کے معارف و احکام پر نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ اس میں ان کی مُراد ظاہری دینی مراسم ہیں کہ جو

دیگر اشیاء کی طرف تبدیلی وتحول کی گنجائش رکھتے ہیں اور ایسا ہونا تاریخ معاشرہ میں قابل تصور قرار دیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کے واضح ہونے کے بعد قارئین کرام اس بات سے آگاہ ہو چکے ہوں گے کہ اس نظریہ پر کئی حوالوں سے اعتراض ممکن ہے مثلاً

(۱) اس میں دین کی کمالیت کا جو معنیٰ کیا گیا ہے وہ آیۂ مبارکہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' سے مطابقت نہیں رکھتا، چنانچہ اس کی بابت سابقہ ذکر شدہ مطالب میں وضاحت ہو چکی ہے۔

(۲) یہ کیونکر ممکن ہے کہ دین کو صرف مسلمانوں کے ظاہری اعمال کی بناء پر ''کامل'' قرار دے اور صرف اس لئے اپنی طرف سے لوگوں پر احسان کا اظہار کرے کہ اب سرزمین مکہ مشرکوں سے خالی ہوگئی ہے اور اب معاشرہ اپنی ظاہری اسلامی صورت کے ساتھ مشرک دشمنوں کے شر سے محفوظ ہوگیا ہے لہٰذا دین کو مکمل ہونے اور اسلام کو پسندیدہ دین ہونے کی سند عطا کردی جائے؟ جبکہ انہی ظاہری اسلام کے دعویداروں میں کتنے ایسے افراد تھے جو مشرکین سے زیادہ نقصان دہ اور خطرناک وفسادی تھے اور وہ منافقین تھے جو اپنے آپ کو مسلمان بلکہ مسلمانوں سے زیادہ مسلمان ظاہر کرتے تھے حالانکہ پس پردہ ایسی میٹنگیں کرتے تھے جن میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی کو ہوا دیں اور ان کی معاشرتی قدروں کو پامال کریں ان کے دینی امور کو درہم برہم کریں، دین میں بدعتیں ایجاد کریں اور شبہات پیدا کر کے دین کا اصل چہرہ ظاہر نہ ہونے دیں ایسے لوگوں کا خطرہ کفار ومشرکین کے خطرے سے کہیں زیادہ تھا چنانچہ ان کے بارے میں قرآنی آیات صراحت و وضاحت کے ساتھ مربوطہ مطالب پر مشتمل ہیں مثلاً سورۂ منافقون، سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ انفال، سورۂ برائت، سورۂ احزاب اور دیگر سورتوں میں متعدد آیات کے مطالعہ سے منافقین کے بارے میں ان کے برے انجام سے آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اس طرح کے نظریات پیش کرنے والے حضرات کس طرح منافقین کی کارستانیوں کو یکسر بے اثر قرار دے سکتے ہیں؟ اور یہ بات کیونکر قابل تصور ہے کہ ان کی سازشیں دم توڑ گئیں اور سرے سے ان کا اثر ورسوخ معاشرے میں ختم ہوگیا اور وہ اپنے ارادوں میں بری طرح شکست کھا گئے؟ اور یہ بھی کیونکر قرین صحت قرار دیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان منافقین کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر ان کے ظاہری اعمال کی بناء پر دین کی تکمیل اور نعمت کے پورے کئے جانے کا اعلان فرمائے اور ظاہری اسلام پر اپنی پسندیدگی کا اظہار صرف اس لئے کرے کہ اس نے مکہ سے مسلمانوں کے دشمنوں یعنی مشرکوں کو بھگا دیا ہے؟ جبکہ منافقین مشرکوں سے زیادہ اسلام دشمن اور خطرناک ترین افراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں صریح وواضح الفاظ میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ فرمایا: ''هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ'' وہ دشمن ہیں ان سے بچ کر رہیں (سورۂ منافقون آیت ۴)

اور یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو صرف ظاہری صورت کی بناء پر کامل ہونے کا اعزاز عطا فرمائے کہ جس کا باطن اس طرح کا ہو یا یہ کہ اپنی نعمت کی تمامیت کا ذکر کرے جبکہ وہ نعمت سے آمیختہ ہو یا وہ اسلام پر اپنی رضایت کا اظہار کرے جبکہ اس کا معنی اس طرح کا کیا جائے جو صرف ظاہری اعمال کی صورتگری سے عبارت ہو؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا: ''وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا'' (اور میں گمراہ کرنے والوں کو ہرگز اپنے ساتھی نہیں بنا سکتا) سورۂ کہف، آیت ۵۱۔ اور منافقوں کے دین کے بارے میں فرمایا: ''فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' (اگر بالغرض تم انہیں پسند بھی کرو مگر اللہ فاسق لوگوں سے راضی نہیں) سورۂ برائت، آیت: ۹۶۔

ان تمام مطالب کے باوجود جو بات آیۂ مبارکہ میں سب سے زیادہ موردِ توجہ قرار پا سکتی ہے وہ یہ کہ آیت میں اطلاق پایا جاتا ہے اور اس میں کوئی قید و شرط مذکور نہیں خواہ اکمالِ دین ہو یا اتمام نعمت ہو، رضایت ہو یا اسلام و دین اور نعمت ہو سب میں اطلاق ہے کسی کو مقید و مشروط ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اکمال دین میں مسلمانوں کی ظاہری حالت اور مکہ کا مشرکین سے پاک ہو جانا اور دشمنانِ اسلام کے شر سے محفوظ ہونا وغیرہ ملحوظ ہے، اس مقام پر ممکن ہے کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اس آیت (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) میں اس وعدہ کے پورا کئے جانے کا ذکر ہے جو درج ذیل آیت میں ہوا:

○ سورۂ نور، آیت: ۵۵

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا''

(اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور اعمال صالحہ انجام دیئے کہ یقیناً بہت جلد انہیں روئے زمین میں اقتدار عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے مومنوں کو عطا کیا، اور ضرور ان کے لئے ان کے اس دین کو مستحکم کرے گا جسے اس نے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے دلوں میں جو خوف پیدا ہو چکا ہے اسے امن میں بدل دے گا، وہ میری ہی عبادت کریں اور کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دیں)

اس آیت میں مؤمنین سے اللہ کا وعدہ مذکور ہے کہ وہ ان کے لئے ان کے پسندیدہ دین کو استحکام عطا کرے گا چنانچہ اس آیت میں ''ان کے پسندیدہ دین (دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ) کے الفاظ بطور تقیید ذکر ہوئے ہیں جو کہ زیر بحث آیت میں ان الفاظ کے بالمقابل ہیں: ''اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ''، ''وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' لہٰذا اکمالِ دین سے مُراد ان کے پسندیدہ دین کا استقرار و استحکام ہے کہ اسے مشرکوں کی طرف سے پیش آنے والے ہر خطرہ سے مزاحمت و تصادم سے محفوظ کر دیا ہے، اور جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ دوسرا ہے وہ مزاحمت و تصادم نہیں، تو یہ وہ معنیٰ ہے جو ان روایات سے ثابت ہوتا ہے جو اس آیت مبارکہ کے عرفہ کے دن نازل ہونے کو ثابت کرتی ہیں اور مؤمنین کو آگاہی دلاتی ہیں کہ اکمال

دین سے مُراد مسلمانوں اور ان کے دینی اعمال کو مشرکوں کے شر اور ان کی طرف سے مزاحمت سے نجات و خلاصی ہے کہ اب کوئی مشرک ان پر حملہ نہ کر سکے گا اور نہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکے گا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیہ مبارکہ ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' اسی وعدہ کی وفا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں مؤمنوں سے فرمایا: ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' اور اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فقرہ ''اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' سورۂ نور کے فقرہ ''وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ'' کے بالمقابل ایک ہی معنی کا افادہ کرتا ہے یعنی دونوں ہم معنیٰ ہیں لیکن سورۂ نور کی آیت کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے: ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے)۔ اس میں ''مِنْکُمْ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ وعدہ مسلمانوں کے مخصوص گروہ سے ہوا کہ جن کا ظاہر ان کے باطن سے یکساں ہے اور ان کے ظاہر و باطن میں یکرنگی پائی جاتی ہے، بنا برایں ان کے اعمال میں دین کی جس قدر جھلک پائی جاتی ہے وہ اسی دین کے مظاہر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام و دستورات کی صورت میں مقرر ہوا ہے، لہٰذا خدا کے پسندیدہ دین کے استقرار و استحکام سے مُراد اسی دین کا اکمال ہے جسے خداوند عالم نے خود پسند فرمایا اور اسے تشریع کے قالب میں ڈھالا اور اس کے اجزاء کو تدریجاً نازل کر کے انہیں ان پر عمل کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ اس کی بندگی کا حق ادا کریں، اور یہ سب کچھ کفار و مشرکین کے نا اُمید ہو جانے اور مسلمانوں کے دین سے انکی توقعات ختم ہو جانے کے بعد ہوا ہے اور یہ وہی معنیٰ و مطلب ہے جو ہم نے اکمالِ دین کی بابت کیا ہے اور کہا کہ اکمالِ دین سے مُراد اس کا احکام و دستورات کے حوالہ سے مکمل ہو جانا ہے کہ اب کوئی اور حکم صادر نہیں ہوگا اور جو کچھ صادر ہو چکا اور جن فرامین کی تشریع ہو چکی ہے اسی پر مہر لگا دی گئی ہے کہ اب کوئی حکم صادر نہ ہوگا، تو اس بناء پر اکمالِ دین سے مُراد یہ نہیں ہو سکتا کہ اب مشرکین مسلمانوں کے اعمال میں رخنہ اندازی نہ کر پائیں گے اور نہ ہی حج و دیگر اعمال میں ان کے ساتھ گھل ملیں گے کہ جس سے ان دونوں کے اعمال میں فرق پایا جا سکے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اکمالِ دین کا معنیٰ اسے اس بلند درجہ تک پہنچا دینا ہے کہ کمالیت کے بعد دوبارہ نقص و کمی کی طرف نہ جا سکے یعنی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد تنزلی کی طرف نہ لوٹ سکے۔

اس کی تصدیق و تائید تفسیر قمی میں مذکور روایت سے ہوتی ہے جسے مؤلف نے اپنے اسناد سے اس طرح بیان کیا کہ مجھے میرے والد نے صفوان بن یحییٰ کے حوالہ سے بتایا کہ انہوں نے علاء کے اسناد سے محمد بن مسلم کی روایت ذکر کی کہ انہوں نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی سنایا کہ آپؑ نے فرمایا: اخر فریضة انزلها الله الولایة ثم لم ینزل بعدها فریضة ثم انزل: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' بکراع الغمیم. فاقامها رسول الله (ص) بالجحفة فلم ینزل بعدها فریضة. اللہ تعالیٰ نے سب سے آخر میں فریضہ ولایت نازل فرمایا کہ اس کے بعد کوئی فریضہ

نازل نہیں کیا۔اس کے بعد یہ آیت ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' بکراع الغمیم کے مقام پر نازل فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا اعلان حجفہ کے مقام پر کیا،اس کے بعد اللہ نے کوئی فریضہ نازل نہیں فرمایا،(تفسیر القمی جلد اوّل،صفحہ ۱۶۲)

اسی مطلب پر مشتمل روایت تفسیر ''مجمع البیان'' میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے مذکور ہے اور تفسیر العیاشی میں بھی اسے زرارہ کے اسناد سے امام محمد باقرؑ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے،(ملاحظہ ہو:''مجمع البیان'' جلد ۳،صفحہ:۱۵۹)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسناد:

شیخ طوسیؒ نے الامالی میں اپنے اسناد سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ذکر کی کہ آپؑ نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے حوالہ سے فرمایا کہ انہوں نے کہا: سمعت رسول الله (ص) یقول: بناء الاسلام علیٰ خمس خصال: علی الشهادتین والقرینتین، قیل له: اما الشهادتان فقد عرفنا، فما القرینتان؟ قال: الصلوٰة و الزکاة، فانه، لاتقبل احد اهما الا بالاخریٰ، والصیام و حج بیت الله من استطاع الیه سبیلاً، و ختم ذلك بالولایة، فانزل الله عزوجل: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' (میں نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا وہ فرما رہے تھے: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: شہاتین اور قرینتین پوچھا گیا کہ شہادتین تو معلوم ہیں یہ قرینتین کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز اور زکوٰۃ، (قرینتین یعنی ایک دوسری سے پیوستہ اور ملی ہوئی)،اور وہ ایک دوسری سے اس حوالہ سے پیوستہ کہلاتی ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری کے بغیر قابل قبول نہیں ہوتی،اور تیسری روزے،چوتھا حج بیت اللہ کہ جسے اس کی استطاعت حاصل ہو اور پانچویں جو کہ ان سب کا اختتامی نکتہ ہے وہ ولایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا۔(الامالی،ج ۲،ص ۱۳۲)

امام محمد باقر علیہ السلام کا تصدیقی بیان:

کتاب ''روضۃ الواعظین'' میں فتال بن الفارسی نے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں حضرت امام محمد باقر علیہ

السلام کا تصدیقی بیان مذکور ہے کہ آپؑ نے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر حج اور مدینہ واپسی پر غدیر کے مقام پر امام علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان اور اس پر آیت کے نازل ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ خطبہ غدیر کہ جو نہایت طویل ہے سب کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ (روضۃ الواعظین ،ص۸۹)

اسی کے مانند کتاب الاحتجاج میں طبرسیؒ نے متصل اسناد کے ساتھ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے (الاحتجاج، جلد اوّل ص ۶۸) اور اس آیت کے ولایت کے بارے میں نازل ہونے کی بابت کلینیؒ نے کتاب اصول کافی، جلد ا،ص ۲۸۹) اور صدوقؒ نے العیون، ج ا،ص ۲۱۶۔ میں متصل سلسلہ سند کے ساتھ عبدالعزیز بن مسلم کے حوالہ سے امام رضا علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے، اور شیخ طوسیؒ نے الامالی۔ ج ا ص، ۱۲۴۔ میں اپنے اسناد کے ساتھ ابن ابی عمیر کے حوالہ سے مفضل بن عمر کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ ارشاد گرامی ذکر کیا جو آپؑ نے اپنے جد حضرت امیر المومنینؑ کے حوالہ سے پیش فرمایا کہ یہ آیت یعنی ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' ولایت کے بارے میں نازل ہوئی، اور طبرسیؒ نے تفسیر ''مجمع البیان۔ ج ۳ ص ۱۵۹'' میں اپنے اسناد کے ساتھ ابوہارون العبدی کے حوالہ سے ابوسعید الخذری کی روایت ذکر کی ہے جس میں اس آیت کے ولایت کی بابت نازل ہونے کو بیان کیا گیا ہے، اور شیخؒ نے الامالی۔ ج ۲ ص ۱۳۲۔ میں اپنے اسناد سے اسحاق بن اسماعیل نیشاپوری کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے جو آپ علیہ السلام نے اپنے آباء کرام کے حوالہ سے امام حسن بن علی علیہما السلام کا ارشاد گرامی قدر پیش کیا،

ہم نے ان روایات کے حوالہ جات ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے اور اصل روایات چونکہ بہت طولانی ہیں لہٰذا اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا کرنے کو ترجیح دی جو شخص ان روایات کو تفصیل کے ساتھ پڑھنا چاہے وہ مربوطہ کتب کا مطالعہ کرے، اللہ الھادی۔

سورۂ مائدہ۔ آیت ۴، ۵

○ ''یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ؗ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۴''

○ ''اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ؗ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَ لَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۵''

ترجمہ

○ ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا کچھ حلال کیا گیا ہے کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور وہ شکار، حلال کیا گیا ہے جسے تمہارے تربیت یافتہ شکاری جانوروں نے تمہارے لئے شکار کیا ہو کہ جنہیں تم نے خدائی تعلیمات کے مطابق سکھایا و سدھارا ہو، تو وہ جسے تمہارے لئے پکڑیں اُسے کھا سکتے ہو اور اس پر تکبیر پڑھو (اللہ کا نام لو) اور تقوئے الٰہی اختیار کرو، یقیناً اللہ بہت جلد محاسبہ کرنے والا ہے'' (۴)

○ ''آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئی ہیں اور ان لوگوں کا طعام تمہارے لئے حلال ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی اور تمہارا طعام ان کے لئے حلال ہے اور تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں مومنہ پاکدامن خواتین اور ان لوگوں کی پاکدامن خواتین جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی کہ جب تم ان کے حق مہر ادا کردو پاکدامنی کے ساتھ نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے اور نہ ہی غلط دوستیاں بنا کر! جو شخص ایمان کا انکاری ہو جائے تو اس کا عمل برباد ہوا اور وہ آخرت میں خسارہ والے لوگوں میں سے ہوگا''۔ (۵)

تفسیر و بیان

''یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ''

(آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے، کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں)

اس آیت مبارکہ میں جس سوال کا ذکر ہوا ہے وہ مطلق و عام ہے اور اسی کے مطابق اس کا جواب بھی مطلق و عام صورت میں دیا گیا ہے کہ جس میں حلال وحرام کے درمیان تمیز کرنے کا قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ حلال اسے کہتے ہیں جس میں تصرف کرنا اور اسے استعمال میں لانا ان چیزوں میں تصرف کرنے اور انہیں استعمال میں لانے کو پاکیزہ عمل کہا جاتا ہو، اور ''طیب'' و پاکیزہ قرار دیئے جانے میں بھی جو اصل معیار ملحوظ ہے وہ عام افراد کے فہم وادراک کی بناء پر ہے لہٰذا جسے عمومی طور پر پاکیزہ کہا جاتا ہو وہ ''طیب'' کا مصداق کہلائے گا اور جو چیز بھی ''طیب'' کا مصداق قرار پائے وہ حلال ہے۔

اور اگر ہم نے حلال وطیب ہونے کا معیار عمومی فہم وطرز فکر کو قرار دیا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ لفظ کے معنی کا تعین عمومی فہم پر موقوف ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں علم الاصول کی بحثوں میں وضاحت موجود ہے۔ اور فقرہ ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ ۫ فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ'' کی بابت کہا گیا ہے کہ اس کا عطف ''الطیبات'' پر ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے وہ جانور جسے تمہارے سکھائے وتربیت یافتہ جانور نے کاٹ کھایا ہو کہ تم اس کا گوشت کھا سکتے ہو (اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ)۔

بنابرایں یہاں ''اُحِلَّ لَکُمْ'' کو صرف اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے حذف کیا گیا ہے۔ کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے یعنی جملوں کے تسلسل و پیوستگی سے اس کا ثبوت ملتا ہے، لیکن ظاہراً اس فقرہ کا عطف پہلے جملہ پر قرین صحت ہے اور ''مَا عَلَّمْتُمْ'' میں حرف ''مَا'' شرطیہ ہے کہ جس کی جزا جملہ ''فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ'' ہے لہٰذا اختصار کی بناء پر حذف کئے

جانے کے فرضیہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لفظ ''جوارح'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''جارحۃ'' ہے کہ جس کا معنیٰ شکاری جانور ہے خواہ پرندہ ہو یا درندہ ہو مثلاً شکاری پرندے اور شکرہ، باز، کتا اور تیندوا وغیرہ۔

''مُكَلِّبِيْنَ'' یہاں ''الْجَوَارِحِ'' سے حال کا صیغہ ہے اور ''تکلیب'' کا معنیٰ کتے کو شکار کرنے کی تربیت دینا ہے یا یہ کہ کتوں کو صرف شکار کرنے کیلئے اپنے پاس رکھنا ہے اور یہاں ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' کو ''مُكَلِّبِيْنَ'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کرنے میں اس امر کی طرف دلالتی اشارہ ہے کہ اس میں مذکور حکم شکاری کتے کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ دیگر درندوں پر لاگو نہیں ہوتا، اور فقرہ ''مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ'' میں ''عَلَيْكُمْ'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیت کا حکم اس صورت سے محدود ہے جب شکاری کتے نے اپنے مالک کے لئے اسے شکار کیا ہو نہ کہ خود اپنے لئے! اس بناء پر اگر کوئی شکاری کتا کہ جسے اس کے مالک نے شکار کرنے کیلئے نہ چھوڑا ہو بلکہ وہ خود کسی جانور پر حملہ کر کے اسے مار دے تو اس کا گوشت کھانا حلال نہ ہوگا۔ اور فقرہ ''وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ'' حلیت کی آخری شرط کو بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ شکار، شکاری جانور کے ذریعے سے ہو اور شکاری کتے نے اس پر حملہ کر کے اسے اپنے مالک کے لئے قابو میں کیا ہو لیکن اس پر تکبیر پڑھنا ضروری ہے یعنی اس کے مالک نے اُسے شکار کی طرف بھیجنے سے پہلے اس پر اللہ کے نام کا ذکر کیا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر تربیت یافتہ شکاری کتے کسی جانور پر حملہ کریں کہ جس کا گوشت ذبح کے بغیر حلال نہ ہو اور اس کے مالک نے اسے شکار کے لئے روانہ کرتے ہوئے تکبیر پڑھی ہو تو ذبح کئے بغیر اس کا گوشت کھانا جائز ہے بشرطیکہ شکاری کتے نے اسے اپنے مالک کے پہنچنے اور اس پر قابو پانے سے پہلے مار دیا ہو تو اس طرح درندہ کا اسے مار دینا ہی تذکیہ اور حلال ہونے کا سبب کہلائے گا لیکن اگر درندہ و شکاری کتے نے اسے مالک کے قابو کرنے سے پہلے قتل نہ کر دیا ہو بلکہ صرف زخمی کیا ہو اور وہ جانور ابھی زندہ ہو تو اس پر تکبیر پڑھ کر اسے ذبح کرنا ہی اس کا گوشت کھانے کو حلال کر سکتا ہے۔

ان احکام و شرائط کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ'' (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، بے شک اللہ جلد حساب و کتاب کرنے والا ہے)، اس میں جانور کے گوشت کی حلیت کے حکم میں تقوائے الٰہی کی پاسداری کی تاکید مذکور ہے تاکہ شکار میں بے راہ روی و حد سے تجاوز نہ کیا جائے اور ان کے قتل میں اصول و ضوابط کی عملی پاسداری کی جائے اور تفریح و عیاشی اور اپنی خودنمائی و طاقت کے مظاہرہ کے لئے بے زبانوں کو موت کے گھاٹ نہ اُتارا جائے جیسا کہ عام طور پر لہو و لعب کی غرض سے شکار کھیلے جاتے ہیں، بلکہ جائز مقاصد کیلئے یعنی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ایسا کیا جائے اور یہ بات ملحوظ و مدنظر رہے کہ اللہ تعالیٰ سریع الحساب ہے اور ظلم و زیادتی کرنے کی سزا آخرت سے پہلے دُنیا ہی میں

دیتا ہے چنانچہ یہ حقیقت مشاہدات میں آچکی ہے کہ اس طرح کے مظالم وزیادتیوں اور بے زبانوں کے ساتھ ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کرنے والے نہایت بُرے انجام سے دوچار ہوئے ہیں کہ جس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

اہلِ کتاب کے طعام کی حلیّت:

''اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ'' اس آیہ مبارکہ میں ''طیبات'' (پاکیزہ چیزوں) کی حلیت کا حکم دوبارہ ذکر ہوا ہے جبکہ اس سے ماقبل آیت میں یہ حکم ذکر ہو چکا تھا (اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ)، اور اس آیت کا آغاز ''اَلْيَوْمَ'' (آج) کے لفظ سے ہوا جس سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ اُن کے لئے اہل کتاب کے طعام کو حلال کیا اور ان کی پاکدامن مؤمنہ عورتوں کو ''طیبات'' کا مصداق قرار دے کر ان کے لئے حلال فرمایا، اور یہاں فقرہ ''اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' کا فقرہ ''وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' کے ساتھ ضمیمہ کرنا دراصل ایک مسلم الثبوت اور قطعی ویقینی چیز کو مشکوک وغیر یقینی چیز کے ساتھ ملا کر بیان کرنے کے طور پر ہے تاکہ اس کی بابت مخاطب کے ذہن میں کامل اطمینان پیدا ہو اور اس کے بارے میں ہر طرح کی غیر یقینی کیفیت اور قلبی بے ثباتی کا ازالہ ہو جائے اور اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کوئی آقا اپنے خادم سے کہے کہ میں نے جو اموال تیرے ہاتھ میں قرار دیئے ہیں وہ سب تیرے ہیں اور اس کے ساتھ فلاں چیز بھی تیری ہے، یہ اس لئے ہے کہ خادم اگر اس چیز کے بارے میں غیر یقینی کیفیت کا شکار ہو کہ آیا اس کے آقا نے وہ چیز اس کی ملکیت میں دی یا نہیں تو اس وقت پہلے ملکیت میں قرار دی جانے والی چیزوں کو یاد کر کے اس چیز کے بارے میں اس کا شک یقین میں تبدیل ہو جائے گا اور اسے اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ وہ چیز بھی اس کی ملکیت میں قرار دی گئی ہے، چنانچہ درج ذیل آیتیں بھی اسی باب سے ہیں:

- سورۂ یونس، آیت: ۲۶

''لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ''

(ان لوگوں کے لئے جنہوں نے نیکی کی، نیک صلہ ہے اور اضافہ بھی ہے)

- سورۂ قٓ، آیت: ۳۵

''لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ''

(اُن کے لئے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کے دلوں میں اہل کتاب کے طعام کے بارے میں غیر یقینی کیفیت تھی کیونکہ

انہوں نے ان کے ساتھ معاشرت ومیل جول اور دوستی کی بابت سخت ترین احکام سنے تھے لہٰذا جاری سلسلہ کلام میں ان کے طعام کی حلیت کا حکم بیان کیا گیا جس سے مؤمنین کو معلوم ہو گیا کہ اہل کتاب کا طعام دیگر طیبات میں شامل ہے اور ان کا قلبی اضطراب ختم ہوا اور ان کے دلوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ یہی بات فقرہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' میں ہے تا کہ مؤمنین مطلع رہیں کہ اہل کتاب کی پاکدامن عورتیں مسلمانوں پر حلال ہیں اسی لئے ان کے ساتھ پہلے پاکدامن مؤمن عورتوں کا ذکر کیا گیا۔

اور جہاں تک جملہ ''وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ'' کا تعلق ہے تو بظاہر یہ ایک ہی جملہ ہے اور اس میں ایک ہی مطلب مقصود ہے، کیونکہ یہ بات واضح ومعلوم ہے کہ جملہ ''وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ'' میں اہل کتاب کے لئے مسلمانوں کے طعام کی حلیت کا بیان کرنا مقصود نہیں اور نہ ہی ان کے اس سلسلہ میں مُکلف ہونے کی طرف توجہ مبذول کرانا مطلوب ہے اگر چہ کفار کو اصولِ دین کی طرح فروع دین کا بھی مُکلف سمجھتے ہیں جبکہ وہ اللہ ورسولؐ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے احکام ودستورات پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ ان کی بابت کچھ سننے اور ماننے کو تیار ہیں اور یہ بات قرآنی بیانات کے اسلوب وطرزِ اظہار کے خلاف ہے کہ وہ کسی ایسے حکم پر مشتمل ہوں جو عملی نتیجہ کے حوالہ سے بے اثر وغیر مفید ہو اور اس کی بابت کچھ کہنا لقلقۂ زبان سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو (معاذ اللہ)، البتہ قرآنی بیانات میں یہ حقیقت واضح دکھائی دیتی ہے کہ اظہارِ مقصود وتوضیح مطلوب کی غرض سے خطاب کے انداز واسلوب میں تبدیلی کی جاتی ہے مثلاً لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے اس کا رخ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور اس طرح کے دیگر انداز واسلوب قرآنی آیات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں جیسا کہ سورۂ آل عمران، آیت: ۶۴ میں ارشاد ہوا: ''قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ'' (کہہ دیجئے! اے اہل کتاب، آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے)، اور سورۂ اسرائیل، آیت ۹۳، میں ارشاد ہوا: ''قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا'' (کہہ دیجئے کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک انسان ہوں جسے رسالت عطا کی گئی ہے)، یہ اور اس طرح کی دیگر آیات مبارکہ میں خطاب کے انداز میں تبدیلی اظہارِ مقصود کے تقاضوں کے مطابق ہوئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جملہ ''وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ'' میں دو مستقل احکام بیان نہیں کئے گئے کہ جس کی بناء پر کہا جائے کہ ایک حکم یہ ہے کہ اہل کتاب کا طعام مسلمانوں کے لئے حلال ہے اور دوسرا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کا طعام اہل کتاب کے لئے حلال ہے بلکہ اس میں ایک ہی حکم کا بیان مقصود ہے اور وہ ''طعام'' کے حلال ہونے اور اس کے حرام وممنوع نہ ہونے کا اظہار! کیونکہ اس میں ممنوعیت ہی نہیں ہے کہ جس کی بناء پر یہ کہا جا سکے کہ اس حکم کا تعلق کسی

ایک گروہ سے ہے جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکور ہے:

○ سورۂ الممتحنہ، آیت:۱۰

''فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ''

(پس اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ خواتین، مؤمنات ہیں تو اُنہیں کفار کی طرف واپس نہ لوٹاؤ، کہ وہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ ہی کفار اُن کے لئے حلال ہیں)

یعنی ان کے درمیان حلیت ہے ہی نہیں کہ آیت میں حلیت کا حکم ان میں سے ایک کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے۔ اور لفظ ''طعام'' کا لغوی معنٰی ہر کھائی جانے والی چیز ہے کہ جو کھانے والے کی ''غذا'' قرار پائے، لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مُراد گندم اور اس طرح کی دیگر چیزیں ہیں چنانچہ لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں یوں مذکور ہے: ''اهل الحجاز اذا اطلقوا اللفظ بالطعام عنوا به البر خاصة'' (اہلِ حجاز جب لفظ ''طعام'' بولتے ہیں تو اس سے اُن کی مُراد صرف گندم ہوتی ہے)۔ یعنی جب اس کے ساتھ کوئی قرینہ واضافت وغیرہ نہ ہو تو اس سے گندم مراد لی جاتی ہے۔ اس کے بعد مؤلف کتاب لسان العرب نے لکھا ہے کہ خلیل نے بھی یوں کہا ہے: ''العالی فی کلام العرب ان الطعام هو البر خاصة'' (عام طور پر عربی زبان میں لفظ ''طعام'' سے گندم ہی مُراد لی جاتی ہے۔) ملاحظہ ہو: لسان العرب جلد ۲، صفحہ ۵۹۳، یہی معنٰی کتاب النہایہ میں ابن اثیر کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ آئمہ اہل بیتؑ سے منقول روایات میں بھی یہ مذکور ہے کہ آیہ مبارکہ میں ''طعام'' سے مُراد گندم اور اس جیسی دیگر اشیاء ہیں سوائے بعض روایات کے کہ جن میں اس کے علاوہ معنٰی مذکور ہے کہ اس کی بابت ''روایات پر ایک نظر'' میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

بہرحال یہ بات قطعی ومسلم ہے کہ آیہ مبارکہ میں اہل کتاب کے ''طعام'' کی حلیّت کے حکم میں ان جانوروں کا گوشت شامل نہیں جن کا تذکیہ نہیں ہوسکتا مثلاً خنزیر کا گوشت یا وہ جانور کہ جن کا تذکیہ تو ہوسکتا ہے لیکن اُنہوں نے اس کا تذکیہ نہ کیا ہو یعنی اسلامی طریقہ پر انہیں ذبح نہ کیا گیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ بالا حرام کی گئی چیزوں کو کہ جن کا ذکر سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ انعام اور سورۂ نحل کی چار آیتوں میں ہوا ''رجس'' (گندگی و پلیدی)، ''فسق'' (غلط کاری) اور ''اثم'' (گناہ) قرار دیا ہے جیسا کہ ہم سابقہ ذکر شدہ مطالب میں بیان کر چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ جس چیز کو رجس، فسق اور اثم قرار دے اور پھر اسے حلال قرار دے کر احسان جتلاتے ہوئے یوں فرمائے: آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہے (اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ)۔

اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ یہی محرمات۔ یعنی حرام کی گئی چیزیں اس آیت سے پہلے بھی اسی

سورت میں ذکر ہو چکی ہیں، لہٰذا کوئی شخص اس طرح کے موارد میں ''نسخ'' کی بات نہیں کرسکتا اور یہ ایک واضح امر ہے، خاص طور پر سورۂ مائدہ کی بابت تو یہ بات ہرگز قرین صحت نہیں کیونکہ روایات میں مذکور ہے کہ اس سورت میں ناسخ آیات تو ہیں مگر منسوخ آیات نہیں ہیں۔

پاکدامن عورتوں کے بارے میں!

''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ''

(اور پاکدامن مؤمنات اوران لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی)

اس آیت میں ''الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' (وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی) کہا گیا ''یہود ونصاریٰ'' (اہل کتاب میں سے!)، تو اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ صفت حکم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی حکم اسی پر موقوف ومنحصر ہے، بنابرایں یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ اس میں طرزِ سخن احسان ومنّت والا ہے اور مقام بھی نرمی وآسانی دینے کا ہے لہٰذا آیت کا معنیٰ یوں کیا جائے گا: ہم تم پر احسان کرتے ہیں کہ تمہارے مردوں اور اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں کے درمیان رشتہ ازدواج قائم کرنے کی ممنوعیت کو ختم کرتے ہوئے آسانی ونرمی پر مبنی حکم جاری کرتے ہیں کیونکہ وہ دیگر غیر مسلم گروہوں کی نسبت تم سے زیادہ نزدیک ہیں اور وہ وہی ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے اور وہ توحید ورسالت پر یقین رکھتے ہیں جبکہ ان کے برعکس مشرکین و بت پرست نبوت کے منکر ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ''الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' میں حکم اس علت وصفاتی بنیاد کے ساتھ مشروط ووابستہ ہے اسی طرح اس کے ساتھ ''مِنْ قَبْلِكُمْ'' کے الفاظ میں بھی ان کی باہمی آمیزش ومیل جول اور اجتماعی و معاشرتی مشترکات کی طرف واضح اشارہ ہے۔

بہرحال یہ بات واضح وآشکار ہے کہ یہ آیت چونکہ منّت واحسان اور نرمی وآسانی کے بیان واظہار کے مقام میں ہے لہٰذا اس میں نسخ کی گنجائش نہیں پائی جاتی جیسا کہ درج ذیل آیتوں میں واضح ہے:

''وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ'' (اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں)۔سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۱۔

''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' (اور تم کافر عورتوں کے ساتھ اپنے سابقہ نکاح کو باقی نہ رکھو) سورۂ ممتحنہ، آیت ۱۰)

یہ ایک واضح وآشکار مطلب ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ پہلی آیت سورۂ بقرہ کی ہے جو کہ سورۂ مائدہ سے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی مفصل سورت ہے۔اور اسی طرح دوسری آیت جو سورۂ ممتحنہ کی

ہے جو کہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ میں نازل ہوئی اور وہ بھی سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی۔ بنابرایں پہلے نازل ہونے والی سورت بعد میں نازل ہونے والی سورت کو کیونکر منسوخ کرسکتی ہے جبکہ روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ سورۂ مائدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے لہٰذا اس نے اپنی ماقبل سورتوں میں نازل ہونے والی آیات کو منسوخ کیا جبکہ کوئی آیت اس کی آیتوں کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ ان تمام مطالب کے علاوہ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۱ (وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتّٰى يُؤْمِنُوا) کی تفسیر میں جو کہ المیزان جلد ۲ میں بیان ہوچکی ہے۔ واضح طور پر ذکر کیا کہ یہ دو آیتیں یعنی سورۂ بقرہ ۲۲۱ اور سورۂ ممتحنہ آیت ۱۰ اہل کتاب کی خواتین سے نکاح کی حرمت سے تعلق ہی نہیں رکھتیں۔

اور اگر یہ بھی کہا جائے کہ سورۂ ممتحنہ کی آیت ایک حوالہ سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت کا احسان وآسانی عطا کرنے کے مقام میں ہونے کے حوالہ سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی ممنوعیت پر دلالت کرنا ہے کہ جسے ایمان والوں پر احسان ومنت کے طور پر ختم کیا گیا۔ کہ اگر پہلے ممنوعیت نہ ہوتی تو حلیّت کا حکم منت واحسان قرار نہ پاتا۔ تب بھی سورۂ مائدہ کی آیت، سورۂ ممتحنہ کی آیت کے لئے ناسخ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے برعکس نہیں ہوسکتا کیونکہ ناسخ کا مقام بعد میں آتا ہے اور جو حکم کسی حکم کو منسوخ کرے وہ منسوخ حکم کے بعد میں آتا ہے پہلے نہیں آتا، بہرحال ''روایات پر ایک نظر'' میں دوسری آیت کے بارے میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

''محصنات'' سے کیا مُراد ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''محصنات'' سے اس آیہ مبارکہ میں کیا مُراد ہے؟ اس کا معنٰی ''پاکدامن عورتیں'' ہے جو کہ ''احصان'' کے متعدد معانی میں سے ایک ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جملہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' میں ''محصنات'' سے مُراد غیر شادی شدہ عورتیں ہیں کہ ظاہر و واضح معنٰی ہے، اور چونکہ یہاں اہل کتاب کی ''محصنات'' کو مؤمنہ محصنات کے ساتھ یکجا ذکر کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں مقامات میں اس کا معنٰی ایک ہی ہو جیسا کہ ''محصنات'' کے معنٰی کی وضاحت پہلے کی جاچکی ہے لہٰذا اس کی روشنی میں دونوں جگہوں پر اس کا ایک ہی معنٰی کیا جائے گا اور یہاں ''احصان'' سے اسلام مُراد لینا بھی صحیح نہیں کیونکہ ''اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' کے الفاظ سے اس کی نفی ہوئی ہے (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ) میں بھی یہی معنٰی مقصود ہوگا جبکہ یہ درست نہیں کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے محصنات کی بابت ہے جو کہ مسلمان نہیں، اور نہ ہی ''محصنات'' سے مُراد ''آزاد عورتیں'' ہیں (یعنی جو کنیزیں نہ ہوں)

کیونکہ آیت مبارکہ میں جو منّت و احسان ملحوظ ہے اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں اہل کتاب کی وہ عورتیں مُراد و مقصود ہیں جو کنیزیں نہ ہوں بلکہ آزاد ہوں، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اہل کتاب کی محصنات سے مُراد پاکدامن عورتیں ہیں خواہ وہ کنیزیں ہوں یا آزاد ہوں، بنابرایں آیہ مبارکہ میں ''احصان'' سے مُراد صرف ''پاکدامن ہونا'' ہے لہٰذا ''المحصنات'' سے مُراد ''پاکدامن عورتیں'' ہی ہے۔

ایک اہم نکتہ:

آیت مبارکہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اہل کتاب کی پاکدامن عورتیں مؤمنین کے لئے حلال ہیں اس میں یہ بھی شرط نہیں کہ ان کے ساتھ کیا جانے والا نکاح دائمی ہو یا منقطع (متعہ) ہو، البتہ یہ شرط ملحوظ ہے کہ ''نکاح'' ہونا چاہیے کہ جس میں حق مہر قرار دیا جائے اور زنا و غیر شرعی دوستیاں نہ ہوں، اس بناء پر یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ مؤمنین کے لئے اہل کتاب کی خواتین کے حلال کئے جانے میں بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ نکاح کیا جائے کہ جس میں حق مہر اور دیگر حقوق ملحوظ ہوتے ہیں، بدکاری نہ کی جائے، نکاح میں دائمی و غیر دائمی ہونے کی کوئی شرط ملحوظ نہیں چنانچہ سورۂ نساء کی آیت ۲۴ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ'' کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ''متعہ'' نکاح ہی ہے جس طرح دائمی نکاح ہوتا ہے، (ملاحظہ ہو: المیزان جلد ۴) اس بحث کے دیگر متعلقہ مطالب سے آگاہی کے لئے علم الفقہ کی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔

اور آیہ مبارکہ: ''إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ'' سورۂ نساء کی آیت ۲۴ کی مانند نکاح سے مربوط حرمت و حلیت کے احکام پر مشتمل آیات میں سے ہے کہ جس میں یوں ارشاد الٰہی ہوا: ''وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ'' (اور تمہارے لئے اس کے علاوہ حلال کیا گیا ہے کہ تم اپنے اموال خرچ کرکے پاکدامن بن کر نکاح کرو بدکار بن کر نہ کرو)۔ تو یہ جملہ ''إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ'' ایک قرینہ وکلامی اشارہ ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں سے نکاح کرنا حلال و جائز ہے اس میں ان کی کنیزیں خریدنے کا جواز شامل نہیں۔

ایمان اور کفر:

''وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ''

(اور جو شخص ایمان کا منکر ہو جائے تو اس کا عمل برباد ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا)

''کفر'' کا لغوی معنی چھپانا، پوشیدہ کرنا ہے لہٰذا اس کے مفہوم کا وجود پذیر ہونا کسی ایسی چیز پر موقوف ہے جو موجود ہو کہ جس پر پردہ ڈالنا ممکن و قابل تصور ہو جیسا کہ ''حجاب'' کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ''محجوب'' (جس پر حجاب ڈالا گیا ہو) موجود نہ ہو، بنابرایں ''کفر'' کے لئے بھی کسی ایسی چیز کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہوگا جسے چھپایا جائے اور اسے مخفی کیا جائے مثلاً اللہ کی نعمت کا کفر، اللہ کی آیات کا کفر، اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے دن کا کفر، اس تناظر میں جملہ ''یَکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ'' سے مضبوط بنیاد پر استوار ایمان کا ہونا ثابت ہوتا ہے یعنی یہ جملہ اس امر کا متقاضی ہے کہ پختہ ایمان موجود ہو اور اس پر پردہ ڈالا جائے، لہٰذا ایمان کا مصدری معنیٰ یعنی تسلیم کرنا و قبول کرنا مُراد نہیں بلکہ اس سے اس کا اسم المصدری معنیٰ مُراد ہے جو کہ مؤمن کے دل میں پائی جانے والی مخصوص صفت اور قبول کر لینے سے حاصل ہونے والا اثر ہے یعنی وہ برحق اعتقادات کہ جو اعمال صالحہ کا سرچشمہ قرار پاتے ہیں، اس بناء پر ایمان کا کفر اور اس پر پردہ ڈالنے کے معنیٰ کی برگشت اس چیز پر عمل کرنے کو ترک کرنے کی طرف ہوگی جس کے حق ہونے کا علم و یقین ہو مثلاً مشرکین سے دوستی و ہم نشینی، ان کے ساتھ گھل مل کر رہنا، ان کے اعمال میں ان کے ساتھ شریک ہونا جبکہ اسلام کی حقانیت کا علم ہو یعنی یہ جاننے کے باوجود کہ اسلام برحق دین ہے مشرکوں کے ساتھ ان کے مشرکانہ اعمال میں شریک ہونا اور دینی ارکان مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے بارے میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ دین کے بنیادی ستون ہیں انہیں ترک کرنا۔

تو یہ ہے ''یَکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ'' کا مطلب! لیکن یہاں ایک نہایت اہم نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ کفر کا معنیٰ چونکہ چھپانا اور پردہ ڈالنا ہے کہ جس سے عام طور پر ہمیشہ و مسلسل ایسا کرنا اور کرتے رہنا سمجھا جاتا ہے لہٰذا ''یَکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ'' کا اطلاق اس مورد میں صحیح ہوگا جب انسان اس کام کو ترک کرے جو اس کے ایمان کا تقاضہ ہے اور اس پر عمل کرنا اس کے ایمان و عقیدہ میں شامل ہے اور اس ترک کرنے کی حالت پر قائم رہے یا دو بار ایسا کرے تو اس پر کفر کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ اسے ''فسق'' سے موسوم کیا جائے گا کہ جس کا اس نے ارتکاب کیا۔

مذکورہ بالا مطلب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ ''یَکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ'' سے مُراد اس حالت میں قائم رہنا اور مسلسل اس کو اپنانا ہے اگرچہ اسے صفت کی بجائے فعل کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے مُراد دائمی و مسلسل کفر ہے لہٰذا جو شخص حق کے حق ہونے کا یقین رکھتا ہو اور کسی عمل کا دین کے ارکان میں سے ہونا اس کے نزدیک یقینی طور پر ثابت ہو چکا ہو اس کے باوجود اس کے اتباع و پیروی کو ترک کرے تو وہ ''یَکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ'' کا مصداق قرار پائے گا اور اس کا عمل باطل و برباد ہوگا جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ''فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ'' (تو اس کا عمل برباد ہو گیا)۔

بنابرایں زیر نظر آیۃ مبارکہ درج ذیل آیۃ شریفہ سے بھرپور مطابقت کی حامل ہے:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۴۷

''وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا عَنۡہَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ؕ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ''

(اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اس پر چل پڑتے ہیں یہ اس لئے ہے کہ اُنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے روگرداں ہوئے، اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور آخرت کے دن ہمارے روبرو پیش ہونے کو نہ مانا ان کے اعمال برباد ہوگئے، انہیں ان کے کئے کی ہی سزا دی گئی)۔

یعنی ان کے اعمال کی بربادی ہی ان کی طرف سے تکذیب آیات کی سزا کے طور پر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں ذکر کیں: ایک ان کا گمراہی کا راستہ اپنانا، دوسرا ان کا حق کا راستہ چھوڑ دینا اور یہ دونوں کام گمراہی اور حق کے راستہ کے بارے میں یقین حاصل ہونے کے باوجود انجام پائے، اور تیسرا آیات الٰہی کی تکذیب کرنا، اور یہ بات واضح ہے کہ کسی چیز کا آیت و نشانی ہونا اس کی دلالت پر یقین حاصل ہونے کے بعد ہوتا ہے، پھر اس کی تفسیر آخرت کی تکذیب کے حوالہ سے کی کیونکہ اگر آخرت کی تکذیب نہ کی جائے تو اس کے بارے میں علم و یقین، حق کو ترک کرنے سے روکتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کی بربادی سے مطلع فرمایا (حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ)۔

اس آیت کی مانند درج ذیل آیت ملاحظہ ہو:

○ سورۂ کہف، آیت ۱۰۴ تا ۱۰۵

''قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا ﴿۱۰۳﴾ؕ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ لِقَآئِہٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ لَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَزۡنًا''

(کہہ دیجئے کہ کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں مطلع کریں جو اپنے اعمال کی بناء پر نہایت نقصان اُٹھانے والے ہیں، وہ لوگ ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی میں کی جانے والی کوششیں بے نتیجہ ہوگئیں جبکہ وہ اپنے تئیں یہ گمان کرتے ہیں کہ جو کام وہ انجام دیتے ہیں وہی درست ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اس کے حضور پیش ہونے کو جھٹلایا تو ان کے اعمال ضائع و بے نتیجہ ہوگئے لہٰذا قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔)

ان آیات کا ''کفر بالایمان'' کے مذکورہ معنٰی پر منطبق ہونا واضح ہے یعنی کفر بالایمان کا جو معنٰی ہم نے ذکر کیا ہے وہ ان آیات میں مذکور مطالب سے بھرپور مطابقت رکھتا ہے۔

ان مطالب پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جملہ ''وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُہٗ'' اپنے ماقبل جملہ سے مربوط و پیوستہ ہے لہٰذا یہ جملہ سابقہ بیان کی تکمیلی حیثیت کا حامل ہے اور اس میں مؤمنین کو اس

ممکنہ خطرہ سے باخبر ومتنبہ کیا گیا ہے کہ جو انہیں اللہ کے احکام کی بابت تساھل و بے پرواہی کرنے اور کفار کے ساتھ دوستی و ہمدستی اپنانے کی وجہ سے لاحق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے اہل کتاب کا طعام حلال کیا اور ان کی پاکدامن عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو جائز قرار دیا تاکہ اللہ کی طرف سے مؤمنوں کے لئے آسانیاں ونرمیاں ہوں اور اس طرح مسلمانوں میں تقویٰ اور پاکیزہ اسلامی اقدار واخلاق کے راسخ وعام ہوجانے کے نتیجہ میں دوسروں کو دین اسلام کی اعلیٰ و ارفع تعلیمات کی طرف توجہ ودعوت ملے گویا مسلمانوں کا ان اقدار واخلاق کو اپنانا احکام کی تشریع کا اصل ہدف ہے اور ایسا نہیں کہ اہل کتاب کی پاکدامن خواتین سے شادی کرنے کے جواز کو اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل اور ہوس پرستی کے لئے وسیلہ وبہانہ کے طور پر استعمال کریں اور اپنے آپ کو ان سے محبت ودللگی کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کے حسن وجمال پر مرمٹتے ہوئے اپنے آپ کو ہلاکت وتباہی سے ہمکنار کردیں کہ پھر انہی کی عادات واطوار مسلمانوں کی عادات واطوار اور اخلاق و صفات پر غالب آجائیں اور ان کی غلط کاریاں مسلمانوں کی نیکیوں پر پانی پھیر دیں اگر ایسا ہوتو معاشرہ کی تباہی وبربادی یقینی ہوجائے گی اور مومنین اپنے پچھلے پاؤں اپنے گمراہ ماضی کی طرف پلٹ جائیں گے کہ جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو تباہی و بربادی میں بدلنے اور اس کی عطا کردہ نرمی وآسانی کی نعمت کو نقمت وعذاب میں تبدیل کردینے کے سوا کچھ نہ ہوگا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے طعام کو حلال قرار دینے اور ان کی پاکدامن خواتین سے شادی کرنے کے جواز کو بیان کرنے کے بعد مؤمنین کو خبردار کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان نعمتوں سے استفادہ کرنے میں حد سے تجاوز کریں یہاں تک کہ کفر بالایمان تک جا پہنچیں اور دین کے بنیادی ارکان کو ترک کرتے ہوئے حق وحقیقت سے روگردانی کے مرتکب ہوجائیں کیونکہ ان کا ایسا کرنا ان کے اعمال کی بربادی اور اُخروی خسارہ وتباہی کا سبب بنے گا۔

یہاں قارئین کرام کو اس مطلب سے آگاہ کرنا ضروری ہے کہ مفسرین نے آیۂ مبارکہ ''اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' کے ذیل میں نہایت گہرائی میں جاکر مربوطہ مطالب پر غور وفکر اور اظہار رائے کیا ہے جس کے نتیجہ میں عجیب وغریب تفسیریں سامنے آئی ہیں کہ جو آیت کے ظاہر اللفظ سے مطابقت نہیں رکھتیں اور آیت کا سیاق بھی ان کی نفی کرتا ہے مثلاً:

۱۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جملہ ''اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' میں ''طیبات'' (پاکیزہ چیزوں) سے مُراد پاک کھانے ہیں جیسے دریائی مچھلی (بحیرہ)، اُونٹنی (سائبہ)، بکری (وصیلہ)، اُونٹ (حامی)۔

۲۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ جملہ ''وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ اصولی طور پر اللہ تعالیٰ نے کوئی طعام تم پر حرام قرار نہیں دیا اور اہل کتابِ کے ذبیحہ کا حلال ہونا بھی اسی باب سے ہے خواہ انہوں نے اسے اپنے دین کے اصولوں کے مطابق ہی ذبح کیوں نہ کیا ہو؟

۳۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے طعام سے مُراد ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہے کہ وہ تمہارے لئے جائز

قرار دیا گیا ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے کہا کہ جملہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' میں پاکدامن مؤمنات اور پاکدامن کتابیہ عورتوں کا حلال ہونا قاعدہ کلیہ کی بناء پر ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ حرام قرار نہیں دی گئی تھیں بلکہ سورۂ نساء آیت: ۲۴ میں جملہ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ'' ان کے حلال وجائز ہونے کا کافی ووافی ثبوت دیتا ہے۔

۵۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جملہ ''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ'' مسلمانوں کو خبردار کرنے اور انہیں اس ابتدائی آیت میں مذکور حکم یعنی اہل کتاب کے طعام کی حلیت وجواز اوران کی پاکدامن عورتوں سے شادی کے جواز کو رد کرنے سے باز رہنے کی تاکید پر مشتمل ہے، (ان اقوال کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کے لئے ملاحظہ ہو: تفسیر المنار جلد ۶، صفحہ: ۱۸۴)

یہ اور اس طرح کے دیگر معانی کے بارے میں مفسرین نے اپنی تحریروں میں ان کی ممکنہ صحت کا خیال ظاہر کیا ہے جبکہ ان میں کوئی وزن پایا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی ٹھوس دلیل ان کا اثبات کرتی ہے بلکہ وہ من گھڑت آراء و بے بنیاد نظریات ہیں جیسا کہ بعض حضرات نے کہا کہ جملہ ''اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمْ'' سابقہ حلال کی گئی چیزوں کا تقییدی بیان ہے حالانکہ یہ قول بلادلیل ہے اور اسے پیش کرنے والے نے اپنے مدّعا کی صحت پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی، یا بعض حضرات کا وہ قول کہ اس میں ان چیزوں کے حلال ہونے کا ذکر ہے جو قاعدہ کلیہ کی رو سے پہلے ہی حلال ہیں حالانکہ اس قول کی آیت میں مذکور لفظ ''اَلْيَوْمَ'' (آج) سے نفی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ اگر ایسا ہو تو پھر منت و اِحسان اور نرمی وآسانی کے حوالے بے معنی ہو جاتے ہیں لہٰذا ہمارے سابقہ بیان کہ جو ان امور کی بابت ہم ذکر کر چکے ہیں اس کے تناظر میں ان تمام احتمالی معانی وآراء کی نفی ہو جاتی ہے اور وہ ان کے قرین صحت نہ ہونے کے اثبات میں کافی ہے۔ اور جملہ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ'' کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ اس سے کتابیہ عورت سے شادی کا جواز ثابت ہوتا ہے تو اس کا نادرست وغلط ہونا اس حوالہ سے واضح ہے کہ یہ آیت صرف نسب وسبب کی بنیاد پر عورتوں سے نکاح کرنے کے حلال یا حرام ہونے کے حکم کے بیان پر مشتمل ہے اس کا تعلق ادیان ومذاہب کی بنیاد پر طبقات کی تقسیم بندی اور ان کے حلال یا حرام ہونے کے حکم سے نہیں۔

روایات پر ایک نظر!

تفسیر ''درمنثور'' کی چار روایتیں

پہلی روایت: آیہ مبارکہ ''یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَہُمۡ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے عکرمہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابورافع کو شہر کے کتوں کو مارنے پر مامور فرمایا تو اس نے سب کو ہلاک کر دیا یہاں تک کہ عوالی (مدینہ کے بڑے باغوں کا علاقہ) تک پہنچ گیا تو اس وقت عاصم بن عدی، سعد بن خیثمہ اور عویم بن ساعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ماذا أحل لنا یارسول اللہ؟ اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَہُمۡ'' (وہ پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟)

دوسری روایت: ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر کے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تو لوگوں نے پوچھا: ماذا أحل لنا من ھذہ الامۃ؟ (اس قوم سے ہمارے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟) اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَہُمۡ'' (وہ پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟)

یہ دو روایتیں ایک دوسرے کی تشریح و وضاحت کرتی ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ دوسری روایت پہلی روایت کی وضاحت میں یوں گویا ہے کہ پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان کتوں سے دوسرے کون سے حلال و جائز کام لے سکتے ہیں مثلاً شکار وغیرہ؟ جبکہ آیت مبارکہ اس سوال کا جواب نہیں بن سکتی کیونکہ ان کا سوال خاص مورد کے بارے میں تھا جبکہ آیت مطلق ہے یعنی اس میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ ان سے کہہ دیں کہ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں، لہٰذا یہ رائے آیت کے ظاہر سے موزونیت نہیں رکھتی۔

اس کے علاوہ ان دونوں روایتوں اور بعد میں ذکر کی جانے والی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ ''وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ'' کا عطف ''الطیبات'' پر ہے، لہٰذا اس کا معنیٰ یہ ہوگا: ''واحل لکم ما علمتم'' (اور تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے وہ شکار جو کتوں کے ذریعے کرو جنہیں تم نے سکھایا سمجھایا ہے)۔ عطف کی بناء پر ترجمہ یوں ہوگا کہ تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور اُسے کہ جسے تمہارے سکھائے سمجھائے ہوئے کتے شکار کریں، اسی وجہ سے بعض مفسرین نے آیت سے فہم المعنیٰ کے لئے عبارت کو یوں فرض کیا: ''قُلۡ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ'' (یعنی کہہ

دیجئے کہ تمہارے لئے طیبات حلال کی گئی ہیں اور اس جانور کا گوشت بھی حلال کیا گیا ہے کہ جسے تمہارے سکھائے سمجھائے کتوں نے تمہارے لئے شکار کیا)۔ البتہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جملہ ''وَمَا عَلَّمْتُمْ'' عبارت میں جملہ شرطیہ ہے کہ جس کی جزاء ان لفظوں میں ذکر ہوئی ہے ''فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ'' (پس تم کھاؤ اسے جو وہ تمہارے لئے شکار کریں)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ دوسری روایت میں لوگوں کی طرف سے پیش کئے گئے سوال میں یہ الفاظ مذکور ہیں ''ماذا احل لنا من هٰذه الامّة'' (اس قوم میں سے ہمارے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟) تو اس میں لفظ ''امت'' سے مُراد کتوں کی قوم ہے یعنی مختلف کتے۔

تیسری روایت: فاریابی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم کہ انہوں نے روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اپنی کتاب سنن میں سب نے ابورافع کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا

''جاء جبرئیل الی النبی (ص) فاستأذن علیه فأذن له فأبطأ. فاخذ رداءهٔ فخرج فقال: قد أذنالك. قال: أجل ولكنا لا ندخل بيتاً فيه كلب ولا صورة. فنظروا فاذا فی بعض بیو تهم جرو''

(جبرئیل حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے داخل ہونے کی اجازت مانگی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اجازت عطا فرمائی مگر دروازہ پر رک گیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ردائے مقدس اُٹھائی اور باہر تشریف لائے اور اس سے فرمایا کہ ہم نے تجھے اجازت دے دی ہے، جبرئیل نے جواب میں کہا: ہاں، درست ہے مگر ہم اس گھر میں نہیں آتے ہیں جس میں کتے یا مجسمے ہوں، چنانچہ جب دیکھا گیا تو بعض گھروں میں چھوٹے کتے (پلے) موجود تھے، ابورافع نے کہا تب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ مدینہ کے تمام کتوں کو ہلاک کردوں اور میں نے اس حکم پر عمل کیا، لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! اس اُمت میں سے کہ جسے ہلاک کرنے کا آپ نے فرمان جاری کیا ہے کیا کچھ ہمارے لئے حلال ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''يَسْئَلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ'' (وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے پاک چیزیں اور ان جانوروں کا گوشت حلال کیا گیا ہے جنہیں تمہارے سکھائے سمجھائے ہوئے کتے شکار کریں) تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو کوئی شخص اپنے کتے کو شکار کے لئے بھیجے اور اسے روانہ کرتے وقت خدا کا نام لے اور وہ کتا کسی جانور کو شکار کر لے تو اس شکار کا گوشت کھانا حلال ہے بشرطیکہ کتے نے اسے نہ کھایا ہو، (یعنی صرف اسے پکڑا اور اس پر قابو پایا ہو)۔

اس روایت میں حضرت جبرئیلؑ کے آنے اور پھر دروازہ پر رُک جانے کی جو تفصیل مذکور ہے وہ عجیب وغریب اور اپنے باب میں انوکھی ہے، اس حوالہ سے یہ روایت قابل استناد بھی نہیں رہتی کیونکہ اس میں جبرئیلؑ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے رُک جانا بعض گھروں میں کتے کے بچوں (پلوں) کی موجودگی کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے اور یہ مطلب اس روایت کے نا قابل اعتماد ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے اس کے علاوہ یہ کہ یہ روایت آیت مبارکہ کے ظاہر سے بھی مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ آیت میں جو سوال و جواب مذکور ہے وہ مطلق ہے یعنی کسی مخصوص چیز کے بارے میں نہیں بلکہ عمومی ہے اور جملہ عاطفہ ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' سے بھی اس کی مطابقت ثابت نہیں ہوتی لہٰذا اس روایت کا جعلی ہونا اس کے اصلی وصحیح ہونے سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی روایت: عبد بن حمید اور ابن جریر نے عامر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ عدی بن حاتم طائی حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتوں کے شکار کے بارے میں پوچھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ اسے کیا جواب دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ'' (ان روایات کا حوالہ: تفسیر ''منثور'' جلد ۲، ص ۲۵۹)

اس چوتھی روایت کے ہم معنی دیگر روایات بھی موجود ہیں اور جو اعتراض سابقہ روایات کی بابت ذکر ہو چکا ہے وہ اس کے بارے میں بھی ہے، مذکورہ بالا چاروں روایتیں اور ان کے ہم معنیٰ دیگر روایات کی حیثیت آیت پر کچھ واقعات کو منطبق کرنے کے باب سے ہے لیکن ان کی تطبیق درست نہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتوں کے شکار کا تذکرہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حلال وحرام کے حوالہ سے قاعدہ کلیہ دریافت کیا تو اس کا جواب آیت مبارکہ میں پہلے اُن کا سوال ذکر کیا گیا پھر حلال وحرام کی بابت قاعدہ کلیہ بیان کر کے دیا گیا اور یوں کہا گیا ''يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' (وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے کہہ دیجئے کہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں)۔ اس کے بعد اُنہیں ان کے مخصوص سوال کا جواب دیا گیا، تو یہ مطالب آیہ مبارکہ کے طرزِ بیان سے معلوم ہوتے ہیں۔

کافی کی تین روایتیں:

۱۔ کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے حماد کے حوالہ سے حلبی کا بیان ذکر کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: حضرت علیؑ کے صحیفہ میں آیۂ مبارکہ ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ

ان سے مُراد کتے ہیں۔

یہی روایت تفسیر العیاشی میں سماعہ بن مہران کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ اسلام کے ارشاد گرامی پر مشتمل ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابن مسکان کے حوالہ سے حلبی کا بیان ذکر کیا کہ انہوں نے کہا: امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: میرے والد گرامی حکم بیان فرماتے تھے اور اس میں نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے اور ہم بھی باز اور عقاب کے شکار کی بابت حکم بیان کرنے سے ڈرتے تھے مگر اب ہمیں کوئی ڈر نہیں اور ہم واضح طور پر اس کے بارے میں شرعی حکم بیان کرتے ہیں کہ ان کا شکار جائز نہیں سوائے اس مورد کے کہ ان پر قابو پا کر ان کا تذکیہ کرلیں (ذبح کرلیں) کیونکہ حضرت علیؑ کی کتاب میں آیۂ مبارکہ ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ اس میں ''جوارح'' سے مُراد صرف کتے ہیں۔

۳۔ مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابو بکر حضرمی کے حوالہ سے بیان کیا کہ اُنہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے باز، عقاب، چیتا اور کتے کے شکار کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: نہ کھاؤ، سوائے اس مورد کے کہ تم خود انہیں ذبح کرو، یا کتے نے شکار کیا ہو، حضرمی نے کہا: میں نے پوچھا: اگر کتا اسے ہلاک کردے تو اس کا حکم کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اسے کھا سکتے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ'' اس کے بعد امامؑ نے اس سلسلہ میں قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کل شیئ من السباع یمسك الصید علیٰ نفسها الا الکلاب معلمة واذا ارسلت الکلب فاذکروا اسم اللہ علیہ فھو ذکاتہ'' ہر درندہ خود اپنے لئے شکار کرتا ہے سوائے سکھائے سمجھائے ہوئے کتے کے کہ وہ اپنے مالک کے لئے شکار کر کے اسے قابو کرلیتا ہے اور جب تم کتے کو شکار کے لئے چھوڑو تو اس پر اللہ کا نام پڑھ لیا کرو کہ یہی اس کا تذکیہ ہے۔

تفسیر العیاشی کی چار روایتیں

ایک روایت بحوالہ ابو عبیدہ:

ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے سکھائے سمجھائے

ہوئے کتے کو شکار کے لئے روانہ کرے اور روانہ کرتے ہوئے اللہ کا نام لے تو اس کے شکار کا حکم کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: جس حیوان کو اس سکھائے سمجھائے کتے نے قابو کر لیا ہو وہ حلال ہے خواہ اس کتے نے اسے قابو میں کر کے ہلاک ہی کیوں نہ کر دیا ہو، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی بغیر سکھا یا سمجھایا کتا موجود ہو تو اسے نہ کھایا جائے اور وہ شکار حلال نہ ہوگا، ابو عبید نے کہا: میں نے پوچھا: باز، عقاب اور شکرہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اگر وہ اپنے شکار پر قابو پالیں اور تم وہاں پہنچ کر اسے ذبح کر و تو وہ حلال ہے ورنہ حلال نہیں (یعنی اگر تم اسے ذبح نہ کر پاؤ بلکہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکا ہو تو وہ حلال نہ ہوگا)، ابو عبید نے کہا میں نے پوچھا: کیا چیتا، کتے کی طرح نہیں کہ اس کا شکار حلال ہو؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں، کتے کے علاوہ کوئی درندہ سکھا یا سمجھایا نہیں ہو سکتا۔

دوسری روایت بحوالہ ابو بصیر:

ابو بصیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ ''وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ''شکاری کتے نے جس حیوان پر قابو پالیا ہو اور اسے کھایا نہ ہو تو وہ حلال ہے لیکن اگر اس نے اسے کھالیا ہو تو اسے نہ کھائیں''۔

اس روایت میں تین شرائط ذکر کی گئی ہیں جو شکاری کتے کے شکار کے حلال ہونے میں ملحوظ ہیں: ایک شرط یہ ہے کہ صرف شکاری یعنی سکھا یا سمجھایا ہوا کتا شکار کرے کیونکہ آیت میں لفظ ''مُكَلِّبِيْنَ'' ذکر ہوا ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ سکھا یا سمجھایا کتا اپنے مالک کے لئے اسے قابو میں رکھے، تیسری شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی بغیر سکھا یا سمجھایا کتا نہ ہو، یہ تینوں شرائط کا آیت مبارکہ کے الفاظ سے ثبوت ملتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں بعض مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

تیسری روایت بحوالہ حریز:

حریز نے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی مسلمان کسی مجوسی کے کتے کو شکار کے لئے بھیجے اور اسے روانہ کرتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اس شکار کا حکم کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: وہ کتا ''مُكَلِّبِيْنَ'' میں شمار ہوگا اور اسے بسم اللہ پڑھ کر روانہ کرنا شکار کا تذکیہ قرار پائے گا لہٰذا وہ حلال ہے۔

اس روایت میں آیۂ مبارکہ کے لفظ ''مُكَلِّبِيْنَ'' کے اطلاق کو ملحوظ قرار دیا گیا ہے کہ اس میں مجوس کے کتے کو بھی

شامل سمجھا جاسکتا ہے۔ البتہ اس حوالہ سے ایک روایت تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے جو ابو حاتم کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے کہا کہ جناب ابن عباس سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی مسلمان کسی مجوسی کے سکھائے سمجھائے کتے یا باز یا شکرہ کو شکار کے لئے چھوڑے اور وہ کسی جانور پر قابو پالے تو اس کا حکم کیا ہے؟ ابن عباس نے جواب دیا کہ اسے مت کھاؤ خواہ اس پر بسم اللہ بھی پڑھ لو، کیونکہ وہ مجوسی کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے اور قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد ہے ''تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ'' (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۲۶۰)

لیکن یہ بیان قرین صحت نہیں کیونکہ آیۂ مبارکہ میں اگرچہ بظاہر خطاب مؤمنین سے ہے لیکن جملہ ''عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ'' عام ہے اور مسلمانوں و مجوسوں وغیرہ کے درمیان شکاری کتوں کو سکھانے سمجھانے کے طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اسی سے یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کتے کے سکھانے سمجھانے کے حوالہ سے مؤمن و غیر مؤمن کے درمیان کوئی فرق نہیں، لہٰذا سکھائے سمجھائے ہوئے کتے کا سکھانے سمجھانے والا شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو یکساں ہے جیسا کہ اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ شکار کیا ہوا جانور مسلمان کی ملکیت ہو یا غیر مسلم کی ملکیت ہو۔

چوتھی روایت بحوالہ ہشامؔ:

ہشام بن سالم نے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ میں جملہ ''وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ'' کی تفسیر میں فرمایا: اس میں طعاؔم سے دالیں و چنے اور اس طرح کی چیزیں مُراد ہیں اور ضمیر ''ھم'' کی بازگشت اہل کتاب کی طرف ہے یعنی اہل کتاب کا طعاؔم!

یہ روایت کتاب ''التہذیب'' میں بھی مذکور ہے اور اس میں لفظ عدؔس کے ساتھ حمصؔ ذکر ہوا ہے (ان روایات کے لئے ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی جلد اوّل، صفحہ ۲۹۴)

کتاب کاؔفی اور التہذؔیب میں جو روایات عمّاؔر بن مروان اور سمؔاعہ کے حوالہ سے مذکور ہیں ان میں اہل کتاب کے طعام کی حلیت کی بابت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ذکر کیا گیا ہے جس میں امامؑ نے فرمایا: اس سے مُراد حبوؔب یعنی چنے اور ان جیسی چیزیں ہیں، (ملاحظہ ہو، فروع کافی جلد ۶، صفحہ ۲۶۳، اور تہذیب الاحکام جلد ۹، صفحہ ۸۹)

اسی کی تائید میں ایک روایت کافی میں مؤلفؒ کے اسناد سے ابن مسکان کے حوالہ سے مذکور ہے کہ قتیبہ اعشٰی نے بیان کیا کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا جبکہ میں بھی وہاں موجود تھا کہ اگر کسی یہودی اور عیسائی

کو بھیڑ بکریاں دے کر انہیں چرانے کے لئے بھیجا جائے اور راستہ میں کوئی حادثہ رونما ہو جائے جس کی وجہ سے کسی بھیڑ بکری کو ذبح کرنا پڑے اور وہ شخص اسے ذبح کر دے تو کیا اس کا ذبیحہ حلال ہوگا؟ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: نہ اس کی قیمت اپنے اموال میں شامل کرو اور نہ ہی اسے کھاؤ کیونکہ اس طرح کے شکار کا حلال ہونا اس پر تکبیر پڑھنے پر موقوف ہے کہ جس کی بابت کسی مسلمان کے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں ہو سکتا، اس شخص نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ'' (آج کے دن تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا طعام بھی تمہارے لئے حلال ہے جنہیں کتاب دی گئی ہے)۔ تو اس سے کیا مُراد ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ اس میں طعام سے مُراد دانے اور اس جیسی چیزیں ہیں، (فروع کافی، جلد ۲، صفحہ ۲۳۰)

اس روایت کو شیخ طوسیؒ نے التہذیب میں اور تفسیر العیاشی میں قتیبہ الاعشی کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا احادیث میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اہل کتاب کے اس طعام کو جو مسلمانوں کے لئے حلال کیا گیا ہے دانوں اور ان جیسی چیزوں سے تفسیر کیا گیا ہے چنانچہ عرفِ عام میں لفظ ''طعام'' سے یہی معنیٰ سمجھا جاتا ہے جیسا کہ صدرِ اوّل کے واقعات کہ جو ہم تک پہنچے ہیں اور روایات کے ظاہر سے ثابت ہوتا ہے، اسی وجہ سے ہمارے اکثر علماء نے اسی کے مطابق رائے و فتویٰ دیا کہ ان کے حلال طعام سے مُراد صرف اور صرف حبوبات اور ان جیسی چیزیں اور وہ غذائیں ہیں جو ان سے بنائی گئی ہوں لیکن اس نظریہ پر بعض حضرات (مؤلف تفسیر المنار) نے شدید تنقید کی اور کہا ہے کہ یہ معنیٰ لفظ ''طعام'' کے استعمالی موارد میں قرآنی عرف کے سراسر خلاف ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''طعام'' سے کہیں بھی یہ معنیٰ مُراد نہیں مثلاً اسی سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا: ''اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِلسَّیَّارَةِ'' (حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا طعام تمہارے لئے اور سواری کے لئے ساز و سامان ہے) تو کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ دریائی شکار کے طعام سے مُراد گندم یا حبوبات ہیں، اور سورۂ آل عمران، آیت ۹۳ میں یوں ارشاد ہوا ''کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ'' (ہر طعام بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا سوائے اس کے کہ جسے خود اسرائیل نے اپنے لئے حرام قرار دیا) تو کسی شخص نے اس میں طعام سے گندم یا ہر طرح کے حبوب مُراد نہیں لئے، کیونکہ گندم و حبوبات میں سے کوئی چیز بنی اسرائیل پر حرام قرار نہیں دی گئی تھی نہ ہی تورات نازل ہونے سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد! لہٰذا طعام سے مُراد ہر چکھی جانے والی چیز ہے یعنی جسے چکھا یا کھایا جائے، چنانچہ اس کا قرآنی ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کے واقعہ میں خود ان کے اپنے قول کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس نے کہا ''فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ'' سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۹، (پس جو شخص اس سے پی لے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں (وہ میرا ساتھی نہیں) اور جو نہ چکھے وہ مجھ سے ہے) اور سورۂ احزاب

آیت ۵۳، میں یوں ارشاد ہوا: ''فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا'' (پس جب تم کھانا کھالوتو متفرق ہوجاؤ)، اس میں ''طَعِمْتُمْ'' سے مُراد کھانا ہے یعنی جب تم کھانا کھالو، (ملاحظہ ہو: تفسیر المنار، جلد ۶ صفحہ ۱۷۷)۔

مؤلف تفسیر المنار کے بیان کی بابت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ انہوں نے اہل لغت کے کلام ''الطعام اذا اطلق کان المراد بهٔ الحبوب و اشبا ھھا'' سے کیا سمجھا کہ فوراً انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنا دیا اور اپنے بیان کی تصدیق میں قرآن مجید میں مذکور بعض مخصوص واقعات سے مربوط الفاظ کو دلیل کے طور پر پیش کر دیا مثلاً ''یطعمهٔ''، اور ''طعمتم'' جو کہ لفظ ''طعام'' سے بنائے گئے افعال کے صیغے ہیں (یطعم۔ فعل مضارع اور ''طعمتم'' فعل ماضی، اور علماء نے آیت کی تفسیر میں لفظ ''طعام'' کی بابت جو معانی ذکر کئے وہ اسی لفظ کے حوالہ سے ہیں اس کے مشتقات یعنی اس سے بنائے گئے افعال وغیرہ کے بارے میں نہیں ہیں، اس کے علاوہ مؤلف تفسیر المنار نے اپنے بیان کی تصدیق میں اور علماء کے بیانات کی رد میں دلیل پیش کرتے ہوئے جملہ ''اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ'' کا جو حوالہ دیا وہ قطعی طور پر بے ربط ہے کیونکہ اس میں ''الْبَحْرِ'' کی اضافت بذات خود ایک واضح و روشن قرینہ ہے کہ اس میں طعام سے حبوبات اور گندم وغیرہ مُراد نہیں کیونکہ دریا میں گندم اور جو جیسی چیزیں نہیں اگتیں، پھر انہوں نے اس جملہ سے بھی استدلال پیش کیا: ''کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'' (ہر طعام بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا) اس کے بعد انہوں نے خود ہی یہ بیان کر دیا کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہودیوں کے دین میں گندم وحبوبات ان پر حرام نہیں ہوئی تھیں، جبکہ ضروری یہ تھا کہ وہ قرآنِ مجید میں مذکور لفظ ''طعام'' کے استعمالی موارد کا تفصیلی مطالعہ کرتے اور دیکھتے کہ یہ لفظ کن مقامات میں مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے پھر اپنا نظریہ پیش کرتے جیسا کہ درج ذیل آیات میں یہ لفظ استعمال ہوا:

- سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۴

''فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ''

- سورۂ مائدہ، آیت ۹۵

''اَوْ کَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ''

- سورۂ انسان، آیت ۸

''وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ''

- سورۂ عبس، آیت ۲۴

''فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖٓ''

اور ان جیسی دیگر آیات مبارکہ!

مؤلف تفسیر المنار نے مذکورہ بالا مطالب ذکر کرنے کے بعد یوں کہا حبوبات کی بابت حلال وحرام کی بحث ہی بے ربط ہے کیونکہ ان احکام کا حبوبات سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا، یہ بحث صرف گوشت سے تعلق رکھتی ہے اور وہ بھی دو حوالوں سے! ایک محسوس مادی وجہ سے جیسے کسی جانور کا خود بخود مر جانا اس کے حرام ہونے کا سبب بنتا ہے، اور دوسرا غیر محسوس وغیر مادی یعنی معنوی واعتقادی بنیاد پر جیسے قربانی کے ذریعے غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا عمل! اسی وجہ سے خُداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا'' (کہہ دیجئے کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں اُن میں میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی کہ کسی کھانے والے شخص پر اس کا کھانا حرام کیا گیا ہو سوائے مُردار جانور کے یا جو خون بہایا گیا ہو) اور ان حوالوں کا تعلق حیوانات سے ہے حبوبات سے نہیں ہے اور یہ آیت صریح دلیل (نص) ہے کہ حرام کئے جانے کا تعلق صرف گوشت والی غذا سے ہے لہٰذا ان کے علاوہ چیزوں کے حرام کئے جانے کے ثبوت کے لئے نصّ و واضح دلیل کی ضرورت ہے۔

یہ ہے مؤلف تفسیر المنار کا بیان!

ان کا یہ بیان ان کے سابق الذکر بیان سے بھی زیادہ عجیب وحیرت انگیز ہے، ملاحظہ ہو:

اُنہوں نے کہا: حلال وحرام کی بحث کا تعلق حبوبات سے نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف گوشت سے ہے،

ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کس دور کی بات کرتے ہیں؟ کیا یہ ہمارے اسی دور کی بات ہے یا آیت نازل ہونے کے دور کی بات ہے؟ اگر ہمارے زمانہ میں ایسا ہے تو یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ صدیاں گزر جانے کے بعد اسلامی احکام لوگوں کے ذہنوں پر نقش بر سنگ ہو گئے ہیں اور وہ ان احکام سے ذہنی طور پر انس والتفات رکھتے ہیں اور اگر نزولِ آیت کے دور میں ایسا تھا تو اس وقت معدودے چند سال ہی دین کی زندگی کے گزرے تھے اور لوگوں کو غذاؤں وحبوبات کے حرام ہونے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا بلکہ وہ سب کچھ حلال سمجھتے تھے چنانچہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان چیزوں کے بارے میں پوچھا جن کا حکم حبوبات اور ان جیسی چیزوں کے حکم سے زیادہ واضح وروشن تھا چنانچہ اس حوالہ سے سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۵ ''يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ'' (وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں) میں ان کے بعض سوالوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اور عبد بن حمید کی بیان کردہ روایت میں قتادہ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم اہل کتاب کی عورتوں سے کس طرح شادی کریں جبکہ ان کے اور ہمارے دین میں فرق ہے، وہ کسی دین کی پیروی کرتی ہیں اور ہم کسی اور دین کے پیروکار ہیں؟ ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ'' (جو شخص ایمان کا انکار کرے تو اس کا عمل برباد ہو گیا) یاد رہے کہ اس موضوع کے حوالہ سے مربوطہ مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں اور عنقریب دیگر مربوطہ امور ذکر کئے جائیں گے جیسا کہ حج تمتع کی بحث میں بھی اس طرح کے

اقوال اوران سے مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب اس دور کے لوگ حیرت وتعجب کے ساتھ کہتے تھے کہ ہم اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ کس طرح نکاح کر سکتے ہیں جبکہ ان کا دین اور ہے اور ہمارا دین اور ہے؟ حالانکہ اس وقت اہل کتاب کی پاکدامن خواتین سے نکاح کرنے کے جواز وحلیت کا حکم نازل ہو چکا تھا تو ان سے یہ بات کرنا کیونکر ممکن نہ ہوتا کہ وہ اہل کتاب کے طعام کی بابت حکم پر مشتمل آیت نازل ہونے سے پہلے یہ پوچھیں کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانا کھانا اوران کے ہاتھوں سے بنی اور پکی ہوئی غذاؤں مثلاً روٹی، دال وحلیم اور حبوبات اوران جیسی چیزوں سے بنائی جانے والی ان کی خوردنی اشیاء کس طرح کھائیں جبکہ ان کا دین اور ہمارا دین مختلف ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو ان سے دوستی کرنے، ان کے ساتھ میل جول رکھنے اوران پر اعتماد کرنے سے متعدد آیات میں منع کرتے ہوئے سخت تنبیہ وخبر دار کیا ہے۔

بہر حال مؤلف تفسیر المنار کی یہ بات کہ صرف گوشت ہی ایسی چیز ہے جس کی بابت حلال وحرام کی بحث ہوسکتی ہے خود ان کے اپنے مؤقف کی نفی کرتی ہے کیونکہ ہم ان سے پوچھیں گے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ بتائیں کہ گوشت کے حلال و حرام ہونے کی بابت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حرام قسموں کے بارے میں حکم بیان کر دیا تھا جیسا کہ سورۂ انعام آیت ۱۴۵ ''قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ'' اور سورۂ نحل کی مربوطہ آیت سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور وہ دونوں سورتیں مکی ہیں، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں پھر سورۂ بقرہ میں بھی اس سلسلہ میں حکم بیان ہو چکا جو کہ سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے، اور اسی طرح آیت ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ'' میں بھی واضح طور پر حکم ذکر ہو چکا ہے جو کہ زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی اور زیر بحث آیت کی بابت مؤلف تفسیر المنار نے خود ہی کہا ہے کہ یہ اہل کتاب کے ذبیحہ کی عدم حرمت پر نص یا مثل نص ہے، جب ایسا ہے تو پھر مسلمانوں کا اہل کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے کی بابت سوال کرنا کیونکر درست قرار پاسکتا ہے جبکہ اس سلسلہ میں مکی ومدنی دونوں آیات میں واضح طور پر بیان ہو چکا تھا کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اوران آیات مبارکہ کے حفظ وتلاوت اوران کی تعلیم وتعلم اوران پر عمل کرنا مسلمانوں کا معمول بن چکا تھا؟

اور جہاں تک ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ سورۂ انعام کی آیت صرف انہی چیزوں کی حرمت کے بیان پر مشتمل ہے جو اس میں ذکر کی گئی ہیں لہٰذا ان کے علاوہ چیزوں مثلاً اہل کتاب کا ذبیحہ تو اس کے لئے خاص دلیل کی ضرورت ہے ان کی یہ بات درست ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر چیز کے حکم کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اوران کی یہ بات آیۂ شریفہ میں مذکور اشیاء کی حرمت پر نص ہونے کا صریح اظہار ہے لیکن یہ اس صورت میں مفید ہے جب کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جس سے آیت میں مذکورہ اشیاء کے علاوہ دیگر چیزوں کی حرمت ثابت نہ ہو۔

اس کے علاوہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ''دلیل'' سے ان کی مُراد کیا ہے؟ اگر اس سے مُراد وہ دلیل ہے جس میں سنت

بھی شامل ہے تو اہل کتاب کے ذبیحہ کی حرمت کے قائل حضرات ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اور ہم ان میں سے بعض روایات سابقہ بحثوں میں ذکر کر چکے ہیں اور اگر دلیل سے مُراد صرف قرآن ہے تو یہ دعویٰ بلا دلیل اور بے بنیاد نظریہ ہے کیونکہ سنت بھی کتاب کے ساتھ ساتھ ہے اور وہ حجت ہونے میں ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس کے علاوہ ہم ان سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ ان کا اہل کتاب کے علاوہ دیگر کفار مثلاً بت پرستوں و دھریوں کے ذبیحہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ ان کے ذبیحہ کو مردار اور شرعی تذکیہ نہ ہونے کی وجہ سے حرام قرار دیتے ہیں؟ تو تذکیہ نہ ہونے کے حوالہ سے جانور کا قبلہ رُخ نہ ہونا اور اس پر تکبیر کا نہ پڑھا جانا، اور غیر اسلامی طریقہ کے بغیر کسی دوسرے طریقہ سے تذکیہ (ذبح کرنے) میں نتیجتاً کیا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند کیا اور منسوخ کر دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ دینی نقطہ نظر سے وہ سب ''خبائث'' ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمام خبائث کو حرام قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا ''وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ'' (اور وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک و گندی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے) سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷۔ اور زیر بحث آیت سے پہلی آیت میں یوں ارشاد ہوا: ''يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' (وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے، کہہ دیجئے کہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں)۔ اس میں سوال و جواب کا انداز اس امر کی واضح دلیل ہے کہ چیزوں کا حلال ہونا ان کے طیب و پاکیزہ ہونے میں منحصر ہے یعنی صرف پاکیزہ چیزیں ہی حلال ہیں، اسی طرح زیر بحث آیت کے ابتدائی الفاظ اس سلسلہ میں واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں جن میں یوں ارشاد ہوا، ''اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ'' (آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں) چونکہ یہ مقام احسان و منت کا ہے لہٰذا اس سے مذکورہ حصہ کا ثبوت ملتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر اپنے احسان کا ذکر کر رہا ہے لہٰذا اس سے حلیت کے حکم کا طیبات ہی سے مربوط ہونا واضح طور پر ثابت ہے۔

اور اگر کفار کا ذبیحہ اس لئے حرام ہو کہ وہ جانور غیر اللہ کے لئے ذبح کرتے ہیں مثلاً بتوں کے نام پر قربانی کرنا تو اس صورت میں سابقہ سوال سامنے آئے گا کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے اور اللہ کے نام پر منسوخ طریقہ پر ذبح کرنے میں کیا فرق ہے؟ (نتیجتاً دونوں یکساں ہیں) یعنی اگر کوئی شخص غیر اللہ کے نام پر ذبح کرے تو وہ جانور حرام قرار پاتا ہے اور اگر کوئی شخص غیر اللہ کے نام پر تو ذبح نہ کرے بلکہ اللہ کے نام پر ذبح کرے لیکن اس میں وہ طریقہ اپنائے جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے تو اس کا ذبیحہ بھی حرام ہوگا۔

مؤلف تفسیر المنار نے اہل کتاب اور بت پرستوں کے ذبیحہ کے درمیان پائے جانے والے فرق کی بابت مزید یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اس لئے شدت کے ساتھ حکم صادر فرمایا کہ مشرکین عرب ہر طرح کا مردار اور بتوں کے نام پر ذبح کئے گئے جانوروں کا گوشت کھانے کے عادی تھے لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ جدید اسلام قبول کرنے والے افراد اپنی

پرانی عادت کو اپناتے ہوئے مُردار اور بتوں کے نام پر ذبح شدہ جانور کا گوشت کھاتے رہیں، جبکہ اہل کتاب ایسا نہیں کرتے تھے اور تازہ مسلمان ہونے والوں کی طرح سابقہ عادات کی پیروی کے حوالہ سے ان کی بابت کوئی اندیشہ نہ تھا کہ وہ بھی مُردار جانور اور بتوں کے نام پر ذبیحہ کا گوشت کھائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤلف تفسیر المنار کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اہل کتاب میں سے نصاریٰ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، اور اس کے علاوہ یہ کہ عیسائی وہ سب کچھ کھاتے تھے جو مشرکین کے نزدیک مباح و جائز تھا اور وہ اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی قربانی نوعِ انسانی کے لئے ہر چیز کے حلال ہونے کا سبب بنی ہے جبکہ ان کا ایسا سوچنا ایک طرح کی خوش فہمی ہے کہ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس طرح کی خوش فہمی کو کلام الٰہی کی تفسیر اور اس کی مقدس آیات کے فہم المعنی کی بابت فکری کاوش کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی دین خداوندی کے احکام سے آگاہی حاصل کرنے میں اس کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

پھر مؤلف تفسیر المنار نے اپنے بیان کے تسلسل میں یوں کہا: ''یہ دینی سیاست کا تقاضا تھا کہ مشرکین عرب کے ساتھ سخت رویہ اپنایا جائے تاکہ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہے بلکہ وہ سب اسلام کے پیروکار بن جائیں، جبکہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی پر مبنی رویہ اختیار کیا جائے''

مؤلف تفسیر المنار نے یہ مطلب ذکر کرنے کے بعد نمونہ و شواہد کے طور پر بعض صحابہ کرام کے ان فتوؤں کا حوالہ بھی دیا جن میں انہوں نے اہل کتاب کے کلیساؤں میں ذبح کئے جانے والے جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں صادر فرمائے۔

لیکن مؤلف تفسیر المنار کا یہ بیان بعض اُن روایات پر مبنی ہے جن سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دیگر اقوام پر برتری عطا فرمائی اور اپنی نگاہِ انتخاب انہی پر مرکوز کرتے ہوئے انہیں دوسروں کے مقابلے میں خاص مقام و احترام اور امتیاز عطا کیا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنے علاوہ دیگر قوموں کو غلام اور خدمتگزار جیسے ناموں سے موسوم کرتے تھے، جبکہ اس طرح کے مطالب قرآنی آیات مبارکہ کے ظواہر سے قطعی مناسبت و موزونیت اور ہمرنگی و ہم آہنگی نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ نے واضح لفظوں میں یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

''يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ''

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے خلق کیا اور تمہیں شعبے اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت اسے حاصل ہے جو تم میں سے سب

سے زیادہ متقی و پرہیز گار ہو)

اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے اس سلسلہ میں کثیر روایات موجود ہیں، اور اسلام نے اپنی دعوتِ حقہ میں کسی طرح سے عربوں کو غیر عرب قوموں پر ترجیح وفوقیت نہیں دی اور نہ ہی ان کے لئے ایک دوسرے سے الگ مقام ومنزلت قرار دی، البتہ اسلام نے اہل کتاب کے علاوہ دیگر مشرکین کو علیحدہ کردیا خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب ہوں، اور انہیں اسلام قبول کرنے اور خدا کے دین پر ایمان لانے کے علاوہ کسی بھی حوالہ سے قابل قبول قرار نہ دیا، ان کے مقابلے میں اہل کتاب سے خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب ہوں الگ سلوک کیا چنانچہ انہیں اختیار دیا کہ وہ اسلام قبول کریں یا اپنے دین پر باقی رہیں تو جزیہ دے کر اسلام کی ضمانت حاصل کریں، اور یہ بات کہ اسلام نے عرب وغیر عرب کے درمیان امتیازی طرزِ عمل اپنایا اگر درست تسلیم بھی کی جائے تو اس سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ فی الجملہ نرمی برتی گئی ہے کیونکہ اس طرح کا طرزِ عمل مبہم ہے اور اس کی وجہ واضح نہیں، لیکن یہ کہنا کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے ان کا وہ ذبیحہ جو انہوں نے اپنے مذہب ومروجہ طریقہ پر کیا ہو اسے مباح وحلال سمجھا جائے اس کی کوئی دلیل موجود نہیں یہ ایک واضح وروشن امر ہے۔

اور جہاں تک بعض صحابہ کے فتاویٰ وعمل وغیرہ کے بارے میں ان کے بیان کا تعلق ہے تو اس میں کوئی وزن نہیں اور نہ ہی اسے حجت ودلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

بنابرایں مذکورہ بالا تمام مطالب کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نہ ہی آیت اور نہ کسی دوسری دلیل سے اہل کتاب کے ذبیحہ کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا جب تک اسلامی طریقہ واصول کے مطابق جانور کو ذبح نہ کیا جائے یعنی اسلامی قانون تذکیہ کے علاوہ ذبح کئے جانے والے جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں، اور اگر ہم آیت کے الفاظ کے بناء پر ان کے ذبیحہ کی حلیت کے قائل بھی ہوں جیسا کہ ہمارے بعض علماء کی طرف سے یہ قول منقول ہے تو اس صورت میں ہم اسے اس شرط وقید سے مربوط قرار دیں گے کہ جانور کا شرعی طریقہ کے مطابق ذبح کیا جانا یقینی طور پر معلوم ہو، جیسا کہ کافی اور التہذیب میں مذکور امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: ''**فانما ھی الاسم ولا یؤمن علیھا الا مسلم**'' یعنی ذبیحہ کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس پر تکبیر پڑھی گئی ہو، اللہ کا نام لیا گیا ہو اور اس سلسلہ میں مسلمان کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں ہوسکتا،

اس موضوع سے مربوط مزید مطالب کا تعلق فقہ سے ہے لہٰذا تفصیلات سے آگاہ ہونے کے لیے فقہی کتب کی طرف رجوع کیا جائے۔

امام صادق علیہ السلام کا فرمان:

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: آیہ مبارکہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ'' میں ''محصنات'' سے مُراد اہل کتاب کی پاکدامن خواتین ہیں (تفسیر العیاشی جلد اوّل، صفحہ ۲۹۶)

اسی کتاب میں ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ'' کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس میں مسلمان پاکدامن عورتیں مُراد ہیں (بحوالہ تفسیر نور الثقلین جلد اوّل، صفحہ ۴۹۳)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

تفسیر قمی میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان اہل کتاب کی خواتین سے نکاح جائز ہے جو جزیہ ادا کرتے ہیں، ان کے علاوہ دوسری خواتین سے نکاح کرنا جائز نہیں'' (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۶۳)

یہ حکم اس صورت میں ہے کہ اگر وہ جزیہ ادا نہ کریں تو محارب شمار ہوں گے کہ جن سے مناکحت روا نہیں، کتاب کافی اور التہذیب میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا ''اہل کتاب کی صرف سادہ لوح خواتین سے نکاح جائز ہے'' (فروعِ کافی جلد ۵ صفحہ ۳۵۷، التہذیب جلد ۷، صفحہ ۲۹۹)

دین میں نقص:

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نصرانی و یہودی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے کیا اس کا ایسا کرنا درست ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ اگر اسے کوئی مسلمان خاتون دستیاب ہو تو اسے یہودی و نصرانی عورت سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ امامؑ سے عرض کیا گیا کہ اسے یہودی و نصرانی عورت سے محبت ہے اور وہ اس میں رغبت رکھتا ہے، امامؑ نے ارشاد فرمایا: اگر اس نے ایسا کرنا ہی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس عورت کو شراب پینے اور خنزیر کا گوشت کھانے سے منع کرے البتہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا کرنے سے اس کے دین میں نقص و کمی ضرور آئے گی (من لایحضرہ الفقیہ، جلد اوّل، صفحہ ۴۰۷)

کتاب تہذیب الاحکام میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: مسلمان مرد کا کسی یہودی

ونصرانی عورت سے عقد مؤقت کرنا جائز ہے خواہ اس کے ہاں آزاد زوجہ موجود ہی کیوں نہ ہو (تہذیب الاحکام جلد ۷، صفحہ ۳۰۰)

امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان:

کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیا کوئی مسلمان مرد مجوسی عورت سے شادی کرسکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں، لیکن اگر اس کے پاس مجوسی کنیز ہو تو اس کے ساتھ جنسی ملاپ کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ اپنا نطفہ باہر نکالے اور اس سے بچہ پیدا کرنے کا اہتمام نہ کرے، (الفقیہ، جلد ۳ صفحہ ۴۰۷)

عبداللہ بن سنان کی روایت:

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن سنان کی روایت ذکر کی ہے کہ اُنہوں نے ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ فرمان بیان کیا کہ آپؑ نے فرمایا: مجھے پسند نہیں کہ کوئی مسلمان مرد کسی یہودی ونصرانی عورت سے شادی کرے کیونکہ اس میں ان کے بچوں کے یہودی یا نصرانی ہونے کا اندیشہ ہے۔

اور اسی کتاب میں مؤلفؒ نے زرارہ کے حوالہ سے اور تفسیر العیاشی میں مسعدہ بن صدقہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ مبارکہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: یہ آیت جملہ ''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' کے ذریعے منسوخ ہوچکی ہے (ملاحظہ ہو: فروع کافی جلد ۵ ص ۳۵۱) مذکورہ بالا دو حدیثوں میں مذکور مطلب قرین صحت معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جملہ ''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' پہلے نازل ہوا اور جملہ ''الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' اس کے بعد نازل ہوا اور ناسخ کا منسوخ سے پہلے ہونا درست نہیں، اس کے علاوہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ سورۂ مائدہ کے بارے میں روایات میں مذکور ہے کہ وہ ناسخ ہے منسوخ نہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب پہلے ذکر ہوچکے ہیں اور اس آیت کے منسوخ نہ ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو پہلے ذکر ہوچکی ہے جس میں کتابیہ عورت سے عقد مؤقت کا جواز بیان ہوا ہے اور اصحاب نے اس روایت پر عمل بھی کیا اور متعہ کی آیت کی تفسیر میں بیان ہوچکا ہے کہ متعہ باقاعدہ نکاح وشادی ہی کی ایک صورت ہے،

ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ جملہ ''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' نے آیہ مبارکہ ''الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' میں اس کے نازل ہونے سے پہلے ہی تخصیص پیدا کردی تو اس سے آیہ مبارکہ ''والمحصنات'' کا اطلاق وعمومیت باقی نہ رہے گی اور اس میں دائمی نکاح شامل نہ رہے گا، کیونکہ جملہ ''وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ'' سے کافرہ عورت کی عصمت کو اپنے

ہاتھ میں لئے رکھنے کی ممانعت مذکور ہے اور وہ صرف دائمی نکاح پر منطبق ہوتی ہے جیسا کہ مرد کے مسلمان ہونے کے بعد زوجیت کی عصمت کا باقی رہنا اس پر منطبق ہوتا ہے جو کہ آیت کے نازل ہونے کا مورد و موضوع ہے۔(اس کی وضاحت یوں ہے کہ دوسری آیت ''الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ '' سے ثابت ہوتا ہے کہ کتابیہ عورت سے دائمی و مؤقت دونوں عقد جائز ہیں لیکن چونکہ اس سے پہلے آیت ''وَ لَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ ''میں کافرہ عورتوں کی عصمتوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ممانعت ہوچکی تھی جس سے دائمی عقد ہی سمجھا جاتا ہے لہٰذا یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ کتابیہ عورت کے ساتھ دائمی عقد حرام جبکہ مؤقت عقد (متعہ) جائز ہے)۔

البتہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس قول پر اعتراض کرتے ہوئے یوں کہے کہ آیت ''وَ لَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ ''(تم کافرہ عورتوں کی عصمتوں کو روکے نہ رکھو) اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو خود مسلمان ہوجائے مگر اس کی بیوی اپنے کفر پر قائم رہے تو اسے حکم دیا گیا ہے کہ تم اسے پابند نہ کرو، لیکن یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ شان نزول سے آیت کے الفاظ میں تقید پیدا نہیں ہوتا اور اس کے معنوی دائرہ کی وسعت ختم نہیں ہوتی چنانچہ ہم اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب سورۂ بقرہ کی آیت نسخ کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں اور اس بات کو واضح طور پر ذکر کرچکے ہیں کہ ''نسخ''میں قرآنی اصطلاح اور لغت کے حوالہ سے وسیع معنیٰ پایا جاتا ہے جس میں نسخ کے عام اصطلاحی معنیٰ کے علاوہ کی گنجائش بھی پائی جاتی ہے مثلاً تخصیص وغیرہ،

بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ آیت، جملہ ''وَ لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ '' کے ذریعے منسوخ ہوچکی ہے لیکن ان روایات کی عدم صحت پر ہم مربوطہ دلائل و مطالب ذکر کرچکے ہیں، البتہ اس موضوع کی مزید تفصیلات فقہی کتب میں مذکور ہیں۔

اعمال کی بربادی:

تفسیر العیاشی میں آیۂ مبارکہ ''وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ '' (جو شخص ایمان کا انکار کردے تو اس کا عمل برباد ہوگیا)۔امامؑ نے فرمایا: اس سے مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اس پر عمل نہ کرے اور نہ ہی اس پر راضی ہو۔

اسی کتاب میں محمد بن مسلم سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے ان دو اماموں یعنی امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ میں سے کسی ایک ہستی کا بیان ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا: ایمان کا انکار دین کے احکام پر عمل کو مسلسل ترک کرنا ہے کہ پھر سارے کا سارا دین ہی ہاتھ سے نکل جائے (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۹۷)

سابق الذکر مطالب کی روشنی میں مذکورہ بالا روایتوں کی تفسیری وضاحت ہوچکی ہے۔ تفسیر العیاشی ہی میں عبید بن زرارہ سے منقول ہے، انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے آیۂ مبارکہ: ''وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ

عَمَلُهٗ'' کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مُراد یہ ہے کہ جس عمل کا اقرار کر چکے ہو اس پر عمل کرنا چھوڑ دو، اسے کفر بالایمان کہتے ہیں اور اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بیماری یا کسی اہم ترین مصروفیت کے بغیر نماز کو ترک کیا جائے (تفسیر العیاشی جلد اوّل، صفحہ ۲۹۶)

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کو ''ایمان'' سے موسوم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ'' سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۳، (اللہ تمہارے ایمان کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا)۔ اس میں ایمان سے مُراد نماز ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری نماز کے اجر سے محروم نہ کرے گا)۔

تفسیر قمی میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: کفر بالایمان سے مُراد یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد اہل شرک کی اطاعت کی جائے، (تفسیر قمی جلد اوّل، صفحہ ۱۶۳)

ولایت حضرت علی امیر المومنین علیہ السلام سے انکار:

کتاب بصائر الدرجات میں ابوحمزہ کی روایت مذکور ہے جس میں انہوں نے کہا: میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ مبارکہ ''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ'' کی تفسیر دریافت کی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: تفسیر ھا فی بطن القرآن: ومن یکفر بولایۃ علی، و علی ھو الایمان، یہ باطنی قرآنی حقیقت ہے کہ جو شخص ولایت علی علیہ السلام کا انکار کرے اس کا عمل برباد ہو جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ ونقصان اُٹھانے والوں میں قرار پائے گا اور علی علیہ السلام ہی سراپا ایمان ہیں۔ (بصائر الدرجات، صفحہ ۷۷)

یہ مطلب کہ جسے امام علیہ السلام نے بطن قرآن (قرآن کی باطنی حقیقت) سے تعبیر فرمایا ہے ظاہر القرآن کے مقابل امر کا نام ہے، قرآن کے ظاہر و باطن کی بابت مربوط مطالب المیزان جلد سوم میں محکم و متشابہ کی بحث میں ذکر کئے جا چکے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ امامؑ کا فرمان تطبیقی مورد کی نشاندہی کے طور پر ہو کہ جسے اصطلاح میں ''جری'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلّی عنوان کو اس کے ایک مصداق پر منطبق کیا جائے، البتہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علیؑ کو اس وقت ایمان سے تعبیر فرمایا جب وہ خندق کے دن عمرو بن عبدود کے مقابلے میں میدان کو روانہ ہوئے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''برز الایمان کلّه الی الکفر کله'' (سارے کا سارا ایمان، سارے کے سارے کفر کے مقابلے میں میدان کو نکل پڑا ہے)۔ یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعدد کتب حدیث میں مذکور ہے مثلاً: بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۵) اور اس مطلب پر مشتمل دیگر کثیر روایات موجود ہیں۔

آیات ۶ تا ۷

O يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَوٰةِ فَاغْسِلُوا۟ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا۟ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۚ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا۟ ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْ لَٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا۟ مَآءً فَتَيَمَّمُوا۟ صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا۟ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ ۚ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُۥ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝٦

O وَاذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَٰقَهُ الَّذِى وَاثَقَكُم بِهِۦٓ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ وَاتَّقُوا۟ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝٧

ترجمہ

○ ''اے مؤمنو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو (نماز پڑھنا چاہو) تو اپنے منہ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں اور پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرو، اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو اپنے آپ کو پاک کرو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ہمبستری کی ہو مگر تمہارے پاس پانی نہ ہو تو تم پاک غبار سے تیمم کرو پھر اسی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو، اللہ تمہیں مشقت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ پاک کرنا چاہتا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر گزار بنو'' (۶)

○ ''اور تم اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تمہیں عطا کی اور اس پیمان کو یاد کرو جو اللہ نے تم سے لے رکھا ہے کہ جب تم نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو یقیناً اللہ دلوں کے حال سے آگاہ ہے'' (۷)

تفسیر و بیان

ان دو آیتوں میں سے پہلی آیت (۶) طہارت کی تینوں قسموں کے بیان پر مشتمل ہے یعنی وضو، غسل اور تیمم اور دوسری آیت (۷) پہلی آیت میں مذکور حکم کی تکمیل و تاکید کے طور پر ہے، یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ طہارت کی تینوں قسموں کے حکم کے بیان پر مشتمل جو آیت قرآنِ مجید میں موجود ہے وہ سورۂ نساء کی درج ذیل آیت ہے کہ جس کی تفسیر ذکر ہو چکی ہے۔

سورۂ نساء، آیت: ۴۳

○ ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنۡتُمۡ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَ اَیۡدِیۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا''

(اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور نہ ہی جنابت کی حالت میں! سوائے اس کے کہ راستہ گزر رہے ہو جب تک کہ غسل نہ کرلو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص پاخانہ کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے ہمبستری کی ہو، تو اگر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاکیزہ مٹی سے تیمم کرلو، تب اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو، یقیناً اللہ درگزر کرنے والا، معاف کرنے والا ہے)

البتہ یہ آیت یعنی سورۂ مائدہ آیت ۶، سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کی نسبت زیادہ واضح و روشن ہے اور اس میں حکم کی مربوطہ جہات وسعت سے مذکور ہیں، اسی وجہ سے ہم نے سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی تفسیر اسی مقام پر مؤخر کی تا کہ دونوں کے موازنہ میں مطالب کا سمجھنا آسان ہو سکے۔

اصل حکم کا بیان:

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوةِ''

(اے ایمان والو، جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو)

آیت میں جملہ ''اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ'' کی بابت ایک ادبی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ عربی زبان میں جب لفظ ''قیام'' حرف ''الٰی'' سے متعدی ہو تو اس میں کنایۃً دو چیزوں کے درمیان پیوستگی اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کا بیان مُراد ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی چیز مراد قرار پائے تو اس کی طرف حرکت اور عملی اقدام کرنا اس سے جدا نہیں ہو سکتا، اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنی تھکن دور کرنے کے لئے آرام کر رہا ہے کہ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور جس کام کا ارادہ کیا ہوا سے انجام دینے کے لئے اپنے آرام کو چھوڑ دیتا ہے جو کہ اس کے لئے لازمی قرار پاتا ہے تو اس کا ایسا کرنا یعنی اپنے سکون و آرام کو چھوڑ کر اس کام کی انجام دہی کے لئے کھڑا ہونا ''القیام الی الفعل'' کہلاتا ہے۔ اور اس کے لئے ارادہ ناگزیر ہوتا ہے، گویا پہلے ارادہ کرتا ہے کہ فلاں کام انجام دے پھر اس کے لئے حرکت میں آتا ہے اور اس کی انجام دہی کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے، اس کی مثال یہ آیت بھی ہے: ''وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ'' سورۂ نساء آیت: ۱۰۲، (اور جب تو ان میں موجود ہو اور ان کے لئے نماز قائم کرے)، یہاں لفظ ''قیام'' ارادہ کرنے کے مورد میں استعمال ہوا ہے یعنی جب ان کے لئے نماز قائم کرنے کا ارادہ کرو اور اس کے برعکس یہ آیت بھی ایک حوالہ سے بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے:

O سورۂ نساء، آیت: ۲۰

''وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا''

(اور اگر تم ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ تبدیل کرنا چاہو جبکہ تم ان میں سے ایک کو سونے سے بھرا مشکیزہ بھی حق مہر کے طور پر دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو)

یعنی جب تم ایک بیوی کو طلاق دو اور اس کی جگہ دوسری عورت سے شادی کرو، تو جو حق مہر پہلی بیوی کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، یہاں کسی عمل کا ارادہ کرنا اور اسے چاہنا اس کے انجام دینے کے مقام پر واقع ہوا ہے،

خلاصہ کلام یہ کہ زیر نظر آیۂ مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز ادا کرنا ان امور سے مشروط ہے جو آیت میں مذکور ہیں یعنی غسل اور مسح جو کہ وضو سے عبارت ہے اور اگر آیت کے الفاظ سے اطلاق وعمومیت سمجھی جائے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ ہر نماز کے لئے الگ وضو ضروری ہے البتہ اس طرح کے اطلاق وعمومیت کا اثبات جملہ ''وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا'' (اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو طہارت کرو یعنی غسل کرو) سے قطع نظر کرنے پر موقوف ہوگا کیونکہ جنابت کی حالت میں حکم کا مطلق ہونا قابل تصور نہیں لیکن واقع الامر یہ ہے کہ احکام پر مشتمل آیات میں سے بہت کم ایسی آیات ہیں جو تمام جہات سے اطلاق رکھتی ہوں، گویا آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر تم جنابت کی حالت میں نہ ہو اور نماز پڑھنا چاہو تو وضو کر کے نماز ادا کرو لیکن اگر جنابت کی حالت میں ہو تو اپنے آپ کو پاک کرو (غسل کرو)۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ جملہ ''وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ'' (لیکن اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک رکھے) نماز کے لئے وضو یا غسل کرنے کی شرط کی وضاحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے۔اس سلسلہ میں مزید وضاحت عنقریب ہوگی، تاہم اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں انہی مطالب پر اکتفاء کی جاتی ہے اور اس سے زیادہ دیگر موضوعات کو زیر بحث لانے میں مفسرین کرام نے جو زحمت گوارا کی ہے اس کا تعلق فقہی مباحث سے ہے تفسیری عمل سے اس کا تعلق نہیں۔

وضو کی کیفیت کا بیان:

''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ''
(پس تم اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوو)

لفظ ''غسل'' (غین پر زبر کے ساتھ) کا معنیٰ کسی چیز پر پانی ڈالنا ہے اور ایسا کرنے میں عام طور پر صفائی و نظافت کو یقینی بنانا اور میل کچیل کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔

لفظ ''وجہ'' کسی چیز کے سامنے کے حصہ کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال انسان کے چہرہ اور سر کے سامنے والے حصہ پر ہوتا ہے کہ جس میں آنکھیں، ناک اور منہ ہے اور جو آمنے سامنے دکھائی دیتا ہے۔

یہ ہے لفظ ''وجہ'' کا لغوی معنی اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں اس کی حد طول میں پیشانی کے بال شروع ہونے کی جگہ سے ٹھوڑی تک اور عرض میں انگوٹھا اور چھوٹی اُنگلی یا انگوٹھا اور درمیانی اُنگلی کے درمیان کا فاصلہ ہے، البتہ لفظ ''وجہ'' کی بابت دیگر مقدار و اندازے بھی ذکر ہوئے ہیں جو مفسرین اور فقہاء نے اپنی کتب میں ذکر کئے ہیں۔

لفظ ''اَیدی'' (اَيْدِيَكُمْ) لفظ ''ید'' سے جمع کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ بدن کا وہ عضو ہے جس سے انسان کسی چیز کو لینے، دینے، پکڑنے اور مارنے وغیرہ جیسے کام لیتا ہے اور اس کی حد کندھے سے ہاتھ کی انگلیوں تک ہے اور چونکہ جسم کے اعضاء کی اہمیت ان سے مربوط ان مقاصد کی بناء پر ہے جن کا انسان ارادہ کرتا ہے چنانچہ ہاتھ سے دینے و لینے اور پکڑنے وغیرہ کا کام لیتا ہے اور عموماً کہنی سے نیچے سے لے کر اُنگلیوں کے پوروں تک سے یہ سب کام انجام پاتے ہیں لہٰذا اسی حد تک کو ہاتھ (ید) کہا جاتا ہے اور پھر اس حد سے بھی نیچے یعنی کلائی سے انگلیوں کے سروں تک ہی اکثر مذکورہ بالا مقاصد کیلئے استعمال ہوتے ہیں لہٰذا اسے ہی ''ید'' یعنی ہاتھ کہا جاتا ہے اس بناء پر یہ لفظ مذکورہ تینوں حدود سے مشترک طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی انگلیوں کے پوروں سے لے کر کندھے تک، انگلیوں سے لے کر کہنی تک اور انگلیوں سے کلائی تک سب کو ''ید'' کہا جاتا ہے اور یہی معنوی

اشتراک اس بات کا سبب ہوا ہے کہ آیت میں ان معانی میں سے کسی ایک کے مخصوص طور پر مُراد ہونے کے لئے معین قرینہ ذکر ہو لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ''وَاَیدِیَکُمْ'' کے ساتھ ''اِلَی الْمَرَافِقِ'' کے الفاظ ذکر فرمائے تا کہ یہ مطلب واضح و متعین ہو جائے کہ ''غسل الید'' سے مُراد اُنگلیوں سے کہنی تک کی حد ہے کہ وضو میں اسے ہی دھونا واجب ہے، پھر اسی قرینہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مُراد وہی حصہ ہے جس میں ہتھیلی شامل ہے چنانچہ اس مطلب کو روایات میں واضح کیا گیا ہے اور جہاں تک حرف ''الیٰ'' کا تعلق ہے تو وہ کسی کام کی انتہاء کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی انتہائی حد لیکن جس پر حرف ''الیٰ'' آیا ہو کیا اس میں مذکور حکم اس سے ماقبل حصہ پر بھی لاگو ہوگا اور وہ بھی اس میں شامل ہوگا یا نہیں؟ تو یہ اس بحث کا حرف کے معنی کی بحث سے کوئی تعلق نہیں بنا برایں آیت میں کہنی کے دھونے کا وجوب حرف ''الیٰ'' سے ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے روایت و حدیث کا سہارا لینا ہوگا کہ اس سلسلہ میں ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ آیت میں حرف ''الیٰ'' حرف ''مع'' کے معنی میں ہے۔ یعنی ساتھ سمیت جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۲ میں یوں مذکور ہے: ''وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ'' (اور تم ان کے اموال اپنے اموال کے ساتھ نہ کھاؤ)، چنانچہ اس مطلب کے اثبات کے لئے ان روایات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں مذکور ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب وضو کرتے تھے تو کہنیوں کو بھی دھوتے تھے،

لیکن ان حضرات کا ایسا کرنا کلامِ الٰہی کی تفسیر میں جرأت و جسارت کی حیرت انگیز مثال ہے۔ کیونکہ روایات میں اس حوالہ سے جو کچھ مذکور ہے وہ دو صورتوں سے خالی نہیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے یا قول و فرمان اگر اسے عمل قرار دیں تو اس سے کسی لفظ کے لئے مخصوص و معین معنی کا اثبات نہیں ہوسکتا کیونکہ ''عمل'' میں مبہم صورت پائی جاتی ہے اور وہ لفظ کے متعدد معانی میں سے کسی ایک کا تعین نہیں کرسکتا، اور اگر اسے قول و فرمان قرار دیں کہ جس کا تعلق آیت کی تفسیر سے نہیں بلکہ اصل حکم کے بیان سے ہے تو اس صورت میں ان روایات کو آیت کی تفسیر پر مبنی نہیں قرار دیا جاسکتا، اور پہلی ممکنہ صورت کی بناء پر یہ بات ممکن ہے کہ کہنیوں کا دھونا مقدمۃً اور تمہیدی طور پر ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لئے ایسا فرماتے تھے کہ کہنی تک دھونے کی یقینی صورت تحقق پذیر ہو، یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس میں اس کا اضافہ اپنے منصبی اختیارات کی بناء پر کیا ہو جیسا کہ پنجگانہ نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اختیار کو استعمال فرمایا کہ جس کی بابت روایات صحیحہ میں واضح طور پر مذکور ہے۔

اور جہاں تک جملہ ''وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ'' کا تعلق ہے کہ جس میں مفسرین نے استدلال پیش کیا ہے تو اس سے بھی ان کا مطلوب و مقصود ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس میں ''لَا تَاْكُلُوْٓا'' دراصل ''لاتضموا'' کے معنی میں ہے یعنی ان کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ ضمیمہ نہ کرو یعنی مخلوط نہ کرو، جس سے مُراد یہ ہے کہ لوگوں کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ اکٹھا نہ کرو، لہٰذا یہاں حرف ''الیٰ'' کا حرف ''مع'' کے ہم معنیٰ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوا کہ جملہ ''اِلَى الْمَرَافِقِ'' کا جملہ ''اَيْدِيَكُمْ'' سے تقییدی تعلق ہے لہٰذا ہاتھوں (ایدیکم) کو دھونے کے حکم کا تعلق مطلق ہے کہ اس میں آخری حد ملحوظ نہیں، اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کہنی سے انگلیوں کے پوروں تک دھونے کا حکم ہے جو کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ وضو کے علاوہ دیگر حالتوں میں جب کوئی شخص ہاتھ دھوتا ہے البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ انگلیوں سے کہنی تک دھویا جائے لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں اُن میں دوسرے طریقہ کی بجائے پہلے طریقہ کا حکم دیا گیا ہے یعنی کہنی سے انگلیوں تک دھونا، جو کہ عام طبعی طریقہ ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے اس ممکنہ رائے کا جواب بھی مل جاتا ہے جس میں جملہ ''اَيْدِيَكُمْ'' کے جملہ ''اِلَى الْمَرَافِقِ'' سے مقید ہونے کو اس بات کی دلیل قرار دیا جائے کہ دھونے کا حکم اس طرح ہے کہ انگلیوں سے شروع کر کے کہنی تک دھوئیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مطلب اس صورت میں قرین صحت قرار دیا جا سکتا ہے جب جملہ ''اِلَى الْمَرَافِقِ'' کو جملہ ''فَاغْسِلُوْا'' کی تقییدی حیثیت میں قرار دیا جائے جبکہ سابق الذکر مطالب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جملہ ''اِلَى الْمَرَافِقِ'' کو جملہ ''اَيْدِيَكُمْ'' کے لئے تقییدی حیثیت کا حامل قرار دینا ہی ناگزیر ہے کیونکہ اس کا مشترک حیثیت کا حامل ہونا کسی ایک معنی کے لئے مخصوص کئے جانے کے لئے قرینہ معینہ چاہتا ہے لہٰذا یہ کہنا بے معنی ہے کہ وہ دونوں جملوں یعنی ''فَاغْسِلُوْا'' اور ''اَيْدِيَكُمْ'' کے لئے تقییدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ امت اسلامیہ کا اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہے جو شخص وضو میں کہنی سے دھونا شروع کرے اور انگلیوں تک نیچے کی طرف دھوئے اس کا وضو صحیح ہے، اس اجماع کا تذکرہ تفسیر مجمع البیان جلد ۳ ص ۱۶۴ میں موجود ہے، اور یہ صرف اس بناء پر ہے کہ آیۂ مبارکہ میں اسی کا احتمال پایا جاتا ہے اور وہ بھی اس بناء پر کہ جملہ ''اِلَى الْمَرَافِقِ'' جملہ ''اَيْدِيَكُمْ'' کے لئے تقییدی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ جملہ ''فَاغْسِلُوْا'' کے لئے!

مسح کے حکم کی وضاحت:

''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ''

(اور تم مسح کرو اپنے سروں کا اور اپنے پیروں کا ٹخنوں تک)

لفظ ''مسح'' کا معنیٰ ہاتھ یا چھونے والے کسی بھی عضو کا کسی چیز پر براہ راست پھیرنا ہے چنانچہ یوں کہا جاتا ہے: ''مسحت الشیئ و مسحت بالشیئ'' (میں نے فلاں چیز کو چھوا، اور میں نے اس چیز سے چھوا)۔ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اگر ''مسحت الشیئ'' کہا جائے یعنی بؔ کے بغیر ہو تو اس کا مطلب اس چیز کا پورے طور پر چھونا ہوگا اور اگر ''مسحت بالشیئ'' کہا جائے یعنی بؔ کے ساتھ، تو اس سے مراد اس چیز کے بعض حصہ کو چھونا ہوگا نہ کہ پوری چیز کو چھونا۔

بنابرایں جملہ ''وَامْسَحُوا بِرُءُوْسِكُمْ '' سر کے بعض حصہ کا مسح کرنے کے حکم پر دلالت کرتا ہے اب وہ حصہ کونسا اور کتنا ہے اس کی بابت آیت مبارکہ سے کچھ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی وضاحت سنت وروایات پر موقوف ہے۔ اور صحیح روایات سے سر کے پیشانی والے حصہ کے مسح کا ثبوت ملتا ہے، اور جملہ ''وَاَرْجُلَكُمْ '' لام پر زبر کے ساتھ ہے جبکہ بعض حضرات نے اسے لام کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ''وَاَرْجُلِكُمْ '' تو اس صورت میں اس کا عطف ''بِرُءُوْسِكُمْ '' پر ہوگا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ لام کے نیچے زیر عطف کی وجہ سے نہیں بلکہ تبعیت کی بناء پر ہے جیسا کہ آیہ مبارکہ ''وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ '' سورۂ انبیاء آیت ۳۰۔ میں لفظ ''حَيٍّ'' ''شَيْءٍ'' کی وجہ سے مجرور ہے لیکن یہ قول صحیح نہیں کیونکہ علم الادب کے ماہرین نے تبعیت کو نادرست طور وطریقہ قرار دیا ہے لہٰذا کلام الٰہی میں اس کی گنجائش قابل تصور نہیں اور جہاں تک جملہ ''كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ '' کا تعلق ہے تو اس میں ''جَعَلْنَا'' سے مراد ''خلقنا'' ہے لہٰذا اس میں تبعیت کی بات بے معنی ہے اور تبعیت کے حوالہ سے بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مورد صرف وہ ہے جہاں تابع ومتبوع میں پیوستگی واتصال پایا جائے جیسا کہ عربوں کے ہاں یوں کہا جاتا ہے ''جُحر ضب خربٍ '' میں اس لفظ ''خربٍ '' لفظ ''ضبٍّ '' کی تبعیت کی بناء پر مجرور ہے جبکہ ہمارے موضوع میں ایسا نہیں کیونکہ اس میں دو لفظوں کے درمیان حرفِ عطف ہے (وَامْسَحُوا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ) لہٰذا اس میں تبعیت کی گنجائش نہیں پائی جاتی،

اور جہاں تک جملہ ''وارجلكم '' کو حرفِ لام پر زبر کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے تو اگر آپ قارئین کرام خالی الذھن ہو کر آیت کے الفاظ پر غور کریں اور اس کی بابت کسی قول ورائے پر توجہ کئے بغیر سوچیں تو آپ واضح طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ جملہ ''وَاَرْجُلَكُمْ '' جملہ ''رؤسكم '' پر عطف کی بناء پر منصوب ہے یعنی لام پر زبر ہے، اگرچہ ظاہراً لفظی طور پر ''رؤسكم '' میں سؔ کے نیچے زیر ہے کیونکہ اس پر حرفِ جر ''ب'' ہے (برؤسكم) لیکن مقامی ومعنوی طور پر وہ منصوب ہے کیونکہ فعل ''وَامْسَحُوا'' کا مفعول بہ ہے اور ''مفعول بہ'' منصوب ہوتا ہے، اس بناء پر ''اَرْجُلَكُمْ'' کو بھی منصوب (زبر کے ساتھ) ہونا چاہیے، لہٰذا آیت کے جملوں سے آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اس میں چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو دھونے اور سر اور دونوں پیروں کے مسح کرنے کا وجوبی حکم مذکور ہے تو آپ کے ذہن میں ہرگز یہ بات نہیں آئے گی کہ ''اَرْجُلَكُمْ'' کو آیت کے پہلے جملہ ''وُجُوْهَكُمْ '' کی طرف عطف کریں حالانکہ جو حکم جملہ ''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ '' میں مذکور ہے (یعنی چہرہ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا) وہ جملہ ''وامسحوا بوجوهكم '' کے آنے سے ختم ہو گیا اور مسح کے حکم نے غسل کے حکم کی جگہ لے لی لہٰذا اب دوسرا حکم یعنی مسح ہی ملحوظ ہوگا، کیونکہ طبع سلیم اس کے علاوہ کسی بھی مطلب کو قرین صحت قرار نہیں دیتی، بلکہ کلام الٰہی تو بجائے خود کسی عام کلام کو بھی اس کے علاوہ کسی مطلب پر محمول نہیں کیا جا سکتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی فصیح و بلیغ کلام کرنے والا شخص اس طرح کہے: قبلت وجه زيد ورأسه ومسحت بكنفه ويده (میں نے زید کے چہرہ کو چوما

اور اس کو اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے ہاتھ کو) اس میں ''یدہ'' (دال پر زبر) نہیں پڑھ سکتے اور اسے ''وجہ زید'' (زید کا چہرہ) کی طرف عطف قرار نہیں دے سکتے کیونکہ پہلا سلسلہ کلام منقطع ہو چکا اور ''یدِہ'' کو دال کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھنے کی گنجائش اس لئے باقی ہے کہ اسے ''بکنفہ'' کی طرف عطف کر دیا جائے اور یہ بات اہل عرب کے ہاں معمول وقرین صحت سمجھی جاتی ہے اور اس کی مثالیں ان کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور اسی کی بابت آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے روایات بھی منقول ہیں جہاں تک اہل سنت کے اسناد سے منقول روایات کا تعلق ہے تو وہ اگرچہ آیت کے الفاظ کی تفسیر پر مشتمل نہیں بلکہ وہ صرف حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل اور بعض صحابہؓ کے فتویٰ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض پاؤں کے مسح کا حکم بیان کرتی ہیں جبکہ بعض میں ان کے دھونے کا حکم مذکور ہے البتہ اہل سنت کے اکثر علماء ومحدثین وفقہاء نے دھونے کے حکم پر مشتمل روایات کو مسح کے حکم پر مبنی روایات پر ترجیح دی لیکن یہاں ان کے ساتھ ہماری بحث کا مقام نہیں کیونکہ وہ ایک فقہی بحث ہے جو علم الفقہ میں ہوتی ہے اور اس کا تفسیری عمل سے کوئی تعلق وربط نہیں، البتہ انہوں نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی ہے کہ آیہ مبارکہ کو اپنے مخصوص فقہی نظریات وآراء پر منطبق کریں اور اس مقصد کیلئے انہوں نے گوں ناگوں تاویلوں کا سہارا بھی لیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی کاوشیں بے نتیجہ ہیں اور آیت کی ان کی مخصوص آراء سے مطابقت قطعی ثابت نہیں بلکہ یہ کام تب ممکن ہے جب کلامِ الٰہی کی بلند پایہ بلاغت کو (معاذ اللہ) پست ترین درجہ تک لے جایا جائے، ذیل میں ان لوگوں کے بیانات وتاویلات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو ان کے جوابات کے ساتھ ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''ارجلکم'' جملہ ''وجوھکم'' کی طرف عطف ہے یعنی جس طرح ''وُجُوْهَكُمْ'' (زبر کے ساتھ) ہے اس طرح ''اَرْجُلَكُمْ'' (لام پر زبر کے ساتھ) ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں مربوط مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان جلد ۳، صفحہ ۱۶۴، اور اگر ''ارجلِکم'' (لام کے نیچے زیر) کو تبعیت کی بناء پر مجرور قرار دیا جائے تو اس سلسلہ میں بھی بعض مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں کہ اس طرح کلام کی عظمت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس سے اس کی بلاغت پر کاری ضرب لگتی ہے لہٰذا دونوں صورتیں ناقابل قبول ہیں اور کلام کی طبعی ترتیب وترکیب ان سے مطابقت نہیں رکھتی۔

(۲) بعض حضرات نے ''ارجلکم'' کو مجرور قرار دینے میں یہ تاویل پیش کی ہے کہ یہ لفظی عطف کے باب سے ہے نہ کہ معنی کے لحاظ سے! یعنی لفظی طور پر اس کا عطف ''رؤسکم'' کی طرف ہے لہٰذا اس سے پاؤں کا مسح کرنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا دھونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مثال شاعر کا یہ مصرعہ ہے: ''عَلَفْتُھا تِبْناً وماءًا بارداً'' (میں نے اپنی اُونٹنی کو گھاس کھلائی اور اسے ٹھنڈا پانی پلایا)۔

اس توجیہ وتاویل میں یہ نقص وخرابی پائی جاتی ہے کہ اس میں جملہ اس طرح فرض کیا گیا ہے: ''فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ'' (پس تم اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ، اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو دھوؤ) گویا ایک فعل امر ''اغسلوا'' فرض کیا گیا تا کہ جملہ ''أَرْجُلَكُمْ'' کو منصوب (لام پر زبر کے ساتھ) پڑھا جا سکے، اسی لئے انہوں نے شاعر کے شعر کے ذریعے استشہاد کیا تا کہ ان کی رائے درست قرار پا سکے، جبکہ وہ اس امر سے غافل رہے کہ فعل ''اغسلوا'' خود بخود متعدی ہوتا ہے اس کے لئے حرف جر کی ضرورت نہیں ہوتی یعنی کسی ایسے حرف کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جو اس کے مفعول کو مجرور کرے یعنی زیر دے، اور اگر فعل ''اغسلوا'' کے علاوہ کوئی فعل فرض کیا جائے تو وہ ظاہر الکلام کے منافی ہوگا اور لفظوں میں بھی اس کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی، اور انہوں نے جس شعر کا مصرعہ حوالہ کے طور پر ذکر کیا ہے اس کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ وہ مجازِ عقلی کے باب سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈا پانی پلانے کو کھلانے اور چارہ دینے کے معنیٰ میں لیا گیا ہے، یا یہ کہ یوں کہا جائے ''علفتها'' (میں نے اسے چارہ دیا) میں دینے، عطا کرنے اور سیر کرنے کا معنیٰ پایا جاتا ہے اس کے علاوہ یہ مطلب بھی لازم الذکر ہے کہ جس شعر کو حوالہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس کے فہم المعنیٰ کے لئے کوئی فعل فرض کرنا ناگزیر ہے ورنہ اس کا معنیٰ نامفہوم ہوگا لہٰذا اس کے لئے قطعی طور پر راستہ ڈھونڈنا پڑے گا جس سے اس سے مطلوبہ معنیٰ حاصل ہو سکے، جبکہ آیہ مبارکہ میں کسی طرح کے لفظی مفروضہ کی ضرورت نہیں کہ جس سے فہم المعنیٰ یقینی ہو سکے۔ بلکہ اس کے الفاظ کی ترتیب ہی اس سے مطلوبہ معانی تک رسائی کو یقینی بناتی ہے۔

(۳) بعض حضرات نے پاؤں کے دھونے کے وجوبی حکم کی بناء پر ''أَرْجُلِكُمْ'' کے مجرور ہونے کی بابت توجیہ و تاویل اس طرح پیش کی کہ اس کا عطف برمحل ہے اور مسح کا مطلب ہلکا سا دھونا ہے یعنی تر کرنا، تو وہ بھی ایک لحاظ سے دھونا ہی قرار پاتا ہے لہٰذا آیت میں پاؤں کا مسح کرنے سے مراد ان کا دھونا لیا جائے تو کوئی حرج لازم نہیں آتا، اور اس کی مزید تاکید وتقویت اس سے ہوتی ہے کہ آیت میں جس عضو کے دھونے کی بابت تحدید وتوقیت مذکور ہے وہ صرف چہرہ ہے اور ہاتھ لیکن مسح کرنے کے حکم میں تحدید مذکور نہیں اور صرف پاؤں کو ٹخنوں تک (أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ) مسح کرنے کے حکم میں حد مذکور ہے تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے بھی یہاں مراد ان کا دھونا ہے یعنی تم پاؤں کو ٹخنوں تک دھوؤ، (ملاحظہ ہو: تفسیر ''المنار'' جلد ۶ ص: ۲۲۹)

یہ توجیہ وتاویل نہایت بے ربط وفضول ترین بات ہے جو اس بحث میں پیش کی گئی ہے کیونکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی محتاج بیان ہے کہ ''مسح'' اور ''غسل'' میں فرق پایا جاتا ہے دونوں ہم معنیٰ نہیں اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ پاؤں کا مسح کرنے کو ان کا دھونا قرار دینا جبکہ سر کے مسح کرنے کو اس کا دھونا قرار نہ دینا ترجیح بلا مرجح ہے یعنی بلا وجہ وبلا دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر پاؤں کے مسح کو دھونے کے معنی میں لیا جائے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کتاب وسنت میں جہاں بھی لفظ

''مسح'' ذکر ہوا ہے اس سے دھونا اور جہاں لفظ ''غسل'' ذکر ہوا ہے وہاں مسح کرنا مُراد کیوں نہ لیا جائے؟ اور کیا وجہ ہے کہ جن روایات میں غسل یعنی دھونے کا حکم مذکور ہے ان سے مسح کرنا مراد نہ لیا جائے اور جن روایات میں مسح کرنے کا حکم مذکور ہے ان سے غسل یعنی دھونا مراد نہ لیا جائے؟ اگر ہم ایسا کریں تو کیا تمام شرعی دلائل اجمال کا شکار نہ ہوں گے کہ پھر ان کی وضاحت کا کوئی راستہ نہ پایا جائے گا؟

اور جہاں تک اس قائل کے تائیدی حوالہ کا تعلق ہے کہ جس میں انہوں نے کہا کہ آیت میں جس عضو کے دھونے کی بابت تحدید و توقیت مذکور ہے وہ صرف چہرہ ہے جبکہ مسح کے حکم میں تحدید مذکور نہیں لہٰذا اس سے پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا ہی مقصود ہوگا تو ان کی یہ بات قطعی بے بنیاد اور مخصوص معنی کو قیاس کے ذریعے الفاظ پر ٹھونسنے کی ایک بدنما صورت ہے اور قیاس کے باب میں اس سے بدنما صورت قابل تصور نہیں۔

(۴) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلی طور پر وضو میں دونوں پاؤں کا پانی کی تری سے مسح کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ کلی طور پر تیمم میں چہرہ کو خاک سے مسح کرنے کا حکم دیا، تو جب وضو کرنے والا شخص ایسا کرے گا تو وہ مسح کرنے والا بھی کہلائے گا اور دھونے والا بھی کہلائے گا کیونکہ ''دھونا'' سے ان پر پانی ڈالنا یا تر کرنا مراد ہے اور مسح سے ہاتھ پھیرنا اور ان پر تر ہاتھ لگانا مراد ہے، لہٰذا جب کوئی شخص اس طرح انجام دے گا تو وہ ایک ہی وقت میں ''غاسل'' (دھونے والا) بھی ہے اور ''ماسح'' مسح کرنے والا) بھی ہے۔ بنا براین لفظ (اَرۡجُلَکُمۡ) کو نصبی حالت میں پڑھنا (حرف لامؔ پر زبر کے ساتھ) اس وجہ سے ہے کہ دونوں پاؤں کا دھونا واجب ہے اور اسے مجرور (لامؔ کے نیچے زیر) قرار دینا اس وجہ سے ہے کہ پانی کی تری سے ان کا مسح کرنا واجب ہے جو کہ ایک طرح کا دھونا ہی ہے یہ ہے اس قائل کے بیان کا خلاصہ!

حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ سر اور پاؤں کے احکام میں اپنی رائے کیونکر منطبق کر سکتے ہیں اور کس طرح اس مطلب کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں سر کے مسح سے مراد دھونا نہیں جبکہ پاؤں کے مسح میں دھونا مراد ہے؟ اگر ان کی بات پر اچھی طرح غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ یہ بات ان کے سابقہ قول ہی کی مانند ہے بلکہ بعینہ وہی ہے بلکہ اس میں بعض خرابیاں زیادہ ہیں لہٰذا جو اشکال سابقہ قول پر وارد ہوتا ہے وہ اس پر بھی وارد ہوتا ہے بلکہ اس پر مزید اضافہ یہ کہ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلی طور پر وضو میں دونوں پاؤں کے مسح کرنے کا حکم دیا ہے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں وضو کا تیمم پر قیاس کیا ہے اور اس قیاس میں اگر حکم کا حکم پر قیاس مراد ہے یعنی جو حکم ان کے نزدیک روایات سے ثابت ہے اس کا قیاس مقصود ہے تو اس بات کا آیت سے کیا تعلق ہے اور یہ مطلب آیت سے کیونکر ثابت ہوتا ہے؟ جبکہ آپ قارئین کرام کو معلوم ہے کہ وہ روایات آیت کی تفسیر کے باب میں نہیں ہیں اور اگر اس قیاس سے ان کی مراد وضو میں مذکور ''فامسحوا بروؤسکم و ارجلکم الی الکعبین'' کا تیمم میں مذکور ''فامسحوا

بوجوھکم و ایدیکم منہ ‘‘ پر قیاس ہے تو اس طرح کا قیاس سرے ہی سے نادرست بلکہ دونوں جانبوں سے یعنی جس کا جس پر قیاس ہو رہا ہے اس طرح کا قیاس ممنوع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں میں لفظ مسح کو حرف بؔ کے ساتھ متعدی کر کے ذکر کیا ہے (فامسحوا برؤسکم ، فامسحوا بوجوھکم)، اور اس حوالہ سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب لفظ ’’مسح‘‘ حرف بؔ کے ساتھ متعدی ہو تو لغت کے اعتبار سے وہ مسح کی جانے والی جگہ کے پورے حصہ پر مسح کرنے کو ثابت نہیں کرتا بلکہ پورے حصہ کو مسح کرنے کا ثبوت صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب لفظ ’’مسح‘‘ خود اپنے آپ سے یعنی حرف بؔ وغیرہ سے متعدی نہ ہو۔

تو یہ ہیں وہ چار اقوال و آراء کہ یہ اور ان جیسی دیگر آراء و نظریات کے ذریعے آیت مبارکہ پر من پسند مطالب ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے اور آیت کے ظواھر کے برعکس معنی کے اثبات کے لئے ان روایات کی اعتباری حیثیت کا تحفظ اور ان کے قرآن مجید سے معنوی ٹکراؤ کی طرف توجہ ہٹانا ہی ان کا مقصود ٹھہرا، جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر یہ بات جائز ہو کہ ہم کسی روایت کے معنی کو آیت پر ٹھونسنے کے لئے آیت میں اس طرح تاویل کریں کہ اس سے اس کے ظاہری معنٰی کے برعکس صورت پیدا ہو تو پھر قرآن مجید کی مخالفت اور اس کے معانی کی اعتباری حیثیت سے انکار کا مصداق ہی باقی نہ رہے گا اور پھر ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق تاویل کر کے من پسند معنی کو آیتوں پر ٹھونستا دکھائی دے گا۔

ہاں، اگر وضو میں پاؤں کے دھونے کے واجب ہونے کے قائل حضرات اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنا پسند کریں تو انہیں چاہیے کہ وہی بات کریں جو ان کے ماسلف حضرات مثلاً انسؓ، شعبیؒ اور دیگر نے کی جیسا کہ ان کی طرف سے منقول ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ جبریل نے پاؤں کے مسح کرنے کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچایا مگر سنت نے ان کا دھونا واجب کیا ہے (تفسیر کشاف، جلد اوّل صفحہ ۶۱۱) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآنی حکم کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منسوخ کر دیا، اگر یہ مطلب درست قرار دیا جائے تو پھر بحث کا عنوان ہی بدل جائے گا اور تفسیری بحث، اصولی (علم الاصول) بحث میں تبدیل ہو جائے گی کہ جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے کہ آیا قرآنی حکم کا سنت کے ذریعے منسوخ ہونا جائز ہے یا جائز نہیں؟ اگر ایسا ہو تو یہ کام علماء علم الاصول سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ کسی مفسر سے! اور کسی مفسر کا مفسر ہونے کی حیثیت میں یہ کہنا کہ فلاں روایت قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اس سے متصادم و ٹکراؤ رکھتی ہے، صرف اس غرض کے لئے ہوگا کہ یہ مطلب واضح کرے کہ فلاں روایت ظاہر الکتاب کے علاوہ مطلب پر دلالت کرتی ہے، مفسر کا اپنے بیان میں کسی شرعی حکم کے بارے میں فتویٰ دینے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ وہ فقیہ کا کام ہے کہ آیات قرآنیہ و سنت نبویہ کے ذریعے کسی شرعی حکم کی نشاندہی کرے کہ جسے ’’فتویٰ‘‘ کہا جاتا ہے ورنہ فقیہ کو اپنی شخصی رائے آیت و روایت پر ٹھونسنے کا حق حاصل نہیں اور نہ ہی وہ ایسا کرتا ہے اور جو اس طرح کرے وہ قابل قبول نہیں۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ آیت میں لفظ ''اِلَى الْكَعْبَيْنِ'' ذکر ہوا ہے تو لغت میں لفظ ''کعب'' پاؤں کے اوپر والے حصہ پر ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''کعب'' سے پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ میں ابھری ہوئی ہڈی مراد ہے لیکن اگر دوسرا معنیٰ درست قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر پاؤں میں دو ابھری ہوئی ہڈیاں ہیں۔

غسل جنابت کا قرآنی حکم:

''وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا''

(اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو پاک ہو جاؤ)

لفظ ''جُنب'' جو کہ لغت میں مصدر ہے اس کا عام استعمال اسم فاعل میں ہوتا ہے یعنی وہ شخص جو جنابت کی حالت میں ہو، اور اس کے اصل میں مصدر ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال مذکر و مؤنث اور واحد و جمع سب کے لئے ہوتا ہے چنانچہ ایک مرد کے لئے کہا جاتا ہے: رجل جنب (جنب مرد)۔ اور عورت کے لئے کہا جاتا ہے ''امرأۃ جنب'' (جنب عورت)، دو مردوں یا عورتوں کے لئے کہا جاتا ہے ''رجلان جنب'' (دو جنب مرد)، ''امرأتان جنب'' (دو عورتیں جنب)، دو سے زیادہ کے لئے یوں کہا جاتا ہے ''رجال جنب'' (کئی جنب مرد)، ''نساء جنب'' (کئی جنب عورتیں) گویا ہر مقام پر ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کا مصدری معنیٰ مقصود ہوتا ہے۔

بہرحال جملہ ''وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا'' جملہ ''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ'' پر عطف ہے کیونکہ آیت میں اس حکم کو بیان کرنا مقصود ہے کہ نماز میں طہارت یعنی پاک ہونا شرط ہے، بنا بر ایں جملہ ''وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا'' گویا اس طرح ہے ''وتطهروا ان کنتم جنباً'' (اور تم طہارت کرو اگر تم جنب ہو)، تو اس طرح وضو کرنے اور نہ کرنے کے حوالہ سے یعنی اس کی بابت آیت کے الفاظ سے فہم المعنی کے لئے اس طرح عبارت فرض کرنا پڑے گی: **''فاغسلوا وجوهکم و ایدیکم و امسحوا برؤسکم وارجلکم ان لم تکونوا جنباً وان کنتم جنباً فاطهروا''** (پس تم اپنے منہ اور ہاتھوں کو دھوؤ اور اپنے سر اور پاؤں کا مسح کرو اگر تم جنب نہیں ہو، اور اگر تم جنب ہو تو طہارت کرو) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وضو کرنے کا حکم صرف اس صورت میں ہے جب جنابت کی حالت میں نہ ہوں، لیکن اگر جنب ہوں تو غسل کرنا واجب ہے چنانچہ روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہی حکم بعینہ سورۂ نساء آیت ۴۳ ''وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا'' میں واضح طور پر مذکور ہے اور یہاں زیر بحث آیت میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ اس میں غسل کرنے کو اپنے آپ کو پاک کرنے (فاطهروا) سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ یہ غسل سے حاصل ہونے والی حالت سے مختلف ہے کیونکہ یہ اس سے حاصل نتیجہ

کا نام ہے یعنی غسل کرنے سے انسان طاہر ہو جاتا ہے اور یہاں اصل عمل یعنی غسل کرنے کو "پاک کرنا" قرار دیا گیا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے جسم سے میل کو پانی سے دور کرنے کو "تنظیف" سے موسوم کیا گیا ہے یعنی صاف کرنا اور یہ مطلب بعض روایات میں مذکور امامؑ کے بیان کردہ اس جملہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے: "ماجریٰ علیہ الماء فقد طهر" (جس چیز پر پانی بہہ جائے وہ پاک ہو جاتی ہے)۔

تیمم کا قرآنی حکم:

"وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا"

(اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے ہمبستری کی ہو مگر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو تم تیمم کرو)

یہاں سے اس شخص کے بارے میں شرعی فریضہ کے بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کے پاس پانی میسر نہ ہو کہ جس سے وضو یا غسل کرے۔

آیت مبارکہ میں جن امور کا ذکر ہوا ہے یعنی بیماری، سفر، رفع حاجت سے فارغ ہونا یا عورتوں سے مباشرت وہ حقیقت میں ایک دوسرے سے تقابلی صورت میں نہیں کیونکہ بیماری اور سفر میں سے کوئی بھی بذات خود ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے انسان ناپاک ہوتا ہو اور طہارت کے لئے وضو یا غسل واجب ہوتا ہو بلکہ وہ تب وضو یا غسل کا باعث بنیں گے جب بیماری یا سفر میں حدث اصغر (پیشاب یا پاخانہ) یا حدث اکبر (جماع وغیرہ) واقع ہو کہ جس کی وجہ سے نماز پڑھنے کے لئے طہارت (غسل) کرنی پڑی، لہٰذا آخری دو شقیں (رفع حاجت سے فارغ ہو کر آنا اور عورتوں سے ہمبستری کرنا) پہلی دو شقوں (بیماری اور سفر) کے مدمقابل نہیں بلکہ پہلی دو شقوں میں سے ہر ایک گو یا دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حرف "اوَ" (اوجاء احد منکم من الغائط) بمعنی واو ہے کہ اس سلسلہ میں عنقریب تفصیل ذکر کی جائے گی اس کے علاوہ یہ کہ جن امور کی وجہ سے وضو وغسل واجب ہوتا ہے وہ صرف بیماری و سفر نہیں بلکہ دیگر وجوہات بھی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے بیماری و سفر کا تذکرہ اس لئے فرمایا ہے کہ عام طور پر انہی دو میں پانی میسر نہیں ہوتا اور رفع حاجت اور عورتوں سے مباشرت کے بعد پانی کا میسر نہ آنا اتفاقی بات ہے (اتفاقی طور پر ہوتا ہے) اور دوسری جانب پہلی جانب کے برعکس یہ کہ بیماری اور سفر کا درپیش ہونا مقتضائے طبع بشر نہیں بلکہ اتفاقیہ امر ہے جو واقع ہوتا ہے جبکہ رفع حاجت اور مباشرت کا عمل دونوں

طبع بشری کی ضرورتوں میں شامل ہیں پہلا کام یعنی رفع حاجت حدث اصغر کا موجب ہوتا ہے کہ جسے وضو کے ذریعے دور کیا جاتا ہے جبکہ دوسرا کام حدثِ اکبر کا سبب بنتا ہے کہ جسے غسل کے ذریعے دور کیا جاتا ہے۔

تو یہ چار امورا ایسے ہیں جن میں سے بعض اتفاقی طور پر اور بعض طبعی طور پر واقع ہوتے ہیں کہ جن میں عام طور پر پانی میسر نہیں آتا جیسے بیماری و سفر یا اتفاقاً پانی دستیاب نہیں ہوتا جیسے رفع حاجت و مباشرت، تو اگر ان صورتوں میں پانی بالکل موجود نہ ہو تو تیمم کا حکم متعین ہوتا ہے بنابرایں پانی کا دستیاب نہ ہونا دراصل اس کے استعمال پر قادر نہ ہونے یعنی اسے استعمال نہ کر پانے سے کنایۃً ذکر ہوا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ عام طور پر استعمال نہ کر پانے کو نہ ہونے سے یا نہ پائے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ پانی کا نہ پایا جانا مذکورہ تمام چاروں امور میں بیماری سمیت بنیادی طور پر تقییدی حوالہ رکھتا ہے۔

پانچ اصولی نتائج:

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں درج ذیل پانچ امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) جملہ ''کُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤی'' میں لفظ ''مرض'' (بیماری) سے مراد وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے پانی کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص اس میں پانی استعمال کرے تو اسے تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا ثبوت جملہ ''فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً'' اور آیت کا سیاق الکلام ہے کہ جس میں پانی کے حوالہ سے تقییدی تذکرہ ہوا ہے۔

(۲) جملہ ''اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ'' میں موضوع کی دوسری شق ذکر ہوئی ہے جو انسان کو زندگی میں کبھی درپیش ہوتی ہے کہ جس میں عام طور پر اسے پانی میسر نہیں آتا اس بناء پر اس جملہ کو جملہ ''اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ'' کے تقییدی حوالہ سے نہیں قرار دیا جائے گا بلکہ اسے جملہ ''فَاغۡسِلُوۡا'' پر عطف قرار دیا جائے گا اور فہم المعنی کے لئے عبارت کو یوں فرض کرنا ہوگا ''اذا قمتم الی الصلاۃ و کنتم علیٰ سفر ولم تجدوا ماءً فتیمموا'' (جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو جبکہ تم سفر کی حالت میں ہو اور تمہیں پانی میسر نہ آئے تو تم تیمم کرو) تو اس فرض کی بناء پر کہ اسے مطلق اور رفع حاجت و جنابت میں سے کسی ایک حالت کے ساتھ مقید نہ کرنے کی صورت میں اس طرح قرار دینا ہوگا کہ جملہ ''اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسلوا'' کو جس طرح ابتداء میں کسی تقیید کی ضرورت نہ تھی اسی طرح دوسری صورت میں عطف کی وجہ سے بھی تقیید کی ضرورت نہیں گویا اس میں یہ بیان مقصود ہے کہ جب تم نماز پڑھنا چاہو تو وضو کرو اور دوسرے جملہ میں کہا گیا کہ جب تم نماز پڑھنا چاہو جبکہ تم سفر میں ہو اور تمہیں پانی میسر نہ آئے تو تم تیمم کرلو،

(۳) جملہ ''اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡکُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ'' سابقہ شقوں سے بالکل الگ ایک مستقل شق ہے لہٰذا یہ بات درست

نہیں کہ حرف ''اَوْ'' یہاں حرف ''واوْ'' کے معنی میں اس طرح سے ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے:۔

○ سورۂ صافات، آیت ۱۴۷

''وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ''

(اور ہم نے اسے ایک لاکھ یا زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا)

کیونکہ یہاں اس بات کی ضرورت ہی نہیں کہ حرف ''اَوْ'' کو حرف واو کے معنی میں لیا جائے اور یوں کہا جائے کہ آیت کا معنٰی یہ ہے کہ جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو اور رفع حاجت کر کے آئے ہو یا جنب ہو گئے ہو تو ایسا کرو، اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت (صافات ۱۴۷) میں حرف ''اَوْ'' اپنے اصل معنی میں ہی ہے نہ کہ حرف ''واوْ'' کے معنی میں! لہٰذا اس میں یائی صورت کا مطلب یہ نہیں کہ متکلم کو اصل تعداد کا علم نہیں بلکہ اس طرح کے مقامات میں طبعاً ایسی صورت سامنے آجاتی ہے کہ بیان میں اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اس کا کلام کرنے والے کے جاننے اور نہ جاننے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کی مثالیں قرآن مجید میں اُمید و آرزو کے مقامات میں استعمال کئے گئے ان الفاظ میں پائی جاتی ہیں:

''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' سورۂ بقرہ آیت ۱۲، ''لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' البقرہ ۱۰۲، بنابرایں زیر بحث آیت میں مذکور جملہ عطف کی بناء پر سابقہ جملہ کی مانند ہے اور اسے فہم المعنی کیلئے یوں فرض کرنا ہوگا: ''اذا قمتم الی الصلاۃ و کان جاء احد منکم من الغائط ولم تجدوا ماءً فتیمموا'' (جب تم نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو اور تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے اور تمہیں پانی میسر نہ ہو تو تم تیمم کرو)۔

اس بیان کی روشنی میں یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے الفاظ سے اس حکم کا ثبوت ملے کہ جس شخص نے وضو کیا ہو یا پانی نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کیا ہو اور ابھی حدثِ اصغر (پیشاب و پاخانہ یعنی رفع حاجت) کی وجہ سے اس کا تیمم یا وضو ختم نہ ہوا ہو اور وہ ابھی تک طہارت کے ساتھ ہو تو اس پر دوبارہ وضو یا تیمم کرنا واجب نہیں، یہ عدم وجوب آیت کے الفاظ سے ''مفہوم شرط'' کے حجت ہونے پر مبنی ہے کہ جس کی تائید و تاکید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں اس شخص پر دوبارہ طہارت کرنا واجب نہیں جو ابھی طہارت کے ساتھ ہو (''مفہوم شرط'' کی بحث علم الاصول سے تعلق رکھتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حکم کسی چیز سے مشروط ہو تو اس شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں وہ حکم ساقط قرار پائے گا یعنی مشروط ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ شرط متحقق نہ ہونے کی صورت میں حکم ساقط ہو جائے گا)

اور جملہ ''اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ'' ادب کی نہایت عمدہ صورت کا حامل ہے اور اس کی بابت غور و فکر اور تدبر کرنے والے ہر شخص پر اس جملہ کی ادبی عظمت آشکار ہے کیونکہ اس میں اصل مقصود کو ''غائط سے واپس آنے'' کے الفاظ سے

کنایۃً بیان کیا گیا ہے، عربی زبان میں لفظ ''غائط'' نچلی جگہ کو کہتے ہیں اور سابقہ ادوار میں لوگ اس طرح کی جگہوں کو رفع حاجت کے لئے استعمال کرتے تھے تا کہ لوگوں سے پوشیدہ ہو کر اپنی فطری و طبعی ضرورت کو پورا کر سکیں ان کا ایسا کرنا مقتضائے ادب و اخلاق کے عین مطابق تھا مگر اب اس لفظ یعنی ''غائط'' کو جس نئے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے وہ اصل میں کنایۃً استعمال ہونے والے ان الفاظ میں سے ہے جو اپنے حقیقی معانی کی بجائے مناسبتی معانی میں استعمال ہوتے ہیں یا غیر مناسبتی معانی میں!، اس کی مثال لفظ ''عذرۃ'' سے دی جاسکتی ہے جس کا اصل معنی گھر کے سامنے کی جگہ ہے اور اسے مخصوص نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس میں گھر کا کوڑا کرکٹ اور گندگی وہاں ڈالتے تھے اور رفتہ رفتہ ہر گندگی اور پھر مخصوص گندگی یعنی پاخانہ کے لئے استعمال ہونے لگا کہ اب اس میں استعمال ہوتا ہے (ملاحظہ ہو: کتاب الصحاح جلد ۳ ص ۷۶۴)

یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت: ''اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ'' مذکور ہے اس کی بجائے یوں نہیں کہا گیا ''أوجئتم من الغائط'' (یا جب تم پائخانہ سے آؤ) کیونکہ اس سے منسوب الیہ متعین ہوتا ہے اور نہ ہی یوں کہا گیا ''أوجاء أحد کم من الغائط'' (یا تمہارا کوئی ایک پائخانہ سے آئے) کیونکہ اس میں بھی اضافت کی وجہ سے منسوب الیہ کے متعین ہو جانے کا اندیشہ پایا جاتا ہے لہٰذا منسوب الیہ کو مبہم رکھنے کی غرض سے یوں ارشاد ہوا: ''اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ'' (یا تم میں سے کوئی ایک پائخانہ سے آئے) تو اس میں ادب و اخلاق کو ملحوظ قرار دیا گیا ہے۔

(۴) جملہ ''اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ'' (یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو) اپنے ماقبل جملہ کی طرح کلام کی مستقل شق ہے اور عطف اور معنی میں بھی اسی کی طرح ہے اور وہ جماع یعنی ہمبستری کرنے سے کنایۃً استعمال کیا گیا ہے جو کہ مقتضائے ادب ہے کہ زبان پر صراحت کے ساتھ اس کا نام نہ لیا جائے کیونکہ طبع انسانی اس طرح کے صراحتی اظہار کو ناپسند کرتی ہے۔

یہاں ایک سوال قابل تصور ہے اور وہ یہ کہ اگر ادب البیان مقصود و ملحوظ تھا تو سابقہ جملہ یعنی ''وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا'' کی طرح یہاں بھی اس طرح کے الفاظ ذکر کئے جاتے جو کہ ادب کے حوالہ سے زیادہ بلاغت کے حامل ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی بات درست ہے لیکن اس سے ایک اہم نکتہ ختم ہو جاتا ہے جو کہ مقتضائے طبع بشری سے عبارت ہے کہ جس کی بابت اشارہ ہو چکا ہے جبکہ ''جنابت'' کے الفاظ میں وہ نکتہ نہیں پایا جاتا لہٰذا جو الفاظ ذکر ہوئے وہ ہر لحاظ سے درست ہیں۔

اس بیان سے بعض ان لوگوں کی طرف منسوب بات کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ جنہوں نے کہا آیت میں عورتوں کو چھونے (ملامسۃ النساء) سے اس کا حقیقی معنی مراد ہے کہ جسے صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اسے جماع یعنی ہمبستری سے کنایۃً تعبیر قرار دینا قرین صحت نہیں اس بیان کی نادرستی اس حوالہ سے ہے کہ آیت کا سیاق اس سے موزونیت نہیں رکھتا بلکہ کنایۃً تعبیر کرنا ہی قرین قیاس اور معنوی مناسبت کا حامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتداء میں حدثِ اصغر کا حکم یعنی

وضو اور حدثِ اکبر یعنی جنابت کا حکم یعنی غسل بیان کیا کہ جس کا تعلق عام حالت یعنی پانی کے میسر ہونے سے ہے اس کے بعد غیر معمولی حالت یعنی پانی میسر نہ ہونے کی صورت میں شرعی حکم کو بیان فرمایا اور واضح طور پر ذکر کیا کہ پانی میسر نہ آنے کی صورت میں وضو کے بدلے تیمم کیا جائے جبکہ موزوں ومناسب اور مقتضائے مقام سے طبعی طور پر مطابقت کی بناء پر ضروری تھا کہ اس کے ساتھ غسل کے بدلے میں بھی شرعی حکم ذکر کر دیا جاتا کیونکہ وہ بھی وضو ہی کی طرح طہارت کا حصہ ہے، بنا بر ایں ایسے الفاظ ذکر کئے گئے جو غسل کے بدلے شرعی حکم کے اشاراتی بیان پر مشتمل ہوں اور وہ یہی جملہ ہے ''اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ'' کہ اس میں کنایۃً شرعی حکم مذکور ہے اور لامحالہ وہی اس میں مراد ومقصود ہے لہٰذا اس جملہ کو صرف وضو کے بدلے شرعی حکم کے بیان سے مختص قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وضو طہارت کا ایک حصہ وقسم ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طہارت کی دوسری قسم یعنی غسل کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۵) مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں آیۃ مبارکہ پر جو چار اعتراضات کئے گئے ہیں وہ سب خود بخود نادرست قرار پاتے ہیں ملاحظہ ہوں وہ چار اعتراضات واشکالات اور ان کے جوابات:

پہلا اعتراض اور اس کا جواب:۔

اعتراض: آیت میں بیماری اور سفر کا ذکر کیا جانا غیر ضروری ہے کیونکہ وہ دونوں اس وقت تیمم کا سبب بنتے ہیں جب آخری دو شقوں یعنی حدثِ اصغر اور عورتوں سے ہمبستری میں سے کوئی ایک ان کے ساتھ ہو جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ دونوں استقلالی طور پر تیمم کا سبب بنتے ہیں خواہ بیماری وسفر نہ بھی ہو لہٰذا آخری دو شقوں کے ذکر کرنے سے پہلی دو شقوں کو ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی یعنی اگر کوئی شخص حدث اصغر یا عورتوں سے جنسی ملاپ نہ کرے تو اس پر تیمم واجب نہیں ہوتا۔

جواب: آیت میں مذکور آخری دو شقوں پہلی دو شقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ منضم کرنے کی غرض سے ذکر نہیں ہوئیں بلکہ ان چاروں شقوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اسے ذکر کرنے میں خاص مقصد ملحوظ ہے کہ اگر اسے ذکر نہ کیا جائے تو کلام میں مقصودہ غرض کے حصول کی امید باقی نہ رہتی جیسا کہ اس حوالہ سے سابق الذکر مطالب میں وضاحت ہو چکی ہے۔

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب:۔

اعتراض: دوسری شق کہ جملہ ''اَوْ عَلٰی سَفَرٍ'' میں مذکور ہے غیر ضروری ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے پہلے اعتراض میں بیان ہو چکا ہے البتہ بیماری کا لاحق ہونا ایک ایسا معقول عذر ومجبوری ہے کہ جس کی وجہ سے وضو کا حکم تیمم میں بدل جاتا ہے لہٰذا اس کا بیان ضروری ہے تاہم اس بناء پر کہ پانی موجود ومیسر ہے لیکن اس کا استعمال مقدور نہیں نہ کہ پانی کی عدم دستیابی حکم کی تبدیلی کا باعث ہے یعنی چونکہ بیمار کا پانی سے وضو کرنا اس کے لئے نقصان دہ ہے اس لئے اسے وضو کی بجائے تیمم کرنے کا حکم

دیا گیا ہے لہٰذا بیماری کا نام لینا ضروری تھا جو کہ لیا گیا لیکن "سفر" کی بات ضروری نہ تھی، جبکہ آخری دو شقوں کا ذکر کیا جانا اس لئے ضروری تھا کہ ان میں پانی کی عدم دستیابی حکم کی تبدیلی میں ملحوظ تھی، بنابرایں کسی بھی حوالہ سے "سفر" کا ذکر کیا جانا ضروری نہیں،

جواب: جملہ "فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً" میں پانی کے میسر نہ آنے کی بات اس کے استعمال کے مقدور نہ ہونے کی طرف اشارہ و کنایہ کے طور پر ہوئی ہے یعنی خواہ پانی میسر ہو مگر اس کا استعمال نقصان دہ ہو یا میسر نہ ہو دونوں صورتوں میں یہی حکم متعین ہے چنانچہ اس کی بابت بھی مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض: جملہ "فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً" دیگر تینوں شقوں سے بے نیاز کرتا ہے اس کے ساتھ کسی شق کے بیان کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور اگر جملہ "وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى" کی جگہ یوں کہا جاتا "وان لم تجدوا ماءً" تو زیادہ واضح و مختصر ہوتا، یعنی اگر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو تم تیمم کرو اس میں تمام شقیں یکی ہو جاتیں۔

جواب: اگر ایسا ہوتا تو کلام میں پائے جانے والے تمام اہم ترین نکات تشنۂ بیان رہ جاتے،

چوتھا اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض: اگر "فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً" کی بجائے یوں کہا جاتا: "وان لم تقدروا علی الماء" یا اس کا ہم معنی جملہ تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس میں بیماری اور اس کے علاوہ دیگر امور خود بخود شامل ہو جاتے۔

جواب: آیت میں مذکور الفاظ مقصودہ معانی و مطالب کے کنایۃً بیان پر مشتمل ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ کنایہ، صریح بیان سے زیاد بلیغ اور مطلب کی تفہیم کی بابت زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

تیمم کا حکم اور ترتیب:

"فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ"

(پس تم پاکیزہ خاک سے تیمم کرو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو)

عربی زبان میں لفظ "تیمم" کا معنیٰ ارادہ کرنا ہے اور لفظ "صَعِيْدً" کا معنیٰ زمین کا اوپر والا حصہ ہے اور آیت میں لفظ "طیب" سے اس کی توصیف ہوئی ہے۔ کسی چیز کے "طیب" ہونے سے مراد اس کی اپنی اصل طبعی حالت کے عین مطابق ہونا ہے یہاں اس سے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ اپنی اصل طبعی حالت میں ہو یعنی اصل خاک و پتھر ہو اور ایسی نہ ہو کہ جسے آگ پر پکا کر اور اُبال کر یا اس طرح کے دیگر طریقوں سے چونا، ٹھیکری، چونے کا پتھر اور معدنیات بنا دیا گیا، سورۂ اعراف آیت ۵۸ میں اس طرح مذکور ہے: "وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا"

(اور طیب زمین سے اس کی نبات اپنے رب کے اذن سے نکلتی ہے جبکہ خبث (ناپاک) جگہ سے سوائے گندگی کے کچھ نہیں نکلتا)۔ اسی سے تیمم کی جگہ کے ''طیب'' ہونے کی بابت روایات میں ''صعید'' کی جو شرائط ذکر ہوئی ہیں ان سب کی وضاحت ہوجاتی ہے اور اصل مقصود سے آگاہی حاصل ہوجاتی ہے ایک قول یہ ہے کہ یہاں ''طیب'' سے مراد ''طہارت'' ہے یعنی پاک مٹی، تو اس سے خاک کے پاک وطاہر ہونے کی شرط ثابت ہوتی ہے۔

اور جملہ ''فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ'' میں جن چیزوں کے مسح کرنے کا حکم مذکور ہے وضو میں ان کے دھونے کا حکم ہے بنابرایں تیمم درحقیقت وضو ہی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وضو میں سر اور پیروں کا مسح کرنے کا حکم تھا کہ تیمم میں اس کی جگہ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونے کا حکم دیا گیا ہے مگر پانی کے بدلے خاک قرار دی گئی تاکہ عمل میں آسانی پیدا ہو،

ان مطالب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیمم میں جن دو اعضاء کے مسح کرنے کا حکم ہے وہی دو اعضاء ہیں جن کا وضو میں دھونا واجب ہے اور یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے لفظ ''مسح'' کو حرف ''ب'' کے ساتھ متعدی کرکے ذکر فرمایا ہے (فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ) لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسح میں ان دو اعضاء کے بعض حصوں کا مسح مقصود ہے وضو میں پورا دھونا واجب ہے یعنی چہرہ کا بعض حصہ اور ہاتھوں میں کہنیوں تک کا بعض حصہ! یہ مطلب ان روایات میں مذکور چہرہ اور ہاتھوں پر مسح کرنے کے حصوں کی تعیین وتحدید کے عین مطابق ہے جو آئمہ اہل بیتؑ کی اسناد سے منقول ہیں اور ان میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ چہرہ کا پیشانی کے دونوں اطراف اور ہاتھوں کا کلائیوں تک مسح کریں۔

اس بیان سے ان لوگوں کے نظریہ کی نفی وعدم صحت واضح ہوتی ہے جنہوں نے ہاتھ کی تحدید بغلوں کے نیچے کے حصہ تک ذکر کی ہے اور ان لوگوں کی رائے کا بطلان بھی آشکار ہوجاتا ہے جنہوں نے تیمم میں بعینہ انہی جگہوں پر مسح کرنے کو ضروری قرار دیا ہے، جن کا وضو میں دھونا واجب ہے یعنی ہاتھوں کا کہنیوں تک ان کی رائے اس بناء پر نادرست ہے کہ آیت کے الفاظ سے اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ آیت میں لفظ ''مسح'' کو حرف بؔ سے متعدی کیا گیا ہے جس سے بعض حصہ کے مسح کرنے کا ثبوت ملتا ہے،

اور آیت میں حرف ''من'' (منه) گویا ابتداء کے معنی میں ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرنے میں خاک سے ابتداء کی جائے چنانچہ روایات میں بھی اس کی وضاحت یوں مذکور ہے کہ مسح کرنے والا شخص پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو خاک پر مارے اور پھر ان ہاتھوں سے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حرف ''من'' ابتداء کے معنی میں نہیں بلکہ تبعیض کے معنی میں ہے اور اس سے مراد یہاں یہ ہے کہ زمین پر دونوں ہاتھ مارنے کے بعد جو خاک باقی رہ جائے مثلاً غبار وغیرہ اس سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا

جائے اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جس خاک سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا جائے اس کا کچھ نہ کچھ غبار پر مشتمل ہونا واجب ہے بنابرایں اس صاف پتھر پر تیمم کرنا صحیح نہیں جس پر کچھ غبار نہ ہو، لیکن ظاہراً وہی بات درست ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور حکم سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ ان حضرات کی احتمالی آراء سے مختص نہیں۔

خُدا کیا نہیں چاہتا اور کیا چاہتا ہے؟

''مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَ کُمْ''

(اللہ نہیں چاہتا کہ تم کسی تنگی کا شکار ہو لیکن وہ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے)

اس جملہ میں فعل مضارع ''مَا یُرِیْدُ'' کے مفعول پر حرف ''مِن'' مطلب کی نفی کی بابت تاکید کی غرض سے ہے لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ دینی احکام میں سے کوئی حکم ایسا نہیں جس میں لوگوں کو سختی و تنگی میں مبتلا کرنا مقصود ہو اسی لئے نفی کو اصل ''حرج'' کی بجائے اس کا ارادہ کرنے ''مایرید'' سے مربوط قرار دیا گیا ہے کہ خدا اس کا ارادہ ہی نہیں کرتا کہ تم پر کسی حکم پر سختی کرے اور تمہیں تنگی میں مبتلا کرے۔

''حرج'' کی دو قسمیں ہیں ایک حرج وہ ہے جو حکم کی اصل غرض و غایت اور اس سے مقصود مصلحت و بہتری میں شامل ہوتا ہے تو اس صورت میں وہ حکم ذاتاً حرج پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً زھد کی اعلیٰ ترین صفت کا ملکہ و قابلیت حاصل کرنے کی غرض سے لذت بخش غذا کھانے کی ممانعت کا حکم تو اس طرح کا حکم بنیادی طور پر ہی حرج پر مشتمل ہوتا ہے حرج کی دوسری قسم وہ ہے کہ جو حکم کی اصل غرض و غایت میں شامل نہیں بلکہ اتفاقیہ اسباب کی وجہ سے کہ جو اصل غرض کے دائرہ سے خارج ہوتے ہیں حکم کو لاحق ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں بعض افراد کے لئے وہ حکم حرج کا باعث ہوتا ہے لہٰذا ان مخصوص افراد کی بابت وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ دیگر افراد کہ جن کے لئے وہ باعث حرج نہیں ہوتا ان پر نافذ ہوتا ہے مثلاً جو شخص بیماری کی وجہ سے نماز میں کھڑا نہیں ہو سکتا کیونکہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اس کے لئے تکلیف کا باعث بنتا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے کھڑا ہو کر نماز پڑھنے کا وجوبی حکم ساقط ہو جاتا ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر افراد کہ جو کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں ان سے وہ حکم ساقط نہیں ہوتا۔

آیت میں اسلوب بیان کی تبدیلی اہم ترین مطلب کی ترجمانی کرتی ہے اور وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جاری سلسلہ کلام میں ''مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ'' کے بعد بیان کا رخ موڑتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَ کُمْ'' (لیکن وہ چاہتا ہے تمہیں پاک رکھے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں جس ''حرج'' کی نفی کی گئی ہے وہ حکم کی اصل غرض و غایت میں شامل حرج ہے لہٰذا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو احکام تمہارے لئے صادر فرماتا ہے ان میں کسی

بھی لحاظ سے تمہارے لئے ''حرج'' نہیں پایا جاتا اور نہ ہی وہ اس لئے قرار دیئے گئے کہ ''حرج'' کا سبب بنیں۔

بنابراین کلام الٰہی کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے لئے جو احکام قرار دیئے ہیں ان میں ہمارا مقصد و مقصود تمہاری تطہیر اور اتمام نعمت ہے کہ اصل معیار و اساس اور غرض و غایت یہی ہے ان احکام سے ہمارا مقصد تم پر سختی کرنا اور تمہیں تنگی میں مبتلا کرنا ہرگز نہیں، اسی وجہ سے ہم نے جب وضو اور غسل کو تمہارے لئے دشواری و سختی کا باعث پایا کہ پانی کے میسر نہ آنے کی وجہ سے تم تکلیف و تنگی میں مبتلا ہوتے ہو تو ہم نے وضو اور غسل کے وجوب کو تیمم کے وجوب میں بدل دیا جو کہ تمہیں مقدور ہے، اور ایسا نہیں کہ پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں طہارت کا حکم سرے ہی سے ختم ہو جائے بلکہ اس کی جگہ تیمم کا حکم اس لئے صادر کیا تاکہ تم پاک ہو جاؤ اور تم پر نعمت تمام ہو تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔

تطہیر و اتمام نعمت:

''وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ''

(لیکن وہ چاہتا ہے تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر گزار بن سکو)

آیت مبارکہ میں مذکور ''حرج کی نفی'' کے معنی کے حوالہ سے جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جملہ ''يُرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ'' میں خداوند عالم یہ کہنا چاہتا ہے کہ وضو غسل اور تیمم کا حکم صرف اس لئے صادر کیا گیا ہے کہ تم طہارت کے حامل ہو جاؤ کیونکہ یہ تینوں طہارت کے حصول کے اسباب ہیں یعنی انہی کے ذریعے طہارت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ ''طہارت'' خواہ کوئی بھی ہو وہ بدن سے ظاہری نجاست سے پاک ہونے کا نام نہیں بلکہ وہ روحانی و معنوی طہارت ہے جو ان تین اعمال کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور حقیقت میں اسے ہی نماز کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے،

اسی مطلب سے یہ بات بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ شرعی طور پر جس شخص نے ان تینوں اعمال میں سے کوئی عمل انجام دیا ہوا گر اس کا وہ عمل ان چیزوں کے ذریعے ختم نہ ہوا ہو جو طہارت کو نقض کرتی ہیں مثلاً وضو، نیند، رفع حاجت وغیرہ سے ٹوٹ جاتا ہے تو جب تک وضو باقی ہو اس شخص پر واجب نہیں کہ ہر نماز کے لئے دوبارہ وضو کرے بلکہ سابقہ وضو کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے یہ مطلب آیت مبارکہ کے ابتدائی جملوں کے مبنی پر اطلاق ہونے کے منافی بھی نہیں کیونکہ تشریع میں وجوب وغیر وجوب (استحباب) دونوں ملحوظ ہوتے ہیں اس بناء پر یہ شرعی حکم واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص وضو سے ہو اور اس سے حاصلہ طہارت کے ساتھ نماز پڑھے تو جب تک وضو باقی ہے اسی کے ساتھ دیگر نمازیں بھی پڑھ سکتا ہے اس پر ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنا واجب نہیں البتہ مستحب ہے کہ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرے تو ان دونوں میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی، سابقہ وضو باقی ہونے

کے باوجود دیگر نمازوں کے لئے مستحب کی نیت سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اتمام نعمت اور شکر گزاری کے حوالہ سے ارشاد ہوا: ''وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ'' نعمت اور اس کے اتمام کی بابت سورۂ مائدہ آیت ۳ ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں اور سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴ ''وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ'' کی تفسیر میں شکر کے معنیٰ کی وضاحت ہو چکی ہے ملاحظہ ہو المیزان جلد چہارم۔

آیت میں ''نعمت'' سے مراد دین ہے البتہ اس میں پائے جانے والے معارف و احکام کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بناء پر کہ دین کا معنی تمام امورِ زندگی میں اللہ کے حضور سر تسلیم خم کر دینا ہے اور یہی معنی بندوں پر اللہ تعالیٰ کی ولایت و حاکمیت ہی کا نام ہے اور اس ولایت کی کمالی صورت تمام دینی احکام کہ جن میں زیر بحث تین طہارتیں بھی ہیں ان کی تشریع و قانون گزاری کے مراحل کو پورا کر دینا ہے۔

یہاں یہ اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیت میں مذکور دونوں مقاصد یعنی تطہیر (لِيُطَهِّرَكُمْ) اور اتمامِ نعمت (لِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ) میں فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ''طہارت'' تین طہارتوں کی تشریع کی غرض و غایت ہے جبکہ ''اتمام نعمت'' میں ایسا نہیں بلکہ وہ یعنی اتمام نعمت تمام احکام کی غرض و غایت ہے اور تین طہارتوں کو ان احکام میں اپنی حد تک حیثیت و مقام حاصل ہے بنا بر ایں ان دو مقاصد میں سے ایک خاص اور دوسرا عمومیت کا حامل ہے۔

ان مطالب کے تناظر میں آیت کا معنی یوں کیا جائے گا: لیکن وہ چاہتا ہے کہ ان تین طہارتوں کے احکام جاری کر کے ان کے ذریعے تمہارے پاک ہونے کو یقینی بنائے اور چونکہ وہ دین کا حصہ ہیں لہٰذا ان کی تشریع سے تم پر اللہ کی تمام نعمتیں پوری ہو تا کہ تم شکر گزار بن سکو کہ پھر وہ تمہیں اپنے لئے مخصوص کر لے اپنے خالص بندوں میں قرار دے (ان مطالب پر مزید غور کریں)۔

اللہ کی نعمت اور میثاق کی یاد آوری:

''وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا''

(اور تم یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تمہیں عطا کی اور اس عہد و میثاق کو جو اس نے پختہ طور پر تم سے لیا کہ تم نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی)

یہاں ''میثاق'' سے مراد وہی عہد و پیمان ہے جو لوگوں سے لیا گیا کہ وہ اسلام کو قبول کریں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کریں گے، چنانچہ اس کی بابت یاد آوری کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ''اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور اطاعت کی) تو یہاں سن لینے اور اطاعت کرنے کا اظہار غیر مشروط و غیر مقید ہے یعنی ہر لحاظ سے اور ہر چیز میں اطاعت! اور یہی معنیٰ ہے اسلام کا! لہٰذا آیت مبارکہ ''وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ'' میں نعمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے

عطا کردہ وہ مواہب جمیلہ وعنایات کریمہ ہیں جس سے اس نے اسلام کی روشنی میں انہیں نوازا ہے اور وہ ان فضیلتوں و عظمتوں سے عبارت ہیں جو انہیں زمانہ جاہلیت کی بدترین حالت کے بعد اسلام قبول کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں یعنی امن وامان، عافیت وسلامتی، دولت وثروتمندی، دلوں کی پاکیزگی اور اعمال کی طہارت جیسا کہ درج ذیل آیت میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۰۳

''وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا''

(اور تم یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تم پر کی کہ جب تم آپس میں دشمنی رکھتے تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت پیدا کی کہ پھر تم اس کی نعمت کے طفیل بھائی بھائی بن گئے اور تم جلتی ہوئی آگ (دوزخ) کے کنارے تک جاچکے تھے پھر اس نے تمہیں اس سے نجات عطا کی)

ایک قول یہ ہے کہ ''نعمت'' سے مراد حقیقی اسلام ہے کیونکہ وہ ہر نعمت کا سرچشمہ ہے اسی سے ہر نعمت فیض پاتی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں آپ قارئین اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ''نعمت'' سے مراد حقیقی اسلام ہو یا ولایت ہو وہ اس کے مصداق کی ایک تعینی صورت ہے لفظ کے مفہوم کی تشخیص وتحدید نہیں کیونکہ مفہوم صرف اس حقیقت کا نام ہے جو لفظ سے سمجھی جاتی ہے کہ اس کا تعلق علم لغت سے ہے علم تفسیر سے نہیں ہے لہٰذا ہم اس کی بابت کوئی اظہار رائے نہیں کرتے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی یاد دلاتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ'' (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو یقیناً اللہ دلوں کی باتوں سے بخوبی آگاہ ہے) تو اس حوالہ سے انہیں تقویٰ اختیار کرنے کا صریح حکم صادر فرمایا،

روایات پر ایک نظر!

ایک فقہی مسئلہ:

کتاب ''تہذیب الاحکام'' میں مؤلفؒ نے واضح اسناد کے ساتھ آیۂ مبارکہ ''اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا جس میں آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو اور

نماز پڑھنا چاہو، راوی یعنی ابن بکیر نے کہا: میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: کیا نیند سے وضوٹوٹ جاتا ہے: امامؑ نے فرمایا: ہاں، جب نیند ساعت پر غالب آجائے اور کچھ سنائی نہ دے، (تہذیب الاحکام، جلد اوّل، صفحہ ۷)

یہی مطلب دیگر روایات میں بھی مذکور ہے اسے سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں زید بن اسلم اور نحاس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے لیکن اس سے ہمارے اس بیان کی نفی نہیں ہوتی جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ''نماز کے لئے کھڑا ہونے'' سے مراد اس کا ارادہ کرنا ہے کیونکہ قیام یعنی کھڑا ہونے کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ لفظ ''قیام'' کے حرف ''الیٰ'' سے متعدی ہونے کی بناء پر ہے (اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ) جبکہ روایت میں جو معنی ذکر ہوا ہے وہ لفظ ''قیام'' کے حرف ''من'' سے متعدی ہونے کی بناء پر ہے گویا امامؑ نے فرمایا کہ یہاں حرف ''الیٰ'' حرف ''من'' کے معنی میں ہے۔

تیمم کی ترتیب کی قرآنی حیثیت:

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے زرارہ کے حوالہ سے ذکر کیا انہوں نے کہا میں نے امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: ''من أین علمت و قلت ان المسح ببعض الرأس و بعض الرجلین'' آپ کس بناء پر فرماتے ہیں کہ سر اور پاؤں کے بعض حصوں کا مسح کیا جائے یعنی مسح کا حکم سر کے بعض حصہ اور پاؤں کے بعض حصوں سے مخصوص ہے؟

''فضحك ثم قال: یازرارة قال رسول الله صلی الله علیه واله وسلم و نزل به الکتاب من الله، لان الله عزوجل یقول: ''فاغسلوا وجوهکم'' فعرفنا ان الوجه کله ینبغی أن یغسل''

امامؑ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے زرارہ! یہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے اور اسی حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں یوں ارشاد فرمایا: ''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ'' (تم اپنے منہ دھوو) تو اس سے ہم نے سمجھا کہ پورے منہ کا دھونا ضروری ہے۔

ثم قال: ''وایدیکم الی المرافق'' فوصل الیدین الی المرافق بالوجه فعرفنا انه ینبغی لهما ان تغسلا الی المرافق،

(پھر خدا نے فرمایا اور ''اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک''! تو اس حکم میں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونے کو منہ کے دھونے کے حکم کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، جس سے ہم نے سمجھا ہے کہ دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا ضروری ہے)

ثم فصل بین الکلام فقال: ''وامسحوا برؤسکم'' فعرفنا حین قال: ''برؤسکم'' انّ المسح

ببعض الرأس لمکان الباء، (پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے درمیان میں یہ الفاظ ذکر فرمائے: ''اور مسح کرو اپنے سروں کا'' تو ''بروٴسکم'' کے الفاظ سے ہم نے سمجھ لیا کہ یہاں سر کے بعض حصہ کا مسح کرنے کا حکم ہے کیونکہ یہاں حرف ''ب'' (بروٴسکم) تبعیض کے معنی میں ہے)۔

ثم وصل الرجلین بالرأس کما وصل الیدین بالوجه فقال: ''وأرجلکم الی الکعبین'' فعرفنا حین وصلهما بالرأس ان المسح علیٰ بعضهما، ثم فسر ذلك رسول الله (ص) للناس فضیعوه ثم قال: ''فان لم تجدوا ماءً فتیمموا صعیداً طیباً وامسحوا بوجوهکم و ایدیکم منه'' فلما وضع الوضوء ان لم یجدوا ماءً اثبت بعض الغسل مسحاً لانهٗ قال: ''بوجوهکم'' ثم وصل بها ''وایدیکم'' ثم قال: ''منه'' ای من ذلك التیمم، لانهٗ علم ان ذلك أجمع لم یجر علی الوجه لانهٗ یعلق من ذلك الصعید ببعض الکف ولا یعلق ببعضها، ثم قال الله: ''ما یرید الله لیجعل علیکم من حرج'' والحرج الضیق''

(پھر سر کے ساتھ دونوں پاؤں کو ملا دیا جیسا کہ دونوں ہاتھوں کو منہ کے ساتھ ملایا، چنانچہ یوں ارشاد فرمایا: ''وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ'' (اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک)، تو جب اللہ نے دونوں پاؤں کو سر کے ساتھ ملا کر فرمایا تو ہم نے اس سے سمجھ لیا کہ پاؤں کے بعض حصہ پر مسح کرنے کا حکم ہے پھر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو اس کی تفسیر بیان فرمائی جسے لوگوں نے کھو دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْهُ'' (اگر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاک خاک پر تیمم کرو اور اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو اسی سے!) تو جب پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں وضو کا حکم ختم کر دیا تو وضو میں جن جگہوں کے دھونے کا حکم تھا وہاں بعض حصوں کے تیمم کا حکم دیا چنانچہ فرمایا ''بِوُجُوْهِکُمْ'' پھر اس کے ساتھ ہاتھوں کے مسح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ''اَیْدِیْکُمْ'' (اور اپنے ہاتھوں کو)، پھر فرمایا ''مِّنْهُ'' یعنی اسی تیمم (اسی خاک) سے! اس سے معلوم ہو گیا کہ منہ اور ہاتھوں پر تیمم کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی پورے منہ کا تیمم واجب نہیں، کیونکہ زمین پر ہاتھ مارنے سے جو غبار ہاتھوں پر لگتا ہے وہ بعض حصہ پر لگتا ہے اور بعض حصہ پر نہیں لگتا، پھر خدا نے فرمایا ''مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ'' (اللہ تم پر کوئی حرج قرار دینا نہیں چاہتا) اس میں ''حرج'' سے مراد تنگی ہے۔ (فروع کافی، جلد ۳ ص ۳۰)

یاد رہے کہ مذکورہ بالا روایت میں امامؑ نے اپنے جاری سلسلہ بیان میں یوں فرمایا ''فان لم تجدوا ماءً'' تو یہ آیت کے معنی کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے باب سے ہے، ورنہ آیت میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''ولم تجدوا ماءً''

کافی کی دوسری روایت:

کتاب کافی ہی میں زرارہ اور بکیر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے؟ تو آنجناب ؑ نے ایک طشت یا پانی سے بھرا برتن منگوایا اور اس میں اپنا دایاں ہاتھ ڈال دیا اور اس سے ایک چلو پانی لیا اور اسے اپنے منہ پر ڈالا اور اس سے اپنے منہ کو دھویا پھر اپنے بائیں ہاتھ کو برتن میں ڈالا اور اس سے ایک چلو پانی لیا اور اسے اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی سے کلائی تک ڈالا یعنی اوپر سے نیچے کی طرف! نیچے سے اوپر کی طرف ہاتھ نہیں پھیرا، یعنی کلائی سے کہنی کی طرف پانی نہیں ڈالا، پھر اپنا دایاں ہاتھ پانی میں ڈالا اور اس سے اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی سے کلائی تک پانی ڈالا اور اسی طرح عمل کیا جس طرح دائیں ہاتھ پر کیا تھا، پھر اپنے سر اور دونوں پاؤں کا ہاتھوں کی تری سے مسح کیا اور اس کے لئے نیا پانی استعمال نہیں کیا اس وقت آپ ؑ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور ہاتھوں کو دھوو، لہٰذا نماز پڑھنے والے کو چاہیے کہ پورا منہ دھوئے کہ کوئی حصہ ایسا نہ ہو جسے نہ دھویا گیا ہو، امام ؑ نے حکم دیا کہ دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا جائے اور کہنیوں تک کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہے جسے نہ دھویا گیا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے: ''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ'' (اپنے منہ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوو) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ'' (پھر تم اپنے سر اور پاؤں کا مسح کرو ابھری ہوئی ہڈیوں تک) لہٰذا اگر سر کے بعض حصہ یا پاؤں کا ٹخنوں اور انگلیوں کے درمیانی حصہ کا مسح کیا جائے تو کافی ہے۔ راوی نے کہا کہ ہم نے امام ؑ سے پوچھا کہ ٹخنے کہاں ہیں۔ یعنی وہ پاؤں کا کونسا حصہ ہے؟، امام ؑ نے فرمایا: یہاں، یعنی مفصل (جوڑ) پنڈی کی ہڈی سے نیچے، ہم نے پوچھا: اس جگہ کو کیا کہتے ہیں؟ امام نے فرمایا: یہ پنڈی کی ہڈی ہے، اور ''کعب'' (ٹخنہ) اس سے نیچے ہے، ہم نے کہا: اللہ آپ کو جزا دے، یہ فرمائیں کہ آیا ایک چلو پانی منہ دھونے اور ایک چلو ہاتھ دھونے کے لئے کافی ہے؟ امام ؑ نے فرمایا: ہاں، اگر اچھی طرح پانی بھر کر دھویا جائے تو کافی ہے، اور دو چلو پانی ہو تو بہتر دھویا جا سکتا ہے (فروع کافی، جلد ۳، ص ۲۶)

یہ روایت مشہور ترین روایات میں سے ایک ہے اسے تفسیر العیاشی میں بکیر اور زرارہ کے حوالہ سے امام ابو جعفر محمد باقر ؑ سے منسوب ذکر کیا گیا ہے، اور اسی روایت کو عبداللہ بن سلیمان کے حوالہ سے بھی امام محمد باقر ؑ سے منسوب ذکر کیا گیا ہے، اسی روایت اور اس سے قبل ذکر شدہ روایت کے ہم معنی دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

علم امام علی ؑ کی ایک مثال:

تفسیر ''البرہان'' میں مذکور ہے کہ تفسیر العیاشی میں زرارہ بن اعین کے حوالہ سے اور ابو حنیفہ نے ابو بکر بن حزم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے وضو کیا اور جورابوں پر ہی مسح کر لیا پھر مسجد میں آیا اور نماز پڑھنے لگا، اس اثناء میں امام

علیؑ تشریف لائے اور اس کی گردن پر ٹھوکر مار کر اس سے کہا: تجھے کیا ہو گیا ہے کہ وضو کے بغیر نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا مجھے عمر بن خطابؓ نے اسی طرح حکم دیا ہے، راوی نے کہا کہ امام علیؑ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے عمر بن خطاب کے پاس لے آئے، امام علیؑ نے اُونچی آواز میں عمر سے کہا: دیکھیں یہ شخص آپ سے منسوب کیا کہہ رہا ہے؟ عمر نے جواب دیا: ہاں، میں نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح مسح کرتے تھے، امام علیؑ نے کہا: سورۂ مائدہ سے پہلے یا اس کے بعد؟ عمرؓ نے جواب دیا: اس کا مجھے علم نہیں، امام علیؑ نے کہا: لم تفتی وانت لا تدری؟ جب آپ نہیں جانتے تو فتویٰ کیوں دیتے ہیں؟ یہ حکم قرآن مجید میں پہلے نازل ہوا تھا، جو سورۂ مائدہ میں منسوخ ہو گیا (تفسیر برھان، جلد اوّل، صفحہ ۴۵۲)

تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ عمر بن خطاب کے زمانہ حکومت میں جورابوں پر مسح کرنے کے بارے میں اختلاف عام تھا جبکہ حضرت علیؑ کا موقف یہ تھا کہ یہ حکم سورۂ مائدہ کی آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں بھی اس حکم کے منسوخ ہونے کا تذکرہ موجود ہے، اور اس کے برعکس اس حوالہ سے بعض حضرات مثلاً براء، بلال اور جریر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ مائدہ نازل ہونے کے بعد بھی جورابوں و نعلین پر مسح کرتے تھے لیکن اس طرح کی روایات مقصود کے اثبات میں قابل اعتماد نہیں بلکہ ان میں کئی حوالوں سے کمزوریاں ہیں جن حضرات نے اس حکم کو منسوخ تسلیم نہیں کیا ان کا گمان یہ تھا کہ نسخ کا قرآنی ثبوت موجود نہیں اور آیت اس سلسلہ میں مقصود کے اثبات میں ناکافی ہے جبکہ ان کی رائے قرین صحت نہیں کیونکہ سورۂ مائدہ کی یہی آیت نسخ کی دلیل ہے کیونکہ اس میں پیروں کے ٹخنوں تک مسح کرنے کا حکم مذکور ہے جبکہ جوراب یا جوتا پیر نہیں کہلاتے اور ان پر مسح کرنا پیروں پر مسح شمار نہیں ہوتا، یہی مطلب بعد والی روایت میں بھی مذکور ہے۔

تفسیر العیاشی کی دو روایتیں:

(۱) محمد بن احمد خراسانی نے سلسلہ سند ذکر کئے بغیر بیان کیا کہ ایک شخص حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جوراب پر مسح کرنے کے بارے میں سوال کیا، امامؑ نے لمحہ بھر اپنا سر جھکائے رکھا پھر سر اُٹھا کر فرمایا: خداوند عالم نے اپنے بندوں کو طہارت کا حکم دیا اور اسے جسم کے حصوں میں تقسیم کر دیا چنانچہ کچھ حصہ چہرہ سے، کچھ حصہ سر سے، کچھ حصہ دو پیروں سے اور کچھ حصہ دو ہاتھوں سے مخصوص کر دیا، لہٰذا اگر جورابیں جسم میں شامل ہیں تو ان کا بھی مسح کرو۔

(۲) حسن بن زید نے امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے بیان کیا کہ امامؑ نے فرمایا حضرت علیؑ، عمر بن خطاب کے دور میں جورابوں پر مسح کرنے کا مسئلہ میں دوسروں سے اختلاف رکھتے تھے، کیونکہ دیگر حضرات کہتے تھے کہ ہم نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جورابوں، نعلین پر مسح کرتے دیکھا ہے۔ امامؑ ان سے پوچھتے تھے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ مائدہ نازل ہونے سے پہلے ایسا کرتے تھے یا اس کے بعد؟ وہ کہتے تھے کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہے، امام علیؑ فرماتے تھے کہ مجھے اس کا علم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ مائدہ نازل ہونے کے بعد ایسا نہیں کرتے تھے لہٰذا میں گدھے کی پشت پر مسح کرنے کو جورابوں پر مسح کرنے پر ترجیح دیتا ہوں، اس وقت امامؑ اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے: ''یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ'' (تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۳۰۱)

تفسیر ''در منشور'' میں مذکور ہے کہ ابن جریر اور نحاس نے اپنی کتاب ناسخ میں حضرت علیؑ کے بارے میں ذکر کیا کہ آپؑ ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے: ''یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ'' (تفسیر ''منشور'' جلد ۲، صفحہ ۲۶۲)

اس حدیث کی وضاحت ہو چکی ہے۔

کافی کی ایک روایت:

کتاب کافی میں مولفؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ حلبیؒ کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے آیۂ مبارکہ ''اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ'' کے بارمیں پوچھا تو امامؑ نے فرمایا: اس سے مراد جماع یعنی ہمبستری کرنا و جنسی ملاپ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ پردہ پوشی کرنے والا ہے لہٰذا اسے پردہ پوشی پسند ہے لہٰذا اس نے صراحت کے ساتھ جماع کرنے کے الفاظ کی بجائے یوں ارشاد فرمایا ہے (فروع کافی جلد ۵ صفحہ ۵۵۵)

امام محمد باقرؑ کے ارشادات:

تفسیر العیاشی میں زرارہ کے حوالہ سے روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے تیمم کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے فرمایا ایک دن جناب عمار بن یاسر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور عرض کی: میں جنب ہو گیا تھا اور میرے غسل جنابت کرنے کے لئے پانی موجود نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: پھر تو نے کیا کیا اے عمار؟ عمار نے عرض کیا: میں نے اپنے کپڑے اتارے اور خاک میں لوٹ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: گدھا اسی طرح کرتا ہے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ'' (اور تم اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اسی سے مسح کرو) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو خاک پر رکھا پھر ان کو آپس میں ملا کر مسح کیا اور ان سے اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان پلکوں کے نیچے تک مسح کیا اس کے بعد ہر ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کو پھیرا، اس کی ابتداء دائیں ہاتھ سے کی۔

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں زرارہ سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: فرض اللہ الغسل علی الوجه و الذراعين و المسح علی الرأس و القدمين، فلما جاء حال السفر و المرض و الضرورة وضع الله الغسل و اثبت الغسل مسحاً، فقال: ''وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ''، (اللہ تعالیٰ نے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو دھونے اور سر اور پاؤں کے مسح کرنے کو واجب قرار دیا، مگر جب سفر میں ہو یا بیماری لاحق ہو یا کوئی اور ضرورت درپیش ہو تو اللہ تعالیٰ نے ان صورتوں میں دھونے کی جگہوں پر مسح کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے ملاپ کیا ہو) (تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۳۰۲)

امام صادقؑ کا قرآنی استدلال:

عبد الاعلیٰ۔ مولیٰ آل سام۔ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: میں گر گیا تھا تو میرا ناخن ٹوٹ گیا اور میں نے انگلی پر پٹی باندھ لی، اب میں کس طرح وضو کروں؟ امامؑ نے فرمایا: اس مسئلہ اور اس جیسے دیگر مسائل کا حل قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعے معلوم ہو چکا ہے: ''ما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج'' (اللہ نے تم پر دین کی بابت کوئی تنگی قرار نہیں دی)۔ (بحوالہ تفسیر العیاشی جلد ۳، ص ۳۰۳)

امامؑ نے اپنے بیان میں سورۂ حج کی آیت کا حوالہ دیا کہ جس میں ''حرج'' کی نفی مذکور ہے اور وضو والی آیت کے ذیلی جملہ کا حوالہ اسی مطلب کی بناء پر نہیں دیا جس کی بابت ہم بیان کر چکے ہیں کہ حرج کی نفی اصل معیار و ملاک کے حوالہ سے ہے، اور ہم نے جو روایات ذکر کی ہیں ان میں نہایت اہم نکات موجود ہیں کہ ان کے تناظر میں آیات کی بابت ہم نے جو مطالب پیش کئے ہیں ان کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ مطالب روایات کی تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آیات ۸ تا ۱۴

O يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ⑧

O وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ⑨

O وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ⑩

O يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑪

ترجمہ

O ''اے اہل ایمان! تم اللہ کے لئے قیام کرنے والے اور عادلانہ گواہی دینے والے بنو، اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی عدل نہ کرنے کا مرتکب نہ بنا دے، عدل اختیار کرو کہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے، تقوائے الٰہی اپناؤ، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے''

(۸)

O ''اللہ نے ایمان والوں اور اعمال صالحہ انجام دینے والوں سے مغفرت اور عظیم اجر کا وعدہ کیا ہے''

(۹)

O ''اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلا دیا وہی دوزخی ہیں''

(۱۰)

O ''اے اہل ایمان! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں اس وقت نوازا جب ایک قوم نے تمہیں اپنے زیر دست کرنا چاہا، تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا، تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ اللہ پر ہی توکل کریں''

(۱۱)

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

○ ''اور حقیقتاً اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و میثاق لیا اور ہم نے ان میں بارہ نقیب معین کئے اور اللہ نے ان سے کہا، میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کا ساتھ دیا اور تم اللہ کو اچھا قرض دیتے رہے تو میں ضرور تمہاری خطاؤں سے درگزر کروں گا اور تمہیں ان باغات میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں پھر تم میں سے جس نے بھی کفر کی راہ اپنائی تو وہ یقیناً راہ راست کو کھو بیٹھا''

(۱۲)

○ ''پھر ہم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اُن پر لعنت کی اور ان کے دلوں میں قساوت ڈال دی، وہ لوگ کلام الٰہی میں الٹ پلٹ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اسے انہوں نے بھلا دیا اور آپ سدا ان کی خیانت کاریوں سے آگاہ ہو رہے ہیں سوائے ان میں سے چند افراد کے! پس آپ ان سے عفو و درگزر کریں اور انہیں معاف کر دیں، یقیناً اللہ نیکی و احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''

(۱۳)

○ ''اور ہم نے ان لوگوں سے عہد و پیمان لیا جنہوں نے کہا: ہم نصرانی ہیں پھر انہوں نے اسے بھلا دیا جو ہم نے انہیں یاد دلایا تھا تو ہم نے ان کے درمیان روزِ قیامت تک دشمنی و نفرت پیدا کر دی اور بہت جلد اللہ انہیں ان کے انجام کار سے باخبر کر دے گا''

(۱۴)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کا ماقبل آیات سے ربط مسلم الثبوت ہے اور کسی وضاحت کا محتاج نہیں کیونکہ ان آیات میں مومنین سے ان اہم ترین امور کی بابت خطاب ہوا ہے جن کا تعلق اصولی طور پر ان کی آخرت اور دنیاوی زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے ہے۔

عادلانہ گواہی کا خدائی فرمان:

''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا''

اے ایمان والو! تم اللہ کے لئے قیام کرنے اور عادلانہ گواہی دینے والے بنو اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی عدل نہ کرنے کا مرتکب نہ بنادے۔

یہ آیت، سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ کی طرح ہے:

''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا''

اے ایمان والو! تم عدل قائم کرنے والے، اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو خواہ وہ تمہارے اپنے یا والدین اور قریبیوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ مالدار ہو یا نادار ہو مگر اللہ ان سے زیادہ حقدار ہے بس تم عدل قائم نہ کر کے نفسانی خواہشوں کی پیروی کے مرتکب نہ بنو اور اگر تم نے کج بیانی کی یا سچی گواہی دینے سے منہ موڑا تو اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔

دونوں آیتوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ سورۂ نساء کی آیت میں گواہی دینے میں عدل و انصاف سے روگردانی کرنے کو نفسانی خواہشات کی پیروی سے مربوط قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گواہی دینے والا شخص قرابت داری اور اس جیسے امور کی وجہ سے عادلانہ گواہی دینے سے گریز کرے اور اس طرح ناحق گواہی دے جس سے اس

کے مفادات کا تحفظ ہو، آیت میں اس طرح کی غیر عادلانہ گواہی کی نہی مذکور ہے جبکہ زیر نظر آیت یعنی سورۂ مائدہ (آیت ۸) میں عدل وانصاف اور حق کی گواہی دینے سے روگردانی کو باہمی دشمنی و ناراضگی سے مربوط قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گواہی دینے والا شخص کسی کے خلاف اس لئے گواہی دے کہ اس سے ناراض ہے یا اس سے کسی وجہ سے دشمنی رکھتا ہے اور اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے بدلہ لینا چاہتا ہے اور اس کے حق پر شب خون مارنا چاہتا ہے۔

اور مطلب کے اظہار میں الفاظ کا مختلف ہونا اصل غرض کے مختلف ہونے کی بناء پر ہے کہ جس کے نتیجہ میں دونوں آیتوں کے درمیان شروط و قیود مختلف ذکر ہوئی ہیں چنانچہ سورۂ نساء میں یوں ارشاد ہوا:

''كُونُوا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'' (تم عدل قائم کرنے والے بنو اللہ کے لئے گواہ بن کر)

اور سورۂ مائدہ میں یوں ارشاد ہوا:

''كُونُوا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ'' (تم اللہ کے لئے قیام کرو عادلانہ گواہ بن کر)

اور یہ اس لئے ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت میں ظالمانہ گواہی دینے کی وجہ سے شاھد اور مشہود علیہ کے درمیان پائی جانے والی دشمنی کو ذکر کیا گیا ہے لہٰذا گواہی کو قسط و عدل کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ گواہی میں عدل و انصاف کو ہر صورت میں ملحوظ رکھیں اور اس میں کسی بھی حوالہ سے ظلم کا ارتکاب نہ کریں خواہ دوسرا فریق دشمن ہی کیوں نہ ہو، جبکہ نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کی پیروی کی بناء پر کسی شخص کے بارے میں ناحق گواہی دینا اس سے مختلف ہے کیونکہ اسے ظالمانہ گواہی اور عدل وانصاف سے روگردانی قرار نہیں دیا جاتا اگرچہ حقیقت میں وہ بھی ظلم و زیادتی سے مبرا نہیں، اسی وجہ سے سورۂ مائدہ کی آیت میں قسط و عدل پر مبنی گواہی دینے کا حکم دیا گیا ہے اور قیام للہ کو اس کی فرع کے طور پر ذکر کیا گیا، یعنی اصولی طور پر گواہی کا عدل پر مبنی ہونا مطلوب ہے جس کا نتیجہ قیام للہ ہے جبکہ سورۂ نساء کی آیت میں گواہی میں للھیت اصل بنیاد ہے یعنی اس میں ذاتی خواہشات ملحوظ قرار نہ پائیں، اور اس کا نتیجہ قیام بالقسط کی صورت میں مطلوب قرار پایا ہے۔

اور اسی وجہ سے سورۂ مائدہ کی آیت میں عدل وانصاف پر مبنی گواہی دینے کے حکم کے ساتھ ہی یوں ارشاد فرمایا:
''اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ'' (عدل اختیار کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور تقوائے الٰہی اپناؤ) تو اللہ تعالیٰ نے عدل اختیار کرنے کی دعوت دی۔ فرمان صادر فرمایا اور اسے تقویٰ کے حصول کا ذریعہ قرار دیا اور سورۂ نساء کی آیت میں اس کے برعکس اللہ کے لیے گواہی دینے کے حکم کے بعد یوں ارشاد فرمایا ''فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا'' (تم خواہشات نفس کی پیروی نہ کرو کہ کہیں عدل نہ کر سکو) تو گواہی دینے میں نفسانی خواہشوں کی پیروی کرنے سے اور تقویٰ کو ترک کرنے سے منع فرمایا اور ایسا کرنے کو عدل نہ کرنے کا براذریعہ قرار دیا۔

پھر دونوں آیتوں میں تقویٰ کے ترک کرنے کی بابت خبردار کرتے ہوئے ایک ہی مطلب بیان کیا اور وہ یہ کہ اللہ

تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے چنانچہ سورۂ نساء میں یوں فرمایا ''وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا'' (اور اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو یا روگردانی کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے) اور سورۂ مائدہ میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'' (اور تقوائے الٰہی اختیار کرو، یقیناً خدا اس سے بخوبی آگاہ ہے جو تم عمل کرتے ہو)

جملہ ''اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى'' میں ضمیر ''هُوَ'' کی بازگشت عدل کی طرف ہے جو کہ صیغۂ امر ''اِعْدِلُوْا'' کا مدلول ہے، اس کا معنی واضح ہے۔

وعدۂ الٰہی:

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ''

(اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے کہ ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے)

اس میں دوسرا جملہ یعنی ''لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ'' اس وعدۂ الٰہی کا بیان ہے جس کی خبر جملہ ''وَعَدَ اللّٰهُ'' میں دی گئی ہے۔

یہاں ایک ادبی نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ سورۂ فتح کی آیت ۲۹ سے زیادہ تاکید کا حامل ہے: جس میں یوں ارشاد ہوا:

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا''

(اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے مغفرت اور اجر عظیم کا!)

لہٰذا وہ رائے درست نہیں جو بعض حضرات نے پیش کی ہے کہ زیر بحث آیت میں مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ الٰہی خبر کے بعد خبر کے طور پر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ ایک مستقل وعدۂ الٰہی ہے جو انشاء یعنی فرمان و فیصلہ کی صورت میں ہے اور اس طرح نہیں جیسے سورۂ فتح کی آیت میں ضمنی صورت میں اسے ذکر کیا گیا ہے۔

کافروں کا برا انجام:

''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ''

(اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہ دوزخی ہیں)

مشہور لغت دان راغبؒ اصفہانی نے لکھا ہے کہ "حجمۃ" کا معنیٰ آگ کے شعلوں کا شدت کے ساتھ بھڑکنا ہے، اسی لفظ سے "جحیم" بنا ہے، اور یہ آیت اصل وعید پر مشتمل ہے اور یہ بات سابقہ آیت میں مذکور جملہ "لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ" کے عین مقابل ہے یعنی اس میں اصل وعید کی بجائے وعدہ مذکور ہے جبکہ زیر نظر جملہ میں وعدہ کی بجائے اصل وعید (دوزخ) مذکور ہے۔

یہاں یہ اہم ترین مطلب قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "کفر" کے ساتھ آیات کی تکذیب کا حوالہ تقیدی صورت میں مذکور ہے جو کہ اس امر کی طرف دلالتی اشارہ کے طور پر ہے کہ آیات کی تکذیب کے بغیر کفر کا معاملہ اس سے مختلف ہے اور اس بات کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر آیات کی تکذیب کے بغیر کفر ہو تو وہ حق کی معرفت کے باوجود حق کا انکار نہیں کہلاتا بلکہ وہ استضعاف یعنی ناتوانی کے زمرے میں آتا ہے، اور صرف کفر اختیار کرنے والوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ چاہے تو انہیں معاف کرے اور چاہے تو انہیں سزا دے، بہرحال یہ دو آیتیں (وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ)، (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ) مومنوں اور کافروں دونوں کے بارے میں واضح بیان پر مشتمل ہیں، اہل ایمان و اعمالِ صالحہ بجالانے والوں سے نہایت پاکیزہ جزاء کا وعدہ کیا گیا ہے اور کافروں و آیات کی تکذیب کرنے والوں کو سخت ترین انجام کی خبر دی گئی ہے اور ان دو مرحلوں یعنی نہایت عمدہ اجر اور سخت ترین عذاب کے درمیانی مراحل اور متوسط منازل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کچھ بیان نہیں فرمایا بلکہ ان کی بابت ابہامی صورت ہی برقرار رکھی اور ان کے انجام کار کا تذکرہ نہیں کیا۔

نعمت الٰہی کی یاددھانی:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا"

(اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تم پر کی، کہ جب لوگ تم پر مسلط ہونے کے درپے تھے)

اس آیت میں مذکور بیان ان متعدد و مختلف واقعات پر منطبق ہوتا ہے جو کفار و مسلمین کے درمیان رونما ہوئے مثلاً جنگ بدر، جنگ احد، جنگ احزاب وغیرہ، اور بظاہر اس میں "اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا" سے مشرکوں کی ان تمام کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے مومنوں کو قتل کرنے اور اسلام و دین توحید کا نام و نشان و آثار مٹا دینے کے لئے کیں، لہٰذا جن حضرات نے یہ کہا کہ اس سے مراد بعض کفار کی طرف سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے یا بعض یہودیوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موت کے گھاٹ اتارنے کی سازش ہے ان کا نظریہ درست نہیں کیونکہ آیت کے الفاظ سے بظاہر اس کی مطابقت ثابت نہیں ہوتی۔

تقویٰ وتوکل علی اللہ:

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ"

(اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور اللہ ہی پر توکل کریں ایمان والے)

* حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور توکل علی اللہ کو ترک کرنے کی شدید ترین ممانعت مذکور ہے چنانچہ اس کا ثبوت اسی جاری سلسلہ بیان میں بنی اسرائیل اور نصاریٰ سے لئے گئے عہد و پیمان کے تذکرہ سے ملتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اور اپنے آپ کو نصاریٰ کہلانے والوں نے وعدہ کرنے کے بعد میثاق الٰہی کو توڑ دیا اور اللہ نے ان کی عہد شکنی کی سزا ان پر لعنت، سنگدلی، اپنے دین میں کمی اور قیامت تک باہمی دشمنی کی آگ میں جلنا قرار دی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی سرگزشت صرف اس لئے بیان کی کہ اس کے ذریعے مؤمنین کو حقائق سے آگاہی دلائے تاکہ وہ ان واقعات وحقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے درس عبرت لیں اور آگاہ ہوں کہ یہود و نصاریٰ جن سختیوں سے دوچار ہوئے وہ اللہ تعالیٰ سے کئے گئے عہد و پیمان کو بھلا دینے کا نتیجہ تھا اور وہ عہد و پیمان سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے یعنی اللہ کے فرامین پر کاملاً عمل پیرا ہوں گے، اور انہوں نے اس عہد و پیمان کو سننے اور اطاعت کرنے کے اظہار کے ساتھ پختہ کیا، تو اس کا اصولی تقاضہ یہ تھا کہ وہ اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچتے اور اپنے دینی اُمور میں اسی پر بھروسہ کرتے یعنی وہ اپنے ہر عمل میں اسی راہ وروش کو اپناتے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کی اور ہر اس کام سے باز رہتے جو اللہ نے ان کے لئے ناپسند فرمایا۔ اور اس کا طریقہ صرف یہی تھا کہ پیغمبران الٰہی پر ایمان لا کر ان کی اطاعت وفرماں برداری کا حق ادا کرتے اور اللہ اور اس کے رسولوں کے علاوہ ان لوگوں کی پیروی کرنے سے دوری اختیار کرتے جو انہیں اپنی ذاتی غلامی اور اپنی فرمانبرداری کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں یعنی جابر و آمر حکمران اور خود پرست وخود خواہ مذہبی رہنما (احبار و راہب) وغیرہ، اور یہ حقیقت ملحوظ رکھیں کہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت روا نہیں یا اس کی اطاعت روا ہے جو اللہ کی اطاعت کی دعوت دے۔

لیکن یہود و نصاریٰ نے اس عہد و پیمان کو اپنے پس پشت ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو گئے، وہ لوگ اللہ کے کلام کو جابجا کر کے اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے اور آیات الٰہیہ کی ان کے اصل مقاصد ومرادات کے علاوہ دیگر معانی میں تفسیر کی ان کا ایسا کرنا اس بات کا باعث ہوا کہ وہ دینی معارف سے بے بہرہ ہوئے اور اس محرومی کے نتیجہ میں ہر طرح کی خیر وسعادت ان کے ہاتھوں سے جاتی رہی کہ پھر جو کچھ دین کے حوالہ سے ان کے پاس باقی رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور اس میں خرابیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ "دین" جن معارف واحکام کا مجموعہ مرکب ہے وہ سب ایک دوسرے سے

اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک میں خرابی پیدا ہونا دوسرے حصہ کے خراب ہونے کا باعث بنتا ہے بالخصوص بنیادی ارکان واصول میں! اور وہ اس طرح سے کہ کوئی شخص نماز تو پڑھے مگر اللہ کے لئے نہ ہو، انفاق کرے مگر اللہ کی خوشنودی کے لئے نہ ہو اور قتال کرے مگر کلمہ حق کی سربلندی کے لئے نہ ہو۔

بنابرایں جو کچھ ان کے پاس دینی معارف میں سے باقی بچا وہ ان کے لئے مفید ثابت نہ ہوا کیونکہ وہ تحریف شدہ اور خرابیوں کا حامل تھا اور نہ ہی دین کے وہ معارف و احکام کہ جنہیں انہوں نے بھلا دیا ان سے بے نیازی ممکن تھی کیونکہ ''دین'' سے بے نیازی ممکن ہی نہیں بالخصوص دین کے بنیادی اصولوں اور ارکان سے!

ان مطالب کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے واقعات کا تذکرہ اس بات کا متقاضی تھا کہ مومنوں کو تقویٰ سے روگردانی کرنے اور اللہ پر توکل کرنے کو ترک کرنے کے برے انجام سے ڈرایا اور خبردار کیا جائے اور انہیں تقویٰ و توکل اختیار کرنے کی دعوت دی جائے۔

ان بیانات و مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ حقیقت بھی ظاہر و واضح ہو جاتی ہے کہ توکل علی اللہ سے مراد تمام تشریعی و تکوینی دونوں امور میں یا صرف تشریعی امور میں اللہ پر بھروسہ کرنا اور اسی کا سہارا لینا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا کہ وہ اس کی اور اس کے رسول کی اس کی طرف سے صادر ہونے والے احکامات اور دینی دستورات میں اطاعت کریں اور جو کچھ اللہ نے ان کے لئے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے وضاحت کے ساتھ انہیں بیان کر دیا اس کی فرمانبرداری کریں اور دین کے امور اور خدائی قوانین میں تمام سلسلے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر موقوف کریں اور دینی معاملات میں اپنی استقلالی حیثیت سے دستبرداری اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو شرعی فرامین صادر کئے ہیں ان میں اسی طرح عمل کریں جس طرح اس نے انہیں حکم دیا اور اس نے جو نظام الاسباب مقرر کر دیا ہے اسی کی پیروی کریں لیکن ان اسباب کو مستقل حیثیت کا حامل نہ سمجھیں اور نہ ہی ان کو ربوبیت کی حد تک لیجائیں بلکہ ہر سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ارادہ و چاہت اور اس کی تدبیر و مشیت سے حاصل ہونے والے نتائج کا انتظار کریں۔

بنی اسرائیل سے لئے گئے میثاق کا تذکرہ:

''وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا''

(اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا، اور ہم نے ان سے بارہ نقیب مبعوث کئے)

راغبؒ اصفہانی کا کہنا ہے کہ لفظ ''نقب'' دیوار اور جلد میں استعمال ہونے میں وہی معنی دیتا ہے جو لفظ ''ثقب''

لکڑی میں استعمال ہونے میں دیتا ہے، اس بناء پر ''نقیب'' اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کی تعداد اور ان کے حالات سے آگاہی و معلومات حاصل کرنے کا کام کرتا ہے۔ اس کی جمع ''نقباء'' ہے، (المفردات، صفحہ ۵۰۳)

اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیؐ کے اہل ایمان کو بنی اسرائیل کی سرگزشت سے آگاہی دلاتے ہوئے انہیں بتایا کہ اس نے ان کے لئے ان کے دینی احکام مقرر کئے، ان سے متعلق امور کو مستحکم کرنے کے لئے ان سے عہد و پیمان لیا، ان کے لئے نقیبوں کو مبعوث کیا، اپنی ہر بات ان تک پورے طور پر پہنچائی اور اس طرح ان پر اتمام حجت کیا، پھر انہوں نے اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور اللہ نے انہیں ان کے کئے کی سزا ان پر لعنت اور انہیں سنگدلی میں مبتلا کرنے کی صورت میں دی، چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد ہوا ''وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ '' (اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا) یہ وہی عہد و پیمان ہے جس کا تذکرہ متعدد بار سورۂ بقرہ اور دیگر مقامات میں ہو چکا ہے ''وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا'' (اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب مبعوث کئے) بظاہر اس سے مراد بارہ اسباط کے سردار ہیں جو ان کے والی و حاکم کی طرح تھے جو ان کے امور کی سرپرستی و نگرانی کرتے تھے ان کی حیثیت ایک حوالہ سے اپنے اسباط میں اسی طرح تھی جیسے اس امت کے افراد میں اولوا الامر کی حیثیت! کہ وہ ان کے دینی و دنیوی امور میں ان کی سرپرستی کرتے تھے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ان پر وحی نہیں آتی تھی اور نہ ہی وہ کوئی نیا شرعی حکم صادر کرتے تھے کیونکہ وہ کام صرف اللہ اور اس کے رسول سے مختص ہے، ''وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ '' (اور اللہ نے کہا: میں تمہارے ساتھ ہوں) اس جملے میں انہیں آگاہ کیا گیا کہ اللہ ان کا محافظ و نگران ہے لہٰذا اس کے تناظر میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کریں تو وہ ان کی مدد کرے گا اور اگر وہ اس کی نافرمانی کریں تو وہ انہیں رسوا کرے گا، اسی وجہ سے دونوں باتوں کو اکٹھا ذکر کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ '' (اگر تم نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی عزت کی) عزت کرنے کا مطلب ہے ان کی مدد کرنا ان کی تعظیم کے ساتھ! اور ''برسلی'' میں ''رسل'' سے مراد وہ رسول ہیں جو بعد میں اللہ کی طرف سے مبعوث ہوں گے مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد علیہما السلام اور وہ تمام رسول جنہیں اللہ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیانی ادوار میں مبعوث فرمایا ''وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا'' (اور تم نے اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض!) اس سے مراد وہ انفاق ہے جو مستحب ہے یعنی واجب زکات کے علاوہ! ''لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ '' (تو میں یقینی طور پر تمہاری خطاؤں سے درگزر کروں گا اور تمہیں باغہائے بہشت عطا کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں)، یہاں تک وعدہ جمیل سے مربوط امور ذکر کئے گئے ہیں، دوسری شق کی بابت یوں ارشاد فرمایا ''فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ '' (پس جو شخص اس کے باوجود تم میں سے کفر اختیار کرے تو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا)۔

عہد شکنی کا انجام:

''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً''

(ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف سے عہد شکنی اور میثاق کے انکار کی سزا سیدھی راہ سے بھٹک جانا ذکر کیا، اور یہ اجمالی تذکرہ ہے جس کی تفصیل اس آیت میں مختلف سزاؤں وعذاب کی صورت میں مذکور ہے کہ جن میں سے بعض کی نسبت اللہ نے اپنی طرف دی جیسے لعنت وسنگدلی میں مبتلا کرنا، اور بعض کو خود ان سے منسوب کیا جو ان کی اپنی اختیار کردہ تھیں جو ان الفاظ میں بیان ہوئیں ''وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ'' تو یہ سب ان کی وہ سزائیں ہیں جو آیات الٰہیہ کے انکار کی وجہ سے قرار پائیں کہ جن میں سے سرفہرست ان کی طرف سے ہونے والی عہد شکنی ہے کہ انہوں نے اللہ سے کئے گئے عہد و پیمان کو توڑ دیا، یا یہ سب سزائیں صرف ان کی عہد شکنی کا نتیجہ ہیں کیونکہ وہ سیدھی راہ کہ جسے انہوں نے کھو دیا وہ ان کی سعادت کی راہ ہے کہ جس پر ان کی دنیا وآخرت کا سنورنا موقوف ہے۔

بنابرایں جملہ ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ ''(ان کی عہد شکنی) سے بظاہر ان کا وہ کفر مراد ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں ان کی سزا بیان کی ہے اور حرف ''ما'' (فَبِمَا) تاکید کے لئے ہے اور اس سے مربوطہ کاموں کی بابت ابہامی صورت میں پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے جو کہ تعظیم یا تحقیر یا ان کے علاوہ کسی غرض کی خاطر ہوتا ہے یعنی جہاں کسی شخص یا کسی کام کو پردۂ ابہام میں رکھنا مقصود ہو وہاں حرف ''ما'' کے ذریعے بات کی جاتی ہے جبکہ وہ شخص یا کام اصل میں معین ومعلوم ہوتا ہے لیکن لفظوں میں اسے ذکر کرنے کی بجائے اس کی بابت ابہام پیدا کر کے بات کی جاتی ہے تو اس میں کبھی متعلقہ شخص کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور کبھی اس کی تحقیر وتذلیل اور کبھی دیگر وجوہات ملحوظ ہوتی ہیں، اس حوالہ سے یہاں ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ '' کا معنی یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے جو عہد شکنی کی اس کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی ''لَعَنّٰهُمْ'' تو اس میں ان کی عہد شکنی کی تفصیلات ذکر نہیں کی گئیں بلکہ انہیں پردۂ ابہام میں رکھا گیا اور ''لعنت'' کا معنی رحمت سے دور کر دینا ہے۔ اور جملہ ''وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً'' (ہم نے ان کے دل سخت کر دیئے) میں قسوۃ القلب یعنی سنگدلی لفظی ومعنوی دونوں لحاظ سے ''قسوۃ الحجارۃ'' (پتھر کی سختی) سے ماخوذ ہے اور دل کی قساوت سے مراد یہ ہے کہ وہ حق کے سامنے خشوع نہیں کرتا، حق کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں رحم پایا جاتا ہے چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیہ مبارکہ ہے جس میں خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ حدید، آیت: ۱۶

''اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ

فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ''

(کیا وہ وقت نہیں آیا کہ اہل ایمان کے دل اللہ کی یاد اور جو کچھ اس نے حق نازل کیا ہے اس کے سامنے خشوع کریں اسے تسلیم کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی کہ طویل عرصہ گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان کے اکثر افراد فاسق ہیں۔)

خلاصۂ کلام یہ کہ ان کی قساوت قلبی کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے ہونے والی اس زیادتی و ناروا عمل کا تذکرہ کیا: ''يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ''(وہ کلام الٰہی سے تحریف کرتے ہیں اسے اس کے اصل مقامات سے دوسری جگہوں پر لیجاتے ہیں) یعنی اللہ کے کلام کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں کہ خداوند عالم کو ان کی تفسیر پسند نہیں، یا یہ کہ کلام میں کچھ اضافہ یا کمی یا تبدیلی کرتے ہیں وہ سب کام تحریف کے باب سے ہیں ان کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے دین کی واضح و روشن حقیقتوں کو پس پشت ڈال دیا ''وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ''(جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اسے انہوں نے بھلا دیا) اور وہ کہ جسے انہوں نے بھلا دیا وہ دین کے اصول اور وہ پختہ بنیادیں تھیں جن پر سعادت و خوشبختی کا دارومدار ہے اور اس کی جگہ ان کی ابدی بدبختی نے لے لی کہ جو ان کے عقائد فاسدہ کے نتیجہ میں ان کے دامن گیر ہوئی مثلاً وہ عقیدۂ تشبیہ کے قائل ہوئے۔ خداوند عالم کو جسم و جسمانیت سے مشابہت دی اور حضرت موسیٰؑ کی ختم نبوت کے قائل ہوئے اور تورات کی شریعت و احکام کو دائمی مانا اور احکام کی بابت نسخ اور بداء کا انکار کیا اور اس طرح کے دیگر باطل نظریات! تو ان عقائد و نظریات نے ان کے دینی اقدار پر کاری ضرب لگائی اور وہ دین الٰہی کے حقائق سے بہرہ مندی سے محروم ہو گئے۔

اور جملہ ''وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ '' کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ان کے خیانت کار افراد سے مطلع و آگاہ رہیں گے یعنی ان میں سے جو لوگ خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ان سے آگاہ رہیں گے، یا ان کی طرف سے ہونے والی خیانتوں سے ہمیشہ آگاہ ہوں گے، (دونوں معانی ممکن ہیں)، اس کے بعد استثناء کی بابت یوں ارشاد فرمایا: ''اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ '' (سوائے چند افراد کے ان میں سے! تو آپ ان سے درگزر کریں اور عفو سے کام لیں، یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ سابقہ مباحث میں متعدد بار بیان ہو چکا ہے کہ ان میں سے معدودے چند افراد کا مستثنیٰ کیا جانا ان کی پوری قوم و جماعت اور امت پر لعنت کے عمومی حکم سے منافات نہیں رکھتا۔ یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ بعض حضرات نے آیت میں مذکور ''قَلِيْلًا مِّنْهُمْ '' سے عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی مراد لئے ہیں جو کہ عجیب بات ہے کیونکہ عبداللہ بن سلام نے سورۂ مائدہ کے نازل ہونے سے بہت عرصہ پہلے اسلام قبول کیا۔

دینی حقائق سے دوری کا نتیجہ:

''وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا''

(اور ان لوگوں سے کہ جنہوں نے کہا: ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے عہد و پیمان لیا پھر انہوں نے وہ کچھ بھلا دیا جو انہیں یاد دلایا گیا تھا تو ہم نے ان کے درمیان قیامت تک باہمی دشمنی پیدا کردی)

راغب اصفہانی نے المفردات میں لفظ ''غری'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب یوں کہا جاتا ہے ''غری بکذا'' تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ فلاں چیز کے ساتھ چپک گیا یعنی اس کے ساتھ پیوستہ ہوگیا اس کی اصل ''غراء'' ہے جس کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ چسپانے و چپکانے والا مادہ ہے (سریش وغیرہ)، اور کہا جاتا ہے ''وأغریت فلاناً بکذا'' (میں نے فلاں چیز کو فلاں چیز کے ساتھ چسپا دیا)، (المفرادات راغب اصفہانی صفحہ ۳۶۰)

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو وہ پیغامبر رحمت تھے وہ لوگوں کو صلح و امن کی دعوت دیتے تھے اور انہیں آخرت سنوارنے کی راہ اپنانے کی ترغیب دلاتے تھے، وہ لوگوں کو دنیا کی فناپذیر لذتوں اور دلفریب چمک دمک سے منہ موڑنے اور اس کی نہایت معمولی و پست ترین آسائشوں کے حصول کی خاطر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے سے منع فرماتے تھے چنانچہ اس سلسلہ سے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بیانات زندہ گواہ ہیں جو ان کی طرف سے چار انجیلوں میں منقول ہیں۔ مگر جب لوگوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو یاد کروایا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں امن و صلح کی جگہ جنگ وحرب اور بھائی چارہ و باہمی محبت کہ جس کی انہیں دعوت دی گئی تھی اس کی جگہ ایک دوسرے سے عداوت و دشمنی کے جذبات پیدا کردیئے جیسا کہ اس حوالہ سے واضح ارشاد الٰہی ہے: ''فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (پھر جب انہوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو انہیں یاد دلایا گیا تھا تو ہم نے اُن کے درمیان عداوت و باہمی دشمنی کے جذبات پیدا کردیئے)۔

اور یہ دونوں یعنی عداوت و باہمی دشمنی کہ جو آیت میں مذکور ہیں مسیحی اقوام کے درمیان نہایت پختہ نفسانی صفات کی طرح راسخ ہوگئیں اور گویا جہنم کی اس آگ کی مانند ہوگئیں کہ آخرت میں وہ جس کا شکار ہوں گے کہ اس میں جلنے سے کوئی بھی انہیں بچا نہیں سکے گا اور وہ جس قدر اس سے نجات پانے کی کوشش کریں گے مگر اس سے چھٹکارا نہ پاسکیں گے بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ اب تم چکھو جلانے والے عذاب کا مزہ!

اور تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب سے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان کی طرف اُٹھالیا گیا ان کے حواریوں اور ان کے شاگردوں میں سے مبلغین کے درمیان اختلافات کی آگ بھڑک اُٹھی اور وہ نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے

دست وگریباں ہو گئے، ان کے باہمی اختلافات کے کا دائرہ اس قدر وسیع ہوا کہ تباہ کن جنگوں کی صورت اختیار کر گیا جس کے نتیجہ میں خاندانوں کے خاندان نیست و نابود ہو گئے اور ایک دوسرے سے نفرت نے انہیں دربدر ہونے پر مجبور کر دیا یہاں تک کہ صورتحال عالمی جنگوں کی حد تک پہنچ گئی کہ جس میں کرۂ ارض کے باسیوں کی تباہی اور انسانیت کی بربادی کا سامان فراہم ہو گیا، یہ سب کچھ ''نعمت'' کے نقمت وعذاب میں تبدیل ہونے اور گمراہی کے اسباب فراہم کرنے کی وہ خوفناک صورتیں ہیں جن کا حوالہ اس خدائی اعلان میں پایا جاتا ہے: ''وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ'' (اور وہ بہت جلد انہیں ان کے کئے سے باخبر کر دے گا)۔

آیات ۱۵ تا ۱۹

O يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ‌ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ‏﴿۱۵﴾

O يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ﴿۱۶﴾

O لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا‌ ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا‌ ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ‏ ﴿۱۷﴾

ترجمہ

○ ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو تمہارے لئے کتاب کی ان بیشتر چیزوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جنہیں تم چھپاتے ہو اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کرتا ہے، یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح بیان پر مشتمل کتاب آچکی ہے'' (۱۵)

○ ''اس کے ذریعے اللہ ہر اس شخص کی ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے درپے ہو اور وہ اس طرح کے افراد کو اپنے اذن کے ساتھ ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔ (۱۶)

○ ''یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے، کہہ دیجئے کہ اگر ایسا ہے تو اگر اللہ مسیح ابن مریم اور ان کی والدہ اور ہر اس شخص کو نابود کردے جو روئے زمین پر موجود ہے تو اسے ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اور اللہ ہی کی ملکیت ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان ہے، وہ جو چاہے خلق کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔ (۱۷)

○ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

○ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾

○ ''اور یہودیوں ونصرانیوں کا کہنا ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، کہہ دیجئے کہ پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی وجہ سے عذاب وسزا کیوں دیتا ہے؟ بلکہ تم اس کی پیدا کی ہوئی موجودات میں سے بشر ہو، وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ ہی کی ملکیت ہے تمام آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اور اسی کی طرف سب کی بازگشت ہے'' (۱۸)

○ ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ رک چکا تھا تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر ونذیر نہیں آیا، یقیناً تمہارے پاس بشیر ونذیر آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے'' (۱۹)

تفسیر و بیان

خداوند عالم نے اہل کتاب سے لئے گئے اس عہد و پیمان کا کہ وہ اس کے رسولوں کی نصرت کریں گے اور جو کتاب انہیں عطا کی اس کی عملی پاسداری کریں گے مگر انہوں نے اس میثاق کو توڑ دیا، تذکرہ کرنے کے بعد انہیں اپنے اس رسول (پیامبر بزرگوار اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پر ایمان لانے کی دعوت دی جنہیں اللہ نے ان کی طرف بھیجا اور اس کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دی جو اس نے نازل کی۔ اپنی اس دعوتِ حقہ میں انہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں (رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور کتاب) کا تعارف کروایا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کی صداقت اور کتاب کی حقانیت پر مضبوط دلیل قائم کی اور اس طرح ان پر اس حوالہ سے اتمامِ حجت کیا۔

جہاں تک ان دونوں کے تعارف کا تعلق ہے تو اس کی بابت یہ دو جملے ارشاد فرمائے:

- ''یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا''

(اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو تمہارے لئے بہت سے امور کو واضح طور ر بیان کرتا ہے)

- ''یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ''

(اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو رسولوں کے سلسلہ بعثت کے وقفہ کے بعد تمہارے لئے احکامِ الٰہی کو واضح طور پر بیان کرتا ہے)

حضرت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صداقت و حقانیت پر مضبوط دلیل قائم کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ'' (وہ تمہارے سامنے وہ باتیں کھل کر بیان کرتا ہے جو تم چھپاتے ہو) یہ بات حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کی صداقت پر نہایت بہترین گواہ ہے کہ ایک اُمّی شخص انہیں ان کے دینی حقائق کی بابت وہ کچھ بتاتا ہے جسے اُن کے بزرگ علماء کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کی حقانیت کی گواہی کی بابت یہ الفاظ ارشاد فرمائے ''یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ'' (اس کے ذریعے اللہ اسے ہدایت عطا کرتا ہے جو اس کی خوشنودی کے حصول کے درپے ہو)، بنابرایں وہ حقائق کہ جن کی حقانیت پر کسی بھی حوالہ سے شک نہیں ہوسکتا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت اور کتاب یعنی قرآن مجید کی صداقت وحقانیت کے عمدہ ترین گواہ ہیں۔ اور اتمام حجت کے حوالہ سے یہ الفاظ مذکور ہیں:

○ ''اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ''

(کہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر ونذیر نہیں آیا، جبکہ تمہارے پاس یقیناً بشیر ونذیر آچکا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت والا ہے)

اور زیر نظر آیات مبارکہ کے جاری سلسلہ بیان میں اللہ تعالیٰ نے مسیحیوں کی اس بات کو رد کیا جس میں انہوں نے کہا ''اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ'' (اللہ تو مسیح بن مریم ہے) اور یہود ونصاریٰ کے اس عقیدہ وقول کو بھی رد کیا جس میں انہوں نے کہا ''نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ'' (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں)۔

اہل کتاب سے واضح خطاب:

''يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ''

(اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا جو تمہارے لئے واضح طور پر بہت سی ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جو تم کتاب میں سے چھپاتے ہو اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے)

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ صفت ذکر کی گئی ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو کہ جنہیں اہل کتاب چھپاتے تھے واضح طور پر بیان کرتے ہیں، تو اس سے ان مطالب کی طرف اشارہ ہے جو ان کی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری اور نبوت کی خوشخبریاں مذکور ہیں کہ وہ لوگ انہیں چھپاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ لوگ ان سے مطلع و آگاہ نہ ہوں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان حقائق کو آشکار فرماتے تھے اور واضح طور پر بیان کرتے تھے چنانچہ اس کا تذکرہ درج ذیل آیات مبارکہ میں ہوا ہے:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷

''اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِىَّ الۡاُمِّىَّ الَّذِىۡ يَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ''

(وہ پیروی کرتے ہیں اس رسول نبی اُمّی کی کہ جس کا ذکر وہ اپنی کتابوں تورات وانجیل میں پاتے ہیں)

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۶

''يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ''

(وہ اسے پہچانتے ہیں جس طرح سے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

○ سورۂ فتح، آیت ۲۹

''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۆ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ''

(محمد اللہ کا رسول ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نرم ہیں ۔۔۔ یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی مثال ہے انجیل میں)

اس کی مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس شخص کے بارے میں صادر ہونے والے حکم کے حوالہ سے ہے جسے یہودیوں نے چھپایا اور اس کی بابت حق پر پردہ ڈالنے کی مذموم کوشش کی کہ جس کا اشاراتی تذکرہ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ ''لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ'' (اور آپ کو غمزدہ نہ کریں وہ لوگ جو کفر میں سرگرم عمل ہیں) میں ہوا کہ جس کی تفسیر عنقریب بیان ہوگی، اور وہ حکم اب بھی یہودیوں کے ہاں رائج تورات کے دوسرے پارہ (السفر التثنیۃ) کے بائیسویں باب میں موجود و مذکور ہے اور اس حکم کو یہودیوں کے بزرگ علماء لوگوں سے پوشیدہ کرتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آشکار کر دیا اور جہاں تک بہت سے امور کی بابت عفو و درگزر کرنے کی بات ہے تو اس سے مراد وہ حقائق ہیں جنہیں وہ لوگ چھپاتے تھے جبکہ ان کی کتابوں میں موجود و مذکور ہیں اور اس کی گواہی دونوں کتابوں یعنی تورات و انجیل میں پائے جانے والے اختلافات سے ملتی ہے مثلاً تورات میں توحید و نبوت کے حوالہ سے بعض مطالب مذکور ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دینا قرین صحت نہیں جیسے عقیدۂ تجسیم اور حلول وغیرہ، یعنی خدا کو جسم والا اور کسی جگہ بیٹھا ہوا ماننا، اور انبیاءؑ کی طرف ایسے اعمال کی نسبت دینا جو عقلی طور پر بھی درست قرار نہیں پاتے جیسے کفر، فجور و بدکاری اور اس طرح کی دیگر لغزشیں و گناہ وغیرہ، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ انبیاء الٰہیؑ ان کے مرتکب ہوں، اسی طرح تورات میں قیامت کا ذکر سرے ہی سے نہیں جبکہ معاد و قیامت کا عقیدہ دین کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور اس کے بغیر دین مکمل ہی نہیں ہوتا، یہی حال ان انجیلوں کا ہے جو عیسائیوں کے ہاں رائج ہیں بالخصوص انجیل یوحنا، ان انجیلوں میں بت پرستی کے نظریات و عقائد پائے جاتے ہیں۔

نور اور کتاب مبین:

''قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ''

(بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین آئی ہے)

اس آیۂ مبارکہ میں جملہ ''قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ'' سے بخوبی ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز آئی وہ اللہ تعالیٰ ہی سے ارتباط رکھتی ہے اور اس کا ربط و پیوستگی اور وابستگی اس طرح ہے جیسے بیان یا کلام بیان کرنے والے اور کلام کرنے والے سے

وابستہ ہوتا ہے اور یہی بات آیت میں لفظ ''نُوْرٌ'' سے قرآن مراد ہونے کی تائید کرتی ہے۔

بنابرایں جملہ ''وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ'' اسی پر عطف قرار پائے گا یعنی عطف تفسیر کے طور پر ہے یعنی ''نُوْرٌ'' اور ''کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ'' دونوں سے مراد قرآن ہے چنانچہ اس کی گواہی ان آیات سے ملتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ''نُوْرٌ'' سے موسوم فرمایا اور ان کا تذکرہ اپنے مقدس کلام میں متعدد مقامات پر فرمایا مثلاً:

- سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷

''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ''

(اور تم پیروی کرو اس نور کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا)

- سورۂ تغابن، آیت ۸

''فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا''

''پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا''

- سورۂ نساء، آیت ۱۷۴

''وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا''

(اور ہم نے تمہاری طرف واضح و روشن کرنے والا نور نازل کیا)

یہ احتمال بھی قابل تصور ہے کہ ''نُوْرٌ'' سے مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں، یہ احتمال آیت کے ابتدائی الفاظ پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے کہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود و نصاریٰ کی طرف سے چھپائے گئے حقائق ظاہر کرنے اور واضح طور پر بیان کرنے والا ذکر کہا گیا (یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ) اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی نا قابل انکار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کلام میں ''نور'' قرار دیا چنانچہ سورۂ احزاب، آیت ۴۶ میں یوں ارشاد ہوا ''وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا'' (اور روشنی دینے والا چراغ)۔

وسیلۂ ہدایت کا بیان:

''یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ''

(اس کے ذریعے اللہ سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے ہر اس شخص کو جو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی راہ پر چلے)

''بِهٖ'' میں حرف بَ ذریعہ وآلہ اور وسیلہ کی غرض کے لئے ہے اور اس میں ضمیر ''ہ'' کی بازگشت ''کتاب'' یا ''نور'' کی طرف ہے خواہ لفظ ''نور'' سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہوں یا قرآن مراد ہو دونوں صورتوں میں مقصد ایک ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرحلہ ہدایت میں ظاہری اسباب میں سے ایک ہیں اور اسی طرح قرآن مجید! اور ہدایت حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ پیوستہ ووابستہ ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ قصص، آیت ۵۶

''اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ''

(آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں کر سکتے لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کی نعمت سے نوازتا ہے)

○ سورۂ شوریٰ، آیت ۵۲۔۵۳

''وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ''

(اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی اپنے امر میں سے روح کی! جبکہ آپ نہ تو کتاب سے آگاہ تھے اور نہ ہی ایمان سے! لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت سے نوازتے ہیں اور آپ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں جو کہ اللہ کا راستہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کے لئے ہے، یاد رکھو کہ تمام امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے)

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ ان آیات مبارکہ میں ہدایت کی قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت دی گئی ہے اس کے باوجود اس کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ حقیقت میں وہی ہادی ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ان ظاہری اسباب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اس نے انہیں مسخر کر رکھا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں جملہ ''یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ'' کو جملہ ''مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ'' سے مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے، تو اس سے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ خدائی ہدایت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کی عملی کاوش سے مشروط ہے بنابرایں یہاں ''یَهْدِیْ'' میں ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دینا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں عملی طور پر کوشاں ہو تو اللہ تعالیٰ اسے سلامتی کی راہ یا تمام راہوں یا یکے بعد دیگرے اکثر راہوں تک پہنچا دیتا ہے۔

یاد رہے کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ایک ارائۃ الطریق یعنی راستہ دکھانا اور دوسری ایصال الی المطلوب یعنی منزلِ

مقصود تک پہنچا دینا، یہاں جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت سے مذکور ہے وہ دوسری قسم ہے جبکہ پہلی قسم عمومی حوالہ سے انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی طرف منسوب ہوتی ہے کہ جسے قرآنی زبان میں ''بلاغ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ''سلام'' کو مطلق اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی ذکر فرمایا ہے اور اس سے سلامتی اور ہر طرح کی اس شقاوت و بدبختی سے خلاصی پانا مراد ہے جو دنیاوی واُخروی سعادت کی راہ روکتی ہے، اس بناء پر ''سلام'' سے مراد وہ حقیقت ہے جسے قرآن مجید میں اسلام یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کر دینا اور اس سے کامل پیوستگی اور ایمان وتقویٰ کے اوصاف یعنی فلاح وفوز اور امن وسلامتی سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہم نے المیزان کی پہلی جلد میں آیۂ مبارکہ ''اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ'' (سورۂ الحمد، آیت ۶) کی تفسیر میں بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے مختلف اندازِ رفتار کی بناء پر متعدد راستے قرار دیئے ہیں کہ ان سب کا منتہیٰ ایک ہی راستہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے کہ جسے اس نے اپنی مقدس کتاب ''صراطِ مستقیم'' سے موسوم کیا ہے، اس حوالہ سے آیاتِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹

''وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ''

(اور جو لوگ ہماری بابت جہاد کریں۔ کوشش کریں۔ تو ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)

○ سورۂ انعام، آیت ۱۵۳

''وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ''

(اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو ورنہ وہ تمہیں اس کے راستہ سے جدا کر دیں گے)

ان مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے راستے ہیں لیکن وہ سب مخلوق کو خالق سے ملانے اور اس کی منزلت وعظمت سے بہرہ ور ہونے کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور ایسا نہیں کہ جو ان راستوں میں سے کوئی راستہ اختیار کرے تو وہ اسے دوسرا راستہ اختیار کرنے والے سے جُدا کر دے اور ان کے درمیان دوری وتفرقہ ڈال دے جیسا کہ اللہ کے راستہ کے علاوہ دیگر راستوں کا حال ہے کہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیتے ہیں اور ان کے درمیان تفرقہ ودوری پیدا کرتے ہیں۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ کا معنی یہ ہے ''واللہ العالم'' کہ اللہ تعالیٰ اپنی مقدس کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہر اس شخص کو جو اس کی خوشنودی کے حصول میں کوشاں ہو ایسی راہوں میں لا کھڑا کرتا ہے کہ جو انہیں اپنائے وہ اسے دنیا وآخرت

کی شقاوت و بدبختی اور ہر اس چیز سے حفظ و امان میں قرار دیتے ہیں جو اس کی سعادتمند زندگی کو ناخوشگوار بنائے۔

لہٰذا یہ حقیقت واضح ہوئی کہ سلامتی و سعادت کے حصول کا دارومدار رضائے الٰہی کی پیروی پر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس تصویر کا دوسرا رُخ ان لفظوں میں واضح کر دیا:

- سورۂ زمر، آیت ۷

''وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ''

(اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں ہوتا)

- سورۂ توبہ، آیت ۹۶

''فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ''

(اللہ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوتا)

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کفر وفسق پر راضی نہیں ہوتا یعنی اسے پسند نہیں کہ اس کے بندے کفر اختیار کریں یا فسق و فجور اپنائیں لہٰذا یہ امر ثابت ہوا کہ رضائے الٰہی کا حصول ظلم کے راستوں سے دوری اختیار کرنے اور دانستہ و نادانستہ طور پر ظالموں کے طرزِ عمل کو اپنانے سے اجتناب کرنے پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے اپنی ہدایت سے بہرہ ور ہونے کی نفی کی ہے اور انہیں اس عنایت خدائی سے محروم و نا اُمید کہا ہے چنانچہ واضح لفظوں میں ارشاد ہوا: ''لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'' (اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا) لہٰذا آیہ مبارکہ یعنی ''یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ'' ایک حوالہ سے درج ذیل آیت کی مانند قرار پائے گی:

- سورۂ انعام، آیت ۸۲

''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ''

(جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کا لباس نہ پہنایا تو ان کے لئے ہے امن اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

ظلمتوں اور نور کا لطیف تقابلی حوالہ:

''وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ''

(اور وہ انہیں اپنے اذن کے ساتھ ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے)

اس جملہ میں ''ظلمات'' کو جمع کے صیغہ میں جبکہ ''نور'' کو مفرد کے صیغہ میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ ایک لطیف تقابلی حوالہ کا حامل ہے اور اس سے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حق کا راستہ ہر طرح کے اختلاف وتفرقہ سے مبرا ہے اور اپنے متعدد مراحل کے باوجود حقیقت واحدہ رکھتا ہے جبکہ اس کے مقابل میں باطل کا راستہ سراپا اختلاف ہے اور اسے اختیار کرنے والے ہمیشہ ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے ہیں۔

یہاں ایک نہایت اہم علمی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لانے کا ذکر ہے (وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ) تو اس میں ظلمتوں سے نکالنے کے عمل کی دو نسبتی صورتیں ہیں: ایک اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف اور دوسری نسبت خود اللہ کی طرف! جہاں تک پہلی نسبت کا تعلق ہے یعنی اسے نبی یا کتاب کی طرف منسوب کیا جائے تو اس میں اللہ کے اذن کا معنی اس کی اجازت ورضایت ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں مذکور ہے:

○ سورۂ ابراہیم، آیت ا

''كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ''

(یہ کتاب، اسے ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں ان کے پروردگار کے اذن کے ساتھ)

اس آیت میں ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لانے کے عمل کو پروردگار کے اذن کے ساتھ مقید ومربوط قرار دیا گیا ہے تا کہ اس طرح سبب کے استقلال کا تصور ذہنوں سے نکال دیا جائے کیونکہ حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہی ہے یعنی وہ استقلالی طور پر لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ اسے کسی اذن کی احتیاج نہیں جبکہ اس کے علاوہ ہر سبب اس کے اذن کا محتاج ہے، حالانکہ اسی سورۂ مبارکہ یعنی ابراہیم کی آیت ۵ میں یوں ارشاد فرمایا:

○ ''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ''

(اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں)

اس میں ''اذن'' کا تقییدی حوالہ اس لئے مذکور نہیں کہ فعل امر ''اُخرج'' میں اذن کا معنی موجود ہے اور ظلمتوں سے نکالنے کی دوسری صورت یہ کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو وہاں ''اذن'' بمعنی علم ہوگا چنانچہ عربی زبان میں لفظ ''اذن'' علم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا جب یوں کہا جاتا ہے: ''أذن به'' تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے ''علم به'' اسے معلوم ہوگیا، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہو:

○ سورۂ توبہ، آیت ۳

''وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ''

(اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے)

- سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۹

''فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ''

(کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں برابر آگاہ کر دیا)

- سورۂ حج، آیت ۲۷

''وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ''

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، انہیں آگاہ کر دو)

اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اذن بمعنی علم مذکور ہے اور جملہ ''وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' (اور وہ انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے) میں ہدایت کا حوالہ دوبارہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ جملہ ''يُخْرِجُهُمْ'' جملہ ''يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ'' اور جملہ ''يَهْدِيْهِمْ'' کے درمیان مذکور ہے جس کی وجہ سے جاری سلسلہ کلام میں فاصلہ پیدا ہو گیا جس سے دوبارہ یہ جملہ کہنا پڑا ورنہ حرف عطف کے ذریعے مقصود کا بیان ممکن تھا اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل ذکر ہے کہ ''صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' کہ جس کے بارے میں سورۂ فاتحہ میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں تمام راستوں پر غالب راستہ ہے لہٰذا اس کی ہدایت بھی ہدایت کی ان دیگر اقسام پر غالب ہے جو دیگر جزئی راستوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں ''صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' کا نکرہ کی صورت میں ذکر کیا جانا سورۂ فاتحہ میں ''الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' بصورتِ معرفہ ذکر کئے جانے سے منافات نہیں رکھتا کیونکہ یہاں مقامی قرینہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس سے مراد وہی ہے اور یہاں اسے نکرہ کی صورت میں ذکر کرنے میں اس کی عظمت شان اور بلندی مقام و منزلت کا لحاظ و اظہار مقصود ہے۔

عیسائیوں کا کفر:

''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ''

(یقیناً کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے)

یہاں ان تین گروہوں میں سے ایک گروہ کا تذکرہ ہوا ہے جن کے اقوال و عقائد سورۂ آل عمران میں ذکر کئے گئے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ مسیح کے بارے میں ان کے ایک ہی حقیقت ہونے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ اور مسیح ایک ہی وجود میں یکجا ہو گئے ہیں لہٰذا حضرت مسیح بشر ہونے کے باوجود خدا ہیں، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس عقیدہ کو یعنی

''اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ'' (اللہ وہی مسیح بن مریم ہے) دیگر دو گروھوں کے عقیدوں سے ہمرنگ و ہماھنگ قرار دیا جائے کہ جنھوں نے حضرت مسیح کو نبی مانا اور جنھوں نے حضرت مسیح کو تین خداؤں میں سے ایک مانا، لیکن جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ'' کے ظاہری الفاظ ان کے اس عقیدہ پر منطبق ہوتے ہیں کہ اللہ اور مسیح ایک ہی حقیقت ہے اور دونوں میں یگانگت و عینیت پائی جاتی ہے۔

عیسائیوں کے عقیدہ کا بطلان:

''قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا''

(ان سے کہیں کہ اگر تمہاری بات درست ہے تو کون ہے جو اللہ کی قدرت کے مقابلے میں کچھ کرسکتا ہو کہ اگر اللہ مسیح ابن مریم اور ان کی والدہ اور روئے زمین پر موجود ہر شخص کو نابود کرنے کا فیصلہ کرے)

اس آیت میں ایک نہایت ظریف ولطیف بیان کے ساتھ عیسائیوں کے عقیدہ کو باطل ونادرست قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں حضرت عیسیٰ کا تذکرہ ''ابن مریم'' کے تقییدی اضافہ کے ساتھ ہوا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح وثابت ہوسکے کہ وہ سراپا بشر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ وفیصلہ کے ماتحت ہیں جیسا کہ دیگر افراد بشر! اسی وجہ سے آیت میں لفظ ''امہ'' کو حرف عطف ''و'' کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ حضرت مسیحؑ کی طرح مخلوق اور ارادۂ خداوندی کے تابع و ماتحت ہیں کہ اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور ''مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' کو بھی حرف عطف ''و'' کے ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا ہے ان سب کا معاملہ یکساں ہے یعنی روئے زمین میں موجود ہر شخص اللہ کی قدرت کاملہ کے تابع اور اس کی مخلوق ہے کہ اللہ ہی نے سب کو وجود عطا فرمایا ہے۔

ان مطالب سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ آیت مبارکہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے حوالہ سے ان کا تذکرہ تقییدی صورت کے ساتھ (ابن مریم) اور ان کی والدہ اور تمام موجودات، ''امکان'' کی وجودی حیثیت کی دلیل ہے یعنی اس سے ان کے ممکن الوجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اس کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ حضرت مسیحؑ دیگر افراد بشر ہی کی طرح ہیں جیسا کہ ان کی والدہ اور روئے زمین پر موجود دیگر افراد ہیں لہٰذا جو کچھ دوسروں کے لئے روا ہے وہ ان کے لئے بھی روا ہے کیونکہ ایک دوسرے کے مثل ہونے کے حوالہ سے سب کی حیثیت ان چیزوں میں یکساں ہوتی ہے جو ان کے لئے روا ہوں یا روا نہ ہوں، اس قاعدہ کلیہ کی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ حضرت مسیحؑ کے علاوہ دیگر افرادِ بشر پر موت آسکتی ہے تو ان پر بھی موت آسکتی ہے اور اس حوالہ سے کوئی مانع قابل تصور نہیں تو جب وہ دوسروں کی طرح ہونے اور نہ ہونے کے حوالہ سے یکساں ہیں اور ان

کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے تو انہیں خدا کیونکر مانا جا سکتا ہے کیونکہ اگر وہ خدا ہوتے تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

اللہ کی مالکیت کا بیان:

''وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا''

(اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے ان سب کی مالکیت)

یہ آیت سابقہ جملہ میں مذکور مطالب کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے اور اس میں ''وَمَا بَيْنَهُمَا'' کے الفاظ مقصود کی وضاحت و صراحت کی غرض سے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں جہاں بھی مخلوقات کا تذکرہ ہوا ہے وہاں صرف ''السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں جبکہ یہاں اس کے ساتھ ''وَمَا بَيْنَهُمَا'' کے الفاظ اس لئے ذکر ہوئے تاکہ بیان صراحت سے زیادہ قریب تر ہو اور اس پر کسی طرح سے شک و شبہ اور اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے لہٰذا اب کوئی شخص اس سلسلہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آسمانوں اور زمین کے ساتھ ان کے درمیان موجود مخلوق مذکور نہیں جبکہ بات اسی کی ہو رہی ہے یعنی آسمانوں اور زمین کے درمیان موجود مخلوق کی!

اور آیت میں لفظ ''لِلّٰهِ'' جو کہ جملہ میں ''خبر'' ہے کہ جس کا متبداء ''مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' ہے اسے پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے آسمانوں اور زمین کی مالکیت کا حصر ثابت ہو یعنی وہ صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے اور اسی سے بیان و مقصود کا اظہار صحیح صورت میں پورا ہوتا ہے لہٰذا آیت کا معنی یوں ہوگا: یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ کی راہ میں مانع ہو جو وہ مسیح اور اس کے علاوہ کسی کے رشتہ حیات کو ختم کرنے کے بارے میں کرے اور اسے وقوع پذیر نہ ہونے دے؟ جبکہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان موجود ہے کی مالکیت و حاکمیت مطلق طور پر صرف اللہ کے لئے ہے اس کے سوا کسی کو مالکیت کا حق حاصل نہیں! بنابرایں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے نفاذ میں مانع و حائل نہیں ہو سکتی اس مطلق حاکمیت و مالکیت کی دلیل کے طور پر اس کے بعد یہ جملہ ارشاد فرمایا ''يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' (اور وہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)، اس جملہ کا سابقہ جملہ یعنی ''وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا'' کی وجہ و اصل علت پر مشتمل ہونا اس بناء پر ہے کہ لفظ ''مُلْكُ'' (میم پر پیش کے ساتھ) کہ جس کا معنی لوگوں اور جو کچھ ان کی ملکیت میں ہے سب کا مالک اور ان پر کامل اختیار کا حامل ہونا ہے اسی صورت میں اپنی حقیقت کے ساتھ تحقّق پذیر ہو سکتا ہے جب قدرت کا دائرہ ہر طرح سے وسعت رکھتا ہو کہ تمام موجودات اس میں آتے ہوں اور ارادہ و مشیت نافذ ہو کہ اسے عملی صورت حاصل ہو سکے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے

ان کی بابت حاصل ہے اور وہ جو کچھ چاہتا ہے خلق کرتا ہے، وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے سب کا علی الاطلاق مالک ہے، بنابرایں اس کا ہر اس چیز کو پیدا کرنا جسے وہ چاہے اور ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھنا اس کا ثبوت ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اس کا ہر چیز کا مالک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اسے ہر چیز کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا ارادہ وفیصلہ کرنے اور پھر اپنے فیصلہ وارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا حق اور قدرت حاصل ہے یہی بات اس حقیقت کی دلیل اور واضح وقوی ثبوت ہے کہ موجودات میں سے کوئی بھی الوہیت وخدائی میں اس کا شریک نہیں اور جہاں تک اس کے ارادہ ومشیت اور فیصلہ کے نافذ العمل ہونے اور اس کی قدرت کاملہ کی وسعت کی دلیل کا تعلق ہے تو وہ اس کا ''اللہ'' ہونا ہے عز اسمہ، اور شاید اسی وجہ سے آیۂ مبارکہ میں لفظ جلالہ ''اللہ'' بار بار ذکر ہوا ہے لہٰذا اس کا ''اللہ'' ہونا ہی اس حقیقت کی دلیل کے طور پر کافی ہے کہ اس کے ساتھ الوہیت میں کوئی شریک نہیں۔

یہود ونصاریٰ کے عقیدہ کی حقیقت:

''وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ''

(اور یہودیوں ونصرانیوں نے کہا، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اس بات میں کسی بھی طرح سے شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ وہ لوگ اس طرح سے اللہ کے بیٹے ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تھے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اکثر نصرانی دعویٰ کرتے ہیں لہٰذا یہ مطلب ثابت وواضح ہے کہ نہ ہی یہودی اور نہ ہی نصرانی حقیقی معنی میں اللہ کے بیٹے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے بلکہ وہ اس طرح کے الفاظ اعزازی طور پر اپنے لئے استعمال کرتے تھے کہ جو ایک لحاظ سے مجازی استعمال کے باب سے ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے ان کی کتب مقدسہ میں اس طرح کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں (انجیل یوقا، اصحاح ۳، آیت ۳۸) اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں (تورات اصحاح ۴ باب مخروج آیت ۲۲) اور حضرت داؤد کے بارے میں (مزمور داؤد ۲، آیت ۷) افرامؔ کے بارے میں (نبوت ارمیا، اصحاح ۳، آیت ۹) حضرت عیسیٰ کے بارے میں (انجیل اور اس کی ملحقہ کتب میں متعدد مقامات پر!) ان کے بارے میں ''اللہ کے بیٹے'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں بلکہ یہ الفاظ صالح مؤمنین کے بارے میں بھی استعمال ہوئے ہیں (انجیل متی، اصحاح ۵، آیت ۹) وغیرہ۔

بہرحال ان کا اپنے آپ کو ''اللہ کے بیٹے'' کہنا دراصل اس غرض کے لئے تھا کہ جس طرح بیٹوں کو باپ سے نسبت

ہوتی ہے وہی نسبت انہیں اللہ تعالیٰ سے ہے یعنی جس طرح بیٹوں کو باپ سے قرب وتقرب حاصل ہوتا ہے ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے وہی قرب وتقرب حاصل ہے گویا ہم اسی طرح سے ہیں جیسے بادشاہ کے بیٹے شہزادے ہونے کے حوالہ سے عوام ورعایا سے الگ مخصوص مقام ومنزلت رکھتے ہیں کہ انہیں عام لوگوں سے ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جو قوانین واحکام عوام کیلئے مقرر ہوتے ہیں وہ ان سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اور اس استثناء کے باعث وہ سزائیں انہیں نہیں دی جاتیں جو عام لوگوں کو قوانین کی خلاف ورزی پر دی جاتی ہیں اور نہ ہی انہیں اس جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں رعایا کے دیگر افراد بیٹھتے ہیں اور جس طرح دیگر افراد کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے اس طرح ان کے ساتھ سلوک نہیں کیا جاتا، تو یہ سب کچھ ان کے اور بادشاہ کے ساتھ نسبتی تعلق اور محبت وعزت کی بناء پر ہوتا ہے۔

بنابراین یہاں بنوت یعنی بیٹے ہونے سے مراد اختصاص وتقرب ہے۔ یعنی وہ اس کے خاص بندے اور مقرب ترین افراد ہیں لہٰذا ''وَاَحِبَّآؤُهٗ'' میں عطف جو کہ ''ابناء اللہ'' پر ہے عطف تفسیر کی طرح ہے وہ اس کے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ اس ادعاء میں ان کا مقصود اصل اختصاص ومحبوبیت نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ ان پر کوئی عذاب وعقاب نہ ہوگا بلکہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں اور وہ ہمیشہ اللہ کی نعمت وعنایت سے بہرہ ور ہوں گے کیونکہ ان پر عذاب وعقاب ان کے اختصاصات وامتیازات کے منافی ہے۔

اور اس مطلب پر کہ یہاں ''دوست'' (اَحِبَّآؤُهٗ) اور بیٹوں (ابناء) سے مراد ان کا لازمی نتیجہ ہے یہ دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یوں ارشاد فرمایا ''یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ'' (وہ معاف کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور عذاب کرتا ہے جس پر چاہتا ہے) کیونکہ اگر ان کے ادّعاء میں مذکورہ لازمی امر مراد نہ ہوتا تو ان کے جواب میں جملہ ''یَغْفِرُ'' ذکر نہ کیا جاتا اور نہ ہی جملہ ''بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ'' قرار پاتا لہٰذا جملہ: ''نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ'' کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے خاص بندے اور اس کے محبوب ہیں (خاصۃ اللہ ومحبوبہ) کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز انہیں عذاب نہیں کر سکتا خواہ وہ جو کچھ انجام دیں اور اس کی دعوت کو قبول نہ بھی کریں کیونکہ خاص اور محبوب ہونے کا اصولی تقاضہ ہی یہ ہے کہ انہیں ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہو اور کسی طرح سے بھی وہ عذاب وعقاب سے دوچار نہ ہوں۔

یہود ونصاریٰ کو دندان شکن جواب:

''قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ''

(ان سے کہیں کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی وجہ سے عذاب کیوں نازل کرتا ہے)

اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے جواب میں ان کے ادعائے باطل کو رد کرتے ہوئے مضبوط دلیل پیش کریں اور وہ یہ کہ ان پر واقع ہونے والے عذاب کا حوالہ دیں اور ان کی قائم کردہ دلیل کے مقابلے میں دلیل قائم کریں لہٰذا جملہ ''قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ'' دونوں حوالوں سے ان کے ادعائے باطل کی رد میں دندان شکن جواب ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ جملہ ''قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ'' میں یہ مطلب ملحوظ ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہوتے کہ تم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست و محبوب ہونے کی وجہ سے اس کے عذاب وعقاب سے محفوظ ہوتو تم اُخروی یا دنیوی عذاب سے پورے طور پر مامون ہوتے، لہٰذا اس عذاب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو تمہارے گناہوں کی وجہ سے مسلسل تم پر نازل ہوتا ہے؟ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے تو وہ مسلسل گناہوں کے مرتکب ہونے کی سزا سے دوچار ہوئے مثلاً ان کا اپنے انبیاء اور اپنی قوم کے نیک وصالح افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا، اللہ تعالیٰ سے کئے گئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرنا، کلامِ الٰہی کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر اس میں تحریف کرنا، اللہ کی آیات پر پردہ ڈالنا اور ان کا انکار کرنا اور ہر طرح سے سرکشی اور زیادتی کا مرتکب ہونا، تو وہ ان اعمال کی سزا کا اس طرح شکار ہوئے کہ ان میں سے بعض افراد مسخ ہوگئے اور ان پر ذلت ورسوائی چھا گئی ان پر دوسرے ظالم مسلط ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے، عزتیں لوٹنے اور دربدری وتباہی کا شکار ہونے جیسے عذاب میں مبتلا ہوگئے کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے خانہ وکاشانہ اور عزت وناموس کی بربادی سے دوچار ہوئے کہ ان کی زندگی اس بیمار ولاچار شخص جیسی ہے جو نہ تو زندہ ہے کہ اس سے کوئی اُمید رکھی جائے اور نہ ہی مردہ ہے کہ اسے بھلا دیا جائے، گویا نہ زندوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ ہی مُردوں میں! تو یہ ہے یہودیوں کے کرتوتوں کا وہ انجام کہ جس سے وہ دوچار ہیں اور جہاں تک نصاریٰ کا تعلق ہے تو ان میں وقوع پذیر ہونے والے گناہ و جرائم اور غلط کاریاں یہودیوں کے برے اعمال سے کم نہ تھیں اور نہ ہی ان پر بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے، عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور اس کے بعد سے اب تک واقع ہونے والا عذاب یہودیوں پر آنے والے عذاب وعقاب سے کم ہے، ان کی سرگزشت کی تفصیلات تاریخ کا ناقابل انکار حصہ ہے کہ جسے تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے اور ان کی بابت قرآن مجید میں بیشتر واقعات کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً سورۂ بقرہ، آل عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ اعراف اور دیگر سورتوں میں ان سے مربوط واقعات مذکور ہیں۔

لہٰذا وہ لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم پر نازل ہونے والی مصیبتیں اور بلائیں وآزمائشیں ہماری محبت کے امتحان کی غرض سے ہیں نہ کہ ہمارے اعمال کی سزا کی صورت میں! یعنی ایسا نہیں کہ یہ مصائب ہماری بداعمالیوں کے نتائج اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ہم پر آئے ہیں کیونکہ اس طرح کی مصیبتیں وسختیاں اللہ کے صالح ترین بندوں مثلاً انبیاء و مرسلین مثلاً ابراہیم، اسماعیل، یعقوب، یوسف، زکریا، یحییٰ اور دیگر اشخاص پر آئیں اور تم مسلمانوں کو بھی اس جیسے سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا جیسا کہ جنگ احد، موتہ وغیرہ میں تمہیں مصائب کا سامنا ہوا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس طرح کی مصیبتیں وتکلیفیں جب ہم

پر آئیں تو وہ خدائی عذاب ہوں اور جب تم پر آئیں تو نعمتیں و کرامتیں اور عنایات الٰہیہ کہلائیں؟

ان کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جسمانی تکلیفیں و مصائب اور سختیاں و دنیاوی شدائد کا سامنا مؤمنین کو بھی اسی طرح سے ہوتا ہے جس طرح کافروں کو ہوتا ہے اور نیک و بد سب ہی ان کا شکار ہوتے ہیں کہ ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کا حصہ ہے لیکن ان میں عنوان و اثر اور صورت و نتیجہ کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے جس کا تعلق انسان کی ذاتی نیکی و برائی سے ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے مقام و مرتبہ کا تعین ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جس شخص کے باطن میں نیکی گھر کر لے اور انسانی فضیلتیں اس کی ذات میں راسخ ہوں جیسے انبیاء کرام اور ان کی راہ و روش اپنانے والے حضرات تو دنیاوی مصائب و آلام اور شدائد و سختیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ ان میں مزید پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی عملداری کی راہیں کھل جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ خود اور دیگر افراد ان فضیلتوں کے آثارِ حسنہ سے معنوی طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں لہٰذا اس طرح کی سنگین صورتحال اور طبع بشری پر گراں گزرنے والی کیفیات کو خدائی نظام تربیت سے تعبیر کرنا بجا ہے اور اگر آپ چاہیں تو اسے درجات کی بلندی کے اسباب سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔

اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جن کے نفوس میں سعادت اور شقاوت میں سے کوئی چیز راسخ نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ مصائب و آلام کی تباہ کن موجوں کے تھپیڑوں کی زد میں آنے کے باوجود سعادت کی راہ پر گامزن ہوئے تو ان کا تشخص کفر یا ایمان اور نیکی یا برائی میں سے کسی ایک راستہ کے حوالہ سے یقینی ہوتا ہے لہٰذا ان پر آنے والی مصیبتوں اور آلام و شدائد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے امتحان و آزمائش سے موسوم کرنا ہی ضروری ہے کہ جس کی بناء پر ان کا انجام بہشت یا دوزخ قرار پا سکتا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جن کی زندگی سراپا فسق و فجور ہے اور وہ نفسانی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں برائی کرنے اور برائی پھیلانے اور ہوس پرستی کے علاوہ کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں، وہ ہمیشہ فضیلتوں کے مقابلے میں رزیلتوں کو اختیار کرتے ہیں، عظمتوں کے مقابلے میں پستیوں کی راہ پر چلتے ہیں، حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں جیسا کہ اس طرح کے افراد کے بارے میں قرآنِ مجید میں متعدد اقوام کے حالات کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً قوم نوح، قوم ثمود، قوم فرعون، اصحاب مدین اور قوم لوط کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے احکام کی بابت طغیان و سرکشی کا ارتکاب کیا اور حد سے تجاوز کیا لہٰذا ایسے لوگوں پر مصیبتوں اور سنگین ترین حالات سے دوچار ہونا اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ان کے اعمال کی سزا کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا مطالب کا جامع تذکرہ درج ذیل آیۂ مبارکہ میں ہوا:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۱

''وَ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ یَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ''

(اور ہم شب و روز کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں تا کہ اللہ ایمان والوں کو آشکار کردے اور تم میں سے گواہوں کا تقرر کرے، اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا، اور اس طرح مؤمنوں کا امتحان لے کر ان میں سے خالص افراد کی نشاندہی کرے اور کافروں کو نیست و نابود کرے)

دوسری جانب تاریخ کی نا قابل انکار حقیقتوں پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے تک جو کہ دو ہزار سال سے زیادہ مدت ہے اور اسی طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان کی طرف لیجائے جانے سے اسلام کے ظہور پذیر ہونے تک تقریباً چھ صدیاں گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور تاریخ ان کی بداعمالیوں اور ان کے ان جرائم کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے گناہ و معصیت اور سنگین ترین جرائم کے ارتکاب میں آخری حدوں کو چھوا مگر ان کے دلوں میں ان بداعمالیوں کی بابت کوئی پشیمانی و شرمندگی کا احساس تک پیدا نہ ہونے پایا، لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان پر جو مصیبتیں آئیں اور وہ نہایت شدید حالات سے دوچار ہوئے تو اس سب کچھ کو عذاب و عقاب اور سزا کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا، اور جہاں تک مسلمانوں پر آنے والی مصیبتوں اور سختیوں و تکلیفوں کا تعلق ہے کہ وہ بھی یہود و نصاریٰ پر آنے والے شدائد جیسے سنگین ترین حالات کا شکار ہوئے تو ان مصائب و آلام کی بابت غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کا تعلق تقدیر و تدبر الٰہی کے اس نظام سے ہے جو اس نے قائم کر رکھا ہے کہ جس میں تبدیلی نہیں ہوتی اور کوئی شخص اس میں تبدیلی کا سوچ بھی نہیں سکتا، بنابرایں مسلمانوں کا ان مصائب و آلام سے دوچار ہونا جبکہ وہ راہِ حق پر گامزن تھے خداوند عالم کی طرف سے امتحان و آزمائش کے علاوہ کچھ نہیں، اور اگر حق کے راستہ سے روگردانی یعنی گناہ و معصیت کے ارتکاب کے نتیجہ میں ان پر کوئی عذاب آیا تو وہ سزا و عقاب کے طور پر تھا کیونکہ کسی شخص کا اللہ پر خاص حق نہیں کہ جس کی وجہ سے وہ انہیں اپنے جاری و قائم نظام سے مستثنیٰ قرار دے اور قرآن مجید میں کسی کے لئے اس طرح کی امتیازی حیثیت کا ثبوت نہیں پایا جاتا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا وغیرہ کے نام و لقب سے یاد کیا اور نہ ہی لوگوں کے اپنے لئے مخصوص ناموں و القاب کے تعین کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی حیثیت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب قرار دے کر اُن سے یوں فرمایا:

○ سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۴

''اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ -- تا -- وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ

اللّٰہَ شَیْـًٔا ؕ وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ''

(کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم بہشت میں جاؤ گے جبکہ اللہ نے ابھی ان لوگوں کو نہیں جانچا جو تم میں سے مجاہد ہیں وہ کہ جو صبر کرنے والے ہیں۔۔تا۔۔۔اور محمد نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں، پس اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم اپنے الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور جو شخص اپنے الٹے پاؤں پلٹ جائے وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو بہت جلد جزا عطا کرے گا)

O سورۂ نساء آیت ۱۲۳

''لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ ۙ وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ''

(نہ تمہاری تمناؤں کے مطابق اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق عمل ہوگا بلکہ جو شخص برا عمل کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی اور وہ اللہ کے پاس کسی کو اپنا ولی وسرپرست اور مددگار نہ پائے گا)

اور زیر نظر آیۂ مبارکہ کے جملہ ''قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ '' میں ایک صورت اور بھی قابل تصور ہے اور وہ یہ کہ اس میں عذاب سے مراد اُخروی عذاب ہو اور ''یُعَذِّبُکُمْ '' جو کہ فعل مضارع ہے اسے مستقبل کے معنی میں لیا جائے یعنی استمرار و تسلسل کے معنی میں نہ لیا جائے جیسا کہ سابقہ بیان میں اسے استمرار و تسلسل کے معنی میں لیا گیا تھا کیونکہ اہل کتاب اخروی عذاب یعنی آخرت میں گناہوں کی سزا ملنے کے بارے میں فی الجملہ عقیدہ رکھتے ہیں چنانچہ یہودیوں کے بارے میں قرآن مجید میں یوں مذکور ہے کہ انہوں نے کہا ''لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً '' (ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی سوائے گنتی کے چند دنوں کے!) سورۂ بقرہ، آیت ۸۰

اور جہاں تک نصاریٰ کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان کے گناہوں کی بخشش کے لئے اپنی جان کا نذرانہ دیا ان کا یہی عقیدہ ان کی طرف سے گناہ وعذاب کے اعتراف کی ایک صورت ہے کہ حضرت مسیحؑ کو سولی پر لٹکایا گیا جو کہ دراصل عیسائیوں کے گناہوں کی معافی کے طور پر تھا، اس کے علاوہ ان کی انجیلوں میں بھی گناہوں کا ثبوت پایا جاتا ہے مثلاً زنا کاری وغیرہ اور کلیساؤں میں گناہوں کی معافی کے لئے مخصوص جگہ کا تعین بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ گناہ وعذاب کا عقیدہ رکھتے ہیں، یعنی جب کوئی شخص ان میں سے کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اسے معافی دلانے کے لئے کلیسا میں لے جاتے ہیں اور وہاں ان کی معافی کے لئے ایک چبوترا یا مخصوص جگہ بنائی گئی ہے جس پر گناہگار کو کھڑا کر کے اس کے لئے اس کے گناہ کی معافی کی دعا کر کے اسے معاف کیا جاتا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ گناہ وعذاب کے نظام کو تسلیم کرتے ہیں تو یہ بھی اس موضوع میں ایک قابل تصور پہلو ہے لیکن ہماری نظر میں پہلی صورت قرین صحت ہے۔

نصاریٰ کے عقیدہ کی رد میں دوسری دلیل:

''بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ''

(بلکہ تم بشر ہو اس مخلوق میں سے جو اس نے پیدا کی، وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان موجودات کی مالکیت اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔)

اس آیت میں اہل کتاب کے عقیدہ باطلہ کی رد میں دوسری دلیل مذکور ہے کہ جو ایک طرح سے ان سے معارضہ کے طور پر ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اے اہل کتاب! تمہارے بارے میں غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ سرے ہی سے باطل و نادرست ہے کہ تم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست و محبوب ہو کیونکہ تم دیگر افراد بشر ہی کی مانند ''بَشَرٌ'' ہی ہو اور اللہ کی پیدا کردہ مخلوق میں ہی تمہارا شمار ہوتا ہے لہٰذا تم اللہ کی دیگر مخلوق سے کوئی امتیازی حیثیت نہیں رکھتے اور آسمانوں و زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی موجودات میں سے کسی کو اس سے زیادہ کوئی مقام وحیثیت حاصل نہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے وہ اللہ کہ جس نے انہیں پیدا کیا اور ان کا علی الاطلاق حاکم ہے اور اسے ان کے اور دیگر تمام موجودات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کامل اختیار و اقتدار حاصل ہے کہ ان کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کر سکتا ہے اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہوگی اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے دائرہ قدرت و مشیت سے باہر نہیں بلکہ وہ سب پر یکساں حاکم وفرمانروا ہے، لہٰذا جب صورتحال اس طرح سے ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے اس حوالہ سے کوئی چیز اس کی مشیت وارادہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور نہ ہی اس کے فیصلہ و حکم کے نافذ العمل ہونے کی راہ میں کوئی چیز حائل ہوسکتی ہے بلکہ اس کے فیصلوں وارادہ کے سامنے کوئی چیز حجاب بھی نہیں ڈال سکتی۔

بنابرایں جملہ ''بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ'' ان کے عقیدۂ باطلہ کی رد میں قائم کردہ دلیل کے مقدمات (تمہیدی مطالب) میں سے ایک قرار پائے گا جبکہ جملہ ''وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا'' دوسرا مقدمہ اور جملہ ''وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ'' تیسرا مقدمہ شمار ہوگا اور جملہ ''يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ'' ان سب کے نتیجہ کے طور پر ہے کہ جس سے ان کے اس دعویٰ کا بطلان یقینی ہوتا ہے جس میں انہوں نے اپنے بارے میں ہر طرح کی سزا وعقاب کی نفی کا اظہار کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عظیم عمل:

''يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ ''

(اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول، رسولوں کی آمد کے جاری سلسلہ میں وقفہ کے بعد آیا ہے جو تمہیں واضح طور پر احکامِ الٰہی بتاتا ہے)

راغب اصفہانی نے لکھا ہے ''فتور'' (فترۃ) کا معنی حدت و تیزی کے بعد سکون و رک جانا، شدت و سختی کے بعد نرمی اور قوت کے بعد کمزوری ہے۔ لہٰذا آیۂ مبارکہ میں ''يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ '' کا معنی یہ ہے کہ وہ زمانہ جس میں اللہ کی طرف سے رسول بھیجنے کا کام رک گیا تھا اور وہ دور کسی پیامبر الٰہی سے خالی تھا۔

یہ آیت اہل کتاب سے دوسرے خطاب کے طور پر ہے کہ جو پہلے خطاب کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ پہلی آیت میں اس مطلب کو واضح کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک رسول بھیجا جس کی تصدیق کتاب مبین کے ذریعے کی وہ لوگوں کو اللہ کے اذن کے ساتھ ہر خیر وسعادت کی راہ دکھاتا ہے، اور یہ آیت اس مطلب کو واضح کرتی ہے کہ پہلی آیت میں مذکور بیان الٰہی اہل کتاب پر حجت تمام کرنے کی غرض سے تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ ہمارے پاس کوئی بشیر ونذیر نہیں آیا (مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ)۔ اس سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہاں جملہ ''يُبَيِّنُ لَكُمْ '' (فعل مضارع) میں اسی چیز کا بیان و تبیان مقصود وملحوظ ہے جو سابقہ آیت میں ملحوظ ومقصود تھا، لہٰذا فہم المعنی کے لئے عبارت کو یوں فرض کرنا ہوگا کہ وہ تمہیں ان بہت سی چیزوں سے آگاہی دلاتا ہے جو تم کتاب میں چھپاتے ہو یعنی وہ دین کہ جس کی طرف بلایا جارہا ہے بعینہ وہی دین ہے جس کا تم عقیدہ رکھتے ہو اور یہ اسی کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے اور اگر تم اس میں کچھ چیزیں مختلف پاتے ہو تو وہ دراصل دین کے وہی معارف وحقائق ہیں کہ جنہیں تم نے چھپایا ہوا ہے جبکہ کتب آسمانی نے ان حقائق ومعارف کو واضح طور پر بیان کردیا ہے اس بناء پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جملہ ''يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ '' میں سابقہ بیان ہی کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس میں جو اہم مطلب سابقہ بیان میں دیگر مطالب کے باعث ذکر نہیں ہوسکا اس میں جاری سلسلہ کلام کے درمیان جملہ ''اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَ '' کی وجہ سے فاصلہ پیدا ہوگیا اسے ذکر کردیا جائے، البتہ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ عام طور پر جاری سلسلہ بیان اور اس کے اصل مقصود کے درمیان الفاظ وعبارتوں کا طویل فاصلہ پیدا ہونا روا ہے کہ اس کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں مثلاً عرب شاعر کا کلام ملاحظہ ہو:

قربا مربط النعامة منّی
لقحت حرب وائل عن حیال
قربا مربط النعامة منّی
ان بیع الکریم بالشسع غال

ان شعروں میں شاعر نے اپنے بیان میں فاصلہ پیدا کرتے ہوئے یوں کہا: شترمرغوں کے باندھے جانے کی جگہ مجھے دے دو، میرے سامنے وائل کی جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں، شترمرغوں کے باندھے جانے کی جگہ مجھے دے دو کہ سخی کا اپنی قیمتی چیز کو بیچنا خریدار کو مہنگا پڑتا ہے۔

اس میں شاعر نے اپنے جاری سلسلہ بیان و اظہار مقصود میں وائل کی جنگ کے شعلہ ور ہونے کا تذکرہ کر کے طویل فاصلہ پیدا کر دیا، تو اس طرح کا اسلوب بیان قرین صحت قرار دیا جاتا ہے، آیۂ مبارکہ میں اگر جملہ ''اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ'' کے ذریعے جاری سلسلہ بیان میں فاصلہ پیدا ہوا ہے تو اس میں بلاغت کلام پر کوئی حرف نہیں آتا، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ ''یُبَیِّنُ لَکُمْ'' ایک مستقل جملہ ہو اور فعل مضارع کا متعلق لفظوں میں ذکر نہ کیا گیا ہو بلکہ محذوف ہوتا کہ اس سے کسی خاص مطلب کے بیان کی بجائے تمام امور کا بیان مقصود و ملحوظ ہو کہ وہ ہر اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جسے واضح طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے یا اس لئے لفظوں میں اسے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ ایک عظیم مطلب ہے اور اس کی عظمت اس کی متقاضی ہے کہ اسے الفاظ میں ذکر نہ کیا جائے بلکہ اس کی بابت الگ وضاحتی اظہار ہو، چنانچہ جملہ ''عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ'' اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ لوگوں کو احکام و دستورات الٰہیہ کی تفہیم کی ضرورت ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، بنابر ایں آیت مبارکہ کا معنی یوں کیا جائے گا، وہ تمہارے لئے اس چیز کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جس کی تمہیں ضرورت ہے اور وہ چیز عرصہ دراز سے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کسی رسول کے نہ آنے کی وجہ سے بیان نہیں ہو سکی اب ہم نے اسے بھیجا ہے تا کہ وہ تمہارے لئے اس چیز کو بیان کرے۔

اور جملہ ''اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ'' ایک ممکنہ مطلب کے جواب و رد کے طور پر ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ تورات کے احکام کے بعد کسی دوسری شریعت و احکام کا صادر ہونا ناروا ہے کیونکہ وہ لوگ ''نسخ'' (احکام کے منسوخ ہونے) اور بدآء کو محال سمجھتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کو رد کرتے ہوئے اپنی قدرت علی الاطلاق کا ذکر کیا کیونکہ ان کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی قدرت علی الاطلاق کے منافی ہے اور اسے محدود کرتا ہے جبکہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور اس کی قدرت کا دائرہ محدود نہیں جس میں نسخ و بداء اور دیگر امور شامل ہیں اسے کسی بھی حوالہ سے محدود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یاد رہے کہ ہم سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۶ ''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا'' کی تفسیر میں اس موضوع کی بابت مربوطہ مطالب

ذکر کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو المیزان جلد اوّل)۔

طرزِ تفکر کی قرآنی ہدایات، ایک ملی جلی بحث!

یہ حقیقت ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ انسانی زندگی تفکر و تدبر پر مبنی زندگی سے عبارت ہے کہ جس کی صورت گری کا عمل اس ''ادراک'' کے بغیر مکمل نہیں ہوتا جسے ہم ''فکر'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور چونکہ زندگی ''فکر'' پر مبنی حقیقت کا نام ہے لہٰذا جس قدر اس میں درستی پائی جائے گی اسی کے مطابق زندگی کمالیت کی حامل ہوگی، اس بناء پر کمالیت و تمامیت کی حامل زندگی کی اساس و بنیاد صحیح و کامل فکر پر استوار ہے اور جس قدر اس کی صحت و کمالیت زندگی میں پائی جائے گی اسی مقدار میں زندگی بھی استقامت و پائیداری کی حامل ہوگی۔

اس حقیقت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں مختلف مقامات پر گونا گوں طرز بیان اور اسلوب اظہار کے ساتھ فرمایا ہے مثلاً:

○ سورۂ انعام، آیت ۱۲۲

''اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا''

(کیا وہ شخص کہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح سے ہے جو ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے کہ جن سے باہر نہیں نکل سکتا)

○ سورۂ زمر، آیت ۹

''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ''

(کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ کہ جو علم نہیں رکھتے)

○ سورۂ مجادلہ، آیت ۱۱

''يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ''

(اللہ تم میں سے ان لوگوں کو بلند مقام عطا کرتا ہے جو ایمان لائے اور جو صاحبانِ علم ہیں ان کے درجات بلند کرتا ہے)

○ سورۂ زمر، آیت ۱۸

''فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ''

(پس میرے ان بندوں کو خوشخبری دو جو ہر بات سنتے ہیں مگر جو اچھی و احسن ہو اس کا اتباع کرتے ہیں، وہی لوگ

ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور وہی عقل والے ہیں)

ان آیات کے علاوہ متعدد دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں اس حقیقت کا تذکرہ ہوا ہے کہ یہاں ان سب کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال اس مطلب میں کسی بھی حوالہ سے شک وشبہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ قرآن مجید نے بنی نوع انسان کو صحیح فکر کرنے اور فروغ علم کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ صحیح طرزِ تفکر ہی اصل ہدف ہے جس کی طرف قرآنِ مجید رہنمائی کرتا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

O سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹

''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ''

(یقیناً یہ قرآن انہی امور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ مضبوط و پائیدار ہیں)

اس میں مضبوط و پائیدار ترین امور سے مراد وہ ملت یا سنت وطرزِ عمل یا راہ روش ہے جس سے زیادہ پائیدار کوئی چیز نہیں، بہرحال اس سے مراد و مقصود زندگی کا وہ طور طریقہ ہے کہ جس کا مضبوط و پائیدار ترین ہونا اس کے طرزِ تفکر کی پائیداری پر موقوف ہے۔ چنانچہ اسی حوالہ سے آیت ۱۵ اور ۱۶ میں یوں ارشاد الٰہی ہے: ''قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۙ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ'' (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا اور کتاب مبین آئی ہے، اس کے ذریعے اللہ ہر اس شخص کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے درپے ہوں اور انہیں ظلمتوں سے نکال باہر کر کے نور کی طرف لے آتا ہے اپنے اذن کے ساتھ! اور انہیں صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے) اور صراطِ مستقیم وہی روشن و واضح راستہ ہے جس میں نہ تو کوئی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نہ ہی مقصد و مقصود تک نارسائی کا خطرہ لاحق ہوتا ہے یعنی وہ مطلوبہ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور وہ راستہ انہیں ان کی منزل مقصود یعنی حق تک لے جاتا ہے۔

یہاں یہ نہایت اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس طرز تفکر کے حوالہ سے کہ جس کی دعوت اور اسے اپنانے کا ارشادی حکم قرآنِ مجید میں دیا گیا ہے اس کی بابت مخصوص نشاندہی نہیں کی گئی بلکہ اسے افرادِ بشر کی فطری عقلوں اور ان کے باطنی فہم و ادراک کی قوتوں کے حوالہ کر دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے وجود میں فطری طور پر صحیح طرزِ تفکر کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے چنانچہ آپ اگر اس کتابِ الٰہی میں تحقیقی نگاہ کریں اور اس کی مقدس آیات میں غور و فکر کریں تو شاید تین سو سے زیادہ آیتیں آپ کو ملیں گی جن میں لوگوں کو ''تفکر''، ''تذکر'' اور ''تعقل'' کی دعوت دی گئی ہے یا حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے اثبات اور باطل کے ابطال کے لئے دلیل قائم کرنے کی ضرورت سے متوجہ کیا گیا ہے مثلاً: ''قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗ'' (کہہ دیجئے کہ کون ہے جو اللہ کے اس اختیار کے مقابلے میں

کوئی اختیار رکھتا ہو کہ اگر اللہ چاہے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی والدہ کو ہلاک کرے) تو وہ اسے ایسا نہ کرنے دے (زیر بحث آیت ۱۷) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و اولیاء مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر بزرگ نبیوں اور لقمان و مؤمن آلِ فرعون جیسی شخصیات کے بارے میں ذکر کیا کہ انہوں نے اپنے مدمقابل دشمنوں کے سامنے حق کے اثبات کے لئے کس طرح استدلال کیا چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ ابراہیم، آیت ۱۰

''قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''

(ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے)

اور لقمان کے حوالہ سے یوں مذکور ہے:

○ سورۂ لقمان، آیت ۱۳

''وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ''

(اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جبکہ وہ اسے نصیحت کر رہے تھے: اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دو، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے)

مؤمن آلِ فرعون کے حوالہ سے یوں مذکور ہے:

○ سورۂ المومن، آیت ۲۸

''وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ''

(اور آلِ فرعون میں سے ایک مومن شخص نے جو کہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا یوں کہا، کیا تم لوگ اس شخص کو اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہے)

فرعون کے جادوگروں کا قصہ بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا:

○ سورۂ طٰہٰ آیت ۷۲

''قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا''

(انہوں نے کہا: ہم تجھے ان واضح و روشن دلائل اور وہ ہستی کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اس پر تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے، پس تو ہمارے بارے میں جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر لے، تیرا فیصلہ صرف ہماری دنیاوی زندگی ہی کے

بارے میں ہوگا)

حقیقت الامر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور نہ ہی کسی ایک آیت میں اپنے بندوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اسے یا اس چیز کو جو اس کی طرف سے آئی ہے اس پر بے بصیرتی کے ساتھ ایمان لائیں یا فلاں راستہ پر سوجھ بوجھ کے بغیر چل پڑیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس نے جو احکام و دستورات صادر فرمائے ہیں کہ جن کی جزئیات کے فلسفہ کا ادراک ان کی عقلیں بھی نہیں کر سکتیں ان کی بابت بھی ایسے امور ذکر کیے جو خود دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان احکام کی پس منظر حقیقت کو واضح کرتے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور وضو کے احکام میں یہ امر پورے طور پر دکھائی دیتا ہے، ملاحظہ ہو:

نماز کے حوالہ سے یوں مذکور ہے:

○ سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵

''اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ''

(یقیناً نماز برائی و بدکرداری سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

روزہ کے بارے میں یوں مذکور ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۳

''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''

(تم پر روزے واجب کئے گئے ہیں جس طرح سے ان لوگوں پر واجب کئے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی ہو جاؤ)

وضو کے حکم پر مبنی آیت میں یوں مذکور ہے:

○ سورۂ مائدہ، آیت ۶

''مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ''

(اللہ تم پر کسی طرح سے تنگی و تکلیف نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے اور وہ تم پر اپنی نعمت کو پورا کرنا چاہتا ہے تا کہ تم شکر گزار بنو)

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں مربوطہ حکم کے ساتھ اس کی دلیل کے قالب میں اس کی حکمت بیان ہوئی ہے اور یہ عقلی ادراک یعنی طرزِ تفکر کا وہ صحیح راستہ کہ جس کی طرف قرآن مجید ہمیں رہنمائی کرتا ہے تا کہ ہم اس کے ذریعے اس حق، خیر اور سعادتمندی سے پوری طرح آگاہی حاصل کر سکیں جس کے اپنانے کی قرآن مجید ہمیں دعوت دیتا ہے اور اس باطل، شر اور نقصان دہ امور کو بخوبی پہچان سکیں کہ قرآن مجید جن سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیتا ہے وہ ہمارے اندر ہی موجود

ہے اور ہم اپنی وجودی ساخت و نا قابل تغیر و تبدل فطرت کی نظروں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس کی بابت کوئی فردِ بشر دوسرے فرد سے تنازع و اختلاف نہیں رکھتا کیونکہ فطرت اپنی اصل حقیقت کے ساتھ تمام افرادِ بشر میں یکساں ہے یعنی ایسا نہیں کہ کوئی شخص فطری امور میں دوسرے شخص سے مختلف رائے رکھتا ہو اور اگر کہیں اس کی بابت اختلاف یا تنازعہ دکھائی دے تو اسے بدیہی حقیقتوں میں نزاع سے تعبیر کیا جائے گا کہ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ طرفین میں سے ایک فرد یا دونوں ہی اختلافی مورد کی بابت غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور اس کی بابت صحیح طرزِ تفکر اختیار نہیں کیا۔

اب یہ سوال سامنے آئے گا کہ وہ صحیح طرزِ تفکر کیا ہے کہ ہم اپنی انسانی فطرت کی بناء پر جس سے آگاہی رکھتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ہر چیز کے بارے میں شک کا شکار ہو سکتے ہیں مگر اس امر کی بابت ہرگز شک کا شکار نہیں ہوتے کہ ہمارے وجود کی دنیا سے باہر کچھ حقائق ایسے موجود ہیں جو اپنی استقلالی حیثیت کے حامل ہیں اور ہمارے اعمال سے پورے طور پر جدا ہیں جیسے مبداء و معاد کے مسائل، اور ان کے علاوہ ریاضیات وطبیعات وغیرہ کے مسائل کہ اگر ہم چاہیں کہ ان حقائق و مسائل سے مکمل و یقینی طور پر آگاہ ہوں تو ہم ان اولیات و بدیہیات سے تمسک کرتے ہیں جو نا قابل شک ہیں یا ان اولیات و بدیہیات کے لوازم و پیوستہ امور کا سہارا لے کر اپنے خاص فکری اسلوب کے ذریعے ان سے اپنے مطلوب تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ''الف'' مساوی ہے ''ب'' کے، اور ہر ''ب'' مساوی ہے ''ج'' کے تو اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ ''الف'' بھی مساوی ہے ''ج'' کے، یا اگر یوں کہیں کہ ''الف'' مساوی ہے ''ب'' کے تو ''ج'' مساوی ہے ''د'' کے لہٰذا اگر ''ج'' دال کے مساوی ہو تو ''ھ'' مساوی ہوگا ''ز'' کے اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ اگر ''الف'' مساوی ہو ''ب'' کے تو ''ھ'' مساوی ہوگا ''ز'' کے، یا اگر یوں کہیں کہ اگر ''الف'' مساوی ہو ''ب'' کے تو ''ج'' مساوی ہوگا ''د'' کے، اور اگر ''ج'' مساوی ہو ''د'' کے تو ''ھ'' مساوی ہوگا ''ز'' کے، لیکن ''الف'' چونکہ ''ب'' کے مساوی نہیں لہٰذا نتیجہ ''ھ'' مساوی نہیں ہوگا ''ز'' کے۔

مذکورہ بالا صورتیں اور ان کے وہ خام مواد کہ جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ایسے بدیہی امور ہیں کہ ان کی بابت کوئی شخص اپنی فطرت سلیمہ کی بنیاد پر کسی طرح کے شک کا شکار نہیں ہوسکتا سوائے اس شخص کے کہ جو عقلی طور پر بیمار ہو یا اس کے فہم و ادراک میں خلل یا آمیزش ہو کہ جس کی وجہ سے وہ ان بدیہی امور کا تعقل نہ کر سکے اور تصور و تصدیق کی بدیہی صورتوں کی بجائے ان سے مختلف راہ و اسلوب اپنائے جیسا کہ عام طور پر بدیہیات کی بابت شک کرنے والے افراد ایسا ہی کرتے ہیں اور ہم جب اس طرح کی تشکیلی صورتوں اور مذکور بالا منطقی طرزِ تفکر پر بخوبی غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا منطقی طرزِ تفکر کی بابت شک کرنے والے حضرات اپنے دعوؤں اور مقاصد سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے انہی جیسے اصولوں کا سہارا لیتے ہیں جو علم منطق میں تدوین کئے گئے ہیں کہ جن کی برگشت ہیئت و مادہ کی طرف ہوتی ہے اور اگر ہم ان

کے بیانات کا تجزیہ وتحلیل کرنے کے لئے ان ابتدائی بنیادی مقدمات پر غور کریں تو ان سب کی بازگشت علم منطق ہی کے ضابطوں ومواد اور ہیئات کی طرف ہوگی جبکہ وہ ان پر معترض ہوتے ہیں اور اگر ہم ان مقدمات یا اشکال وہیئات میں کسی صورت میں تبدیلی کریں کہ جو علم منطق میں نتیجہ بخش نہیں قرار دی جاتی تو ان حضرات کے بیانات سرے ہی سے بے نتیجہ ہو جائیں گے اور وہ اس طرح کی تبدیلی کو ہرگز پسند وقبول نہیں کریں گے تو یہ مطلب بذاتِ خود اس حقیقت کا واضح ترین گواہ ہے کہ یہ حضرات اپنی انسانی فطرت کی بناء پر مذکورہ بالا منطقی اصولوں کے معترف ہیں اور انہیں تسلیم کرتے ہیں اور ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں یعنی اپنے استدلال میں ان کا سہارا لیتے ہیں مگر اس کے باوجود کہ وہ ان حقائق کی بابت یقین رکھتے ہیں ہٹ دھرمی کی بناء پر ان کا انکار کرتے ہیں ذیل میں ان کے بیانات بمع جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اگر علم منطق حقائق تک پہنچنے کا صحیح طریقہ ہوتا تو اہل منطق کے درمیان کوئی اختلاف نہ پایا جاتا جبکہ ہم انہیں ان کی آراء میں شدید ترین اختلاف کا شکار پاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے بیان میں علم منطق ہی کے ایک اصول وقاعدہ کا سہارا لیا ہے یعنی قیاس استثنائی! جبکہ وہ خود اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور وہ اس مطلب سے غافل ہوئے کہ علم منطق کا ایسا آلہ وذریعہ ہونا کہ جس کے استعمال سے انسان فکر ونظر میں غلطی سے محفوظ ہوتا ہے اس کے صحیح استعمال پر موقوف ہے، یعنی جب اسے صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو وہ انسان کو فکری ناہمواری سے بچاتا ہے لیکن ہر استعمال کرنے والا شخص اسے صحیح استعمال بھی کرتا ہے؟ اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرتا، اس کی مثال تلوار سے دی جاسکتی ہے جو کہ کاٹنے کا آلہ ہے لیکن وہ اسی صورت میں کاٹنے کے عمل کو نتیجہ بخش بناتا ہے جب اسے صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

(۲) بعض اہل دانش کا کہنا ہے کہ علم منطق کے اصول وقوانین انسانی فکر ہی کے بنائے ہوئے ہیں جو کہ تدوین کے بعد تاریخی طور پر مکمل ہوئے، تو اصل حقائق کا ثبوت ان پر کیونکر مبنی ہوسکتا ہے؟ یعنی وہ اصل حقائق کے ثبوت کا معیار واساس کسی طرح قرار پاسکتے ہیں؟ اور جو شخص ان قوانین سے آگاہی نہ رکھتا ہو یا انہیں استعمال نہ کرے اسے حقائق تک رسائی کیونکر ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی سابقہ قول کی طرح قیاس استثنائی ہے اور مغالطہ کی بدترین قسم ہے کیونکہ اس میں ''تدوین'' کا مطلب ہی غلط سمجھا گیا ہے اور یہ بات کرنے والے کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ تدوین سے مراد ایجاد ہے جبکہ ایسا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''تدوین'' کا معنی ان قواعد سے تفصیلات تک رسائی حاصل کرنا ہے جو اجمالی طور پر ہر شخص کو فطرتاً معلوم ہیں لہٰذا اسے ایجاد کرنا اور بنانا نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) بعض حضرات نے کہا ہے کہ علم المنطق کے مروجہ اصولوں کو اس لئے عام کیا گیا تا کہ لوگوں کو اہل بیت علیہم

السلام کے راستہ سے روکا جا سکے یا انہیں کتاب وسنت کی پیروی کرنے سے روگرداں کیا جا سکے لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان اصولوں سے اجتناب برتیں۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان حضرات کی بات قیاس کی دونوں قسموں یعنی اقترانی اور استثنائی کا مجموعہ مرکب ہے اور اس بناء پر استدلال کرنے والے حضرات نے اس مطلب کی طرف توجہ نہیں کی کہ کسی راستہ کا کسی غلط مقصد کیلئے بنایا جانا یا کسی ناپسندیدہ غرض کے حصول کے لئے اس پر چلنا اس راستہ کے اپنے طور پر صحیح و درست ہونے کے منافی نہیں یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی چیز کسی غلط کام لینے کے لئے بنائی جائے جبکہ وہ چیز اپنے طور پر غلط نہ ہو مثلاً تلوار کہ جو اصل میں اپنے دفاع کے لئے بنایا جانے والا آلہ ہے مگر اس سے کسی مظلوم کو قتل کرنے کا کام لیا جائے اور اسی طرح دین جو کہ اللہ کا بنایا ہوا سعادت بخش نظام حیات ہے اسے رضائے الٰہی کے علاوہ کسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے تو اس میں استعمال کرنے والا قصوروار قرار پائے گا اصل تلوار یا دین کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۴) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ علم المنطق کے اصول اگرچہ عقلی بنیادوں پر استوار ہیں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عقلی بنیادوں پر قائم اصولوں کا اپنانا کتاب وسنت کی خلاف ورزی کا سبب بنتا ہے جیسا کہ اپنے آپ کو فلاسفہ کہلانے والوں کی اکثر آراء اسی نتیجہ تک لے جاتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی قیاس اقترانی ہی کی ایک صورت ہے کہ جس میں یہ مغالطہ ہوا ہے کہ جن فلاسفہ کی آراء کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا نادرست ہونا نہ تو کسی منطقی اصول وقیاس کی وجہ سے ہے اور نہ ہی علم منطق کی ناقابل انکار و بدیہی بنیادوں پر استوار ہونے کی وجہ سے ہے بلکہ ان کے اپنے بعض خود ساختہ غلط اصولوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہے کہ جنہیں انہوں نے علم منطق کے صحیح اصولوں کے ساتھ آمیختہ کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ان کی آراء غلط ہو گئیں۔

(۵) علم المنطق کے اصول وقواعد پر اعتراض کرنے والوں میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ علم منطق سے صرف یہ کام لیا جاتا ہے کہ الفاظ ومعانی کی مختلف ترکیبی صورتوں میں سے کس طرح صحیح وغلط کی تمیز اور درست ونادرست کے درمیان فرق کرنے کی راہ پا سکتے ہیں لہٰذا علم منطق کا تعلق ان صورتوں کے اصولوں ومواد سے نہیں ہے اور نہ ہی ان کی بابت کوئی ایسا ضابطہ موجود ہے جس کی بناء پر فکر ونظر میں غلطی سے بچا جا سکے، بنابرایں اہل عصمت کے علاوہ جس کی بھی طرف رجوع کریں خطاء وغلطی سے نہیں بچ سکتے، خطا وغلطی سے بچنے کا واحد راستہ معصومینؑ کی طرف رجوع کرنا اور ان سے کسب فیض ورہنمائی حاصل کرنا ہے۔

اس کا جواب واضح ہے کہ اس میں بھی وہ مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں اور وہ اس حوالہ سے کہ اس کی بنیاد ''خبر واحد'' یا تمام ''اخبارِ آحاد'' اور ان تمام ''ظواہر القرآن'' کے حجت ہونے پر قائم ہے جو کہ ظنی الدلالت ہیں اور یہ امر ایک روشن حقیقت

ہے کہ معصومین علیہم السلام کی طرف رجوع کرنا اور ان سے کسب فیض کرنا اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمیں ان کی طرف منسوب کلام کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو کہ یہ فرمان انہی کا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی پورے طور پر یقینی ہو کہ اس فرمان میں اس کا مقصد و مراد کیا ہے؟ جب تک ان دونوں جہتوں کے بارے میں یقین حاصل نہ ہو ان کے ارشادات سے فیض حاصل کرنا ممکن نہیں اور یہ کام کسی ''خبر واحد'' یا تمام ''اخبار آلا حاد'' سے کیونکر لیا جاسکتا ہے جبکہ اخبار آلا حاد خود یقینی نہیں بلکہ ان کا معصومینؑ کی طرف سے صادر ہونا اور اسی طرح ان کی دلالت دونوں غیر یقینی اور ظنی ہیں؟ یہی بات ہر اس کلام و بیان کے بارے میں ہوگی جس کی دلالت غیر یقینی و ظنی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہمیں روایات و احادیث کے بارے میں یہ یقین حاصل نہیں کہ یہ معصومینؑ ہی کا کلام و بیان ہے اور یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس کلام و فرمان سے ان کی مراد یہی ہے جو ہم نے سمجھا ہے تو اس صورتحال میں ان سے کسب فیض کرنا کیونکر ممکن ہوگا۔ بنا برایں جب معیار یہ ہو کہ صرف یقینی امور سے تمسک کیا جائے تو اس میں معصومؑ و غیر معصوم دونوں کے بیانات شامل ہیں اور یہ معیار دونوں میں ملحوظ ہوگا اور اس حوالہ سے ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ ہوگا بلکہ ہر کلام و بیان کو اسی معیار پر پرکھا جائے گا ورنہ اس کا ''دلیل'' قرار پانا درست نہ ہوگا خواہ وہ معصومؑ کی طرف منسوب بیان ہو یا مقدمات عقلیہ، علم المنطق کے اصول ہوں، اور جہاں تک علم المنطق کی قیاسی صورتوں کا تعلق ہے تو ان کا حجت و قابل قبول ہونا مسلم ہے اور جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ علم المنطق کے اصولوں سے اس لئے بھی ہمیں یقین حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کی بابت اشتباہات کی ایک طویل فہرست موجود ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی شخص ان کا سہارا نہیں لے سکتا، تو اس بات کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بلا دلیل اور بے بنیاد ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ان کی یہی بات اپنے طور پر علم المنطق ہی کے ایک اصول پر مبنی ہے کہ جس سے یقینی نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور اس کی منطقی صورت کچھ اس طرح سے قابل تصور ہے کہ مثلاً یوں کہا جائے کہ لوگوں کو جو کچھ مطلوب ہے وہ سب قرآنِ مجید میں موجود ہے اور جو کتاب اس قدر جامع ہو وہ دوسری ہر چیز سے بے نیاز کرتی ہے لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ قرآن مجید دوسری ہر چیز سے بے نیاز کرتا ہے، تو یہ خود ایک منطقی قیاس ہے کہ جس سے یقینی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ بنا برایں اشکال کرنے والوں کی اپنی بات ہی علم المنطق پر مبنی ہے تو وہ اس علم کے عقلی اصولوں کا انکار کیونکر کر سکتے ہیں؟

(۶) علم المنطق اور اس کے اصولوں پر اعتراض کرنے والوں میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہے اور بہتر زندگی بسر کرنے میں ان اصولوں کی پیروی کامیابی و سعادت کی ضمانت دیتی ہے وہ سب قرآن مجید اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات و ارشادات میں موجود ہے لہٰذا اس کے بعد کافروں و ملحدوں کے خود ساختہ اصولوں کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی اسی بات میں علم المنطق کا سہارا لیا گیا ہے اور ان کے استدلال میں

ہی یہ حقیقت درخشاں ہے کہ علم المنطق کے اصول قابل عمل ہیں چنانچہ اس استدلال میں علم منطق کے ''قیاس اقترانی'' کی واضح صورت موجود ہے اور اس میں عقلی یقینی اصولوں ہی سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس میں وہ مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں اور وہ اس طرح کہ:

(۱) علم المنطق کے اصولوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کی عملداری کا ثبوت کتاب و سنت میں پایا جاتا ہے لہٰذا ان اصولوں کی بابت مستقل بحث کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

(۲) کتاب و سنت کا کسی دوسری دلیل و اصول کو اپنے ساتھ منضم کرنے سے بے نیاز ہونا ان دونوں سے تمسک اختیار کرنے اور ان سے کسب فیض کرنے والے شخص کا ان سے فہم المعانی کے لئے کسی دوسری دلیل و اصول کا محتاج ہونا دو الگ الگ مسئلے ہیں کہ اعتراض کرنے والوں نے ان دونوں میں خلط ملط کر دیا اور مغالطہ کا شکار ہو گئے لہٰذا ان حضرات کی مثال اس طبیب سے دی جاسکتی ہے جس کا کام ہی انسانی جسم کے بارے میں بحث و تحقیق کرنا ہوتا ہے اور وہ یہ کہنے لگے کہ طبیعی و معاشرتی و ادبی علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور ہم ان علوم سے بے نیاز ہیں اس کا اس طرح کہنا اس لئے نادرست ہے کہ ان تمام علوم کا تعلق انسان ہی سے ہے ان سب کو انسانی علم کہا جاتا ہے یا اس شخص کی مثال اس جاہل انسان سے دی جاسکتی ہے جو کسی طرح کا علم حاصل کرنے کی ضرورت کا انکار اس بناء پر کرے کہ تمام علوم انسانی فطرت میں ودیعت کئے جاچکے ہیں۔

(۳) کتاب و سنت دونوں ہی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ صحیح عقلی اصول اپنانے کی دعوت دینے والے ہیں (اور صحیح عقلی اصول بدیہی مقدمات یا ان سے وابستہ امور کے علاوہ کچھ نہیں) چنانچہ قرآنِ مجید اس حوالہ سے یوں گویا ہے:

○ سورۂ زمر، آیت ۱۸

''فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ''

(پس میرے ان بندوں کو خوشخبری دو جو ہر بات سنتے ہیں مگر جو بات اچھی ہو اس کا اتباع کرتے ہیں، کہ وہی ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا ہے اور وہی صاحبانِ عقل ہیں)

یہ اور اس کے علاوہ دیگر کثیر آیات و روایات میں یہی مطلب ذکر ہوا ہے، ہاں، البتہ ہر اس چیز کا اتباع کرنے سے روکتے ہیں جو صریح و یقینی طور پر ان سے متصادم ہو کیونکہ کتاب اور سنت قطعیہ ان امور میں سے ہیں جن کے حق و سچ ہونے کا ثبوت عقلی دلیل سے ملتا ہے اور یہ بات محال و ناممکن ہے کہ عقل دوبارہ اسی چیز کو نادرست قرار دے جس کے حق و برحق ہونے کو پہلے ثابت کر چکی ہے، اور جہاں تک صحیح عقلی مقدمات کے غیر صحیح مقدمات سے تمیز دینے اور پھر صحیح مقدمات سے وابستہ ہو جانے کا تعلق ہے تو وہ اسی طرح سے ہے جیسے آیات و روایات میں محکم و متشابہ کی تمیز و پہچان کرنے کے بعد ان میں سے محکم کو

اخذ کرنا ضروری ہے اور جس طرح اصلی وجعلی حدیثوں میں تمیز کرنے کے بعد اصلی حدیثوں کو اخذ کرنا اوران پر عمل کرنا ضروری ہے جبکہ جعلی حدیثیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

(۶)''حق'' حق ہے خواہ جہاں بھی ہو اور جیسے اور جہاں سے ملے، اس میں اس کے حامل شخص کا ایمان، کفر، تقویٰ، فسق وغیرہ اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی ان چیزوں کا ''حق'' کے حق ہونے سے کوئی تعلق ہے لہٰذا اگر ''حق'' سے صرف اس کے حامل سے دشمنی کی بناء پر روگردانی کی جائے تو وہ جاہلانہ تعصب کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اور اپنے پیغمبروں کی زبانی حق سے روگردانی کے مرتکب افراد کی سخت مذمت کی ہے۔

(۷) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ کتاب وسنت میں اس امر کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اپنانے کی دعوت دی گئی ہے کہ دین میں بھرپور احتیاط سے کام لیا جائے لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ کتاب وسنت کے ظواہر پر اکتفاء کریں اور منطقی وعقلی اصولوں کی پیروی سے اجتناب برتیں کیونکہ ان میں دائمی تباہی اور نا قابل تلافی نقصان اور ایسی شقاوت سے دو چار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کے بعد سعادت کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسی بیان میں منطقی وعقلی اصولوں کو اپنایا گیا ہے کیونکہ یہ بیان قیاس استثنائی پر مشتمل ہے کہ جس میں ان عقلی اصولوں سے کام لیا گیا ہے جو عقل کے نزدیک واضح وروشن اور ثابت ومسلم ہیں خواہ کتاب وسنت درمیان میں نہ بھی ہوں، اس کے علاوہ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ ان حضرات کا مذکورہ بالا بیان اس شخص کی بابت قرین صحت قرار پاسکتا ہے جو عقلی مسائل کی باریک بینیوں کو سمجھنے سے قاصر ہو لیکن جو شخص ان کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کی بابت قرآن و سنت سے کوئی دلیل ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ بھی ان معارف کی حقیقتوں تک رسائی سے محروم ہے جن سے انسان کی عظمت وشرف وابستہ ہے اور ان کے بغیر اس کی امتیازی حیثیت اور وجودی تشخص کی جلوہ گری ممکن نہیں چنانچہ اس نا قابل انکار حقیقت پر کتاب وسنت اور عقل بھی دلالت کرتے ہیں۔

(۸) علم المنطق پر اعتراض کرنے والے حضرات میں سے بعض کا کہنا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہمارے بزرگوں اور بلند پایہ علمی شخصیات کا طرزِ عمل فلسفہ وعرفان کے مخالف رہا اور وہ کتاب وسنت سے استفادہ کرنے کے ذریعے فلاسفہ کے بنائے ہوئے منطقی وعقلی اصولوں اور عرفاء کے طریقہ ریاضت سے بے نیاز ہوتے تھے اور پھر خلفاء کے دور میں یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا جس نے مسلمان اہل دانش کو اپنے خیالی حسن کا اسیر کر لیا چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کے پیروکار ہونے کے باوجود فلسفی مطالب کو قرآنی معارف پر منطبق کرنے کی طرح ڈال دی جس کے نتیجہ میں وہ دو گروھوں یعنی اشاعرہ اور معتزلہ میں تقسیم ہو گئے۔ پھر زمانہ خلفاء میں کچھ دوسرے لوگوں نے سر اُٹھایا کہ جو صوفی وعارف کے ناموں سے موسوم ہوئے، وہ لوگ قرآنی حقائق سے آگاہی اور کشف الاسرار کے دعویدار بن گئے اور یہ گمان کرنے لگے کہ انہیں اہل عصمت و

طہارت یعنی آئمہ اہل بیتؑ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہیں اسی بناء پر فقہاء اور اہل بیت علیہم السلام کے دامن سے پیوستہ اور ان کے شیعہ و پیروکاران سے الگ حیثیت کے حامل قرار پائے، یہ صورتحال تیرھویں صدی ہجری کے درمیانی زمانہ (ایک سو سال پہلے) تک باقی رہی، اس وقت ان حضرات یعنی فلاسفہ و عرفاء نے قرآن و حدیث کے مقاصد و معارف کو تاویلوں اور اکھاڑ پچھاڑ کے ذریعے فلسفی و عرفانی مطالب سے جوڑنے اور مربوط و مرتبط کرنے کی عملی منصوبہ بندی کی جس کے نتیجہ میں اکثر حضرات غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ اس نظریہ کے قائل نے اپنے اس بیان سے یہ نتیجہ اُخذ کیا کہ فلسفہ و منطق کے اصول و قوانین اس برحق طریقہ و طرزِ عمل سے متصادم ہیں جس کی رہنمائی کتاب و سنت نے کی ہے۔

اس کے بعد اس شخص نے علم منطق پر بعض اعتراضات کئے کہ وہ سب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مثلاً علم منطق کے علماء کے درمیان آپس میں اختلافات ہونا، علم منطق سے استفادہ کرنے کے باوجود ان سے خطاء و غلطی کا سرزد ہونا اور حقیقی مسائل میں بدیہیات و عقلیات کا ضروری مقدار سے نہایت کم بلکہ ناکافی ہونا وغیرہ، تو اس صورتحال میں علم منطق کا کیونکر سہارا لیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد اس نے متعدد فلسفی مسائل کو بطور مثال ذکر کیا اور ان کی بابت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ قرآن و سنت سے حاصل ہونے والے مطالب سے صریح طور پر تناقض و تصادم رکھتے ہیں۔

تو یہ ہے علم منطق پر اعتراض کرنے والے دانشور کے اظہارات کا خلاصہ کہ جسے ہم نے یہاں چند سطروں میں ذکر کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی کہ ان کی مذکورہ باتوں میں سے کس کا جواب دیں اور کس کا نہ دیں کیونکہ ان میں اس قدر بے بنیاد و بے ربط امور پائے جاتے ہیں کہ وہ ناقابل درستگی ہیں، گویا اس نے بیماری کو دوا پر ترجیح دی ہے، تاہم اس کے بیان کردہ مطالب کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے جو انہوں نے مسلمان دانشوروں اور علماء کے بارے میں کہی کہ وہ آئمہ معصومینؑ سے منحرف و روگرداں ہو کر اپنے خود ساختہ منطقی اصولوں اور فلسفی معارف کو کتاب و سنت پر منطبق کرنے لگے جس کے نتیجہ میں وہ خود دو گروھوں یعنی معتزلہ اور اشاعرہ میں تقسیم ہو گئے اور انہی میں سے صوفی مسلک افراد پیدا ہو گئے کہ وہ اور ان کے پیروکاروں نے کتاب و سنت سے بے نیازی کا عقیدہ اپنایا اور یہ سلسلہ تیرھویں صدی ہجری تک جاری رہا کہ عرفانی فلسفہ ظہور پذیر ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان مطالب میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی تصدیق تاریخ کے روشن اوراق سے ہوتی ہو بلکہ تاریخ ان تمام مطالب کی نفی کرتی ہے اس تاریخی بحث کی بابت بہت جلد ہم مربوطہ مطالب ذکر کریں گے انشاءاللہ تعالیٰ۔

اس کے ساتھ ساتھ یہاں یہ مطلب بھی قابل ذکر ہے کہ اس قائل نے علم کلام اور علم فلسفہ کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے اور وہ واضح غلطی کا شکار ہو کر ان دونوں کو ایک ہی علم سمجھ کر ان کی بابت یکساں اظہار رائے کرنے لگے جبکہ ان دونوں میں

فرق ہے کیونکہ علم فلسفہ کی بحثوں کا محور حقائق ہیں اور اس کا استدلال یقینی بنیادوں پر استوار مسلم الثبوت مسائل پر مبنی ہوتا ہے جبکہ علم الکلام میں حقیقی وغیر حقیقی دونوں طرح کے امور سے مربوط بحثیں ہوتی ہیں اور اس کا استدلال ان مسائل پر مبنی ہوتا ہے جو یقینی وغیر یقینی دونوں طرح کی بنیادوں پر استوار قرار پائے ہیں، بنابرایں ان دونوں یعنی علم الکلام اور علم الفلسفہ کے درمیان آسمان وزمین کے درمیان پائے جانے والے فاصلہ سے بھی زیادہ فاصلہ وفرق پایا جاتا ہے اس صورت میں یہ بات کیونکر قابل تصور ہے کہ علم الکلام کا ماہر شخص علم فلسفہ کے مطالب کو قرآن پر منطبق کرنے کا سوچے؟ اس کے علاوہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس دن سے ان کے آسمانِ علم پر سب سے پہلا ستارہ درخشاں ہوا اس وقت سے آج کے دن تک وہ حضرات فلاسفہ و عرفاء سے دست وگریباں ہیں چنانچہ ان کی کتب وخطوط اور دیگر تحریریں کہ جن میں ان کے اور فلاسفہ وعرفاء کے درمیان ہونے والے علمی مناظروں کی تفصیلات مذکور ہیں ان سے مذکورہ بالا مطالب کی بابت واضح گواہی حاصل ہوتی ہے لہٰذا ممکن ہے اس قائل کے ادعاء کی بنیاد بعض مستشرقین کا وہ بیان ہو جس میں یہ کہا گیا ہے کہ علم فلسفہ کا یونان سے مسلمانوں کی سرزمین کو منتقل ہونا علم الکلام کے وجود میں آنے کا سبب بنا، درحقیقت اس قائل کو ''کلام'' اور ''فلسفہ'' کے معانی ہی معلوم نہیں اور اسے ان دونوں کے اصل واصول اور اہداف سے آگاہی حاصل ہی نہیں، لہٰذا اس نے ان دو مختلف علوم کے اسباب وعوامل پر غور کئے بغیر اظہار خیال کر دیا کہ اس کا ایسا کرنا اندھیرے میں تیر چلا دینے کے سوا کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس سب سے زیادہ تعجب آور بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا دانشور نے اپنے بیان کے تسلسل میں یوں کہا کہ علم الکلام اور علم فلسفہ میں یہ فرق ہے کہ علم الکلام میں جو بحثیں کی جاتی ہیں ان کا محور مبداء ومعاد ہے اور ان کی بابت کی جانے والی بحثوں میں دینی نقطہ نظر ملحوظ رکھا جاتا ہے جبکہ علم فلسفہ ان امور کی بابت اپنی بحثوں میں دینی مؤقف کو ملحوظ نہیں رکھتا۔

اس مطلب کو ذکر کرنے کے بعد اس دانشور نے اسی بات کو دلیل قرار دیتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ منطقی وعقلی اصولوں کو اپنانا دین کے منافی ہے اور اس طرزِ عمل کے سراسر خلاف ہے جسے دینی قواعد وضوابط جائز قرار دیتے ہیں۔

اس دانشور نے اپنے اس بیان کے ذریعے اپنے سابقہ اظہارات کی نسبت زیادہ خرابی پر مشتمل مطالب ذکر کئے ہیں اور ہر وہ شخص جسے ان امور کی بابت آگاہی وبصیرت حاصل ہے وہ اس امر سے بخوبی مطلع ہو سکتا ہے کہ اس دانشور نے علم الکلام اور علم فلسفہ کے درمیان جو فرق ذکر کیا ہے اس کے ذریعے ان کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ علم کلام کی بحثوں میں جن امور وقواعد کے ذریعے استدلال کیا جاتا ہے وہ جدلی قیاسات ہیں جو مسلم الثبوت مقدمات سے ترکیب یافتہ ہوتے ہیں (یعنی مشہورات ومسلمات) کیونکہ ان کے ذریعے مسلمہ مسائل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ جبکہ علم فلسفہ میں ہونے والی بحثوں میں جدلی قیاسات کی بجائے برھانی قیاسات کے ذریعے استدلال کیا جاتا ہے تاکہ حق کا اثبات ہو، نہ کہ اس کا اثبات ہو جو مسلم الثبوت ہے لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ علم الکلام دینی اور علم فلسفہ غیر دینی اور دین سے متصادم ہے اور پھر

اسی بنیاد پر یہ فیصلہ کریں کہ علم فلسفہ کی کسی بات کو درخور اعتناء قرار نہ دیا جائے خواہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

اور جہاں تک اس دانشور کی طرف سے منطق وفلسفہ وعرفان پر کئے گئے اعتراضات کا تعلق ہے تو جو کچھ اس نے علم منطق کے بارے میں کہا اس کا جواب دیا جا چکا ہے اور جو کچھ اس نے فلسفہ کے بارے میں کہا اس کا جواب دیا جا چکا ہے اور جو کچھ اس نے فلسفہ وعرفان کے بارے میں کہا اس کا جواب یہ ہے کہ اس نے جو کچھ فلاسفہ وعرفاء کے بیانات سے سمجھا اور اس کی بابت اظہار رائے کیا اور پھر اسے دین حق سے متصادم ومخالف ثابت کیا تو اس سلسلہ میں ہمارا مؤقف بھی یہی ہے کہ جو بات دین سے متصادم ومخالف ہو وہ باطل ونادرست ہے لیکن کسی فلسفی یا اہل عرفان کی غلط وباطل بات کو اصل علم فلسفہ وعرفان کے حساب میں نہیں لیا جا سکتا کیونکہ عین ممکن ہے کسی علم سے تعلق رکھنے والا شخص اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرے جو کہ دین اور اس کے اصولوں سے متصادم ہو تو اسے کوئی شخص بھی قبول نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے اس علم سے مربوط قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ اس شخص کی اپنی بے بنیاد اور من گھڑت بات شمار ہوگی اور ہم بھی اس امر سے اختلاف نہیں کرتے کہ فلاسفہ وعرفاء کے مسلک کو اختیار کرنے والے بعض حضرات نے غلط وبیہودہ باتیں کی ہیں لیکن ہمارا مؤقف صرف یہ ہے کہ ان کی نادرست باتوں کو خود انہی کی طرف منسوب کیا جائے نہ کہ علم فلسفہ وعلم عرفان کی طرف!

کاش وہ دانشور ان اختلافات پر بھی نگاہ کرتے جو متکلمین کے درمیان رونما ہوئے یعنی اشعریوں، معتزلیوں اور امامیوں کے درمیان جن امور کی بابت اختلاف رائے ہوا ان کی بابت بھی غور کیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ ان اختلافات نے اُمت اسلامیہ کی وحدت واتحاد کو کس طرح پارہ پارہ کیا کہ اسی ابتدائی دور ہی میں (۷۳) فرقے وجود میں آ گئے اور پھر ہر گروہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گیا کہ نتیجتاً ہر گروہ کے خود (۷۳) گروہ بن گئے، تو کیا وہ سب دین کے پیروکار نہیں؟ کیا ان دین کے پیروکاروں کے درمیان پائے جانے والا سنگین ترین اختلافات کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین اسلام ہی صحیح دین نہیں؟ ہرگز نہیں، کوئی محقق اس طرح کی بات نہیں کر سکتا، کیا کسی بات کو اصل دین کی خرابی کا باعث گردانا صحیح ہے یا علمائے دین کی کسی ذاتی غلطی کو دین کے حساب میں ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر فلاسفہ وعرفاء میں سے کسی کی غلطی یا ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو فلسفہ وعرفان کے حساب میں ڈالنا کیونکر قرین صحت قرار پا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا اس دانشور کو چاہیے کہ وہ دین والوں میں پیدا ہونے والے اختلافات کی جو وجہ سمجھے فلسفہ وعرفان والوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو بھی وہی وجہ قرار دے، علم الکلام کے ساتھ ساتھ علم فقہ کی مثال بھی دی جا سکتی ہے کہ اس میں بھی علمائے اسلام کے درمیان شدید اختلافات اور مختلف گروہ پیدا ہوئے اور وہ متعدد فرقوں ومسلکوں میں تقسیم ہو گئے اور پھر ہر گروہ کے افراد میں گوناگوں اختلافات نے جنم لیا، یہی حال دیگر متعدد علوم وفنون کا ہے کہ ان کے علماء کے درمیان بہت زیادہ اختلافات پیدا ہوئے کہ ان اختلافات کو اصل علوم وفنون کے نادرست ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اوراس دانشور نے اپنے تمام بیانات سے جو نتیجہ اخذ کیا کہ تمام علوم وفنون نادرست ہیں اور صرف کتاب وسنت ہی واحد وہ دینی راستہ ہے جسے اختیار کر کے حقائق سے آگاہی حاصل کرنا ممکن ہے ان کے علاوہ کوئی علم صحیح نہیں، یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، ہاں اس کی یہ بات تب قرین صحت قرار دی جاسکتی ہے کہ وہ طریقہ تذکر کو درست مانے، کہ جسے یونانی فلاسفر افلاطون سے منسوب کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر انسان نفسانی خواہشوں کا طوق اپنے گلے سے اُتار کر تقویٰ وروحانی فضائل سے اپنے آپ کو آراستہ کرے اور پھر جس چیز کی بابت اپنے اندر کی دنیا میں نگاہ کرے گا اسے حق مل جائے گا اور اس کے سامنے حق آشکار و واضح ہو جائے گا۔

اس مسلک وطریقہ تذکر کے بارے میں مذکورہ بالا مطلب کو یونان کے بعض قدماء اوران کے علاوہ دوسروں نے بھی اور کئی مسلمان دانشوروں اور فلاسفۂ غرب نے بھی اختیار کیا البتہ اس فرق کے ساتھ کہ جو توجیہی موقف کسی گروہ نے اپنایا دوسرے نے اس سے مختلف صورت میں اسے پیش کیا، یعنی ہر ایک نے اپنے الفاظ وانداز میں اس کی بابت اظہار خیال کیا، مثلاً بعض حضرات نے اس مسلک ونظریہ کی اس طرح تفسیر وتوضیح پیش کی کہ تمام انسانی علوم کا تعلق فطرت بشر سے ہے یعنی وہ سب فطری طور پر ابتداء ہی میں یہ تمام علوم انسان کو حاصل ہوئے اور اب اس کے ساتھ موجود ہیں لہٰذا کسی علم کو جدید ونیا کہنا دراصل اس کی جدید اور تازہ یاد آوری (تذکر) کی وجہ سے ہوتا ہے، بعض حضرات نے اس سلسلہ میں یوں کہا کہ تہذیب النفس اور مادی امور سے دوری اختیار کرنا حقائق کے جلوہ گر ہونے کا سبب بنتا ہے نہ یہ کہ تمام علوم بالفعل انسان کو حاصل ہیں بلکہ وہ سب بالقوۃ ہیں (یعنی انہیں حاصل کرنے کی قوت واستعداد اوران علوم کے انسان کے وجود میں جگہ پانے کی بنیادیں موجود ہیں، علمی اصطلاح میں ان دونوں قسموں کو ''بالقوۃ'' اور ''بالفعل'' کہا جاتا ہے پہلی قسم سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز ممکن ہے اوراس کی اصل وبنیاد واستعداد پائی جاتی ہے جبکہ دوسری قسم سے مراد یہ ہے کہ وہ اب ہی موجود ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص عالم ہے یعنی عالم ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے بالقوۃ کہتے ہیں اور فلاں شخص عالم ہے یعنی اس نے علم حاصل کرلیا ہے اسے بالفعل کہتے ہیں۔ اوران علوم کا جو انسان کے وجود میں بالقوۃ موجود ہیں بالفعل ہونا نفس انسانی کے باطن سے وابستہ ہے جو کہ غفلت کی صورت میں انسان سے الگ اور تذکر و یاد آوری کی صورت میں اس سے جڑا ہوتا ہے، یہ وہ مطلب وموقف ہے جو عرفاء، اہل اشراق اور دیگر اقوام ومذاہب کے پیروکاروں نے اختیار کیا ہے۔

علم فلسفہ وعرفان پر اعتراض والے حضرات میں سے بعض نے مذکورہ بالا موقف کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تقویٰ وشریعت کی پیروی کے علمی وعملی دونوں حوالوں سے اتباع سے مشروط کر دیا یعنی صرف یہ نہیں کہ نفسانی خواہشوں کی پیروی سے دوری اختیار کی جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی وعملی طور پر تقویٰ اور شریعت کے احکام پر عمل کو یقینی بنایا جانا ضروری ہے کہ اس کے بغیر حقائق تک رسائی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا، یہ موقف ہمارے متعدد معاصر علماء اوران کے

علاوہ دیگر حضرات نے پیش کیا اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہی مطلب اصل میں ان کے اور عرفاء و متصوفہ کے درمیان بنیادی فرق پیدا کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرات اس امر سے غافل ہیں کہ ان سے پہلے خود عرفاء نے یہی شرط ذکر کی ہے جیسا کہ ان کی معتبر کتب میں مذکور مطالب سے اس کی تائید و گواہی ملتی ہے، لہٰذا یہ نظریہ بعینہ صوفیوں کا نظریہ ہے اور ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق شریعت کی پیروی اور اس کے اتباع کی کیفیت اور اصل اتباع کے معنی کے حوالہ سے ہے، چنانچہ ان حضرات یعنی شریعت کی پیروی کے دعویداروں کے نزدیک اتباع صرف کتاب و سنت کے ظواہر سے تمسک پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس میں کسی دوسری چیز کا کوئی عمل دخل نہ ہو، گویا ان کا مؤقف و مسلک صوفیوں اور اخباریوں کے مسلکوں کا معجون مرکب ہے۔

یاد رہے ہیں کہ مذکورہ بالا آراء و نظریات کے علاوہ بھی متعدد دیگر آراء زیر نظر موضوع کی بابت پیش کی گئی ہیں اور جہاں تک ''تذکر'' کے مسلک کا تعلق ہے کہ جس کی بابت مختلف توضیحات و تشریحات ذکر کی گئی ہیں اگر اس کے ساتھ منطقی و عقلی اصولوں کی نفی کا پہلو نہ ہو تو اسے کسی حد تک درست قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ انسان اپنے وجود میں آتے ہی حضوری علم کے ذریعے اپنی ذات اپنی وجودی قوتوں اور اپنے وجود میں آنے کے علل و اسباب سے شعوری آگاہی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ایسی قوتیں حاصل ہوتی ہیں جو اس کے حضوری علم کو حصولی علم میں بدل دیتی ہیں (حضوری علم اس علم کو کہتے ہیں جو فطرتاً اسے حاصل ہوتا ہے اور حصولی علم اس علم کو کہتے ہیں جو حواس اور وجودی قوتوں کے استعمال اور عملداری سے اسے حاصل ہوتا ہے) اور اس کے وجود میں پائی جانے والی کوئی قوت ایسی نہیں جو انسان کے وجود پذیر ہوتے ہی اپنی مخصوص علمداری نہ کرتی ہو، بنابرایں انسان اپنے وجود میں آنے کے ابتدائی مرحلہ ہی میں بعض علوم کا حامل ہوتا ہے اگرچہ طبعی طور پر وہ علوم اس سے متاخر ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اگر انسان مادی وابستگیوں سے منہ موڑ لے تو اسے بعض علوم تک رسائی کا حصول ممکن ہوجاتا ہے۔

اور اگر ''تذکر'' کے مسلک و نظریہ سے منطقی و عقلی اصولوں کی طرف رجوع کرنے کی نفی مراد ہو یعنی یوں کہا جائے کہ بدیہی اور متناسب مقدمات کی عملی آمیختگی انسان کے مطلوبہ ہدف تک رسائی کو یقینی بنانے کا سبب نہیں بنتی کہ جس کی بناء پر اسے قوت کے مرحلہ سے فعلیت کے مرحلہ تک پہنچادے، یا یہ کہ نظریہ ''تذکر'' سے مراد یہ ہے کہ لوح نفس کا خواہشات سے مبرا و منزہ ہونا انسان کو مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لئے علمی مقدمات کا سہارا لینے سے بے نیاز کردیتا ہے تو اس طرح کا نظریہ و مؤقف نہایت بے معنی و بے بنیاد اور گھٹیا ترین ہوگا۔

جہاں تک نظریہ ''تذکر'' کے حوالہ سے پہلے مؤقف و معنی کا تعلق ہے کہ جس میں منطقی و عقلی اصولوں کی طرف رجوع کرنے کی نفی ملحوظ ہے تو اس کے نادرست ہونے اور اس قول کے باطل و غلط ہونے کی متعدد دلیلیں ہیں مثلاً:

(۱) انسانی علوم و معارف کی بابت عمیق بحث و تحقیق اس مطلب کو مسلم الثبوت قرار دیتی ہے کہ انسان کے تصدیقی

علوم اس کے تصوری علوم پر موقوف ہوتے ہیں اور تصوری علوم حسی علوم یا ان سے کسی بھی حوالہ سے حاصل ہونے والے معارف میں منحصر ہیں ان کے علاوہ نہیں، (اس موضوع کی مزید وضاحت و تفصیلی بحث ہماری کتاب ''اصولِ فلسفہ'' کے پانچویں مقالہ میں مذکور ہے) اور علمی دلیل و تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو شخص حواس خمسہ میں سے کسی ایک حسّ سے محروم ہو وہ ان تمام علوم سے محروم ہوتا ہے جو اس حسّ (محسوساتی قوت) سے مربوط اور اس تک منتہی ہوتے ہیں خواہ وہ علوم تصوری ہوں یا تصدیقی ہوں، نظری ہوں یا بدیہی ہوں، اور اگر یہ کہا جائے کہ تمام علوم انسان کے قالب الوجود ہیں بالفعل موجود ہیں تو پھر کسی حسّ کا فقدان بے اثر قرار پائے گا یعنی اس محسوساتی قوت کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ مادرزاد نابینا ہر چیز کو دیکھ سکتا ہے اور مادرزاد بہرہ ہر آواز کو سنتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اندھاپن اور بہرہ پن وغیرہ انسان کے اندر موجود علوم کی فعلیت و عملداری میں مانع ہیں تو یہ مؤقف ان حضرات کے اپنے ہی قول و نظریہ سے روگردانی ہوگی کہ جس میں انہوں نے کہا کہ نظریہ تذکر سے مراد مادی وابستگیوں و گراوٹوں سے منہ موڑ کر اپنے نفس و باطن کی طرف رجوع کرنے سے غفلت کے پردے ہٹ جانے کے نتیجہ میں مطلوب تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

(۲) عملی طور پر یہ حقیقت آشکار ہے کہ نظریہ تذکر معدودے چند افراد ہی کے مطلوبہ نتائج کے حصول میں کارمند ثابت ہوا اور وہ بھی اس نظریہ کے قائلین میں سے! ورنہ عامۃ الناس اور بنی نوع انسان کے اکثر افراد اپنے مقاصد حیات میں عام مروجہ طریقوں یعنی علمی و عقلی اصولوں کو اپنا کر اپنے ہزاروں اہداف تک رسائی کو یقینی بناتے ہیں اور یہی صورتحال تمام علوم وفنون میں پائی جاتی ہے لہٰذا ان حقائق و عملی شواہد میں سے کسی ایک کا انکار بھی ہٹ دھرمی ہوگا اور اسے اتفاقیہ امر کہنا نہایت بے بنیاد ہے، ان مطالب سے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ علمی و عقلی اصولوں کو اپنا کر اپنے مطلوبہ مقاصد و نتائج کو حاصل کرنا انسان کا فطری معمول ہے۔ یعنی کسی مجہول و نامعلوم چیز سے آگاہ ہونے کے لئے عقلی مقدمات کا سہارا لینا عام فطری عمل ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور یہ بات محال و ناممکن ہے کہ موجودات میں سے جو چیز بھی فطری و تخلیقی طور پر مخصوص وجودی قوتوں کے پیوستہ نظام سے لیس تو ہو مگر ان قوتوں سے استفادہ کرنے میں ہمیشہ خطا و غلطی کا شکار ہو اور اس کی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(۳) نظریہ تذکر کے قائل حضرات جسے ''تذکر'' سے موسوم کرتے ہیں اس کی برگشت علم منطق ہی کے ترتیبی اصولوں پر مبنی علمی و عقلی مقدمات کی طرف ہوتی ہے کہ اگر ان مقدمات میں سے کوئی ایک بھی اپنی ترتیبی صورت میں خلل کا شکار ہو جائے تو مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات نادانستہ و لاشعوری طور پر منطقی اصولوں کو اپناتے ہیں لہٰذا اسے اتفاقی امر یا ابتدائے آفرینش سے انسانی وجود میں تذکراتی جہتوں کا پایا جانا قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر وہ اپنے مؤقف پر پختہ یقین رکھتے ہیں تو کم از کم ایک عملی نمونہ ہی پیش کر دیں جس میں منطقی اصولوں میں سے کوئی اصول استعمال

نہ ہوا ہو!

اور جہاں تک نظریۂ تذکر کے دوسرے معنی کا تعلق ہے کہ جس میں کہا گیا کہ اس کے ہوتے ہوئے منطقی اصولوں کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں تو اس میں ہمیشہ یا اکثر خطاء وغلطی سے دو چار ہونے کا امکان پایا جاتا ہے، اس نظریہ کی بازگشت دو طریقوں اور اسلوب ہائے عمل کی طرف ہوتی ہے یعنی اگر اس نظریہ کی بناء پر موضوع کا جائزہ لیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ مجہولات سے آگاہی کے دو طریقے ہیں: ایک منطقی طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ تذکر ہے جو شریعت کی عملی پیروی سے عبارت ہے، اور یہ دونوں طریقے حقائق تک رسائی کے حوالہ سے یکساں ہیں یا یہ کہ طریقہ تذکر افضل ومقدم ہے کیونکہ اس سے دائمی طور پر حقائق تک رسائی یقینی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معصوم کے فرمان کے عین مطابق ہوتا ہے جبکہ منطقی و عقلی طریقہ ایسا نہیں یعنی وہ دائمی صورت میں حقائق تک رسائی کو یقینی نہیں بناتا۔

بہر حال اس نظریہ کے باطل و نادرست ہونے پر وہی دوسرا جواب کافی ہے جو نظریہ تذکر کے پہلے معنی کی بابت ذکر ہو چکا ہے کیونکہ کتاب وسنت کے تمام مقاصد ومعارف اور اسرار ورموز کہ جن کا دائرہ بہت وسیع ہے ان سب کا ادراک سوائے معدودے ان چند افراد کے کسی کے بس کا روگ نہیں کہ جو دینی معارف کی بابت تدبر وتفکر کرتے ہوئے نہایت گہرائی میں جاتے ہیں اور پھر ان معارف و معالم کے درمیان پائے جانے والے معنوی ومفہومی ربط و پیوستگی اور اصول وفروع سے مربوط مطالب وحقائق کی آمیختگی کی وسعتوں کو کھنگال کر بنیادی اعتقادات اور انفرادی واجتماعی اعمال کی باریکیوں تک رسائی کو یقینی بنانے میں کوشاں رہتے ہیں، اور یہ بات محال و ناممکن ہے کہ انسان کو تکوینی وتخلیقی یا تشریعی طور پر اس چیز کا مکلف قرار دیا جائے جس کی وہ طاقت و استعداد نہیں رکھتا یا اسے اس امر پر مامور ومجبور کیا جائے کہ وہ نفسانی خواہشات کی زنجیروں کو توڑ کر پاکیزہ صفات سے اپنے آپ کو اس طرح آراستہ کرے کہ کتاب وسنت کے تمام حقائق و اسرار سے آگاہ ہو جائے بنا برایں ہر شخص صرف انہی عام طریقوں کے ذریعے دینی حقائق سے آگاہی حاصل کرسکتا ہے جو شخصی ومعاشرتی زندگی کے امور میں اس کا معمول ہوتے ہیں جو کہ ''معلومات'' کی مخصوص ترتیب کے ذریعے ''مجہولات'' تک رسائی حاصل کرنے سے عبارت ہیں اور یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے بعض دینی معارف وحقائق سے آگاہی حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے۔

اور نظریہ تذکر کے قائل حضرات میں سے بعض کے بیانات واظہارات سے حیرت ہوتی ہے کہ ہماری مذکورہ بالا دلیل جسے نظریہ تذکر کی نفی کے لئے ہم نے پیش کیا ہے انہوں نے اسے نظریہ تذکر کے اثبات اور علم منطق کے رد میں پیش کر دیا اور کہا کہ اگر حقائق و واقعیات سے آگاہی حاصل کرنا منطق وفلسفہ کے ذریعے صحیح ہوتا جو کہ صحیح نہیں تو یہ کام صرف اس علم کے دیوتا ارسطو وابن سینا جیسے حضرات ہی کر سکتے ہیں یہ کام عامۃ الناس کے بس کا روگ نہیں، تو اس صورت میں یہ بات کیونکر قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ شارع صرف منطق وفلسفہ کے اصولوں کو حقائق و واقعیات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے استعمال

کرنے کا حکم دے؟ دراصل انہوں نے اس امر کی طرف توجہ ہی نہیں کی کہ اس کا یہی اعتراض بعینہ خود اس کی اپنی طرف لوٹتا ہے، اور اگر وہ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ تذکر و تذکیہ نفس و تطہیر باطن کے ذریعے حقائق تک رسائی اور واقعات سے آگاہی کا حصول ہر شخص کے لئے ممکن ہے اور جو شخص جس قدر ان امور میں عملی طور پر تقدم کرے گا اتنا ہی اسے حقائق سے آگاہی کے حصول میں کامیابی ہوگی، اس کے جواب میں بعینہ یہی کہا جائے گا کہ علم منطق کے اصولوں سے جس قدر بھی استفادہ کیا جائے گا خواہ کم یا زیادہ اتنا ہی حقائق تک رسائی کا حصول ممکن ہوگا اور یہ کام ہر شخص کی استعداد و قابلیت پر موقوف ہے اور شارع مقدس نے ہر شخص پر واجب قرار نہیں دیا کہ وہ حقائق کی آخری حد تک جائے اور اپنی صلاحیت و استعداد اور طاقت و قابلیت سے زیادہ عمل کرے۔

اس کے علاوہ ان کے بیان کے نادرست ہونے کی دوسری دلیل سابق الذکر تیسرا وہ اعتراض ہے جو ہم نے نظریہ تذکر کے قائل حضرات پر کیا ہے کیونکہ وہ حضرات اپنے مؤقف کی صحت بلکہ ہر وہ کام جسے تذکر کے مسلک کی بنیاد پر انجام دیتے ہیں اس میں منطق ہی کا سہارا لیتے ہیں اور علم منطق ہی کے اصولوں کو اپناتے ہیں جیسا کہ اس حوالہ سے مربوط مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ان حضرات نے منطق کے اصولوں کی نفی اور طریقہ تذکر کے اثبات میں بھی علم منطق ہی کے اصولوں کا سہارا لیا جو کہ ان کے مؤقف و مدعا کے غلط ہونے کا سب سے بڑا اور کافی ووافی ثبوت ہے۔

ان حضرات کے مؤقف و مدعیٰ کے نادرست ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر کسی نظریہ و مسلک کے غلط ہونے کی دلیل صرف یہ ہو کہ اس میں خطا کا وقوع پذیر ہونا زیادہ ہوتا ہے تو اس حوالہ سے نظریہ تذکر بھی نادرست قرار پائے گا کیونکہ اس میں خطاء و غلطیوں کا وقوع پذیر ہونا مسلم الثبوت بلکہ بہت زیادہ ہے کیونکہ ان حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ طریقہ تذکر کو سلف صالح اور بزرگان دین نے اختیار کیا اور انہوں نے منطق کو نہیں اپنایا، حالانکہ ان بزرگوں اور سلف صالح کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے اختلافات اور غلطیاں کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں جیسا کہ متعدد صحابہ کرام کے بارے میں معتبر کتب میں منقول ہے جبکہ ان کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جن کے علم اور کتاب و سنت کی پیروی کرنے پر اہل اسلام کا اتفاق رائے ہے یا اکثریت کی ان کی فقاہت و عدالت پر بھی متفقہ رائے ہے یا اسی طرح آئمہ اطہار علیہم السلام کے بعض اصحاب بھی ایسے ہیں جن کے علم و فقاہت اور عدالت کے بارے میں دو آراء نہیں پائی جاتیں مثلاً ابوحمزہ، زرارہ، ابان، ابوخالد، ہشام بن حکم، ہشام بن سالم، مؤمن طاق، صفوان اور ان کے علاوہ دیگر حضرات تو ان کے درمیان بھی بنیادی مسائل میں اختلاف رائے کا پایا جانا کسی سے پوشیدہ نہیں جبکہ یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ جب دو افراد کی آراء ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو حق یقیناً ان میں سے ایک کے ساتھ ہوگا یعنی ایک کی بات صحیح اور دوسرے کی غلط ہوگی، یہی حال قدیم فقہاء و محدثین کا ہے مثلاً کلینیؒ، صدوقؒ، شیخ الطائفہ (طوسیؒ)، مفیدؒ، سید مرتضیٰؒ اور ان کے علاوہ دیگر حضرات! (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم) تو اس صورتحال

کے تناظر میں نظریہ تذکر کی منطقی اصولوں پر کونسی امتیازی خصوصیت باقی رہتی ہے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی دوسری امتیازی خصوصیت تلاش کی جائے کہ جو نظریہ تذکر کے علاوہ ہو اور اس کے ذریعے حق و باطل کے درمیان تمیز ممکن ہو، اور علم منطق کے علاوہ کوئی راستہ ایسا نہیں باقی رہتا جس کے ذریعے حق و باطل کے درمیان تمیز ممکن ہو سکے لہٰذا وہی حقیقی راستہ ہے جسے ہر شخص اپنائے اور اس کے ذریعے حق کو پہچاننے کی کوششوں کو یقینی بنائے۔

نظریہ تذکر کے نادرست ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ ان حضرات کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر معصومین علیہم السلام کے دامن سے پیوستہ و وابستہ ہوں تو ہر طرح کی خطاء و غلطی سے محفوظ ہوں گے یعنی جو شخص ان ہستیوں کی قولی و عملی پیروی کرے اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی، اس استدلال کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ جو شخص کوئی بات کسی معصومؑ سے خود سنے اور اس کی بابت اسے پختہ یقین ہو کہ اس سے معصومؑ کا مقصد و مراد یہ ہے تو یقیناً اس میں کوئی غلطی نہ ہوگی، اس حوالہ سے تو کسی کو بھی اعتراض یا بحث کی گنجائش نہیں، حقیقت میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ امام معصومؑ سے براہِ راست سنی ہوئی بات یا ان کے ارشاد گرامی قدر سے سمجھی جانے والی بات نہ تو اصل نظریہ تذکر ہے اور نہ ہی اسے علم منطق قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ اصل حقیقت کا علمی و یقینی مشاہدہ ہے کہ اس کی بنیاد پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ معصومؑ کا فرمان ہے اور معصومؑ کا ہر فرمان حق ہے لہٰذا یہ حق ہے، تو یہی منطقی اصول ہے کہ جس کا نتیجہ قطعی و یقینی ہوتا ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ موارد کہ جن میں امام معصومؑ سے براہِ راست کوئی بات نہ سنی ہو بلکہ خبر واحد (کسی ایک راوی) یا اس جیسے دیگر کسی ذریعہ سے معصومؑ کا بیان ہم تک پہنچا ہو تو اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ''ظن'' حاصل ہوتا ہے (''ظن'' یعنی گمان، صحیح ہونے کا فکری جھکاؤ)

جس کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی ''خبر واحد'' (کسی ایک راوی کے بیان) کو احکام کے علاوہ حجت قرار دینے کی کوئی دلیل پائی جاتی ہے اور احکام میں بھی صرف اس صورت میں اسے دلیل قرار دینا درست ہے جب وہ قرآنِ مجید سے موافق ہو، لیکن اگر وہ کتاب اللہ سے موافق نہ ہو یا کسی علمی دلیل کی بناء پر اس کے نادرست ہونے کا یقین حاصل ہو جائے تو اس کی کوئی وقعت و حیثیت باقی نہیں رہتی اور اسے ''دلیل'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۹) علم منطق و فلسفہ پر اعتراض کرنے والے حضرات میں سے بعض نے اپنے مؤقف کی صحت پر یوں استدلال کیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں ہمارے ساتھ اسی طرح کلام کیا جو ہمارے ہاں یعنی افرادِ بشر کے درمیان معمول ہے اور اسی ترتیب و ترکیب کو استعمال فرمایا جو اہل زبان (عرب) کے درمیان معروف و رائج ہے، کلامِ الٰہی میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق امر و نہی اور وعدہ و وعید سے ہے یا قصص و واقعات اور وعظ و نصیحت یا احسن انداز میں بحث و تمحیص سے ہے وہ ظاہر الفاظ سے واضح ہے اور وہ ایسے امور نہیں جن کے سمجھنے اور تعقل کرنے میں ہمیں علم منطق و فلسفہ اور دیگر ان اصول و ضوابط کی ضرورت ہو جو کفار و مشرکین اور ظالموں نے بنائے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان سے دوستی کرنے۔ ان کا سہارا

لینے، ان کے طرزِ عمل کو اپنانے اور ان کا راستہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے لہٰذا کسی بھی دیندار اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان والے شخص پر اس کے علاوہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ دینی بیانات کے ظواھر سے تمسک کرے اور ان سے وہی مطالب مقصود قرار دے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں کہ ان کی بابت تأویلوں وغیرہ کی راہ لے اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی دوسرے اصول وضابطہ کو اپنائے، یہ وہ قول ہے جسے نظریہ تذکر کے قائل حضرات میں سے ان لوگوں نے پیش کیا ہے جنہیں ''حشویہ'' اور ''مشبہہ'' کہا جاتا ہے اور بعض محدثین نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔

لیکن یہ قول نہ تو مطالب کے لحاظ سے صحیح ہے اور نہ ہی استدلالی ترکیب وترتیب کے لحاظ سے درست ہے جہاں تک اس کی استدلالی ترکیب وترتیب کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے اس لئے قرین صحت نہیں کہ اس میں خود منطقی اصول استعمال کئے گئے ہیں جبکہ اس سے ان اصولوں کے استعمال کی نفی ان کا مقصود ہے۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مجید منطقی اصولوں کے استعمال کی ہدایت کرتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ علم منطق حاصل کرے، لیکن ہمارا مدعا یہ ہے کہ علم منطق کے اصولوں کو اپنانا ناگزیر ہے کہ اس کے علاوہ حقائق تک رسائی کا کوئی چارۂ کار ہی نہیں، اور جو حضرات علم منطق کے اصول استعمال کرنے کے حق میں نہیں بلکہ اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو یہ کہے کہ قرآن مجید ہمیں دینی مقاصد سے آگاہی دلانا چاہتا ہے لیکن ہمیں عربی زبان سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کا ورثہ ہے اس طرح کی باتوں کی کوئی حیثیت ووقعت نہیں کیونکہ زبان خواہ کوئی بھی ہو ایک وسیلہ ہے جس کی ضرورت طبعی طور پر اپنے مقاصد دوسروں تک پہنچانے میں ناقابل انکار ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اور حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت کے بیان میں اسے استعمال کیا لہٰذا عربی زبان کا سیکھنا ضروری و ناگزیر ہے، یہی حال علم منطق کا ہے کہ انسان کو طبعی وفطری طور پر کسی چیز کے فہم وتعقل میں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت میں استعمال فرمایا ہے یعنی منطقی اصولوں کی عملداری کے واضح نمونے قرآن وسنت میں پائے جاتے ہیں۔

اور جہاں تک ان کے استدلال کے مطالب ومواد کا تعلق ہے تو وہ اس لحاظ سے نادرست ہے کہ خود انہوں نے اپنے استدلال ہی میں عقلی اصولوں کو اپنایا ہے لیکن وہ اس سلسلہ میں مغالطہ وغلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور وہ اس طرح سے کہ انہوں نے کلام کے ظواھر اور ان کے مصادیق کے درمیان فرق کو نہیں سمجھا بلکہ دونوں کی بابت یکساں معنوی وحدت قرار دی، یعنی الفاظ اور معانی ومفاھیم کے تطبیقی موارد میں فرق ہی نہیں کیا جس کے نتیجہ میں غلط فہمی اور پھر غلطی کا شکار ہو گئے مثلاً جو بات کسی مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جو کتاب اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ یہ ہے کہ جہاں علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، کلام، مشیت، ارادہ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے ان کے مقابل الفاظ کے معانی سمجھے یعنی جہل، عجز، موت، بہرہ پن، اندھا پن

وغیرہ، علم بمقابلہ جہل، قدرت بمقابلہ عجز، حیات بمقابلہ موت وغیرہ (ان الفاظ سے وہ معانی قرار دے جس کا تقابل ان کے متضاد الفاظ کے معانی سے ہوتا ہے) لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہمارے ہی علم جیسا علم اور ہماری قدرت جیسی قدرت ہماری حیات جیسی حیات اور ہماری سماعت و بصارت وکلام ومشیت وارادہ جیسے امور ثابت کرنا چاہے تو ایسا کرنا نہ تو کتاب وسنت کی رو سے اسے روا ہے اور نہ ہی عقل ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے، اس سلسلہ میں بعض مربوطہ مطالب المیزان جلد ۳ میں محکم اور متشابہ کی بحث کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں (ملاحظہ ہو: المیزان جلد ۳ صفحہ ۹۵)

(۱۰) علم منطق وفلسفہ پر اعتراض کرنے والے بعض حضرات نے کہا ہے کہ عقلی دلائل سے جن مقدمات ومطالب کے حجت ہونے کا ثبوت ملتا ہے ان کی صحت خود ایک مقدمہ عقلیہ پر مبنی ہے کہ جس میں عقلی فیصلہ کی پیروی کو واجب وضروری قرار دیا گیا ہے اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ عقل کے فیصلوں کا حجت ودلیل قرار پانا خود عقل ہی سے ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ صریح "دَور" ہے۔ "دَور" (دال پر زبر کے ساتھ) سے مراد یہ ہے کہ پہلی چیز کا ثابت ہونا دوسری چیز کے ثابت ہونے پر اور دوسری چیز کا ثابت ہونا پہلی چیز کے ثابت ہونے پر موقوف ہو مثلاً الف کا وجود ب کے وجود پر اور ب کا وجود الف کے وجود پر موقوف ہو، یہ محال و ناممکن ہے لہٰذا اختلافی مسائل میں تقلید کی بجائے ضروری ہے کہ معصومؑ کے قول وفرمان کی طرف رجوع کیا جائے خواہ وہ نبی ہوں یا امامؑ ہوں۔

یہ بات زیر بحث موضوع کی بابت پیش کی گئی آراء میں سب سے زیادہ پست و بے بنیاد ہے کیونکہ اس رائے کے ذریعے جس مطلب کا اثبات مراد تھا اسی کی نفی کر دی گئی گویا عمارت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں مگر بنیادوں سمیت عمارت ہی منہدم کر دی اور وہ اس طرح سے کہ انہوں نے عقل کے فیصلوں کو اپنے خیال میں "صریح دَور" کی بنیاد پر نادرست ثابت کرنا چاہا مگر جب شریعت کے احکام کی بات آئی تو عقل کے فیصلہ سے تمسک اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا کیونکہ اس مرحلہ میں ان کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ وہ شرعی احکام کے لئے یا عقل کے فیصلہ کے ذریعے استدلال کریں جو کہ "دَور" ہے یا خود شریعت کے فیصلہ کو دلیل بنائیں تو یہ بھی "دَور" ہے ان دونوں صورتوں میں وہ خود پھنس گئے کہ کیا راستہ اختیار کریں یعنی عقل کے فیصلہ کو مانیں جبکہ اس کی نفی ان کا مدعا ہے یا شرع کے فیصلہ کو بنیاد قرار دیں تو کس دلیل کے ساتھ؟ لہٰذا ان کے سامنے سوائے تقلید کے کوئی راستہ باقی نہیں جو کہ بجائے خود ایک حیرت وعدم توازن ہے، اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات کو "عقل کے فیصلہ کی پیروی کے واجب وضروری ہونے" کے معنی کی بابت غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اگر عقل کے فیصلہ کے ضروری و واجب ہونے سے مراد اس کا وہ معنی ہو جو ممنوعیت واباحت کے مقابلے میں آتا ہے کہ جس کی خلاف ورزی پر مذمت یا عقاب وسزا کا تعین ہوتا ہے جیسا کہ کسی شفیق ومہربان شخص کی نصیحت پر عمل کرنے کا واجب وضروری ہونا ہے کہ اس کی خلاف ورزی مذمت کا سبب بنتی ہے اور فیصلہ کرنے میں عدل وانصاف قائم کرنے کا واجب وضروری ہونا ہے کہ اس کی خلاف ورزی مذمت وعقاب کا موجب

ہوتی ہے تو اس طرح کے امور دراصل "عقلِ عملی" کے باب سے ہیں کہ اس میں دو آراء نہیں پائی جاتیں بلکہ ہم سب اس پر متفق ہیں اور اگر عقل کے فیصلہ کی پیروی کے واجب وضروری ہونے سے مراد یہ ہو کہ انسان جب کسی چیز کے اثبات پر عملی مقدمات وصحیح علمی صورت کے ساتھ تمام مربوطہ امور پر کامل وہمہ گیر نظر کرتے ہوئے استدلال کرے تو اس کے لئے اس سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو تسلیم کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور یہ ایک واضح امر ہے کہ جس کی گواہی وجدانی ہے اور اس وقت یہ سوال قطعاً بے معنی ہے کہ عقل سے اس کے حجت ہونے کی دلیل پوچھی جائے کیونکہ اس کا حجت ہونا بدیہی امر ہے اور وہ دیگر بدیہی امور کی طرح ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بدیہی امر کا حجت ہونا خود اس کے اپنے حوالہ سے ہوتا ہے یعنی وہ کسی دوسری حجت ودلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔

(۱۱) منطق پر اعتراض کرنے والوں میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ علم منطق سے زیادہ سے زیادہ جو کام لیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ وہ (منطق) موجودات ہستی کی ثبات ودوام صفت ماہیات سے آگاہی کے حصول کو یقینی بنائے اور یہ کہ کلی و دائمی اور ثبات صفت مقدمات واصولوں کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل ہوسکیں، جبکہ عصر حاضر کی علمی تحقیق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نہ تو کلیت رکھتی ہے اور نہ ہی دوام وثبات کی حامل ہے نہ ہی عالم الخارج میں اور نہ ہی عالم ذہن میں بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ ہر شے تغیر وتبدل کے عمومی نظام کے ساتھ وابستہ ہے اور کوئی چیز بعینہ اپنی حالت پر ثابت یا دائم یا کلی صورت میں باقی نہیں رہتی۔

یہ قول اس وجہ سے نادرست ہے کہ اس میں اپنائے گئے طرزِ استدلال اور استدلالی مطالب میں دونوں لحاظ سے منطقی اصولوں سے کام لیا گیا ہے کہ اس سے ہر وہ شخص بخوبی آگاہ ہوسکتا ہے جو ان کے استدلال کی بابت اچھی طرح غور وفکر کرے اس کے علاوہ یہ کہ اعتراض کرنے والے کا مقصد یہ ہے کہ اس اعتراض کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ قدیم علم المنطق یقیناً غلط ہے اور یہی بات بجائے خود ایک کلی، دائم وثابت نتیجہ ہے جو ثبات کے حامل مفاہیم پر مشتمل ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو استدلال کرنے والے کو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ بنابراین اعتراض کرنے والوں کا اعتراض خود ہی اپنے آپ کو نادرست قرار دیتا ہے۔

مذکورہ بالا گیارہ اعتراضات اور ان کے جوابات کے طویل سلسلہ نے ہمیں شاید ہمارے اصل موضوع یعنی تفسیر سے کچھ دور کردیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے ہی موضوع کی طرف لوٹیں کیونکہ ہم نے اس کتاب میں اپنا اصل مقصود تفسیری بحثوں ہی کو قرار دیا تھا اور اب اسی کی طرف لوٹتے ہیں:

قرآن مجید انسانی عقلوں کو ان کے فطری اصول سے کام لینے اور ان کے طبعی طور پر مانوس طریقہ کو اختیار کرنے کی راہ دکھاتا ہے اور وہ اصول وطریقہ یہ ہے کہ معلومات کے ذریعے مجہولات سے آگاہی حاصل کی جائے، انسانی عقلیں اس

فطری اصول پر استوار ہیں کہ حقیقی یقینی مقدمات کو استعمال کر کے تصدیقی واقعی معلومات کا حصول یقینی بنایا جائے کہ اس طریقہ کو علم منطق میں ''برھان'' کہا جاتا ہے، اسی طرح انسانی عقلیں فطری طور پر اس اصول پر استوار ہیں کہ جن چیزوں کا تعلق عمل سے ہے اور اس سے سعادت یا شقاوت، خیر یا شر، نفع یا نقصان اور مناسب وموثر یا نامناسب وغیر موثر نتائج سامنے آتے ہیں ان تمام امور سے جو کہ ''امورِ اعتباریہ'' کہلاتے ہیں ایسے مقدمات و بنیادی خطوط ترتیب دے جن میں مدمقابل کو خاموش و مطمئن کر سکے کہ اس طریقہ کو علم منطق میں ''جدل'' کہتے ہیں، اور یہ بات بھی انسانی عقلوں کو ان کے فطری اصول سے استفادہ کرنے کی راہ دکھانے کے باب سے ہے کہ وہ خیر وشر کے احتمالی موارد میں ان مقدمات کو بنیاد بنائے جو نہ تو یقینی ہیں اور نہ ہی امور اعتباریہ میں سے ہیں بلکہ ظنی وقوی امکانی جہت کے حامل ہیں تاکہ اس طرح ممکنہ خیر تک رسائی یا ممکنہ شر سے دوری اختیار کرنے کا راستہ مل سکے، کہ اس طریقہ کو علم منطق میں ''موعظہ'' کہتے ہیں، ان تینوں طریقوں کا جامع بیان درج ذیل آیہ مبارکہ میں ان الفاظ میں ہوا:

O سورۂ نحل، آیت ۱۲۵

''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ''

(اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ، اور ان کے ساتھ احسن انداز میں جدال کرو)

اس میں حکمت سے مراد بظاہر وہی ''برھان'' ہے جس کے بارے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ علم منطق کے اصولوں میں سے ایک ہے جیسا کہ اس کا اشاراتی ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس کے تقابل میں ''موعظۂ حسنہ'' اور ''جدال'' کو ذکر کیا گیا ہے جو کہ علم منطق کے اصولوں میں سے ہیں۔

اس مقام پر ممکن ہے کہ آپ یہ کہیں کہ منطقی طرزِ تفکر پر سب کو دسترس حاصل ہے خواہ وہ کافر ہوں یا مؤمن ہوں، فاسق ہوں یا متقی ہوں، تو اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ کا اہل تقویٰ و دینداروں کے علاوہ دیگر افراد سے اس کی نفی کرنے کا کیا معنی ہوگا؟ اور یہ کہنے سے کیا مراد لیا جا سکتا ہے کہ کافر و فاسق صحیح علم و تذکر سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

O سورۂ المومن، آیت ۱۳

''وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ''

(اور کوئی تذکر و نصیحت حاصل نہیں کر سکتا سوائے اس شخص کے جو اللہ کی طرف پلٹ آئے)

O سورۂ طلاق، آیت ۲

''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا''

(اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے خدا اس کے لئے راہِ نجات وسعادت قرار دیتا ہے)

○ سورۂ نجم، آیت ۲۹۔۳۰

''فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى''

(پس آپ اس شخص سے منہ موڑ لیں جو ہمارے ذکر سے روگردانی کرے اور دنیاوی زندگی کے علاوہ کچھ بھی نہ چاہے کہ ایسے لوگوں کے علم کی حد یہی ہے، یقیناً آپ کا پروردگار ہر اس شخص سے بخوبی آگاہ ہے جو اس کے راستہ سے بھٹک جائے اور وہ اس شخص کو بھی بخوبی جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہے)

ان آیات کے علاوہ وہ روایات بھی کثرت سے موجود ہیں جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ سودمند علم صرف وہ ہے جو عمل صالح کے ذریعے حاصل ہو،

اس بات کا جواب یہ ہے کہ کتاب وسنت کے علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس میں کسی طرح سے شک کی گنجائش نہیں پائی جاتی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تقویٰ کو یا تقویٰ اور تذکر دونوں کو حقائق تک رسائی کے لئے مستقل راستہ قرار دیا گیا ہے جو کہ اس فطری طرزِ تفکر سے مختلف اور علاوہ ہے جو عام طور پر انسان کا معمول ہے کہ جس کے بغیر اس کی زندگی کے امور چل ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ سب دلائل واستدلالات بے معنی و بے مقصد ہو جاتے جو قرآنِ مجید میں کفار ومشرکین اور حق کی پیروی نہ کرنے والوں یعنی فاسقوں وفاجروں کے خلاف ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ اس مفروضہ کی بناء پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کافر وفاسق لوگ تقویٰ وتذکر کا معنی ومطلب ہی نہیں سمجھ سکتے یعنی وہ جب تک کفر وفسق کی حالت میں ہیں وہ تقویٰ وتذکر کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر ہی نہیں سکتے اور اگر ان کی یہ حالت بدل جائے تو پھر ان کے ساتھ بحث کرنا اور انہیں موردِ مذمت قرار دینے کا مورد ہی باقی نہ رہے گا، یہی صورتحال سنت کے حوالہ سے ہے کہ روایات میں مختلف گمراہ فرقوں کے پیروکاروں سے استدلالی بحث اور انہیں موردِ مذمت قرار دیا گیا ہے جبکہ وہ تقویٰ و تذکر سے عاری ہیں کہ انہیں ان کے معانی ومفاھیم کا ادراک ہی نہیں یا یہ کہ گمراہی کے زندان سے باہر آنے کے بعد ان سے بحث وجدال کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ وہ ہدایت یافتہ ہوتے ہیں۔

بنابر ایں تقویٰ کا ضروری قرار دیا جانا نفس انسانی کو انحرافی راستوں سے دور کر کے فطری استقامت کی طرف لوٹانے کی غرض سے ہے، اس مطلب کی مزید وضاحت یوں ہے کہ انسان جسمانی طور پر ان دو متضاد قوتوں کا حامل ہے جو حیوانی اور درندہ جانوروں والی ہیں کہ ان دونوں کا مرکز مادی بدن ہے اور ان میں سے ہر قوت اپنا مخصوص شعوری عمل کرتی ہے کہ اس میں وہ کسی دوسری قوت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ اپنی استقلالی حیثیت میں اپنی عملداری کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی

عملداری میں کسی دوسری قوت کی پرواہ نہیں کرتی، البتہ صرف اس صورت میں اپنی عملداری سے رک جاتی ہے جب اسے کسی ایسی چیز کا سامنا ہو جو اس کی عملداری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے مثلاً غذا طلبی انسان کو کھانے پینے کی طرف راغب کرتی ہے اور اس حوالہ سے اس قوت کی طرف سے کوئی حد یا اندازہ مقرر نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ معدہ اسے ایک حد و اندازہ سے زیادہ آگے نہیں جانے دیتا، یا یہ کہ زیادہ کھانے سے اس کا منہ اس قدر تھک جاتا ہے کہ پھر کوئی چیز چبانا اس کے بس میں نہیں رہتا، تو یہ وہ امور ہیں جن کا مشاہدہ ہم اپنے نفوس میں ہمیشہ کرتے ہیں۔

اس صورتحال میں اگر کوئی شخص اپنی کسی جسمانی قوت کا اسیر ہو جائے اور اس کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کا عادی بن جائے تو وہ قوت اسے ہر طرح سے اپنے شکنجے میں جکڑ دے گی کہ اس کے نتیجہ میں اس قوت کی مد مقابل دوسری قوت محکوم و مغلوب ہو جائے گی یا اپنی مطلوبہ عملداری نہ کر پائے گی، مثلاً غذا خوری یا جنسی عمل میں افراط سے کام لینا انسان کو زندگی کے دیگر اہم ترین امور سے روک دیتا ہے کہ وہ کام کاج و دوسروں سے میل جول اور گھریلو ذمہ داریوں اور اولاد کی تربیت جیسے ان تمام شخصی و معاشرتی لازمی امور کی انجام دہی سے قاصر رہتا ہے جن کا انجام دینا اس کی زندگی کے بنیادی فرائض میں شامل ہوتا ہے، یہی حال دوسری قوتوں مثلاً شہوانی و غضبانی قوتوں کی بابت ہے کہ ان کا اسیر ہونا انسان کو اس کی بنیادی حیاتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے چنانچہ ان قوتوں کی عملداری کے حوالہ سے ہم اپنے اور دیگر ہمنوع افراد کے روزمرہ کے معمولات میں عملی طور پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ افراطی طرزِ عمل اپنانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے افراطی و تفریطی طرزِ عمل سے انسان کی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انسان ایسی مخلوق ہے جسے ان مختلف قوتوں کو تسخیر کرنے کی طاقت حاصل ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ان تمام قوتوں سے کام لیتے ہوئے اپنی دنیا و آخرت کی زندگی کو سعادتمند بنانے میں کامیاب ہو سکے، کہ اسے ہی علمی کمالی زندگی قرار دیا جا سکتا ہے، لہٰذا انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ ان قوتوں میں سے ہر ایک کی عملداری کو اس کے مخصوص دائرہ میں قرار دے کہ جس سے دوسری قوتوں کی عملداری متاثر یا سرے سے ختم نہ ہونے پائے۔

ان مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کی انسانیت اس صورت میں تمامیت و کمالیت کے ساتھ جلوہ گر ہوگی جب وہ اپنی مختلف وجودی قوتوں کی عملداری کے خطوط اس طرح مرتب کرے کہ ان میں سے ہر قوت اپنی جائز و مناسب حد میں رہے اور افراط و تفریط سے دوچار ہونے کی بجائے درمیانی راہ پر قائم ہو، اور اسی اعتدالی صفت کو جو ہر قوت میں مقصود و مطلوب ہے کہ جسے ہم اس قوت کی فضیلت سے موسوم کرتے ہیں مثلاً حکمت، شجاعت، عفت و پاکدامنی وغیرہ، کہ ان سب کا جامع نام ''عدل'' ہے۔

اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انسان جن افکار کا حامل ہوتا ہے اور اس کے انسانی علوم و معارف میں جس قدر

وسعت پیدا ہوتی ہے وہ انہی شعوری قوتوں کی عملداری وطلبگاری کا نتیجہ ہے اور وہ اس طرح کہ اپنی ابتدائے خلقت اور وجود میں آنے کے پہلے مراحل میں اس کے پاس ان وسیع علوم ومعارف میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اس کی باطنی واندرونی قوتیں اپنی احتیاجات وضرورتوں کا شعوری احساس پیدا کرتی ہیں اور اسے اپنی چاہتوں اور مطلوبات کی طرف رغبت دلاتی ہیں یہی ابتدائی شعور واحساسات انسانی علوم کا سرچشمہ قرار پاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ انسان ان میں تعیم وتخصیص اور ترکیب وتفصیل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ انسانی افکار وآراء اور نظریات وعقائد کی تدوین وصورتگری کے مراحل پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔

اسی مرحلہ میں عقلمند و بیدار فکر شخص کو محسوس ہوتا ہے کہ کسی انسان کو اپنی متضاد وجودی قوتوں میں سے کسی ایک قوت کا گرویدہ ہونا اور اپنی تمام تر فکری وعملی توجہات اسی پر مرکوز کرنا اس کے افکار ومعارف میں انحراف وکجروی کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اس قوت ہی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے کہ اسے ہی دیگر تمام قوتوں پر مقدم کرنے اور ترجیح دینے ہی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اسی کی زلفوں کا اسیر ہو کر اس کے علاوہ دوسری تمام قوتوں کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے چنانچہ اس حقیقت پر عملی تجربات گواہی دیتے ہیں کہ اسی انحراف وکجروی کا مشاہدہ ہم ان افراد میں کرتے ہیں جو شہوت رانیوں میں حد سے تجاوز کے مرتکب ہوتے ہیں اور اسی طرح ان لوگوں میں بھی اس کی مثالیں ونمونے دیکھنے میں آتے ہیں جو انسانی معاشرہ میں جبر واستبداد اور ظلم وفساد پھیلا کر عمومی زندگی کا نظام درہم برہم کر دیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو شہوتوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور لہو ولعب، شراب وکباب اور رقص وسرور وجنسی لذتوں کے نشہ میں غرق ہونے کی وجہ سے انسانی فرائض کی ادائیگی کے بارے میں سوچ بچار ہی نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی اہم ترین ذمہ داری کو پورا کرنے کی صلاحیت ان میں باقی رہتی ہے، ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ شہوت پرستی ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور خلوت وجلوت سمیت تمام حالتوں میں اپنی مخصوص جسمانی خواہشوں کو پورا کرنے میں سرگرم رہتے ہیں، یہی حال ان سرکشوں اور ستمگروں وسنگدلوں کا ہے کہ ان کے دلوں میں نرمی وشفقت اور رحمدلی وانکساری جیسے پاکیزہ اوصاف جگہ ہی نہیں کر پاتے یہاں تک کہ جن امور میں ان اوصاف کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے ان میں بھی وہ ان سے عاری ہوتے ہیں، ان کی زندگی ان کے باطنی خبث وگندے پن کی مجسم تصویر بن جاتی ہے کہ جس کا ثبوت ان کے بولنے اور خاموش رہنے، دیکھنے اور نظریں پھیر لینے، آنے اور جانے سمیت تمام حالتوں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے، وہ سب کے سب اپنے علوم میں غلط راہ پر گامزن ہیں اور ان میں سے ہر گروہ اپنے من گھڑت انحرافی وتحریفی افکار سے دل لگائے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز سے غافل ہے جبکہ اس کے علاوہ مفید علوم اور صحیح وبرحق انسانی معارف کا وسیع سلسلہ موجود ہے، لہٰذا یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ مفید علوم اور صحیح وبرحق معارف اسی صورت میں انسان کو حاصل ہو سکتے ہیں جب وہ پاکیزہ اخلاق اور عظیم الشان انسانی فضائل سے آراستہ ہو اور یہی اصل تقویٰ ہے۔

مذکور بالا مطالب سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں جو اچھے و پاکیزہ اخلاق کو انسانی وجود میں جگہ دیتے ہیں اور پاکیزہ اخلاق مفید علوم، برحق و حقیقی معارف اور صحیح افکار ونظریات کی بقاء وحفاظت کو یقینی بناتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت مسلم الثبوت و ناقابل انکار ہے کہ اس علم میں کوئی خیر وخوبی نہیں پائی جاتی جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

بہرحال مذکورہ بالا بحث کو ہم نے ایک علمی واخلاقی قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے کیونکہ اس موضوع کی بابت وضاحت کی اشد ضرورت تھی البتہ ان تمام مطالب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں ایک ہی جامع جملہ میں یوں بیان فرمایا: ''وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ'' (اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو)، سورۂ لقمان، آیت ۱۹۔ یہ جملہ دراصل زندگی کے سفر میں درمیانی راہ وروش اپنانے کی طرف لطیف کنایہ ہے کہ افراط وتفریط کی بجائے درمیانی راستہ اپنانا چاہیے اس کے علاوہ دیگر آیات میں یوں ارشاد ہوا:

- سورۂ انفال، آیت ۲۹

''اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا''

(اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو تو اللہ تمہارے لئے فرقان (حق و باطل اور صحیح وغلط کے درمیان تمیز کرنے کی راہ و صلاحیت) قرار دے گا)

- سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۷

''وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ''

(اور تم زادِ راہ بناؤ، یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، اور تم صرف میرا تقویٰ اختیار کرو اے صاحبانِ عقل!)

اس سے مراد یہ ہے کہ چونکہ تم صاحبان عقل ہو لہٰذا تمہیں اپنی عقلوں سے کام لینے کے لئے تقویٰ کی ضرورت ہے (واللہ اعلم)

- سورۂ شمس، آیت ۷ تا ۱۰

''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا''

(اور قسم ہے نفس کی اور اس کی کہ جس نے اسے آراستہ کیا، (صحیح سمت دی) پھر اس نفس کو اس کا فجور اور اس کا تقویٰ (دونوں) سمجھا دیئے بے شک، جس نے نفس کو پاکیزہ رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گندہ وآلودہ کیا وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا)

- سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۰

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ''

(اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو تا کہ کامیابی سے ہمکنار ہوسکو)

ان آیات کے مقابلے میں ان کا دوسرا رخ واضح کرنے کے لئے یوں ارشاد الٰہی ہوا:

○ سورۂ مریم، آیت ۶۰

''فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا''

(پھر ان کے بعد ان کی جگہ پر وہ لوگ بیٹھے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشوں و شہوتوں کے تابع ہو گئے، ایسے لوگ بہت جلد گمراہی و سرگردانی کا شکار ہوں گے سوائے اس شخص کے کہ جو توبہ کرے اور ایمان لا کر عمل صالح بجالائے)

اس آیت میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ شہوتوں کی پیروی کرنا گمراہی و بے راہ روی کا سبب بنتا ہے،

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۴۶

''سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِيَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَ اِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَيِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ''

(میں بہت جلد ان لوگوں کو اپنی آیتوں سے دور کر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اگر کسی آیت کا مشاہدہ کریں تو اس پر ایمان نہ لائیں اور اگر رُشد و ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اسے اختیار نہ کریں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس پر چل پڑیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے غفلت میں پڑے رہے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ جو لوگ اپنی غضبانی قوتوں کے اسیر ہیں وہ حق کی پیروی نہیں کر سکتے اور وہ گمراہی کی راہ پر گامزن ہیں، اس کے بعد ان کی اس حالت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حق سے غافل ہیں۔

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹

''وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ ۖ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۖ وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۖ وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ اُولٰۤئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ اُولٰۤئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ''

(اور ہم نے دوزخ کو بہت سے جنوں اور انسانوں کے لئے تیار کر رکھا ہے، وہ ایسے ہیں کہ ان کے دل تو ہیں مگر وہ ان کے ذریعے حق و باطل کی پہچان نہیں کرتے، ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے حقائق کا مشاہدہ نہیں کرتے، ان

کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے حق کی بات نہیں سنتے، ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں، وہی لوگ غفلت کا شکار ہیں)

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ کہ جنہیں غافل قرار دیا گیا ہے وہ ان حقائق سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جن کا تعلق بنی نوع انسان کے مربوطہ اُمور سے ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے دل، ان کی آنکھیں اور ان کے کان ان حقائق ومعارف تک رسائی حاصل کرنے سے محروم ہیں جن تک ہر سعادتمند انسان اپنی انسانیت کے حوالہ سے رسائی حاصل کرتا ہے، اور وہ ان امور سے بہرہ مند ہونے کی بجائے ایسی چیزوں کے حصول میں مصروف رہتے ہیں جو حیوانوں سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر! کیونکہ حیوانات ودرندے اور وحشی جانور بھی ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ جس چیز کی طرف اپنی حیوانی فطرت کے ساتھ مائل وراغب ہوتے ہیں اور ان کے حصول کا فیصلہ کر لیتے ہیں ان تک پہنچنے میں اپنی تمام تر قوتیں وصلاحیتیں بروئے کار لا کر اپنا مطلوب حاصل کر لیتے ہیں۔

بنابراین مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ امر واضح ہوا کہ قرآن مجید نے تقویٰ کو تفکر وتذکر اور تعقل کی بنیادی شرط قرار دیا ہے اور فکری استقامت ودرستی اور علمی کاوشوں کا اپنے مقصود تک رسائی میں کامیاب ہونا اور ہر طرح کے حیوانی افکار واوھام اور شیطانی القاءات سے مبرا ہونا علم کے ساتھ عمل پر موقوف قرار دیا ہے۔

ہاں، یہاں ایک ایسی قرآن حقیقت موجود ہے جس کا کسی بھی حوالہ سے انکار ممکن نہیں اور وہ یہ کہ جو شخص ولایت الٰہیہ کی پاکیزہ وادی میں داخل ہو جائے اور پروردگار عالم کی مقدس ذات اور اس کی کبریائی حقیقت کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسمانوں وزمین کے ملکوتی حقائق تک رسائی کو یقینی بنانے کیلئے اپنی خاص عنایت کا دروازہ کھول دیتا ہے کہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ان بزرگ ترین آیتوں اور اس کے کبھی ماند نہ پڑنے والے جبروتی انوار کا مشاہدہ کرتا ہے جو دوسرے نہیں کر سکتے، اس ناقابل انکار حقیقت کی بابت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان الفاظ میں توجہ دلائی: ''لولا ان الشیاطین یحومون حول قلوب بنی آدم لرأوا ملکوت السماوٰت والارض'' (اگر شیاطین بنی نوع آدم کے دلوں کے اردگرد نہ گھومتے رہتے تو وہ آسمانوں وزمین کے ملکوتی حقائق کا دیدار کر لیتے)، کتاب ''المحجۃ البیضاء۔ جلد ۳، صفحہ ۱۸۔ اسی طرح ایک روایت کہ جسے متعدد راویوں نے بیان کیا اس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''لولا تکثیر فی کلامکم و تمریج فی قلوبکم لرأیتم ما اریٰ ولسمعتم ما اسمع '' (اگر تمہارا حد سے زیادہ باتونی ہونا اور تمہارے دل غیر اطمینانی کیفیت کا شکار نہ ہوتے تو تم بھی وہ کچھ دیکھ پاتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہ کچھ سن پاتے جو میں سنتا ہوں) کتاب ''مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶''۔

اور اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹

''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ''

(اور جو ہماری بابت کوشش کریں تو ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی رہنمائی کریں گے اور یقیناً اللہ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اور اسی حقیقت کا ثبوت درج ذیل آیات مبارکہ میں موجود ہے:۔

○ سورۂ حجر، آیت ۹۹

''وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ''

(اور اپنے پروردگار کی بندگی وعبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں یقین آجائے)

اس آیت میں یقین کو عبادت سے مربوط اور اس کی فرع ونتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

○ سورۂ انعام، آیت ۷۵

''وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ''

(اور اسی طرح ہم نے ابراھیم کو آسمانوں وزمین کے ملکوتی حقائق دکھائے اور تاکہ وہ یقین والوں میں قرار پائے)

اس آیت میں یقین کو ملکوتی حقائق کے مشاہدہ سے مربوط قرار دیا گیا ہے۔

○ سورۂ تکاثر، آیت ۵ تا ۷

''كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ''

(نہیں نہیں، اگر تم علم الیقین حاصل کر لیتے تو تم دوزخ کو خود ہی دیکھ لیتے، پھر تم یقین کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ کر لیتے)

○ سورۂ مطففین، آیت ۱۸ تا ۲۱

''اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ''

(نیک وصالح افراد کا اعمال نامہ علیین میں ہے، اور آپ کو کیا معلوم کہ علیون سے کیا مراد ہے؟ وہ لکھی ہوئی ایک کتاب ہے کہ اسے صرف مقربین بارگاہِ الٰہی دیکھ پاتے ہیں)

بہرحال اس موضوع کی بابت مربوطہ مطالب کی تفصیلات عنقریب سورۂ مائدہ، آیت ۵۵ ''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔۔'' کی تفسیر میں ذکر کی جائیں گی اور اسی طرح اس آیت میں بھی ان کا تذکرہ ہوگا: سورۂ مائدہ، آیت ۱۰۵ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ)۔

یادر ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی حقیقت سے ہمارے سابق الذکر مطلب کی نفی نہیں ہوتی جس میں ہم نے بیان کیا کہ قرآن مجید اس فطری طرزِ تفکر کی تائید کرتا ہے جس پر انسان کی تخلیق اور انسانی زندگی کے نظام کی بنیاد استوار ہے کیونکہ وہ ایک غیر فکری راستہ ہے اور مخصوص خدائی عنایت ہے کہ خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور یہ واضح حقیقت ہے کہ عاقبت بخیر صرف تقویٰ والوں سے مخصوص ہے۔

ایک تاریخی بحث

اس بحث میں ہم اجمالی طور پر اسلامی طرزِ تفکر کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس راہ وروش کا جائزہ لیتے ہیں جسے امت اسلامیہ نے اپنے گوں ناگوں گروہوں ومسالک ومذاہب کے باوجود اختیار کیا، اس بحث میں ہمارا مقصد ان مذاہب و مسالک میں سے کسی مذہب ومسلک کے حق یا باطل ہونے کا اثبات نہیں بلکہ ہم صرف رونما ہونے والے واقعات کو قرآنی منطق ونظریہ کے تناظر میں پرکھتے ہوئے ان کے درست ونادرست ہونے کی چھان بین کریں گے لیکن اس کے طرفداروں کے فخریہ اظہارات اور مخالفوں کے اعتذاری بیانات سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کہ ان کے اصول وفروع کی بابت غور کریں اور ان کے بارے میں اظہارِ رائے کریں، کیونکہ اس کا تعلق دیگر بحثوں سے ہے خواہ مذہبی ہوں یا ان کے علاوہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید اپنی مخصوص منطق وطرزِ عمل میں انسانی زندگی سے مربوط تمام امور ومتعلقات کو ملحوظ و مدنظر قرار دیتے ہوئے ہر طرح کی قید وشرط کے بغیر انسان پر اپنے احکام صادر ولاگو کرتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، سفید ہو یا سیاہ، عربی ہو یا عجمی، شہری ہو یا دیہاتی، عالم ہو یا جاہل، موجود ہو یا غائب، اس کی ذاتی زندگی کے امور ہوں یا معاشرتی زندگی کے وہ جس دور میں ہو اور جس جگہ پر ہو، قرآن مجید اس کے مربوطہ تمام مسائل ومتعلقہ امور میں خواہ ان کا تعلق اعتقادات سے ہو یا اخلاق واعمال سے ہو سب کی بابت دستورات جاری کرتا ہے، اور یہ حقیقت مسلم الثبوت اور ناقابل انکار ہے۔

بنابرایں یہ امر واضح ہوا کہ قرآن مجید کا ان تمام علوم وفنون سے سروکار اور ربط وتعلق ہے جو انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو سے مربوط ہیں، اور یہ مطلب بھی ان قرآنی آیات مبارکہ سے واضح وآشکار ہے جن میں انسان کو تدبر وتفکر اور تذکر وتعقل کی دعوت دی گئی کہ قرآن مجید تمام افرادِ بشر کو ان تمام امور میں علم کے زیور سے آراستہ ہونے اور جہالت کی زنجیروں کو توڑنے کی نہایت سخت تاکید وترغیب دلاتا ہے جن کا تعلق آسمانی، زمینی، نباتاتی، حیوانی وانسانی حقائق واسرار سے ہے خواہ ہماری اسی دنیا سے ہوں یا اس کے علاوہ ہوں یعنی ملائکہ، شیاطین، لوح وقلم وغیرہ، اور ان سب کی بابت حقائق واسرار سے آگاہی حاصل کرنے کی ترغیب دلانے کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت سے بہرہ ور ہو، اور ہر اس چیز سے

آگاہ ہو جس کا کسی بھی حوالہ سے انسان کی معاشرتی زندگی کی سعادت سے تعلق بنتا ہو خواہ وہ اخلاقیات میں سے ہوں یا احکام میں سے ہوں اور خواہ حقوق میں سے ہوں یا معاشرتی دستورات وضوابط میں سے ہوں،

اور آپ سابقہ ذکر شدہ مطالب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ قرآن مجید فطری طرزِ تفکر کی تائید کرتا ہے کہ جسے اختیار کرنے کی دعوت خود فطرت دیتی ہے اور انسان کیلئے اسے اختیار کرنا ناگزیر ہے کہ اس سے فرار وروگردانی کا کوئی راستہ ہی موجود نہیں، حق تو یہ ہے کہ یہی فطری دعوت بعینہ منطقی اصولوں پر مبنی ہے، اور قرآن مجید نے خود ہی ان منطقی اصولوں یعنی برھان، جدل اور موعظہ کو استعمال کیا ہے اور وہ جن لوگوں کو ہدایت ورہنمائی کرتا ہے انہیں انہی اصولوں کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے امور میں ان سے استفادہ اور انہیں استعمال کریں، یعنی جن واقعات وحقائق کا تعلق عمل سے نہیں بلکہ نظریات سے ہے۔ ان میں ''برھان'' کا سہارا لیں اور ان کے علاوہ دیگر امور میں مسلمات کے ذریعے استدلال کریں یا معتبر بہ امور سے کام لیں چنانچہ قرآن مجید اپنے مقاصد کے بیان میں سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معیار قرار دیتا ہے اور لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات وکردار میں نمونہ عمل کا تعین کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وکردار ہی کو معیارِ عمل قرار دیتے چلے آرہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے علمی اسلوب وطرز استدلال کی اسی طرح تقلید کرتے ہیں جس طرح ایک طالب علم اپنے استاد کے علمی اسلوب کو اپناتا ہے۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں (اس سے ہماری مراد وہ دور ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے) لوگ اسلامی تعلیمات کی بابت جدید العہد تھے، ان کی حالت قدیم دور کے اس انسان جیسی تھی جو علوم وفنون میں ابتدائی ترین مراحل سے گزرا وہ لوگ علمی موضوعات ومباحث میں نہایت سادہ اندیشی کے حامل تھے البتہ تحصیل علم وتحریر کے حوالہ سے ان کی توجہات وکاوشیں بھرپور تھیں، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے حفظ قرآن پر بھرپور توجہ سے کام لیا اور قرأت کے مسائل کو نہایت اہمیت دی، اور اسی طرح احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حفظ کرنے میں غیر معمولی اہتمام کا ثبوت دیا اس دور میں وہ لوگ احادیث حفظ کرنے کو انہیں تحریر کرنے سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ایک دوسرے کو احادیث سنانے وبیان کرنے پر زور دیتے تھے، اسی دور میں اہل اسلام کے اپنے افرادِ ملت کے درمیان اعتقادی بحثوں کا سلسلہ بھی بہت وسیع رہا اور اس کے ساتھ ساتھ بعض غیر مسلم قوموں کے ساتھ بھی بحث ومباحثہ اور مناظرات ہوتے تھے بالخصوص یہود ونصاریٰ کے ساتھ بحثیں عام تھیں کیونکہ ان کے بزرگانِ دین جزیرۂ عرب، حبشہ اور بلادِ شام میں موجود تھے، اسی زمانہ سے علم کلام کے ظہور پذیر ہونے کا آغاز ہوا، وہ لوگ شعری ذوق وشوق اور شعر گوئی کے دلدادہ تھے جو کہ عربوں کے ہاں ایک عمومی رسم کی صورت اختیار کر چکی تھی مگر اسلام نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی قرآنِ مجید نے شعر وشعراء کی تعریف میں کوئی لفظ کہا، بلکہ سنت نبویؐ میں بھی اس حوالہ سے خاص توجہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

پھر جب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا اور خلافت کا مسئلہ متنازع صورت اختیار کر گیا کہ جو تاریخ اسلام کا ایک المیہ ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے اس کی وجہ سے علم کلام کے ابواب میں ایک باب کا اضافہ ہو گیا اور اس نئے اختلافی موضوع کے جنم لیتے ہی کلامی بحثوں کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔

پہلی خلافت کے دور میں جنگ یمامہ کہ جس میں متعدد قاریانِ قرآن شہید ہوئے کے بعد قرآن مجید کو جمع کرنے کا باضابطہ آغاز ہوا اور یہ سلسلہ پہلی خلافت میں جس کا دورانیہ تقریباً دو سال تھا جاری رہا پھر دوسری خلافت میں جمع القرآن کی بابت اہتمام عمل میں آیا۔

اس دور میں صدائے اسلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچنے لگی اور مسلمانوں کو نصیب ہونے والی فتوحات کے نتیجہ میں اسلام کو فروغ حاصل ہو گیا لیکن ان حالات میں مسلمانوں کی توجہ چونکہ جنگوں وغیرہ پر مرکوز تھی لہٰذا وہ علوم و معارف اور تحقیق و بحث میں ترقی کے مراحل طے نہ کر سکے، یا یہ کہ وہ اپنے علمی مقام و مرتبہ کی بنیاد پر مزید وسعت کو ضروری ہی نہیں سمجھتے تھے، البتہ اس دور میں علم اور اس کی فضیلت کو ایسی کھلی و واضح حقیقت نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کی بنیاد پر کسی قوم کو دوسری قوم پر برتری و امتیازی تشخص حاصل ہو، بلکہ اس دور میں علم اور اس کے آثار کا دائرہ صنعت تک محدود تھا کہ جس سے قوموں کی ایک دوسرے سے پہچان وابستہ تھی۔ انہی فتوحات اور دشمنوں کو پے در پے شکست سے دوچار کرنے نے ایک بار پھر عربوں کے زمانہ جاہلیت کے غرور و تکبر کی آگ بھڑک اٹھی کہ جسے نبویؐ تربیت نے خاموش کر دیا تھا، ان کے طغیان و جاہلانہ غرور کے نتیجہ میں ان کے اندر جبر و استبداد کی رسیا اقوام اور ظالم و ستمگر لوگوں کے احساس برتری نے جنم لیا اور رفتہ رفتہ ان کے یہ شیطانی اوصاف ان کے افکار و اعمال میں جگہ کر گئے چنانچہ اس کا گواہ اس دور میں اُمت اسلامیہ کا عرب اور غیر عرب میں تقسیم ہو جانا ہے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے غیر عرب کو ''موالی'' یعنی غلاموں کے نام سے موسوم کیا، گویا عربوں کے علاوہ دوسری تمام قوموں کو غلام کہا گیا، مسلمانوں کے غرور و تکبر اور زمانہ جاہلیت کی جبر و استبداد پر مبنی حالت کا دوسرا ثبوت معاویہ کا ملوکانہ طرزِ عمل ہے کہ جو اس زمانہ میں بلادِ شام کا حاکم تھا اور اس کے قیصری اندازِ حکمرانی نے مسلمانوں کے درمیان تقسیم در تقسیم کو فروغ دیا، اس کے علاوہ دیگر متعدد امور تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں کہ سپاہیانِ اسلام نے کیا کارنامے سرانجام دیئے کہ جن کے نتیجہ میں مسلمانوں میں گروہ بندیاں بڑھتی چلی گئیں، ان گروہ بندیوں اور تقسیمات نے اہل اسلام کی علمی سرگرمیوں میں بالخصوص قرآنی تعلیمات کے فروغ کو بہت متاثر کیا، اور ان کی تمام تر علمی کاوشیں صرف قرأت قرآن تک محدود ہو گئیں اور مختلف قرائتوں کے اختیار کرنے کے حوالہ سے ان کے درمیان موجود قرآنی نسخے توجہات کا مرکز بن گئے جن میں سے بعض نسخوں کی نسبت زید بن ثابت کی طرف اور بعض کی نسبت اُبی بن کعب اور ابن مسعود وغیرہ کی طرف تھی۔

اور جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو اس دور میں اس کی بابت غیر معمولی اہتمام ہوا اور احادیث کے بیان و روایت

کرنے کا سلسلہ اس حد تک وسیع ہوگیا کہ عمر بن خطاب نے بعض صحابہ کو حدیث بیانی سے روک دیا کیونکہ وہ حد سے زیادہ حدیثیں بیان کرتے تھے، دوسری جانب اہل کتاب کی کثیر تعداد دائرہ اسلام میں آئی تو محدثین کہ جن کا کام ہی حدیث بیانی تھا انہوں نے ان سے ان کی کتب میں مذکور مطالب اور ان کے انبیاء وقوموں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان معلومات کو ان احادیث نبویہؐ کے ساتھ مخلوط کردیا جو ان کے پاس محفوظ تھیں کہ جس کے نتیجہ میں حدیثوں میں جعلی و بے ربط اور من گھڑت مطالب شامل ہوگئے اور حدیث سازی کا مذموم سلسلہ شروع ہوا، یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے پاس موجود احادیث میں صدرِ اوّل کے صحابہ وراویوں کی طرف سے منقول ایسی حدیثیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو مطالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بے ربط اور ٹکڑوں ٹکڑوں کی صورت میں ہیں کہ جن کے ابتدائی جملے درمیانی جملوں سے اور درمیانی جملے آخری جملوں سے ہم آھنگ وہم رنگ نہیں کہ قرآن مجید واضح الفاظ میں ان کی نفی کرتا ہے اور بے ربط وجعلی حدیثوں کو بے اعتبار قرار دیتا ہے۔

حدیث سازی کے اسباب

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا اور وہ کونسے اسباب تھے جن کے نتیجہ میں حدیث سازی کا سلسلہ شروع ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حوالہ سے تین بنیادی اسباب ایسے ہیں جو اس مذموم سلسلہ کا موجب بنے اور وہ یہ ہیں:

پہلا سبب:

حدیث سازی کا ایک سبب یہ تھا کہ لوگ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں شرفیابی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوئی باتوں کو دوسروں سے بیان کرنے کی عظمت وشرف کے قائل تھے اور صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے جو صحابہ سے سنی ہوئی احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے اور ان کے اس بیان کی وجہ سے ان کی تعظیم وتکریم ہوتی تھی، لہٰذا اس صورتحال نے لوگوں کو حدیث بیانی کی راہ پر لا کھڑا کیا اور ہر شخص اس بات کا خواہاں وکوشاں ہوتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ حدیثیں بیان کرے (یہاں تک کہ اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والے حضرات بھی اس کام میں لگ گئے) اور پھر اس سلسلہ میں حدیث بیان کرنے والوں کے درمیان تقدم واوّلیت اور افتخار واعزاز حاصل کرنے کے لئے شدید رقابت کا بازار گرم ہوگیا۔

دوسرا سبب:

حدیث سازی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ حفظ الحدیث کے شدید ترین لالچ اور حدیث بیانی کی گہری رغبت احادیث

سے مربوط سلسلوں میں تحقیق اور ان کے معانی میں غور و فکر کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی بالخصوص احادیث کی صحت کو کتاب اللہ کے ذریعے یقینی بنانے کا عمل رک گیا جبکہ کتاب اللہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر دین کے اصول و فروع کا دارومدار ہے اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں واضح طور پر تاکید فرماتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ ان پر جھوٹ منسوب کرنے والے زیادہ ہو جائیں گے (ستکثر علی القالة) یعنی مجھ سے منسوب حدیثیں بیان کرنے والوں کی کثرت ہو جائیگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی صحیح و معتبر اسناد کے ساتھ منقول ہے اور اس کے مشابہ دیگر ارشادات بھی موجود ہیں۔

بہرحال اس صورتحال کی وجہ سے حدیث سازوں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے مذموم سلسلہ کو وسعت دیں لہٰذا ان کے درمیان جعلی حدیثوں کا بازار گرم ہو گیا کہ جن میں خداوند عالم کے اسماء مقدسہ وصفات وافعال سے مربوط مطالب، انبیاء کرام کی طرف منسوب لغزشوں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر پر نہایت مذموم اعمال کی نسبت دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو داغدار کرنے کی مساعی، خلق وایجاد کے حوالہ سے خرافات و بیہودہ مسائل، گزشتہ اقوام کے حالات وواقعات اور تحریف قرآن وغیرہ سے مربوط امور و مطالب شامل ہیں کہ اگر ان سب پر اچھی طرح غور کیا جائے تو وہ تورات وانجیل میں پائے جانے والے خرافی مطالب سے کم نہیں۔

ان حالات کے نتیجہ میں قرآن وحدیث کی بابت تقدم اور عمل کے حوالہ سے یوں تقسیم بندی ہوگئی کہ ظاہری طور پر قرآن کو تقدم دیا جائے اور حدیث کو عمل کا معیار قرار دیا جائے، بنابرایں قرآنِ مجید عملی طور پر متروک ہو گیا، اور اب تک یہ اصول نظر انداز ہو رہا ہے کہ حدیث کی صحت کو قرآنی آیات کے ذریعے یقینی بنایا جائے اور عملی طور پر اس اصول کی ہرگز پروا نہیں ہو رہی، اگرچہ ظاہری طور پر امت اس اصول کو نظر انداز کرنے سے انکاری ہے جبکہ قرآن مجید نے اس حوالہ سے واضح طور پر آگاہ کر دیا ہے کہ قیامت کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پروردگارِ عالم سے یوں کہیں گے: ''وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا'' (رسول کہیں گے اے پروردگار میری اُمت نے اس قرآن کو چھوڑ دیا) سورۂ فرقان، آیت ۳۰

البتہ اس سے معدودے چند افراد ہی مستثنیٰ ہوں گے کہ جو قرآن پر عمل کرتے رہے اور یہی تساہل و بے توجہی بعینہ ان اسباب میں سے ایک ہے جو دیگر ادیان و مذاہب کے خرافی و بیہودہ عقائد کے اہلِ اسلام کے درمیان پھیل جانے اور ٹھوس دینی اصول شمار کئے جانے کا موجب بنے کہ ان لوگوں نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان نظریات کو اسلامی رنگ دے دیا، اور پھر صورتحال یوں ہوگئی کہ بیماری نے بیماری کو جنم دے دیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''الداء یجر الداء'' ایک بیماری دوسری بیماری کی راہ ہموار کرتی ہے۔

تیسرا سبب:

حدیث سازی کا تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسئلہ خلافت کو متنازع بنا دیا گیا

اور عامۃ المسلمین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ کی بابت اختلاف رائے کا شکار ہو گئے، کچھ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان و ارشاد کے عین مطابق اہل بیتؑ کا دامن تھاما اور ان سے متمسک ہو گئے جبکہ کچھ لوگ ان سے روگرداں ہو گئے اور ان کی عظمت اور قرآنی اسرار و حقائق سے ان کے علم و آگاہی کی پروا نہ کرتے ہوئے ان سے دشمنی وعداوت کی راہ پر چل پڑے حالانکہ ان کے بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا اور تاکیدی ارشادات و فرامین صادر کئے ان کی بابت کوئی مسلمان شک نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو حکم دیا کہ وہ اہل بیتؑ سے علم حاصل کریں نہ یہ کہ انہیں کتاب اللہ کے معانی بتاتے پھریں کیونکہ اہل بیتؑ دوسروں کی نسبت اللہ کی کتاب کا زیادہ علم رکھتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو واضح طور پر آگاہ فرمایا کہ اہل بیتؑ قرآن کی تفسیر میں ہرگز غلطی نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کی آیات کے فہم المعانی میں خطاء کے مرتکب ہوں گے چنانچہ اس حوالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ثقلین میں کہ سند کے لحاظ سے احادیث متواترہ میں سے ہے یوں ارشاد فرمایا:

''انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض''

(میں تم میں دوگرانقدار چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی عترت، اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں حوضِ کوثر پر میرے پاس آ جائیں گے)

بعض روایات میں یہ الفاظ مذکور ہیں:

''لا تعلموھم فانھم اعلم منکم''

(تم انہیں علم دینے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ وہ تم سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں)

اور قرآن کی تفسیر کے حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی کثرت سے منقول ہے:

''من فسر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہٗ من النار''

(جو شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں قرار دے)

یاد رہے کہ اس موضوع سے مربوط مسائل و مطالب اسی کتاب (المیزان) کی تیسری جلد میں ''محکم اور متشابہ'' کی بحث کے ذیل میں ذکر ہو چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل بیتؑ سے روگردانی ہی سب سے بڑا دردناک سانحہ تھا جس کے نتیجہ میں قرآن مجید کے حقائق و اسرار سے آگاہی حاصل کرنے اور قرآنی طرزِ تفکر اختیار کرنے کے راستے بند ہو گئے چنانچہ اس تلخ حقیقت کی گواہی اس سے ملتی ہے کہ احادیث کے باب میں بہت کم حدیثیں ملتی ہیں جو اہل بیتؑ سے منقول ہوں، جبکہ علم الحدیث کے حوالہ سے عہدِ خلفاء پر نگاہ کریں تو معلوم ہوتا ہے اس دور میں اس علم کو خاص اہمیت و منزلت حاصل تھی اور لوگوں میں حدیث سے آگاہ

ہونے کا شوق و ولولہ نہایت شدید تھا لیکن جب آپ اسی دور میں ان احادیث و روایات کو شمار کریں جو امام علیؑ اور امام حسنؑ و امام حسینؑ سے منقول ہیں بالخصوص وہ احادیث جن کا تعلق تفسیر قرآن سے ہے تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی اور جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے تو انہوں نے امام علی علیہ السلام سے قابل ذکر حد تک بھی روایات بیان نہیں کیں اور تابعین حضرات نے جتنی روایات امام علیؑ سے منسوب ذکر کی ہیں ان کی تعداد پورے قرآن میں ایک سو تک بھی نہیں پہنچتی اور امام حسنؑ سے منقول روایات کی تعداد دس بھی نہیں جبکہ امام حسینؑ سے کوئی روایت بیان ہی نہیں کی گئی کہ جسے ذکر کیا جائے حالانکہ بعض محققین نے تفسیر کی بابت موجود روایات کی تعداد سترہ ہزار ذکر کی ہے (یہ تعداد سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ذکر کی اور اس کے ساتھ یہ بات ذکر کی کہ تفسیری روایات کی یہ وہ تعداد ہے جو اس نے اپنی کتاب ''ترجمان القرآن'' میں ذکر کی ہے کہ جس کی تلخیص تفسیر ''درمنثور'' کے نام سے مشہور ہے) اور جن روایات کا تعلق فقہ سے ہے ان کی تعداد بھی اسی کے لگ بھگ ہے لیکن فقہی ابواب میں بعض ارباب تحقیق نے صرف دو حدیثیں امام حسینؑ سے منقول پائی ہیں، تو اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ ہو سکتی ہے کہ لوگوں نے اہل بیتؑ سے منہ موڑ لیا اور ان کی بیان کردہ احادیث سے روگردانی کر لی؟ یا یہ کہ لوگوں نے اہل بیتؑ سے احادیث لیں بلکہ بہت زیادہ لیں مگر وہ سب بنی امیہ کے دور میں چھپا دی گئیں اور انہیں بھلوا دیا گیا کیونکہ بنی امیہ اہل بیتؑ سے دشمنی رکھتے تھے اور ان سے منحرف ہو گئے تھے؟ مجھے معلوم نہیں، البتہ اس قدر معلوم و واضح ہے کہ حضرت امام علیؑ کا گوشہ نشین ہو جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جمع القرآن کے لئے منعقد ہونے والے اجتماعات اور اسی طرح عہد عثمانی میں اس سلسلہ میں ہونے والے اجلاسوں میں شرکت نہ کرنا اور امام حسنؑ و حسینؑ کی تاریخ حیات سے مذکورہ بالا دو احتمالوں میں سے پہلے احتمال کی تصدیق ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ اہل بیتؑ سے منہ موڑنے اور ان کی بیان کردہ روایات سے روگردانی کرنے کے نتیجہ میں ہوا، اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع ہوا کہ لوگوں نے نہ صرف یہ کہ امام علیؑ کی بیان کردہ احادیث سے روگردانی کی بلکہ کتاب مستطاب ''نہج البلاغہ'' میں مذکور آپؑ کے بعض ارشادات و خطابات کے منکر ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ امام علیؑ کا کلام نہیں، ایک طرف تو یہ ہوا اور دوسری طرف زیاد بن ابیہ کا خطبہ اور یزید کی بیہودہ غزلیں اور شراب و کباب کے تذکرہ پر مشتمل اشعار کو اس قدر یقینی تسلیم کیا کہ ان کے بارے میں کوئی دو آراء نہیں پائی جاتیں۔

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ حضرات اہل بیتؑ ہر دور میں مظلوم رہے اور ان کی بیان کردہ احادیث سے روگردانی کی گئی یہاں تک کہ حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کا دور آیا اور ان دو اماموں نے علمی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، وہ دور بنی اُمیہ کی آمرانہ و جابرانہ سلطنت کے خاتمہ اور بنی عباس کے ظالمانہ اقتدار کا درمیانی زمانہ تھا، اس اثناء میں انہوں نے اپنے بزرگوں آباء کرام کی احادیث لوگوں کے سامنے بیان کیں اور ان کے ان آثار کو زندہ و تازہ کیا جو سابقہ خلافتوں و سلطنتوں میں مٹا دیئے گئے اور ان کی یاد دلوں سے محو کر دی گئی تھی لیکن افسوس کہ ان دو معصوم اماموں نے جو حدیثیں

خود بیان کیں یا اپنے آباء کے حوالہ سے ذکر کیں یا ان کی اولاد و ذریت طیبہ نے ان کے بعد بیان فرمائیں سب ہی دشمنوں کی شیطانی چالوں کا نشانہ بنیں اور دشمنوں نے ان میں اسی طرح جعلی حدیثیں مخلوط کر دیں جس طرح احادیث نبویؐ میں جعل سازی کے مرتکب ہوئے، چنانچہ ان دو اماموں نے واضح الفاظ میں یہ بات اپنے بیانات میں ذکر کی اور حدیث سازی کرنے والوں کے نام بھی بتائے مثلاً مغیرہ بن سعید، ابن ابی الخطاب وغیرہ، اور آئمہ اہل بیتؑ نے اس سلسلہ میں اپنے اصحاب اور اپنے شیعوں کو ایک اصول و معیار سے آگاہ فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ جو حدیث ان کی طرف نسبت کے ساتھ بیان کی جائے اسے قرآن کے سامنے رکھیں کہ اگر وہ قرآن سے مطابقت و موافقت رکھتی ہو تو اسے لے لیں اور صحیح قرار دیں اور جو حدیث قرآن سے مطابقت نہ رکھتی ہو اور اس کے مخالف ہو اسے چھوڑ دیں مگر لوگوں میں سے سوائے معدودے چند افراد کے، آئمہؑ کے فرمان و دستور العمل پر کان نہ دھرے اور فقہی موضوعات و مسائل کے علاوہ دیگر احادیث کو قرآنی معیار پر پرکھنے کے بغیر ہی تسلیم کر لیا گویا انہوں نے بھی اسی طرزِ عمل کو اپنایا جسے سوادِ اعظم نے احادیث نبویؐ کی بابت اختیار کیا، بلکہ اس سے بھی بالاتر یہ کہ انہوں نے افراطی راہ پر چلتے ہوئے اس سلسلہ میں یہ نظریہ اپنا لیا کہ ظواہر القرآن حجت نہیں جبکہ بعض فقہی کتب کی صحت پر پختہ یقین کر لیا مثلاً کتاب ''مصباح الشریعہ''، کتاب ''فقہ الرضا'' اور کتاب ''جامع الاخبار'' ان کا افراطی عمل اس حد تک پہنچ گیا کہ ان میں سے بعض افراد اس بات کے قائل ہو گئے کہ حدیث ہی قرآن کی تفسیر کرتی ہے خواہ وہ قرآن کی صریح آیت کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، ان کی یہ بات سوادِ اعظم کے اس نظریہ کے برابر ہو گئی جس میں وہ کہتے ہیں کہ روایت قرآنی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے شاید اس صورتحال کے تناظر میں بعض لوگوں نے کہا کہ اہل سنت نے قرآن سے تمسک اختیار کیا مگر عترت کو چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا کہ وہ یعنی قرآن و عترت ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے (انهما لن يفترقا) اور بعض شیعوں نے عترت سے تمسک اختیار کیا مگر قرآن کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجہ میں وہ عترت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے (انهما لن يفترقا) اس طرح گویا پوری اُمت اسلامیہ نے قرآن و عترت دونوں کو چھوڑا۔

بہر حال حدیث کے باب میں جو طرزِ عمل اپنایا گیا وہ ان عوامل و اسباب میں سے ایک ہے جس سے علوم اسلامیہ یعنی دینی و ادبی علوم کا قرآنِ مجید سے تعلق ختم ہو گیا اور ان کی وابستگی کتاب اللہ سے منقطع ہو گئی حالانکہ وہ تمام علوم اسی شجرۂ طیبہ کی شاخ و برگ اور میوے ہیں جس کی اصل و بنیاد ثابت و قائم اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں کہ وہ ہر لحہ اپنے رب کے اذن سے ثمر بخش رہتا ہے، لہٰذا آپ اگر ان علوم کی بابت بخوبی غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی تشکیل اس طرح عمل میں لائی گئی ہے کہ انہیں قرآن کی ضرورت ہی نہیں، یہاں تک کہ ایک طالب علم کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ وہ ان تمام علوم کو حاصل کرے کہ جن میں علم صرف، علم نحو، علم بیان، علم لغت، علم حدیث، علم رجال، علم درایت، علم فقہ، علم اصول شامل ہیں اور وہ ان علوم

میں مہارت حاصل کر کے اور درجہ اجتہاد تک پہنچ جائے جبکہ اس نے قرآن کو پڑھا ہی نہ ہو اور نہ ہی قرآن کو چھوا ہو،

بنابرایں اس کے نتیجہ میں قرآن کی حقیقی حیثیت سوائے اس کے کچھ نہیں رہتی کہ اسے ثواب حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے یا اس سے تعویذ بنا کر بچوں کے گلے میں ڈالے جائیں تا کہ وہ نا گہانی حادثات سے محفوظ رہیں، ان مطالب پر بخوبی توجہ کریں اور ان سے درس عبرت حاصل کریں اگر آپ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

خیر، اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں اور اپنے جاری سلسلہ کلام سے دوبارہ مربوط ہوتے ہیں تاریخ سے ثابت ہے کہ دوسرے عہد خلافت کے دور میں قرآن وحدیث کے حوالہ سے وہی کچھ ہوا جو ہم آپ کو بتا چکے ہیں اس دور میں علم الکلام کی بحثوں کا سلسلہ وسیع تر ہو گیا جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کا دیگر اقوام اور گوناگوں عقائد ونظریات کے پیروکاروں سے میل جول اور آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو گیا کہ جن میں علماء، دانشوروں، پادریوں اور اسقفوں و بطریقوں کی کثیر تعداد شامل تھی اور وہ اپنے ادیان و مذاہب کے محققین تھے، چنانچہ علم الکلام وعقائد کی بحثوں کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا چلا گیا مگر اس دور میں ان بحثوں کی با قاعدہ تدوین نہ ہو سکی اور مربوطہ مسائل کی تدوینی صورتگری عمل میں نہ آسکی لہٰذا اس سلسلہ میں تالیف کی بابت جو تاریخی شواہد و آثار موجود ہیں ان میں ان حضرات کا تذکرہ ہے جو اس دور کے بعد آئے اور انہوں نے کلامی بحثوں کو مدون و مرتب کیا، یہ صورتحال عہد عثمانی تک باقی رہی اور عہد عثمانی میں حکومت کے خلاف اس قدر وسیع تحریک چلی کہ جس کا انجام ایک انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا اس دور میں صرف ایک کام ہوسکا یعنی جمع القرآن، چنانچہ تمام قرآنی نسخوں کو ختم کر کے ایک نسخہ پر اتفاق رائے ہو گیا، یہ صورتحال حضرت علیؑ کے عہد خلافت تک جوں کی توں رہی اور آپؑ کے دور میں اسلامی معاشرہ کی اصلاح کا عمل اور ہر طرف پھیلی ہوئی خرابیوں کو دور کرنے کی ضرورت نے آپؑ کی تمام تر توجہات اپنی طرف مبذول کیں چنانچہ اندرونی اختلافات اور پے در پے ہونے والی جنگوں کی وجہ سے معاشرہ نہایت ابتری کا شکار ہو چکا تھا کہ جس کی درستگی ناگزیر تھی اس نہایت سنگین صورتحال اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کی کوششوں و دیگر مشکلات کے باوجود امام علیؑ نے علم نحو کی تدوین فرمائی اور اپنے ایک معتمد صحابی ابوالاسود دئلی سے اس کی کلیات قلمبند کروائیں اور انہیں حکم دیا کہ اس علم کی تمام جزئیات کو یکجا کریں اس کے علاوہ آپؑ نے اپنے خطبوں وخطابات میں دینی معارف اور قرآن مجید کے نفیس ترین اسرار و رموز بیان کئے، اس کے ساتھ ساتھ آپؑ کے وہ اعتقادی وعلم الکلام کی بحثوں سے مربوط مناظرات حدیث کی کتب کا عظیم خزانہ ہیں۔

قرآن وحدیث کے حوالہ سے صورتحال اسی طرح پر تھی اور معاویہ اور دیگر اموی وعباسی حکمرانوں کے دور میں تقریباً چوتھی صدی ہجری تک جو کہ آئمہ اثنا عشر علیہم السلام کے عہد کے آخری ایام تھے اس سلسلہ میں یعنی قرآن وحدیث کے معارف کی بابت کوئی قابل ذکر کارنامہ نہ ہوسکا البتہ معاویہ کے دور میں اہل بیتؑ کا ذکر مٹانے میں ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا گیا

اوران کے علمی مقام ومنزلت اور پاکیزہ سیرت وکردار پر پردہ ڈالنے کے لئے تمام تر ریاستی ودیگر وسائل بروئے کار لائے گئے اور حدیث سازی کا بازار خوب گرم رہا اس دور میں سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ دینی حکومت کو استبدادی سلطنت میں تبدیل کر دیا گیا اور سنت نبویؐ کو امپراطوری حاکمیت میں ڈھال دیا گیا، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم کردہ مدینہ فاضلہ وسلطنت عادلہ کا نظام اکھاڑ پچھاڑ کا شکار ہو گیا، اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز کے دور میں حدیث نگاری کا باضابطہ آغاز ہوا اور احادیث کو تحریری صورت دینے کا فرمان صادر کیا گیا جبکہ اس سے پہلے اس صورت میں موجود نہ تھا بلکہ محدثین احادیث کو قلمبند کرنے کی بجائے زبانی طور پر حفظ کرتے تھے۔

اس دور میں عربی ادبیات کو نہایت درجہ فروغ حاصل ہوا کہ جس کا آغاز معاویہ کے دور میں ہو چکا تھا اور اس دور میں شعر وشاعری کا سلسلہ عروج کو پہنچ گیا تھا کہ اس کے بعد دیگر اموی وعباسی حکمرانوں نے بھی اسی روش کو اپنایا اور شعر گوئی کی محفلوں کی رونق کو دوبالا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کسی ایک اچھا شعر کہنے یا ادبی نکتہ بیان کرنے پر سینکڑوں و ہزاروں دیناروں کے انعامات دیئے جاتے تھے جس کے نتیجہ میں ہر شخص شعر گوئی کا دلدادہ ہو گیا اور تاریخ عرب ایک دوسرے کو سنانے اور گزرے ہوئے ایام کے قصے بیان کرنے کی غرض سے محفلیں سج گئیں، ان محفلوں کے ذریعے وہ لوگ خوب مال کماتے تھے البتہ یہ سب کچھ مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہوتا تھا چنانچہ اموی حکمرانوں نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ اہتمام واقدام کیا اور اس طرح کی محفلیں سجا کر اور شاعروں وقصہ خوانوں کے ذریعے اپنی تعریفیں کروا کر بنی ہاشم کے مقابلے میں اپنی حیثیت منوانے میں مصروف رہے جبکہ ان کے بعد عباسی حکمران بنی فاطمہ کے مقابلے میں اپنے مقام ومنزلت کے اثبات واظہار کے درپے رہے چنانچہ وہ لوگ ان مقاصد کیلئے علماء ودانشوروں کے ظاہری اکرام واحترام اور انہیں نوازنے کے ذریعے انہیں استعمال کرتے اور اپنی حکومت واقتدار کو مضبوط ووسیع کرنے کے لئے ہر حربہ اپناتے تھے تاکہ عوام الناس پر تسلط جمائے رکھیں اور انہیں اپنی زلف اقتدار کا اسیر کئے رکھیں۔

بہرحال حکمرانوں کی اس روش کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ شعر وادب کا گہوارہ بن گیا اور صورتحال یہ ہو گئی کہ علماء کی کثیر تعداد ایسی سامنے آئی جو علمی مسائل وعقلی مباحث میں کسی شاعر کے شعر کو اپنے مؤقف کی صحت کے لئے بطور مثال پیش کرتے تھے اور اس کی بناء پر اپنے نظریہ کے تشخص کو یقینی بناتے تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے نظریاتی وفکری مقاصد ومواقف کو لغوی مسائل پر مبنی قرار دے کر سلسلہ بحث کو آگے بڑھاتے تھے اور کم سے کم یہ کہ کسی بھی بحث کے آغاز میں اس موضوع اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لا کر اپنے مطلوب کو بیان کرتے اور علمی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے تھے، تو ان امور کی اثر گزاری ارباب تحقیق واہل علم حضرات کے علمی وتحقیقی ذوق میں نمایاں تھی، انہی ایام میں علم الکلام کی بحثیں عام ہو گئیں اور اس سلسلہ میں کتابیں ہی کتابیں منظر عام پر آ گئیں، ابھی یہ سلسلہ اپنی پیشرفت کے ابتدائی ایام ہی میں تھا کہ علمائے علم کلام دو

بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے یعنی اشاعرہ اور معتزلہ، البتہ ان کے نظریات و آراء کے بنیادی اصول خلفاء بلکہ عہد نبویؐ ہی میں موجود تھے جس کا ثبوت وہ مناظرات ہیں جو امام علی علیہ السلام نے مسئلہ جبر و تفویض اور مسئلہ قضاء و قدر اور مسئلہ استطاعت وغیرہ کی بابت کئے اور ان امور کی بابت خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات سے بھی ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی قدر ہے "لا جبر و لا تفویض بل امر بین الامرین" (نہ جبر اور نہ ہی تفویض، بلکہ ان دونوں کے درمیان درمیان!) یعنی جبر کا عقیدہ بھی درست نہیں اور تفویض کا نظریہ بھی صحیح نہیں بلکہ ان کے بین بین والا عقیدہ برحق ہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "القدریة مجوس ھٰذہ الامة" (قدر کا عقیدہ رکھنے والے اس اُمت کے مجوسی ہیں)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ ان دو گروہوں کے وجود میں آنے کے بعد زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ اس طرح کہ معتزلیوں نے عقل کے مسلمہ اصولوں کو دینی ظواہر پر مقدم قرار دیا مثلاً اس بات کے قائل ہوئے کہ کسی کام کے اچھے یا برے ہونے کی تشخیص کا معیار عقل ہے اور کسی چیز کو دوسری چیز پر مقدم کرنا و ترجیح دینا کسی مرجح اور ترجیح دینے کے بنیادی سبب کے بغیر غلط ہے اور جس چیز کی طاقت نہ ہو اس کا حکم دینا قبیح و نادرست ہے اسی طرح وہ نظریہ استطاعت و تفویض کے قائل ہوئے اور اس طرح بعض دیگر مسائل کے حوالہ سے ان کا تشخص قائم ہو گیا، اشاعرہ بھی اپنے بعض مخصوص نظریات کی بناء پر معتزلیوں سے علیحدہ پہچان حاصل کر گئے اور وہ یہ کہ انہوں نے دینی ظواھر کو عقل پر مقدم مانا اور حسن و قبح کا معیار عقل کو قرار دینے کی نفی کی اور ترجیح بلا مرجح کو جائز تسلیم کیا، استطاعت اور جبر کا انکار کیا اور کلام اللہ کے قدیم ہونے کا عقیدہ قائم کر لیا، یہ اور اس طرح کے دیگر عقائد و نظریات ان کی کتب میں مذکور ہیں کہ ان کے حوالہ سے ان دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے سے الگ حیثیت حاصل ہو گئی۔

پھر انہوں نے علم الکلام کو باقاعدہ طور پر مدوّن و مرتب کیا اور اس کی بابت مخصوص اصطلاحات وضع کیں اور کچھ مسائل کا اضافہ کر دیا تا کہ ان مسائل کے حوالہ سے فلاسفہ پر تقدم حاصل کر لیں کہ جن مسائل کو وہ "امور عامہ" کے عنوان سے زیر بحث لاتے ہیں، البتہ یہ کام اس وقت ہوا جب فلسفہ کی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں کر دیا گیا اور مسلمانوں کی درسگاہوں میں اس کی تدریس ہونے لگی، بنابر ایں یہ بات درست نہیں کہ علم الکلام اور اس کے ماہرین کا دو گرہوں معتزلہ اور اشاعرہ میں تقسیم ہو جانا اس وقت ہوا جب علم فلسفہ عربوں میں آیا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے موضوعات و مسائل علم فلسفہ کے عربوں میں آنے سے پہلے موجود روایات میں ذکر ہوئے ہیں۔

فرقۂ معتزلہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ان کے وجود میں آنے کے ابتدائی ایام سے عباسی حکمرانوں کے ابتدائی دور تک (یعنی تیسری صدی ہجری کے اوائل تک) ان کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی اور لوگوں کے

درمیان اس کی شہرت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوا یہاں تک کہ ان کا چمکتا دمکتا سورج ڈوب گیا اور پھر ایوبی بادشاہوں کے ہاتھوں ان کے حامیوں کا قتل عام ہوا اور ان کی پوری بساط الٹ گئی چنانچہ ان کے طرفداروں ومعتقدوں کو اس طرح قتل کیا گیا کہ ان کے مقتولین کی تعداد کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں، معتزلیوں کے قتل عام کے نتیجہ میں اشعریوں کے لئے میدان صاف ہوگیا اور وہ کسی مخالف کے بغیر اپنی کلامی بحثوں میں مصروف وسرگرم ہو گئے کہ ان کے حامیوں ومعتقدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا حالانکہ ابتداء میں ان کے فقہاء نے ان کلامی موضوعات کو زیر بحث لانا گناہ قرار دیا تھا مگر وہ تمام بحثیں آج تک ان کے درمیان رائج ہیں۔

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے تو انہیں کلامی بحثوں میں دوسروں پر تقدم حاصل تھا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد شیعان اہل بیت علیہم السلام کلامی موضوعات زیر بحث لائے جن میں سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار، عمرو بن الحمق اور دیگر حضرات شامل ہیں اور تابعین میں سے رشید حجری، کمیل، میثم تمار اور دیگر علویون سرفہرست ہیں کہ ان سب کو اُموی حکمرانوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا مگر حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کے دور میں شیعانِ اہل بیتؑ ایک بار پھر منظر عام پر آئے اور مضبوط ہو گئے، چنانچہ انہوں نے علم کلام سے مربوط موضوعات کو ایک بار پھر زندہ کیا اور کتابیں تالیف کیں، ان کی مساعی کو عروج حاصل ہوگیا اور حکومتوں کے ریاستی جبر واستبداد کے باوجود ان کی علمی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ وہ اپنے تحقیقی سفر اور کلامی بحثوں کے انہاک عمل میں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مصروف رہے، بالآخر آل بویہ کے دور حکومت میں جو کہ تقریباً چوتھی صدی ہجری میں تھی انہیں قدرے امن نصیب ہوا لیکن دیگر حکومتوں کی طرف سے بھرپور دباؤ کے نتیجہ میں دوبارہ سختیوں کا شکار ہو گئے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں صفویوں کو ایران میں اقتدار حاصل ہوا تو ایک بار پھر علم وتحقیق کی محفلوں میں رونق آگئی جو کہ آج تک قائم ودائم ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ شیعوں کا کلامی موضوعات میں طرزِ عمل واسلوب بحث اشاعرہ کی نسبت معتزلہ سے زیادہ مشابہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مسالک کی آراء اور بعض نظریات اس قدر ایک دوسرے سے قریب تر ہیں کہ بعض لوگوں کی نظروں میں شیعہ اور معتزلہ کو کلامی بحثوں میں ایک ہی موقف کے حامل سمجھا گیا مثلاً مسئلہ حسن وقبح، مسئلہ ترجیح بلا مرجح، مسئلہ قدر اور مسئلہ تفویض وغیرہ، تو ان موضوعات میں بعض مطالب وآراء کے درمیان پائی جانے والی مشابہت کی بناء پر دونوں مسالک کو ایک مسلک قرار دیا گیا جبکہ ایسا سوچنے والے حضرات غلط فہمی کا شکار ہوئے کیونکہ شیعوں کے نزدیک جو اصول ونظریات قابل قبول سمجھے جاتے ہیں وہ صرف وہی ہیں جو آئمہ اہل بیتؑ سے مروی ہیں جبکہ وہ معتزلیوں کے علمی ذوق سے ہرگز ہم رنگ نہیں۔

بہر حال علم الکلام ایک نہایت پاکیزہ وقابل عزت تحقیقی حوالہ کا امین ہے کہ جس کا مقصد ومقصود دینی برحق معارف کا

دفاع کرنا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان متکلمین یعنی علم الکلام کے ماہرین و محققین نے طریقہ بحث میں بگاڑ پیدا کر دیا اور وہ عقلی احکام کے درمیان تمیز نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں اصل حقیقت اور عام قبول کئے جانے والے امور میں خلط ملط کا شکار ہو گئے کہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت عنقریب پیش ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ اسی دور میں قدیمی علوم مثلاً منطق، ریاضیات، طبعیات، الٰہیات، طب و عملی حکمت سب کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا، اس کام کا کچھ حصہ اموی حکمرانوں کے دور میں ہوا اور عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا چنانچہ سینکڑوں کتب کا یونانی، رومی، ہندی، فارسی اور سریانی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کر دیا گیا اور لوگ ان علوم کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان علوم کے ماہرین و اہل نظر حضرات منظر عام پر آ گئے اور انہوں نے مربوطہ علوم میں وقیع کتب و رسائل تحریر کئے اس صورتحال نے اس دور کے علماء کے غیض و غضب کی آگ کو شعلہ ور کر دیا بالخصوص جب وہ علماء ملحدوں یعنی دھریوں علم الطبیعہ کے ماہروں اور مانویوں کی طرف سے دین اسلام کے مسلمات کے خلاف برسر پیکار دیکھتے تھے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے غصہ کی شدت اس وقت مزید بڑھ جاتی تھی جب وہ مسلمان فلسفی نما لوگوں کو دیکھتے کہ وہ دینی معارف کی کمزوریاں تلاش کرنے کی راہ پر چل رہے ہیں اور دینداروں کو بے بنیاد تنقید کا نشانہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اسلام کے پختہ اصولوں اور شریعت مقدسہ کی پاکیزہ تعلیمات کا مذاق اُڑانے کو اپنا معمول بنا چکے ہیں، (سچ ہے کہ جہالت سے بڑی بیماری کوئی نہیں)، اس کے علاوہ علماء کے غیض و غضب میں مزید اضافہ اس وقت ہوتا تھا جب انہیں پتہ چلتا کہ ان حضرات نے بعض ان مسائل میں اپنی رائے کا اظہار کیا جو ان اصولوں پر مبنی ہیں جو علم ہیئت اور علم الطبیعہ سے ماخوذ ہیں مثلاً بطلیموسی افلاک کا وجود اور ان کا طبع خامس ہونا اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہونے کا ناممکن ہونا، افلاک و فلکیات کا شخصی حوالہ سے اور عناصر کا نوعی حوالہ سے قدیم ہونا اور تمام انواع کا قدیم ہونا وغیرہ، تو اس طرح کے مسائل وضع شدہ اصولوں پر مبنی ہیں کہ علم فلسفہ میں ان پر کوئی برھان قائم نہیں کی گئی لیکن فلسفی نما جاہلوں کی طرف سے انہیں برھانی مسائل میں قرار دیا جاتا تھا اور ملحدوں (دھریوں) اور ان جیسے دیگر لوگوں نے کہ اس دور میں جو اپنے آپ کو فلاسفہ میں شمار کرتے تھے ان مسائل میں اپنے باطل نظریات شامل کر دیتے تھے مثلاً مسئلہ تناسخ اور معاد کا ناممکن ہونا بالخصوص جسمانی معاد کا محال ہونا، تو وہ ان مسائل کے ذریعے دینی ظواھر کو محکوم کرنے کی سعی کرتے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض حضرات نے شاید یہاں تک کہہ دیا کہ دین ان چند تقلیدی اعمال کے مجموعہ کا نام ہے کہ جنہیں انبیاء کرام سادہ لوح افراد کی تربیت اور ان کی عقلوں کو سدھارنے کے لئے لائے ہیں لیکن تعلیم یافتہ لوگ یعنی فلاسفہ کو جن کا کام ہی حقیقی علوم میں بحث و تمحیص ہے انہیں ان تقلیدی مسائل کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ خود اہل نظر ہیں اور طریقہ استدلال میں مستقل رائے رکھتے ہیں لہٰذا انہیں کسی تقلیدی یعنی بلادلیل امر سے کوئی سروکار نہیں۔

ان فلسفی نما افراد کے کافرانہ نظریات نے فقہاء و متکلمین کو ان کا مقابلہ کرنے اور ان کے خلاف قیام کرنے کی راہ پر لا کھڑا کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کا قلع قمع کر دیں خواہ یہ کام ان سے بھرپور مناظرے کر کے کریں یا لوگوں کو ان کے خلاف میدان میں لا کر کریں خواہ ان سے اظہار برائت کر کے اور ان کی تکفیر کر کے کریں، چنانچہ فقہاء و متکلمین کی کاوشیں رنگ لائیں اور متوکل عباسی کے دور کے آخری ایام میں ان لوگوں کی بساط لپیٹ دی گئی اور ان کے حصے بخرے کر دیئے گئے اور ان کی کتب محو و نابود کر دی گئیں، اس صورتحال میں علم فلسفہ کے کلی طور پر خاتمہ کا نقارہ بجنے کو تھا کہ معلم ثانی ابونصر فارانی (متوفی ۳۳۹) پھر ان کے بعد شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا (متوفی ۴۲۸) نے اسے حیاتِ تازہ بخشی، پھر ان دو حضرات کے علاوہ علم فلسفہ کے سپوتوں مثلاً ابوعلی بن مسکویہ اور ابن رشد اندلسی اور دیگر حضرات نے علم فلسفہ کو پروان چڑھایا مگر اس کے بعد علم فلسفہ پر اتار چڑھاؤ کا ایسا سلسلہ چل پڑا کہ کبھی اس میں قوت اور کبھی ضعف پیدا ہوتا رہا۔

اگرچہ علم فلسفہ ابتداء ہی میں دنیائے عرب میں آ گیا تھا لیکن عربوں میں شاذ و نادر ہی ایسے حضرات پیدا ہوئے جو فیلسوف کہلائے مثلاً کندی اور ابن رشد اور آخر میں سرزمین ایران ہی اس کا ٹھکانہ بنی اور مسلمان متکلمین نے اگرچہ فلسفہ کی علی الاعلان مخالفت کی اور فلاسفہ کے خلاف شدید ترین تحریک چلائی لیکن ان کی اکثریت نے علم منطق کو تسلیم کیا اور اس میں کتب و رسائل تالیف کئے کیونکہ انہوں نے اسے فطری طرز استدلال کے عین مطابق پایا مگر افسوس جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان حضرات نے اسے استعمال کرنے میں غلطیاں کیں چنانچہ انہوں نے حقیقی "حدود" اور ان کے اجزاء کو مجازی مفاھیم میں شامل کر دیا اور اعتباری و مجازی امور میں منطقی برہان کو استعمال کیا جبکہ ان میں قیاس جدلی کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اصول کارگر ثابت ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات کلامی موضوعات مثلاً حسن و قبح، ثواب و عقاب، حبط و فضل کی بابت ان کے "جنس"، "فصل" اور "حد" کے حوالہ سے بحث و اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان امور کا "حد" وغیرہ سے کیا ربط ہے؟ اسی طرح وہ حضرات اصولی و کلامی مسائل میں کہ جن کا تعلق فروع دین سے ہے "ضرورت" (لازمی ہونے) اور "امتناع" (ممنوع و محال ہونے) کے حوالہ سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ ان کا ایسا کرنا مجازی و "اعتباری" امور میں حقائق کا سہارا لینے کے باب سے ہے، اور اس سے بالاتر یہ کہ وہ حضرات ان امور کے بارے میں جن کی برگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے دلیل و برہان کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں کام کا انجام دینا اللہ تعالیٰ پر واجب و لازمی ہے اور فلاں کام کا انجام دینا قبیح و بُرا ہے تو اس طرح وہ لوگ از خود طے کئے ہوئے امور کو حقائق پر فوقیت و برتری دیتے ہیں بلکہ ان پر حاکم قرار دیتے ہیں اور ایسا کرنے کو "برھان" سے موسوم کرتے ہیں جبکہ ایسا کرنا درحقیقت شعری قیاس کے سوا کچھ نہیں وہ حضرات اپنے افراطی طرز تفکر میں اس حد تک پہنچ گئے کہ ان میں سے بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس اس سے منزہ و بالاتر ہے کہ وہ اپنے احکام و افعال کو "امور اعتباریہ" میں سے کسی امر پر مبنی قرار دے کیونکہ "امور اعتباریہ" کی

حقیقت ان کا موہوم ہونا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے تکوین وتشریع کے تمام سلسلے حقیقی امور ہیں نہ کہ امور اعتبار یہ! اوران حضرات میں سے کسی شخص نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے کہ کوئی حکم صادر فرمائے مگر اس حکم کے صادر کرنے پر دلیل و برھان قائم نہ ہو سکے لہٰذا تکوینی وتشریعی تمام امور میں ''برھان'' کی گنجائش پائی جاتی ہے اور مؤثر ہے تو اس طرح کے اقوال و نظریات ان حضرات نے پیش کئے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی کی قسم میں انہیں علم واہل علم کے مصائب کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکتا، ان حضرات کا ان بے بنیاد مطالب کو علمی محفلوں میں زیر بحث لانا مزید شدید ترین مصیبت کے سوا کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا آراء ونظریات کے ہجوم میں مسلمانوں کے درمیان ایک اور مسلک نے سر اُٹھایا یعنی ''تصوف''! کہ جس کی اصل بنیاد خلفاء کے دور میں پڑ چکی تھی لیکن اس زمانہ میں تصوف کی بجائے زہد کے نام سے اسے موسوم کیا جاتا تھا، پھر بنی عباس کے ابتدائی دور میں تصوف کا چرچا اس مسلک کے چند سپوتوں کے منظر عام پر آنے سے مزید بڑھ گیا جن میں ابویزید بسطامی، جنید، شبلی اور معروف کرخی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

اس مسلک کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ حقیقی انسانی کمال کے حصول اور حقائق المعارف تک رسائی کا واحد راستہ ''طریقت'' ہے جس سے مراد یہ ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے شرعی ریاضت اپنائی جائے، چنانچہ اس مسلک کے بزرگوں خواہ وہ شیعوں میں سے ہوں یا اہل سنت میں سے ان سب کی نسبت حضرت علی علیہ اسلام کی طرف دی جاتی ہے۔

اہل تصوف حضرات چونکہ کرامات کے مدعی تھے اور ایسے امور کا بیان وذکر کرتے تھے جو دینی ظواھر اور عقل سے تناقض رکھتے ہیں اور وہ ان کی بابت یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان امور کے معانی کا فہم وادراک اہل ظاہر کے بس کا روگ نہیں لہٰذا ان کے ان اظہارات پر فقہاء وعامۃ الناس خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے ان کے خلاف آواز اُٹھائی اور ان سے برائت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تکفیر کی یہاں تک کہ انہیں قید خانوں میں ڈالا گیا انہیں کوڑے مارے گئے قتل کیا گیا پھانسی دی گئی شہر بہ شہر پھرایا گیا اور علاقہ بدر کر دیا گیا، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ لوگ نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ کھلے لفظوں میں اپنے اقوال ونظریات کو شریعت کے اسرار سے موسوم کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ان حضرات کا مدعیٰ قرین صحت ہوتا اور وہی اصل حق وحقیقت ہوتا اور دینی ظواھر کی حیثیت گٹھلی کے چھلکے جیسی ہوتی کہ جن کا اظہار وبیان ضروری ہوتا تو شریعت لانے والی ہستی خود یہ کام کرتی کیونکہ انہیں ایسا کرنے کا دوسروں سے زیادہ حق حاصل تھا اور وہ خود اپنی زبان سے ان مطالب کو بیان کرتے اور اگر ان کے نظریات وآراء حق وحقیقت پر مبنی نہیں تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حق کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سراسر گمراہی ہے۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ ان حضرات نے اپنے مسلک کے ابتدائی ایام میں اسے ''طریقت'' کے نام سے موسوم نہیں کیا بلکہ صرف لفظی دعووں پر اکتفاء کی پھر تیسری صدی ہجری کے بعد جب لوگوں کے دلوں میں کچھ جگہ بنالی تو اپنے

عقائدوآراء پر مشتمل کتب کی تالیف کا کام کیا، اس کے بعد اس سلسلہ کو مزید بڑھاتے ہوئے کھل کر سامنے آ گئے اور اپنے نظریات کو صریح طور پر ''حقیقت'' و ''طریقت'' کے عنوان سے آشکار کرنے میں منہمک ہو گئے چنانچہ اس حوالہ سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کے عقائد نظم و نثر دونوں میں پھیل گئے اس طرح ان کی مقبولیت و شہرت عام ہوتی چلی گئی اور ان کے حامیوں وطرفداروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا کہ لوگوں کے دل ان سے وابستہ ہو گئے یہاں تک کہ چھٹی اور ساتویں صدیوں میں اپنے عروج وکمال کی بلندیوں کو چھونے لگے اور ہر طرف ان کے بہی خواہوں کا جال بچھ گیا مگر رفتہ رفتہ ان کی رفعتوں وسربلندیوں کا سورج غروب ہونے لگا اور ان کی کجرویوں و بے ربط باتوں کی وجہ سے عامۃ الناس ان سے منہ موڑنے لگے، اگر ان کے انحطاط وزوال کے اسباب پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ اس کی بنیادی وجوہات دو تھیں:

(۱) ہر وہ چیز جس کا تعلق عامۃ الناس کی زندگی کے بنیادی امور سے ہو اس کی بابت جب لوگوں کی توجہات میں شدت پیدا ہو اور ان کے دل اس کے کعبۂ جمال کا طواف کرنے لگیں تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس صورتحال میں ذاتی مفادات حاصل کرنے والے افراد موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل میں اپنے آپ کو اس سے مربوط ظاہر کرتے ہیں اور خود اس کا اصل مالک ووارث گردانتے ہوئے ایسے اعمال انجام دیتے ہیں جن سے ان کے مخصوص مقاصد و مفادات کا تحفظ ہوتا ہے مگر وہ چیز اپنی اصل حیثیت وحقیقت کھو دیتی ہے، یہی حال ان حضرات کے عقائد ونظریات کی بابت ہوا کہ ان کے پرکشش لفظوں اور دلفریب مطالب نے لوگوں کو اس مسلک کا گرویدہ کر دیا اور وہ جوق در جوق اس کے شیدائی و فدائی ہوتے چلے گئے مگر بعض عناصر نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اندر سے کھوکھلے الفاظ کی جمالیات کے اسیر لوگوں کو اپنے مخصوص مقاصد واہداف کی بھینٹ چڑھا دیا جس سے لوگوں کے دلوں میں اس مسلک کے بارے میں نفرت بھرے جذبات پیدا ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی بساط الٹ گئی۔

(۲) اس مسلک کے بزرگوں ومشائخ اور بعض سپوتوں نے معرفت نفس کے حوالہ سے یہ کہا کہ طریقت ایک نو پیدا طریقہ ہے کہ جسے شریعت کے بانی نے اپنے مربوطہ دستورات میں ذکر نہیں کیا لیکن اس کے باوجود وہ ایسا پسندیدہ طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اسی طرح پسند فرمایا ہے جس طرح عیسائیوں کے درمیان نئے ظہور پذیر ہونے والے طرزِ عمل یعنی رہبانیت کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا، حالانکہ ان کے یہ اظہارات سراسر بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بارے میں واضح لفظوں میں یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ حدید، آیت ۲۷

''وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا''

(اور وہ رھبانیت کہ جس کی بدعت انہوں نے قائم کی جبکہ ہم نے اس کا حکم ان پر صادر نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی رضا وخوشنودی کی راہ اپنائیں لیکن انہوں نے رھبانیت کا حق ادا نہیں کیا اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا)

مسلک تصوف کے پیروکاروں کی اکثریت نے اس بدعت کو تسلیم کیا جس کے نتیجہ میں ان کے لئے یہ راستہ کھل گیا کہ وہ اپنے مسلک کے لئے ایسے آداب ورسوم ایجاد کریں جن کا شریعت میں کوئی نام ونشان ہی نہیں ملتا، ان کا یہ طرزِ عمل مزید وسعت اختیار کرتا چلا گیا اور نت نئی بدعت کی بنیاد ڈالنا اور شریعت سے منہ موڑنا ان کا معمول بن گیا یہاں تک کہ شریعت اور طریقت دونوں آمنے سامنے قرار پا گئے جس کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ احکام شریعت بازیچۂ اطفال بن گئے اور دینی شعائر کی حرمت پامال ہوگئی اور واجبات کو پس پشت ڈال دیا گیا، فرائض الٰہی سے روگردانی کی گئی بالآخر ملنگوں جیسے گروہ منظر عام پر آگئے اور پھر تصوف کو تماشہ گہ خاص وعام سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل نہ ہوئی اور اس کے نام لیواؤں نے ''فناء فی اللہ'' کے نام پر افیون وبھنگ کے استعمال کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور عادت بنالیا، کہ ان کی پہچان ہی انہی کاموں سے ہونے لگی۔

اور اس حوالہ سے جہاں تک کتاب وسنت کا تعلق ہے جو کہ عقل کی پیروی کرنے کا راستہ دکھاتے ہیں تو ان سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ شرعی ظواھر کے نیچے وہ حقائق موجود ہیں جو ان ظواھر کے باطنی امور ہیں لہٰذا اسی کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے اور یہی حق ہے، اور یہ بات بھی حق ہے کہ انسان ان باطنی امور تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، لیکن اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ انہی ظواھر ہی سے کام لیا جائے اور وہ بھی اس طرح سے کہ جس طرح ان سے کام لینے کا حق اور صحیح طریقہ ہے لہٰذا اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ استعمال نہ کیا جائے اور ہرگز اس بات کا تصور بھی نہ کیا جائے کہ کوئی ایسا باطن موجود ہے کہ کوئی ظاہر اس کی طرف رہنمائی نہیں کرتا، ظاہر تو باطن کا عنوان وپہچان اور آئینہ ہوتا ہے اور اس بات کا تصور بھی نادرست ہے کہ حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان چیزوں سے زیادہ قریب تر کوئی شے ہے جن کی رہنمائی شارع مقدس نے فرمائی ہے یا یہ کہا جائے کہ خداوند عالم نے (معاذ اللہ) اس سے غفلت برتی یا تساھل ولاپرواہی سے کام لیا یا کسی خاص وجہ سے اسے مورد توجہ قرار نہیں دیا (معاذ اللہ) جبکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یوں ارشاد فرمایا ''وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' (اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تاکہ ہر چیز واضح طور پر بیان ہوسکے)۔ سورۂ نحل۔ آیت ۸۹۔

خلاصہ بحث یہ کہ حقائق کی بابت بحث کرنے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں:

(۱) دینی ظواھر

(۲) عقلی اصولِ بحث وتحقیق

(۳) تصفیہ نفس

ان تینوں طریقوں میں سے ہر ایک کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنالیا جبکہ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ ان تینوں

کے درمیان ایک دوسرے کے حوالہ سے تحفظات کا بازار گرم ہے اور وہ ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے ہیں ان کا حال مثلث کے تین زاویوں جیسا ہے کہ جس زاویہ کی مقدار میں اضافہ ہوگا اتنا ہی دوسرے دوزاویوں میں کمی پیدا ہوتی چلی جائے گی اور اسی طرح بالعکس! یہی حال تفسیر قرآن کے حوالہ سے ہے کہ مفسرین کے علمی ذوق ونظر میں فرق کے نتیجہ میں تفسیری جہات بھی مختلف ہوتی ہیں چنانچہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ مفسر اپنی علمی رائے وموقف کو قرآن پر مسلط کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس ہونا چاہیے اور وہ یوں کہ قرآن کو اپنی رائے وموقف کی بنیاد اور اساس قرار دے ایسا کرنے والے مفسرین بہت کم ہیں۔

سابق الذکر مطالب سے آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں کہ مذکورہ بالا تین طریقوں میں سے قرآن مجید صرف اسی طریقہ کی تصدیق کرتا ہے جو حق ہے اور یہ بات نا قابل تصور ہے کہ کوئی باطن حق ہو مگر اس کا ظاہر اس سے مطابقت و موافقت نہ رکھتا ہو، اور یہ بھی قابل تصور نہیں کہ قرآن مجید میں کوئی حق ہو خواہ باطن میں ہو یا ظاہر میں ہو کہ عقلی برھان اس کی نفی کرے یا اس کے مدمقابل قرار پائے۔

یہی وجہ ہے کہ چند علماء نے اپنی علمی قابلیت وصلاحیت کے مطابق اپنے تمام تر نظریاتی ومسلکی اختلافات کے باوجود دینی ظواھر اور عرفانی مسائل کے درمیان ہماھنگی اور ہمرنگی پیدا کی مثلاً ابن عربی، عبدالرزاق کاشانی، ابن فہد، شہید ثانی اور فیض کاشانی۔

بعض حضرات فلسفہ کے درمیان ہمرنگی پیدا کرنے میں کوشاں ہوئے مثلاً ابونصر فارابی، شیخ سہروردی، شیخ صائن الدین محمد ترکہ۔

بعض حضرات نے کوشش کی کہ دینی ظواھر اور علم فلسفہ کے درمیان قرب کو فروغ دیں مثلاً قاضی سعید وغیرہ۔

بعض حضرات نے ان تینوں طریقوں کے درمیان ہمرنگی پیدا کرنے کی سعی کی مثلاً ابن سینا نے اپنی تفسیروں اور دیگر کتابوں اور صدر المتالہین شیرازی نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں اور چند دیگر ان دانشوروں نے اس سلسلہ میں اپنی کاوشیں بروئے کار لائیں جو ان دو حضرات یعنی ابن سینا اور ملا صدرا کے بعد آئے۔

لیکن ان تمام تر کوششوں ومساعی کے باوجود ان تین طریقوں میں پایا جانے والا جوھری اختلاف جوں کا توں ہے بلکہ اس اختلاف کا قلع قمع کرنے کی جتنی زیادہ کوششیں ہوئیں اتنا ہی اس میں اضافہ ہوتا گیا اور جس قدر اس اختلاف کی آگ بجھانے کے اقدامات عمل میں لائے گئے اتنا ہی وہ آگ زیادہ بھڑک اُٹھی، اور آپ خود اس سلسلہ میں جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان علوم وفنون کے ماہرین میں سے ہر شخص دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتا ہے اور اسے جاہل، بے دین، بے وقوف قرار دیتا ہے جبکہ عامۃ الناس ان سب سے برائت ولاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر سنگین وافسوس ناک صورتحال اسی دن سے پیدا ہوئی جب مسلمانوں نے قرآن مجید کی

اجتماعی تفکر کی دعوت سے روگردانی کا ارتکاب کیا حالانکہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا:

○ ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'' سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۳

(اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ پیدا نہ کرو)

خدایا ہمیں اس چیز کی ہدایت فرما جس میں تیری رضا و خوشنودی ہے اور ہم سب کو حق پر ہمصدا اقرار دے اور اپنی طرف سے ہمیں ولی وسرپرست عنایت فرما اور ہمیں اپنی طرف سے مددگار رحمت فرما!

روایات پر ایک نظر!

ابن عباس کا بیان:

تفسیر ''درمنثور'' میں آیۂ مبارکہ ''يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا'' (اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو تمہارے لئے بہت سی چیزوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے) کے ذیل میں مذکور ہے کہ ابن ضریس، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسے صحیح السند قرار دیتے ہوئے ابن عباس کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: جو شخص رجم (زنا کرنے والے کو سنگسار کرنے کی سزا) کا انکار کرے گویا اس نے نادانستہ طور پر پورے قرآن کا انکار کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے ''يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ'' (اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو بہت سی ان باتوں کو واضح طور پر تمہارے لئے بیان کرتا ہے جنہیں تم قرآن سے چھپاتے ہو) ابن عباس نے کہا کہ سنگسار کرنے کی سزا کا حکم ان امور میں شامل تھا جو وہ چھپاتے تھے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۶۹)

ابن عباس کا مذکورہ بالا بیان ان مطالب کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ ''يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ۔۔۔'' کی تفسیر میں ذکر کئے جائیں گے کہ عہد نبویؐ میں سنگسار کرنے کے حکم کو یہودی چھپاتے تھے کہ جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھول کر بیان فرمایا۔

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ ''يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ'' کے ذیل میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا ''فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ'' سے مراد وہ عرصہ ہے جب رسولوں کے آنے کا سلسلہ رک گیا

تھا۔ (تفسیر القمی، جلد اوّل صفحہ ۱۶۴)

پانچ سو سال:

کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابوحمزہ ثابت بن دینار ثمالی اور ابوربیع کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم حضرت امام محمد باقرؑ کے ہمراہ اس سال حج پر گئے جس سال ہشام بن عبدالملک بھی حج ادا کرنے گیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ عمر بن خطاب کا آزاد کردہ غلام نافع بھی تھا اس نے دیکھا کہ کعبہ کے ایک کونہ میں ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے پاس لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس نے ہشام سے کہا: اے امیر المومنین! یہ شخص کون ہے جس کے اردگرد اس قدر لوگ جمع ہیں؟ اس نے کہا: یہ کوفہ والوں کا نبی ہے، یہ محمد بن علی ہے، نافع نے کہا: آپ گواہ رہیں میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں اور اس سے وہ مسائل پوچھتا ہوں کہ جن کا جواب نبی یا نبی کے وصی کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا، ہشام نے کہا: جاؤ اور اس سے وہ مسائل پوچھو، شاید تم اسے شرمندہ کرسکو، چنانچہ نافع آگے بڑھا اور لوگوں کے کندھوں کا سہارا لیتے ہوئے بالآخر امام محمد باقرؑ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اس نے امامؑ سے کہا: اے محمد بن علی! میں نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن کو پڑھا ہوا ہے اور میں ان کتب میں مذکور حلال وحرام امور سے بخوبی آگاہی رکھتا ہوں، میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے وہ مسائل پوچھوں جن کا جواب سوائے کسی نبی یا نبی کے وصی کے کوئی شخص نہیں دے سکتا، امام محمد باقرؑ نے اس کی بات سن کر سر اُٹھایا اور فرمایا: سل عما بدالك، جو کچھ تمہاری نظر میں ہے پوچھو، اس نے کہا: یہ بتایئے کہ عیسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان کتنا زمانی فاصلہ ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میں تجھے اپنا نظریہ بتاؤں یا تیرا نظریہ بتاؤں؟ اس نے کہا: دونوں بتائیں، امامؑ نے فرمایا: میرے مطابق پانچ سو سال جبکہ تیرے مطابق چھ سو سال کا فاصلہ ہے۔ (روضہ کافی، جلد ۸ صفحہ ۱۲۱)

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ آیات مبارکہ کے اسباب نزول کی بابت مختلف روایات ذکر کی گئی ہیں چنانچہ طبری نے عکرمہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنگسار کرنے کی سزا کے بارے میں پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم میں سے سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے ابن صوریا کی طرف اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کیا انہوں نے رجم کے حکم کو اپنی کتابوں میں دیکھا ہے؟ ابن صوریا نے جواب میں کہا: جب ہماری قوم میں زنا عام ہوگیا تو ہم زنا کار کو سو کوڑے مارتے تھے اور اس کا سر مونڈ دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ یہودی زنا کار شخص کو سنگسار کیا جائے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''یَآ اَھْلَ

الْكِتٰبِ--تا--صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ''(جامع البیان، جلد ۶ ص ۱۰۴)

اللہ کے بیٹے اور دوست؟:

طبری نے ایک روایت ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ابن اُبی حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے ساتھ بحری بن عمرو اور شاس بن عدی بھی تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بحث و گفتگو کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اللہ کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا، انہوں نے کہا: اے محمد، آپ ہمیں کیوں ڈرا رہے ہیں؟ بخدا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں، اس وقت یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ''وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ''(تفسیر جامع البیان طبریؔ، جلد ۶ صفحہ ۱۰۶)

طبری نے ابن عباس ہی کے حوالہ سے ایک یہ روایت بھی ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا: حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور اس کی بابت انہیں ترغیب دلائی اور اللہ کے عذاب سے بھی ڈرایا مگر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ماننے سے انکار کر دیا چنانچہ معاذ بن جبل، سعد بن عبادہ اور عقبہ بن وھب نے ان سے کہا: اے یہودیو، خدا سے ڈرو، بخدا تمہیں معلوم ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور تم ہی اس کی بعثت سے پہلے اس کا تذکرہ ہمارے سامنے کرتے تھے اور ہمیں اس کی صفات و نشانیاں بتاتے تھے، اس وقت رافع بن حریملہ اور وھب بن یہود نے کہا: ہم نے آپ لوگوں سے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کہا، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں کی، اور نہ ہی ان کے بعد کوئی بشیر و نذیر بھیجا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ''

(جامع البیان جلد ۶ صفحہ ۱۰۷) اسی روایت کو سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں ابن عباس اور ان کے علاوہ دیگر اسناد سے ذکر کیا ہے اور اس کے علاوہ اس سلسلہ میں دیگر روایات بھی ذکر کی ہیں۔

ان روایات کے مندرجات سے دیگران روایات کی طرح جو اسباب نزول کی بابت ذکر کی گئی ہیں یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب آیات مبارکہ کے مندرجات پر وقوع پذیر ہونے والے امور کی تطبیق کے باب سے ہیں کہ بیان کرنے والوں نے ان واقعات کی آیات سے تطبیق دی اور پھر ان واقعات کو آیات شانِ نزول قرار دے کر بیان کیا جبکہ شانِ نزول کی بابت ذکر کی جانے والی روایات میں مذکور واقعات اسباب نزول نہیں بلکہ نظریات کے اسباب ہیں اور جہاں تک آیات کا تعلق ہے تو وہ نزول کے حوالہ سے مطلق ہیں۔

آیات ۲۰ تا ۲۶

○ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰

○ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۱

○ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝۲۲

○ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚۛ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۳

ترجمہ

○ ''اور جب موسیٰ نے اپنی اُمت سے کہا: اے میری اُمت! تم اس نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں نوازا ہے کہ تم میں انبیاء قرار دیئے اور تمہیں ملوک بنایا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو کائنات میں کسی ایک کو بھی عطا نہیں کیا'' (۲۰)

○ ''اے میری اُمت! تم اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ کہ جو اللہ نے تمہارے لئے مخصوص و مقدر کی ہے اور تم اپنے پچھلے پاؤں نہ پلٹو ورنہ خسارہ میں رہوں گے'' (۲۱)

○ ''اُنہوں نے کہا: اے موسیٰ! اس میں جابر لوگ رہتے ہیں اور جب تک وہ لوگ اس سے نہیں نکلتے ہم اس میں داخل نہیں ہوں گے، اگر وہ اس سے باہر نکل جائیں تو ہم ضرور اس میں داخل ہوں گے'' (۲۲)

○ ''جن لوگوں کے دلوں میں خوف تھا ان میں سے دو اشخاص نے کہ جن کو اللہ نے نعمت سے نوازا بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس سرزمین میں اس کے دروازہ سے داخل ہو جاؤ، پس جب تم اس میں داخل ہو گے تو یقیناً تم ہی غلبہ پاؤ گے'' (۲۳)

○ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿۲۴﴾

○ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۵﴾

○ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۶﴾

○ ''انہوں نے جواب دیا: اے موسیٰ! ہم اس میں اس وقت تک ہرگز کبھی داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ اس میں موجود ہیں پس تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے قتال کرو، ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں''(۲۴)

○ ''موسیٰ نے کہا: اے میرے پروردگار! میں صرف اپنے اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں، تو ہمارے اور ان فاسق لوگوں کے راستے جدا کردے''(۲۵)

○ ''خدا نے کہا: وہ سرزمین ان لوگوں پر چالیس سال تک حرام کردی گئی ہے وہ زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں اور آپ ان فاسقوں کی حالت پر غمگین نہ ہونا''(۲۶)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ ماقبل آیات سے بے ربط نہیں بلکہ ان میں مذکور مطالب سابقہ آیات کے مضامین سے پیوستگی کے حامل ہیں کیونکہ سابقہ آیات میں یہودیوں کی طرف سے دعوت اسلام قبول کرنے کا انکار اور ڈھٹائی کا، تذکرتھا اور ان آیات میں ان کی طرف سے عہد شکنی کے ارتکاب کو بیان کیا گیا ہے کہ ان سے جو پختہ عہد و میثاق لئے گئے تھے انہوں نے ان سب کی خلاف ورزی کی اور یہ کہ انہوں نے اپنے وعدہ کو پورا نہ کیا جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی اطاعت و فرماں برداری کی بابت کیا تھا بلکہ ان کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور حضرت موسیٰؑ کی دعوت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، ان کی اس عہد شکنی اور اللہ کے نبیؑ کی کھلی مخالفت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں سرگردانی وفکری بے ثباتی کے مرض میں مبتلا کر دیا جو کہ سخت ترین عذاب الٰہی ہے۔

بعض روایات میں مذکورہ مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے ابتدائی ایام میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں کہ اس سلسلہ میں ''روایات پر ایک نظر'' میں بعض مربوط مطالب ذکر کئے جائیں گے انشاء اللہ۔

نعمت الٰہی کی یاددھانی:

○ ''وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ''

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اس نعمت الٰہی کو یاد کرو جو اس نے تمہیں عطا کی ہے)

جو آیات حضرت موسیٰؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان کا مطالعہ اور ان پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ زیر بحث واقعہ۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کا اپنی قوم کو سرزمین مقدس میں داخل ہونے کی دعوت دینا۔ ان لوگوں کے مصر سے نکل جانے کے بعد کا ہے، جیسا کہ اس آیت میں جملہ ''وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا'' (اور ہم نے تمہیں بادشاہ بنایا) سے بھی اسی مطلب کا ثبوت ملتا ہے۔

اور جملہ ''وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے متعدد معجزات رونما ہو چکے تھے مثلاً من وسلویٰ کا آنا، پتھر سے چشموں کا پھوٹنا اور بادل کا ان پر سایہ افگن ہونا۔

اور جملہ ''اَلْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' جو کہ دو بار ذکر ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اپنی قوم کو مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دینے سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے اللہ کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب متعدد بار ہو چکا تھا اور ان کی طرف سے بار بار معصیت کی وجہ سے انہیں ''فاسقین'' کہا گیا اور ''فسق'' جیسی نہایت بری صفت سے متصف کیا گیا۔

مذکورہ بالا قرائن و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ یعنی حضرت موسیٰؑ کا انہیں مقدس سرزمین میں آنے کا حکم دینا اور ان کا اس کی نافرمانی کرنا کہ جس کے نتیجہ میں وہ سرگردانی و فکری عدم توازن کا شکار ہوئے، یہ سب کچھ حضرت موسیٰؑ کی زندگی اور بنی اسرائیل کے پاس قیام کے آخری دنوں میں ہوا اور حضرت موسیٰؑ کے حوالہ سے قرآن مجید میں جن واقعات کا تذکرہ ہوا وہ سب اس واقعہ سے پہلے رونما ہوئے، لہٰذا حضرت موسیٰؑ کا ان لوگوں سے یہ کہنا کہ تم یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تمہیں عطا کی (اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ) میں وہ سب نعمتیں مقصود و ملحوظ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عطا فرمائیں اور انہیں ان سے نوازا، اور انہیں مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دینے سے پہلے خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو یاد دلانے کا مقصد انہیں ذہنی طور پر اس حکم کو قبول کرنے اور اس پر فوراً اور خوشی سے عمل کرنے کے لئے آمادہ کرنے کو یقینی بنانے کے لئے تھا تا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ ان پر اپنی مزید نعمتیں نازل فرمائے اور اپنی عنایات کے دروازے ان پر کھول دے کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں جن نعمتوں سے نوازا ان میں حضرت موسیٰؑ کا ان کی طرف مبعوث کرنا اور حضرت موسیٰؑ کا انہیں دین حق کی پیروی کی دعوت و رہنمائی کرنا، انہیں فرعون کے ظلم و جور سے نجات دلانا، ان کی ہدایت کے لئے تورات کو نازل کرنا اور مخصوص شریعت کا ان کے لئے مقرر کرنا شامل ہے کہ ان نعمتوں کے بعد نعمتوں کی تکمیل کے سلسلہ میں سوائے اس کے اور کوئی کام باقی نہ تھا کہ وہ ایک مقدس سرزمین میں آباد ہوں اور پورے استقلال و آزادی اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

اللہ تعالیٰ نے جو نعمت انہیں عطا فرمائی اور حضرت موسیٰؑ نے اس نعمت کی یاد دہانی کروائی اس کا تذکرہ ان آیات مبارکہ میں تین صورتوں میں ہوا اور ان کی تفصیل یوں بیان ہوئی:

(۱)　''اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ''

(۲)　''وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا''

(۳)　''وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ''

پہلی نعمت: اس کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ''اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ'' کہ تم میں انبیاء قرار دیئے، اس نعمت کی عظمت یہ ہے کہ اس میں جن انبیاء کا حوالہ دیا گیا ہے ان کے نسبی سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کرام نمایاں ہیں، یا یہ کہ اس سے بالخصوص بنی اسرائیل میں سے انبیاء مراد ہیں کہ جن میں حضرت یوسفؑ یا اسباط اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ مقصود ہیں، اور نبوت خود ایک عظیم نعمت خداوندی ہے۔

دوسری نعمت: اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ''وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا'' (اور تمہیں بادشاہ قرار دیا)، اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں استقلالی حیثیت عطا کی کہ تم فرعونیوں کی غلامی سے آزاد ہو گئے اور جابروں و آمروں کی اسارت و جبر سے نجات پا گئے، یہاں یہ نکتہ نہایت قابل توجہ ہے کہ لفظ ''ملوک'' جو کہ ''ملک'' کی جمع کا صیغہ ہے اس میں ''ملک'' سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو شخص اپنی ذات، اپنے اہل و خاندان اور اپنے اموال میں استقلال رکھتا ہو اسے ''ملک'' کہتے ہیں، یعنی وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال اور خاندان اور اپنے اموال کے بارے میں خود فیصلہ کر سکتا ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی جبر نہیں، اور تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے دور میں بنی اسرائیل نہایت عمدہ اجتماعی طرزِ زندگی کے حامل تھے جو کہ توحیدی طرز عمل ہے کہ جس میں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری پر مامور تھے اور معاشرے میں کامل عدل اپناتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کا عملی احترام و تحفظ یقینی بنائیں اور کسی فرد و قوم سے زیادتی و بے عدالتی کے مرتکب نہ ہوں اور اس سلسلہ میں پورے استقلال کے ساتھ عمل کریں اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہی افراد کو مسند اقتدار پر بٹھانے اور معاشرے میں طبقاتی ماحول پیدا کرنے سے اجتناب کریں کہ ایسا کرنے سے ان کا معاشرتی وقار و استحکام خطرے میں پڑ سکتا ہے، اور وہ صرف اور صرف حضرت موسیٰؑ کا حکم مانیں کہ جو اللہ کی طرف سے ان کے لیے نبی و ھادی اور حاکم مقرر کئے گئے ہیں جو کہ نہ تو دیگر سلاطین جیسے سلطان و بادشاہ ہیں اور نہ ہی کسی قوم کی سرداری کا تاج اُن کے سر پر رکھا ہوا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی برتری اور ناحق تسلط و حاکمیت کی بنیاد پر حکمرانی کرتے ہوں،

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ انہیں ''ملوک'' (بادشاہ) قرار دیئے جانے سے مراد انہیں اقتدار و حکمرانی عطا کرنا ہے کہ جس کی ابتداء طالوت سے ہوئی اور پھر داؤد اور دیگر حکمرانوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، بنابرایں آیت مبارکہ میں گویا حکومت و اقتدار عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور غیب کی خبر دی گئی ہے کیونکہ انہیں حضرت موسیٰؑ کے عہد مبارک کے کئی عرصہ بعد اقتدار حاصل ہوا۔

یہ قول اگرچہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن آیت کے الفاظ سے اس کی تصدیق و مطابقت نہیں ہوتی کیونکہ آیت میں ارشاد ہے ''وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا'' (اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا) جبکہ اس قول کی بناء پر یہ الفاظ ہونے چاہئیں تھے ''وجعل منکم ملوکا'' (اور اس نے تم میں سے بعض افراد کو بادشاہ بنایا) جیسا کہ انبیاء بنانے کے حوالہ سے یوں ارشاد فرمایا ''اِذْ جَعَلَ فِيكُمْ اَنْبِيَآءَ'' (اور اس نے تم میں انبیاء بنائے)۔

ممکن ہے کہ آیت میں ''ملوک'' سے مراد وہ بزرگی ہو جو معاشرہ کے بعض افراد کے حوالہ سے ہوتی ہے کہ جس میں پیرانہ سالی بھی شامل ہے، اس بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ''ملک'' قرار پائیں گے اور ان کے بعد حضرت یوشع نبیؑ اور ان کے بعد یوسفؑ ہوں گے کہ جو سفید ریش و بڑی عمر والے ہونے کے ساتھ ساتھ حاکم بھی تھے اور اس طرح یہ سلسلہ طالوت،

داؤد، سلیمان اور دیگر حضرات تک منتہی ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات قرین صحت معلوم نہیں ہوتی اور اس پر وہی اشکال واعتراض وارد ہوتا ہے جو اس سے پہلے قول پر وارد ہوا۔

تیسری نعمت: اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہوا: ''وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'' (اور اس نے تمہیں وہ کچھ دیا جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا) اس سے مراد وہ عنایات الٰہیہ اور فیوضات ربانیہ ہیں جن کے ساتھ واضح وروشن معجزات بھی تھے کہ اگر وہ لوگ اپنی بات پر قائم رہتے اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو پورا کرتے تو ان کی زندگی کے تمام امور درستی کے ساتھ انجام پاتے، وہ معجزات اور عنایات الٰہیہ اس دور میں انہیں نصیب ہوئیں جب وہ مصر میں تھے اور پھر اس وقت ان کے ساتھ تھیں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون اور اس کی قوم سے نجات عطا کی، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن معجزات وخصوصی عنایات اور واضح وروشن دلائل و براھین سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو نوازا وہ پوری دنیا میں کسی قوم کو نہیں نوازا اور حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو قومیں گزریں ان میں سے کوئی قوم ان عنایات و معجزات سے بہرہ ور نہیں ہوئی جو بنی اسرائیل کو عطا کئے گئے۔

بنابرایں بعض حضرات کا وہ قول بے بنیاد ہو جاتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ آیت میں ''عالمین'' سے مراد بنی اسرائیل ہی کے دور میں بسنے والے لوگ ہیں، کیونکہ آیت مبارکہ میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اس وقت تک کسی قوم کو وہ نعمتیں عطا کی گئیں جو بنی اسرائیل کو عطا کی گئی تھیں اور میدانی حقائق سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم:

○ ''يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ''

(اے میری قوم! تم لوگ اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ کہ جسے اللہ نے تمہارے لئے مقرر کر دیا ہے اور تم اپنے پچھلے پاؤں نہ پلٹو (مرتد نہ بنو) ورنہ سخت خسارے کا شکار ہو جاؤ گے)

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ حکم مذکور ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو صادر فرمایا کہ مقدس سرزمین میں داخل ہو جائیں جبکہ وہ ان کے طرزِ عمل سے بھانپ رہے تھے کہ وہ لوگ سرکشی کے مرتکب ہوں گے اور اس حکم پر عمل نہیں کریں گے اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے انہیں مرتد ہونے اور دین حق کو چھوڑ کر پچھلے پاؤں پلٹ جانے سے منع فرمایا اور ایسا کرنے کے سنگین نتیجہ یعنی خسارہ و نقصان سے دوچار ہونے سے خبردار کیا اور حضرت موسیٰؑ کا ان کے طرز عمل سے ان کی طرف سے

نافرمانی کرنے کو بھانپ لینا اس سے ثابت ہے کہ جب اُن لوگوں نے آنجنابؑ کے حکم کو رد کر دیا تو نبی اللہ نے انہیں ''فاسقین'' کا لقب دیا کیونکہ کسی ایک حکم کے نہ ماننے سے کسی کو ''فاسق'' قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس عمل کے بار بار انجام دینے اور اس کے عادی ہو جانے کی وجہ سے اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرنے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

آیت کے الفاظ کے حوالہ سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں ارشاد ہوا: ''الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ'' (مقدس سرزمین) تو اس میں لفظ ''مقدسہ'' ذکر ہوا ہے اور مفسرین نے اس کا معنٰی ''مطہرہ'' کیا ہے یعنی شرک سے پاک کی ہوئی اور اس کی وجہ وہاں انبیاء و مؤمنین کا سکونت پذیر ہونا ہے، لیکن قرآن مجید میں اس کی بابت کچھ مذکور نہیں جس میں اس لفظ یعنی ''مقدسہ'' کی وجہ تسمیہ معلوم ہو سکے، البتہ اس حوالہ سے درج ذیل آیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے قریب تر معنٰی سمجھا جاسکتا ہے۔

○ سورۂ اسرائیل، آیت ۱

''إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ''

(مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے اردگرد کو ہم نے بابرکت بنایا ہے)

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۳۷

''وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا''

(اور ہم نے وارث بنایا ان لوگوں کو جنہیں زمین کے مشرق و مغرب کے تمام ان علاقوں میں کمزور کر دیا گیا تھا کہ جن میں ہم نے برکت قرار دی)

ان آیتوں میں بابرکت قرار دینے کا تذکرہ ہے اور کسی سرزمین کو بابرکت قرار دینے سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس میں خیر کثیر قرار دی جائے اور دین کا قیام اور شرک کی پلیدی و گندگی کو دور کرنا خیر کثیر ہی کے باب سے ہے۔

اور جملہ ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا سرزمین مقدس میں سکونت پذیر ہونا خدا نے طے فرمایا چنانچہ ظاہر الآیات سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے اور آیات کے آخر میں جملہ ''فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً'' اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس مطلب کی تاکید مزید کرتا ہے کیونکہ جملہ ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' مجمل کلام ہے اور اس میں وقت اور اشخاص کا تعین ونشاندہی نہیں کی گئی، اس حوالہ سے وہی لوگ یقینی طور پر اس کے مخاطب ہیں جو اس وقت موجود اور اس کے مکلف تھے جو کہ مر مٹ گئے اور ان کا کوئی فرد باقی نہیں بچا بلکہ وہ سب اسی فکری عدم توازن کی حالت میں ختم ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی مقدس سرزمین میں نہ آیا سوائے ان کے بیٹوں اور پوتوں کے! کہ جو حضرت یوشع بن نون کے ہمراہ ارض مقدسہ میں داخل ہوئے، خلاصہ کلام یہ کہ جملہ ''فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً'' میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وہاں سکونت پذیر ہونے کا جو فیصلہ کیا وہ چالیس برس بعد کے لئے تھا، اور یہ وہی فیصلہ ہے جس پر درج ذیل آیت دلالت کرتی ہے:

○ سورۂ قصص، آیت ٦

''وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ''

(اور ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کردیا گیا اور ہم انہیں امامت عطا کریں اور انہیں زمین میں استقرار بخشیں)

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے لئے اس کی امید وآرزو رکھتے تھے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ ان کی امت اللہ سے استعانت اور صبر اختیار کرے اس حوالہ سے قرآن مجید میں ان کا اپنی امت سے یہ فرمانا مذکور ہے:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۲۹

''قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ''

(موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تم اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر سے کام لو، یقیناً زمین اللہ کی ہے وہ اس کا وارث بناتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے آنے سے پہلے بھی سخت اذیت و آزار کا شکار تھے اور آپ کے آنے کے بعد ہمارا وہی حال ہے، موسیٰ نے کہا: بہت جلد تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو تباہ کردے گا اور تمہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا کہ دیکھے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو)

اسی مطلب اور وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کو درج ذیل آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۳۷

''وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا''

(اور ہم نے ان لوگوں کو زمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنایا جنہیں کمزور ومحروم کردیا گیا تھا وہ علاقے کہ جنہیں ہم نے بابرکت قرار دیا، اور بنی اسرائیل کے صبر کرنے کے نتیجہ میں تیرے پروردگار کی خوبصورت بات پوری ہوگئی)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو ارض مقدسہ میں اقتدار سے نوازنا اور انہیں اس میں سکونت پذیر کروانا کلمۃ اللہ اور خداوند عالم کا حتمی فیصلہ تھا جو کہ ان کی طرف سے اطاعت وفرمانبرداری اور صبر کرنے سے مشروط تھا، معصیت ونافرمانی سے اجتناب کریں اور تلخی روزگار میں صبر سے کام لیں۔

ہم نے یہاں صبر کے موارد میں عمومیت و وسعت کا حامل معنی اس لئے مقصود قرار دیا کہ آیت میں اطلاق پایا جاتا

ہے (واصبروا)، صبر کرنے کو کسی مورد سے مخصوص کر کے ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے دور میں انہیں پے در پے سختیوں اور مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے اوامر و نواہی بھی صادر ہوتے رہے چنانچہ جب وہ لوگ بار بار معصیت کے مرتکب ہوتے تھے ان پر مزید سختیاں آتیں اور ان کے لئے نہایت سخت احکام صادر ہوتے جیسا کہ اس کا ثبوت ان کے بارے میں نازل ہونے والی قرآنی آیات میں موجود ہے۔

تو یہ ہے بظاہر جملہ ''كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' کا معنیٰ کہ جس میں ان کے لئے کئے گئے فیصلہ اور ارض مقدسہ میں ان کے استقرار و استیلاء کا ذکر ہے لیکن اس کے باوجود آیات مبارکہ میں اس فیصلہ کی مدت و مقدار مذکور نہیں بلکہ اس حوالہ سے ان میں ابہام پایا جاتا ہے البتہ اس سلسلہ میں جو مطالب درج ذیل آیات میں مذکور ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ مطلق نہیں تھا بلکہ مشروط تھا کہ جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

- سورۂ اسرائیل، آیت ۸

''وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا''

(اور اگر پلٹ گئے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے اور ہم نے دوزخ کو کافروں کا بچھونا قرار دیا ہے)

- سورۂ اعراف، آیت ۱۲۹

''عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ''

(عین ممکن ہے تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین میں خلافت عطا کرے پھر دیکھے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو)

- سورۂ ابراہیم، آیت ۷

''وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۔۔۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ''

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو اس نے تمہیں عطا کی ہے۔۔۔ اور اس بات کو یاد کرو کہ تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں مزید نعمت عطا کروں گا اور اگر تم نے کفران کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے)

مذکورہ بالا آیات اور ان جیسی دیگر آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا وعدہ و فیصلہ مشروط تھا مطلق و غیر مشروط نہیں تھا،

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنی امت سے یہ فرمانا کہ اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، فیصلہ کر دیا

ہے (کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ) اس سے ان کی مراد وہ وعدہ الٰہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے کیا گیا، اس کے ساتھ ہی اس مفسر نے اس وعدۂ الٰہی کا حوالہ دیا جو ابراہیم واسحاق ویعقوب کے ساتھ ہوا کہ اللہ بہت جلد زمین کا اقتدار ان کی نسل کو عطا کرے گا اور اس سلسلہ میں طویل بحث کے ضمن میں تورات میں مذکور اس وعدہ کی عبارت ذکر کی جس میں یوں کہا گیا:

''سفر تکوین میں یوں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کا کنعانیوں کی سرزمین سے گزر ہوا تو پروردگار اس کے سامنے جلوہ گر ہوا اور فرمایا کہ یہ سرزمین میں تیری نسل کو دیتا ہوں، (تورات، سورۂ ۲، آیت ۷)

اور اسی سورہ میں یہ بھی مذکور ہے: ''اور اس دن پروردگار نے ابراہیم سے پختہ عہد و میثاق کیا کہ میں تیری نسل کو یہ سرزمین عطا کرتا ہوں جو کہ نہر مصر سے نہر کبیر یعنی نہر فرات تک ہے، (تورات، سورۂ ۱۵، آیت ۱۸)

اور اسی باب میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو سفر تثنیۃ الاشتراع سے موسوم ہے: حوریب میں ہمارے پروردگار معبود نے ہمارے ساتھ بات کی اور کہا: اس پہاڑ میں تمہارا بیٹھنا کافی ہو گیا، اب جگہ بدلو اور یہاں سے کوچ کرو اور کوہستانِ امورمین میں چلے جاؤ، اور اس سے ملحقہ علاقے سب اس میں شامل ہیں جن میں چٹیل میدان، پہاڑ، قابل زراعت زمین، ساحل سمندر جو کہ کنعانیوں کا علاقہ ہے اور لبنان سے نہر کبیر یعنی نہر فرات تک کا علاقہ شامل ہے۔ یہ بات مدنظر رکھو کہ میں نے اس سارے علاقہ کو تمہارے سامنے رکھ دیا ہے اب تم اس میں داخل ہو جاؤ اور اس سرزمین کو اپنے ہاتھوں میں لے لو کہ جس کے بارے میں رب نے تمہارے آباؤ واجداد ابراہیم واسحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ انہیں اور ان کے بعد ان کی نسل کو دیتا ہے۔

بہرحال اس سلسلہ میں مزید بحث کرنا ہمارا مقصود نہیں، کیونکہ اس سے زیادہ کچھ ذکر کرنا اس کتاب میں ہماری جاری روش سے مطابقت نہیں رکھتا خواہ مذکورہ بالا مطالب اور وعدہ ہائے الٰہی اصل تورات سے لئے گئے ہوں یا تحریف شدہ تورات میں مذکور ہوں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ قرآن کی تفسیر کا تورات سے کیا تعلق؟

بنی اسرائیل کا گستاخانہ جواب:

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ

(انہوں نے جواب دیا: اے موسیٰ! اس سرزمین میں جابر و ظالم لوگ رہتے ہیں اور ہم اس میں اس وقت تک داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس سے باہر نہیں جاتے، پس اگر وہ اس سے باہر نکل جائیں تو ہم یقیناً اس میں داخل ہو جائیں گے)

مشہور لغت دان راغبؔ اصفہانی نے لکھا ہے کہ لفظ ''جبر'' اصل میں ٹوٹی ہوئی چیز کو طاقت کے ساتھ درست کرنے

کے معنی میں آتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: "جبرتهٔ فانجبر واجتبر" (میں نے اسے درست کیا تو درست ہو گیا، کوئی چیز یا کوئی شخص!، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل درستگی کے عمل میں استعمال کیا جاتا ہے کہ جس میں طاقت وزبردستی شامل نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت علیؑ کی دعا میں یوں مذکور ہے "یا جابر کل کسیر ویا مسهل کل عسیر" (اے ہر ٹوٹے ہوئے کو جوڑنے والے، اور اے ہر مشکل کو آسان کرنے والے!) اسی مناسبت میں روٹی کو "جابر بن حبہ" کہا جاتا ہے (گندم کے دانہ سے بنی ہوئی وہ چیز جو ٹوٹے کو جوڑتی ہے)، اور کبھی یہ لفظ صرف زبردستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً "لاجبر ولا تفویض" (نہ زبردستی اور نہ ہی سپردگی)۔ اور "اِجبار" کا دراصل یہ معنی ہے کہ کسی کو یہ کام سپرد کرنا کہ وہ کسی شخص پر زبردستی کرے، لیکن "اجبار" صرف کسی پر زبردستی کرنے کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے اور جب بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو زبردستی و مجبوری کا معنی ہی عام طور پر سامنے آتا ہے چنانچہ جب یوں کہا جائے "اجبرتهٔ علی کذا" (میں نے اسے اس کام پر مجبور کیا) تو اس میں اس شخص کی ناپسندیدگی کا اظہار مطلوب ہوتا ہے گویا "اجبرته" کا معنی "اکرهتهٔ" ہے، اور لفظ "جبار" جب کسی انسان کی توصیف میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد اس شخص کا اپنی کسی کمزوری کا جبران کرنا اپنے لئے اس بڑائی و بلند مرتبت کا دعویٰ کرتے ہوئے کہ جس کا وہ حقدار نہ ہو، یعنی وہ اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنے آپ کو اس مقام ومنزلت کا حامل ظاہر کرتا ہے جس کا وہ مستحق وحقدار نہیں ہوتا، تو اس صورت میں یہ لفظ صرف اور صرف مذمتی حوالہ رکھتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے "وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ" (اور ہر جبار سرکش ناکام ہوگا)، "وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا" (اور اس نے مجھے جبار بدبخت نہیں بنایا) اور "اِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ" (اس میں جبار لوگ رہتے ہیں) اور عام استعمال میں عرب اس طرح کہتے ہیں "نخلة جبارة، ناقة جبّارة" (کھجور کا جبار درخت، جبار اُونٹنی) یہ لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب درخت کے بارے میں اس کا دوسرے درختوں سے برتر وممتاز ہونا اور اُونٹنی کا دوسری اُونٹنیوں سے زیادہ طاقتور ہونا ظاہر و بیان کیا جائے، (کتاب المفردات، صفحہ ۸۵)

مذکورہ بالا شواہد سے واضح ہوا کہ آیت میں لفظ "جبارین" سے مراد وہ طاقتور لوگ ہیں جو زبردستی اور طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو ان کاموں پر مجبور کرتے ہیں جو وہ خود چاہتے ہیں۔

اور جہاں تک بنی اسرائیل کے جواب کا تعلق ہے کہ جس میں انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا "وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا" (ہم ہرگز اس سرزمین میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ لوگ (جبارین) وہاں سے نکل نہ جائیں) تو اس میں انہوں نے مقدس سرزمین میں داخل ہونے کو جابروں کے وہاں سے نکل جانے سے مشروط قرار دیا، جبکہ وہ حقیقت میں حضرت موسیٰؑ کا حکم رد کرنا چاہتے تھے اگرچہ انہوں نے بظاہر یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ لوگ اس سرزمین سے باہر نکل جائیں تو وہ اس میں ضرور داخل ہوں گے (فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ جن جابر لوگوں کا ذکر آیت میں بنی اسرائیل کے حوالہ سے ہوا ان کے بارے میں متعدد روایات میں مذکور ہے کہ وہ قوی ہیکل، بلند قد والے اور مضبوط جسموں والے تھے اور ان کی بابت ایسے امور وافعال منقول ہیں کہ کوئی اہل عقل سلیم ان کی تصدیق نہیں کرسکتا اور انہیں قرین صحت قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی تاریخی آثار اور علوم الطبیعہ کی بحثوں میں ان روایات میں مذکور امور واعمال کی نسبت کے صحیح ہونے کے شواہد ملتے ہیں لہٰذا وہ روایات درجہ اعتبار سے خارج اور جعلی ہیں۔

خدا کے خوف کا اظہار:

''قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا''

(خوف رکھنے والوں میں سے دوافراد نے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا کہا)

آیت کے سیاق واسلوب بیان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''خوف'' سے مراد اللہ کا خوف ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں دو شخص ایسے تھے جن کے دلوں میں اللہ کا خوف تھا جو اللہ اور اس کے نبی کے حکم کی نافرمانی سے ڈرتے تھے، بلکہ ''مِنَ الَّذِيْنَ'' کے الفاظ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان میں بہت افراد ایسے تھے جن کے دلوں میں خوف خدا تھا اور انہی میں سے دو اشخاص نے دوسروں سے کہا کہ مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ کہ اس کے اندر آنے کے بعد تمہیں غلبہ حاصل ہوجائے گا، اور یہ مطلب متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ''نعمت'' ذکر ہوا ہے اس سے مراد ولایت الٰہیہ ہے۔

بنابرایں وہ دو اشخاص اولیائے الٰہی میں سے تھے اور یہی بات اپنے طور پر مستقل قرینہ ہے کہ یہاں ''خوف'' سے مراد خوف خدا ہے کیونکہ اولیائے الٰہی اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہیں لاتے چنانچہ اس سلسلہ میں واضح لفظوں میں ارشادِ خداوندی ہے:

- سورۂ یونس، آیت ۶۲

''اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''

(یاد رکھو، اولیائے الٰہی کو نہ کوئی خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ وہ محزون وغمگین ہوتے ہیں)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں فعل ''انعم'' کا متعلق لفظوں میں ذکر نہ کیا گیا ہو یعنی وہ چیز کہ جو نعمت کے طور پر عطا ہوئی یعنی خوف خدا! اس بناء پر یوں معنیٰ کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے خوف کی نعمت سے نوازا۔ کہ وہ صرف اسی کا خوف

دل میں رکھتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اگر عبارت میں فعل مضارع ''یَخَافُوْنَ'' کا مفعول ذکر نہیں ہوا اور یہ بیان نہیں کیا گیا کہ وہ کس چیز سے ڈرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ ''اَنْعَمَ اللهُ عَلَیْهِمَا'' میں اس کی بابت کفایت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ وہ دو اشخاص ان جابر لوگوں سے نہیں ڈرتے تھے ورنہ وہ بنی اسرائیل سے یہ نہ کہتے کہ تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ اور یہ جملہ زبان پر نہ لاتے ''اُدْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ''۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ''یَخَافُوْنَ'' میں ضمیر جمع (ھُم) کی بازگشت بنی اسرائیل کی طرف ہوتی ہے اور جو ضمیر موصول (الذین) کی طرف پلٹتی ہے وہ محذوف ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں کیا جائے گا ''وقال رجلان من الذین یخافھم بنو اسرائیل قد انعم الله علی الرجلین بالاسلام'' (اور کہا دو اشخاص نے ان لوگوں میں سے جن سے بنی اسرائیل ڈرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے دو اشخاص کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی)، ان مفسرین حضرات نے اپنے اس قول کی تائید میں ابن جبیر کی طرف منسوب روایت کا حوالہ دیا کیونکہ اس روایت کے مطابق ابن جبیر ''یَخَافُوْنَ'' کو حرف یٰ پر پیش (ُ) کے ساتھ پڑھتے تھے (یُخَافُوْنَ)، اس بناء پر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ دو اشخاص کہ جن سے لوگ ڈرتے تھے، کیونکہ اس سرزمین میں بسنے والوں میں سے دو طاقتور اشخاص کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور بنی اسرائیل کے ساتھ رہتے تھے انہوں نے بنی اسرائیل سے ان کی ہدایت و رہنمائی اور نصیحت و خیر خواہی کے طور پر بات کی تاکہ وہ اس سرزمین میں بسنے والوں پر کس طرح کامیابی حاصل کریں اور اس علاقہ کو کس طرح اپنے ہاتھوں میں لیں، لہٰذا انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں اسلام کی نعمت سے نوازا اور ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ (ملاحظہ ہو: کتاب تفسیر الکشاف، جلد اوّل صفحہ ۶۲۰)

مذکورہ بالا قول ان بعض روایات پر مبنی ہے جو ان آیات کی تفسیر میں منقول ہیں لیکن چونکہ وہ روایات ''اخبار الآحاد'' میں سے ہیں (کہ جن کے راوی ایک سے زیادہ نہیں اور ان کے مندرجات کی صحت و درستی کی شہادت قرآنی آیات سے بھی نہیں ہوتی لہٰذا انہیں مورد اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا)۔

اور جملہ ''اُدْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ'' سے مراد شاید یہ ہو کہ ان جابروں کے ممالک میں سے اس ملک میں ''باب'' (دروازہ) سے آئیں جو بنی اسرائیل سے قریب تر ہے جو کہ اس سرزمین کی نسبت ایک دروازہ کے طور پر ہے، کہا جاتا ہے کہ اس شہر یا علاقہ کا نام ''اریحاء'' تھا اور عام طور پر اس طرح کے علاقہ کو شہر یا ملک کا دروازہ کہا جاتا ہے، یا اس سے مراد مخصوص شہر کا دروازہ بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ زمانہ قدیم میں شہروں کے دروازے بنائے جاتے تھے یا شہر کے ابتدائی علاقہ کو ''دروازہ شہر'' سے موسوم کیا جاتا تھا، جیسا کہ عصر حاضر میں سرحدیں کسی ملک میں داخل ہونے کے لئے دروازوں کا کام دیتی ہیں۔

اور جملہ ''فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ'' ان دو اشخاص کی طرف سے بنی اسرائیل کو دشمن پر فتح و کامیابی حاصل

کرنے کے وعدہ کے طور پر ہے، اوران دونوں نے یہ بات نہایت پختہ یقین کے ساتھ کی کیونکہ وہ اس سلسلہ میں جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سن چکے تھے ان پر کامل بھروسہ واعتماد کر کے انہوں نے یہ بات کی جو کہ ان کے حضرت موسیٰ ؑ پر ایمان اوران کے بیان کی صداقت پر یقین کا مظہر ہے، یا اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ولایت الٰہیہ کے نور سے یہ معرفت حاصل کی، اکثر مفسرین حضرات نے ان دو اشخاص کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا تھے جو کہ بنی اسرائیل کے بارہ نقباء میں سے ہیں (ملاحظہ ہو: تفسیر ''در منثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

ان دو حضرات نے بنی اسرائیل سے وعدۂ فتح وکامیابی اور دشمن پر غلبہ کی نوید وخوشخبری دینے کے بعد ان سے کہا کہ وہ اپنے پروردگار پر توکل وبھروسہ کریں چنانچہ انہوں نے کہا: ''وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ '' (اور تم اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو) کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کی کفایت کرتا ہے جو اس پر توکل کرے ان کے اس بیان میں ان کا مقصد بنی اسرائیل کے حوصلے بلند کرنا اوران کے وعدہ وخوشخبری کو قرین صحت سمجھتے ہوئے ان کی باتوں پر عمل کرنے کی ترغیب دلانا ہے۔

بنی اسرائیل کی ڈھٹائی:

○ ''قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا''

(انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز اس سرزمین میں داخل نہ ہوں جب تک وہ (جبارین) اس میں موجود ہیں)

بنی اسرائیل کا دوبارہ اپنی اسی بات کو دھرانا کہ ہم اس سرزمین میں جابروں کی موجودگی میں ہرگز داخل نہ ہوں گے دراصل اس لئے تھا کہ موسیٰ ؑ کو ان کے مشن ودعوتِ حق کی بابت مایوسی کا شکار کریں تا کہ وہ اپنے کام سے دستبردار ہو جائیں، اگر بنی اسرائیل کے بیان پر غور کریں تو اس میں کئی حوالوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات کی توہین اور گستاخی کے پہلو دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح ان احکام خداوندی کی بابت بھی بے حرمتی کا پہلو پایا جاتا ہے جن کی بابت حضرت موسیٰ ؑ نے انہیں مطلع کیا تھا، بنی اسرائیل کے بیان میں عجیب ترتیب وترکیب پائی جاتی ہے: پہلی بات تو یہ ہے انہوں نے ان دو اشخاص کی دعوت کو یکسر نظر انداز کیا جنہوں نے انہیں حضرت موسیٰ ؑ کے ارشادات پر عمل کرنے کا کہا تھا اور نہ ہی اس سے مخاطب ہو کر بات کی، بلکہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوئے، پھر حضرت موسیٰ ؑ سے بات کرنے میں نہایت اختصار اختیار کیا جبکہ ابتداء میں انہوں نے اسباب وخصوصیات سمیت تفاصیل ذکر کیں، اس طرح بات کرنا ادبی اصطلاح میں ''ایجاز بعد الاطناب'' کہلاتا ہے جو کہ تخاصم اور مدمقابل سے الجھنے کی صورت میں اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ دوسرے فریق کو باخبر کیا جائے کہ وہ اس سے زیادہ بات کرنا ناپسند کرتے ہیں اوراس کی بات سننا ان کی سماعتوں پر گراں ہے۔ پھر انہوں نے اپنی

بات کومزید پختہ کرنے کے لئے یوں کہا: ''لَنْ نَّدْخُلَهَآ'' (ہم ہرگز اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گستاخانہ بیان میں ''اَبَدًا'' کہہ کر اپنی ڈھٹائی کا ثبوت فراہم کر دیا، پھر انہوں نے اس پر اکتفاء نہ کی بلکہ ان کی جہالت نے انہیں اس سے بھی بڑی بات کرنے کی جرأت دی اور انہوں نے پہلے سے زیادہ شرم آور بات کر دی اور یوں کہا: ''فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ'' (تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور تم دونوں قتال کرو، ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں)، ان کے اس بیان سے واضح طور پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کا خداوند عالم کے بارے میں بت پرستوں جیسا عقیدہ تھا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسان کی طرح ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کے عقیدہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا: ''وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ''۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۳۸۔ (اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کروا دیا تو وہ ان لوگوں کے پاس آئے جو اپنے بتوں کی پوجا کر رہے تھے انہوں نے کہا: اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی معبود بناؤ جس طرح ان لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا: تم لوگ بہت جاہل ہو۔)

یہودی اپنے عقیدۂ تجسیم وتشبیہ پر قائم رہے اور ابھی تک اس پر قائم ہیں چنانچہ ان کے ہاں موجود کتب سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔

موسیٰؑ کی فریاد بارگاہِ الٰہی میں!

○ ''قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ''

(موسیٰ نے کہا: پروردگار! میں تو صرف اپنے اوپر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں، پس ہمارے اور فاسق لوگوں کے درمیان جدائی ڈال دے)

آیت کے سیاق البیان سے ثابت ہوتا ہے کہ جملہ ''اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ'' (میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں رکھتا) ایک طرح کا کنایہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں اپنی فریاد پیش کرنے کے حوالہ سے تمہیداً استعمال کیا تا کہ جو عظیم ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان کو عطاء فرمائی اس کی بابت لوگوں کو قائل کرنے میں اپنی عدم توانائی کا اظہار کر سکیں کہ وہ اس سلسلہ میں صرف اپنے اور اپنے بھائی پر ہی اختیار رکھتے ہیں کیونکہ اس ذمہ داری کا بوجھ وہ اپنے اور اپنے بھائی ہارون کے کندھوں پر رکھ سکتے تھے جو کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے خلیفہ ومسند نشین اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت ورسالت کے منصب پر فائز تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فرمانِ خداوندی سے سرتابی کریں، یا اس جملہ سے یہ بھی سمجھا جا سکتا

ہے کہ شاید ان کا مقصد و مراد یہ ہو کہ وہ صرف اپنے اوپر اختیار رکھتے ہیں اور ان کے بھائی کو خود اپنے اوپر اختیار حاصل ہے۔

بہر حال ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کلی طور پر اپنے آپ سے اختیار کی نفی کریں اور یہ کہیں کہ میں اس کام کو انجام دے ہی نہیں سکتا جو میرے سپرد کیا گیا ہے یا یہ کہ کوئی بھی میری دعوت پر لبیک نہیں کہتا، نہیں ایسا ہرگز نہیں کیونکہ سیاق الکلام سے اس کی نفی ہوتی ہے اور آیت میں ان لوگوں کا حوالہ مذکورہ ہے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے کہ جن میں سے دو اشخاص کا بیان بھی مذکور و منقول ہے کہ جنھوں نے آنجناب کی دعوت پر لبیک کہا، اور آنجناب نے اللہ تعالیٰ کے حضور صرف اپنا اور اپنے بھائی کا ذکر کیا اس کے علاوہ اپنے اہل خانہ اور اپنے بھائی کے اہل خانہ کا ذکر بھی نہیں کیا جبکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وہ افراد ہرگز آپ کے فرمان و دعوت سے روگرداں نہ تھے بلکہ کامل اطاعت گزار تھے، لہٰذا یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ میں تو صرف اپنے اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس کے علاوہ کسی پر مجھے کوئی قدرت و اختیار حاصل نہیں دراصل فریاد و مناجات کے تقاضے کے مطابق تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک پاکیزہ دین اختیار کرنے کی دعوت دی اور اپنی ذمہ داری کو نہایت احسن انداز میں ادا کیا اور ان پر حجت تمام کردی مگر ان لوگوں نے ان کی دعوت کو رد کر دیا اور اسرائیلی معاشرہ نہایت قبیح و مذموم صورت میں ان کے مدمقابل آ گیا لہٰذا صورتحال اسی کی متقاضی تھی کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں ان لفظوں کے ساتھ اپنی فریاد و عرضداشت پیش کریں کہ پروردگار! میں نے تیرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں اپنے اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی پر میرا اختیار و قدرت نہیں اور ہم نے اپنا فریضہ بھرپور طریقہ سے ادا کر دیا ہے لیکن ان لوگوں کی طرف سے ہمیں شدید ردعمل اور ہماری دعوت قبول کرنے سے انکار کا بری طرح سامنا کرنا پڑا ہے لہٰذا اب ہم ان لوگوں سے مایوس ہیں اور کامیابی کا راستہ بند ہو چکا ہے، اب تو خود ہی کوئی راہ کھول دے اور گرہ کشائی کر کے اپنی ربوبیت کی طاقت و عنایت کے ساتھ ان سے کئے ہوئے اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے اسباب فراہم فرما جو تو نے انہیں نعمتوں کے پورا کرنے اور انہیں زمین کا وارث و حاکم بنانے کے سلسلہ میں فرمایا ہے اور اب تو ہی فیصلہ کر اور ہمارے اور ان فاسقوں کی راہیں ایک دوسرے سے جدا کر دے۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے اس فرمان کہ تم مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ کی جس طرح نافرمانی و حکم عدولی کا ارتکاب کیا اتنا ان کے دوسرے فرامین و دستورات کی بابت نہیں کیا کہ جن میں خدا کا دیدار کرنے کا مسئلہ، بچھڑے کی پرستش کا مسئلہ، دروازہ میں داخل ہونے اور حطہ کہنے کا مسئلہ وغیرہ سرفہرست ہیں، انہوں نے مقدس سرزمین میں داخل ہونے کے فرمان کی بابت نہایت صریح و سخت ترین لہجہ و انداز میں نافرمانی کی، ان کے ایسا کرنے کے باوجود حضرت موسیٰ نے انہیں ان کے حال پر نہیں چھوڑا کیونکہ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے تو ان کے مشن کا سارا سلسلہ رک جاتا اور پھر ان کے اوامر و نواہی اور دستورات میں سے کچھ بھی معاشرے میں باقی نہ رہتا بلکہ ان کے درمیان وحدت و یکجہتی کے فروغ کے لئے ان کی

تمام کاوشیں رائیگاں جاتیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے درج ذیل چند امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) اس وقت کی صورتحال اس بات کی متقاضی تھی کہ حضرت موسیٰ ؑ بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرتے ہوئے اپنے اور اپنے بھائی ہی کے بارے میں وہ کچھ بیان کرتے جو انہوں نے کیا، کیونکہ صرف وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام، لوگوں تک پہنچانے کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے لہٰذا اپنے بیان میں اپنے اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی شخص کا نام نہ لینا ہی مقتضائے حال کے مطابق تھا خواہ وہ مومنین ہی کیوں نہ ہوں اور ان کی طرف سے آنجناب ؑ کی حکم عدولی بھی نہ ہوئی ہو، کیونکہ ان دو بھائیوں کے علاوہ کسی شخص کو احکام خداوندی کی تبلیغ کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی اور اس میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی درست تھا جو ان احکام پر عمل کرنے اور آنجناب ؑ کی دعوتِ حق پر لبیک کہنے پر مامور تھے۔

(۲) چونکہ صورتحال اس بات کی متقاضی تھی کہ حضرت موسیٰ ؑ اپنے پروردگار کے حضور فریاد اور اپنی قوم کا شکوہ لے کر جائیں لہٰذا ان کا بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرنا دراصل اللہ تعالیٰ سے ان ذمہ داریوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد طلب کرنے کے طور پر ہے۔

(۳) حضرت موسیٰ ؑ کے بیان میں ''وَ اَخِیْ'' (اور میرا بھائی) کے الفاظ کا عطف ''اِنِّیْ'' کے حرف ''یْ'' کی طرف ہے، اس بناء پر معنی یہ ہوگا: میرا بھائی میری طرح سوائے اپنے کسی پر اختیار نہیں رکھتا، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا عطف ''نفسی'' پر ہے، لیکن یہ قول سیاق الکلام سے مطابقت نہیں رکھتا البتہ دونوں صورتوں میں معنی صحیح ہے اس کا سیاق الکلام سے عدم مطابقت کے باوجود معنی میں صحت کا حامل ہونا اس حوالہ سے ہے کہ اگرچہ حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ میں سے ہر ایک اپنے اوپر کامل اختیار رکھتا تھا اور اوامرِ الٰہی کی اطاعت کے حوالہ سے دونوں یکساں حیثیت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت موسیٰ ؑ کو حضرت ہارونؑ پر بھی اختیار حاصل تھا کیونکہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰ ؑ کی زندگی ہی میں ان کے خلیفہ و مسند نشین تھے اور وہ دونوں مخلص مؤمنین کی اطاعت گزاری کے حوالہ سے بھی ان پر اختیار رکھتے تھے۔

(۴) جملہ ''فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ'' حضرت موسیٰ ؑ کی طرف سے بنی اسرائیل کے لئے بددعا نہ تھی اور آنجنابؑ نے اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں چاہا کہ ان کے اور بنی اسرائیل کے درمیان ایسا فیصلہ کرے کہ جس کے نتیجہ میں ان پر عذاب نازل ہو یا یہ کہ ان کے (یعنی موسیٰ ؑ و ہارونؑ) اور بنی اسرائیل کے درمیان ہمیشہ کے لئے جدائی ڈال دے کہ یا انہیں (دو بھائیوں کو) ان کے علاقہ یا معاشرہ سے دور کر دے یا انہیں موت دیدے، ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ حضرت موسیٰ ؑ ان لوگوں کو اس چیز کی طرف آنے کی دعوت دے رہے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر و مقدر فرمائی ہے یعنی نعمت کا پورا کرنا اور حضرت موسیٰ ؑ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم پر احسان فرمایا کہ انہیں فرعون و فرعونیوں سے نجات عطا کی اور حضرت

موسیٰ ؑ ہی کے ہاتھوں انہیں زمین میں اختیار و اقتدار سے نوازنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

○ سورۂ قصص، آیت ۵

''وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ''

(اور ہمارا ارادہ (فیصلہ) ہے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کردیا گیا اور انہیں امام بنائیں اور انہیں وارث (حاکم) قرار دیں)

بنی اسرائیل اس بات کو آنجنابؑ سے سن چکے تھے اور اس سے آگاہ ہو چکے تھے جیسا کہ ان کے بیان کو درج ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۲۹

''قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا''

(انہوں نے کہا ہم تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد بھی اذیت و آزاد کا نشانہ بنائے گئے ہیں)

اور اس کی مزید گواہی اس جملہ سے ملتی ہے ''فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' (پس آپ فاسق لوگوں کے حال پر دکھی نہ ہوں)، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان پر عذاب الٰہی نازل ہونے کا اندیشہ لاحق تھا اور اس بات کی توقع تھی کہ وہ ان پر فکری عدم توازن کی صورت میں عذاب نازل ہونے سے بہت فکرمند تھے۔

چالیس سال تک سرگردانی کا عذاب:

○ ''قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ''

(خدا نے کہا کہ وہ سرزمین چالیس سال تک ان پر حرام کردی گئی ہے کہ وہ زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں لہٰذا آپ فاسق لوگوں کے بارے میں دکھی نہ ہوں)

''فَاِنَّهَا'' میں ضمیر ''ھا'' کی برگشت ''ارض مقدسہ'' کی طرف ہے اور حرام کئے جانے سے مراد تکوینی حرمت ہے جو کہ قضاء الٰہی کے باب سے ہے، اور ''يَتِيْهُوْنَ'' ''تیہ'' کا معنی تحیر و سرگردانی ہے اور ''الْاَرْض'' میں الف و لام عہد کا معنی رکھتا ہے یعنی وہ سرزمین جو انہیں معلوم ہے (عہد ذکری)، اور جملہ ''فَلَا تَاْسَ'' (افسوس نہ کریں، دکھی نہ ہوں) سے مراد یہ ہے کہ انہیں افسوس یعنی غمگین ہونے سے منع کیا گیا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں جو کچھ حضرت موسیٰ ؑ نے کہا (فاسق لوگ) اس کی تصدیق فرماتے ہوئے کہا ''الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ'' یعنی بعینہ وہی الفاظ استعمال فرما کر ان لوگوں کے

بارے میں حضرت موسیٰؑ کے بیان کی تصدیق کردی۔

بہرحال آیۂ شریفہ کا معنیٰ یہ ہے کہ ان لوگوں پر مقدس سرزمین میں داخل ہونا اور اس میں ساکن اور اس کا مالک بننا ان کے لئے حرام قرار دیا گیا، یعنی ہم نے فیصلہ کیا اور تکوینی طور پر ان کے بارے میں مقدر کردیا کہ وہ اس سرزمین میں چالیس سال تک داخل ہونے کی توفیق ہی نہ پائیں گے بلکہ اس کے اردگرد گھومتے پھرتے رہیں گے اور سرگرداں رہیں گے کہ نہ تو شہری زندگی پائیں گے اور نہ ہی دیہاتی وصحرائی زندگی! بلکہ شہر بہ شہر اور در بہ در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اور انہیں کہیں بھی آرام کرنے اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی نعمت حاصل نہ ہوگی، لہٰذا اے موسیٰ! آپ ان فاسق لوگوں کے حال پر غمگین نہ ہوں کیونکہ وہ جس عذاب (سرگردانی) کا شکار ہوئے وہ ان کے کئے کی سزا ہے یعنی ان کے فسق کا نتیجہ ہے، بنابرایں آپ ان کی بدکرداری پر انہیں ملنے والی سزا کی وجہ سے پریشان و غمگین نہ ہوں۔

روایات پر ایک نظر!

حدثِ نبویؑ:

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن ابی حاتم نے ابوسعید خدری کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کانت بنو اسرائیل اذا کان لأحدهم خادم دابة و امرأة کتب ملکاً، بنی اسرائیل کے ہاں رسم تھی کہ جب ان میں سے کسی شخص کے پاس خادم اور سواری ہوتی اور وہ شادی شدہ ہوتا تو اسے ملک یعنی بادشاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

اسی کتاب میں ابوداؤد کے حوالہ سے ان کی مرسلہ روایات کے مجموعہ میں مذکور زید بن اسلم کی بیان کردہ روایت ذکر کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جملہ ''وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا'' (اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا) کی تفسیر میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد بیوی کا ہونا، گھر کا ہونا اور خادم کا ہونا ہے، (بحوالہ مذکورہ بالا)

یاد رہے کہ تفسیر ''درمنثور'' میں مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ ان کے ہم معنی دیگر روایات بھی ذکر کی گئی ہیں لیکن اگر آیت کے سیاق پر نظر کی جائے تو اس سے اس طرح کی تفسیر قرین صحت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں اس طرح کی کوئی رسم ہو کہ وہ ہر شخص کو بادشاہ کہتے ہوں جس کے پاس گھر، بیوی اور خادم ہو یا اسے بادشاہ لکھا جاتا ہو لیکن یہ امر واضح حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام افراد کہ جن کی اکثریت خدمتگزاری کا کام کرتی تھی اس طرح مرفہ نہ تھے کہ ان کے پاس یہ سب چیزیں موجود ہوں بلکہ معدودے چند افراد ہی تھے جو یہ سب کچھ رکھتے تھے جبکہ آیۂ شریفہ میں تمام بنی اسرائیل کو ''ملوک'' (سلاطین) کہا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر گھر، بیوی اور خادم رکھنے والے کو بادشاہ کہا جائے تو اس طرح کے افراد ہر قوم میں مل سکتے ہیں ان سب کو یہ لقب دیا جائے کیونکہ یہ چیزیں عام طور پر قوموں کے افراد کے پاس ہوتی ہیں تو پھر بنی اسرائیل کی کیا خصوصیت باقی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کا صرف بنی اسرائیل کو ملوک قرار دینا کس بناء پر قابل تصور ہوگا؟ حالانکہ آیت میں انہیں ملوک قرار دیا جانا ان پر اللہ تعالیٰ کا احسان شمار کیا گیا ہے۔

شاید اسی نکتہ کے متوجہ ہونے کے نتیجہ میں بعض حضرات نے اس کی تاویل کرتے ہوئے قتادہ کی روایت کی بناء پر یوں کہا کہ بنی اسرائیل وہ پہلی قوم ہے جنہوں نے گھروں میں خادم رکھے لیکن اس بات کی تصدیق تاریخ سے نہیں ہوتی۔

امام محمد باقرؑ کا فرمان:

کتاب الامالی میں شیخ مفیدؒ نے ابوحمزہ کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو سرزمین مقدس کے نزدیک لے آئے تو ان سے فرمایا ''ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ'' (اس مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ کہ جو اللہ نے تمہارے لئے مقرر فرمادی ہے اور اپنے پچھلے پاؤں نہ پلٹنا ورنہ نقصان اُٹھانے والے بن جاؤ گے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے وہ مقدس سرزمین انہی کے لئے مخصوص کی تھی لیکن انہوں نے کہا ''إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ'' (اس سرزمین میں جابر لوگ رہتے ہیں اور ہم اس وقت تک اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ یہاں سے نکل نہیں جاتے، پس اگر وہ اس سرزمین سے نکلیں تو یقیناً ہم اس میں داخل ہوں گے، ان لوگوں میں سے کہ جن کے دلوں میں خوف تھا دو اشخاص نے کہ جن پر اللہ نے خاص عنایت فرمائی یوں کہا: اس سرزمین کے دروازہ سے داخل ہوجاؤ، جب تم اس میں داخل ہوجاؤ گے تو یقیناً تم غلبہ پاؤ گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو، انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم اس سرزمین میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ لوگ (جابر و ظالم) اس میں موجود ہیں، پس تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے قتال کرو، ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، پس تو ہمارے اور اس فاسق قوم کے درمیان جدائی ڈال دے)

لہٰذا جب بنی اسرائیل نے اس سرزمین میں جانے سے انکار کردیا تو اللہ نے وہ سرزمین ان پر حرام قرار دے دی اور وہ لوگ چالیس سال تک اس سرزمین سے چار فرسخ دور علاقہ میں سرگرداں رہے، اس وقت خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ ان فاسق لوگوں کے حال کو دیکھ کر غمگین نہ ہونا (فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ)۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ہر روز عصر کے وقت ان کا اعلان کرنے والا بلند آواز سے اعلان کرتا تھا: چلو چلو، چنانچہ وہ لوگ اپنی سواریوں پر سوار ہوکر روانہ ہوجاتے تھے اور حُدی (وہ آواز جو اُونٹوں کو تیز چلانے کے لئے بلند کی جاتی ہے) کے ساتھ اور اونٹوں کو تازیانہ لگاتے ہوئے رات بھر سفر کرتے تھے جب سحر ہوتی اور روشنی پھوٹنے لگتی تو اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دیتا کہ وہ حرکت میں آئے لہٰذا زمین انہیں واپس پھیر کر اسی جگہ پر لیجاتی تھی جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے، وہاں پہنچ کر

وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ لگتا ہے کہ تم لوگ غلط راستہ پر چل پڑے تھے، اسی طرح وہ لوگ ہر روز رات کو کوچ کرتے اور پھر سحر کے وقت واپس اسی جگہ لوٹ آتے، چالیس سال تک وہ لوگ اسی حالت کا شکار رہے، اللہ تعالیٰ نے ان پر من وسلویٰ نازل فرمایا، اس مدت میں وہ سب مر گئے سوائے دو اشخاص کے، ایک یوشع بن نون اور دوسرے کالب بن یوفنا، اور ان لوگوں کی اولاد، وہ لوگ سرزمین مقدس سے چار فرسخ دور علاقہ میں سرگردانی کا شکار رہتے تھے اور جوں ہی وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرتے تو ان کے کپڑے اور جوتے لکڑی کی طرح خشک ہو جاتے، کہ وہ انہیں استعمال نہ کر پاتے تھے۔

امام صادقؑ نے فرمایا: ان لوگوں کے پاس ایک پتھر تھا اور وہ جب سواریوں سے نیچے اُترتے اور کہیں قیام کرتے تو موسیٰؑ اپنا عصا اس پتھر پر مارتے تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑتے تھے یعنی ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ! اور جب وہ کوچ کرتے تو پانی دوبارہ اس پتھر میں چلا جاتا تھا اور پتھر کو اُونٹ پر رکھ دیا جاتا تھا، (کتاب الاختصاص، صفحہ ۲۶۶)

مذکورہ بالا روایت سے قریب المعنیٰ کثیر روایات فریقین شیعہ وسنی اسناد سے موجود ہیں، مذکورہ بالا روایت کی بابت یہ مطلب قابل توجہ ولائق ذکر ہے کہ اصل روایت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے مگر آخر میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیان ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس روایت کا حصہ نہیں بلکہ دوسری روایت کی عبارت ہے، ان روایات میں اگرچہ "تیہ" (سرگردانی) وغیرہ کے حوالہ سے جو تفصیلات اور دیگر امور ذکر کئے گئے ہیں ان کی بابت کلام الٰہی میں واضح تائیدی الفاظ نہیں ملتے لیکن اس کے باوجود ان میں کوئی ایسی بات شامل نہیں جو قرآن مجید سے متصادم ومخالف ہو، حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو عہد موسیٰؑ میں عجیب مقام حاصل تھا کہ ان کی زندگی میں ہر پہلو سے معجزات ہی معجزات پائے جاتے ہیں اس بناء پر ان کے حوالہ سے "تیہ" کی جو تفصیلات اور مربوطہ امور روایات میں مذکور ہیں ان میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔

اللہ کا وسیع اختیار:

تفسیر العیاشی میں مسعدہ بن صدقہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے آیۂ مبارکہ "ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" کی تفسیر پوچھی گئی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: "كتبها لهم ثم محاها ثم كتبها لابنائهم فدخلوها والله يمحو ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتاب" اللہ نے وہ سرزمین ان کے لئے مقدر و مخصوص کی پھر اس فیصلہ کو ختم کر دیا اور اسے ان کی اولاد کے لئے مخصوص کر دیا، اور ان کی اولاد ان کے بعد اس سرزمین میں داخل ہوئی، اور اللہ جو چاہتا ہے محو وختم کرتا ہے اور جو چاہتا ہے مقدر و اثبات کرتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے، (جو چاہتا ہے اس میں لکھتا ہے اور جو چاہتا ہے اس سے مٹا دیتا ہے)۔ (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۳۰۴)

یاد رہے کہ تفسیر العیاشی میں مذکورہ بالا مطلب ایک روایت میں اسماعیل جعفی کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا بیان ذکر کیا گیا ہے اسی طرح یہی مطلب زرارہ، حمران اور محمد بن مسلم کے اسناد سے امام محمد باقرؑ سے منسوب ہے اور امامؑ نے اپنے بیان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ام الکتاب میں لکھنے اور سرزمین مقدس میں داخل ہونے کو مقدر کرنے کے حوالہ سے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں موجود لوگوں اور ان کی اولاد کی نسبت سے موازنہ کیا اور اسے محو و اثبات اور مسئلہ بداء سے مربوط قرار دیا جو کہ آیت کے ظاہر السیاق سے متصادم اور منافات نہیں رکھتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس سرزمین میں داخل ہونا اور وہاں سکونت پذیر ہونا مقدر فرمایا مگر وہ لوگ اپنی معصیت کاری و نافرمانی کے نتیجہ میں چالیس سال تک اس سرزمین سے محروم رہے اور ان کا اس میں داخلہ حرام کر دیا گیا لیکن اس کے بعد انہیں اس میں آنے کی توفیق حاصل ہوئی، بنا بر ایں آیت میں معنی کے حوالہ سے تمام افرادِ بنی اسرائیل کو مخاطب کیا گیا کہ جس میں موجودہ افراد اور ان کے بعد آنے والے افراد سب شامل ہیں کیونکہ وہ سب ایک ہی قوم و اُمت واحدہ ہیں کہ وہ حکم سب کے لئے تھا یہ بات دوسری ہے کہ ان کی ایک نسل اپنی نافرمانی کی وجہ سے اس سرزمین مقدس سے فیض پانے سے محروم ہوئی جبکہ دوسری نسل اس سے فیض یاب ہوئی، اس بناء پر محو و اثبات اور بداء وغیرہ کا اس سلسلہ میں کوئی حوالہ نہیں بنتا، اگرچہ بعض افراد کی نسبت بداء قابل تصور ہے کہ وہ اس زمانہ میں موجود تھے۔

کافی کی ایک روایت:

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے عبدالرحمان بن یزید کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت داوٗد نبی ہفتہ کے دن ناگہانی انتقال فرما گئے تو ان کے جنازہ پر پرندوں نے اپنے پروں سے سایہ کیا اور موسیٰؑ کلیم اللہ "تیہ" میں فوت ہوئے تو آسمان سے ایک ندا دینے والے نے ندا دی، موسیٰ فوت ہو گئے ہیں تو پھر موت سے کون بچ سکتا ہے؟ (کتاب فروع کافی جلد ۶ صفحہ ۱۱۲)

آیات ۲۷ تا ۳۲

○ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

○ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

○ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ

○ ''اور آپ ان لوگوں کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ اچھی طرح بیان کریں کہ جب ان دونوں نے قربانی پیش کی مگر ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی، (جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی) اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کردوں گا (ہابیل نے) کہا، اللہ تقویٰ والوں سے قبول کرتا ہے''

(۲۷)

○ ''اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے کہ مجھے قتل کرے تو میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ جو عالمین کا پروردگار ہے''

(۲۸)

○ ''میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ اپنے سر لے تا کہ تو دوزخیوں میں سے ہو جا اور ظالموں کی سزا یہی ہے''

(۲۹)

○ فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾

○ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبۡحَثُ فِى الۡاَرۡضِ لِيُرِيَهٗ كَيۡفَ يُوَارِىۡ سَوۡءَةَ اَخِيۡهِ‌ؕ قَالَ يٰوَيۡلَتٰۤى اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوۡءَةَ اَخِىۡ‌ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾

○ مِنۡ اَجۡلِ ذٰ لِكَ‌ ۛۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَاۤءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا‌ ؕ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰ لِكَ فِى الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ﴿۳۲﴾

○ ''پھر اسے اس کے نفس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے پر ابھارا تو اس نے اسے قتل کر دیا جس کی وجہ سے وہ خاسرین میں سے ہو گیا''

(۳۰)

○ ''پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کھودنے لگا تا کہ اسے دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے (دفن کرے)، یہ دیکھ کر اس نے کہا: ہائے کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ ناتوان ہوں کہ اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر سکتا، اس طرح وہ ندامت و پشیمانی کا شکار لوگوں میں سے ہو گیا''

(۳۱)

○ ''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے یا زمین میں فساد پھیلائے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جو شخص کسی ایک شخص کو حیات دے گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کر دیا، یقیناً ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ آئے مگر اس کے باوجود لوگوں میں کثیر افراد زمین میں زیادتی کرنے والے ہوئے''

(۳۲)

تفسیر و بیان

یہ آیات حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ کے تذکرہ پر مشتمل ہیں اور اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ حسد اس قدر بری بلا ہے کہ اولادِ آدم کو اس حد تک لیجا تا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو ناحق قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اس حوالہ سے ظلم کی آخری حد تک پہنچ کر اس گھناؤنے جرم کا مرتکب ہوجاتا ہے کہ پھر اپنے کئے کے نتیجہ میں سخت نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوجاتا ہے اور ندامت و پیشمانی اس پر چھا جاتی ہے مگر اسے اس پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اس حوالہ سے یہ آیات معنی کے لحاظ سے ماقبل ان آیات سے ربط کی حامل ہوجاتی ہیں جن میں بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا انکار اور حق کی دعوت کو قبول نہ کرنا صرف حسد اور سرکشی کی وجہ سے تھا، یہی بات حسد کے مذموم آثار میں سے ہے کہ وہ انسان کو اس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتار دے اور پھر اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہو کہ اس ندامت کی زنجیروں میں ہی ہمیشہ جکڑا رہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان دو بھائیوں کے واقعہ سے عبرت حاصل کی جائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حسد کی آگ میں جل کر اس طرح کے اعمال انجام دیں اور پھر اس کے نتیجہ میں کفر اختیار کر کے اس پر ڈٹ جانے کی نوبت آئے۔

آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ

''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ''

(اور ان لوگوں کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا اصل واقعہ بیان کریں)

اس آیت میں جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں سب سے پہلے ان کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:

''اُتْلُ'' (پڑھیں)، یہ صیغہ امر ہے جو ''تلاوت'' سے مشتق ہے۔ ''تلاوت'' جو ''یتلو'' سے ہے اس کا معنی کسی چیز کا دوسری چیز کے پیچھے پیچھے آنا ہے اور قرائت کرنے سے یعنی پڑھنے کو ''تلاوت'' سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قاری یعنی پڑھنے والا شخص۔۔ کسی واقعہ کو بیان کرنے والا۔۔ اس واقعہ یا خبر کے بعض اجزاء کو اس کے دوسرے بعض اجزاء کے پیچھے

پیچھے لاتا ہے، لفظ ''نبا'' کہ جس کا معنی خبر ہے اس سے مراد وہ خبر ہے جو اہمیت وفائدہ کی حامل ہو۔

لفظ ''قربان'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ یا اس کے علاوہ کسی کا قرب حاصل ہو سکے، یہ لفظ اصل میں مصدر ہے اس سے تثنیہ وجمع کے صیغے نہیں بنتے۔

لفظ ''تقبل'' کا معنی خاص اہمیت کے ساتھ اور قبول کی جانے والی چیز کی بابت خاص توجہ کرتے ہوئے اسے قبول کرنا ہے۔

لفظ ''عَلَیۡھِمۡ'' میں ضمیر ''ھم'' اہل کتاب کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ سابق الذکر مطالب کے تناظر میں واضح ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ بیان میں اصل مقصود اہل کتاب ہیں اور یہاں لفظ ''آدم'' سے مراد وہی شخصیت ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں ''ابوالبشر'' کے طور پر ہوا ہے۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہاں ''آدم'' سے مراد بنی اسرائیل کا ایک شخص ہے جس کے دو بیٹے تھے اور انہوں نے ایک قربانی کے بارے میں آپس میں اختلاف ونزاع کیا ان میں سے ایک نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا، قتل کرنے والے کا نام قابیل یا قابین تھا جبکہ مقتول کا نام ھابیل تھا لہٰذا اسی حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد یوں فرمایا ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِکَ ۚۛ کَتَبۡنَا عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ '' (اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر مقرر کر دیا کہ۔۔۔)۔

لیکن یہ نظریہ درج ذیل تین دلائل کی بناء پر نادرست ہے:۔

پہلی دلیل: پورے قرآن میں جہاں بھی لفظ ''آدم'' مذکور ہے وہاں صرف حضرت آدم ابوالبشرؑ ہی مراد ہیں ان کے علاوہ کوئی شخص مقصود نہیں، اگر ان کے علاوہ کوئی شخص مقصود ومراد ہوتا تو یقیناً اس کے ساتھ ایسا قرینہ ودلالتی اشارہ ذکر کیا جاتا کہ واقعہ کی بابت کسی طرح کا ابہام نہ پایا جائے۔

دوسری دلیل: قرآن مجید میں اس واقعہ سے مربوط جو بعض تفصیلات ذکر ہوئی ہیں مثلاً ''فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا'' (پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا) اس کی تطبیق صرف اسی ابتدائی انسان پر ہوتی ہے جو نہایت سادہ اندیشی اور سطحی فکر وادراک کے ساتھ زندگی کی منزلیں طے کر رہا تھا، وہ اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے حاصل ہونے والے تجربات کی بنیاد پر معلومات کے خزانے اکٹھے کرتا رہتا تھا چنانچہ آیت مبارکہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کو یہ آگاہی حاصل نہ تھی کہ جسے اس نے قتل کیا ہے اسے کس طرح زمین میں چھپائے اور اس کی لاش کو دفن کرے، تو یہ حالت صرف

آدم ابوالبشر کے بیٹے کی بابت قابل تصور و لائق تطبیق ہے بنی اسرائیل کے کسی شخص کی بابت اس طرح کی سادہ لوحی اس لئے قرین صحت قرار نہیں دی جاسکتی کیونکہ وہ اپنے طرزِ زندگی کے حوالہ سے تہذیب و تمدن کے حامل تھے لہٰذا ان میں سے کسی شخص کا اس طرح کے امور سے ناآگاہ ہونا قابل تصور نہیں ہوسکتا۔

تیسری دلیل: قرآن مجید میں اصل واقعہ کو بیان کرنے کے بعد خداوند عالم کے اس فرمان ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ '' (اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر مقرر کردیا) سے استدلال کرتے ہوئے آیت پر کئے جانے والے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اس حکم کے قرار دیئے جانے کا بنی اسرائیل سے اختصاص اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ مذکورہ واقعہ کی بناء پر جو حکم صادر و مقرر ہوا وہ تمام بنی نوع بشر کے لئے ہے کہ جو شخص کسی ایک شخص کو قتل کرے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جو شخص کسی ایک شخص کو زندہ کرے گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا، تو اس میں بنی اسرائیل اور دیگر افراد برابر حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا بنی اسرائیل سے اختصاص کی کوئی وجہ نہیں بنتی، اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے یہ الفاظ استعمال کئے کہ ''اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے مقرر کردیا'' کیونکہ قاتل و مقتول حضرت آدم ابوالبشر کے دو بیٹے نہ تھے کہ جن کا واقعہ نوعِ انسانی کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے ابتدائی حادثات میں سے ایک ہے کہ جس سے ان دو اشخاص کے بعد آنے والے افراد کے لئے درسِ عبرت ہو، بلکہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کے دو بیٹوں کا واقعہ ہے اور ان کا واقعہ درحقیقت ایک خاص قوم سے تعلق رکھنے والے واقعات میں سے ایک ہے، لہٰذا اسے خاص طور پر بنی اسرائیل کے لئے درسِ عبرت قرار دیتے ہوئے ان کے لئے اس کی بابت مخصوص حکم صادر و مقرر کیا گیا۔

لیکن یہ جواب اصل اعتراض کی بیخ کنی نہیں کرتا بلکہ اصل سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کیونکہ کسی ایک انسان کو قتل کرنا تمام افرادِ بشر کا قتل کرنا قرار دیا جانا اور کسی ایک انسان کو زندہ کرنا تمام افراد بشر کا زندہ کرنا قرار دیا جانا ایک عام کلی دستور العمل ہے کہ اس نوع کے تمام افراد پر یکساں لاگو ہوتا ہے اور اسے ان میں سے صرف بعض افراد سے مخصوص قرار نہیں دیا جاسکتا، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ قتل سے مربوط یہ حکم بعض افرادِ بشر سے مخصوص ہو اور دیگر افراد سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو جبکہ بنی اسرائیل سے پہلے بھی قتل کی بے شمار وارداتیں ہوچکی تھیں اور قتل کے اس مخصوص واقعہ سے پہلے بھی بنی اسرائیل میں اس طرح کی وارداتوں کا ارتکاب ہوچکا تھا، تو اس صورت میں اس حکم کا مخصوص واقعہ سے کیا ربط بنتا ہے اور خاص طور پر بنی اسرائیل کے لئے اس حکم کے اختصاص کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ اگر سوال و اعتراض کرنے والے کی بات درست قرار دی جائے تو آیت کے الفاظ یوں ہونے چاہیں تھے: ''من قتل منکم نفساً'' (جو شخص تم میں سے کسی کو قتل کرے) تا کہ یہ حکم انہی سے مخصوص قرار پائے، پھر یہ سوال اس اختصاص کی بابت دوبارہ سامنے آئے گا جبکہ وہ سرے ہی سے نادرست ہے اور جہاں تک اصل اعتراض کے جواب کا تعلق ہے کہ جو جملہ ''قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ

نَفْسٍ ‘‘میں حکم کی صورت میں مذکورہ ہے تو وہ ایک عظیم راز پر مشتمل ہے اوراس میں حکمت بالغہ پائی جاتی ہے نہ یہ کہ صرف ایک شرعی حکم کا بیان مقصود ہو، لہٰذا ’’ان کے لئے لکھ دیئے جانے اور مقرر کئے جانے‘‘ سے اسی حکمت بالغہ اور عظیم راز کا بیان واظہار مقصود ہے اوراس میں بنی اسرائیل اوران کے علاوہ دیگر افرادِ بشر کے لئے اسی طرح سے فوائد عمومی صورت میں ملحوظ ہیں جس طرح ان اخلاقی دستورات اور نصائح میں ہوتے ہیں جو قرآن مجید میں اُمت محمدیہؐ کے لئے ذکر ہوئے ہیں جبکہ وہ نصائح و اخلاقی دستورات صرف اُمت محمدیؐ سے مختص نہیں بلکہ ان کے آثار وفوائد نوع انسانی کے تمام افراد کے لئے ہیں، اور زیر نظر آیت میں جو حکم مذکور ہے اس میں بنی اسرائیل کو مخاطب قرار دے کر اسے بیان کیا گیا ہے کیونکہ سلسلہ کلام انہی سے مربوط تھا اور انہیں نصیحت کرنا، تنبیہ وخبردار کرنا اوران کی طرف سے انجام پانے والے ان اعمال پر ان کی سرزنش کرنا مقصود تھا جو انہوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کرتے ہوئے انجام دیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی میں ڈھٹائی سے کام لیتے رہے اور فتنہ کی آگ کو شعلہ ور کر کے جنگ وجدال کا میدان سجانا اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کو مسلسل ہوا دینا ان کا معمول بن گیا، یہی وجہ ہے کہ ’’مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا ـ‘‘ کے ذیلی جملہ میں یوں ارشاد ہوا ’’وَ لَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِکَ فِی الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ‘‘(اور یقیناً ان کے پاس ہمارے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ آئے مگر اس کے باوجود ان میں سے کثیر لوگوں نے زیادہ روی کا ارتکاب کیا)۔

ان مطالب کے باوجود اس مفسر نے واقعہ کی جو تفصیلات ذکر کی ہیں ان کا نہ تو روایتی اور نہ ہی تاریخی، کوئی حوالہ نہیں ملتا، یعنی نہ کوئی روایت اس تفصیل کی تصدیق کرتی ہے اور نہ ہی کسی تاریخی سند سے اس کا قرین صحت ہونا ثابت ہوتا ہے۔

بنابرایں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جملہ ’’نَبَاَ ابۡنَیۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ ‘‘ سے حضرت آدم ابوالبشرؑ ہی کے دو بیٹوں کا واقعہ مراد ہے اور جہاں تک جملہ ’’بِالۡحَقِّ ‘‘ کا تعلق ہے کہ اس کے ذریعے کلام میں تقیید مقصود ہے اور وہ لفظ ’’نَبَاَ ‘‘ یا ’’وَاتۡلُ ‘‘ سے متعلق ہے، تو اس میں یہ اشارہ یا صریح ومحکم دلالت پائی جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے درمیان اس واقعہ کی بابت ردو بدل اور تحریف ہو چکی ہے اور اس کی تفصیل میں بعض امور کو حذف کر دیا گیا ہے چنانچہ اس کا ثبوت موجودہ تورات کے سفر تکوین کی چوتھی فصل میں مذکور مطالب میں پایا جاتا ہے کہ اس میں کوے کے بھیجے جانے اور اس کے زمین کو کھودنے کا ذکر ہی نہیں ہے، اس سے بالاتر یہ کہ اس میں واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جس میں عقیدۂ تجسیم۔ خدا کے جسم والا ہونے۔ کا صریح الفاظ میں اظہار ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ومنزہ ہے۔

واقعہ کے دیگر پہلو:

ایک پہلو: ’’اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَ لَمۡ یُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ‘‘(جب ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان

میں سے ایک سے قربانی قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی)

آیت کے ظاہر لسیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دو بھائیوں میں سے ہر ایک نے اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کی تا کہ اس کے ذریعے پروردگار کا قرب حاصل ہو سکے، البتہ لفظی حوالہ سے یہ نکتہ یاد رہے کہ یہاں لفظ ''قربان'' کو تثنیہ کے صیغہ میں ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں مصدر ہے اور مصدر تثنیہ و جمع کے صیغوں میں نہیں آتا۔

دوسرا پہلو: ''قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ'' (اس نے کہا میں تجھے قتل کر دوں گا، اس نے کہا: اللہ پرہیز گاروں سے قبول کرتا ہے)۔

اس میں پہلی بات کہنے والا قاتل اور دوسری بات مقتول کا بیان ہے۔ سیاقِ کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی ہے جبکہ دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہوئی؟ اس سلسلہ میں آیت خاموش ہے اور لفظوں میں اس کی بابت کوئی اشارہ نہیں ملتا، البتہ صرف ایک مقام ایسا ہے جو کلامِ الٰہی میں اس مطلب کو ثابت کرتا ہے کہ سابقہ اُمتوں یا بنی اسرائیل کے درمیان بالخصوص یہ بات مشہور تھی کہ قربانی کی قبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اسے آگ کھا جائے یعنی جلا دے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۸۳

''اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ''

(جن لوگوں نے کہا کہ اللہ نے ہم سے عہد لے لیا ہے کہ ہم کسی رسول کو اس وقت نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لے، کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس رسول واضح دلائل کے ساتھ آئے اور وہ چیز بھی لے آئے جو تم نے کہی ہے تو پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو)

یاد رہے کہ آج تک اہل کتاب کے ہاں لفظ ''قربان'' کا معنی معروف و مشہور ہے چنانچہ یہودیوں کے ہاں اس کی متعدد قسمیں ہیں جن میں حیوان کو ذبح کر کے قربانی کرنا، آٹا، تیل، دودھ و پنیر اور نورس پھل دینا شامل ہے اور عیسائیوں کے ہاں روٹی اور شراب پیش کرنا ہے کہ جو بعد میں ان کے عقیدہ کے مطابق روٹی حضرت مسیح کے گوشت میں اور شراب ان کے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بنا بر ایں اس واقعہ میں بھی عین ممکن ہے کہ قربانی کا قبول کیا جانا اسی صورت میں ہو، اور خاص طور پر اس حوالہ سے کہ اس واقعہ کا مخاطب اہل کتاب کو قرار دیا گیا ہے جو کہ مذکورہ بالا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بہر حال قاتل اور مقتول دونوں کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک کی قربانی قبول جبکہ دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔

تیسرا پہلو: سیاق الکلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس نے یہ الفاظ کہے: ''لَاَقْتُلَنَّكَ'' (میں تجھے قتل کر دوں

گا) وہ وہی شخص ہے جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی اور اس نے یہ بات اس حسد کی بناء پر کہی جو اس کے دل میں پایا جاتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی وجہ بظاہر معلوم نہیں ہوتی، اور نہ ہی مقتول کی طرف سے کسی فعل کا ارتکاب قاتل کی طرف سے قتل کی دھمکی دینے کی وجہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کی بناء پر اس نے اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی بات کی، لہٰذا یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ قاتل کا یہ کہنا کہ "میں تجھے ضرور قتل کروں گا" صرف اس حسد کی وجہ سے تھا کہ مقتول کی قربانی قبول ہوئی اور قاتل کی قربانی قبول نہیں ہوئی، اور مقتول کا یہ کہنا کہ "اللہ تقویٰ والوں سے قبول کرتا ہے" تا آخر کہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان کو ذکر فرمایا ہے۔ دراصل قاتل کی بات کا جواب ہے کہ جس میں اس نے اسے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ:

(۱) قربانی کی قبولیت و عدم قبولیت میں میرا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ ہی میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں مجھے قتل کیا جائے، بلکہ اصل جرم قاتل کا ہے کہ جس نے تقوائے الٰہی اختیار نہیں کیا جس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کی قربانی کو قبول نہیں فرمایا۔

(۲) اگر قاتل نے مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں اپنا ہاتھ اسے قتل کرنے کے لئے ہرگز نہیں بڑھاؤں گا کیونکہ وہ تقوائے الٰہی رکھتا ہے اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، اور وہ اپنے اس بیان سے یہ چاہتا ہے کہ قاتل اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد جب واپس جائے تو اس پر مقتول کے گناہ کا بوجھ بھی ہو اور خود اپنے گناہ کا بوجھ بھی ہو کہ جس کے نتیجہ میں وہ دوزخیوں میں قرار پائے جو کہ ظالموں کی سزا و انجام ہے۔

بنابرایں اس کا یہ کہنا ہے کہ "اللہ متقین سے قبول کرتا ہے" اس کی دو صورتیں ممکن ہے، پہلی صورت یہ کہ اس سے مراد ان افراد کا تعین ہو جن کی قربانی قبول ہوتی ہے اور یہ بات ثابت ہو کہ قبولیت کا دائرہ وسیع نہیں کہ متقی و غیر متقی سب اس میں شامل ہوں۔ یعنی ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی قربانی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے خواہ وہ متقی ہو یا نہ ہو۔ بلکہ صرف انہی افراد کی قربانی قبول ہوتی ہے جو متقی ہوں، دوسری صورت یہ کہ قاتل کے گمان کے برعکس صورتحال کو واضح کرنا مقصود ہو کہ اس نے جو سوچا ہے وہ اس کی غلط فہمی ہے، گویا قاتل یہ گمان کر رہا تھا کہ اس کی قربانی قبول ہوگی اور مقتول کی قربانی قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس کا گمان یہ تھا کہ اس کا دارومدار تقویٰ پر نہیں یا یہ کہ اللہ حقیقت حال سے آگاہ ہی نہیں رکھتا (معاذ اللہ)۔ البتہ ممکن ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو اور حقیقت الامر اس پر آشکار نہ ہو جیسا کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص پر اصل بات واضح نہیں ہوتی اور وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس جملہ "إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ" (یقیناً اللہ متقی لوگوں سے قبول کرتا ہے) میں عبادات اور قربانیوں کی قبولیت کی بابت حقیقت الامر بیان کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں قتل، ظلم اور حسد کے حوالہ سے نصیحت و ہدایت مذکور ہے کہ ان اعمال سے اجتناب برتا جائے کیونکہ ان کی سزا بہت سخت ہے، اور اس میں ان اعمال پر خدا کی طرف

سے مقرر کردہ سزا کا ثبوتی واثباتی بیان ہے کہ اس طرح کے افعال پر سزا دینا رب العالمین کی ربوبیت کے لازمی تقاضوں میں شامل ہے کیونکہ ربوبیت اسی صورت میں قائم ونافذ ہوتی ہے جب کائنات پر ایسا مضبوط نظام حاکم ہو جس میں ہر عمل کو عدل کے ترازو پر تولا جائے اور ظلم کی سزا دردناک عذاب مقرر ہوتا کہ ظالم اپنے ظلم سے ہاتھ اُٹھالے یا پھر اپنے کئے کی وہ سزا بھگتے جسے اس نے خود اپنے لئے قرار دیا ہے یعنی دوزخ کی آگ۔

عظیم طرزِ عمل کا پاکیزہ نمونہ:

''لَئِنۡ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ''

(اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے کہ مجھے قتل کرے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں)

اس میں حرف لام قسم کے معنی پر مشتمل ہے اور جملہ ''ہاتھ بڑھانا'' دراصل کنایۃً ذکر ہوا ہے اس سے مراد قتل کے مقدمات مہیا وفراہم کرنا اور اس کے اسباب کی عملداری کو یقینی بنانا ہے یہاں یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ جملہ ''لَئِنۡ بَسَطۡتَّ'' (اگر تو نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا) جواب جملہ اسمیہ کے ساتھ نفی میں دیا گیا اور فعل یعنی ''بسطت'' کی بجائے اسم صفت یعنی ''باسط'' کہا گیا اور اسے حرف بؔ کے ساتھ مزید تاکید کا حامل بنایا گیا (بباسط) اور پھر کلام کو قسم کے ذریعے پختہ کر دیا گیا تو ان تمام اُمور سے اس مطلب کا اثبات مقصود ہے کہ وہ اپنے بھائی کے قتل کا ارتکاب کرنے تو بجائے خود اس کا ارادہ کرنے اور اس کے بارے میں سوچنے سے بھی کوسوں دور ہے، یعنی وہ ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اسی لئے اس نے اپنے بیان ''مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ'' (میں تیری طرف اپنا ہاتھ بڑھانے والا نہیں) کی تاکید مزید کے لئے اس کی وجہ کو ان الفاظ میں ذکر کیا ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ'' (میں اللہ کا خوف دل میں رکھتا ہوں کہ جو عالمین کا پروردگار ہے) کیونکہ جب متقین اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جو کہ معبود وعالمین کا پروردگار ہے کہ جو ہر گناہ پر مقررہ عذاب کی سزا دیتا ہے، تو اس وقت متقین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو انہیں کسی ظلم کے ارتکاب کی طرف نہیں بڑھنے دیتا کہ جو ان کے لئے ہلاکت وتباہی کا سبب بنے، یعنی جب متقی افراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو انہیں اس کے عدل کی یاد آجاتی ہے اور وہ یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ ان کا پروردگار ہے کہ جو ہر گناہ پر مقررہ عذاب کی سزا دیتا ہے، تو اس وقت متقین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو انہیں کسی ظلم کے ارتکاب کی طرف نہیں بڑھنے دیتا کہ جو ان کے لئے ہلاکت وتباہی کا سبب بنے، یعنی جب متقی افراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو انہیں اس کے عدل کی عملداری کے تصور کی بناء پر وہ گناہ کرنے کی بجائے اس کا ارادہ وخیال بھی دل میں نہیں لاتے۔

اس بیان کے بعد ھابیل نے جو تاویل اور بھائی کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کی وجہ ذکر کی وہ اس کے مؤقف کی اصل حقیقت تھی کہ اس نے ''لَئِنۡ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ '' (اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے کہ مجھے قتل کرے میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ جو کائنات کا پروردگار ہے) کے بعد یوں کہا'' اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓءَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ '' (میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں اپنے سر لے لے تاکہ دوزخیوں میں سے ہو جا اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی!) اس میں اس نے اپنے مؤقف کی حقیقت بیان کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس صورتحال میں دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ وہ بھی اپنے بھائی کو کہ جس نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ قتل کر دے اور قتل کا گناہ اپنے سر لے کر اپنے آپ کو دوزخی بنا لے، یا یہ کہ اس کا بھائی اسے قتل کر دے اور وہ دوزخی بن جائے، اس صورتحال میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو قتل نہیں کرے گا وہ بھائی کہ جس نے خود اپنے آپ پر ظلم کر کے اپنی سعادت کو کھو دیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا اور بھائی کو قتل کر کے ظالم نہیں بننا چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھائی اسے قتل کرنے کا مجرم بنے اور ظالم قرار پائے جبکہ وہ خود قتل ہو کر سعادتمند بنے اور ظالم قرار نہ پائے۔ بنابرایں اس کا یہ کہنا: ''اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ'' (میں چاہتا ہوں) دراصل ''انی اختار'' (میں اختیار کرتا ہوں) کے معنی میں ہے یعنی یہاں لفظ ارادہ کو اختیار کرنے سے کنایۃً ذکر کیا گیا ہے کیونکہ صورتحال ان دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی متقاضی تھی لہٰذا یہاں ارادہ کرنے سے اختیار کرنا مراد لیا جائے گا۔

اگر ہم اس آیت یعنی ''اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ۔۔۔'' کو آیت ''لَئِنۡ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ'' کی تاویل پر مبنی قرار دیں تو یہ اس آیت کی طرح ہوگی جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ کو بیان کرتی ہے کہ خضر نے ایک شخص کو قتل کیا تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے پوچھا ''اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَکِیَّۃًۢ بِغَیۡرِ نَفۡسٍ ؕ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا نُّکۡرًا'' (سورۂ کہف، آیت ۷۴)۔ کیا تو نے ایک پاکیزہ جان کو ناحق قتل کیا ہے، تو نے بہت ہی برا کام انجام دیا ہے۔ خضرؑ نے اس کے جواب میں اپنے کئے کی توجیہ کرتے ہوئے یوں کہا'' وَ اَمَّا الۡغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤۡمِنَیۡنِ فَخَشِیۡنَاۤ اَنۡ یُّرۡہِقَہُمَا طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ﴿ۚ۸۰﴾ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَہُمَا رَبُّہُمَا خَیۡرًا مِّنۡہُ زَکٰوۃً وَّ اَقۡرَبَ رُحۡمًا'' (سورۂ کہف، آیت ۸۱)۔ (جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو اس کے والدین مؤمن تھے اور ہمیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ اپنے والدین کو سرکشی و کفر کی راہ پر لگا دے لہٰذا ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار ان کے لئے اس کے بدلے اس سے بہتر و پاکیزہ اور نہایت مہربان فرزند انہیں عطا کرے)۔

زیر نظر واقعہ کے حوالہ سے بھی صورتحال یہ ہے کہ مقتول (ہابیل) نے چاہا یعنی اختیار و پسند کیا کہ سعادت و خوش بختی کی حامل موت کو شقاوت و بدبختی کی حامل زندگی اور ظالموں کی صف میں قرار پانے پر ترجیح دے خواہ اس کا بھائی اپنے غلط مؤقف کے نتیجہ میں شقاوت و بدبختی سے دوچار کیوں نہ ہو اور یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے حضرت خضرؑ نے اس بچے کے لئے

سعادت کی حامل زندگی کو اختیار کیا اگر چہ یہ بات اس کے والدین کے لئے غم واندوہ اور نہایت دکھ کا سبب تھی لیکن حضرت خضرؑ نے اسے اس کے زندہ رہنے اور سرکش و کافر ہو کر اپنے اور والدین کی گمراہی کا باعث بننے پر ترجیح دی تا کہ اللہ اس کے والدین کو اس کے بدلے میں اس سے کہیں بہتر اور پاکیزہ ومہربان فرزند عطا فرمائے۔

جہاں تک ہابیل ابن آدم کا تعلق ہے کہ جنہیں قتل کیا گیا تو وہ متقین میں سے تھے اور عالم باللہ تھے۔ اللہ کی معرفت رکھتے تھے چنانچہ ان کے متقی ہونے کا ثبوت ان کے اس بیان میں پایا جاتا ہے " اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ " (یقیناً اللہ متقین سے قبول کرتا ہے) کہ اس میں ان کے متقی ہونے کا ادعاء واظہار پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کر دی اور اسے رد نہیں کیا۔ اور ان کے عالم باللہ ہونے کا ثبوت اس جملہ میں پایا جاتا ہے " اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ " (میں اللہ سے ڈرتا ہوں کہ جو عالمین کا رب ہے)۔ اس میں انہوں نے اپنے دل میں اللہ کا خوف ہونے کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس حوالہ سے ان کے بیان کی تصدیق ان لفظوں میں فرمائی " اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا " (یقیناً اللہ کا خوف وخشیت اس کے عالم بندے ہی رکھتے ہیں)۔ سورۂ فاطر، آیت ۲۸۔

بنابرایں اللہ تعالیٰ کا ھابیل کے بیان کا ذکر کرنا کہ اس نے کہا " اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ " (میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو رب العالمین ہے) اور اس کی تصدیق کرنا دراصل اس کے عالم ہونے کی صفت بیان کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھی حضرت خضرؑ کی توصیف میں ان کے علم کا حوالہ دے کر یوں فرمایا: " وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا " (کہف، آیت ۶۵) اور ہم نے اسے اپنی طرف سے علم عطا کیا، اور ہابیل کے عالم باللہ ہونے کا کافی ووافی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قاتل وظالم بھائی کو حکمت بالغہ اور موعظہ حسنہ کے ذریعے نصیحت کی کیونکہ انہوں نے اپنی پاک طینت اور پاکیزہ فطرت سے اس حقیقت کو درک کر لیا تھا کہ عنقریب بنی نوع بشر کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا پھر طبع بشری کی وجہ سے ان میں مختلف گروہ پیدا ہو جائیں گے جن میں سے بعض متقی اور بعض ظالم ہوں گے۔ جبکہ ان کا اور پوری کائنات کا ایک ہی پروردگار ہے جو ان کا مالک اور ان کے امور کا تدبیر کرنے والا ہے اور یہ بات اس کے حسن تدبیر میں شامل ہے کہ وہ عدل واحسان کو دوست رکھتا ہے جبکہ ظلم وعداوان کو ناپسند وناگوار سمجھتا ہے، لہٰذا انسان پر واجب ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اللہ کا خوف دل میں رکھے جو کہ اصل دین ہے اور اطاعتی وتقربی اعمال اور معاصی ومظالم دونوں قسم کے اعمال موجود ہیں البتہ اطاعتی وتقربی اعمال کی قبولیت کا دارومدار تقویٰ پر ہے جبکہ گناہوں اور مظالم کے آثار گناہ کرنے والے اور ظلم کرنے والے کی گردن کا طوق ہیں، ان تمام امور کے تناظر میں لازمی وناقابل انکار حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کے علاوہ دوسرا جہان ہونا چاہیے جس میں جزاء وسزا ہو یعنی اطاعت ونیک اعمال پر جزا دی جائے اور ظلم کرنے والوں کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے۔

تو یہ دینی معارف کے بنیادی اصول ہیں اور مبدء ومعاد سے تعلق رکھنے والے جامع علوم ہیں جن سے اس عبد صالح

نے اپنے جاہل بھائی کو آگاہی دلائی، وہ جاہل بھائی کہ جسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ میت کو کس طرح لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ کرے یہاں تک کہ اسے کوے نے اس کی تعلیم دی، چنانچہ اس عبد صالح نے اپنے بھائی سے کہ جس نے اسے قتل کی دھمکی دی یہ نہیں کہا: اگر تو مجھے قتل کرنا چاہے تو میں اپنے آپ کو تیرے سپرد کردوں گا اور اپنا دفاع نہیں کروں گا اور اپنے قتل ہونے کی پروا نہیں کروں گا، بلکہ اس نے اس سے یہ کہا: میں تجھے قتل نہیں کروگا۔

اور اس نے یہ بھی نہیں کہا: میں ہر حال میں تیرے ہاتھوں قتل ہونا چاہتا ہوں تا کہ تو ظالم قرار پائے اور دوزخ کی آگ کا شکار ہو، کیونکہ کسی شخص کی زندگی میں اس کی گمراہی و بدبختی کے اسباب فراہم کرنا ظلم اور شریعت اسلامیہ کی رو سے ضلالت و گمراہی ہے اور یہ مسئلہ ہر شریعت میں یکساں ہے کسی شریعت میں اس کے علاوہ نہیں، لہٰذا اس نے اس طرح کہا: اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میری طرف بڑھائے تو میں قتل کئے جانے کو تجھے قتل کرنے پر ترجیح دوں گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

ہابیل و قابیل کے واقعہ کی بابت ایک غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ بعض حضرات نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے یوں کہا: جس طرح قاتل نے ظلم و زیادتی کرنے میں افراط سے کام لیا اسی طرح مقتول نے بھی تفریط کا پہلو اختیار کیا اور ظلم سہنے کی راہ لی، کیونکہ نہ تو اس نے قاتل کی بابت پر کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی اپنے دفاع و بچاؤ میں کچھ کیا، بلکہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیا اور اس کے ارادۂ قتل میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور صاف لفظوں میں اس سے کہا: اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے گا تا کہ مجھے قتل کرے میں ہرگز تجھے قتل کرنے کے لئے اپنے ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں ہی قصوروار ہیں۔

یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ ہابیل نے یہ نہیں کہا کہ میں اپنا دفاع نہیں کروں گا اور تجھے تیرے حال پر چھوڑ دوں گا کہ تو جو کچھ چاہتا ہے میرے ساتھ انجام دے، بلکہ اسے نے کہا: میں تجھے قتل کرنا نہیں چاہتا، چنانچہ قرآن مجید میں قتل کی کیفیت اور اس کی تفصیلات مذکور نہیں اور نہ ہی یہ بیان ہوا ہے کہ ہابیل نے اپنے بچاؤ کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا یا یہ کہ قابیل نے اس پر ناگہانی حملہ کر کے اسے قتل کردیا جبکہ وہ اپنے بچاؤ اور دفاع کی تدبیر کر رہا تھا، اس حوالہ سے کوئی بات مذکور نہیں لہٰذا مذکورہ بالا اعتراض ہرگز قرین صحت نہیں۔

اسی طرح اس واقعہ پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ہابیل نے اس لئے اپنے آپ کو اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہونے پر آمادہ کیا اور خود کو اس کے حوالہ کردیا تا کہ اس کا بھائی ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر شقاوت و بدبختی کا طوق گلے میں

ڈال لے جبکہ وہ خود اس حوالہ سے سعادتمند قرار پائے یعنی بے جرم و بے خطا مارے جانے کے نتیجہ میں مظلومانہ شہادت کی سعادت حاصل کرلے چنانچہ اس نے اپنے بھائی سے یوں کہا "اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ" (میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ اپنے سر لے تاکہ تو دوزخی قرار پائے) اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے بعض خشک مقدس لوگ اپنی عبادات اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر اپنے لئے عابد و زاہد ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں خواہ کوئی ظالم ان پر ظلم ڈھاتا رہے یا کوئی زیادتی کرنے والا ان پر زیادتی کرتا رہے وہ اس ظلم و زیادتی کا بوجھ اور گناہ ظلم و زیادتی کرنے والے پر ڈال کر خود آسودہ خاطر ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنا دفاع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں سوائے اس کے کہ وہ صبر سے کام لیں اور مظلوم بن کر اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں، جبکہ ان کی یہ بات و نظریہ جہالت کے سوا کچھ نہیں کیونکہ وہ گناہ پر اعانت کے باب سے ہے جو کہ مددگار اور مدد کئے جانے والے دونوں افراد کے گناہ میں برابر کے شریک ہونے سے عبارت ہے یعنی اس میں دونوں ڈ یکساں قصوروار ٹھہرائے جائیں گے اور ایسا نہیں ہوگا کہ صرف ظلم کرنے والا دونوں کے گناہ کا ذمہ دار قرار پائے گا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہابیل کا یہ کہنا کہ میں چاہتا ہوں تو میرا اور اپنا گناہ اپنے سر لے (اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ) دراصل ایک مشروط بیان ہے کہ اگر تو مجھے قتل کرے تو میرا اور تیرا دونوں کا گناہ تیرے اوپر ہوگا اور تو ہی جوابدہ ہوگا چنانچہ اس کی بابت مربوطہ مطالب پہلے ذکر ہوچکے ہیں۔

یاد رہے کہ مذکورہ بالا دو اعتراضات کے جواب میں بعض حضرات نے دیگر مطالب ذکر کئے ہیں جو نہایت کمزور بلکہ بے معنی ہیں لہٰذا ان کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور جہاں تک ہابیل کے بیان کا تعلق ہے کہ جس میں انہوں نے یوں کہا "اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ" (میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا گناہ اپنے سر لے تاکہ تو دوزخیوں میں سے ہوجا) تو اس کی بابت بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو مجھے قتل کرے گا تو میرا اور تیرا گناہ دونوں کا ذمہ دار تو ہوگا۔

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ "تبوء" جو کہ "بواء" سے مشتق ہے اس کا معنی کسی جگہ کے تمام اجزاء کا مساوی ہونا ہے جبکہ اس کے برعکس لفظ "نبوۃ" کا معنی کسی جگہ کے اجزاء کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے چنانچہ جب یوں کہا جائے: "مکان بواء" تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہاں آنے والوں کے لئے وہ جگہ ناہموار نہیں اور جب عرب یوں کہتے ہیں "بوأت له مکاناً" تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس جگہ کو درست و ہموار کردیا۔ استفادہ کے لئے تیار کردیا اور ہابیل کا بیان کہ "اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ" اس سے مراد یہ ہے کہ تو مجھے قتل کرکے اُٹھے تو تیری حالت یہ ہو کہ میرا اور تیرا گناہ دونوں ہی تیرے سر ہوں، اور یوں بھی کہا جاتا ہے "انکرت باطلها و بوّت بحقها" (میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کا حق اپنے ذمہ لے لیا)، (کتاب المفردات، ص ۶۹)۔

بنابرایں ''تبوء'' کا معنی ''رجوع'' کرنا دراصل لازم المعنی کے باب سے ہے، لہٰذا ''اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ'' کا معنی یہ ہے کہ مقتول پر جو ظلم ہوا اس کا گناہ قاتل کے سر ہو کہ جس نے قتل کا ارتکاب کیا اس طرح اس پر دو گناہوں کا بوجھ آئے گا، جبکہ مقتول اللہ کے حضور کسی گناہ کے بغیر حاضر ہوگا، تو یہ مطلب جملہ ''اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ'' سے بظاہر سمجھا جاتا ہے چنانچہ اسی مطلب پر مشتمل روایات بھی موجود ہیں اور عقل سلیم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس موضوع کی بابت بعض مربوطہ مطالب المیزان جلد ۲ احکام الاعمال کی بحث میں ذکر ہو چکے ہیں اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آیہ مبارکہ ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' کسی کا گناہ کسی دوسرے کے سر کرنے کی ممانعت کرتی ہے اور عقل بھی اس کے خلاف حکم کرتی ہے، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کا تعلق عقل نظری کے احکام سے نہیں کہ جن میں ان کے وقوع پذیر ہونے کے محال ہونے کی گنجائش ہوتی ہے بلکہ عملی عقل کے احکام میں سے ہے کہ کا ثبوت وتغیر انسانی معاشرے کی مصلحتوں وفوائد کے تابع ہوتے ہیں یعنی ان کا دارومدار انسانی معاشرہ کی بہترین وبھلائی پر ہوتا ہے لہٰذا یہ بات عین ممکن ہے کہ معاشرہ کسی شخص کے کام کو کسی دوسرے کا کام قرار دے اور اس کے نام لکھ کر اس پر اس کا مؤاخذہ کرے یا یہ کہ کوئی شخص ایسا کام کرے کہ جسے اس کا کام قرار نہ دیا جائے مثلاً کوئی شخص کسی انسان کو قتل کرے کہ جس کے ذمہ معاشرہ کے حقوق ہوں اور اس نے ان حقوق کو سلب کر دیا ہو تو قاتل سے ان حقوق کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا، اسی طرح اگر مقتول نے معاشرہ میں فتنہ وفساد پھیلایا ہو اور امن عامہ میں خلل اندازی کا مرتکب ہوا ہو تو معاشرہ کا حق ہے کہ وہ اس کی تمام خوبیوں ونیکیوں پر سرخ لکیر پھیرے اور انہیں بے اثر قرار دے، اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، تو اس طرح کے موارد میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ مقتول کے گناہوں وخطاؤں کو قاتل کے سر ڈالتا ہے یعنی مظلوم سے جو ناروا اعمال سرزد ہوئے معاشرہ وہ سب ظالم کے نامہ اعمال میں شمار کرتا ہے، اور ان کا بوجھ ظالم پر ڈالتا ہے، اس صورت میں بھی درحقیقت اس نے خود اپنا گناہ اپنے سر لیا کسی دوسرے کا گناہ اپنے سر نہیں لیا کیونکہ اس نے قتل جیسے ظلم کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو دوھرے گناہ میں آلودہ کر لیا، اس کی مثال اس چیز سے دی جاسکتی ہے جسے کوئی شخص کسی سے اس کی قیمت دے کر خرید کرے تو جس طرح نئے مالک کا اس چیز سے استفادہ کرنا اور اسے کام میں لانا پہلے مالک کی اس دور کی ملکیت کو سلب نہیں کرتا جب وہ چیز اس کی ملکیت سے دوسرے شخص کی ملکیت میں نہیں آئی تھی اسی طرح آیہ مبارکہ میں جملہ ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' قاتل کے اس گناہ پر اس کے مؤاخذہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ اس کا مرتکب نہیں ہوا تھا، اور نہ ہی یہ جملہ یعنی ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' اس لئے بے فائدہ وبے اثر قرار دیا جاسکتا ہے کہ دوسرے شخص کی وجہ سے ذمہ داری خود بخود کسی اور شخص کی طرف منتقل ہو چکی ہے، یہ تو ہے آیت مبارکہ کے حوالہ سے موضوع کی وضاحت، اسی طرح وہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بے فائدہ وبے اثر نہیں ہوتا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا: ''لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسہ'' (کسی مسلمان شخص

کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں)۔

یعنی اس ارشادِ نبویؐ کو صرف اس بنیاد پے بے اثر قرار دینا درست نہیں کہ خرید وفروخت کی وجہ سے ملکیت دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ معاشرہ مقتول کے گناہوں کو قاتل کے گناہ قرار دیتا ہے اس بناء پر مقتول کے گناہ قاتل کے گناہ قرار پاتے ہیں کیونکہ اس نے قتل کا ارتکاب کرنے اور مقتول پر ظلم کرنے کی وجہ سے اس کے گناہ بھی اپنے سر لے گئے جس طرح سے کوئی شخص کوئی چیز کسی سے خریدتا ہے تو اس استعمال کرنے سے صرف اس وجہ سے کہ وہ چیز اس سے پہلے فلاں شخص کی ملکیت تھی روکا نہیں جاسکتا۔ لہٰذا آیۂ مبارکہ قاتل کی وجہ سے مقتول کے مؤاخذہ میں مانع ہوتی ہے، اور اسے اس حوالہ سے بے اثر قرار دینا صحیح نہیں۔

تو یہ ہے ہمارا نقطہ نظر جو ہم نے جملہ ''اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ'' میں اختیار کیا ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''اثمی و اثمك'' (میرا گناہ اور تیرا گناہ) سے مراد یہ ہے ''اثم قتلی و اثمك'' (مجھے قتل کرنے کا گناہ اور تیرا گناہ) یعنی اگر تو نے مجھے قتل کیا تو میرے قتل کا گناہ اور تیرے دیگر گناہ، سب تیری گردن میں ہوں گے۔ یہ بات ابن مسعود اور ابن عباس و دیگر حضرات کی طرف منسوب ہے، اور ایک رائے جو جبائی اور زجاج سے منسوب ہے وہ یہ کہ اس سے مراد ''باثم قتلی و اثمك الذی لم یتقبل من اجله قربانك'' ہے یعنی میرے قتل کا گناہ اور تیرا وہ گناہ جس کی وجہ سے تیری قربانی قبول نہیں ہوئی، اور ایک رائے یہ بھی ذکر ہوئی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے ''باثم قتلی و اثمك الذی هو قتل جمیع الناس'' یعنی مجھے قتل کرنے کا گناہ اور تیرا وہ گناہ کہ جو تمام انسانوں کے قتل سے عبارت ہے، یہ رائے دیگر مفسرین سے منسوب ہے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان، جلد ۴ ص ۱۸۴)

مذکورہ بالا آراء اس جملہ ''اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ'' کی بابت ذکر کی گئی ہیں لیکن آیت کے الفاظ کے تناظر میں ان آراء کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی عقل سے اس کی تصدیق و تائید ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ دونوں گناہوں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار دیکر یہ کہنا بھی بلاوجہ ہے کہ ایک گناہ قاتل کا ہے اور ایک گناہ مقتول کا ہے، جبکہ دونوں گناہ قاتل کے ہیں۔

قتل کی سنگین واردات:

''فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''

(پھر اسے اس کے نفس نے اپنا اسیر کرلیا کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کردے چنانچہ اس نے اسے قتل کردیا جس سے وہ

خسارہ پانے والوں میں سے ہوگیا)

یہاں قتل کی سنگین واردات کے ارتکاب کا واقعہ بیان ہوتا ہے، راغب اصفہانی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے کہ لفظ ''طوع'' کا معنی فرمانبرداری ہے جس کے مقابلے میں لفظ ''کرہ'' استعمال ہوتا ہے جس کا معنی بے رغبتی وناپسندیدگی ہے، لفظ ''طاعت'' بھی ''طوع'' کی طرح ہے البتہ لفظ ''اطاعت'' زیادہ تر ان موارد میں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی مافوق کی طرف سے حکم صادر ہوا اور لفظ ''ارتسام'' وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں دستور وفرمان دیا جائے۔ کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے، بنابرایں جملہ ''فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ'' کا معنی گویا یوں ہے ''اسمحت لهٔ قرينتهٔ وانقادت لهٔ و سولت''، اس کے ساتھی۔ یعنی اس کے نفس۔ نے اس کے لئے راہ ہموار کی اور اسے رام کیا اور اسے آمادہ کیا وورغلایا، ''طوعت'' مقصود کی تفہیم اور مقصد ومطلوب کے ابلاغ کی بابت ''اطاعت'' سے زیادہ بہتر ہے، جملہ ''فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ'' کے مقابل میں یوں کہا جاتا ہے ''تأبت عن كذا نفسهٔ'' (اس کے نفس نے فلاں چیز سے انکار کردیا)، (المفردات، ص ۳۱۰)

راغب کے بیان میں اُن کا مقصد یہ نہیں کہ ''طوعت'' میں ''انقادت'' یا ''سولت'' کا معنی بھی شامل ہے بلکہ وہ یہ مطلب سمجھانا چاہتے ہیں کہ ''طوعت'' جو کہ باب تفعیل سے ہے یعنی ''تطویع''، اس سے تدریجی معنی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ''اطاعت'' جو کہ باب افعال سے ہے اس میں دفعتاً فرمان برداری کا معنی پایا جاتا ہے چنانچہ یہ بات ان دو بابوں یعنی افعال اور تفعیل میں عمومی طور پر ہوتی ہے، بنابرایں آیت میں ''تطویع'' سے مُراد پے در پے وسوسوں اور بار بار اقدامات کے نتیجہ میں نفس تدریجی طور پر کسی کام پر آمادہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کامل اطاعت وفرمانبرداری کا ہدف حاصل کر لیتا ہے۔ لہٰذا آیت کا معنی یہ ہے اس کا نفس رام ہوگیا اور تدریجی فرمانبرداری کرتے ہوئے بالآخر یہ مرحلہ آگیا کہ اس نے اپنے نفس کی ہاں میں ہاں ملادی اور اس کے فرمان کی اطاعت کو یقینی بناتے ہوئے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، اس بناء پر جملہ ''قَتْلَ اَخِيْهِ'' امر وفرمان کی جگہ مامور بہ کو ذکر کرنے کے طور پر ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے یوں کہا جاتا ہے: اس نے اس طرح فرماں برداری کی جبکہ اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے فلاں حکم کی اس طرح فرمانبرداری کی۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''طوعت'' بمعنی ''زینت'' ہے لہٰذا ''قَتْلَ اَخِيْهِ'' کلام میں مفعول بہ واقع ہوا ہے۔
(زينت لهٔ نفسهٔ، قتل اخيه)

ایک قول یہ ہے کہ ''طوعت'' بمعنی ''طاوعت'' ہے یعنی اس کا نفس بھائی کو قتل کرنے پر رام ہوا لہٰذا اصل جملہ اس طرح ہوگا ''طاوعت لهٔ نفسهٔ في قتل أخيه'' یعنی اس میں حرف ''فی'' محذوف ہے اور ''قَتْلَ اَخِيْهِ'' کو ادبی اصطلاح میں ''منصوب بنزع الخافض'' کہا جاتا ہے یعنی حرف جرّ حذف کر کے اسے منصوب (زبر کے ساتھ۔ قَتْلَ۔) قرار دیا گیا، بہرحال آیت کا معنی ظاہر وواضح ہے۔

ایک لطیف نکتہ:

بعض مفسرین نے جملہ ''فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ'' سے یہ سمجھا ہے کہ چونکہ اس میں ''اصبح'' مذکور ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو رات کے وقت قتل کیا، کیونکہ یہاں ''اصبح'' کا معنی یہ ہے کہ اس نے اس حال میں صبح کی کہ وہ خسارہ والوں میں سے تھا، لیکن یہ رائے صحیح نہیں کیونکہ جملہ ''اصبح'' اگرچہ اصل ولغت کے لحاظ سے ''صبح کرنے'' کے معنی میں آتا ہے اور اس کے مقابل جملہ ''امسٰی'' آتا ہے جس میں ''شام یا رات'' کا وقت مقصود ہوتا ہے لیکن اہل عرب اسے بمعنی ''صار'' استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ''ہوجانا'' ہے یعنی اس میں اس کے لفظی اشتقاق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، لہٰذا آیت کا معنی یہ نہیں کہ وہ صبح کے وقت خاسرین میں سے تھا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کرنے کے نتیجہ میں خاسرین میں سے ہوگیا، چنانچہ قرآنِ مجید میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں مثلاً:

- سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۰۳

''فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا''

(پھر تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے)

- سورۂ مائدہ، آیت ۵۲

''فَیُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ نٰدِمِیۡنَ''

(پھر وہ اپنے دلوں میں بات چھپانے پر شرمندہ ہوگئے)

یعنی اپنے گناہ کو چھپانے پر ندامت کا شکار ہوگئے۔

بنابرایں زیرِ نظر آیات مبارکہ میں ''فاصبح'' سے اس کا لغوی معنی مُراد لینا کسی بھی حوالہ سے قرینِ صحت نہیں قرار پاتا، بلکہ اس سے اس کا عام معروف معنی ہی مراد لیا جائے گا کہ وہ اپنے کئے کے نتیجہ میں خاسرین میں سے ہوگیا۔

خدا کا بھیجا ہوا کوّا:

''فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَہٗ کَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَۃَ اَخِیۡہِ''

(پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کھودنے لگا تاکہ اسے سمجھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے (دفن کرے)

"یبحث" میں لفظ "بحث" کا معنی کسی چیز کو مٹی میں ڈھونڈنا ہے اسی مناسبت سے یوں کہا جانے لگا "بحثت عن الأمر بحثاً" (میں نے اس کام میں کافی بحث و جستجو کی)۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۴ ص ۱۸۴)

"یواری" کہ جو "موارات" سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اس کا معنی چھپانا ہے اسی سے "تواری" بنا ہے جس کا معنی اپنے آپ کو چھپانا ہے۔ اور لفظ "وراء" کا معنی کسی چیز کی پشت ہے (اس کے پیچھے)۔

لفظ "سوأۃ" کا معنی وہ چیز ہے جسے انسان ناپسند کرتا ہو، لفظ "ویل" بمعنی ہلاکت و تباہی ہے اور لفظ "یاویلتیٰ" ہلاکت و تباہی کے موقع پر کہا جاتا ہے۔ لفظ "عجز" (ناتوانی) بمقابل "استطاعت" (توانائی) استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال آیۂ مبارکہ کے سیاق الکلام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاتل اپنے کئے پر ایک عرصہ تک سرگردانی میں مبتلا رہا اور اسے اس بات کا خوف لاحق رہا کہ کہیں کسی کو اس کے جرم کا پتہ نہ لگ جائے اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح لوگوں کی دسترس سے دور کرے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو اسے مقتول کی لاش کو دفن کرنا سکھائے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوے کا بھیجنا اور اس کا زمین کو کھودنا اور قابیل کا اپنے بھائی کو قتل کرنا یہ سب واقعات ایک دوسرے سے قریب قریب ہوتے یعنی ان کے درمیان زمانی فاصلہ نہ ہوتا تو قابیل کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی: یا ویلتا أعجزت أن أکون مثل هذا الغراب۔ (ہائے ہائے، کیا میں اس سے بھی زیادہ ناتواں ہوں کہ اس کوے جیسا ہو جاؤں)

اسی طرح اس واقعہ کا جائزہ لینے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوے نے زمین کھودنے کے بعد اس میں کوئی چیز دفن بھی کی کیونکہ ظاہر الکلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کوے نے قابیل کو دفن کرنے یعنی لاش کو پوشیدہ کرنے کا طریقہ بتانا چاہا صرف زمین کو کھودنا نہیں سکھایا۔ کیونکہ صرف زمین کو کھودنے کا طریقہ بتانا دفن کرنے کے طریقہ سے آگاہ کرنے میں کافی نہیں ہوتا اور وہ یعنی قابیل نہایت سادہ فہم کا مالک شخص تھا تو وہ صرف زمین کو کھودنے کے عمل سے دفن کی کیفیت و طریقہ سے کیونکر آگاہ ہو سکتا تھا، ویسے بھی ان دونوں کاموں میں کوئی ایسا ربط بھی نہیں کہ جس سے ایک کا دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہونا ثابت ہو، بلکہ قابیل نے جب دیکھا کہ کوا نے زمین کھودی اور کوئی چیز اس میں دفن کر دی تو اس سے اس نے اپنے بھائی کی میت کو چھپانا سیکھ لیا۔

پرندوں میں سے کوا ہی ایسا پرندہ ہے جو اپنے شکار سے بچے ہوئے کو اپنے لئے ذخیرہ کرنے کی غرض سے زمین میں دفن کرتا ہے خواہ چیز دانہ کی صورت میں ہو یا کوئی پرندہ ہو، اگر چہ وہ بعض اوقات زمین کو کسی چیز کے دفن کرنے یا اپنے لئے کچھ ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں کھودتا بلکہ اس لئے کھودتا ہے کہ اپنے لئے کوئی غذا، دانہ یا کیڑے وغیرہ تلاش کرے۔

ہم یہاں ایک ادبی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ سابق الذکر مطالب میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ "لیُرِیَهٗ" میں "یُری" کی ضمیر کی بازگشت "غراب" کی طرف ہے کیونکہ ظاہر الکلام میں "غراب" سب سے زیادہ نزدیک

لفظ ہے جس کی طرف اس ضمیر کو پلٹایا جاسکتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس ضمیر کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اگر چہ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن بظاہر یہ بات بعید نظر آتی ہے، تاہم دونوں صورتوں میں معنی درست ہے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ خداوند عالم قاتل کو سکھانا چاہتا تھا کہ وہ مقتول کی لاش کو کس طرح دفن کرے، یا یہ کہ کوا۔ کہ جسے اللہ نے بھیجا تھا وہ قاتل کو سکھانا و دکھانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے مقتول بھائی کی لاش کو کس طرح دفن کرے دونوں صورتیں قرین صحت ہیں۔

اور جہاں تک قابیل کے یہ کہنے کا تعلق ہے کہ (یا ویلنا أعجزت ان اکون مثل هٰذا العزاب) یعنی ہائے کہ میں اس سے بھی قاصر ہوں کہ اس کوے جیسا ہوں۔ تو اس کے یہ بات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح کوے نے نہایت آسانی کے ساتھ اس چیز کو چھپایا، اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اس طرح کرسکتا ہے کہ زمین کو کھود کر اپنے مقتول بھائی کو اس میں چھپادے (دفن کردے) کیونکہ زمین کو کھودنے اور اس کے اندر کوئی چیز چھپانے۔ دفن کرنے۔ کے درمیان ربط و پیوستگی ہے، اس خیال کی وجہ سے اسے سخت افسوس ہوا کہ وہ ایک عظیم فائدہ سے محروم ہوگیا اور اسے اس بات پر سخت ندامت و شرمندگی ہوئی کہ اس نے مقتول کی لاش کو چھپانے۔ دفن کرنے۔ کے بارے میں کوئی سوچ بچار ہی نہیں کی کہ اسے معلوم ہو جاتا کہ زمین کو کھودنا آسان ترین ذریعہ وطریقہ ہے جس سے وہ اسے دفن کرسکتا ہے۔ تو اس نے اپنی ندامت و شرمندگی کا اظہار ان لفظوں میں کیا "يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ" ہائے، میں اس قدر ناتوان ہوں کہ اس کوے جیسا بھی نہیں بن سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا سکتا۔

تو اس کا یہ کہنا دراصل اسے اپنے آپ کو کوسنے کے طور پر ہے کہ اس نے اپنے آپ سے استفہام انکاری کی صورت میں اس طرح کہا گویا اس نے اپنے آپ سے یوں کہا: کیا تو اس قدر ناتواں ہے کہ اس کوے جیسا ہوتا تو اپنے بھائی کی میت کو دفن کر لیتا؟ تو اسے اس کا جواب نفی میں ملا یعنی تو ایسا نہیں۔ اس قدر ناتوان نہیں۔، پھر وہ دوبارہ استفہامِ انکاری کی صورت میں اپنے آپ سے کہتا ہے کہ تو نے اس سے غفلت کیوں کی اور اس طریقہ کو کیوں نہیں اپنایا حالانکہ یہ نہایت واضح و آسان طریقہ ہے اور تو نے اس دوران بلاوجہ اپنے آپ کو شقاوت و بدبختی کا شکار کیوں کر لیا؟ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا لہٰذا وہ ندامت و پشیمانی کا شکار ہوگیا کیونکہ ندامت و پشیمانی اس نفسانی و باطنی دکھی حالت و کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ اپنے کئے کی بابت ان اسباب پر نظر ڈالتا ہے جو اس کے کسی فائدہ سے محروم ہونے یا کسی نقصان سے دوچار ہونے کا باعث بنتے ہیں کہ جن کے بارے میں اس نے بے توجہی و کاہلی برتی، آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ندامت و پشیمانی وہ حالت و کیفیت ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ اپنے ممکنہ وسائل سے استفادہ کرنے میں سستی بے توجہی سے کام لے اور جو شخص کسی ظلم کا مرتکب ہوا ہو اور اسے یہ بات ناگوار گزرے کہ لوگ اس کے کئے سے آگاہ و مطلع ہوں تو اس وقت جو حالت اس پر طاری ہوتی ہے اسے بھی ندامت و پشیمانی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس طرح کے امور یعنی

ظلم وزیادتی کو انسانی معاشرہ ہرگز قبول نہیں کرتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہوتے ہیں اور جو اعمال معاشرے کے عمومی نظام سے منافات رکھتے ہوں ان کے آثار افراد ہی پر پڑتے ہیں خواہ ابتدائے امر میں لوگ اس کی طرف متوجہ وملتفت نہ ہوں، اور ظالم مجرم شخص تو چاہتا ہے کہ معاشرہ کے نظام کو اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کرے جبکہ معاشرہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص کوئی زہریلی غذا کھائے یا زہریلی چیز پیئے اور چاہے کہ اس کا نظام ہاضمہ اس غذا یا زہریلے پانی کو ہضم کرلے جبکہ اس کا نظام ہاضمہ اسے ہضم نہیں کرتا بلکہ اس زہریلی چیز کا اثر ہرصورت میں ظاہر ہوگا خواہ وہ اسے اپنے اندر محفوظ کرلے جو کہ امکان پذیر ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کا اثر ظاہر ہوگا کہ جو ناگزیر ہے اور جسم کے نظام میں اس سے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ خواہ وماخواہ اس زہر کی اثرگزاری جسمانی نظام میں پائی جانے والی ان حفاظتی قوتوں کے ذریعے یقینی ہوتی ہے جو ہرطرح کی ضرررساں چیزوں کی کمین میں ہیں، ظالم کا حال بھی ایسا ہی ہے کہ وہ عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی کمین میں ہے: ''اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ'' (یقیناً تیرا پروردگار گھات میں ہے)۔ سورۂ فجر، آیت ۱۴۔ تو جس طرح زہر کا اثر اپنے وقت پر ظاہر ہوجاتا ہے اسی طرح جو شخص ان امور کی بابت تدبیر واہتمام میں کمی کرے جن میں بھرپور توجہ والتفات اور خیال رکھنا اس پر واجب ہوتا ہے تو اس پر اپنی کوتاہی کا اثر ظاہر ہوکر رہتا ہے اور پھر وہ ندامت وپشیمانی کا شکار ہوجاتا ہے اور اگر وہ اپنی کوتاہی کی تلافی کرنا بھی چاہے اور اس کی اصلاح ودرستگی کی کوشش واہتمام واقدام کرے تب بھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا بلکہ ایک خرابی کے بعد دوسری خرابی پیدا ہوجائے گی اور یکے بعد دیگرے پے درپے خرابیوں کے جنم لینے کے نتیجہ میں ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اللہ تعالیٰ اسے سب کے سامنے رسوا کردے گا اور ہر شخص اس کے مظالم وناروا اعمال وافعال سے آگاہ ومطلع ہوجائے گا۔

سابق الذکر مطالب کے تناظر میں یہ بات واضح وآشکار ہوگئی کہ جملہ ''فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ'' (وہ ندامت اُٹھانے والوں میں سے ہوگیا) دراصل اس کی اس ندامت وپشیمانی کی طرف اشارہ ہے جو اسے اپنے بھائی کی لاش دفن نہ کرسکنے کی وجہ سے لاحق ہوئی، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ندامت وپشیمانی اصل قتل کے ارتکاب پر ہوئی ہو اور یہ بات بعید بھی نہیں۔

احساس اور تفکیر کی بابت ایک بحث:

حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ میں ذکر ہونے والا یہ جملہ یعنی ''فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ'' قرآن مجید کی واحد آیت ہے جو اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے یعنی اس طرح کے مطالب پر مشتمل کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ملتی کہ جس

میں اس طرح انسان کے اپنی قوت احساس سے استفادہ کرنے کی کیفیت مذکور ہو اور اس سے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوت احساس کے ذریعے موجوداتِ عالم ہستی کی خصوصیات سے آگاہی حاصل کرتا پھر ان میں غور وفکر کرنے کے ذریعے اپنے مقاصد حیات و اغراضِ زندگی کو حاصل کرنے کی راہ ڈھونڈتا ہے جیسا کہ علمی بحثوں میں اس مطلب کو واضح طور پر بیان وتسلیم کیا گیا ہے کہ انسانی علوم ومعارف کا سرچشمہ بالآخر قوتِ احساس ہے اور وہ سب اسی پر منتہی ہوتا ہے اور یہ نظریہ اس نظریہ کے مقابل میں ہے جو تذکر اور علم فطری کے قائل حضرات نے پیش کیا ہے کہ اس کے مطابق تمام علوم ومعارف کی اصل و اساس اور سرچشمہ فطرتِ انسانی ہے۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ اگر آپ انسان کی لوح فکر پر نظر کریں اور اس پر نقش علمی صورتوں کے بارے میں غور وفکر کریں خواہ ان کا تعلق تصورات سے ہو یا تصدیقات سے ہو، کلیات سے ہو یا جزئیات سے ہو، کلی ہوں یا جزئی ہوں اور وہ علوم وادراکات اس انسان کی مضبوط فکر وفہم سے مربوط ومرتبط ہوں یا اس کی کمزور فکر وفہم کا نتیجہ ہوں، ہر حال میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خواہ وہ جاہل ترین اور فکری طور پر کمزور ترین انسان ہے مگر اس کی لوح فکر میں اس قدر علمی صورتیں اور علوم نقش وثبت ہیں کہ کوئی شخص انہیں شمار نہیں کرسکتا بلکہ ان کا شمار کرنا سوائے رب العالمین کے، کسی کے بس میں نہیں، اور ان علمی صورتوں کی کثرت اور ان کے شمار کئے جانے سے ماوراء ہونے کے باوجود یہ حقیقت مشاہدہ میں آتی ہے کہ اس دنیا میں انسانی زندگی کے دورانیہ میں ان صورتوں میں اضافہ در اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اس روز افزوں سلسلہ پر قہقری نظر کریں یعنی اس کے نقطہ آغاز کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ علمی صورتیں کم سے کم تر ہوتی ہوئی صفر تک جا پہنچیں گی اور پھر وہ لمحہ سامنے آجائے گا جب اس لوح ذہن پر کوئی علمی صورت دکھائی نہ دے گی یعنی علم بالفعل۔ موجودہ علمی صورت۔ میں سے کچھ بھی دکھائی نہ دے گا چنانچہ اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

O سورۂ علق، آیت ۵

''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ''

(اللہ نے انسان کو وہ علم پڑھایا جو وہ نہ جانتا تھا)

اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ اللہ نے اسے وہ علم عطا فرمایا جس سے وہ بے بہرہ تھا اور جو علم اس کے پاس تھا وہ اس کی بابت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دیئے جانے سے بے نیاز ہے، (یہ مراد لینا درست نہیں) کیونکہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جس کے لئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں کہ انسان کے پاس جو بھی علم ہے خواہ کوئی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عنایت ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے وجود کی کمالیت کو یقینی بنا سکے اور اپنی زندگی کے امور میں اس سے بھرپور استفادہ کر سکے، اور یہ امر واضح ہے کہ وہ تمام امور کہ جن کی طرف بے جان چیزیں اپنی طبیعی کششوں کے ساتھ رواں دواں رہتی ہیں، جاندار

موجودات کہ جن میں سے ایک انسان بھی ہے۔وہ بھی ان کی طرف علم کی روشنی کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں لہٰذا علم ہدایت ہی کا ایک مصداق ہے۔اور جہاں تک سلسلہ ہدایت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو علی الاطلاق اپنی طرف منسوب فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

- سورۂ طہٰ، آیت ۵۰

''الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی''

(اسی نے ہر چیز کو اس کی خلقت (وجود و ہستی) عطا کی، پھر ہدایت سے نوازا)

- سورۂ اعلیٰ، آیت ۲ تا ۳

''الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی''

(وہ کہ جس نے پیدا کیا تو اسے کامل فرمایا، اور اسی نے تقدیر کی پھر ہدایت فرمائی)

اور بنی نوع کی ہدایت کے حوالہ سے کہ جس میں حس و فکر ملحوظ ہے یوں ارشاد فرمایا:

- سورۂ نمل، آیت ۶۳

''اَمَّنۡ یَّهۡدِیۡکُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ''

(آیا وہ کہ جو تمہیں بحر و بر کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے)

ہدایت کے معنی کی بابت بعض سابقہ بحثوں میں مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں، خلاصہ بیان یہ کہ جب ہر علم ہدایت ہے اور ہر ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے تو ہر علم کا سرچشمہ خدائی تعلیم ہوگی، اور جملہ ''عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ'' کے قریب المعنی یہ جملہ ہے جو درج ذیل آیت میں مذکور ہے:

- سورۂ نحل، آیت ۷۸

''وَ اللّٰهُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ۙ وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ''

(اور اللہ نے جب تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا تو تمہیں کسی چیز کا علم نہ تھا اور اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے)

اگر انسان کی عمومی حالت پر غور کیا جائے اور قرآنی آیاتِ مبارکہ میں مذکور مطالب و معارف پر تدبر سے کام لیا جائے تو ان دونوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا نظری علم یعنی اشیاء و موجودات عالم ہستی کی خصوصیات اور ان سے مربوط و وابستہ عقلی معارف سب ہی کا نقطہ آغاز و سرچشمہ حس، قوت احساس ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ سے موجودات کی خصوصیات کا علم عطا فرماتا ہے کہ جس کا ثبوت اسی جملہ میں پایا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کوے کا حوالہ دیا ''فَبَعَثَ اللّٰهُ

غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ''(پھر اللہ نے کوے کو بھیجا جو زمین کو کھود رہا تھا تا کہ اسے (قاتل کو) دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح دفن کرے)۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوے کو دفن کا طریقہ سمجھانے کے لئے بھیجنے کی نسبت سنجی کریں تو اس سے خود اللہ تعالیٰ کا قاتل کو دفن کا طریقہ تعلیم دینا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ آیت میں یہ مذکور نہیں کہ کوا خود وہاں گیا اور زمین کو کھود کر قاتل کو بھائی کی لاش دفن کرنے کا طریقہ بتانے لگا بلکہ یوں مذکور ہے کہ اللہ نے کوے کو بھیجا اگر چہ کوا اس سے آگاہ نہ تھا کہ اسے خدا نے بھیجا ہے اور نہ ہی ہابیل کو معلوم تھا کہ کوئی ہے جو اس کے امور کی تدبیر اور اسے سکھانے وسمجھانے اور مقتول کو دفن کرنے کا طریقہ بتانے کا اہتمام وتدبر کر رہا ہے، بلکہ ظاہری طور پر کوے کا آنا اور زمین کھود کر قاتل کو مقتول کی لاش دفن کرنے کا طریقہ بتانا اتفاقیہ معلوم ہو رہا تھا جیسا کہ دیگر اتفاقی اسباب انسان کو معاش ومعاد کی تدبیر واہتمام سے آگاہی دلاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ جس نے انسان کو خلق فرمایا اور اسے اپنی زندگی کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے علم کی کمالیت کی راہ دکھائی، اور خدا ہی نے کائنات کا نظام اس طرح مرتب ومقرر کیا کہ جس سے انسان دیگر موجودات عالم ہستی کے ساتھ ارتباط و پیوستگی اور میل جول کے ذریعے علمی کمالات سے بہرہ ور ہو اور اشیاء کے حقائق ومعارف سے آگاہی کامل حاصل کر سکے تا کہ اس طرح اپنے مربوطہ امور کی انجام دہی سے صحیح طور پر عہدہ برا ہو اور زندگی کی بنیادی اغراض کو پورا کر سکے، بنا برایں یہ مطلب واضح ہوا کہ اس دن اللہ تعالیٰ ہی نے کوے کو بھیجا تا کہ قاتل کو مقتول کی لاش دفن کرنے کا طریقہ سمجھائے اور اللہ ہی ہے جو ہمیشہ وہ وسائل واسباب فراہم کرتا ہے جن سے استفادہ کرتے ہوئے انسان مربوطہ امور سے آگاہی حاصل کرتا ہے، لہٰذا خدا ہی انسان کا معلم ہے اور وہی انسان کو سب کچھ سکھانے وبتانے والا ہے چنانچہ اس حوالہ سے متعدد مثالیں قرآن مجید میں پائی جاتی ہیں مثلاً:

- سورۂ مائدہ، آیت ۴

''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ''

(اور جو کچھ تم شکاری کتوں کو سکھاتے ہو وہ اسی علم سے ہے جو خدا نے تمہیں پڑھایا ہے)

اس آیت میں انسان کے علم اور جو کچھ وہ شکاری کتوں کو سکھاتا ہے اس سب کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے جبکہ انسان یا خود اپنی قوتِ فکری سے آگاہی حاصل کرتا ہے یا دیگر ہمنوع افراد سے کسب فیض کرتے ہوئے آگاہ ہوتا ہے۔

- سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۲

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ''

(اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور اللہ ہی تمہیں علم عطا کرتا ہے)

اس آیت میں لوگوں کو علم عطا کرنے یعنی دین سے آگاہی دلانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے جبکہ لوگ

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دینی معارف کا کسب فیض کرتے تھے۔

○ سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۲

''وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ''

(اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے لکھنے کی تعلیم دی۔ اسی طرح وہ عمل کرے)

اس آیت میں لکھنے کی تعلیم دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے جبکہ لکھنے والا اپنے ہی جیسے کسی لکھنے والے انسان سے لکھنا سیکھتا ہے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ مذکورہ تمام امور خلق و تدبیر سے وابستہ ہیں لہٰذا ان اسباب کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے کہ جس سے انسان کی علمی کمالیت کی راہ ہموار ہوتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اسباب کے ذریعے تعلیم دینے ہی کا دوسرا نام ہے لہٰذا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کو زبانی و عملی طور پر تعلیم دیتا ہے اور کوئی لکھنے والا دوسرے لکھنے والے انسان کو بیان و قلم کے ذریعے لکھنا سکھاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان اسباب کے ذریعے تعلیم دیتا ہے کہ اس حوالہ سے تعلیم دینے اور سکھانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف یقیناً صحیح ہے۔ تو یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ان تمام امور کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح قرار پاسکتا ہے جن کی نسبت عالم الاسباب میں اللہ تعالیٰ کی طرف دی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا خالق ہے، اور اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان وہی اسباب ہیں جو ظاہری طور پر عملداری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہی کسی چیز کو وجود کی نعمت سے مالا مال کرنے کے ذرائع ہیں، اس مطلب کو آپ اس طرح بھی بیان کرسکتے ہیں کہ وہ کسی چیز کے وجود میں آنے کی جملہ شرائط میں سے ہیں کہ جس کا وجود میں آنا اپنی تمام جہتوں و جوانب سے اسباب سے وابستہ ہوتا ہے چنانچہ اس کی توضیحی مثال یوں ہے کہ زید جو کہ عمرو اور ھند کے رشتہ ازدواج سے وجود میں آیا اس کے وجود میں آنے کی جملہ شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ زید سے پہلے عمرو اور ھند موجود ہوں اور وہ آپس میں شادی کریں اور مناکحت انجام دیں، ورنہ زید نامی بچہ وجود میں نہیں آسکتا تھا، اسی طرح کسی چیز کو آنکھ سے دیکھنے سے پہلے، آنکھ کا ہونا اس کی جملہ شرائط میں سے ایک ہے کہ جو دیکھ سکتی ہو، اور اسی طرح دیگر امور!

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی توحید تمام اسباب کی نفی کرنے اور ان کو بے اثر قرار دینے میں مضمر ہے یعنی عقیدہ توحید تب درست قرار پائے گا جب تمام اسباب سے بے نیازی اور ان کے بے اثر ہونے کا عقیدہ رکھا جائے اور وہ اسے ہی خدا کی قدرتِ مطلقہ کے اثبات اور اس سے ہر طرح کے عجز و ناتوانی کی نفی میں بنیاد قرار دے اور یہ گمان کرے کہ اگر اسباب کی عملداری ضروری قرار دی جائے تو اس سے خداوند عالم کا کسی چیز کو وجود عطا کرنے میں مخصوص طریقہ اپنانے میں مجبور ہونا تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اس کے سوا کوئی اختیار ہی نہیں رکھتا بلکہ وہ اسباب ہی کا اسیر اور ان کے ہاتھوں بے بس ہے، تو اس طرح کا عقیدہ رکھنے والا شخص خود ہی اپنے نظریہ کی لاشعوری

طور پر نفی کرتا ہے، کیونکہ اس طرح وہ خدا کو مجبور تسلیم کرتا ہے جبکہ خود اس مطلب کی طرف متوجہ و ملتفت نہیں یعنی وہ خدا کو مختار ثابت کرتے کرتے اسے مجبور ثابت کر دیتا ہے اور اسباب کی مستقل اثر گزاری کو یقینی بناتے ہوئے ان کے بغیر خلق و ایجاد کو ناممکن قرار دیتا ہے حالانکہ عقیدۂ توحید میں اسباب کی عملداری خدا کی مشیت و فیصلہ پر موقوف ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے انسان کو اشیاء و موجوداتِ عالم ہستی کی ان وجودی خصوصیات سے آگاہی بخشی جن تک اس کے حواس دسترسی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس کے ذریعے تمام امور کی تعلیم دی پھر آسمان و زمین میں موجود ہر چیز اس کے دست تسخیر میں قرار دی۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ جاثیہ: آیت ۱۳

''وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ''

(اور اس نے تمہارے لئے مسخر کر دیا وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

اس میں آسمانوں اور زمین کی موجودات کا انسان کے لئے مسخر کر دینا یعنی اس کے دست اختیار میں دیئے جانے کا جو تذکرہ ہے اس سے اس کے علاوہ کچھ مراد نہیں کہ انسان ان اشیاء میں تصرف کرتے ہوئے یعنی ان سے کام لیتے ہوئے اپنی زندگی کے مقاصد و آرزوؤں کو پورا کر سکے، گویا اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء و موجودات کو انسان کے وجود کے ساتھ وابستہ و پیوستہ قرار دیا تاکہ وہ ان سے بھرپور استفادہ کر سکے اور اللہ نے اسے قوت فکر و فہم بھی عطا فرمائی تاکہ اس کے ذریعے وہ ان اشیاء و موجودات سے استفادہ اور انہیں اپنے مقاصد حیات کو پورا کرنے کے لئے استعمال میں لانے کا طریقہ معلوم کر سکے، اس مطلب کا ثبوت درج ذیل آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

○ سورۂ حج، آیت ۶۵

''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ''

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے اور اس کشتی کو بھی جو دریا میں چلتی ہے اس کے حکم کے ساتھ!)

○ سورۂ زخرف، آیت ۱۲

''وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ''

(اور اس نے تمہاری سواری کے لئے کشتی اور چوپائے قرار دیئے)

○ سورۂ المومنون، آیت ۲۲

''وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ''

(ان پر (چوپایوں پر) اور کشتی پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے)

ان کے علاوہ ان جیسی دیگر متعدد آیات میں اس طرح کے دلائل مذکور ہیں۔

آپ ان آیات کے اندازِ بیان پر غور کریں کہ کس طرح کشتی کے سواری کے لئے قرار دیئے جانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے جبکہ اسے انسان ہی بناتا ہے پھر ان پر سواری کرانے کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی حالانکہ کشتی اور چوپائے ہی ہیں جو انسان کو سوار کرتے یعنی ان کا بوجھ اپنے اوپر لادتے ہیں اور کشتیوں کے رواں دواں کرنے کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے جبکہ پانی کی روانی یا ہوا کی تیزی یا بخارات کا دباؤ اور اس کی روانی یا ہوا کی تیزی یا بخارات کا دباؤ اور اس طرح کے امور اس کا سبب ہوتے ہیں، اگر ان تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے مسخر قرار دیا جانا کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے ان سب میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ حاکم ہوتا ہے کہ جو کشتی، چوپایوں اور زمین و آسمان کی موجودات کو ان سے مطلوب مقاصد سے ہمکنار کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے انسان کو قوت حس کے ساتھ قوت فکر عطا فرمائی تا کہ وہ اس کے ذریعے اپنی اس کمالیت سے بہرہ ور ہو سکے جو اس کے لئے معین ہوئی ہے یعنی اپنے فکری علوم کہ جو تکوینیات یعنی نظری علوم میں اثر گزاری کرتے ہیں ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مقدرہ کمال تک رسائی کی کوشش میں کامیاب ہو سکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ نحل، آیت ۷۸

''وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ''

(اور اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے تا کہ تم شکر گزار بن سکو)

لیکن جہاں تک عملی علوم کا تعلق ہے کہ جو ان اعمال میں اثر گزار ہوتے ہیں جن کا انجام دینا یا انجام نہ دینا ضروری ہوتا ہے تو ان میں حسؔ یا عقل نظری کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کا سرچشمہ عنایت پروردگار ہوتا ہے، اس حوالہ سے ارشادِ الٰہی ہے:

○ سورۂ شمس، آیت ۷ تا ۱۰

''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۞ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۞ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا''

(اور نفس کی قسم اور اس کی کہ جس نے اسے درست کیا پھر اسے اس کی بدکاری اور اس کے تقویٰ سے آگاہی دلائی، یقیناً وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اسے پاکیزہ رکھا اور وہ شخص ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کر دیا)

○ سورۂ روم، آیت ۳۰

''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ''

(پس آپ اپنا رخِ دل دین کے لئے سیدھا رکھیں جو کہ فطرتِ الٰہی ہے کہ جس پر اللہ نے لوگوں کی تخلیق کا نظام

استوار ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی مضبوط دین ہے)

بنابرایں یہ مطلب واضح وآشکار ہے کہ ان آیات میں ان اعمال کے علم کا کہ جن کا انجام دینا ضروری ہے (یعنی نیکیاں) اور اسی طرح ان اعمال کے علم کہ جن کا انجام نہ دینا ضروری ہے (یعنی برائیاں) حقیقی سرچشمہ خدائی الہام کو قرار دیا گیا ہے، جو کہ ''دل میں ڈال دینے'' سے عبارت ہے، ''العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء من عبادہٖ'' (علم نور ہے، اللہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے)۔

لہٰذا یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ انسان کو جو علم بھی حاصل ہوتا ہے وہ خدائی ہدایت ہے اور خدا کی طرف سے رہنمائی کے ذریعے حاصل ہوئی ہے البتہ وہ نوعی لحاظ سے مختلف ہے یعنی اس کی مختلف قسمیں ہیں (۱) بعض وہ ہیں جن کا تعلق عالم الخارج میں پائی جانے والی اشیاء وموجودات کی خصوصیات سے ہے اور وہ راستہ کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو ان کی ہدایت فرماتا ہے وہ قوت حسّ ہے (۲) بعض وہ ہیں جو فکری کلی علوم میں سے ہیں تو وہ صرف اور صرف خدائی عطاوعنایت اور اس کی طرف مسخر کئے جانے سے حاصل ہوتے ہیں کہ نہ تو قوتِ حسّ ان پر سرخ لکھیر پھیر سکتی ہے اور نہ ہی انسان کسی بھی حال میں ان سے بے نیاز ہوسکتا ہے، (۳) بعض وہ ہیں جو عملی علوم میں سے ہیں کہ جن کا تعلق اعمال کے صالح وفاسد ہونے سے ہے یعنی وہ انسان کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں کہ ان میں سے کون سے اعمال اچھے اور کون سے بُرے ہیں؟ اور کون سے اعمال تقویٰ کے باب سے ہیں اور کون سے اعمال فجور وبدکاری کے باب سے ہیں؟ تو ان کی بابت اللہ تعالیٰ انسان کو الہامی ہدایت سے نوازتا ہے اور وہ اس طرح سے کہ دلوں میں ان سے آگاہی کی نعمت ڈال دیتا ہے اور اسے فطرت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی رہنمائی کرتا ہے۔جس کے نتیجہ میں انسان اپنے اعمال کی صحت وعدم صحت اور صلاح وفساد سے آگاہ ہوجاتا ہے۔

تیسری قسم کہ حقیقت میں اس کی برگرشت خدائی الہام کی طرف ہوتی ہے اسی صورت میں عملی طور پر نتیجہ بخش ثابت ہوتی ہے اور اس کی اثر گزاری مکمل ہوتی ہے جب دوسری قسم درستی کی حامل ہو اور صحیح وپائیدار بنیادوں پر استوار ہو اور وہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے عقل کی عملداری اسی صورت میں درست سمت میں قرار پاتی ہے جب انسان اپنے تقویٰ اور فطری دین کی پاسداری کو یقینی بنائے اس حوالہ سے درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

- سورۂ آلِ عمران، آیت ۷

''وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ''

(اور کوئی نہیں سمجھ سکتا سوائے صاحبانِ عقل کے!)

- سورۂ المومن، آیت ۱۳

''وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ''

(اور کوئی تذکرہ حاصل نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو خدا کی طرف پلٹ آئے)

- سورۂ انعام، آیت ۱۱۰

''وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ''

(اور ہم ان کے دلوں اوران کی آنکھوں کو پھیرتے رہتے ہیں جیسا کہ وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے تھے)

- سورۂ بقر، آیت ۱۳۰

''وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ''

(اور کون ہے جو آئین ابراہیمی سے منہ موڑتا ہے سوائے اس کے کہ جس نے اپنے آپ کو سفاہت و بے وقوفی سے لاچار کردیا ہو)

یعنی کوئی شخص فطری تقاضوں کو پس پشت نہیں ڈال سکتا سوائے اس کے کہ جس نے اپنی عقل کو تباہ کردیا ہو اور عقل کے علاوہ کسی راستہ پر چل پڑا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل اور تقویٰ کے درمیان جو چولی دامن کا ساتھ پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اس کی تائید بصیرت وشعور سے بھی ملتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ جب انسان کی قوت فکر ونظر مخدوش و بیمار ہو جائے کہ وہ حق و باطل کا ادراک ہی نہ کرپائے یعنی حق کو حق سمجھنے اور باطل کو باطل سمجھنے ہی سے قاصر و عاجز ہو جائے تو وہ فلاں کام کے کرنے یا فلاں کام سے اجتناب برتنے کی بابت خدائی الہام سے بہرہ ور کیونکر ہوسکتا ہے؟ مثلاً جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس مادی زوال پذیر زندگی کے بعد کچھ بھی نہیں تو وہ شخص دینی تقویٰ سے عاری ومحروم ہے جبکہ دینی تقویٰ اُخروی زندگی کا بہترین زادِراہ ہے، اسی طرح جو انسان اپنے فطری دین کی پاکیزگی سے محروم ہو اور تقویٰ کے زیور سے آراستہ نہ ہو اس کے وجود میں پائی جانے والی حسی قوتیں یعنی شہوانی وغضبانی قوتیں اور پسندیدگی و ناپسندیدگی وغیرہ کی قوتیں اعتدال پر نہیں رہتیں اور ان قوتوں کی عدم اعتدالی کے نتیجہ میں اس کی قوت ادراک اور فکر وفہم کی عملداری مطلوبہ پسندیدہ صورت میں نہیں ہوتی، اگر ہم قرآنی بیانات پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی یہی طرز واسلوب اپنایا گیا ہے اور دینی معارف ومعالم کی تعلیم میں بھی اسے ہی اختیار کیا گیا ہے یعنی مذکورہ بالا تین طریقوں کو معلومات کے حصول کے لئے معین کیا گیا ہے اور جہاں تک ان جزئیات کا تعلق ہے کہ جو احساس کی قابل قبول خصوصیات کی حامل ہیں تو ان کی بابت قرآنی آیات نوعِ انسانی کو حسی قوتوں سے استفادہ کرنے کی راہ دکھاتی ہیں مثلاً ''اَلَم تَرَ'' (کیا تو نے نہیں دیکھا)، ''افلا یرون'' (کیا وہ نہیں دیکھتے)، ''افرأیتم'' (کیا تم نے دیکھا)، ''افلا تبصرون'' (کیا تم نہیں دیکھتے، نہیں سمجھتے)، یہ اور اس طرح کے دیگر کلمات! اور جہاں تک ان عقلی کلیات، عقل کے کلی و عام احکام کا تعلق ہے کہ جو مادّہ سے مربوط کلی امور سے یا عالم ظاہر سے ماوراء امور

سے تعلق رکھتے ہیں تو قرآنی آیات ان کی بابت عقل کو ہی معتبر ترین دلیل قرار دیتی ہیں اگر چہ وہ امور حسی قوتوں کی دسترس سے باہر اور مادّہ و مادیات کے دائرہ سے خارج ہی کیوں نہیں، چنانچہ مبداء و معاد سے مربوط مطالب پر مشتمل اکثر آیات مبارکہ میں اس طرح کی تعبیرات مذکور ہیں: ''لقوم یعقلون'' (عقل سے کام لینے والے لوگوں کے لئے)، ''لقوم یتفکرون'' (غور وفکر سے کام لینے والے لوگوں کے لئے)، ''لقوم یتذکرون'' (تذکر و نصیحت سے بہرہ ور ہونے والوں کے لئے)، ''یفقھون'' (جو سمجھتے و سوج بوجھ رکھتے ہیں)، یہ اور اس طرح کی دیگر تعبیرات! اور جہاں تک ان عملی امور کا تعلق ہے جن میں خیر وشر اور عمل کے حوالہ سے نفع وضرر پایا جاتا ہے اور تقویٰ و فجور کی نسبتیں ملحوظ ہوتی ہیں تو آیات مبارکہ ان سے آگاہی کے حصول کو خداوند عالم کی طرف سے الہام و القاء اور خاص عنایت سے منسوب کرتی ہیں اور ان چیزوں کو ذکر کرتی ہیں جن کی یاد آوری سے انسان اپنے باطنی ادراک کے الہامی سرچشمہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے مثلاً وہ آیات کہ جن میں یہ تعبیرات مذکور ہیں ''ذلکم خیر لکم'' (یہ تمہارے لئے بہتر ہے)، ''فانہٗ اثم قلبہٗ'' (یقیناً اس کا دل گنہگار ہے)، ''فیھما اثم'' (ان دو میں گناہ ہے)، ''والاثم والبغی بغیر الحق'' (گناہ اور ناحق دشمنی)، ''ان اللہ لا یھدی'' (اللہ اسے ہدایت و رہنمائی نہیں کرتا)، یہ اور اس طرح کی دیگر تعبیرات۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا تعبیرات پر اچھی طرح غور فرمائیں، ان کے تناظر میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے ان حضرات کے نظریات پر سرخ لکیر پھیر دی جن کے تمام افکار و آراء کا دار و مدار حس و تجربہ پر ہے اور وہ عملی بحثوں میں عقلی احکام کی سرے سے نفی کرتے ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے تمام بیانات و موضوعات میں جس چیز کو سب سے پہلے مورد توجہ قرار دیا ہے اور اس کی بابت خاص عنایت برتی ہے وہ مسئلہ توحید باری تعالیٰ ہے اور اس کے بعد تمام حقیقی معارف کو اسی سے مربوط و وابستہ قرار دے کر متعلقہ مطالب بیان کئے ہیں اور لوگوں کو ان کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی ہے چنانچہ یہ امر واضح و روشن ہے کہ مسئلہ توحید دیگر تمام مسائل و موضوعات کی نسبت حس سے زیادہ دور ہے اور اس کا مادہ سے ہرگز کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ خالص عقلی احکام سے مربوط و مرتبط ہے، اور قرآن مجید واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ ان حقیقی معارف کا سرچشمہ فطرت ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ روم، آیت ۳۰

''فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا‌ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا‌ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ‌ؕ''

(پس آپ اپنا رخ دین کے لئے خالص رکھیں جو کہ فطرتِ الٰہی ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو خلق کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں)

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت، ایجاد کی وہ قسم ہے جو ان علوم و ادراکات سے جڑی ہوئی ہے لہٰذا یہ بات

بے معنی ہے کہ خلقت میں تبدیلی واقع ہو سوائے اس کہ وہ تبدیلی بھی خلقت وایجاد ہی سے تعلق رکھتی ہو، لیکن جہاں تک مطلق ایجاد کی تبدیلی کا تعلق ہے یعنی حکم الواقع اور وجود یافتہ چیز ہی اپنی حقیقت سے محروم ہو ایسا ہرگز قابل تصور نہیں اور یہ کام انسان کے بس میں ہی نہیں، اور خدا نہ کرے ایسا ہو کہ وہ اپنے فطری علوم ہی پر سرخ لکیر پھیر کر ان کی حیثیت وحقیقت کو یکسر ختم کرے اور زندگی میں فطرت کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے اور فطرت سے انحراف وروگردانی کی جو صورتیں مشاہدہ میں آتی ہیں وہ فطری اصولوں واحکام کو پاؤں تلے روندنے سے عبارت نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ان کا غلط وبیجا استعمال کہلاتا ہے جیسا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تیرانداز جب تیر چلاتا ہے تو وہ اس کے مطلوبہ ہدف پر نہیں لگتا جبکہ تیر اور اس سے مربوط امور واشیاء سب درست جگہ پر قرار دی جاتی ہیں تاکہ مقصودہ مقام پر لگے لیکن اس کا استعمال اسے غلط جگہ پر پھینک دیتا ہے، یہی حال چاقو، چھریوں، ہتھوڑوں، سوئیوں، قینچیوں ودیگر آلات کا ہے کہ جب انہیں درست جگہوں میں قرار نہ دیا جائے یعنی ان سے وہ کام لیا جائے جس کے لئے وہ بنائے نہیں گئے تھے تب بھی وہ اپنا وہ کام ضرور کریں گے جو ان کی وجودی فطرت کا تقاضا ہے یعنی کاٹنا، ٹکڑے وحصے بخرے کرنا، توڑنا وغیرہ، لیکن مقصود ومطلوبہ صورت میں نہیں، اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جس کا محال وناممکن ہونا یقینی ہے اور وہ یہ کہ آرے سے سوئی کا کام لیا جائے یعنی جس آلہ کو کاٹنے کے لئے بنایا گیا تھا اس سے سینے کا کام لیا جائے گویا آرے نے اپنا کام سوئی سے تبدیل کر لیا اور اپنا کام اسے اور اس کا کام اپنے ذمہ لے لیا، جس کے نتیجہ میں کاٹنے کی بجائے سینے وجوڑنے کا کام کرنے لگا، ایسا ہونا محال ہے۔ یہ مطلب ہر اس دانشور اور اہل فکر ونظر پر روشن وآشکار ہے جو حس وتجربہ ہی کو اصل واساس قرار دیتے ہیں اور اپنے نظریہ کی صحت ودرستی پر اس طرح استدلال کرتے ہیں:۔

(۱) خالص عقلی بحثیں اور حس سے دور مقدمات سے ترتیب وتشکیل یافتہ قیاسات میں بہت زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں چنانچہ اس کا ثبوت خالص عقلی مسائل میں کثرت سے پائے جانے والے اختلافات ہیں، لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے یعنی ان کا سہارا لینا درست نہیں کیونکہ ان سے اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

(۲) قوتِ حس مسلم طور پر اشیاء کی خصوصیات سے آگاہی حاصل کرنے کا ذریعہ ووسیلہ ہے چنانچہ جب موضوعات میں کسی موضوع میں اس کی مخصوص شرائط کے ساتھ کوئی اثر محسوس ہو اور پھر انہی شرائط کے ساتھ یعنی کسی طرح کے اختلاف وفرق کے بغیر بار بار وہ اثر اس کے ساتھ دکھائی دے تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اثر اتفاقاً اس کے ساتھ ملحق نہیں ہوا بلکہ اس موضوع کی پیوستہ خصوصیت ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہے کیونکہ اگر اتفاقیہ ہوتی تو ہمیشہ اس کے ساتھ نہ ہوتی۔

مذکورہ بالا دو دلیلیں حس وتجربہ کا سہارا لینے کی اصولی ضرورت کے اثبات اور خالص عقلی اصولوں کو اپنانے کی نفی کے لئے قائم کی گئی ہیں جبکہ ان میں جن اصولوں کا سہارا لیا گیا ہے وہ سب ہی عقلی ہیں اور حس وتجربہ سے باہر ہیں، پھر انہی عقلی اصولوں کے ذریعے استدلال کر کے ان سے استدلال کرنے کی نفی مطلوب ہوئی ہے ان کا ایسا کرنا ہمارے سابقہ بیان کی

تصدیق ہے کہ فطرت ہرگز غلط و نادرست نہیں ہوتی یہ انسان ہے جو اس سے استفادہ کرنے اور اس سے کام لینے کی کیفیت میں غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس سے بدتر صورت یہ ہے کہ حس و تجربہ کو تشریع شدہ احکام اور مقرر شدہ قوانین کی تشخیص کے لئے استعمال کیا گیا مثلاً معاشرہ میں کوئی حکم مقرر کر کے اسے لوگوں میں نافذ کر دیا گیا تا کہ اس طرح اس کا اثر و نتیجہ معلوم ہو سکے اور پھر اس کی بابت عملی نتائج کی نسبت سنجی اور جائزہ لیا گیا کہ اگر اس سے زیادہ موارد میں بہتر نتائج حاصل ہوئے ہوں تو اسے ہی ایک مستقل قانون کی صورت دی گئی ورنہ اسے ایک طرف رکھ دیا گیا اور اس کی جگہ دوسرا قانون لایا گیا اور اسے بھی پہلے حکم و قانون کی طرح آزمایا گیا تو یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہتا ہے اور یہ طرزِ عمل بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے قیاس یا استحسان کے ذریعے کسی حکم و قانون کے قرار دیئے جانے کا نظریہ ہے کہ اس کی بناء پر شرعی حکم کا تعین کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ فقہی حوالہ سے قیاس و استحسان کہ جسے علمی زبان میں ''شم الفقاہت'' کہا جاتا ہے وہ حکم کے کشف کا ذریعہ و وسیلہ تو ہے مگر حکم کے قرار دینے اور قانونگزاری کا اس سے کوئی تعلق نہیں یعنی اس کی بنیاد پر کوئی حکم و قانون مقرر و طے نہیں کیا جا سکتا، بہر حال قیاس و استحسان کی بحث علم اصول سے تعلق رکھتی ہے اس سلسلہ میں اسی علم کی طرف رجوع کیا جائے، البتہ یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ قرآن مجید ان سب کو نادرست قرار دیتا ہے اور یہ بات ثابت کرتا ہے کہ اس کے مقررہ احکام واضح طور پر فطری ہیں اور تقویٰ و فجور کہ ہر شخص کو خدا کی طرف سے الہامی صورت میں ان سے آگاہی دلائی جاتی ہے ان کی تفصیلات صرف وحی کے ذریعے حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس حوالہ سے درج ذیل آیاتِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

- سورۂ اسرائیل، آیت ۳۶

''وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ''

(اور اس کی پیروی نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں)

- سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۸

''وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ''

(اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو)

- سورۂ بقرہ آیت ۲۱۳

''اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ''

(اللہ نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی حق کے ساتھ، تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ صادر کرے جس میں وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں)

اس آیت میں احکام شریعت اور قوانین الٰہی کو ''حق'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

○ سورۂ نجم، آیت ۲۸

''وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا''

(اور گمان، حق سے ذرہ بھر بے نیاز نہیں کر سکتا)

ہاں، گمان، حق سے کیونکر بے نیاز کر سکتا ہے جبکہ اس کی پیروی میں باطل یعنی گمراہی کے کھڈ میں گرنے کا خوف ہر وقت دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔

○ سورۂ یونس آیت ۳۲

''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ''

(کیا حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ ہے؟)

○ سورۂ نحل، آیت ۳۷

''فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ''

(خدا جسے گمراہ کرتا ہے اسے ہرگز ہدایت عطا نہیں کرتا)

یعنی گمراہی انسان کو خیر و سعادت کی راہ پر لانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی لہٰذا جو شخص باطل کے ذریعے حق تک، یا ظلم کے ذریعے عدل تک، یا برائی کے ذریعے نیکی تک، یا فجور کے ذریعے تقویٰ تک پہنچنے کی کوشش کرے تو وہ غلط راستہ پر چلا اور اصل راستہ سے بھٹک گیا اور اس نے وجود و ہستی سے اس چیز کا طمع و توقع کر لی جو اس کے لئے یقیناً روا نہیں، جبکہ احکام و قوانین کی اصل و اساس سرچشمہ وجود و ایجاد ہی ہے کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا یعنی وہ چیزیں کہ جو اس کے لئے روا نہیں ان کے حصول کی کوشش نتیجہ بخش ثابت ہوتی تو یہ کام متضاد اشیاء کی خصوصیات میں بھی ہو سکتا اور دو متضاد چیزوں میں سے ہر ایک، دوسری چیز کا عمل و اثر اپنے ذمہ میں لے سکتی، جبکہ ایسا ممکن نہیں اور اسی طرح قرآن مجید اس طریقہ تذکر کی بھی نفی کرتا ہے کہ جس میں علمی و فکری طرز عمل کو نادرست قرار دیا جاتا ہے اور فطری اصولوں کو قابل اعتناء و لائق توجہ نہیں سمجھا جاتا اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب اسی جلد میں بیان ہو چکے ہیں۔

اور اس طرح قرآن مجید لوگوں کو تقوائے الٰہی اختیار کئے بغیر تفکر سے منع کرتا ہے اور اسے بے مقصد و بے فائدہ کام قرار دیتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب فی الجملہ بیان ہو چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ قرآن مجید جہاں بھی دینی احکام و دستورات کو بیان کرتا ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی فضیلتوں اور پاکیزہ صفات کو ذکر کرتا ہے تاکہ ان کی یاد آوری سے انسان کے اندر تقویٰ سے آراستہ ہونے کا جذبہ بیدار ہو کہ جس کے نتیجہ میں شرعی احکام کے سمجھنے اور اس کی

بابت آگاہی کے حصول کی راہ ہموار ہو سکے، اس مطلب کا اشاراتی حوالہ درج ذیل آیات میں پایا جاتا ہے:

- سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۲

''وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ''

(اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی عدت کا وقت پورا کر لیں کہ اگر وہ اپنی مرضی و پسندیدگی کے ساتھ نیکی کا راستہ اپناتے ہوئے نئے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کا راستہ نہ روکو، یہ نصیحت ہے جو تم میں سے اسے کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور یہ بات تمہارے لئے پاکیزہ ترین و پاک ترین ہے، خدا علم رکھتا ہے جبکہ تم علم نہیں رکھتے)

- سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۳

''وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۗ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ''

(اور تم ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف خدا سے مخصوص رہے، اور اگر وہ رک جائیں تو سوائے ظالموں کے، کسی پر چڑھائی روا نہیں)

- سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵

''وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۗ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ''

(اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز برائی و بدی سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے اور اللہ اس سے آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو)

عادلانہ قانونِ الٰہی:

''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا''

(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر مقرر کیا کہ جو شخص کسی شخص کو ناحق قتل کرے یا زمین میں فساد پھیلائے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جو شخص کسی انسان کو زندہ کرے گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا)

لفظ ''اَجْل'' کی بابت تفسیر مجمع البیان میں لغت کے حوالہ سے یوں مذکور ہے ''الاجل فی اللغة الجناية''

لغت میں ''اَجل'' کا معنی جرم کیا گیا ہے، راغب اصفہانی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب المفردات میں لکھا ہے: ''اَجل'' اس جرم کو کہتے ہیں کہ مستقبل میں جس کے وقوع پذیر ہونے کا اندیشہ لاحق ہو، اس بناء پر ہر ''اجل'' جرم ہے لیکن ہر جرم ''اجل'' نہیں کہلاتا، عام طور پر یوں کہا جاتا ہے، ''فعلت ذلك من اجله'' (میں نے فلاں کام اس وجہ سے انجام دیا)، (ملاحظہ ہو: کتاب المفردات، صفحہ ۱۱) پھر یہ لفظ ''اَجل'' کسی کام کی وجہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا، چنانچہ یوں کہا جاتا ہے: ''فعلتهٔ ذلك من اجلهٖ'' (میں نے اس وجہ سے فلاں کام کیا) یعنی وہ چیز میرے کام کی وجہ ہے، شاید یہ لفظ ابتداء میں وجہ وسبب کے معنی میں استعمال ہوا ہو کہ جرم وجنایت کے موجب وباعث امر کے لئے اسے ذکر کیا جاتا ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں: ''اساء فلان و من أجل ذلك أدبتهٔ بالضرب'' فلاں شخص نے برا کام انجام دیا اور اسی وجہ سے میں نے اسے مارا تاکہ اسے سبق حاصل ہو، یعنی میرے اسے مارنے کا سبب ووجہ اس کی طرف سے انجام پانے والا وہ جرم وغلط کام ہے یا یہ کہ اس جرم نے اسے برا بنا دیا، پھر یہ لفظ تدریجاً ہر وجہ وسبب کے لئے استعمال کیا جانے لگا چنانچہ یوں کہا گیا: ازورك من اجل حبیی لك و لأجل حبیی لك، میرا تجھ سے ملاقات کے لئے آنا اس وجہ سے ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے اور تیری محبت مجھے تیرے پاس لائی ہے۔

آیہ مبارکہ میں جملہ ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ'' بظاہر اس واقعہ کی طرف اشارہ کے طور پر ہے جو حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے درمیان رونما ہوا کہ سابقہ آیات میں اسے ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دردناک واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ ہم نے بنی اسرائیل کے لئے اس طرح کا حکم مقرر کیا ہے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جملہ ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ'' کا تعلق سابقہ آیت میں مذکور اس جملہ سے ہے ''فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ'' (تو وہ پشیمان لوگوں میں سے ہوگیا) یعنی وہ کام اس کی ندامت وپشیمانی کا سبب بنا، یہ قول اگرچہ اپنے طور پر قرین صحت لگتا ہے جیسا کہ اس کی مانند سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۰ میں یوں ارشاد ہوا: ''كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۝ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ؕ وَيَسۡـئَلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى'' (اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرسکو، دنیا وآخرت میں اور یہ لوگ یتیموں کے بارے میں آپ سے پوچھتے ہیں) لیکن اس سے یہ مطلب نکلے گا کہ جملہ ''كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ'' کو ابتدائے کلام میں قرار دیا جائے جبکہ قرآنی طرزِ بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کے موارد میں حرف واؤ ذکر کیا جاتا ہے جو استیناف یعنی ابتداء وآغاز کا معنی دیتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت ۲۲۰ میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَيَسۡـئَلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى'' (اور وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں) تو اس میں حرف واؤ کے ساتھ نئے موضوع کے بیان کا آغاز ہوا ہے اسی طرح کی مثالیں دیگر آیات میں بھی موجود ہیں۔

اور جہاں تک جملہ ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ'' کا تعلق ہے کہ وہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ کی طرف اشاراتی حوالہ ہے تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس واقعہ سے یہ مطلب ثابت ہوتا ہے کہ نوع انسانی کی طبع وجودی نفسانی خواہشات کی پیروی اور حسد

کی رسیا ہے اور حسد لوگوں کو دوسروں کے غیر اختیاری امور کے حوالہ سے بھی اس حد تک پستی سے دوچار کر دیتا ہے کہ وہ نہایت کمترین چیز کی بنیاد پر حسد کی آگ میں جلتے ہوئے رب العالمین کی بارگاہ میں گستاخی و جسارت سے بھی دریغ نہیں کرتے اور پھر اپنے ہمنوع افراد میں سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو یہاں تک کہ اپنے حقیقی پدری و مادری بھائی کو قتل کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

حقیقت یہ ہے کہ سب انسان ایک ہی نوع کے افراد ہیں اور ایک ہی وجودی حقیقت کے حامل ہیں لہٰذا ان میں سے ایک شخص انسانیت کے اسی مقام کا حامل ہوتا ہے کہ اس نوع کے کثیر افراد جس کے حامل ہوتے ہیں یعنی سب میں انسانیت یکساں ہوتی ہے اور کثیر افراد اسی مقام اور منزلت کے حامل ہوتے ہیں جو ان میں سے ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلق کرنے اور نسل انسانی میں اضافہ در اضافہ کرنے کے ذریعے اس حقیقت کی بقاء مقصود قرار دی ہے کہ جو تھوڑی مدت ہی زندہ رہ سکتی ہے اور اس کی بقاء کا راز اسی میں مضمر قرار دیا کہ یکے بعد دیگرے اس کے افراد آتے جاتے ہیں اور آنے والا جانے والے کی جگہ پر قرار پائے اور جانے والے کی طرح خدا کی زمین میں خدا کی عبادت و بندگی کرتا رہے، بنابرایں کسی ایک شخص کو قتل کرنا اصل خلقت کو تباہی سے دوچار کرنے کے مترادف ہے اور اس غرض کو پورا نہ ہونے دینا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی تخلیق میں مقصود قرار دیا اور اس کی بقاء افزائش نسل کے ذریعے ایک کو دوسرے کی جگہ پر بٹھانے سے یقینی بنانا چاہا چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کے فرزند ہابیل نے کہ جسے قابیل نے قتل کیا اپنے بھائی (قابیل) سے کہا ''مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ'' (میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں کہ تجھے قتل کروں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے)۔ اس نے ان الفاظ سے اس مطلب کی طرف اشارہ کیا کہ کسی کو ناحق قتل کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو چیلنج کرنا ہے لہٰذا اس وجہ سے کہ طبع انسانی کسی بھی ظلم کے ارتکاب کے لئے ادنی و موہوم ترین سبب کا سہارا لیتی ہے جبکہ اس کا ایسا کرنا یعنی کسی انسان کو قتل کرنا درحقیقت نظام ربوبیت اور بنی نوع انسان کی غرض خلقت کو تباہ و برباد کرنا ہے چنانچہ بنی اسرائیل اسی عمل کے رسیا تھے جیسا کہ ان آیات سے پہلے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ وہ حسد، تکبر، نفسانی خواہشات کی پیروی اور حق سے ٹکر لینے جیسے گناہوں و مظالم کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے زیر نظر آیات مبارکہ میں انہیں اس نہایت وحشیانہ عمل کے مذموم آثار سے مطلع و باخبر کیا اور انہیں آگاہ کیا کہ اس کے نزدیک ایک شخص کو قتل کرنا سب کو قتل کرنے کے برابر ہے اور اس کے مقابل میں اس کے نزدیک ایک شخص کو زندہ کرنا تمام لوگوں کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔

اور یہ لکھ دینا کہ جو زیر نظر آیت میں مذکور ہے (کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیۡۤ اِسْرَآءِیْلَ) اگرچہ تکلیفی (شرعی لازمی) حکم پر مشتمل نہیں کہ جس کی بناء پر کہا جائے کہ ایک شخص کو قتل کرنے پر بنی نوع انسان کے تمام افراد کے قتل کی سزا اسے دی جائے گی لیکن

اس کے باوجود یہ لکھ دیا جانا اور سخت ترین حکم اس عمل کے نہایت سنگین ہونے کا واضح ثبوت دیتا ہے اور اس میں خداوند عالم کے غیض وغضب کی آگ کو شعلہ ور کرنے کا پہلو پایا جاتا ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو۔

بہر حال مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس جملہ یعنی ''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ '' کا معنی یہ ہے کہ چونکہ انسان کی طبع وجودی ایسی ہے کہ وہ اسے کسی بھی عام ومعمولی وجہ سے اس طرح کے عظیم ظلم کے ارتکاب کی راہ پر لا کھڑا کرتی ہے اور بنی اسرائیل ایسا ہی کرتے تھے لہٰذا ہم نے انہیں کسی شخص کو ناحق قتل کرنے کی حیثیت واثر سے آگاہ کر دیا ہے کہ شاید وہ اس طرح کی زیادتی سے باز آ جائیں کہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل ونشانیاں لے کر آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود زمین میں فساد پھیلانے اور زیادتی کرنے میں مصروف رہے۔

اور جہاں تک اس جملہ کا تعلق ہے کہ جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا'' (جس نے کسی شخص کو ناحق (کسی کے بدلے میں نہیں) قتل کیا یا زمین میں فساد پھیلایا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا) تو اس میں اللہ تعالیٰ نے ''کسی کو قتل کرنے کے بدلے میں قتل کرنے'' کو مستثنیٰ فرما دیا کیونکہ وہ قصاص کہلاتا ہے جس کی بابت یوں ارشاد ہوا: ''كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى '' (تم پر قتل میں قصاص واجب کیا گیا ہے) سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۸۔ اور اس قتل کو بھی مستثنیٰ کیا جو فساد فی الارض کے مجرم کے لئے مقرر ہے جس کی بابت یوں ارشاد ہوا: ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا '' اس آیت میں فساد فی الارض کے مرتکب کی سزا قتل ذکر کی گئی ہے۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایک شخص کو قتل کرنا تمام انسانوں کو قتل کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے (فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا) تو اس سلسلہ میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک فردِ بشر اپنی اس انسانی حیثیت وحقیقت کے ساتھ کہ جس سے اس کی زندگی وموت وابستہ ہے وہ اسی حقیقت سے عبارت ہے جو تمام افرادِ بشر میں یکساں پائی جاتی ہے اور اس میں بعض اور کُل کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ ایک شخص اور سب اشخاص برابر ہیں، لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی ایک انسان کا قتل پوری نوعِ انسانی کا قتل قرار پائے گا اور اس کے برعکس صورتحال بھی یہی ہے کہ کسی ایک انسان کو زندہ کرنا تمام انسانوں کو زندہ کرنا ہوگا، یہی وہ مطلب ہے جو زیر نظر آیہ مبارکہ سے سمجھا جاتا ہے اور آیت اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

دو اعتراض اور ان کے جوابات:

زیر نظر آیت پر دو طرح سے اعتراض کیا گیا ہے:

(۱) اس آیت سے اصل موضوع کی مطلوبہ غرض ہی فوت ہو جاتی ہے یعنی یہ آیت خود اپنی غرض ومقصد کو نقض کرتی

ہے اور وہ یوں کہ اس میں قتل کے گناہ و جرم کے بہت بڑا ہونے کا بیان مقصود ہے اور اس کے سنگین نتائج و آثار کا اظہار ملحوظ ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مقتولین کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی گناہ و جرم بھی اسی قدر زیادہ وسنگین ہوگا اور اس کے آثار بھی اسی طرح زیادہ سخت ہوں گے جبکہ اگر یوں کہا جائے کہ ایک شخص کو قتل کرنا تمام افرادِ انسان کو قتل کرنے کے برابر ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اگر ایک شخص کو قتل کیا جائے یا سو افراد یا ہزار افراد کو قتل کیا جائے سب یکساں ہوں گے اور ایک مقتول کے علاوہ دیگر افراد کا خون رائیگاں جائے گا کیونکہ ان کے قتل کی سزا قاتل کو نہ ملے گی۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ دس افراد کو قتل کرنا تمام افرادِ انسان کو قتل کرنے کے دس گنا جرم و گناہ کے برابر ہے اور تمام افراد بشر کو قتل کرنا تمام افراد کی تعداد کے مطابق قتل کا ارتکاب کرنے کے برابر ہے کیونکہ اس کی بازگشت سزا کی تعداد کے اضافہ ہونے کی طرف ہے، یہ بات اس لئے مذکورہ اعتراض کا جواب نہیں ہوسکتا کیونکہ اعتراض کے الفاظ میں اس مفروضہ کا ثبوت نہیں ملتا، اس کے علاوہ یہ کہ ''تمام افراد'' یا ''سب کے سب'' اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس مجموعہ کے برابر ہے جو ان اکائیوں سے تشکیل یافتہ ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی حد تک جاتا ہے لہٰذا اس معنی کے ساتھ جمیع یعنی ''تمام'' اور ''سب کے سب'' ایک بے معنی لفظ قرار پائے گا کیونکہ اس میں کوئی اکائی یعنی فردِ واحد موجود ہی نہیں کہ جس کی بناء پر اس کی زیادہ تعداد یا بار بار شمار کرنے سے ''تمام'' اور ''سب کے سب'' یعنی اکائیوں کے بغیر مجموعہ قابل تصور ہو،

البتہ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

O سورۂ انعام، آیت ۱۶۰

''مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا''

(جو شخص گناہ کا مرتکب ہو تو اسے اس جیسی سزا کے علاوہ کوئی سزا نہیں دی جائے گی)

(۲) اگر ایک شخص کے قتل کو تمام افراد بشر کا قتل قرار دینے سے یہ مراد ہو کہ اس نے ان تمام افراد کو قتل کیا جن میں سے ایک وہ خود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی مجموعہ کا ایک فرد اس مجموعہ کے برابر ہو جس میں وہ خود شامل ہے اور اس کے علاوہ دیگر افراد بھی اس میں شامل ہیں، یہ بات بدیہی طور پر محال و ناممکن ہے، اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ ایک شخص کو قتل کرنا اس کے اپنے سوا دیگر تمام افراد کے قتل کرنے کے برابر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کسی ایک شخص کو قتل کرے گویا اس نے اس کے علاوہ دیگر افراد کو بھی قتل کیا اس طرح کا مطلب و معنی نہایت بے بنیاد و فضول ہے اور اس غرض کو بھی سرے سے ختم کر دیتا ہے جو آیت میں مقصود ہے یعنی اس ظلم کی شدت و سنگینی! اس کے علاوہ آیت کے الفاظ ''فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا'' کسی استثناء کے بغیر مذکورہ احتمال کی نفی کرتے ہیں۔ اور اس میں اعتراض کے جواب میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ آیت میں جس برابری کا ذکر ہوا ہے (فَكَاَنَّمَا) یعنی ایک شخص کو قتل کرنا تمام انسانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اس سے مراد عقاب و سزا کے حوالہ

سے ہے یا عذاب کے زیادہ ہونے کے تناظر میں ہے، اس جواب کا نادرست ہونا واضح ہے،

اصل جوابات: مذکورہ بالا دو اعتراضات کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جملہ ''مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًا۔۔۔فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا'' دراصل تمام افرادِ بشر کے ایک ہی انسانی حقیقت کے حامل ہونے کے اشاراتی بیان کا حامل ہے اور کنایۃً اس حقیقت واحدہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں سے ایک شخص اور سب کے سب یکساں ہیں، لہٰذا جو شخص ان میں سے کسی ایک انسان کو قتل کرے گو یا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا یعنی انسانیت کو قتل کیا، اس مطلب کو اس مثال کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر پانی کو متعدد برتنوں میں تقسیم کر دیا جائے تو جو شخص ان میں سے کسی ایک برتن سے پیئے گو یا اس نے پانی پیا اور کہا جائے گا کہ اس نے پانی پیا ہے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اس برتن کا پانی پیا کیونکہ اس کا مقصد پانی پینا ہے اور دیگر برتنوں میں جو پانی موجود ہے وہ ''پانی'' ہی ہے کہ جس کی حقیقت تمام برتنوں میں یکساں ہے، لہٰذا جو شخص ایک برتن کا پانی پیئے گو یا اس نے تمام برتنوں میں موجود پانی ہی کو پیا ہے، بنابرایں جملہ ''مَنۡ قَتَلَ۔۔۔'' تشبیہ کی صورت میں کنایہ ہے لہٰذا اس پر مذکورہ دو اعتراضوں میں سے کوئی بھی درست نہیں بلکہ اس بیان و وضاحت کے بعد وہ خود بخود غلط قرار پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں اعتراضوں کی بنیاد آیت میں مذکور تشبیہ بسیط ہونا ہے کہ جس میں مشبہ کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے وجہ الشبہ میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ اگر اس میں ایک اور سب برابر ہوں تو اصل معنی ہی خراب ہو جائے گا اور اعتراض کی گنجائش پیدا ہوگی اور وہ اس طرح سے ہو جائے گا کہ جیسے یوں کہا جائے کہ فلاں قوم کا ایک شخص ایک شیر کی مانند ہے اور ان میں سے ایک شخص طاقت و شجاعت میں سب کے برابر ہے۔

اور جہاں تک زیر نظر جملہ کے بعد والے جملہ کا تعلق ہے کہ جس میں یوں ارشاد ہوا ''وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا'' (اور جس نے کسی ایک شخص کو زندہ کیا گو یا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا) تو اس کی بابت وہی مطالب ہیں جو سابقہ جملہ کی بابت ذکر ہو چکے ہیں، اور یہاں ''اَحۡيَا'' یعنی زندہ کرنے سے مراد اس کا وہی معنی ہے جو عقلاء کے ہاں کے معروف ہے جیسے کسی غرق ہونے والے کو باہر نکال کر ڈوبنے سے بچانا اور کسی قیدی کو رہائی دلانا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں حق کی طرف ہدایت کو احیاء یعنی زندہ کرنے سے تعبیر کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ انعام، آیت ۱۲۲

''اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ''

(یا وہ شخص جو مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص کسی کو راہِ ایمان کی رہنمائی کرے گو یا اس نے اسے زندہ کیا۔

اور جملہ ''وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ'' کا عطف آیت کے ابتدائی جملہ (مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا) پر ہے، بنابرایں اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ آ چکے ہیں جو انہیں کسی کو قتل کرنے سے باز رہنے کی تاکید کرتے رہے اور ہر اس چیز سے منع کرتے رہے جو کسی بھی حوالہ سے زمین میں فساد کا باعث ہو۔

اور جملہ ''ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ'' جاری سلسلہ کلام کا تتمہ اور اسے مکمل کرنے والا ہے اور جب اسے سابقہ جملوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس بیان میں اصل غرض یہ ہے کہ یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ لوگ قوم بنی اسرائیل، فسادی، اپنے غرور و تکبر پر ڈھٹائی کرنے والے اور سرکشی کا بار بار ارتکاب کرنے والے ہیں جبکہ ہم نے انہیں قتل کے سنگین ترین جرم ہونے کے بارے میں واضح طور پر آگاہ کر دیا ہے اور ان میں ان کے علاوہ دیگر قوموں میں ہمارے رسول واضح دلائل و معجزات لے کر آ چکے ہیں اور انہوں نے ان لوگوں کو ان جرائم و گناہوں کے بارے میں پوری طرح آگاہ کر دیا اور ان کے خطرناک نتائج سے باخبر کر دیا ہے مگر وہ اس کے باوجود سرکشی و ظلم اور زیادتی و تکبر سے باز نہیں آئے اور جس طرح پہلے زیادتیاں کر کے زمین میں فساد پھیلاتے رہے اب بھی اسی طرح زیادتیوں کا مسلسل ارتکاب کر رہے ہیں۔

آیت میں لفظ ''مسرفون'' ذکر ہوا ہے، اسراف کا معنی اعتدال کی حد سے باہر ہونا اور ہر کام میں کہ جسے انسان انجام دے حد سے تجاوز کرنا ہے اگرچہ عام طور پر اسے انفاق کے موارد میں حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد وا:

○ سورۂ فرقان، آیت ۶۷

''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا''

(اور وہ لوگ کہ جو انفاق کرتے ہیں کہ نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی کمی کرتے ہیں بلکہ اس کا درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں جو مضبوط و درست راستہ ہے)

روایات پر ایک نظر!

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی قدر:

تفسیر العیاشی میں ہشام بن سالم کے حوالہ سے منقول ہے کہ حبیب سجستانی نے بیان کیا کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جب حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی مورد قبول واقع ہوئی جبکہ دوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔ امامؑ نے ان دونوں کے نام لے کر فرمایا کہ ہابیل کی قربانی قبول ہوئی مگر قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی اس سے قابیل کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور اس نے ہابیل سے دشمنی مول لے لی چنانچہ مسلسل اس کی تاک میں رہنے لگا اور اس کی تنہائی کی تلاش میں لگ گیا تا کہ اس کا کام تمام کرے، بالآخر ایک دن اس نے اسے تنہا پایا کہ وہ اپنے والد حضرت آدمؑ کی آنکھوں سے اوجھل تھا لہٰذا موقع پا کر اس نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر ڈالا، ان کے رونما ہونے والے واقعہ کا کچھ حصہ یعنی قتل کی واردات سے پہلے ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۳۰۹)

یہ روایت اس واقعہ کی بابت ذکر کی جانے والی روایات میں سے بہترین روایت ہے اور یہ نہایت طویل و مفصل روایت ہے جس میں امام علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ھبۃ اللہ (حضرت شیث) نامی ایک فرزند عطا فرمایا کہ جسے حضرت آدمؑ نے اپنا وصی مقرر فرمایا اور اسی سے انبیاءؑ کے درمیان وصی قرار دینے کا سلسلہ چلا، اس روایت کو ہم عنقریب اس کے موزوں مقام میں ذکر کریں گے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو بے خبری کی حالت میں قتل کیا کہ وہ سنبھل نہ سکے اور نہ ہی اپنا بچاؤ کر سکے، چنانچہ اس سلسلہ میں ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں اور واقعہ کا جائزہ لینے سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔

اس مقام پر یہ مطلب قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ روایات میں حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے نام ہابیل اور قابیل ذکر ہوئے ہیں لیکن موجودہ تورات میں ان کے نام ہابیل اور قایین ذکر کئے گئے ہیں جو کہ اس لئے قابل قبول نہیں قرار دیئے جا سکتے کہ موجودہ تورات کا سلسلہ سند ایک مجہول الحال شخص تک پہنچتا ہے جبکہ اس کے علاوہ بھی اس میں جو تحریف ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

امام زین العابدینؑ کا تفصیلی بیان:

تفسیر قمی میں مؤلف نے لکھا ہے کہ مجھے میرے والد حسن بن محبوب نے بیان کیا کہ ہشام بن سالم نے ابوحمزہ ثمالی کے حوالہ سے ثویر بن ابی فاختہ کی روایت ذکر کی جس میں انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام علی بن الحسین زین العابدینؑ سے سنا کہ آپؑ قریش کے کچھ لوگوں سے فرما رہے تھے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں کہ جن میں سے ایک نے اپنا پالتو صحتمند پُرگوشت مینڈھا دیا یعنی ہابیل، اس کی قربانی قبول ہوگئی جبکہ دوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی اس وجہ سے قابیل ہابیل پر غضب ناک ہوگیا اور اس نے ہابیل سے کہا: ''واللہ لأقتلنك'' خدا کی قسم میں تجھے قتل کردوں گا، ہابیل نے اس سے کہا ''اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ'' (یقیناً اللہ تقویٰ والوں سے قبول کرتا ہے، اگر تو نے میری طرف اپنے ہاتھ بڑھائے کہ مجھے قتل کرے میں اپنے ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں، میں اللہ کا خوف دل میں رکھتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ اپنے سر لے کہ پھر دوزخیوں میں شامل ہوجا اور یہی ہے ظالموں کی سزا!)

بہرحال قابیل کے دل میں اپنے بھائی کو قتل کرنے کی تمنا نے اسے رام کرلیا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کس طرح اسے قتل کرے اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس جرم کا ارتکاب کیونکر کرے، چنانچہ ابلیس آیا اور اس نے اسے سکھایا کہ اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر نیچے والے پتھر سے اسے کچل دو، قابیل نے اسی طرح عمل کیا اور اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس کی لاش کو چھپائے، اسی دوران دو کوے وہاں آگئے اور وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوگئے یہاں تک کہ ان کی لڑائی اس قدر شدید ہوگئی کہ ایک نے دوسرے کو قتل کردیا اور پھر اپنے پنجوں سے زمین کو کھود کر اس میں مقتول کوے کی لاش دفن کردی، اس منظر کو دیکھ کر قابیل کہنے لگا ''يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ'' ہائے، کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ ناتواں ہوں کہ اپنے بھائی کی لاش دفن کرسکتا، چنانچہ وہ پشیمان و نادم ہوگیا، پھر اس نے ایک گڑھا کھودا اور اپنے مقتول بھائی کو اس میں دفن کردیا اور اس کا ایسا کرنا بعد میں مُردوں کو دفن کرنے کا نمونہ بن گیا۔

اس کے بعد قابیل اپنے والد حضرت آدمؑ کے پاس آیا تو حضرت آدمؑ نے اس کے ساتھ ہابیل کو نہ دیکھ کر اس سے پوچھا: میرے بیٹے کو کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟ قابیل نے گستاخانہ لہجہ میں جواب دیا: کیا تو نے مجھے اس کا محافظ و نگران بنا کر بھیجا تھا؟ حضرت آدمؑ نے اس سے کہا: میرے ساتھ قربانی کی جگہ پر چلو، وہ دونوں چل پڑے مگر حضرت آدمؑ کے دل میں کھٹکا سا

پیدا ہوا اور ہابیل کے کئے کی بابت انہیں تشویش سی لاحق ہونے لگی جب قربانی کی جگہ پر پہنچے تو سارا ماجرا کھل گیا اور حضرت آدمؑ قتل کی واردات سے آگاہ ہو گئے، حضرت آدمؑ نے اس زمین پر لعنت کی جس نے ہابیل کا ناحق خون قبول کیا اور حضرت آدمؑ نے حکم دیا کہ قابیل پر لعنت کی جائے، چنانچہ آسمان سے قابیل کے لئے ندا آئی کہ تو اپنے بھائی کو قتل کرنے کی وجہ سے ملعون قرار پایا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد زمین کوئی خون نہیں پیتی، حضرت آدمؑ وہاں سے واپس چلے گئے اور چالیس شب و روز ہابیل کے غم میں روتے رہے جب ان کا غم واندوہ شدید تر ہوا تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں اپنا دکھ پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ انہیں ایک بیٹا عطا کرنے والا ہے جو ہابیل کا قائم مقام ہوگا، چنانچہ حضرت حوّاؑ نے ایک پاک و برکت والا فرزند جنم دیا، جب ساتواں دن آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو وحی کی ''یا آدم ان ھٰذا الغلام ھبة منّی لك فسمه ھبة الله'' اے آدم! یہ بچہ میری طرف سے تجھے عطیہ و بخشش ہے لہٰذا اس کا نام ھبۃ اللہ رکھو، حضرت آدمؑ نے اللہ کے فرمان پر اس کا نام ''ھبۃ اللہ'' رکھ دیا۔ (تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۶۶)

یہ روایت حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ اور اس سے مربوط مطالب کی بابت ذکر کی جانے والی روایات میں سے معتدل ترین روایت ہے لیکن اس کے باوجود اس کے متن میں بعض مطالب بظاہر ایک دوسرے سے مطابقت سے خالی نظر آتے ہیں کیونکہ اس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کی دھمکی دی پھر اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح اسے قتل کرے؟ تو یہ دو باتیں آپس میں مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ یہ کس طرح قابل تصور ہے کہ ایک شخص اپنے دشمن کو قتل کی دھمکی دے اور اسے پتہ نہ ہو کہ کس طرح اسے قتل کرے، البتہ ممکن ہے کہ وہ اس حوالہ سے متحیر ہوا ہو کہ قتل کرنے میں کونسا طریقہ اختیار کرے اور کس آلہ سے قتل کرے کہ جس کی بابت ابلیس۔ لعنۃ اللہ علیہ۔ نے اسے سمجھایا کہ اس کے سر پر پتھر مار کر اسے موت کے گھاٹ اُتارے، اس سلسلہ میں دیگر متعدد روایات موجود ہیں جو شیعہ و سنی دونوں کے اسناد سے ذکر کی گئی ہیں اور وہ اس روایت سے ملتی جلتی اور مضمون و مطالب کے حوالہ سے اس سے قریب تر ہیں۔

یاد رہے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ کی بابت نہایت کثرت کے ساتھ روایات ذکر کی گئی ہیں کہ جو مختلف اور عجیب و غریب مطالب پر مشتمل ہیں مثلاً:

- بعض روایات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہابیل کے مینڈھے کو چالیس سال تک بہشت میں رکھ کر اس کی پرورش کا اہتمام کیا پھر اسے اسماعیل کی جگہ قربان کرنے کے لئے ابراہیم کے پاس بھیجا انہوں نے اسے ذبح کیا۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ ہابیل نے خود ہی اپنے آپ کو قابیل کے قبضہ میں دے دیا تا کہ وہ اسے قتل کر دے اور خود اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے قابیل کے ایک پاؤں کو اس کی

ران کے ساتھ قیامت تک کے لئے باندھ دیا اور اس کا منہ داھنی طرف کر دیا کہ وہ جس طرف بھی رخ کرے اسے تکلیف ہو یعنی اگر سردیوں کا موسم ہو تو سخت ترین برفانی ہوائیں اس پر حملہ آور ہوں اور اگر گرمیوں کا موسم ہو تو سخت ترین آتشیں ہوائیں اسے گھیرے میں لے لیں اور سات فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ رہیں اور اسے سخت ترین شکنجے میں جکڑے رکھیں کہ وہ یکے بعد دیگرے اسے نہایت تکلیف سے دوچار رکھیں۔

- بعض روایات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دریائی جزیرہ میں الٹے منہ لٹکا رکھا ہے اور وہ قیامت تک اسی حالت میں رہے گا اور سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ قابیل فرزند آدم اپنے دو سینگوں کے ساتھ عین الشمس میں لٹکا ہوا ہے اور سورج جس طرف رخ کرتا ہے وہ بھی اسی طرف مڑ جاتا ہے خواہ سخت سردیوں کا موسم ہو یا سخت گرمیوں کا موسم ہو، اور وہ قیامت تک اسی حالت میں سختی و عذاب میں مبتلا رہے گا اور جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں ڈال دے گا۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ آدمؑ کے جس بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا وہ قابیل تھا جس کی ولادت بہشت میں ہوئی۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ جب حضرت آدمؑ اپنے بیٹے ہابیل کے قتل سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے عربی زبان میں مرثیہ پڑھا۔
- بعض روایات میں مذکور ہے کہ ان کی شریعت میں یہ حکم ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے لئے اس پر حملہ کرے تو وہ (جسے قتل کرنے کے لئے اس پر حملہ ہوا ہے) اپنے آپ کو اس (قاتل) کے حوالہ کر دے اور اپنا دفاع نہ کرے اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائے۔

اس کے علاوہ متعدد روایات اس سلسلہ میں ذکر ہوئی ہیں اور یہ روایات اور ان جیسی دیگر روایات جن راویوں اور اسناد سے منقول ہیں وہ سب یا ان میں سے اکثر ضعیف ہیں، نہ تو عقل ان کو قرین صحت قرار دیتی ہے اور نہ ہی قرآن مجید سے ان کے صحیح و قابل قبول ہونے کا ثبوت ملتا ہے، ان میں سے بعض کا جعلی ہونا یقینی طور پر ثابت و واضح ہے اور بعض تحریف شدہ ہیں یا راویوں کی طرف سے نقل بالمعنی میں غلطیاں و غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غلط الزام:

تفسیر "درمنثور" میں سیوطی نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ اس نے کہا: عمر نے بیان کیا کہ حضرت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی نہیں کہ جب کوئی شخص اس پر حملہ کرنے کے لئے آئے کہ اسے قتل کرے تو وہ اسے وہی الفاظ کہے جو ہابیل نے قابیل سے کہے تھے کہ اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے کہ مجھے قتل کرے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں؟ اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ دو اور حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں میں سے اس جیسے بنو جوان میں سے بہتر تھا کہ وہ بہشت میں ہوگا جبکہ اس کا قاتل دوزخ کی آگ میں جلے گا (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۷۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ فتنہ انگیز روایات میں سے ایک ہے اور اس طرح کی روایات کثرت سے موجود ہیں اور ان میں سے اکثر روایات سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں ذکر کی ہیں مثلاً وہ روایت کہ جو بیہقی نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے پیش کی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنی تلواریں توڑ دو (یعنی فتنہ کے موقع پر)، اور اپنی زرہیں وکمانیں پارہ پارہ کر دو اور گھروں کی مخفی گاہوں میں بیٹھ جاؤ اور آدمؑ کے دو بیٹوں میں سے جو بہتر تھا اس جیسے بن جاؤ۔

اسی طرح کی ایک روایت سیوطی نے ابن جریر اور عبدالرزاق کی سند سے حسن کے حوالہ سے ذکر کی ہے جس میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمؑ کے دو بیٹوں نے بنی نوع بشر کے لئے ایک مثال پیش کر دی ہے لہٰذا ان دونوں میں سے جو خیر و بہتری پر تھا اسے اپنا لو (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۲۷۵)

اس کے علاوہ دیگر روایات بھی ذکر کی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ روایات ایسی ہیں کہ نہ تو عقل سے ان کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ ہی عقل کے احکام و فیصلوں کی تائید و تصدیق کرنے والی ان روایات سے ان کی صحت کا اشارہ ملتا ہے جن میں اپنے بچاؤ و دفاع اور حق کی نصرت و مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے:

○ سورۂ حجرات، آیت ۹

''وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ''

(اگر مؤمنوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ واقع ہو جائے تو ان کے درمیان صلح و اصلاح قائم کرو، اور اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر دھاوا بولے اور زیادتی کا مرتکب ہو تو اس زیادتی و ظلم کرنے والے گروہ سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم پر سر تسلیم خم کر دے)

اس کے علاوہ وہ تمام روایات اس واقعہ میں ہابیل کے اس بیان کی یوں تفسیر و تاویل کرتی ہیں جس میں ہابیل نے یوں کہا ''لَئِنۡۢ بَسَطْتَّ اِلَىَّ يَدَكَ لِتَقۡتُلَنِىۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيۡكَ لِاَقۡتُلَكَ'' (اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے کہ مجھے قتل کرے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں) کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہابیل نے اپنے آپ کو اپنے بھائی کے سپرد کر دیا کہ وہ اسے قتل کر دے اور اپنا دفاع و بچاؤ نہ کیا۔

ان مذکورہ تفسیر و تاویل کی عدم صحت بخوبی واضح اور قارئین کرام خود اس سے آگاہ ہیں۔

ان روایات کے بارے میں جو چیز سوء ظن کا باعث بنتی ہے وہ یہ کہ اس کے سلسلہ سند میں وہ افراد سرفہرست ہیں جو اس فتنہ میں شامل تھے جو خانہ علیؑ و فاطمہؑ میں برپا کیا گیا اور وہ ان جنگوں میں بھی شریک تھے جو امام علیؑ اور معاویہ کے درمیان واقع ہوئیں اور وہ خوارج اور طلحہ وزبیر کے گروہ میں شامل ہو گئے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان افراد کی بیان کردہ روایات کی ممکن حد تک تاویل کی جائے اور اگر قابل تاویل نہ ہوں تو انہیں چھوڑ دیا جائے اور ان پر ہرگز اعتماد نہ کیا جائے۔

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن عساکر نے حضرت علیؑ کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے ارشاد فرمایا حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دمشق میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام ''قاسیون'' ہے اس کے دامن میں آدمؑ کے بیٹے (قابیل) نے اپنے بھائی (ہابیل) کو قتل کیا۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۲۸۵)

بظاہر اس روایت میں کوئی قابل اعتراض مطلب مذکور نہیں سوائے اس کے کہ ابن عساکر نے اسے کعب الاحبار کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اس نے کہا جو خون قاسیون پہاڑ پر ہے وہ آدمؑ کے بیٹے کا خون ہے، اسی روایت کو دوسرے اسناد سے عمرو بن خبیر شعبانی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں کعب الاحبار کے ساتھ دیر المران پہاڑ پر تھا تو کعب الاحبار کی نظر پہاڑ کے دامن پر پڑی کہ جس میں خون آلود پانی بہہ رہا تھا اسے دیکھ کر کعب الاحبار نے کہا کہ اس جگہ آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا اور یہ اس کے خون کا اثر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عالمین کے لئے نشانی قرار دیا ہے۔

یہ دو روایتیں اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں کہ وہاں ایسا مستقل نشان باقی تھا جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ ہابیل مقتول کے خون کا نشان ہے۔ یہ بات حقیقت کی بجائے خرافات سے زیادہ شباہت رکھتی ہے کہ اس طرح کی بے بنیاد باتیں اس لئے گھڑی گئی ہیں تاکہ لوگ اس جگہ کی زیارت کو آئیں اور اس پہاڑ پر نذر و نیاز اور ہدیے دیں یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے کسی جگہ پاؤں کا نشان بنا کر اسے زیارتگاہ بنا دیا جاتا ہے یا پتھر پر ہاتھ یا انگلیوں کے نشانات بنائے جاتے ہیں یا جیسا کہ جدہ (دادی) یعنی حضرت حوا کی قبر کا نشان بنا کر اسے اس طرح شہرت دی گئی ہے کہ ہر خاص و عام کی زبان پر یہی بات آتی ہے کہ یہاں وہ مدفون ہیں اور اس طرح کے دیگر مقامات! تو یہ سب باتیں من گھڑت و بے بنیاد خود ساختہ ہیں ان کا نہ تو تاریخی حوالہ موجود ہے اور نہ ہی ان کی شرعی حیثیت ہے۔

قابیل کا مجرمانہ عمل:

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہ، ابن جریر اور ابن منذر نے ابن مسعود

کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا روئے زمین پر جو بھی ناحق خون بہایا جائے اور کسی کو ظلم کے ساتھ قتل کیا جائے اس کے گناہ میں حضرت آدمؑ کا بیٹا (قابیل) شریک قرار پائے گا کیونکہ اسی نے سب سے پہلے ناحق قتل کی بنیاد رکھی (''درمنثور'' ج ۲ ص ۲۷۶) اس روایت میں مذکور مطلب دیگر شیعہ وسنی اسناد سے بھی منقول ہے۔

امام محمد باقرؑ کی تفسیر:

کتاب کافی میں کلینیؒ نے اپنے اسناد سے حمران کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا میں نے امام محمد باقرؑ سے پوچھا کہ اس آیت مبارکہ کا معنی کیا ہے: ''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا'' (جو شخص کسی شخص کو ناحق قتل کرے یا زمین میں فساد پھیلائے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا)، اور یہ کیونکر صحیح ہے کہ اس نے ایک شخص کو قتل کیا مگر اسے تمام انسانوں کا قتل قرار دیا جائے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے دوزخ کے اس مقام پر رکھا جائے گا جہاں دوزخیوں کو سخت ترین عذاب کا سامنا ہوتا ہے اور وہ جگہ ایسی ہے کہ اگر وہ تمام انسانوں کو قتل کرتا تو اسے اسی جگہ پر عذاب کا سامنا ہوتا اور وہاں ہی اسے سخت عذاب کیا جاتا، حمران نے کہا: میں نے عرض کی کہ اگر وہ دوبارہ کسی اور شخص کو قتل کرے تو پھر؟

امامؑ نے فرمایا وہ عذاب دگنا ہو جائے گا (فروع کافی، جلد ۷ ص ۲۷۱) اس روایت کے مانند شیخ صدوقؒ نے کتاب معانی الاخبار (ص ۳۷۹) میں ایک روایت حمران کے حوالہ سے ذکر کی ہے۔

اس روایت میں حمران نے جو سوال کیا کہ اگر وہ دوبارہ کسی کو قتل کرے تو پھر؟ دراصل اسی اشکال کی طرف اشارہ ہے جس کی بابت پہلے وضاحت ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ اس سے ایک قتل کا کئی افراد کے قتل کے برابر ہونا لازم آتا ہے جو کہ درست نہیں، مگر امامؑ نے اس کے جواب میں واضح کر دیا کہ اس عذاب کو دگنا کر دیا جائے گا، اگر یہ کہا جائے کہ امامؑ کے جواب سے آیت میں ''برابر'' ہونے کی نفی ہوتی ہے جبکہ آیت میں واضح لفظوں میں مذکور ہے کہ جس نے کسی شخص کو ناحق قتل کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا (مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ) اور عذاب کے دگنا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص یا زیادہ یا سب کا قتل یکساں نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں کیونکہ برابری کا تعلق عذاب کی نوعیت سے ہے اور وہ یوں کہ ایک شخص یا دو افراد یا تمام افراد کے قاتل کی دوزخ میں ایک ہی جگہ معین ہے یعنی خواہ وہ ایک شخص کو قتل کرے یا دو یا سب کو، اس کا مقام دوزخ میں ایک ہی ہوگا، چنانچہ روایت میں اس مطلب کی طرف ان لفظوں میں اشارہ ہوا ہے ''لو قتل الناس جمیعاً کان انما دخل ذلك المكان'' (اگر وہ تمام انسانوں کو قتل کرے تب بھی اسی جگہ اس کا ٹھکانہ ہوگا)۔

اس مطلب کی تصدیقی گواہی اس روایت میں موجود ہے جسے تفسیر العیاشی میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حمران کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر ذکر کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: دوزخ میں ایک نہایت سخت عذاب کی جگہ ہے کہ وہاں دوزخیوں کو شدید ترین عذاب سے دوچار کیا جاتا ہے لہٰذا ہر قاتل کو اسی جگہ رکھا جاتا ہے، حمران نے کہا میں نے پوچھا: اور اگر وہ دو افراد کو قتل کرے تو پھر؟ امامؑ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دوزخ میں اس سے زیادہ سخت عذاب کی کوئی جگہ ہے ہی نہیں، لہٰذا قاتل کا عذاب اس کے قتل کی مقدار کے مطابق زیادہ کیا جائے گا یعنی اگر اس نے دو افراد کو قتل کیا تو دگنا عذاب ہوگا (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۳۱۳)

امام علیہ السلام نے اپنے فرمان میں نفی و اثبات کو جس طرح اکٹھا کر کے موضوع کو واضح کیا وہ اسی مطلب کا بیان ہے کہ جو روایت کی بابت توجیہ و تاویل کے طور پر ہم ذکر کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ یکساں و برابر ہونا عذاب کی نوعیت و سختیت کے حوالہ سے ہے چنانچہ ''بمنزلہ'' اور اس جیسا ہونے میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے البتہ نوعیت اور عذاب کی کیفیت میں جو فرق ممکن ہے وہ قاتل کے اپنے حوالہ سے ہے۔

ہمارے ذکر کردہ مطالب کی تصدیقی گواہی اور فی الجملہ تائید اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں مذکور اس روایت سے ہوتی ہے جو حنان بن سدیر سے منقول ہے جس میں آیہ مبارکہ ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا'' کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان مذکور ہے کہ دوزخ میں ایک گڑھا ہے کہ جو شخص تمام انسانوں کو قتل کرے اسے وہاں ڈالا جائے گا اور اگر ایک شخص کو قتل کرے تب بھی اسے اسی جگہ ڈالا جائے گا (بحوالہ مذکورہ بالا) اس روایت میں آیہ مبارکہ کے اصل الفاظ کی بجائے نقل بالمعنی کی بنیاد پر الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔

اِحیائے نفس کی تفسیر:

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے فضیل بن یسار کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کا مطلب پوچھا ''وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا'' (جس نے کسی شخص کو زندہ کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا)، امامؑ نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی شخص کو جلنے یا دریا میں غرق ہونے سے بچایا گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔ فضیل نے کہا: میں نے پوچھا: جو شخص کسی کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کی راہ پر لائے تو کیا وہ بھی ایسا ہی ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: یہ اس کی سب سے بڑی تاویل و تفسیر ہے، (اصول کافی، جلد ۲ ص ۲۱۱)

اس روایت کو شیخ نے اپنی کتاب ''الامالی'' میں اور برقی نے اپنی کتاب ''المحاسن'' میں فضیل کے حوالہ سے ذکر کیا

ہے کہ اس میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان مذکور ہے، یہ روایت سماعہ اور حمران کے حوالہ سے بھی مذکورہ بالا کتابوں میں ذکر کی گئی ہے کہ جس میں امام جعفر صادقؑ کا مذکورہ فرمان منقول ہے۔

اس روایت میں امامؑ کا یہ فرمان کہ کسی کو گمراہی سے ہدایت کی راہ پر لانا آیت کی سب سے بڑی تاویل ہے تو اس سے مراد اس کی عمدہ ترین تفسیر ہے۔ لفظ ''تاویل'' صدرِ اسلام میں اکثر موارد میں تفسیر کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

اسی مطلب کی تصدیقی گواہی تفسیر العیاشی میں مذکور محمد بن مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کا مطلب پوچھا ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا'' (جس شخص نے ایک شخص کو ناحق قتل کیا یا زمین میں فساد پھیلایا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا)، امامؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کا ٹھکانہ دوزخ میں اس جگہ ہے کہ اگر وہ تمام انسانوں کو قتل کرتا تب بھی اس کا ٹھکانہ وہی ہوتا اور جملہ ''وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا'' کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کر سکتا تھا مگر اس نے قتل نہ کیا یا کسی کو غرق و پانی میں ڈوبنے سے بچائے یا آگ میں جلنے سے نجات دلائے اور ان سب سے بڑا عمل وہ ہے کہ کسی کو گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک لے آئے (بحوالہ مذکورہ بالا)

اس میں امامؑ نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کر سکتا تھا مگر اسے قتل نہ کیا، اس کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کا قتل کیا جانا ثابت و مسلم ہو جیسا کہ قصاص میں ہوتا ہے اور مقتول کے وارث اسے قتل نہ کریں یعنی یا معاف کر دیں یا دیت پر رضامند ہو جائیں، تو اس صورت میں اسے زندہ کرنا یا زندگی دینا یعنی احیاء کہا جائے گا۔

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں ابوبصیر سے ایک روایت منقول ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ مبارکہ ''وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا'' کا مطلب پوچھا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے کسی شخص کو کفر سے نکال کر ایمان کی راہ دکھائی گویا اس نے اسے زندہ کیا اور جس نے ایسا کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ کیا (تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۳۱۳)

اسی مطلب کو اہل سنت کے اسناد سے ذکر کی جانے والی متعدد روایات میں بیان کیا گیا ہے۔

زیادتی کے مرتکب لوگ!

تفسیر ''مجمع البیان'' میں منقول ہے کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ''مسرفون'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے حرام کردہ کو حلال قرار دیتے ہیں اور خونریزیاں کرتے ہیں (تفسیر ''مجمع البیان'' جلد ۳ ص ۱۸۷)

ایک علمی بحث اور تطبیقی حوالہ:

تورات کے سفر تکوین کے اصحاح چہارم میں یوں مرقوم ہے:

(۱) آدم نے حوا کو اپنی زوجیت کے طور پر پہچانا، وہ حاملہ ہوئیں اور ''قابین'' کو جنم دیا اور یہ الفاظ زبان پر لائے مجھے پروردگار کی طرف سے بیٹا عنایت ہوا ہے۔

(۲) وہ دوبارہ حاملہ ہوئیں اور ہابیل کو جنم دیا، ہابیل چرواہا بنا اور قابین کسان بنا۔

(۳) چند روز گزرے تھے کہ قابین نے اپنی زمین سے کچھ میوے پروردگار کے لئے قربانی کے طور پر پیش کئے۔

(۴) اور ہابیل نے بھی اپنے جانوروں، بھیڑ بکریوں میں سے تر و تازہ اور موٹے و صحتمند جانور قربانی کے لئے پیش کئے، پروردگار نے ہابیل اور اس کی قربانی پر نظر عنایت کی اور اسے مورد قبول قرار دیا۔

(۵) مگر پروردگار نے قابیل اور اس کی قربانی پر نظر نہ کی جس پر قابین سخت رنجیدہ خاطر ہوا اور اس کا چہرہ اُتر گیا۔

(۶) پروردگار نے قابین سے کہا تو کیوں رنجیدہ و غصہ میں آیا ہے اور تیرا چہرہ کیوں اُتر گیا ہے۔

(۷) اگر تو نے نیک کام کیا ہوتا تو کیا اوپر نہ آتا تاہم تک نہ پہنچتا؟ اور اگر تو نیکی نہ کرے تو گناہ کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا اور وہی تیرا شیدا ہوگا اور اب تو ایسا کرنے کے بعد اس پر تلملا رہا ہے۔

(۸) اور قابین نے اپنے بھائی ہابیل کو اپنی باتوں میں لگالیا اور وہ دونوں آپس میں محو گفتگو ہو گئے کہ اس اثناء میں قابین نے اپنے بھائی ہابیل پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔

(۹) پروردگار نے قابین سے کہا: تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں کیا میں اپنے بھائی کا نگہبان و محافظ ہوں؟

(۱۰) پروردگار نے کہا: تو نے یہ کیا کیا کہ تیرے بھائی کے خون کی آواز زمین سے بلند ہو رہی ہے۔

(۱۱) پس اب تو ملعون ہے تو اسی زمین سے ہے کہ جس نے اپنا منہ کھولا ہے تا کہ تیرے بھائی کا وہ خون نگل لے کہ جسے تو نے اپنے ہاتھ سے اس پر بہایا ہے۔

(۱۲) تو نے کب زمین میں ایسا کام کیا کہ جس کی پاداش میں زمین تجھے اپنی محصولات نہیں دیتی اور تو اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہے۔

(۱۳) قابین نے پروردگار سے کہا کہ میرا گناہ اس قدر بڑا ہے کہ کوئی اسے برداشت نہیں کرسکتا کوئی اس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔

(۱۴) تو نے آج مجھے زمین سے اور خود اپنے قرب سے دھتکار دیا ہے تا کہ میں چھپ چھپ کر اور سرگرداں و بے سرو سامان ہو کر زمین میں مارا مارا پھرتا رہوں کہ جو بھی مجھے پائے وہ مجھے قتل کر دے۔

(۱۵) پروردگار نے اس سے کہا: اسی وجہ سے جو شخص قابیل کو قتل کرے اس سے سات گنا انتقام لیا جائے گا اور پروردگار نے قابیل کے لئے ایک نشانی قرار دی تا کہ جو اسے پائے وہ اسے قتل نہ کرے۔

(۱۶) بہر حال قابیل اپنے رب کی بارگاہ سے نکلا اور عدن کے مشرقی علاقہ نود میں سکونت اختیار کر لی۔

یہ تورات کی سولہ آیات ہم نے اس کے عربی نسخہ سے یہاں لکھی ہیں کہ جو ۱۹۳۵ء میں کیمبرج میں شائع ہوا۔

اب دیکھیں کہ اس واقعہ کے بارے میں قرآن مجید میں کیا مذکور ہے:

○ سورۂ مائدہ، آیت ۲۷ تا ۳۱

''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾''

(اور ان کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ صحیح طور پر بیان کرو کہ جب ان دونوں نے قربانی پیش کی مگر ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی اس (دوسرے) نے اس (پہلے) سے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا، میں نے کہا یقیناً اللہ تقویٰ والوں سے ہی قبول کرتا ہے (۲۷) اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے کہ مجھے قتل کرے مگر میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے (۲۸)، میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ اپنے سر لے کہ تو دوزخیوں میں سے ہو جا، اور یہی انجام و سزا ہے ظلم کرنے والوں کی! (۲۹)، مگر اسے اس کے نفس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کی ترغیب دلائی تو اس نے اسے قتل کر دیا جس کے نتیجہ میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو گیا (۳۰) پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے سمجھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو دفن کرے، اس نے کہا: ہائے، کیا میں اس سے بھی زیادہ ناتواں ہوں کہ اس کوے جیسا ہوتا تو اپنے بھائی کی لاش کو دفنا جانتا، تو وہ ندامت و پشیمانی اُٹھانے والوں میں سے ہو گیا (۳۱)۔

قارئین کرام! آپ خود غور کریں کہ یہ واقعہ تورات میں کس طرح ذکر ہوا ہے اور قرآن مجید میں کس طرح بیان ہوا

ہے پھر ان دونوں کے تناظر میں اصل واقعہ کے پہلوؤں کا جائزہ لیں تو آپ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی اور پھر خود ہی فیصلہ کریں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے!

تورات کے مطالعہ سے یہ بات سب سے پہلے واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس میں پروردگار کو زمینی موجودات میں سے شمار کر کے انسانی صورت کا حامل قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے اور ان پر اور ان کے لئے اسی طرح حکم جاری کرتا ہے جس طرح انہی میں سے کوئی شخص ان پر حکمرانی کرتا ہے اور ان کے ساتھ بات چیت اور میل جیل کرنے میں وہی طرزِ عمل اپناتا ہے جو ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ اختیار کرتا ہے پھر کبھی ان سے دور ہو جاتا ہے اور اتنا دور ہو جاتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں پاتا اور جب نزدیک ہوتا ہے تو اسی طرح اسے دیکھا جاتا ہے جس طرح عام لوگ ایک دوسرے کو نزدیک سے دیکھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ تورات میں مذکور مطالب سے پروردگار کے بارے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک عام انسان جیسا ہے جو زمین میں رہتا ہے اور ہر حوالہ سے عام انسان کی طرح ہے یعنی ایسا نہیں کہ جو وہ چاہے وہ پورا ہو اور اس کا حکم و فیصلہ نافذ العمل ہو، اس بناء پر تورات و انجیل کی تمام تعلیمات کی اصل و اساس یہی ہے اور وہ سب اسی پر مبنی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے بالاتر، منزہ تر اور پاک تر ہے۔ تورات میں آدمؑ کے بیٹوں کے واقعہ کا جو تذکرہ ہوا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس دور میں انسان اللہ تعالیٰ سے بالمشافہہ اور آمنے سامنے گفتگو کرتا تھا اور اس کے ساتھ میل جول رکھتا تھا اور جب قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کیا تو خدا نے اس سے اور اس جیسوں سے اپنے آپ کو مخفی و پوشیدہ کر لیا اور دیگر افراد پہلے کی طرح اللہ تعالیٰ سے گفتگو اور میل جول کرتے رہے حالانکہ ٹھوس دلائل سے یہ مطلب ثابت ہو چکا ہے کہ انسان ایک ہی نوع رکھتا ہے اور اس کے تمام افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی دنیاوی زندگی مادی امور پر استوار ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مادہ اور مادیات سے منزہ و ماوراء ہے اور امکان و ممکنات کی مادی آلودگی و نقص و حدوث (عدم سے وجود میں آنے) سے پاک ہے یہی وہ حقائق ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید واضح لفظوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظیم و لازوال اور کامل و بے نیاز ذات کا تعارف کرواتا ہے اور جہاں تک قرآن مجید میں مذکور اس واقعہ سے متعلق مطالب کا تعلق ہے تو ان تمام تفصیلات کی اصل و اساس اس واقعہ کے تذکرہ کے ذیل میں قتل کے حوالہ سے کوے کے بھیجے جانے کا ذکر بھی ہوا ہے جس سے اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ انسان تدریجی طور پر کمال کی منزلیں طے کرتا ہے اور اس کی زندگی کے کمالی مرحلے حس و فکر کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے حوالہ سے دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس میں مقتول کی زبانی ان عظیم گوہر ہائے حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جو انسان فطرت سلیمہ کے بلند پایہ معارف اور دین کے پاکیزہ اصول و معالم ہیں یعنی توحید، نبوت و قیامت! پھر تقویٰ اور ظلم کا تقابلی تذکرہ جو کہ تمام احکامِ خداوندی و دستورات شرعی میں

بنیادی عوامل ہیں، پھر عدلِ الٰہی کا حوالہ مذکور ہے کہ جو لوگوں کے اعمال کی قبولیت وعدم قبولیت کی بابت حقیقی معیار و اساس ہے اور اسی پر اخروی جزا وسزا کا نظام قائم ہے پھر قاتل کی ندامت وپیشمانی کا تذکرہ ہے کہ اس نے جس سنگین ترین جرم کا ارتکاب کیا اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت کے خسارہ سے دوچار ہوا، پھر اس سب کچھ کے بعد قرآن مجید نے قتل جیسے نہایت سنگین جرم کے آثار سے پردہ اُٹھایا کہ جو شخص کسی ایک فرد کو قتل کرے تو اس کا گناہ تمام افرادِ بشر کو قتل کرنے کے برابر ہے اور اس کے مقابل میں جو شخص کسی ایک فرد کو زندہ کرے گویا اس نے بنی نوع انسان کے تمام افراد کو زندہ کیا۔

آیات ۳۳ تا ۴۰

○ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾

ترجمہ

○ ''یقیناً ان لوگوں کی سزا کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے میں کوشاں رہتے ہیں، یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو مخالف سمت سے کاٹا جائے یا شہر بدر کیا جائے، یہ ان کی دنیاوی رسوائی ہے جبکہ آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب مقرر ہے''

(۳۳)

○ ''سوائے ان لوگوں کے، کہ جو اس سے پہلے توبہ کرلیں کہ تم ان پر قابو پالو، آگاہ رہو کہ اللہ معاف کردینے والا، نہایت رحم والا ہے''

(۳۴)

○ ''اے ایمان والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ''

(۳۵)

○ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اگر وہ زمین کی ہر چیز کے مالک بن جائیں اور اس کے ساتھ اسی کے مانند دیگر چیزوں کے بھی مالک ہوں اور وہ اپنی تمام مملوکہ چیزیں قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ دیں تب بھی ان سے قبول نہ ہوں گی، اور ان کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے''

(۳۶)

○ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٣٧﴾

○ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾

○ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٩﴾

○ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٠﴾

○ ''وہ دوزخ کی آگ سے باہر نکلنا چاہیں گے مگر وہ اس سے باہر نکل نہ سکیں گے، ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب مقرر ہے''

(۳۷)

○ ''اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھوں کو کاٹ دو، یہ ان کے کئے کی اللہ کی طرف سے مقررہ عبرتناک سزا ہے، اور اللہ غلبہ وطاقت والا، دانائی والا ہے''

(۳۸)

○ ''پس جو شخص اپنے ارتکاب جرم کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح نفس کرے تو یقیناً اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے''

(۳۹)

○ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی حکمرانی، وہ جسے چاہتا ہے عذاب وسزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''

(۴۰)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ ماقبل آیات سے ارتباط کی حامل ہیں، کیونکہ ان سے پہلی آیات میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جو قانون و حکم بنی اسرائیل کے لئے مقرر فرمایا اس کا تذکرہ ہے، اگرچہ وہ بنی اسرائیل ہی کے بارے میں جاری سلسلہ بیان کا تتمہ تھا اور ان ہی کی صورتحال کو ذکر کیا گیا تھا کہ جس میں نہ تو کسی حکم کی خلاف ورزی پر اس کی سزا کا تذکرہ تھا اور نہ ہی کوئی صریح دستور مذکور تھا لیکن ان کے مندرجات کے تناظر میں یہ مطلب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ زیر نظر آیات مبارکہ سے کہ جن میں زمین میں فساد پھیلانے والوں اور چوروں کی سزا ذکر ہوئی ہے ارتباط و مناسبت کی حامل ہیں۔

اللہ و رسولؐ سے جنگ کرنے والوں کی سزا:

○ ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا''

(یقیناً ان لوگوں کی سزا کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔۔۔)

اس آیت میں لفظ ''فَسَادًا'' جو کہ ادبی حوالہ سے مصدر ہے اسے حال کی جگہ قرار دیا گیا ہے، اور ''اللہ سے جنگ کرنا'' اگرچہ اپنے ظاہری لفظی و حقیقی معنی میں محال و ناممکن ہے لہٰذا اس سے اس مجازی معنی متعین طور پر مراد لینا ہی ناگزیر ہے کہ جس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس میں ہر شرعی حکم کی خلاف ورزی و نافرمانی اور ظلم و زیادتی شامل ہوگی یعنی جو شخص اللہ کے فرامین کی معصیت کرے اور اس کے احکام و دستورات کی خلاف ورزی کرے وہ ایسا ہے جیسے اس نے اللہ سے جنگ کی، لیکن چونکہ آیت میں اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شامل کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ جنگ کرنا بھی اللہ سے جنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے بعض ان احکام و امور کی مخالفت بھی مراد ہے جن کا تعلق حضرت پیغمبر اسلامؐ سے ہے، بنابرایں یہ معنی متعین و یقینی ہوگا کہ جنگ کرنے سے مراد ہر وہ کام ہے جس سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدائی ذمہ داریوں اور آپؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے احکام کی نافرمانی کے نتیجہ میں حضورؐ سے جنگ کرنا کہلائے جیسے کفار کا آنحضرتؐ سے جنگ کرنا اور راہزنوں کا امن عامہ کو خراب کرنا ہو، کہ جسے حضورؐ نے اپنی

خدائی ذمہ داری وولایت کے ساتھ روئے زمین پر قائم فرمایا، چنانچہ اللہ ورسول سے محاربہ کے بعد جملہ "وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا" اسی معنی کے مراد ہونے کو مشخص و متعین کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلانے کا مطلب امن عامہ میں خلل اندازی اور راہزنی ہے مسلمانوں سے ہر طرح کا محاربہ مقصود نہیں، اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ان کافروں کے ساتھ محارب جیسا سلوک نہیں کیا کہ جو آنحضرتؐ اور مسلمانوں سے جنگ کرتے تھے جبکہ ان پر غلبہ و کامیابی پا چکے تھے اور انہیں ان چار سزاؤں میں سے جو محاربین کے لئے قرآن مجید میں معین و مذکور ہیں یعنی قتل کرنا، سولی پر لٹکانا، مثلہ کرنا اور شہر بدر کرنا، یعنی جب آنحضرتؐ نے ان پر قابو پالیا اور ان کے مقابلے میں کامیابی حاصل کر لی تو ان کو محارب قرار دے کر مذکورہ چار سزاؤں میں سے کوئی بھی ان پر جاری نہیں کی۔

اس کے ساتھ ساتھ آیت ۳۴ میں توبہ کرنے والوں کا استثنائی ذکر اس مطلب کی طرف اشاراتی حوالہ ہے کہ محاربہ سے مراد فساد پھیلانے کا مذکورہ بالا معنی ہے کیونکہ اس استثناء میں جس توبہ کرنے کا ذکر ہوا ہے وہ شرک وغیرہ سے توبہ کرنا نہیں بلکہ محاربہ سے توبہ کرنا ہے۔

بنابرایں محاربہ اور اِفساد سے بظاہر یہ مراد ہے کہ امن عامہ میں خلل اندازی کی جائے اور واضح کہ امن عامہ میں رخنہ ڈالنا، معاشرے میں خوف پھیلانے اور امن کی جگہ خوف کو دلوں پر مسلط کرنا کا نام ہے اور ایسا ہونا طبعی طور پر اس طرح ہوتا ہے کہ اسلحہ کے ذریعے لوگوں کو قتل کرنے کی دھمکیاں دینے سے عمومی طور پر خوف و ہراس پھیلایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں فساد فی الارض کی تفسیر تلوار کھینچنے یعنی اسلحہ کی نمائش کرنے وغیرہ سے کی گئی ہے اس کی مزید وضاحت "روایات پر ایک نظر" میں عنقریب ہوگی۔ انشاء اللہ۔

قتل یا پھانسی؟

"اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا"

(انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے)

آیت میں تین الفاظ مذکور ہیں "يُقَتَّلُوْٓا" (انہیں قتل کیا جائے)، "يُصَلَّبُوْٓا" (پھانسی دی جائے)، "تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ" (ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں)، یہ تینوں الفاظ باب تفعیل سے ہیں یعنی "تقتیل"، قتل سے "تصلیب"، صلب سے اور "تقطیع"، قطع سے ہے، اس سے ان کے معانی میں شدت یا اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

حرف "اَوْ" عام طور پر اردو زبان میں "یا" چند چیزوں میں سے کسی ایک کے مقصود ہونے پر دلالت کرتا ہے، یہاں

محارب کی چار سزاؤں میں سے ایک کے اختیار کرنے کو حرف ''اَوْ'' کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تا کہ یہ بات واضح ہو کہ یہ چاروں مقصود نہیں بلکہ ان میں سے کوئی ایک قرار دی جائے گی، اب یہ بات واضح نہیں کہ ان چاروں سزاؤں کو ترتیب وار ملحوظ قرار دیا جائے گا یا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا روا ہے؟ یعنی جس ترتیب کے ساتھ آیت میں ان کو ذکر کیا گیا ہے اسی بناء پر ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے گا یا کوئی ایک بھی اختیار کی جائے صحیح ہے مثلاً آیت میں اس ترتیب سے سزاؤں کو ذکر کیا گیا ہے: قتل، پھانسی، ہاتھ پاؤں کاٹنا، شہر بدری، کیا اسی ترتیب سے ممکنہ سزا دینے کو اختیار کیا جائے یا کوئی بھی اختیار کی جائے صحیح ہے؟ یہ بات آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم نہیں ہوتی: بلکہ اسے آیت سے باہر قرائن سے سمجھا جا سکتا ہے خواہ وہ قرائن حالیہ ہوں یا مقالیہ ہوں یعنی لفظوں میں ان کے اشارے ملتے ہوں یا غیر لفظی حوالوں سے ثابت ہوتے ہوں، بہر حال آیت اس حوالہ سے مجمل ہے لہٰذا اس کی وضاحت بذریعہ سنت ہوتی ہے اور عنقریب اس سلسلہ میں ان روایات کو ذکر کیا جائے گا جن میں حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہے کہ ان سزاؤں کی ترتیب فساد پھیلائے جانے کی کیفیت ونوعیت کے لحاظ سے ہے مثلاً کوئی شخص تلوار اٹھائے اور کسی کو قتل کر دے اور مال بھی لوٹ لے، یا کوئی شخص صرف قتل کا مرتکب ہو یا صرف مال لوٹنے کے جرم کا ارتکاب کرے یا صرف اسلحہ کی نمائش کرے لیکن نہ تو کسی کو قتل کرے اور نہ ہی کسی کا مال لوٹے، تو ان میں فساد و جرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا کا تعین ہوگا، اس سلسلہ میں ''روایات پر ایک نظر'' میں مربوطہ مطالب ذکر ہوں گے انشاءاللہ۔

اور آیت میں مذکور جملہ ''اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ'' میں ''مِّنْ خِلَافٍ'' (یعنی بالعکس صورت میں) کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ اور پاؤں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے مقابل والے عضو کے برعکس کاٹا جائے مثلاً دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، جبکہ اس کا مقابل عضو دایاں پاؤں ہے لیکن اس کے برعکس یعنی مخالف سمت والا عضو کاٹا جائے، تو یہ بات اس امر کا اشارتی ثبوت ہے کہ اس میں دونوں ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹنے میں ان کا ایک حصہ کاٹنا مقصود ہے سب کا سب کاٹنا مقصود نہیں یعنی ایک ہاتھ کاٹنا مقصود ہے نہ کہ دونوں، اور ایک پاؤں کاٹنا مقصود ہے نہ کہ دونوں! اور کاٹنے میں مخالف سمت ملحوظ رہے گی یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور داہنا پاؤں!

اور جملہ ''اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ'' میں ''نفی'' سے مراد دور پھینکنا اور آنکھوں سے دور یعنی غائب کر دینا ہے اور روایات میں اس کی تفسیر میں شہر بدر یا ملک بدر کرنا مذکور ہے یعنی اسے اس کے وطن سے نکال باہر کر دیا جائے۔

آیت مبارکہ کی بابت دیگر متعدد فقہی بحثیں بھی ہیں کہ جن کا تعلق کتب فقہ سے ہے لہٰذا ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

جملہ ''ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ'' میں لفظ ''خزی'' کا معنی رسوائی ہے، اور اس کا مطلب

واضح ہے چنانچہ اس حوالہ سے بعض مفسرین نے آیت سے استدلال کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مجرم پر دنیا میں حد جاری کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے آخرت کے عذاب سے خلاصی مل گئی بلکہ جملہ ''وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سزا پانے کے علاوہ آخرت میں بھی اسے عذاب کا سامنا ہوگا، یہ تفسیر فی الجملہ قرین صحت ہے۔

اور جملہ ''إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ گرفتار ہونے سے پہلے توبہ قابل قبول ہے لیکن گرفتاری اور جرم ثابت ہونے کے بعد حد ساقط نہ ہوگی۔

اور جملہ ''فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ'' ان سے حد ساقط ہونے کا کنایہ ہے یعنی گرفتاری سے پہلے اگر توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف کرنے والا ہے۔ بہرحال یہ جملہ صرف دنیاوی سزا کی معافی کے موارد میں سے ہے اس کا اخروی سزا کی معافی سے کوئی تعلق نہیں۔

تقویٰ اور وسیلہ:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ''

(اے ایمان والو! تقوے الٰہی اختیار کرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المفرادت'' میں لکھا ہے کہ ''وسیلہ'' کا معنیٰ اپنے آپ کو کسی چیز تک پوری توجہ و چاہت کے ساتھ پہنچانا ہے۔ البتہ یہ معنیٰ ''وسیلہ'' کے عمومی معنیٰ کی نسبت خاص جہت کا حامل ہے، کیونکہ اس میں رغبت و چاہت کا حوالہ شامل ہے، خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ''وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ'' اور ''اللہ کی طرف وسیلہ'' کا مطلب علم وعبادت کے ذریعے اس کے راستہ پر چلنا اور شریعت کی پاکیزہ خوبیوں سے اپنے آپ کو مزین کرنا ہے، بنابرایں وسیلہ ''قربت'' کے ہم معنیٰ ہے (المفردات، صفحہ ۵۲۳) اور وسیلہ چونکہ ایک طرح کی قربت ورسائی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مکان ومکانیات اور جسم وجسمانیات سے پاک ومنزہ ہے لہٰذا یہاں قربت ووصل سے مراد معنوی وروحانی پیوستگی ہے کہ جو بندہ اور اس کے پروردگار کے درمیان قائم ہوتی ہے اور اس ربط و پیوستگی کا قیام صرف اور صرف عبودیت و بندگی کے تقاضوں کی عاجزانہ ترین انداز میں تکمیل پر موقوف ہے، لہٰذا ''وسیلہ'' درحقیقت بندگی کے وجودی تجسّم اور خداوند عالم کی بارگاہ میں اپنی بے مایگی وسراپا احتیاج کی صورتگری کا دوسرا نام ہے، بنابرایں ''وسیلہ'' اسی رابطہ سے عبارت ہے، اور جہاں تک علم وعمل کا تعلق ہے تو وہ دونوں اس کے لوازم اور ذرائع ہیں جیسا کہ اس کی بابت بخوبی غور وفکر کرنے سے ظاہر وواضح ہے، ہاں اگر علم وعمل سے کہ جن کا حوالہ راغب نے اپنے بیان میں دیا ہے۔ مذکورہ بالا حالت مراد ومقصود ہو تو وسیلہ کی حقیقت کو اسی تناظر میں متعین کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات بھی واضح وروشن ہوجاتی ہے کہ جملہ "وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ" میں جہاد سے مطلق جہاد مراد ہے کہ جس میں جہاد بالنفس اور جہاد بالکفار سب ہی شامل ہیں کیونکہ اسے جہاد بالکفار سے مختص قرار دینا بلادلیل ہے جبکہ یہ جملہ اپنے ماقبل جملہ "وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ" سے جڑا ہوا ہے اور اس کی بابت بیان کیا جاچکا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو بندے کو اللہ سے ملادے، چنانچہ آپ اس کے معنی سے آگاہ ہوچکے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ بعد والی دو آیتیں جن مطالب پر مشتمل ہیں ان کے تناظر میں جملہ "وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ" میں جہاد سے اس کا مطلق معنیٰ یعنی ہر طرح کا جہاد مراد لینا ہی موزوں ہے البتہ اس کے باوجود یہ امکان بھی موجود ہے کہ یہاں جہاد سے قتال مع الکفار یعنی کافروں سے جنگ کرنا مراد ہو کیونکہ قرآن مجید میں جہاں بھی جہاد قتال کے معنی میں مذکور ہے اور مؤمنین کو اس کا حکم دیا گیا ہے وہاں اسے "فی سبیل اللہ" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور یہاں بھی اسی طرح مذکور ہے "وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ" لیکن جہاں مطلق جہاد مقصود ہے وہاں "فی سبیل اللہ" مذکور نہیں۔

جیسا کہ درج ذیل آیت میں اس طرح ذکر ہوا:

○ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹

"وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ"

(اور جن لوگوں نے ہماری بابت جہاد کیا تو ہم ضرور انہیں اپنے راستوں کی رہنمائی کریں گے اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)

بنابرایں "وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ" کے بعد جہاد فی سبیل اللہ (وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ) کا حکم عام کے بعد خاص ذکر کرنے کے باب سے ہے تاکہ خاص کی اہمیت واضح ہوسکے، اور تقوائے الٰہی اختیار کرنے کے حکم کے بعد وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دینا بھی شاید اسی طرح ہو یعنی عام کے بعد خاص کا ذکر ملحوظ و مقصود ہو۔

کافروں کا برا انجام:

"إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ"

(یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اگر ان کے پاس ہر وہ چیز ہو جو روئے زمین پر موجود ہے)

بظاہر ان دو آیتوں میں جیسا کہ پہلے اس سلسلہ میں بیان ہوچکا ہے۔ ماقبل آیت میں مذکور مطالب کا تعلیلی حوالہ پایا جاتا ہے ان دو آیتوں اور ماقبل آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ تم تقوائے الٰہی اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ ان کو انجام دینے سے تم اپنے آپ کو دردناک عذاب سے بچا سکتے ہو

اور کوئی چیز اس کا بدل وعوض نہیں بن سکتی کیونکہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تقوائے الٰہی نہ اپنا سکے اور اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش نہ کر سکے اور نہ ہی انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی توفیق پائی لہٰذا اگر وہ زمین میں موجود ہر چیز کے مالک بھی ہو جائیں کیونکہ یہ بات بنی نوع آدم کے ہر فرد کی آخری تمنا ہوتی ہے کہ وہ روئے زمین کی ہر شے کا مالک ہو جائے اور پھر اس کی مانند دگنا اسے حاصل ہو جائے اور وہ چاہیں کہ اپنی تمام مملوکہ اشیاء قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ دے دیں تب بھی ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے لیے دردناک ترین عذاب مقرر ہے، وہ چاہتے ہیں اور ان کی ہر ممکن کوشش ہے کہ اس عذاب سے نجات پا جائیں مگر وہ ہرگز اس سے نجات نہیں پا سکتے کیونکہ وہ ہمیشہ کا عذاب ہے جو ان پر چھایا ہوا ہے اور کبھی ان سے جدا نہ ہوگا بلکہ ابد تک ان کو اپنے گھیرے میں لئے رکھے گا۔

اس آیت میں دو اہم مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے:

(۱) عذاب ہی انسان کا وہ انجام ہے جو اس دنیا سے جانے کے بعد اسے گھیر سکتا ہے لیکن اس سے نجات پانے کا واحد ذریعہ ایمان اور تقویٰ ہے کہ جو اس کا رخ دوسری طرف پھیر سکتا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا:۔

O سورۂ مریم، آیت ۷۱، ۷۲

''وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ''

(تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو دوزخ پر وارد نہ ہو، یہ کام تیرے پروردگار کا یقینی طے شدہ ہے، پھر ہم نجات دلائیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل چھوڑ دیں گے)۔

O سورۂ عصر، آیت ۳

''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ''

(یقیناً انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے، جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے)

(۲) انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان آگ سے متاثر ہوتا ہے اور وہ اسے سخت تکلیف دیتی ہے اور یہ بنیادی تقاضا بنی نوع انسان پر ہر حال میں اثر انداز ہوتا ہے، اس سے چھٹکارا قابل تصور نہیں یعنی یہ بات ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اس فطری تقاضے سے ماوراء ہو یعنی آگ میں گرے اور اسے تکلیف نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو کوئی شخص اس سے تکلیف میں مبتلا نہ ہوتا اور نہ ہی آگ کے شعلوں سے اس کا بدن جھلستا اور نہ اس سے بچنے کی ترکیبیں عمل میں لاتا جبکہ تجربہ ومشاہدہ سے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہر انسان آگ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے شعلوں سے اسے تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ایسا ہونا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔

چوروں کی سزا کا بیان:

''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا''

(اور چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھوں کو کاٹ دو)

آیت کی ابتداء میں حرف وآو نئے جملہ کے آغاز کی نشانی ہے، گویا اس آیت میں ہر موضوع سے مربوط حکم کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں لہٰذا اسے یوں فرض کیا جائے گا: ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ'' (اور جہاں تک چور مرد اور چور عورت کا تعلق ہے) اسی وجہ سے اس کے مربوطہ جملہ میں جو کہ ادبی لحاظ سے اس کی خبر کہلاتا ہے۔ حرف فآ ذکر ہوا ہے ''فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا'' (تو ان دونوں کے ہاتھوں کو کاٹو)، اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ حرف فآ دراصل حرف ''اما'' کہ جسے ابتدائے کلام میں فرض وتصور کیا گیا ہے۔ کے جواب کے معنی میں ہے۔

اور جہاں تک لفظ ''أیدیهم'' کا تعلق ہے کہ اسے جمع کے صیغہ میں ذکر کیا گیا ہے (یدؔ (مفرد)) (أیدی (جمع) جبکہ یہاں تثنیہ (دو) مراد ہے تو اس حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ اس طرح کا استعمال عام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم میں بعض اجزاء یا اکثر ایسے ہیں جو دو ہیں مثلاً دو سینگ، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور دو پاؤں، اور جب ان کا تثنیہ بنایا جائے تو چار بنتے ہیں کہ جن کے لئے جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے مثلاً ''اعین'' (آنکھیں)، ''أیدی'' (ہاتھ)، ''أرجل'' (پاؤں) وغیرہ۔ حالانکہ ہر انسان کی دو آنکھیں، دو ہاتھ اور دو پاؤں ہوتے ہیں اس سے زیادہ نہیں ہوتے، یہی طرزِ عمل جسم کے اس عضو کے بارے میں بھی اپنایا جاتا ہے جو صرف ایک ہے مثلاً پیٹھ، پیٹ، چنانچہ یوں کہا جاتا ہے ''ملأت ظهورهما وبطونهما ضرباً'' اس میں لفظ ''ظهر'' (پیٹھ) اور لفظ ''بطن'' (پیٹ) کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جبکہ ہر انسان کا ایک پیٹ اور ایک پیٹھ ہے، قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے:۔

○ سورۂ تحریم، آیت ۴

''اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا''

(اگر تم دونوں اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر لو جبکہ تم دونوں کے دل منحرف ہو گئے ہیں)

لفظ ''ید'' کندھے کے نیچے سے اُنگلیوں کے لبوں تک کے حصہ کو کہتے ہیں، یہاں آیۂ مبارکہ میں اس سے مراد دایاں ہاتھ ہے چنانچہ روایات میں یہی مذکور ہے۔

اور قطع کرنا (کاٹنا) بعض حصہ کو یا سارے ہاتھ کو کاٹنے پر بولا جاتا ہے کہ اسے کاٹنے والے آلہ کے ذریعے بدن سے جدا کر دیا جائے۔

جملہ ''جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ'' میں لفظ ''جَزَآءً'' جملہ ''فَاقْطَعُوْٓا'' سے قطع کرنے کی حالت کے بیان پر مشتمل ہے یعنی ان کے ہاتھوں کا کاٹنا ان کے کئے کی سزا کے طور پر ہو کہ جو اللہ کی طرف سے ان کے لئے مقرر ہوئی ہے۔

لفظ ''نکال'' کا معنی وہ سزا ہے جو کسی مجرم کو دی جاتی ہے تا کہ اپنے جرم سے باز رہے اور دوسرے افراد اس سے عبرت حاصل کریں۔

قطع یعنی ہاتھ کاٹنے کو ''نکال'' یعنی عبرت آمیز سزا قرار دیا جانا اس مطلب کا باعث ہوا ہے کہ اس کے فوراً بعد یوں کہا جائے ''فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ'' (پس جو شخص ظلم کا مرتکب ہونے کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے) یعنی جب ہاتھ کا کاٹا جانا عبرت کی غرض سے دی جانے والی سزا ہو تو اس سے مراد یہی ہے کہ سزا پانے والا اپنی معصیت و گناہ سے منہ موڑ لے کیونکہ جو شخص ظلم کا ارتکاب کرنے کے بعد توبہ کرلے پھر اپنی اصلاح کرے اور چوری کے راستہ پر نہ چلے کہ اسی سے توبہ کا معنی پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اسے اپنی طرف سے مغفرت و رحمت سے نوازتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

O سورۂ نساء، آیت ۱۴۷

''مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا''

(اللہ کو تمہیں سزا دینے سے کیا حاصل اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان والے بن جاؤ، اور اللہ تو ہے ہی شکر گزار اور دانا و آگاہ)

بہرحال آیت میں بہت زیادہ فقہی بحثیں ہیں، جو شخص ان سے آگاہ ہونا چاہے وہ فقہی کتب کی طرف رجوع کرے۔

اللہ: آسمانوں اور زمین کا مالک!

''اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (البقرہ ۱۰۷)

(کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی مالکیت!)

یہ آیت درحقیقت ماقبل آیت میں مذکور مطالب کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے کہ جب چور مرد اور چور عورت توبہ کریں اور اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہو کر اپنی اصلاح نفس کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور حاکم کو اپنی مملکت و رعایا پر اپنی پسند کے مطابق حکم صادر کرنے کا اختیار و حق حاصل ہوتا ہے خواہ وہ ان پر

عذاب نازل کرے۔ان کے ظلم وجرم پر سزا دے۔ یا رحمت سے نوازے۔معاف کردے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کو حق حاصل ہے کہ جسے چاہے سزا وعذاب میں مبتلا کرے اور جسے چاہے معاف کردے یہ سب کچھ اس کی حکمت ومصلحت پر موقوف ہے،بنابرایں وہ چور مرد اور چور عورت کو عذاب وعقاب کرے گا اگر وہ توبہ نہ کریں اور انہیں معاف کردے گا اگر وہ توبہ کرلیں۔

اور جملہ ''وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ'' آسمانوں اور زمین کے مالک ہونے کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے اور وہ یہ کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ ''مُلك'' (حاکمیت)۔مَ پر پیش کے ساتھ کا تعلق قدرت واختیار رکھنے سے ہے جیسا کہ ''مِلك'' مَ کے نیچے زیر کے ساتھ۔(مالکیت) کا تعلق خلق وایجاد قیمومت الٰہیہ سے ہے۔

اس مطلب کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور وجود عطا کرنے والا ہے لہٰذا ہر چیز کا وجود اور اس سے مربوط آثار کا سرچشمہ ذات پروردگار ہے،وہی ہر چیز عطا کرنے والا ہے اور وہی اپنی عطا وعنایت کو روک دینے والا ہے اور اسے ہی ہر چیز میں تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہے تو ''مِلك''۔مَ کے نیچے زیر کے ساتھ۔کا یہی معنی ہے۔چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

○ سورۂ رعد،آیت ۱۶

''قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّہُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ''

(کہہ دیجئے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ یکتا غالب ہے)

○ سورۂ بقرہ،آیت ۲۵۵

''اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ''

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں،وہ زندہ و پائندہ ہے،نہ اسے اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند!اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

وہ اس کے باوجود جو چاہے کرسکتا ہے اور جو پسند کرے انجام دے سکتا ہے کیونکہ جس چیز کا بھی تصور کریں وہ اسی سے ہے پس حکم صادر کرنا اور اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانا اس کا حق اور اس کے اختیار میں ہے کہ اسے ہی ''مُلک'' مَ پر پیش کے ساتھ۔کہتے ہیں (حاکمیت) اور اسی کو سلطنت وکامل اختیار واقتدار کہا جاتا ہے،بنابرایں اللہ تعالیٰ مالک ہے کیونکہ وہ قیوم ہے اور حاکم ہے کیونکہ وہ قادر ہے وہ اپنے ارادہ وفیصلہ کے نفاذ میں عاجز و بے بس نہیں۔

روایات پر ایک نظر!

ایک واقعہ، ایک حقیقت:

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابوصالح کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: قبیلہ بنی ضبہ کے کچھ لوگ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ سب بیمار تھے، آنحضرتؐ نے ان سے ارشاد فرمایا: آپ لوگ میرے پاس قیام کریں اور جب آپ تندرست ہو جائیں گے تو میں تمہیں جنگ کے لئے بھیجوں گا، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حضورؐ کے حکم پر وہ لوگ مدینہ سے باہر آئے، حضورؐ نے صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیجا جہاں وہ ان اُونٹوں کا پیشاب پیتے تھے اور ان کا دودھ ان کی غذا و خوراک تھا، چنانچہ وہ شفایاب ہو گئے اور توانا و طاقتور ہو گئے، شفایاب ہونے اور طاقتور ہوتے ہی انہوں نے وہاں موجود حضورؐ کے مقرر کردہ تین شتر بانوں کو قتل کر دیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے حضرت علیؑ کو ان کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا، وہ لوگ اس وقت ایک وادی میں سرگردانی کی حالت میں تھے، وہ وادی یمن کی سرزمین کے نزدیک تھی اور وہ لوگ وہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے چنانچہ حضرت علیؑ نے ان پر قابو پا لیا اور انہیں گرفتار کر کے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آئے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ'' (یقیناً ان لوگوں کی سزا کہ جو اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ان کے ہاتھوں اور پیروں کو مخالف سمتوں سے کاٹا جائے)۔

(ملاحظہ ہو: کتاب فروع کافی، جلد ۷، صفحہ ۲۴۵)

اس روایت کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ شیخ طوسیؒ نے کتاب ''التہذیب'' میں ابوصالح کے حوالہ سے ذکر کیا ہے جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے مذکورہ بالا واقعہ بیان فرمایا، (ملاحظہ ہو: کتاب ''تہذیب الاحکام، جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۴) اور تفسیر العیاشی میں بھی اسے ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں یہ مطلب اضافہ کیا گیا ہے کہ آیت میں مذکور چار سزاؤں میں سے آنحضرتؐ نے ان لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹنے کی سزا کو اختیار کیا (تفسیر العیاشی جلد اوّل، صفحہ ۳۱۴)۔

اور یہ واقعہ اہل سنت کی معتبر کتب میں متعدد اسناد سے ذکر کیا گیا ہے کہ جن میں صحاح ستہ شامل ہیں البتہ ان کی تفصیلات میں بعض مطالب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض کتب میں یوں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر قابو پالیا تو انکے ہاتھ اور پاؤں کو مخالف سمتوں سے قطع کیا اور ان کی آنکھیں بھی نکال دیں اور بعض کتب میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے ان میں سے بعض کو قتل کیا اور پھانسی دی اور ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹا اور آنکھیں نکال دیں، بعض کتب میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لئے ان کی آنکھیں نکالیں کہ انہوں نے شتربانوں کی آنکھیں نکالی تھیں، بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنکھیں نکالنے سے منع فرمایا، بعض کتب میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرما کر آنحضرتؐ کی توبیخ کی کہ انہوں نے کیوں اس طرح مثلہ کیا ہے، بعض کتب میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کی آنکھیں نکالنے کا ارادہ کیا مگر اس پر عمل نہیں کیا، یہ اور اس طرح کے دیگر مطالب کے حوالہ سے ان کتب میں اختلاف پایا جاتا ہے، (ملاحظہ ہو: کتاب سنن ترمذی جلد اوّل صفحہ ۹ ۴، سنن نسائی جلد ۷ صفحہ ۹۲، سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۸۲۶، سنن ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۵ ۴ ۴، مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۷ ۷ ۱، صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۱۰۲)۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات میں آنکھیں نکالنے کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا۔

محارب کی سزا کا تفصیلی ذکر:

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عمرو بن عثمان بن عبداللہ مدائنی کے حوالہ سے حضرت امام ابوالحسن رضا علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آپؑ سے آیت ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا'' کی بابت پوچھا گیا کہ وہ کونسا جرم ہے کہ جس پر ان چار سزاؤں میں سے کسی ایک کا سامنا مجرم کو کرنا پڑتا ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسولؐ سے محاربہ کرے اور زمین میں فساد پھیلانے میں کوشاں ہو کہ کسی کو قتل کردے تو اسے اس کے جرم میں قتل کیا جائے گا، اور اگر کسی کو قتل کرے اور مال کو لوٹے تو اسے قتل کیا جائے گا اور پھانسی دی جائے گی اور اگر صرف مال لوٹ لے مگر قتل نہ کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں گے، اور اگر تلوار کشی کر کے اللہ اور رسولؐ سے محاربہ اور زمین میں فساد پھیلانے میں کوشاں ہو مگر نہ تو کسی کو قتل کرے اور نہ ہی کوئی مال لوٹے تو اسے شہر بدر کیا جائے گا، راوی نے پوچھا، کہ شہر بدری کس طرح ہوگی اور اس کی حد کیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس نے جس شہر میں جرم کا ارتکاب کیا ہو وہاں سے نکال باہر کر کے دوسرے شہر میں بھیجا جائے گا اور اس شہر کے لوگوں کو مطلع کردیا جائے گا کہ اسے شہر بدر

کیا گیا ہے لہٰذا ایک سال تک اس کے ساتھ میل جول، لین دین، شادی بیاہ، کھانا پینا وغیرہ نہ کریں، اگر وہ اس دوران کسی دوسرے شہر چلا جائے تو اس شہر کے باسیوں کو اطلاع دی جائے یہاں تک کہ ایک سال پورا ہو جائے، راوی نے کہا: میں نے پوچھا کہ اگر وہ ارضِ شرک کا رخ کرلے تاکہ وہاں قیام پذیر ہو تو؟ امامؑ نے فرمایا: اگر وہ سرزمین شرک چلا جائے تاکہ وہاں سکونت اختیار کرے تو اس کے باسیوں سے جنگ کی جائے گی۔ (ملاحظہ ہو، کتاب فروع کافی، جلد ۷، صفحہ ۲۴۷)

یہ روایت کتاب تہذیب الاحکام (شیخ طوسیؒ) اور تفسیر العیاشی میں ابو اسحاق مدائنی کے حوالہ سے امام رضاؑ کے فرمان پر مشتمل منقول ہے اور اس مطلب کی حامل روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے کثرت سے بیان ہوئی ہیں اور اسی طرح اہل سنت کے متعدد اسناد سے بھی روایات ذکر کی گئی ہیں کہ جن میں سے بعض روایات میں مذکور ہے کہ امام کو حق حاصل ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے جسے چاہے اختیار کرے یعنی یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ قتل کی سزا معین کرے یا پھانسی پر لٹکائے یا ہاتھوں اور پاؤں کو مخالف سمت سے کاٹنے کا حکم جاری کرے یا شہر بدر کردے، اسی کے مانند بعض روایات شیعہ اسناد سے بھی منقول ہیں جن میں امامؑ کے اس حق کا تذکرہ ہے کہ وہ ان چار سزاؤں میں سے جو چاہے اختیار کرسکتا ہے مثلاً کتاب کافی میں مؤلفؒ نے جمیل بن دراج کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کے ضمن میں وضاحت فرمائی، راوی نے کہا میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کی: محارب کی جن چار سزاؤں کو خداوند عالم نے ذکر فرمایا ہے ان میں سے کون سی سزا انہیں دی جانی چاہیے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: یہ امامؑ کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ چاہے تو ہاتھ پاؤں کی سزا متعین کرے یا قتل کا حکم دے، راوی نے کہا: میں نے پوچھا: شہر بدر کی کیا حد ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ایک شہر سے دوسرے شہر تک! امامؑ نے اس کے بعد فرمایا: امام علیؑ نے دو افراد کو کوفہ سے بصرہ شہر بدر کیا، (کتاب فروع کافی، جلد ۷، ص ۲۳۶)

اس موضوع کی تفصیلی بحث فقہی کتب میں مذکور ہے البتہ یہ مطلب واضح ہے کہ آیۂ مبارکہ میں حدود، سزاؤں کی ترتیب جرم کی نوعیت سے وابستہ ہے کیونکہ قتل، پھانسی، ہاتھوں اور پاؤں کا قطع کرنا اور شہر بدری، جو کہ متوازی امور نہیں اور نہ ہی ان کے درمیان ہمرنگی پائی جاتی ہے بلکہ شدت وضعف کے لحاظ سے ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ کے بیان میں حرف ''اَوْ'' کا ذکر کیا جانا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا ترتیبی حوالہ رکھتا ہے، جیسا کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں محاربہ اور فساد فی الارض کے مرتکب افراد کی معینہ سزائیں (حدود) ذکر کی گئی ہیں کہ جو شخص تلوار کشی کرے اور زمین میں فساد پھیلانے میں کوشاں ہو یا کسی انسان کو قتل کردے تو اس کی سزا قتل ہے کیونکہ وہ محارب اور مفسد ہے اور اس سزا کو ''قصاص'' قرار نہیں دیا جاسکتا کہ جو کسی انسان کو قتل کرنے کے بدلے میں مقرر ہے، کہ جس میں یہ گنجائش پائی جاتی ہے کہ اگر مقتول کے وارث دیت پر راضی ہو جائیں تو قتل کی سزا ختم ہو جاتی ہے لیکن یہاں ایسا نہیں، چنانچہ تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم

کے حوالہ سے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے اور اسی کتاب میں ابوعبیدہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر مقتول کے وارث اسے معاف کر دیں تو کیا حکم ہے؟ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اگر وہ اسے معاف بھی کر دیں تب بھی امام کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کی سزا دے کیونکہ اس نے محاربہ کیا اور قتل و سرقت کا مرتکب ہوا، ابوعبیدہ نے کہا اگر مقتول کے وارث اس سے دیت لے کر اسے چھوڑ دیں تو کیا ایسا کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا نہیں، اس کی سزا قتل ہے، (تفسیر العیاشی، جلد اوّل صفحہ ۳۱۴)

حارثہ بن بدر کی توبہ:

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید کے حوالہ سے اور ابن ابی الدنیا کی کتاب الاشراف اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے شعبی کی روایت ذکر کی گی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حارثہ بن بدر تمیمی کہ جو اہل بصرہ سے تھا اس نے زمین میں فساد اور محاربہ کا ارتکاب کیا اس نے قریش کی بعض شخصیات سے بات کی کہ امام علیؑ سے اس کی سفارش کریں کہ وہ اسے امان دے دیں مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا، پھر وہ سعید ابن قیس ہمدانی کے پاس آیا جو اسے امام علیؑ کی خدمت میں لے گیا، اس نے عرض کیا: اے امیر المومنین! جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے میں کوشاں ہوں ان کی کیا سزا ہے؟ امام علیؑ نے فرمایا: ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ان کے ہاتھوں پاؤں کو مخالف سمتوں سے کاٹا جائے یا شہر بدر کر دیا جائے، اس کے بعد امام علیؑ نے ارشاد فرمایا: سوائے ان لوگوں کے کہ جو تمہارے ان پر قابو پانے سے پہلے توبہ کر لیں، یہ سن کر سعید نے پوچھا: خواہ وہ حارثہ بن بدر تمیمی ہی کیوں نہ ہو؟ پھر فوراً حارثہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ حارثہ بن بدر تمیمی ہے کہ جس نے توبہ کر لی ہے اور اب امان چاہتا ہے کیا اسے امان مل سکتی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں، چنانچہ وہ آگے بڑھا اور حارثہ کو امامؑ کے پاس لے آیا، اس نے امامؑ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ جسے امامؑ نے قبول کر لیا اور اس کے لئے امان نامہ لکھ دیا (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۷۹)

اس روایت میں سعید کا یہ کہنا کہ ''خواہ وہ حارثہ بن بدر ہی کیوں نہ ہو؟'' (وان کان حارثہ بن بدر) دراصل آیت کے تناظر میں اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہے کہ محاربہ و افساد کے بعد ہر توبہ کرنے والا آیت کے استثنائی جملہ میں شامل ہے اور اس طرح کے استعمالی شواہد عام پائے جاتے ہیں۔

دار السلام یا دار الشرک:

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے سورہ بن کلیب کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر سے مسجد کی طرف روانہ ہو یا کسی اور کام کی غرض سے باہر آئے اور راستہ میں کوئی شخص اس کا راستہ روک لے اور اسے تشدد کا نشانہ بنائے اور اس کے کپڑے بھی چھین لے تو اس کی کیا سزا ہے؟ امامؑ نے استفہامیہ طور پر پوچھا کہ آپ کے اردگرد جو حضرات علماء موجود ہیں ان کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کی کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف ظاہر بظاہر ایک شرارتی کام ہے اور جہاں تک محارب کا تعلق ہے تو وہ اسے کہتے ہیں جو دارالشرک میں اس طرح کا جرم کرے، امامؑ نے پھر پوچھا: ان دونوں مقامات میں سے کس کا احترام زیادہ ہے، دارالاسلام کا یا دارالشرک کا؟ میں نے عرض کیا کہ دارالاسلام کا احترام زیادہ ہے، یہ سن کر امامؑ نے ارشاد فرمایا: ایسے لوگ ہی اس آیت کا مصداق ہیں ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ'' (کتاب فروع کافی، جلد ۷، ص ۲۲۵)۔

اس روایت میں امامؑ نے جن حضرات علماء کے بارے میں پوچھا اور راوی نے اس کے جواب میں ان کی آراء بیان کیں ان سے مراد قیاس کی پیروی کرنے والے علماء ہیں کہ جن کی آراء و نظریات سوادِ اعظم کی بعض روایات میں مذکور ہیں، اور ان سب کی بنیاد بعض وہ روایات ہیں جو ضحاک کے اسناد سے آیت کے شانِ نزول کی بابت ذکر کی گئی ہیں کہ جن میں ضحاک نے کہا کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور تفسیر طبری میں مذکور ہے کہ عبدالملک بن مروان نے انسؓ کو ایک خط لکھا اور اس میں اس آیت کا معنیٰ پوچھا تو اس کے جواب میں انسؓ نے لکھا کہ یہ آیت عرنیوں کے چند افراد کے بارے میں نازل ہوئی کہ جس کا تعلق بجیلہ سے تھا، وہ لوگ مرتد ہو گئے تھے اور اسلام سے منہ موڑ لیا تھا، انہوں نے ہی شتر بان کو قتل کر کے اونٹ ساتھ لے گئے، انہوں نے ہی راستوں میں خوف و ہراس پھیلایا اور عورتوں کی عزتیں لوٹیں، اس پر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل سے محارب کے بارے میں حکم الٰہی دریافت کیا تو جبریل نے کہا جو شخص چوری کرے اور خوف و ہراس پھیلائے اور عورتوں کی عزت لوٹے اسے تختہ دار پر لٹکا دیں (تفسیر ''جامع البیان'' طبری، جلد ۶ صفحہ ۱۳۶)

اس کے علاوہ دیگر روایات بھی اسی مضمون و مطلب پر مشتمل ہیں، بہر حال آیت جو کہ مطلق ہے اس سے کتاب کافی کی مذکورہ بالا روایت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ شان نزول آیت کے ظاہر کو مقید کرنے کا باعث نہیں ہوتا۔

امامؑ کا وسیلہ:

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ امامؑ کی اطاعت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرو (تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۶۸)

اس سے مراد یہ ہے کہ امامؑ کی اطاعت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرو، یہ بات تطبیق کے ایک مورد کی نشاندہی

کے طور پر ہے اسی کی مانند ابن شہر آشوب کی وہ روایت ہے جس میں انہوں نے کہا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے آیۂ مبارکہ ''وَابْتَغُوٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ''انا وسیلته'' میں اللہ وسیلہ ہوں، (کتاب المناقب، ابن شہر آشوب، جلد ۳ ص ۷۵)

اور اسی سے قریب المعنی وہ روایت ہے جو کتاب ''بصائر الدرجات'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے سلمان کے حوالہ سے امام علیؑ کے فرمان پر مشتمل ذکر کی ہے (بصائر الدرجات، صفحہ ۲۱۶)

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ بالا دونوں روایتیں تطبیق کی بجائے تاویل کے باب سے ہوں، اس سلسلہ میں دونوں روایتوں میں مذکور مطالب پر بخوبی غور کیجئے۔

فرمانِ نبویؐ:

تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا: میرے لئے اللہ سے وسیلہ کی درخواست کرو کیونکہ وہ بہشت کا وہ درجہ و مقام ہے جو ایک عبد کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوگا اور میری خواہش ہے کہ وہ ایک عبد میں ہی قرار پاؤں (مجمع البیان، جلد ۳، صفحہ ۱۸۹)۔

وسیلہ کی دعا:

کتاب ''معانی الاخبار'' میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابو سعید خدری کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم اللہ کے حضور دست سوال دراز کرو تو میرے لئے وسیلہ کی درخواست کرو، چنانچہ ہم نے آنحضرتؐ نے پوچھا کہ وسیلہ کا مطلب کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: وہ جنت میں میرا درجہ و مقام ہے، (معانی الاخبار، صفحہ ۱۱۶) یہ حدیث طولانی ہے اور اسے حدیث وسیلہ کہا جاتا ہے۔

قارئین کرام! اگر آپ اس حدیث میں اچھی طرح غور و فکر کریں اور اسے آیت کے معنی پر منطبق کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وسیلہ در حقیقت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ مقام و منزلت ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انہیں حاصل ہے کہ جس کے ذریعے وہ خدا سے تقرب کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل وعترت طاہرین اور پھر آپؐ کی اُمت میں سے نیک و صالح بندے اس کو پاتے ہیں، چنانچہ بعض روایات میں آئمہ طاہرین علیہم السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پروردگار کا دامن تھامتے ہیں اور ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن تھامتے ہیں اور تم لوگ ہمارے

دامن تھامتے ہو، (ملاحظہ ہو: کتاب المحاسن للبرقی، جلد اوّل ص ۱۸۳) (دامن تھامنے سے مراد جسمانی نہیں بلکہ معنوی وسیلہ بنانا ہے۔ مترجم)

اسی مطلب کی طرف ان دو روایتوں کی بازگشت ہے جو ہم تفسیر قمی اور المناقب، ابن شہر آشوب کے حوالہ سے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ بات خالی از امکان نہیں کہ یہ دو روایتیں تاویل کے باب سے ہوں نہ کہ تطبیق کے باب سے! شاید اس مطلب کی مزید وضاحت ہم بعد میں کسی موزوں مقام پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

انہی روایات سے ملحق وہ روایت ہے جسے تفسیر العیاشی میں ابو بصیر کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا آپؑ نے ارشاد فرما رہے تھے: ''عدو علی هم المخلدون فی النار. قال تعالیٰ: ''وما هم بخارجين منها'' حضرت علیؑ کے دشمن دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وما هم بخارجين منها'' (اور وہ اس سے باہر نہیں آئیں گے)۔

تفسیر ''برھان'' میں آیۂ مبارکہ ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا'' کے ذیل میں کتاب ''تہذیب الاحکام'' کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابو ابراہیمؑ کا ارشادِ گرامی قدر ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا: ''تقطع يد السارق ويترك ابهامه وراحته، وتقطع رجله ويترك عقبه يمشى عليها'' (چور کا ہاتھ کاٹا جائے لیکن درمیانی اُنگلی اور ہتھیلی کو چھوڑ دیا جائے (کاٹا نہ جائے) اور اس کا پیر کاٹا جائے لیکن پاؤں کا پچھلا حصہ نہ کاٹا جائے تا کہ وہ چل پھر سکے)۔ (تفسیر ''البرھان'' جلد ۱ ص ۴۷۰)۔

کتاب ''تہذیب الاحکام'' ہی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے محمد بن مسلم کے حوالہ سے روایت ذکر کی کہ انہوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے چور کا ہاتھ کاٹنے کی حد کے بارے میں سوال کیا یعنی کس قدر مال چوری کرنے کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ۱/۴ دینار چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے پوچھا: اگر دو درہم چوری کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟ ۱/۴ دینار سے کم مقدار میں چوری کرے تو کیا اسے چور نہیں کہا جائے گا؟ یعنی آپؑ نے فرمایا ہے کہ ۱/۴ دینار چوری کرنے والا شخص ہاتھ کاٹے جانے کی سزا کا مستحق ہوگا تو کیا اس مقدار سے کم چوری کرنے والے کو چور نہیں کہا جائے گا اور ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم اس پر جاری ہوگا؟ یعنی وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''چور'' شمار ہوگا؟ اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ امامؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کی کوئی چیز چرائے کہ جسے اس نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا ہو تو اسے ''چور'' کہا جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''چور'' شمار ہوگا لیکن اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا سوائے اس کے کہ ۱/۴ یا اس سے زیادہ مقدار میں چوری کرے، اگر ۱/۴ دینار سے کم مقدار میں بھی چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو آپ اکثر لوگوں کو کٹے ہوئے ہاتھ والے پائیں گے اور وہ بے دست ہو جائیں گے (تہذیب الاحکام، جلد ۱۰، صفحہ ۹۹)۔

اس روایت میں مذکور فرمانِ امامؑ (اگر ۱/۵ دینار سے کم مقدار میں مال چرانے پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو اکثر لوگوں کو کٹے ہوئے ہاتھ والے پائیں گے) اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت ورحم پر مبنی ہے، اور امامؑ کا فرمان کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا ۱/۴ دینار یا اس سے زیادہ مقدار میں چوری کرنے سے مختص ہے اس کی بابت سوادِ اعظم کی طرف سے منقول بعض روایات میں بھی یہی مذکور ہے، چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہر کتاب کا مؤلف نے اپنے اسناد سے عائشہؓ کے حوالہ بیان کیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چور کا ہاتھ صرف اسی صورت میں کاٹا جائے گا جب وہ ۱/۴ دینار یا اس سے زیادہ مقدار میں مال چوری کرے، (ملاحظہ ہو: کتاب صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۹۹، صحیح مسلم جلد ۵، صفحہ ۱۱۲)۔

تفسیر العیاشی کی تین روایتیں

پہلی روایت: سماعہ نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے بیان کیا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: جب چور پکڑا جائے تو اس کا ہاتھ درمیان سے کاٹا جائے گا، اگر دوبارہ چوری کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کا پاؤں درمیان سے کاٹا جائے گا، اگر تیسری بار چوری کرے تو اسے قید کر دیا جائے گا اور اگر قید خانہ میں بھی چوری کا مرتکب ہو تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

دوسری روایت: زرارہ نے بیان کیا کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے چوری کی اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا، پھر دوبارہ چوری کی تو بایاں پاؤں کاٹا گیا، پھر تیسری بار چوری کی تو اس کی سزا کیا ہوگی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: حضرت امیر المومنینؑ اسے عمر قید کی سزا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ میں اس شخص کو بے دست چھوڑ دوں کہ غسل وطہارت ہی نہ کر سکے اور اسے بے پاؤں کر دوں کہ قضائے حاجت کے لئے بھی نہ جا سکے۔ اس کے بعد امام محمد باقرؑ نے فرمایا: حضرت امیر المومنینؑ جب چور کا ہاتھ کاٹتے تھے تو کہنی سے نیچے تک کاٹتے تھے اور جب پاؤں کاٹتے تھے تو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹتے تھے اور اس امر کی تاکید فرماتے تھے کہ حاکم کو حدود کے اجراء میں غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

تیسری روایت: زرقان کہ جو ابن ابی داؤد کا ساتھی اور دوست تھا اس نے بیان کیا کہ ایک دن ابن ابی داؤد معتصم عباسی کے دربار سے واپس آئے تو بہت مغموم لگ رہے تھے، میں نے ان کی یہ حالت دیکھ کر ان سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے آج جو منظر دیکھا ہے کاش اسے نہ دیکھتا اور بیس سال پہلے ہی مر جاتا، میں نے پوچھا: کیوں،

کیا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس سیاہ پوست ابوجعفر محمد بن علی بن موسیٰ نے آج امیر المومنین معتصم کے سامنے جو کچھ کہا ہے! میں نے پوچھا: تو کیا ہوا اور اس کی تفصیل تو بتائیں؟ ابن ابی داؤد نے کہا: ایک چور نے چوری کا اعتراف کیا اور اس نے خلیفہ سے التجاء کی کہ اس پر حد جاری کر کے اسے اس گناہ سے پاک کرے، خلیفہ نے اس موضوع کے لئے فقہاء کو اپنے دربار میں بلایا اور ایک اجتماع تشکیل دیا اور ابوجعفر محمد بن علی کو بھی بلوایا، خلیفہ نے بھرے دربار میں ہم سے پوچھا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا ضروری ہے؟ ابن ابی داؤد نے کہا کہ میں نے اس کا جواب یوں دیا کہ کلائی سے کاٹا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسح کے حکم میں یوں ارشاد فرمایا: ''فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ''، (پس تم مسح کرو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کا) میری رائے سے وہاں موجود کئی حضرات نے اتفاق کیا، بعض حضرات نے کہا: بلکہ کہنی سے کاٹنا واجب ہے، خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ انہوں نے اس جملہ سے استدلال کیا کہ خدا فرماتا ہے ''وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ'' (اور تم اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوو) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھ کی حد کہنی تک ہے، یہ سن کر خلیفہ نے محمد بن علی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ اس مسئلہ میں آپ کیا کہتے ہیں اے ابوجعفر، محمد بن علی نے جواب دیا کہ ان حضرات نے اس سلسلہ میں آپ کو بتا تو دیا ہے، خلیفہ نے کہا: ان کی باتوں کو چھوڑیں، آپ بتائیں کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ محمد بن علی نے کہا: آپ مجھے اظہارِ رائے سے معاف ہی کر دیں تو بہتر ہے، خلیفہ نے کہا: میں آپ کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ اپنی رائے کا اظہار کریں، تب محمد بن علی نے کہا کہ اب جبکہ آپ نے مجھے اللہ کی قسم دی ہے تو میں بات کرتا ہوں، اور وہ یہ کہ ان حضرات نے غلط فتویٰ دیا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں سنت کو سمجھا ہی نہیں، اصل حکم یہ ہے کہ اُنگلیوں کے جوڑوں کے ابتدائی حصے سے ہاتھ کاٹا جائے اور ہتھیلی کو باقی رہنے دیا جائے (یعنی ہتھیلی کے بعد اُنگلیوں کے شروع ہونے کی جگہ سے!) خلیفہ نے پوچھا: اس کی کیا دلیل ہے؟ محمد بن علی نے کہا کہ اس کی دلیل یہ فرمانِ نبویؐ ہے: ''السجود علی سبعة أعضاء: الوجه واليدين والركبتين والرجلين'' سات اعضاء پر سجدہ کیا جائے: چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پیر، لہٰذا اگر چور کا ہاتھ کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے تو وہ سجدہ ہی نہ کر سکے گا، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے: ''وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ'' (سجدہ کے مقامات اللہ کے لئے مخصوص ہیں) یعنی یہ سات اعضاء کہ جن پر سجدہ کیا جاتا ہے وہ خدا کے لئے ہیں۔ اس کی ملکیت ہیں ''فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا'' (پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو)، یعنی جو چیز اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اسے مت کاٹو، ابن ابی داؤد نے کہا کہ محمد بن علی کی بات خلیفہ کو پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ چور کا ہاتھ انگلیوں کے جوڑوں سے کاٹا جائے اور ہتھیلی کو باقی رہنے دیا جائے، ابن ابی داؤد نے کہا کہ جب خلیفہ نے محمد بن علی کی رائے پر عمل کرنے کا حکم دیا تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی اور میں نے کہا: کاش آج میں زندہ نہ ہوتا۔

ابن ابی زرقان نے کہا کہ ابن ابی داؤد کہنے لگا کہ میں تین روز کے بعد معتصم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ

مجھ پر واجب ہے کہ میں امیر المومنین کی خیر خواہی کروں لہٰذا میں ضرور وہ بات آپ سے کہوں گا جس کا مجھے علم ہے خواہ اس کے لئے آگ کے شعلوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، خلیفہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جب امیر المومنین نے فقہاء کو اپنے دربار میں اکٹھا کیا اور اپنی رعایا کے علماء کا اجتماع تشکیل دیا تا کہ ایک دینی مسئلہ میں شرعی حکم سے آگاہ کریں، چنانچہ انہوں نے خلیفہ کی درخواست پر اس سلسلہ میں شرعی حکم بتادیا اور اس وقت دربار میں امیر المومنین کے فرزندانِ گرامی قدر، سردارانِ لشکر، وزراء اور تمام دفتری ملازمین موجود تھے جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور جو لوگ دروازے کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے وہ سب کچھ سن رہے تھے مگر خلیفہ ان تمام علماء وفقہاء کی آراء کو نظر انداز کر کے صرف اس ایک شخص کی رائے پر عمل کرتا ہے جس کی امامت کے صرف چند افراد قائل ہیں اور وہ ادّعاء کرتے ہیں کہ وہی خلیفہ کی بجائے امامت وحاکمیت کا حقدار ہے، پھر خلیفہ اسی کے بتائے ہوئے حکم کے مطابق حکم صادر کرتا ہے اور دیگر فقہاء کی آراء کو رد کر دیتا ہے! یہ سن کر خلیفہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور میری بات اس پر اثر کر گئی اور اس نے مجھ سے کہا: آپ نے مجھے نصیحت ورہنمائی کی اس پر اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، پھر اس نے چوتھے دن ایک شخص کو بلایا جو اس کے وزراء کا منشی تھا اور اسے حکم دیا کہ وہ محمد بن علی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے، چنانچہ اس منشی نے خلیفہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے محمد بن علی کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی مگر انہوں نے قبول نہ کی اور کہلوا بھیجا کہ آپ خود جانتے ہیں کہ میں آپ لوگوں کے ہاں نہیں آتا اور اس طرح کی دعوتوں میں شریک نہیں ہوتا، منشی نے کہا کہ میں آپ کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دے رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ میرے ہاں قدم رنجاں فرمائیں اور اپنی تشریف آوری سے میرے گھر کو رونق بخشیں تا کہ آپ کی بدولت میرے گھر میں برکت نازل ہو اور خلیفہ کا فلاں وزیر بھی آپ کی زیارت کا خواہشمند ہے، چنانچہ محمد بن علی نے اس کی دعوت قبول کر لی اور اس کے گھر آ گئے، جوں ہی کھانا کھانا شروع کیا تو زہر کے آثار محسوس کرنے لگے، انہوں نے اپنی سواری منگوائی اور واپس جانے کی تیاری کر لی، میزبان نے اصرار کیا کہ وہ مزید تشریف فرما رہیں، مگر محمد بن علی نے کہا کہ میرا تیرے گھر سے باہر جانا ہی تیرے لئے بہتر ہے چنانچہ وہ وہاں سے چلے گئے اور پورا دن اور پوری رات شدید تکلیف کا شکار رہے اور بالآخر انتقال کر گئے (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۳۲۰)۔

مذکورہ بالا واقعہ دیگر اسناد سے بھی منقول ہے اور ہم نے اس واقعہ کو اس کے طولانی تر ہونے کے باوجود یہاں ذکر کیا ہے اور اس سے پہلے بھی بعض طولانی روایات ذکر کی جا چکی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روایات نہایت اہم قرآنی مباحث پر مشتمل ہیں کہ جن کے ذریعہ آیات مبارکہ کے معانی کا سمجھنا آسان ہوسکتا ہے، اور وہ بحثیں فہم المعانی میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

تفسیر ''درمنشور'' میں مذکور ہے کہ احمد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ایک عورت نے عہد نبویؐ میں چوری کا ارتکاب کیا اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا، اس کے بعد اس نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ آیا اس کے لئے توبہ کی گنجائش ہے اے اللہ کے رسول؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں، تو آج اپنے گناہ سے پاک ہوگئی ہے اور اسی طرح ہوگئی ہے جیسے اپنی ولادت کے پہلے دن، ہر طرح کے گناہ سے پاک تھی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ''، (پس جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے کہ یقیناً اللہ معاف کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے)۔ (تفسیر ''درمنشور'' جلد ۲، صفحہ ۲۸۱)۔

یہ روایت تطبیق کے طور پر ہے، چنانچہ اس کا ماقبل آیت سے اتصال و پیوستگی اور دونوں کا یکساں نازل ہونا واضح و ظاہر ہے۔

آیات ۴۱ تا ۵۰

○ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۴۱

○ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْــــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲

○ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳

○ إِنَّآ أَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾

○ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ﴿٤٥﴾

○ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَّنُورٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾

○ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿٤٧﴾

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ‌ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا‌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَـعَلَـكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡـرٰتِ‌ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝۴۸

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ۝۴۹

اَفَحُكۡمَ الۡجَـاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ‌ ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۝۵۰

ترجمہ

''اے رسول! آپ کو ان لوگوں کا کفر کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا دکھی نہ کرے کہ جو زبانی طور پر ایمان کا اظہار کرنے والوں میں سے ہیں جبکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور ان میں سے کچھ یہودیوں میں سے ہیں، وہ جھوٹ پر کان دھرنے والے ان لوگوں کے لئے جاسوسی کرنے والے ہیں جو آپ کے پاس نہیں آئے، وہ کلمات کو ان کے اصل مقامات سے تبدیل کر دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ حکم دیا گیا تو لے لینا اور اگر یہ حکم نہ ملا تو اس سے بچ کر رہنا، حق تو یہ ہے کہ اللہ جسے آزمائش میں مبتلا کرنا چاہے تو اس کی بابت آپ کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی اختیار عطا نہیں کیا گیا، ایسے لوگوں کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ نے کوئی ارادہ نہیں کیا، ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے'' (۴۱)

''وہ جھوٹ پر کان دھرنے والے، حرام کھانے والے ہیں، پس اگر وہ آپ کے پاس آئیں (آپ کو فیصل قرار دیں) تو آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ پھیر لیں (اس کا اختیار آپ کو ہے)، اور اگر آپ نے ان سے روگردانی کی تو وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ صادر کریں تو عدل پر مبنی فیصلہ صادر کریں، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' (۴۲)

- ''وہ لوگ آپ کو کیونکر اپنا فیصل قرار دے سکتے ہیں جبکہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم مذکور ہے اس کے باوجود وہ خدائی حکم سے منہ موڑتے ہیں، درحقیقت وہ مؤمن ہی نہیں'' (۴۳)

- ''یقیناً ہم ہی نے توراۃ نازل کی ہے کہ جس میں ہدایت اور نور ہے، اسی کے مطابق اسلام والے انبیاء یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے اور خدا پرست اہل علم اور احبار بھی، کتاب اللہ کی بابت اپنی خدائی ذمہ داریوں کی بناء پر اور اس پر گواہ ہونے کے حوالہ سے، یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے، لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچنا، اور جو شخص اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم و فیصلہ نہ دے تو ایسے لوگ کافر ہیں'' (۴۴)

- ''اور ہم نے توراۃ میں ان کے لئے یہ قانون لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا قصاص ہوگا (ان کے مطابق فیصلہ ہوگا) پس جو شخص معاف کردے تو اس کا ایسا کرنا اس کے لئے کفارۂ گناہ قرار پائے گا، اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں'' (۴۵)

○ ''اور ہم نے ان کے بعد عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بھیجا کہ جو اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والے ہیں اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی کہ جس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ اپنی ماقبل کتاب تورات کی تصدیق کرنے والی ہے اور تقویٰ والوں کے لئے سرچشمہ ہدایت و نصیحت ہے'' (۴۶)

○ ''اور انجیل والوں کو چاہیے کہ جو کچھ اللہ نے انجیل میں نازل کیا اس کے مطابق فیصلے کریں اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں'' (۴۷)

○ ''اور ہم نے آپ کی طرف کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے جو کہ اپنی ماقبل کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگران و نگہبان ہے، پس آپ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں اور آپ کے پاس جو حق آچکا ہے اس کے برعکس ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص دستور العمل اور راہ و روش قرار دی ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز کی بابت آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں عطا کی ہے پس تم نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرو، تم سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہے پھر وہ تمہیں تمہارے اختلافی امور کے بارے میں آگاہ کرے گا'' (۴۸)

○ ''اور آپ اُن کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کریں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ان سے ہوشیار رہیں کہ کہیں وہ بعض ان چیزوں کے بارے میں جو اللہ کی طرف سے آپ کی طرف نازل ہوئی ہیں آپ کو اُلجھن میں نہ ڈال دیں، اگر وہ منہ موڑ لیں تو آپ آگاہ رہیں کہ اللہ اُنہیں ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے اور بہت ہی لوگ فاسق ہیں'' (۴۹)

○ ''کیا وہ زمانہ جاہلیت کے طریقہ وروش کے درپے و دلدادہ ہیں؟ حالانکہ یقین والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے؟'' (۵۰)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کے بعض حصے دوسرے بعض حصوں سے ربط و پیوستگی کے حامل ہیں اور ان سب کا سیاق الکلام ایک ہی ہے جس سے اس مطلب کا اشاراتی ثبوت ملتا ہے کہ یہ آیات اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئیں کہ جنہوں نے تورات کے بعض احکام کی بابت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فیصل قرار دیا تھا اور اُنہیں اُمید تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بارے میں تورات کے حکم کے برخلاف حکم دیں گے تا کہ اس طرح اُنہیں تورات کے حکم پر عمل کرنے سے چھٹکارا پانے کا موقع مل جائے گا چنانچہ وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اگر تمہیں یہی ملے۔ یعنی جو تمہاری خواہش کے مطابق ہو تو اس پر عمل کرو اور اگر اس کے علاوہ کچھ دیا جائے یعنی تورات ہی کا حکم بتایا جائے تو اس سے کنارہ کشی کرو،

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں تورات ہی کے حکم پر عمل کرنے کا فرمایا لہٰذا اہل کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منہ موڑ لیا۔

البتہ آیات کے سیاق الکلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کچھ منافقین بھی تھے جو اسی طرح کی توقع و اُمید رکھتے تھے جس طرح اہل کتاب کے گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تورات کے برخلاف حکم صادر کرنے کی اُمید رکھی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھوکہ دیں تا کہ وہ ان کی خواہش و چاہت کے مطابق حکم صادر فرمائیں اور طاقتور طبقہ کی طرفداری کرتے ہوئے فیصلہ کریں جو کہ زمانہ جاہلیت کی فرسودہ رسم ہے، جبکہ اللہ کے سوا کون ہے جو یقین والوں کے لئے بہتر فیصلہ کرنے والا ہو (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ)۔

اس بیان سے ان روایات میں مذکور مطالب کی تائید و تصدیق ہوتی ہے جو ان آیات کے شانِ نزول کی بابت وارد ہوئی ہیں کہ یہ آیات یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئیں کہ ان کے اشراف میں سے دو افراد نے جو کہ شادی شدہ تھے زنا و بدکاری کا ارتکاب کیا اور ان کے بزرگ علماء نے شادی شدہ افراد کے بدکاری کے ارتکاب پر تورات میں مذکور حکم یعنی سنگسار کرنے کو کوڑے مارنے میں تبدیل کرنا چاہا تو انہوں نے بعض افراد کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی شدہ شخص کی طرف سے زنا کے ارتکاب کا حکم دریافت کریں، اور اُنہیں تاکید کی کہ اگر وہ کوڑوں کی سزا بتائیں تو قبول کر لیں اور اگر سنگسار کرنے کی سزا بتائیں تو اسے رد کر دیں، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنگسار کرنے کی سزا بتائی تو وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روگرداں ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں ابن صوریا سے تورات کا حکم پوچھا

اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی مقدس آیات کی قسم دی کہ وہ حق بات کو کہ جو انہیں معلوم ہے نہ چھپائیں گے، چنانچہ ابن صوریا نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کی تصدیق کی اور کہا کہ تورات میں اس کا حکم سنگسار ہی مذکور ہے۔ بہرحال اس حوالہ سے تفصیلی بیان ''روایات پر ایک نظر'' میں عنقریب ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ اور شان نزول کی بابت وارد ہونے والی روایات کے باوجود یہ آیات اپنے معنی ومقصود میں مستقل حیثیت کی حامل ہیں جو کہ تمام قرآنی آیات کی عمومی صفت ہے کہ وہ خاص واقعات کی بابت نازل ہوتی ہیں مگر ان کے اسباب النزول کی حیثیت ان کے مصادیق کا حصہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن مجید ایک ایسی عظیم کتاب ہے جس کی ہادیانہ حیثیت زمان ومکان کی پابند نہیں اور نہ ہی کسی قوم وقبیلہ یا خاص واقعہ سے مختص ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے:۔

- سورۂ یوسف، آیت ۱۰۴

''اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ''

(وہ پوری کائنات کے لئے نصیحت ہی نصیحت ہے)

- سورۂ فرقان، آیت ۱

''تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا''

(بابرکت ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان نازل کیا تا کہ وہ عالمین کے لئے انذار کرنے والا ہو)

- سورۂ فصلت، آیت ۴۲

''وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ''

(اور وہ غلبہ والی وطاقتور کتاب ہے کہ نہ تو باطل اس کے سامنے سے اس پر حملہ کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے!)

اے رسول، دلبر داشتہ نہ ہوں!

''يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ''

(اے رسول! ان لوگوں کی وجہ سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں جو کفر میں تیزی دکھاتے ہیں)

اس آیت میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی وڈھارس دی گئی اور انہیں آیت میں مذکور افراد کی طرف سے جو

اذیت وتکلیف پہنچی اس پر دلبرداشتہ نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے اور وہ افراد درحقیقت وہی ہیں جو کفر میں تیزی دکھاتے ہیں یعنی نہایت تیزی کے ساتھ رواں دواں ہیں اور اس میں بھرپور انہماک و دل سپردگی کے ساتھ ہمہ تن مشغول رہتے ہیں کہ ان کے افعال واقوال سے کافرانہ عزائم یکے بعد دیگرے نمایاں ہوتے ہیں، پس وہ لوگ کفر میں بہت ہی تیزی کرتے ہیں، البتہ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ کفر میں مسارعت اور تیزی کرنے اور کفر کی طرف مسارعت وتیزی کرنے میں فرق ہے۔

آیت مبارکہ میں جملہ ''مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ'' ان لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کے بارے میں کہا گیا ''يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ'' (وہ کفر میں تیزی دکھاتے ہیں) یعنی منافقین! کہ جو زبان سے اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں جبکہ ان کے دلوں نے ایمان نہیں لایا۔

یہاں ایک علمی وادبی نکتہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ آیت میں خود منافقین کی بجائے ان کے کردار کو ذکر کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنجیدہ خاطر نہ ہونے کے حکم کی وجہ بیان کی گئی ہے جیسا کہ سابقہ جملہ میں ''يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ'' کے الفاظ سے نہی شدہ کی وجہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔ کہ آپ کو یہ لوگ کفر میں تیزی دکھانے کی وجہ سے رنجیدہ خاطر نہ کریں کیونکہ وہ زبانی ایمان لائے ہیں قلبی ایمان نہیں لائے اور وہ حقیقتاً مؤمن نہیں، اور اسی طرح وہ یہودی کہ جو آپ کے پاس آئے اور انہوں نے جو کچھ کہا، جملہ ''وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا'' سابقہ جملہ ''مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا'' پر عطف ہے جیسا کہ سیاق الکلام سے اس کا ثبوت ملتا ہے لہٰذا اسے مستقل جملہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بنابرایں جملہ ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ'' ادبی حوالہ سے خبر ہے جس کا متبداء محذوف ہے یعنی ''هم سماعون''۔

اور یہ جملے کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ وہماہنگ ہیں دراصل یہودیوں کی حالت کو بیان کرتے ہیں، جہاں تک اُن منافقین کا تعلق ہے جن کا تذکرہ ابتدائے آیت میں ہوا تو ان کی حالت ان اوصاف سے مطابقت نہیں رکھتی جیسا کہ ظاہر وواضح ہے۔

بنابرایں آیت میں جن یہودیوں کا تذکرہ ہوا ہے وہ ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ'' کا مصداق ہیں یعنی بہت زیادہ جھوٹ سننے والے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ جھوٹ ہے اسے سنتے رہتے ہیں کیونکہ اگر وہ یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ جھوٹ ہے اسے سنتے رہتے تو اس سننے کو بری صفت قرار نہ دیا جاتا، اس کا بری صفت ہونا اسی حوالہ سے ہے کہ وہ اسے جھوٹ جانتے ہوئے سنتے رہتے ہیں، اور آیت میں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ وہ لوگ ان لوگوں کے فائدہ کے لئے سنتے ہیں جو آپ کے پاس (اے رسول) ابھی نہیں آئے، اور وہ لوگ جو آپ کے پاس نہیں آئے اور یہ ان کے فائدہ میں جھوٹ سنتے رہتے ہیں وہ جو کچھ ان سے کہتے ہیں یہ ان کی ہر بات سنتے اور اسے قبول کرتے ہیں اور ان کی ہر بات پر عمل پیرا ہوتے ہیں، یہاں ایک اہم علمی نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت میں دوبارہ لفظ ''سَمّٰعُوْنَ'' ذکر ہوا ہے ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ''، ''سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ'' ان دونوں کے معنوں میں

فرق ہے، پہلے کا معنی کان دھرنا جبکہ دوسرے کا معنی قبول کرنا اور مان لینا ہے۔

جملہ ''یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ'' کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ کلمات کے اپنے اصل موارد و مقامات میں قرار پانے کے بعد اور باوجود ان میں تحریف کرتے ہیں، یہ جملہ ''لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ'' کی صفت ہے، اور اسی طرح جملہ ''یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا''

مذکورہ بالا تمام مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ یہودی آپس میں کسی دینی واقعہ میں سخت ابتلاء کا شکار ہو گئے کہ اس واقعہ کی بابت تورات میں حکم متعین و مذکور تھا مگر ان کے علماء نے حکم ثابت ہونے کے باوجود اسے تبدیل کر دیا پھر انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ میں فیصل قرار دیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی تحریف شدہ حکم دیں جو ان کے علماء نے دیا ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر اس کے علاوہ کوئی حکم دیں تو اس سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

اور جملہ ''وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا'' بظاہر جملہ معترضہ ہے کہ جس کے ذریعے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہودی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت آزمائش کا شکار ہیں۔ بنابراین حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطمئن رہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنجیدہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ و ضرورت نہیں اور نہ ہی اس چیز کی بابت دلبرداشتہ و دکھی ہونے کی ضرورت ہے جس سے بچاؤ کا کوئی چارۂ کار میسر نہیں۔

اور جملہ ''اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ'' میں یہ مطلب ملحوظ و مقصود ہے کہ ان کے دل بار بار فسق کے ارتکاب کی وجہ سے اپنی پہلی گندگی پر باقی ہیں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سیدھی راہ سے دور کر دیا ہے اور اللہ فاسق لوگوں کے علاوہ کسی کو سیدھی راہ سے دور نہیں کرتا۔

جھوٹ کے رسیا اور حرام خور:

''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ''

(بہت زیادہ جھوٹ سننے والے، حرام کھانے والے ہیں)

راغب اصفہانی نے کتاب المفردات میں لکھا ہے ''سحت'' اس جلد کو کہتے ہیں جسے اکھیڑ کر پھینک دیا جاتا ہے، خداوند عالم کا ارشاد ہے: ''فَیُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ'' ۔طٰہٰ، ۶۱۔ (ورنہ وہ تمہیں ایک عذاب کے ذریعے محو و نابود کر دے گا)

بعض حضرات نے اسے ت پر زبر کے ساتھ پڑھا ہے (فَیَسحَتَکُمْ) چنانچہ یوں کہا جاتا ہے: ''سحتہٗ و سحتہٗ'' اور اسی سے لفظ ''سحت'' بنا ہے کہ جس کا معنی ہر وہ برا عمل ہے جو اسے انجام دینے والے کے دین و مروت کو بوسیدہ جلد کی طرح اکھیڑ دیتا ہے اور وہ شخص معاشرہ میں بے دین و بے مروت کہلاتا ہے، لہٰذا جملہ ''اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کا عمل ان کے دین کو بوسیدہ جلد کی طرح ناقابل بنا دیتا ہے، اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وارد ہوا ہے: ''کل لحم نبت من سحت فالنار أولیٰ بہ'' (جو گوشت حرام سے بنے اس سے دوزخ کی آگ بہتر ہے)، اسی بناء پر رشوت کو ''سحت'' کہا جاتا ہے، (المفردات، ص ۲۲۵)

بنابراین ہر وہ مال جو حرام طریقہ سے کمایا جائے وہ ''سحت'' کہلائے گا، آیت مبارکہ میں سیاق الکلام سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ''سحت'' سے مُراد رشوت ہے اور اس مقام پر ''اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'' (حرام کھانے والے) کے الفاظ ذکر کرنے سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ یہودیوں کے جن علماء نے اپنے افراد کا وفد حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا انہوں نے اس سلسلہ میں رشوت لی تھی تاکہ اللہ کے حکم کو تبدیل کریں اور اس میں تحریف کریں کیونکہ اس حکم سے بعض اشراف کو نقصان پہنچ سکتا تھا کہ اس نے رشوت دے کر اپنے آپ کو اس سے بچا لیا، لہٰذا ان علماء نے رشوت لی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو تبدیل کر دیا۔

ان مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں جملہ ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'' مجموعی صورت میں پوری قوم کی صفت بیان کرتا ہے، لیکن اگر ان دو جملوں کو الگ الگ کر کے تقسیم کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ جملہ ''سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ'' ان یہودیوں کی صفت ہے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اور دیگر وہ تمام افراد ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں اور جملہ ''اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ'' دوسرے لوگوں کی صفت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہیں آئے۔ یعنی وہ علماء کہ جنہوں نے رشوت لی، خلاصہ کلام یہ کہ یہودیوں کے علماء رشوت کھانے والے ہیں اور ان کے عوام جو ان کی تقلید کرتے ہیں وہ ان کی جھوٹی باتوں کے سننے کے رسیا ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدائی اختیار:

''فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ''

(پس اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کے درمیان فیصلہ صادر کریں یا اُن سے منہ موڑ لیں)

اس جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ اگر یہودی آپ کے پاس آئیں اور آپ کو فیصل قرار دیں تو آپ

ان کی پیشکش کو قبول کر کے ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان کی پیشکش کو رد کر دیں اور ان سے منہ موڑ لیں، اور واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرف کو اختیار کریں اس میں ہی مصلحت و بہتری ہوگی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کا اختیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا کہ اپنی مرضی و رائے کے مطابق فیصلہ کریں۔

اس اختیار عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ان دو طرفوں میں سے دوسری طرف کو اختیار کریں یعنی ان کے درمیان فیصل بننا قبول نہ کریں اور ان سے منہ موڑ لیں تو ان پر کوئی ضرر عائد نہ ہوگا اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واضح طور پر آگاہ فرمادیا کہ اگر ان کے درمیان فیصلہ کریں تو انہیں صرف عدل وانصاف پر مبنی فیصلہ کرنا ہوگا۔

تو بالآخر ان تمام مطالب کی برگشت اس بات کی طرف ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا حکم ان کے درمیان جاری کریں، گویا یہ کہ یا اس کا حکم جاری کریں یا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور کوئی دوسرا حکم جاری نہ کریں۔

تعجب وحیرت کا اظہار:

''وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ''

(اور وہ کیونکر آپ کو اپنا فیصل قرار دیں گے جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے کہ جس میں اللہ کا حکم مذکور ہے، پھر وہ اس کے بعد روگردانی کریں گے اور وہ ہرگز ایمان لانے والے نہیں)

اس جملہ میں یہودیوں کے اقدام کو تعجب و حیرت کے انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ایسی اُمت ہے جس کے پاس کتاب بھی ہے اور شریعت بھی ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور کتاب و شریعت کا انکار کرتے ہیں، پھر وہ جس واقعہ میں مبتلا ہوئے ہیں اس کی بابت ان کی کتاب و شریعت میں اللہ کا حکم مذکور ہے اس کے باوجود وہ تورات میں مذکورہ حکم الٰہی سے منہ موڑتے ہیں اور آپ کو فیصل قرار دیتے ہیں جبکہ آپ بھی اللہ کا حکم ان کے درمیان جاری کریں گے، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ نہ تو کتاب اور نہ ہی اس میں مذکور حکم کو مانتے ہیں بلکہ اس سے روگردانی کرتے ہیں اور اس کے حکم سے دور بھاگتے ہیں۔

بنابرایں جملہ ''ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ'' کا معنی یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کی بابت تورات میں مذکور حکم خدا سے روگردانی کرتے ہیں، اور جملہ ''وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ تورات اور اس کے حکم پر ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے ہیں۔

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ''ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ'' سے مُراد یہ ہو کہ وہ اس حکم سے روگردانی کرتے ہیں جو حضرت پیغمبر

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے درمیان صادر کریں اور جملہ ''وَمَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ'' سے مُراد یہ ہو کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے ہی نہیں یعنی ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا فیصل قرار دینا ہی بتاتا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے نہیں، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ وہ نہ تورات کو مانتے ہیں اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے ہیں، لیکن جو معنی پہلے بیان کیا جاچکا ہے وہ سیاق الکلام سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اور آیت مبارکہ میں اس حکم کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو آج یہودیوں کے پاس موجود تورات میں مذکور ہے اور وہ وہی تورات ہے جسے عزراء نے ایران کے بادشاہ ''کورش'' کے حکم پر جمع کیا اور اس کی تدوین کی یہ کام اس وقت انجام پذیر ہوا جب بابل فتح ہوا اور اسرائیلیوں کو بابلیوں کی قید سے رہائی دی گئی اور کورش نے انہیں فلسطین واپس جانے اور ہیکل۔ یہودیوں کی وہ عبادتگاہ جسے بابلیوں نے منہدم کردیا تھا دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، یہی تورات حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں یہودیوں ہی کے پاس تھی اور آج بھی ان کے ہاتھوں میں ہے۔ قرآن مجید بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اسی تورات میں حکم خداوندی موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید اس بات کو بھی واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اس تورات میں تحریف وتبدیلی ہوئی ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جو تورات اس وقت یہودیوں کے پاس ہے اس میں بعض چیزیں اس اصلی تورات کی بھی موجود ہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی اور بعض امور تحریف شدہ وتبدیل شدہ بھی شامل ہیں خواہ اضافہ کی صورت میں ہوں یا کمی کی صورت میں ہوں، خواہ لفظوں میں تبدیلی کی صورت میں ہوں یا جگہ و مقام میں تبدیلی کی صورت میں ہوں یا کسی دوسری صورت میں ہوں، تو یہ وہ نظریہ ہے جو قرآن مجید سے تورات کی بابت معلوم ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں تفصیلی بحث سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

تورات کی صفات:

''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ''

(ہم ہی نے تورات کو نازل کیا ہے، اس میں ہدایت کی روشنی اور اسی کے مطابق انبیاء حکم صادر کرتے ہیں)

اس آیت میں سابق الذکر آیت میں مذکور مطالب کی بنیادی وجہ کو بیان کیا گیا ہے، یہ آیت اور اس کے بعد والی آیات مبارکہ اس مطلب کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں واُمتوں کے لئے ان کے درمیان پائے جانے والے زمانی فرق واختلاف کے باوجود شریعتیں ومخصوص احکام مقرر فرمائے ہیں اور ان احکام ودستورات کو ان کتابوں میں

ودیعت کیا جوان کی طرف بھیجیں تا کہ وہ ان کے ذریعے ہدایت یافتہ ہوں اور بصیرت وآ گاہی کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور اگر کسی حوالہ سے باہمی اختلافات کا شکار ہوں تو ان احکام وشرائع کی طرف رجوع کر کے اپنے اختلافات کو دور کرسکیں اور انبیاء وعلماء کو بھی انہی احکام کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا کہ وہ ان دستورات کی پاسداری کریں اور انہیں تحریف وتبدیلی سے بچا کر رکھیں، اور لوگوں سے شریعت ودستورِ الٰہی بیان کرنے کی اجرت وقیمت طلب نہ کریں کہ جس قدر بھی قیمت طلب کریں گے وہ بہت ہی کم ونہایت ناچیز ہوگی اور احکام بیان کرنے میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں اور اس کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ لائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سلسلہ میں تاکید فرمائی اور انہیں اپنی ذاتی نفسانی خواہشوں کی پیروی سے ممانعت کا نہایت شدید حکم دیا کہ وہ دنیا پرستوں کی فتنہ انگیزیوں سے بچ کر رہیں، اللہ تعالیٰ نے جو مختلف احکام قرار دیئے اس کی وجہ قوموں اور ادوار کا مختلف ہونا ہے یعنی ہر دور اور ہر قوم کے لئے مختلف احکام اس لئے صادر فرمائے تا کہ اللہ تعالیٰ کا سلسلہ امتحان پورا ہوسکے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ صلاحیتیں مختلف ہوجاتی ہیں اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دو افراد استعداد میں شدت وضعف کی وجہ سے کسی ایک علمی وعملی تربیتی سلسلہ سے یکساں بہرہ ور نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر شخص کو حصولِ کمال کے لئے خاص نظام ومخصوص سلسلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

بنابرایں جملہ ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہدایت کی کچھ چیزیں ہیں جن سے فیض پایا جاسکتا ہے اور کچھ نور ہے جس کے ذریعے معارف واحکام سے آ گاہی حاصل ہوسکتی ہے اور یہ کام بنی اسرائیل کی حالت واستعداد اور صلاحیت پر موقوف ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں بنی اسرائیل کے عمومی اخلاق، قومی خصوصیات اور ان کی قوتِ فہم وادراک کو واضح طور پر بیان فرمادیا ہے لہٰذا اس نے ان کی طرف ہدایت کی کچھ مقدار اور کچھ نور ہی بھیجا کیونکہ ان کا تاریخی پس منظر وقومی تشخص اور کم استعداد ہونا اسی کا متقاضی تھا۔

چنانچہ ارشادالٰہی ہے:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۴۵

''وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ''

(اور ہم نے الواح میں ہر چیز کی بابت نصیحت لکھ دی اور ہر چیز کی تفصیل بیان کردی ہے)

اور جملہ ''يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا'' میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی توصیف میں اسلام کا حوالہ دیا جو کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردینے سے عبارت ہے یعنی اللہ کا ہوجانا، جو کہ اللہ کے نزدیک اصل دین ہے، یہاں انبیاء کی توصیف میں ان کے اسلام کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے تا کہ واضح ہوجائے کہ دین ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام، یعنی اللہ کے

حضور سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو اسی سے وابستہ کرنا اور اس کی بندگی و عبادت سے ہرگز منہ نہ موڑنا، بنابرایں کسی مومن کو روا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے اور اس سے وابستہ ہونے کے باوجود اس کے کسی حکم و دستور اور فرمان سے سرتابی کرے۔

اور جملہ ''وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ'' کا عطف سابقہ جملہ میں ''يَحْكُمُ'' سے ہے یعنی ''يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ'' تورات کے مطابق حکم و فیصلہ کرتے ہیں ربانیون اور احبار، ربانیون یعنی وہ علماء جو علم و عمل میں صرف خدا سے وابستہ و پیوستہ ہو کر رہ گئے ہیں یا وہ حضرات کہ جن کے علوم کی بناء پر لوگوں کی تربیت کی ذمہ داری اُن کے سپرد ہوئی ہے اور ''احبار'' سے مراد یہودیوں کے نہایت بزرگ و نامور اور تورات کے ماہر ترین علماء ہیں جو صرف وہی حکم و فیصلہ کرتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حکم دیا اور ان سے چاہا کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت و پاسداری کا فریضہ ادا کریں اور اسی وجہ سے کہ وہ اللہ کی کتاب کے عالم اور اس کے معالم و معارف سے کامل آگاہی رکھنے والے ہیں اور اللہ نے انہیں اپنی کتاب کے حقائق کی حفاظت کا ذمہ سونپا ہے لہٰذا اُنہیں کتاب اللہ پر گواہ و نگران کہا گیا تاکہ اللہ کی کتاب میں کوئی تحریف و تبدیلی واقع نہ ہونے پائے کیونکہ تورات ان کے سینوں میں محفوظ ہے''

بنابرایں جملہ ''وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ'' درحقیقت جملہ ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا'' کے نتیجہ کے طور پر ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ انہیں اسے حفظ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو وہ اس کے حافظ ہونے کی بناء پر اس پر شاہد و نگران ہیں کہ اس میں کوئی تحریف و تبدیلی واقع نہ ہونے پائے، اور یہاں شہادت (وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ) کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے آیت کا سیاق بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے البتہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں شہادت سے مراد ان کی طرف سے یہ گواہی دینا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم و فیصلہ دیا ہے وہی تورات میں موجود اور ثابت ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں شہادت و گواہی سے مراد یہ ہے کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے کہ جو یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، لیکن سیاق الکلام سے ان دو آراء کی تصدیق نہیں ہوتی اور ان کی صحت پر کوئی کلامی اشارہ موجود نہیں اور جہاں تک اس جملہ کا تعلق ہے ''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا'' (پس تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو) تو اس کا تعلق پہلے جملہ سے ہے جس میں کہا گیا ہے: ''اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا'' لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ جب ہم نے تورات کو نازل کیا جو کہ ہماری طرف سے خاص مقام و منزلت کی حامل ہے اور اس میں شریعت و احکام مذکور ہیں کہ جن کے مطابق انبیاء، ربانیون، علماء اور احبار حکم و فیصلہ صادر کرتے ہیں تو تم اس میں سے کچھ بھی نہ چھپاؤ اور نہ ہی کسی خوف یا طمع کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی لاؤ، خوف سے مراد یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں سے ڈرو اور اپنے پروردگار کو بھلا دو بلکہ صرف اللہ کی خشیت دل میں رکھو تاکہ تمہیں لوگوں کا خوف لاحق ہی نہ ہونے پائے اور طمع سے مراد یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دو خواہ وہ مال ہو یا دنیاوی جاہ و جلال ہو کیونکہ وہ

سب زوال پذیر اور ختم و نابود ہونے والا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ جملہ ''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا'' کا تعلق معنی کے لحاظ سے جملہ ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا'' سے ہو کیونکہ جملہ ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا'' کا مرادی معنی یہ ہے کہ ان سے کتاب کو حفظ کرنے کا میثاق لیا گیا ہے یعنی ہم نے اُن سے عہد لیا کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت کریں گے اور ہم نے انہیں اس پر گواہ قرار دیا کہ وہ اسے تبدیل نہیں کریں گے اور اس کے اظہار میں میرے علاوہ کسی کی خشیت وخوف دل میں نہ لائیں گے اور نہ ہی میری آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچیں گے چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیتوں سے ملتا ہے:۔

○ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۸۷

''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا''

(اور جب ہم نے عہد و پیمان لیا اُن لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ وہ اسے واضح طور پر لوگوں کو بیان کریں گے اور اسے نہیں چھپائیں گے مگر انہوں نے اس عہد و پیمان کو پس پشت ڈال دیا اور اسے نہایت کم قیمت پر بیچ دیا)

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۰

''فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَیَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا٘ وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ١ؕ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِیْهِ١ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ١ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ وَالَّذِیْنَ یُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ١ؕ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ''

(پھر ان کے بعد نالائق لوگ ان کے جانشین بن کر کتاب کے وارث بن بیٹھے، وہ اس پست دنیا کا مال بٹورتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں بہت جلد معاف کر دیا جائے گا، اور اگر اس جیسی متاع و دولت ان کے پاس مزید آجائے تو وہ اسے بھی اچک لیں گے، کیا ان سے کتاب کا عہد و پیمان نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ نہ کہیں گے حالانکہ وہ کتاب میں جو کچھ بھی ہے اُسے بخوبی پڑھ چکے ہیں، اور آخرت کا ٹھکانہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے بہتر ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ اور جو لوگ کتاب سے وابستہ رہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم نیک وصالح لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے)۔

بہرحال یہ دوسرا معنی زیادہ موزوں اور بعد والے جملہ میں جو تاکید و شدت آمیز انداز اختیار کیا گیا ہے اس سے بھرپور ہماھنگ ہے کہ جس میں یوں ارشاد ہوا:

''وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ''

(اور جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جسے اللہ نے نازل کیا ہے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں)۔

قتل اور دیگر جرائم کا حکم:

''وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۔۔۔ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ''

(اور ہم نے تورات میں ان کے لئے واجب قرار دیا کہ جان کے بدلے جان ۔۔۔ اور زخموں کا قصاص ہے)

آیت کا سیاق الکلام، بالخصوص جملہ ''وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ'' اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ یہاں مختلف جرائم کے احکام بیان کئے گئے ہیں مثلاً قتل، کوئی عضو کاٹنا، زخمی کرنا وغیرہ اور آیت میں جو تقابلی ذکر ہوا ہے یعنی ''النَّفْسَ بِالنَّفْسِ''، ''الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ''، ''الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ''، ''الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ''، ''السِّنَّ بِالسِّنِّ'' تو اس میں طرفین ملحوظ ہیں یعنی وہ عضو کہ جو متاثر ہوا کہ جس کا قصاص ہے اور دوسرا وہ عضو کہ قصاص کے طور پر جس پر حکم جاری ہوگا، پہلے کو ''مقتص لهٗ'' اور دوسرے کو ''مقتص بہ'' کہتے ہیں، اس تقابلی ذکر سے مراد و مقصود یہ ہے کہ قصاص کے باب میں ''نفس'' یعنی جان ''نفس'' کے برابر ہے، اسی طرح آنکھ آنکھ کے اور ناک ناک کے معادل و برابر ہے، یعنی جس عضو کو ضائع کیا گیا اس کے بدلے اسی جیسے عضو پر قصاص کا حکم جاری ہوگا، اور یہاں حرف ''ب'' (بِالنَّفْسِ، بِالْعَيْنِ، بِالْأَنْفِ، بِالْأُذُنِ، بِالسِّنِّ) تقابل کا معنی دیتا ہے جیسا کہ خرید و فروخت میں یوں کہا جاتا ہے: ''بعت هٰذا بهٰذا'' (میں نے یہ چیز اس چیز کے بدلے میں بیچی)، تو نتیجہ سخن یہ ہے کہ ان تمام جملوں کہ جو ایک ہی سیاق میں ذکر ہوئے ہیں کا معنی یہ ہوگا کہ مقتول کی جان کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے گی (اسے قتل کیا جائے گا) اور جس نے کسی کی آنکھ نکالی ہو، اسے پھوڑا اور ختم کیا ہو، اس کے بدلے میں اس کی آنکھ نکال دی جائے گی، جس نے کسی کی ناک ضائع کی ہو اس کے بدلے میں اس کی ناک ضائع کی جائے گی، اسے کاٹا جائے گا اور جس نے کسی کا کان کاٹا ہو تو اس کے بدلے اس کا کان کاٹا جائے گا اور اسی طرح دانت کے بدلے دانت نکالا جائے گا اور زخموں کا قصاص ان کی مقدار و کیفیت کے مطابق ہوگا، خلاصہ یہ کہ جان اور اعضاء بدن میں سے ہر ایک کا قصاص اس جیسے عضو سے لیا جائے گا تا کہ عدل قائم ہو، شاید اس مفسر کا مقصد و مراد بھی یہی ہو کہ جس نے کہا کہ فہم المعنی کے لئے یوں فرض و تصور کیا جائے کہ ''النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'' دراصل ''النفس مقصة بالنفس، یا مقتولة بالنفس'' یعنی جان کا قصاص جان کے ذریعے لیا جائے گا یا جان کو جان کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اسی معیار پر دیگر جملے قرار دیئے جائیں گے، البتہ اس طرح فرض کرنے سے جملوں کے معانی تو واضح ہو سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے بغیر بھی جملے مکمل ہیں اور اپنے معانی ظاہر کرتے ہیں، اسے ادبی اصطلاح میں ظرف لغو کہتے ہیں کہ جو ظرفِ مستقر کے مقابلے میں آتا ہے جس میں اس کا متعلق تقدیری یعنی فرضی و محذوف تصور کیا جاتا ہے۔

بہر حال آیۂ مبارکہ میں اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ یہ حکم اس حکم

سے مختلف ہے جس میں یہودیوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا فیصل قرار دیا تھا چنانچہ سابقہ آیات بھی اسی مطلب کے بیان پر مشتمل ہیں کیونکہ اس آیت کا سیاق الکلام جملہ ''اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ'' کے ذریعے مورد تجدید واقع ہوا ہے، اور یہ حکم موجودہ تورات میں بھی مذکور ہے جو کہ اس وقت یہودیوں کے ہاں رائج ہے، اس کا مزید تذکرہ ''روایات پر ایک نظر'' میں عنقریب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

معافی: کفارۂ گناہ!

''فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ''

(پس جو اسے معاف کردے تو یہ اس کے لئے کفارۂ گناہ ہوگا)

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی مجرم یا قاتل کو مقتول کے وارث یا وہ شخص جو زخمی ہوا یا آنکھ یا کان یا ناک یا زبان وغیرہ سے محروم ہوا اس سے قصاص لینے سے درگزر کرے اور اپنے قصاص لینے کے حق سے دستبردار ہو کر اسے معاف کردے تو اس کا ایسا کرنا اس کے گناہوں یا مجرم کے جرم کا کفارہ بن جائے گا۔

ظاہر الکلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فہم المعنی کے لئے یوں فرض کرنا ہوگا: ''فان تصدق به من له القصاص فهو كفارة له، وان لم يتصدق فليحكم صاحب الحق بما انزله الله من القصاص، ومن لم يحكم بما انزل الله فاؤلئك هم الظالمون'' (پس اگر وہ شخص معاف کردے کہ جسے قصاص کا حق ہے تو اس کا یہ عمل اس کے لئے کفارہ قرار پائے گا، اور اگر وہ معاف نہ کرے تو حقدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قصاص کی بابت جو حکم اللہ نے صادر فرمایا ہے وہی صادر کرے، اور جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق حکم صادر نہ کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں)۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) جملہ ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ'' میں حرف واو نیا جملہ نہیں بلکہ جملہ ''فَمَنْ تَصَدَّقَ'' پر عطف ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے جملہ ''فَمَنْ تَصَدَّقَ'' پر حرف فا تفریع کے لئے ہے یعنی مجمل پر مفصل کے طور پر ہے۔ پہلے اجمالی بیان سے تعلق رکھنے والا تفصیلی بیان ہے چنانچہ اس کی مثال سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کہ جو قصاص کے حکم پر مشتمل ہے اس میں موجود ہے جس میں یوں ارشاد ہوا:

''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ''

(پس جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کردیا جائے تو اس کی تلافی نیکی کے ساتھ کرنی چاہیے اور اچھائی

کے ساتھ اس کا حق اسے ادا کرنا چاہیے)

(۲) جملہ ''وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ'' اس طرح سے ہے کہ علت کو اس کے معلول کی جگہ قرار دینے کے طور پر ہے اور فہم المعنی کے لئے یوں فرض کیا جائے گا ''وان لم یتصدق فلیحکم بما انزل الله فان من لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون'' (اور اگر وہ معاف نہ کرے تو اسے چاہیے کہ اسی کے مطابق حکم کرے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے کیونکہ جو اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں)۔

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کا حوالہ:

''وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ''

(اور ہم نے ان کے پیچھے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو روانہ کیا جو کہ اپنے ماقبل نازل ہونے والی تورات کی تصدیق کرنے والا ہے)

''قَفَّيْنَا'' کا مصدر تقفیہ ہے جس کا معنی کسی چیز کو کسی چیز کے پیچھے قرار دینا ہے اور یہ ''قفا'' (گردن کے پیچھے) سے بنا ہے، اور ''آثار'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''اثر'' ہے جس کا معنی نشان ہے کہ جس سے اثر والے شخص کا پتہ چلتا ہے (نقش قدم، نشانِ قدم) اسے عام طور پر قدم کے اس نشان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو زمین پر پاؤں مارنے سے بنتا ہے، ''اٰثَارِهِمْ'' میں ضمیر ''ھم'' کی بازگشت انبیاء کی طرف ہے، یعنی انبیاء کے پیچھے پیچھے!

بنابرایں جملہ ''وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ'' استعارہ بالکنایہ ہے جس سے مقصود اس مطلب کا اثبات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اسی راہ وروش کو اپنایا جسے ان سے پہلے انبیاءؑ نے اختیار کیا تھا جو کہ عبارت ہے توحید کی طرف دعوت دینے اور اپنے آپ کو اللہ سے وابستہ و پیوستہ کرنے سے!

اور جملہ ''مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'' پہلے جملے کی وضاحت اور اس مطلب کی طرف اشارہ کے طور پر ہے جو حضرت عیسیٰؑ کا مشن و دعوت الی الحق بعینہ وھی ہے جو حضرت موسیٰؑ کی تھی اور ان دونوں کے درمیان اصلاً و اصولاً کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

اور جملہ ''وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'' اور اس سے مربوط آیات کے سیاق الکلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعتوں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں کا باہم تذکرہ مقصود ہے تاکہ یہ حقیقت آشکار ہو کہ وہ ایک دوسری سے بھرپور ہم آہنگ بلکہ کامل ہمرنگ و ہم

معنی ہیں، اس سے تین نتائج حاصل ہوتے ہیں:

(۱) آیت مبارکہ میں جس انجیل کا ذکر ہے اس کا لغوی معنی بشارت وخوشخبری ہے وہ ایک کتاب تھی جو حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی، وہ صرف ایک خوشخبری نہ تھی کہ جو کتاب کے بغیر ہو البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اس کے حضرت عیسیٰ پر نازل ہونے کے بارے میں تفصیلات ذکر نہیں کیں جیسا کہ تورات اور قرآن کے بارے میں تفصیلات ذکر کیں چنانچہ تورات کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۴۵

''قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ''

(اس نے کہا اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کی ذمہ داریوں کے ساتھ لوگوں میں سے چنا ہے پس جو کچھ میں تجھے دوں اُسے لے لو اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ اور ہم نے اس کے لئے الواح میں ہر چیز سے میں کچھ لکھا جو کہ نصیحت ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے)

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۵۴

''اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِىْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ''

(اس نے الواح کو لے لیا اور ان تحریروں میں ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب کی نافرمانی سے ڈرتے رہتے ہیں)

اور قرآن مجید کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ شعراء، آیت ۱۹۵

''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيْنٍ''

(روح الامین نے اسے تیرے دل پر واضح عربی زبان میں اُتارا تا کہ تو انذار کرنے والوں میں شامل ہو جائے)

○ سورۂ تکویر، آیت ۲۱

''اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ''

(یقیناً یہ باعزت پیغمبر کی بات ہے کہ جو عرش والے کے نزدیک طاقتور، محترم اطاعت کئے جانے والا ہے کہ امین بھی ہے)

○ سورۂ عبس، آیت ۱۶

''فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ''

(مکرم بلند مرتبہ پاکیزہ صحیفوں میں، عظیم الشان نیک سفیروں کے ہاتھوں میں ہے)

جہاں تک انجیل کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے نازل کرنے اور اس سے مربوط مطالب کی بابت کچھ بھی ذکر نہیں فرمایا البتہ صرف اس کے حضرت عیسیٰؑ پر نازل کئے جانے کا تذکرہ اس آیت میں سابقہ آیت تورات کے حضرت موسیٰ پر نازل ہونے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل کئے جانے کے تذکرہ کے مقابل میں ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انجیل ان دو آسمانی کتابوں، تورات اور قرآن کے علاوہ ایک مستقل کتاب ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انجیل کی توصیف میں ارشاد فرمایا ''فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ'' (اس میں ہدایت اور نور ہے) یہ بات تورات کی توصیف میں کہے جانے والے الفاظ کے بالمقابل ہوئی ہے کہ جن میں یوں ارشاد ہوا: ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ'' (بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور نور ہے) اس میں یہ بیان مراد و مقصود ہے کہ یہ کتاب معارف و احکام پر مشتمل ہے، البتہ اس آیت میں دوبارہ یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں ''وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (اور ہدایت اور تقویٰ والوں کے لئے نصیحت ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے جس ہدایت کا ذکر ہوا وہ اس ہدایت سے مختلف ہے جس کی تفسیر موعظہ و نصیحت سے کی گئی ہے۔ لہٰذا پہلی ہدایت سے مراد وہ معارف ہیں جن کے ذریعے اعتقادات کے باب میں ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور دوسری ہدایت سے مراد وہ معارف ہیں جو دین میں تقویٰ کی راہ دکھاتے ہیں۔

بنا بر ایں لفظ ''نُوْرٌ'' کا مصداق صرف احکام و شرعی دستورات کے سوا کچھ نہ ہوگا چنانچہ اس سلسلہ میں غور و فکر کرنے سے اسی مطلب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ ایسے امور ہیں جن کے ذریعے زندگی بسر کرنے کے واضح اصول و طریقے اور طرز ہائے عمل کی نشاندہی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

○ سورۂ انعام، آیت ۱۲۲

''اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ''

(کیا وہ شخص کہ جو مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے)

اس سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ تورات اور انجیل میں ہدایت سے مراد بعض اعتقادی معارف ہیں مثلاً توحید و معاد اور دونوں کی بابت ''نور'' سے مراد شرعی دستورات اور احکام ہیں اور دوبارہ انجیل کی توصیف میں ھُدًی کے لفظ سے وعظ و نصیحت کی خاص صورتیں ہیں، واللہ اعلم۔ اور آیت میں لفظ ''ھُدًی'' کے دوبار ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ دوسری مرتبہ ''ھُدًی'' پہلی مرتبہ ذکر کئے جانے والے لفظ ''ھُدًی'' سے مختلف اور لفظ ''وَّمَوْعِظَةً'' عطف تفسیر

کے طور پر ہے، واللہ اعلم۔

(۳) انجیل کی توصیف میں مذکور جملہ ''وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ'' تاکید وغیرہ کی غرض سے دوبارذکر نہیں کیا گیا بلکہ اس سے اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ انجیل تورات ہی کے احکام اور اس کی پیروی کا تسلسل ہے لہٰذا انجیل کا تورات کے احکام کی تصدیق اور اس میں مذکور دستورات خداوندی پر عمل کرنے کی دعوت و تاکید کے علاوہ کوئی ہدف و مقصد نہیں سوائے ان چند امور کے کہ جن کے حوالہ سے حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے بارے میں استثنائی تذکرہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت ۵۰

''وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ''

(اور تاکہ میں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کروں جو تم پر حرام کی گئی ہیں)

اس کا ثبوت قرآن مجید کی توصیف میں اس جملہ میں پایا جاتا ہے جو اگلی آیت میں مذکور ہے:

''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ''

(اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے کہ جو اس سے پہلی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس پر حاوی ہے)

اس سلسلہ میں مزید وضاحت عنقریب ذکر ہوگی۔

جملہ ''وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے اور یہ آیت اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کہ انجیل کہ جو حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی اس میں تقوئے دینی کی بابت خاص توجہ مبذول ہوئی ہے جبکہ وہ ان اعتقادی معارف اور عملی احکام پر بھی مشتمل ہے جو تورات میں موجود و مذکور ہیں، البتہ یہاں یہ اہم نکتہ قابل ذکر ہے کہ عصر حاضر میں جو تورات یہودیوں کے ہاں رائج ہے اگرچہ قرآن مجید نے اس کی مکمل تصدیق نہیں کی اور اسی طرح ان چار انجیلوں کی بھی قرآن مجید میں مکمل تصدیق نہیں ہوئی جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں اگرچہ وہ چار انجیلیں اس انجیل کے علاوہ اور مختلف ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے کہ وہ خود حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان تمام کتب میں اس مطلب کی تائید و تصدیق ملتی ہے کہ ان میں تقوئے دینی کو خاص طور پر موردِ توجہ قرار دیا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں مزید مربوطہ مطالب کا اشاراتی تذکرہ عنقریب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ کا حکم ہی اصل و اساس ہے:

''وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ''

(اور اہل انجیل پر لازم ہے کہ وہ اسی کے مطابق حکم و فیصلے کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے)

اس آیت میں عیسائیوں پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام اعمال انجیل میں مذکور احکام الٰہیہ کے مطابق انجام دیں اور جو کچھ اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اسی کے مطابق ہر حکم و فیصلہ کریں جو بات یقینی طور پر ثابت و مسلم ہے وہ یہ کہ انجیل میں تورات اور اس کے دستورات و احکام کی تصدیق نازل ہوئی ہے سوائے بعض اُن احکام کے کہ جو منسوخ کئے گئے کہ جن کا ذکر اس انجیل میں موجود ہے جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی کیونکہ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انجیل نے تورات کے احکام و دستورات کی تصدیق کر دی ہے اور بعض وہ چیزیں جو تورات میں حرام کی گئی تھیں انہیں حلال کر دیا ہے لہٰذا تورات کے دیگر وہ احکام کہ جو حلال کئے گئے امور و اشیاء کے علاوہ ہیں ان پر عمل کرنا خود انجیل میں مذکور احکام الٰہی پر عمل کرنا کہلائے گا، اور یہ بات واضح و روشن ہے۔

ان مطالب سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ قول ضعیف و نادرست ہے جو بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ انجیل اسی طرح تفصیلی احکام پر مشتمل ہے جس طرح تورات مشتمل ہے، اس قول کے نادرست ہونے کی وجہ واضح ہے۔

اور جہاں تک جملہ ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' (اور جو شخص اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں) کا تعلق ہے تو اس میں اس مطلب کی شدت کے ساتھ تاکید ہوئی ہے جو ''وليحكم'' میں ملحوظ و مقصود ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس جملہ کو تین مرتبہ ذکر فرمایا ہے: دو مرتبہ یہودیوں کے تذکرہ میں اور ایک مرتبہ عیسائیوں کے تذکرہ میں قدرے فرق کے ساتھ! اور وہ یوں ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (اور جو اللہ کے حکم کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ کافر ہیں)، ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' (اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں) اور ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' (اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں)، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کفر، ظلم اور فسق کا حامل قرار دیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نصاریٰ کے تذکرہ میں فسق جبکہ یہودیوں کے تذکرہ میں کفر و ظلم کی نسبت کیوں دی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ نے توحید کو تثلیث میں بدل دیا یعنی ایک خدا کی بجائے تین خداؤں کے قائل ہو گئے اور انہوں نے اپنے بزرگ دینی رہنما پولس کے کہنے پر تورات کے احکام کو مسترد کر دیا اور عیسیٰ مسیح کے دین کو موسیٰ کے دین سے قطعی مختلف و الگ مستقل دین قرار دے دیا کہ جس میں حضرت مسیح کے اپنے آپ کو قربان کر دینے سے تمام احکام کے ختم و غیر مؤثر ہونے کو بنیادی حیثیت کا حامل قرار دیا گیا۔

بنا برایں نصاریٰ توحیدی دین کے دائرہ سے باہر نکل گئے اور معمولی تاویل کا سہارا لے کر شریعت الٰہیہ کے منکر

ہو گئے چنانچہ وہ خدائی دین حق سے فاسق ہو گئے، کیونکہ فسق کا معنیٰ کسی چیز کا اپنی اصل جگہ سے باہر نکل جانا ہے جیسا کہ گٹھلی کھجور کے چھلکے سے باہر آ جاتی ہے اسی وجہ سے ان کے تذکرہ میں ''فاسقون'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے تو وہ حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے دین کی بابت کسی غلط فہمی و لاعلمی کا شکار نہ تھے بلکہ انہوں نے علم و آگاہی کے باوجود تورات کے احکام و معارف کو رد کر دیا جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا صریح انکار یعنی کفر اور ان کی بابت ظلم کرنے سے عبارت ہے لہٰذا ان کے تذکرہ میں کفر اور ظلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں (کافرون، ظالمون)۔

یہاں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ تین آیات کہ جن کے آخر میں یوں ارشاد ہوں ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ''، ''فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ''، ''فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ'' مطلق ہیں یعنی ان میں جو مطلب ذکر ہوا ہے وہ عمومیت رکھتا ہے، کسی قوم کے ساتھ مختص نہیں اگرچہ اس مقام پر اس کا انطباق اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پر ہے لیکن ہر وہ شخص یا قوم جو ایسا کرے اس پر اس کا اطلاق ہوگا یعنی جو بھی اللہ کے نازل کردہ احکام کے علاوہ کسی چیز پر مبنی حکم کرے وہ ظالم، کافر اور فاسق کہلائے گا۔

البتہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ احکام کے علاوہ حکم و فیصلہ کرے اس کے کفر کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جو قاضی اللہ کے نازل کردہ کے احکام علاوہ فیصلہ کرے وہ کافر ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ جو حاکم اللہ کے نازل کردہ کے علاوہ حکومت و حکمرانی کرے وہ کافر ہے۔ بعض حضرات نے اس شخص کو کافر قرار دیا ہے جو سنّت کو پس پشت ڈال کر بدعت کی راہ اپنائے۔ بہر حال یہ خالص فقہی مسئلہ ہے لیکن مقام کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ حق ہے کہ کسی بھی شرعی حکم کی مخالفت یا اس دینی امر کی مخالفت اور اسے رد کر دینا کہ جس کا دینی اصولوں میں ثابت ہونا معلوم ہو وہ کفر کا باعث بنتا ہے اور اگر اس کا دینی امر ہونا ثابت و معلوم ہو لیکن اسے رد نہ کریں بلکہ صرف عمل میں اسے نظر انداز کریں اور اس کی نافرمانی کریں تو ایسا کرنا فسق کا باعث ہے لیکن اگر اس کے دینی ثبوت کا علم نہ ہو بلکہ صرف اسے رد کریں تو ایسا کرنا کفر یا فسق کا موجب نہ ہوگا کیونکہ وہ قاصر و ناتواں ہے مقصر نہیں یعنی جان بوجھ کر اور علم و آگاہی کے باوجود اسے رد نہیں کیا لیکن اگر اس کے مقدمات اور بنیادی تقاضوں میں کوتاہی و لاپرواہی اور جان بوجھ کر بے توجہی سے کام لیا تو مقصر ہوگا، بہر حال مزید معلومات کے لئے فقہی کتب کا مطالعہ کریں۔

نزول قرآن کا تذکرہ:

''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ''

(اور ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی حق کے ساتھ، جو کہ ہر اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی اور ان پر نگران ونگہبان ہے)

لفظ ''مُهَيْمِنًا'' جو کہ ''هيمنة'' سے مشتق ہے اور ھیمنت کا معنی تسلط ہے یعنی کسی چیز کا دوسری چیز پر تسلط و بالادستی کا حامل ہونا ہے البتہ یہ اس کے استعمالی موارد سے ماخوذ معنی ہے لیکن ہر طرح کے تسلط کو ہیمنت نہیں کہتے بلکہ کسی چیز کا دوسری چیز کی حفاظت ونگہبانی اور اس میں گوناگوں تصرف کر سکنے کے حق کا حامل ہونے کو ہیمنت کہتے ہیں اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے کہ اسے ''مُهَيْمِنًا'' کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ماقبل آسمانی کتب کے تمام معارف ومعالم اور حقائق و احکام کا واضح وکھلا بیان ہے اور وہ اس طرح سے کہ وہ ان کتب میں مذکور بنیادی اصولوں کی حفاظت کرتا ہے جبکہ ان کے وہ فروع منسوخ کرتا ہے کہ جن کا منسوخ کیا جانا اس لئے ضروری ہے کہ ان میں تبدیلی کا امکان پایا جاتا ہے تا کہ وہ احکام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے تکامل وترقی کے راستہ پر گامزن ہونے کے تمام مراحل سے ہم آھنگ ہو سکیں، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ اسرائیل، آیت ۹

''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ''

(یقیناً یہ قرآن مضبوط ترین راہ ومقصد کی طرف رہنمائی کرتا ہے)

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۶

''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''

(ہم جس آیت کو بھی منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلواتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں)

○ سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷

''اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ''

(وہ پیروی کرتے ہیں نبی اُمّی کی کہ جس کا نام اپنے پاس موجود تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک وگندی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان سے وہ بوجھ دور کرتا ہے اور ان سنگینیوں کو دور کرتا ہے جو ان کو گھیرے ہوئے تھیں، پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے اور اس کا احترام

کیااور اس کی مدد کی اور اس نور کی بھی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا بس وہی فلاح و کامیابی پانے والے ہیں)

اس مقام پر ایک اہم نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ جملہ ''وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ'' ماقبل جملہ ''مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ'' کا وضاحتی تکمیل کا حامل ہے کیونکہ اگر یہ جملہ یہاں ذکر نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ قرآن کے تورات و انجیل کی تصدیق کرنے والا ہونے سے یہ سمجھا جاتا کہ وہ صرف ان کتب میں مذکور احکام و دستورات کے باقی اور اس دور میں بھی کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر موثر ہونے کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس جملہ یعنی ''وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ'' کے ذریعے اس کے نگہبان و نگران ہونے کو ذکر کر کے اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کتب میں مذکور معارف و دستورات برحق اور اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ کو ان میں ہر طرح کی تبدیلی و تصرف کرنے کا حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو نسخ یا تکمیل کے ذریعے ایسا کر سکتا ہے جیسا کہ ذیلی جملہ سے اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے: ''وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ'' (اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز کے بارے میں آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں دی)۔

بنابرایں جملہ ''مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ'' کا معنی ان کتابوں میں مذکور معارف واحکام کی تائید وتصدیق کرنے والا ہے جو کہ اس اُمت کی حالت وتقاضوں سے ہم آہنگ ہو، لہٰذا ان میں نسخ وتکمیل اور اضافہ کئے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ امور اس کے تصدیق کرنے والا ہونے سے منافات نہیں رکھتے جیسا کہ حضرت مسیحؑ یا ان کی انجیل کا تورات کی تصدیق کرنے والا ہونا ہے جبکہ حضرت مسیحؑ نے تورات میں بعض ان چیزوں کو کہ جو حرام قرار دی گئی تھیں حلال کیا اور اس کا تذکرہ درج ذیل آیت میں ہوا ہے:

○ سورۂ آل عمران، آیت ۵۰

''وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ''

(اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو مجھ سے پہلے کتاب آئی یعنی تورات! اور تا کہ میں بعض ان چیزوں کو تمہارے لئے حلال کروں جو تم پر حرام کی گئی ہیں)

واضح وتاکیدی فرمان:

''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ''

(پس ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں)

اس آیت میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں یعنی جب آپ کے پاس شریعت آچکی ہے کہ جو کتاب قرآن میں برحق نازل ہوئی ہے اور وہ سراسر حق ہے خواہ اپنی ماقبل آسمانی کتب کے عین مطابق ہو یا مختلف ہو کیونکہ وہ سابقہ کتب پر نگران و نگہبان ہے لہٰذا آپ پر لازم و ضروری ہے کہ اہل کتاب کے درمیان جیسا کہ سابقہ آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے یا سب لوگوں کے درمیان جیسا کہ بعد والی آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جو اللہ نے آپ کی طرف نازل کیا ہے کوئی فیصلہ نہ کریں آپ کا فیصلہ ما انزل اللہ کے عین مطابق ہونا چاہیے اور آپ اس حق کو جو آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے آچکا ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

مذکورہ بالا مطالب سے ظاہر ہے کہ جملہ ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ'' سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ اس میں ''بَيْنَهُمْ'' کا تعلق اہل کتاب سے ہو یا تمام انسانوں سے ہو، لیکن ضمیر ''ھم'' کی بازگشت کا اہل کتاب کی طرف ہونا بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس کے لئے عبارت میں یہ الفاظ فرض کرنے پڑیں گے: ''فاحکم بینھم ان حکمت'' (پس ان کے درمیان فیصلہ کریں اگر فیصلہ کریں) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کے درمیان فیصلہ کرنا واجب قرار نہیں دیا بلکہ اُنہیں فیصلہ کرنے اور نہ کرنے اور ان سے روگردانی کا اختیار دے دیا چنانچہ ارشاد ہوا ''فَإِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ'' (پس اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے روگردانی کریں)، اس کے علاوہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آیات میں منافقین اور یہودیوں کا باھم ذکر کیا لہٰذا ''بَيْنَهُمْ'' میں ضمیر ''ھم'' کا یہودیوں کے ساتھ مختص قرار دینا بلا دلیل و بلا وجہ ہے کیونکہ ان کے ساتھ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا ذکر بھی ہوا ہے، بنابرایں مناسب تر یہ ہے کہ ضمیر ''ھم'' کو تمام لوگوں (الناس) کی طرف لوٹایا جائے جو کہ مورد و مقام کا دلالتی تقاضا ہے، اور یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جملہ ''عَمَّا جَآءَكَ'' کا تعلق جملہ ''وَلَا تَتَّبِعْ'' سے ہے کیونکہ اس میں عدول کرنے اور منہ موڑ لینے کا معنی شامل ہے۔

جملہ ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا'' میں لفظ ''شِرْعَةً'' کے معنی میں راغب نے لکھا ہے کہ شرع یعنی واضح راستہ چلنا! چنانچہ کہا جاتا ہے ''شرعت لہ طریقاً'' (میں نے اسے واضح راہ و روش اور راستہ دے دیا) اور لفظ ''شرع'' مصدر ہے پھر اسے ''واضح راستہ'' سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ یوں کہا گیا: شرع، شرَع، شریعۃ، اور پھر یہ لفظ استعارۃً طریقہ ہائے الٰہی کے لئے استعمال کیا جانے لگا، شریعت یعنی شریعت الٰہیہ، دستورات و احکام خداوندی! اور لفظ شریعت کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے شریعۃ اناء (گھاٹ) سے مشابہت کی بناء پر بنایا گیا ہے (المفردات، صفحہ ۲۵۸) البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ شریعت یعنی گھاٹ، اس کے پہلے معنی یعنی راستہ سے بنایا گیا ہو کیونکہ عربوں کے ہاں یہ لفظ یعنی شریعۃ الماء

(پانی کا راستہ) واضح وروشن راستہ ہونے کی بناء پر اس لئے معلوم ومعروف تھا کہ وہ کثرت کے ساتھ گھاٹ پر آتے جاتے تھے، اور لفظ ''نہج'' (نون پر زبر اور ھ پر جزم کے ساتھ!) کا معنی واضح راستہ ہے، چنانچہ جب کہا جاتا ہے ''**نهج الأمر و أنهج**'' تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے فلاں کام کو واضح کر دیا، اور اسی سے ''منهج الطريق'' اور ''منهاج الطريق'' ہے کہ جس کا معنی واضح وروشن راستہ ہے۔ (المفردات، راغب اصفہانی، صفحہ ۵۰۶)

شریعت کا معنی: قرآنی اصطلاح میں!

لفظ ''شریعت'' کے معنی سے آپ آگاہ ہو چکے ہیں یعنی راستہ! اور لفظ ''دین'' و ''ملت'' کا معنی خاص ومخصوص راستہ ہے، لیکن قرآنی استعمال واصطلاح میں لفظ ''شریعت'' کا معنی لفظ ''دین'' کے معنی سے زیادہ خصوصیت کا حامل ہے کہ جسے اصطلاح میں ''اَخص'' کہتے ہیں چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیات میں ملتا ہے:

- سورۂ آلِ عمران، آیت ۹

''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ''

(یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)

- سورۂ آلِ عمران، آیت ۸۵

''وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''

(اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کو اختیار کرے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا)

اگر مذکورہ بالا دو آیتوں کو زیر نظر آیت ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا'' اور سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۸ ''ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا'' (پھر ہم نے آپ کو دین کی شریعت پر قرار دیا لہٰذا اسی کا اتباع کریں) کے ساتھ ضمیمہ کر کے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''شریعت'' سے مراد وہ معین طریقہ ودستور العمل ہے جو اُمتوں میں سے اُمت یا ان انبیاء میں سے کسی نبی کے لئے معین کیا گیا جنہیں اس شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہو مثلاً نوحؑ کی شریعت، ابراہیمؑ کی شریعت، موسیٰؑ کی شریعت، عیسیٰؑ کی شریعت، محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت! جبکہ ''دین'' سے مراد وہ عام خدائی راہ وروش اور دستور العمل ہے جو تمام اُمتوں کے لئے مقرر ہوا ہے لہٰذا شریعت میں نسخ کی گنجائش موجود ہے لیکن ''دین'' میں اس کے وسیع معنی کے تناظر میں نسخ کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی، اور ''دین'' و ''شریعت'' میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ''دین'' کو ایک شخص۔ فرد واحد۔ اور ایک

قوم وگروہ سے منسوب کیا جاسکتا ہے خواہ وہ کوئی بھی ہوں لیکن ''شریعت'' کو فرد واحد کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا سوائے اس کے کہ وہ فردِ واحد اس شریعت کا وضع کرنے والا اور اس کا ذمہ دار ہو لہٰذا یوں کہا جاسکتا ہے: مسلمانوں کا دین، یہودیوں کا دین اور ان کی شریعت اور یہ بھی کہا جاسکتا اللہ کا دین، اللہ کی شریعت، دین محمدیؐ و شریعت محمدیہؐ، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے: زیدؔ کا دین، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا زیدؔ کی شریعت، عمرو کی شریعت، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لفظ ''شریعت'' میں حدثی یعنی تازہ وجود پذیر ہونے کے معنی کا اشارہ پایا جاتا ہے جو کہ راستہ کو آمادہ کرنے اور معین کرنے سے عبارت ہے، لہٰذا یوں کہنا درست وروا ہے: شریعت یعنی وہ طریقہ وطرزِ عمل کہ جسے خدا نے بنایا یا شریعت یعنی وہ طریقہ جسے فلاں نبی یا فلاں اُمت کے لئے بنایا گیا ہے، لیکن یوں نہیں کہا جاسکتا: شریعت یعنی وہ طریقہ جسے زیدؔ کے لئے بنایا گیا ہے کیونکہ اس میں کسی شخص کی انفرادی خصوصیت ملحوظ نہیں ہوتی۔

بہرحال یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ''شریعت'' کا معنی خاص جبکہ ''دین'' کے معنی میں عمومیت پائی جاتی ہے اور جہاں تک درج ذیل آیت کا تعلق ہے:

○ سورۂ شوریٰ آیت ۱۳

''شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى''

(اس نے تمہارے لئے دین قرار دیا کہ جس کی وصیت نوح کو کی، اور اسی کی وحی آپ پر کی اور اسی کی وصیت وحکم ابراہیم وموسیٰ اور عیسیٰ کو دیا)

تو یہ آیت مذکورہ بالا مطالب سے منافات نہیں رکھتی یعنی اس میں اور ان مطالب کے درمیان ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا کیونکہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت محمدیہؐ کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے لئے قرار دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو دیئے جانے والے احکام ودستورات کے مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان احکام کی حامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ پر وحی کے ذریعے نازل فرمائے اس سے اس حقیقت کا اشارہ ملتا ہے کہ اسلام تمام سابقہ شریعتوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اضافی احکام کا حامل بھی ہے یا یہ کہ تمام شریعتیں اپنی اصل و اساس میں حقیقت واحدہ رکھتی ہیں البتہ اُمتوں کی صلاحیتوں و استعدادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں بعض احکام مختلف ہیں جیسا کہ سورۂ شوریٰ آیت ۱۳ کے ان الفاظ سے اس کا اشارہ یا دلالتی ثبوت ملتا ہے: ''أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا'' (دین کو قائم رکھو اور آپس میں فرقہ نہ ڈالو)۔

بنابرایں دیگر شریعتوں کو ''دین'' کا نام دینا جبکہ دین صرف ایک ہے اور شریعتیں ایک دوسرے کو منسوخ کرتی رہتی ہیں اس طرح سے ہے جیسے اسلام کے بعض جزئی احکام کو ''اسلام'' کے احکام کہا جاتا ہے جبکہ ان میں سے بعض ناسخ اور بعض

منسوخ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سوائے ایک دین کے، کسی چیز کو اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا اور وہ اسلام ہے یعنی اس کے حضور سر تسلیم خم کر دینا، البتہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی قابلیتوں ولیاقتوں کے مختلف ہونے کی بناء پر ان کے لئے مختلف طرز ہائے عمل و دستور ہائے بندگی مقرر فرمائے کہ جنہیں شریعت موسیٰ، شریعت عیسیٰ، شریعت محمدؐ، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی شریعت میں بعض احکام کو دوسرے بعض احکام کے ذریعے منسوخ فرمایا کیونکہ منسوخ کئے جانے والے حکم کی مصلحت کا وقت ختم ہوا اور ناسخ حکم میں پائی جانے والی خدائی مصلحت ظہور پذیر ہوئی مثلاً عورتوں کے ساتھ بدکاری کی سزا عمر قید سے کوڑوں اور سنگسار کرنے میں تبدیل ہوئی اور اس طرح کے دیگر احکام! چنانچہ اس کا ثبوت اس جملہ میں پایا جاتا ہے: ''وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ'' (اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز کی بابت آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں عطا کی)۔

یہ ہے لفظ ''دین'' اور شریعت سے مربوط بحث! اور جہاں تک لفظ ''ملت'' کا تعلق ہے تو اس سے مراد لوگوں کے درمیان رائج طرزِ عمل ہے کہ جسے وہ باہمی میل جول اور معاشرتی زندگی میں اپناتے ہیں، اس میں املال و املاء اور تصدیق و تائید اور تقلید کا معنی پایا جاتا ہے کہ اس بناء پر اسے کسی دوسرے سے لئے گئے طرزِ عمل کا نام دیا جائے گا، البتہ اس کا اصل معنی کچھ زیادہ واضح نہیں، بلکہ اس کی شباہت شریعت کے مترادف معنی سے زیادہ ہے اور وہ اس طرح کہ ''ملت'' شریعت کی طرح خاص طریقہ وروش کا نام ہے جبکہ ''دین'' ایسا نہیں، اگر چہ ان دونوں میں اس حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے کہ شریعت سے مراد وہ طریقہ وطرزِ عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرمایا ہے کہ وہ اسے اپنا کر اپنی زندگی کے امور انجام دیں، جبکہ ''ملت'' کا لفظ اس طرزِ عمل پر استعمال ہوتا ہے جسے کسی دوسرے سے عملی پیروی کی غرض سے اختیار کیا جائے، شاید اسی وجہ سے ملت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دے کر استعمال نہیں ہوتا جیسا کہ ''دین'' اور ''شریعت'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، یعنی یوں کہا جاتا ہے ''اللہ کا دین'' اللہ کی شریعت، لیکن یوں نہیں کہا جاتا: اللہ کی ملت بلکہ ملت کا لفظ نبی کی طرف نسبت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اس کی سیرت وسنت کے حوالہ سے! یا اُمت کی طرف نسبت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اس حوالہ سے کہ وہ اسے اپناتے ہیں اور اسے عملی طور پر اختیار کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۵

''مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ''

(ابراہیم کی ملت جو کہ خالص بندۂ خدا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا)

اور حضرت یوسفؑ کے بیان کا حوالہ دیا کہ فرمایا:

○ سورۂ یوسف، آیت ۳۸

''اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ''

(میں نے ان لوگوں کے دین وملت وطرزِ عمل کو اختیار نہیں کیا جو اللہ کو نہیں مانتے اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں، اور میں نے اپنے آباء ابراہیم واسحاق ویعقوب کی ملت وطرزِ عمل اور راہ وروش کو اختیار کیا ہے)

اور کفار کی اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے جو انہوں نے اپنے انبیاء سے کہی یوں ارشاد ہوا:

O سورۂ ابراہیم، آیت ۱۳

''لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا''

(ہم تمہیں یقیناً اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے یا تم ہمارے دین وملت کی طرف پلٹ آؤ گے)

خلاصہ کلام یہ کہ قرآنی اصطلاح میں لفظ ''دین'' شریعت اور ملت سے وسیع معنی کا حامل ہے جبکہ وہ دو یعنی شریعت و ملت ایک دوسرے کے مترادف معانی رکھتے ہیں ان میں لفظوں کے حوالہ سے بعض جہات کے تناظر میں فرق پایا جاتا ہے۔

شریعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ:

''وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ''

(اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز کی بابت آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں عطا کی)

اس آیت میں شریعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور اس میں امت واحدہ قرار دینے سے مراد تکوینی وتخلیقی طور پر ایک اُمت قرار دینا نہیں جو کہ ایک نوع سے عبارت ہے کیونکہ تمام افرادِ بشر ایک ہی نوع رکھتے ہیں اور ایک ہی طرزِ زندگی کے حامل ہیں جیسا کہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:

O سورۂ زخرف، آیت ۳۳

''وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ''

(اگر ایسا نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی اُمت ہوتے تو ہم خدائے رحمان کا انکار کرنے والوں کے لئے ایسے گھر بنا دیتے کہ جس کی چھتیں چاندی کی ہوں اور سیڑھیاں بناتے کہ جن کے ذریعے وہ اُوپر کو جا سکیں)

بلکہ انہیں ایک ہی اُمت کی حیثیت میں قرار دینا مراد ہے کہ جو استعداد وصلاحیت اور لیاقت میں ایک ہی سطح کے حامل ہوں تا کہ ان کے لئے ایک ہی شریعت مقرر کی جائے اور ان کے درجات ومراتب کے ایک دوسرے سے نزدیک تر

ہونے کے حوالہ سے انہیں یکساں نظام و شریعت کی پیروی کا فرمان دیا جائے، لہٰذا جملہ ''وَ لَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً''
درحقیقت شرط کی علت و وجہ کو خود شرط کی جگہ قرار دینے کے طور پر ہے تا کہ اس کو مدنظر قرار دینے کے نتیجہ میں شرط کی جزا کا معنی
واضح ہو سکے یعنی یہ واضح ہو سکے کہ جملہ ''وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ'' کا معنی یہ ہے کہ اس نے مختلف شریعتیں قرار دیں تا کہ اس
چیز کے بارے میں تمہیں آزمائے جو اس نے تمہیں دی اور تمہیں اس نعمت سے نوازا اور لامحالہ وہ عطیے کہ جن کا تذکرہ آیت
مبارکہ میں ہوا ہے اُمتوں میں مختلف ہیں اور ان کا مختلف ہونا ان کے علاقوں، زبانوں اور رنگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے
نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی ایک ہی زمانہ میں دو یا زیادہ شریعتیں قرار نہیں دیں بلکہ یہ سب کچھ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ اور انسان کے صلاحیتوں و استعدادات میں ترقی کے راستے طے کرنے کی بناء پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مختلف
دستورات اور احکام صادر ہوئے وہ صرف انسان کی زندگی کے گوناگوں موارد میں امتحان و آزمائش کی غرض سے ہیں اور اگر
آپ اس بات کو یوں بیان کرنا چاہیں تب بھی درست ہے کہ تمام احکام و دستورات الٰہی اور فرامین خداوندی انسان کو مرحلہ
قوت سے نکال کر مرحلہ فعلیت تک پہنچانے کے لئے ہیں یعنی اس کی وجودی صلاحیت کو عملی صورت تک لیجانے کی غرض سے
ہیں کہ وہ سعادت و شقاوت کی دونوں جانبوں میں سے کسے اختیار کرتا ہے یا اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا
جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا پرستوں اور شیطان پرستوں کے درمیان تمیز و تشخص اور دونوں کی واضح پہچان کی غرض سے ہے
اگرچہ قرآنِ مجید میں اس سلسلہ میں عبارتیں و الفاظ اور استعمالی محاورے مختلف ہیں لیکن ان سب کی بازگشت ایک ہی معنی و
مطلب کی طرف ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ امتحان کے حوالہ سے یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۲

''وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ''

(اور ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں اور تا کہ اللہ جان لے۔ واضح و مشخص کرے۔ ان لوگوں کو جو
مؤمن ہیں اور تم میں سے گواہ قرار دے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور تا کہ اللہ مؤمنوں کو چھانٹ لے اور
کافروں کو تباہ و برباد کردے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اللہ تمہیں بہشت عطا کردے گا جبکہ اللہ تم میں سے جہاد کرنے
والوں اور صبر کرنے والوں کو جان نہ لے؟)

یہ اور اس کے علاوہ دیگر آیات بھی اسی مطلب پر مشتمل ہیں۔

دوسرے حوالہ سے یوں ارشاد ہوا:

○ سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۲۴

''فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى''

(پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آجائے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی شقاوت و بدبختی کا شکار ہوگا، اور جو شخص میری یاد سے منہ موڑے گا تو اس کی زندگانی تنگی و سختی کی حامل ہوگی اور ہم قیامت کے دن اسے اندھا محشور کریں گے)

اور تیسرے حوالہ سے یوں فرمایا:

○ سورۂ حجر

''وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا (حجر ۲۸)، قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝'' (حجر ۳۹ تا ۴۳)

(اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں ایک بشر خلق کرنے والا ہوں۔۔اس (شیطان) نے کہا: پروردگار! چونکہ تو نے مجھے اپنے پنجے میں جکڑ لیا ہے لہٰذا میں روئے زمین پر بنی نوع بشر کی زندگی ان کے لئے دلفریب بنادوں گا اور ان سب کو اپنے پنجے میں جکڑ لوں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے! خدا نے کہا: یہ میرا راستہ ہے جسے میں نے پختہ وسیدھا قرار دیا ہے، یقیناً میرے بندوں پر تیرا داؤ نہ چلے گا سوائے ان افراد کے کہ جو بھٹک کر تیری پیروی کریں اور ان سب کے لئے دوزخ ہی وعدہ گاہ ہے)۔

یاد رہے کہ اس سلسلہ میں دیگر آیات بھی موجود ہیں۔ خلاصہ بیان یہ کہ نوعِ انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایات مختلف زمانوں میں افراد کی صلاحیتوں واستعداد کے مختلف ہونے اور شریعت وسنت الٰہی کہ جس کا اجراء ونفاذ لوگوں کی سعادت اور کامیاب زندگی کے لئے لازم وضروری ہے کہ جو خدائی امتحانوں وآزمائش کی صورت میں ہے اس کا مختلف ہونا افراد کی استعدادات وصلاحیتوں کے درجات کے مختلف ہونے کی بناء پر ہے کہ جس کے نتیجہ میں شریعتوں کا مختلف ہونا لازمی وناگزیر امر ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شریعتوں کے مختلف قرار دینے کا سبب بیان کرتے ہوئے۔ اسے اپنے ارادہ ومشیت سے مربوط قرار دے کر بنی نوع بشر پر اپنی نعمتوں وعنایات کی بابت ان سے امتحان لینے اور اُنہیں آزمانے کی غرض کی صورت میں یوں ذکر کیا: ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ'' (ہم نے ہر ایک کے لئے ایک نظام اور راہ وروش مقرر کی، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز کی بابت تمہیں

آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں عطا کی)۔

بنابرایں آیت کا معنی۔ واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر اُمت کے لئے۔تشریعی و قانونگزاری کی بناء پر خاص احکام و مخصوص دستور العمل مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمت قرار دیتا اور تمہارے لئے ایک ہی شریعت مقرر کرتا، لیکن اس نے تمہارے لئے مختلف شریعتیں بنائیں تاکہ اس نے جو نعمتیں تمہیں عطا کی ہیں اُن کی بابت تمہیں آزمائے۔نعمتوں کا مختلف ہونا امتحان و آزمائش کے مختلف ہونے کا متقاضی ہے جو کہ شرعی احکام اور عملی دستورات کی بنیادی جہت ہے، لہٰذا لامحالہ شریعتوں کا مختلف ہونا یقینی ہوا،

اور وہ مختلف امتیں یہ ہیں: حضرت نوحؑ کی امت، حضرت موسیٰؑ کی امت، حضرت عیسیٰؑ کی اُمت اور حضرت محمدؐ کی اُمت! چنانچہ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر اپنے احسانات کے حوالہ سے یوں فرمایا:

○ سورۂ شوریٰ، آیت ۱۳

''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى''

(اس نے تمہارے لئے جو دین قرار دیا وہ وہی ہے جس کی وصیت نوح کو کی، اور جسے ہم نے آپؐ کی طرف وحی کے ذریعے نازل کیا اور جس کی وصیت ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو کی)

نیکیوں میں سبقت کا حکم:

''فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا''

(پس تم نیکیوں میں سبقت لو، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے)

جملہ ''فَاسْتَبِقُوا'' میں استباق کا معنی سبقت لینا، آگے بڑھنا ہے۔

''مَرْجِعُكُمْ'' میں مرجع، رجوع سے مصدر میمی ہے، اور پورا جملہ دراصل جملہ ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا'' کی فرع اور اس سے مربوط نتیجہ ہے کہ جس کا معنی یہ ہے: ہم نے تمہیں اس برحق شریعت کو جو کہ تمام شریعتوں پر نگران و نگہبان ہے تمہارے لئے خاص قرار دیا ہے اور اس میں یقیناً تمہاری بہتری و بھلائی ہے لہٰذا تم نیکیوں میں سبقت لو جو کہ احکام و دستورات ہیں، اور تم آپس کے ان اختلافات میں الجھے نہ رہو جو تمہارے اور تمہارے غیروں کے درمیان پائے جاتے ہیں کیونکہ تم سب کی بازگشت تمہارے رب کی طرف ہے، وہ تمہیں اس چیز کی بابت واضح کردے گا جس میں تم اختلاف رکھتے ہو،

اور وہ تمہارے درمیان حق کا فیصلہ کرے گا اور عادلانہ قضاوت کرے گا۔

فیصلہ کی اصل واساس: ما انزل اللہ!

''وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم''

(اور یہ کہ ان کے درمیان اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کی اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں)

اس آیت کے ابتدائی الفاظ سابقہ آیت ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ'' سے یکسانیت رکھتے ہیں، البتہ ان دونوں سے حاصلہ نتیجہ یعنی فرع میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ اس سے ایک جیسے الفاظ کے مکرر ذکر کئے جانے کا فائدہ اور وجہ معلوم ہو جاتی ہے چنانچہ پہلی آیت میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ یہی وہ فرمان ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا جو کہ عبارت ہے اس شریعت سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے لئے قرار دی گئی ہے لہٰذا ان پر واجب وضروری ہے کہ وہ ان نیک اعمال میں ایک دوسرے پر سبقت لیں، اور دوسری آیت ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیتی ہے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے سے بچ کر رہنے کی تاکید کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس مطلب کو واضح کرتی ہے کہ اگر وہ ایسا کرنے سے منہ موڑیں یعنی ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے سے روگردانی کریں تو ان کا ایسا کرنا انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت سے محروم کرنے کا ثبوت دیتا ہے جو کہ ان کے فسق کا نتیجہ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت ۲۶

''يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ''

(وہ اس سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی سے بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے اور وہ اس سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا سوائے فسق اختیار کرنے والوں کے!)

اب تک جو مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت مبارکہ سابقہ آیت کے بعض ان مطالب کے وضاحتی بیان وتوضیح پر مشتمل ہے جو وضاحت وتشریح طلب تھے اور وہ یہ کہ خواہشات نفس کے اسیر افراد کا اس چیز کی پیروی سے منہ موڑنا کہ جسے اللہ نے برحق نازل فرمایا ہے وہ ان کے فاسق ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ نے چاہا کہ انہیں ان کے

بعض ان گناہوں کی سزا دے جوان کے فاسق ہونے کا سبب ہیں اور سزا دینا مصیبت میں مبتلا کرنا بظاہر وہی گمراہ کرنا ہدایت سے محروم کرنا ہے لہٰذا جملہ: ''وان احکم بینھم بما انزل اللہ'' کا عطف جملہ ''وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ'' میں لفظ ''کتاب'' کی طرف ہے، جیسا کہ بعض حضرات کا قول ہے، اس بناء پر مناسب یہ ہے کہ ''الکتاب'' پر الف ولام سے اشاراتی طور پر حدثی معنی ملحوظ ومقصود ہو لہٰذا آیت کا معنٰی یہ کیا جائے: اور ہم نے آپ کی طرف وہ احکام نازل کئے جوان کے لئے مقرر کئے تھے اور یہ حکم نازل کیا کہ ان کے درمیان ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرو،

اور جملہ ''وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ'' (اور ان سے بچ کر رہیں کہ کہیں آپ کو بعض ان چیزوں کے بارے میں الجھا نہ دیں جو اللہ نے آپ کی طرف نازل کی ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی سازشوں سے خبردار رہیں کہ کہیں آپ کو فتنہ سے دوچار نہ کردیں، حالانکہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی عصمت کے حامل ہیں اور معصوم ہیں تو اس حوالہ سے ہے کہ قوت عصمت، اختیار کو ختم نہیں کرتی اور نہ ہی فاعل مختار ہونے کی بناء پر دی جانے والی ذمہ داریوں وخدائی دستورات وفرائض کو ختم کرتی ہے کیونکہ وہ علمی صلاحیتی قوتوں کے باب سے ہے اور جہاں تک علوم وادراکات کا تعلق ہے تو وہ عمل کرنے والی قوتوں اور اعضاء بدن میں موجود قوتوں اور خود ان اعضاء کو جوان قوتوں کے حامل ہیں فعل وترک۔ انجام دینے یا نہ دینے اختیاری نسبت کے برابر ہونے سے محروم نہیں کرتے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے کسی غذا کے بارے میں اس کے زہریلا ہونے کا پختہ یقین اسے کھانے سے بچنے کو یقینی بناتا ہے لیکن اگر اسے کھایا جائے تو وہ اعضاء کہ جو اسے تناول کرنے میں استعمال ہوئے مثلاً ہاتھ، منہ، زبان، دانت وغیرہ کہ جن کا کام ہی کھانے پینے میں استعمال ہونا ہے اور اگر انہیں استعمال نہ کیا جائے تو وہ کچھ نہ کر پائیں گے تو اس سے ثابت ہوا کہ ان کی عملداری کے ممکن ہونے کے باوجود اگر ان سے کام نہ لیا جائے تو وہ کچھ نہ کر پائیں گے لہٰذا ان سے کام لینا اختیاری فعل ہے اگرچہ اس کا انجام پذیر ہونا مذکورہ بالا یقینی علم کے ہوتے ہوئے محال وناممکن ہے۔ چنانچہ اس موضوع کی بابت بعض مطالب درج ذیل آیہ مبارکہ میں ذکر ہو چکے ہیں:

○ سورۂ نساء، آیت ۱۱۳

''وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا''

(اور وہ ذرہ بھر آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، جبکہ اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل کی ہے اور آپ کو اس چیز کا علم عطا کیا ہے جو آپ کو معلوم نہ تھی، اور اللہ کا فضل وکرم آپ پر بہت عظیم ہے)

اور جملہ ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ'' ان کے فسق کی وجہ سے انہیں گمراہ کئے جانے

کی وضاحت کے طور پر ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے اور اس میں ان آیات کے ابتدائی جملوں کی طرف رجوع کی صورت پائی جاتی ہے کہ جن میں یوں ارشاد ہوا ''یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ'' اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی و ڈھارس دی گئی اور آپ کو دلبرداشتہ و مفہوم ہونے سے بچنے کی راہ بتائی گئی اور یہ کام صرف اسی مقام پر نہیں بلکہ اکثر مقامات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کے حق سے روگرداں ہونے کی وجہ سے دلبرداشتہ و غمزدہ ہونے سے منع فرمایا اور ان کے اس راستہ پر چلنے سے انکار کی وجہ سے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دکھایا کہ جوان کی فلاں وصلاح کا ضامن ہے دکھی نہ ہونے سے کام لینے کا حکم دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حقیقت سے آگاہ فرما دیا کہ وہ لوگ اللہ کو اس کی مملکت وسلطنت میں شکست نہیں دے سکتے اور نہ ہی وہ اس پر غلبہ پا سکتے ہیں بلکہ اللہ اپنی خدائی میں ہر شے پر غالب ہے اور وہی انہیں ان کے فسق اختیار کرنے کی وجہ سے حق وحقیقت سے محروم کرتا ہے اور ان کی باطنی کمی کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں کمی ڈالتا ہے اور وہی ہے جوان سے توفیق سلب کر کے اور انہیں تباہی سے دوچار کر کے ان پر رجس و پلیدی ڈال دیتا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

○ سورۂ انفال، آیت ۵۹

''وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ''

(اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ یہ گمان نہ کریں کہ خدا سے آگے بڑھ گئے ہیں، وہ خدا کو شکست نہیں دے سکتے)

لہٰذا جب سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے اور وہی ہے جو اپنے پاکیزہ دین کو ہر طرح کی نجاست وگندگی سے پاک وصاف رکھتا ہے لہٰذا کوئی چیز اس کے ارادہ میں حائل نہیں ہوسکتی اور اس صورتحال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غمگین ودلبرداشتہ اور دکھی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں شاید اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ''، اس میں ''فَاعْلَمْ'' کے الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہی دلانا مقصود ہے ورنہ یوں کہا جاسکتا ہے ''فان تولوا فانما یرید اللہ''، یا اس معنی کے حامل دیگر الفاظ استعمال ہوسکتے تھے اس بناء پر آیت کے معنی کی اس طرح تاویل ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کیا گیا کہ ان کا حق سے روگردانی کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے فسق کی سزا کے طور پر انہیں مسخر کئے جانے کی صورت میں ہے لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے منہ موڑنے سے دکھی وغمزدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کے بھیجے ہوئے نمائندہ و پیامبر ہیں کہ جو لوگوں کو اپنے رب کے راستہ پر چلنے کی دعوت دینے والے ہیں لہٰذا اگر کوئی چیز ان کے دکھی وغمزدہ ہونے کا باعث بنے تو وہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ دینی مشن میں اللہ کا ارادہ مغلوب واقع ہو جبکہ ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ کوئی چیز اللہ پر غالب نہیں آسکتی بلکہ وہ ہے کہ جو تمام موجودات ومخلوقات کو اِدھر اُدھر پھراتا ہے اور وہی ہے جو کسی کو توفیق عطا کرتا ہے اور کسی سے توفیق سلب کر لیتا ہے لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غمزدہ

ودکھی ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔

اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا:

○ سورۂ کہف، آیت ۸

''فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا''

(اور شاید کہ آپ ان کے اس حدیث (قرآن) پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے سخت افسوس کا شکار ہو کر اپنے آپ کو ہی ختم کر ڈالیں ہم نے روئے زمین کی ہر شے کو اس کی زینت و بناؤ سنگھار قرار دیا ہے تا کہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ اُن میں سے سب سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے اور ہم ہی روئے زمین کی زیب و زینت کو خاک کے خشک ذرے بنا دینے والے ہیں)

بنابرایں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ اس نے پیغمبروں کو بھیجنے اور دینی انزاز و بشارت دینے میں تمام لوگوں کے ایمان لانے کو ہدف و غرض قرار نہیں دیا کہ انسان اپنی زندگی کی ہر من پسند چیز اور تمام خواہشوں کی تکمیل کا خواب شرمندۂ تعبیر کر سکے بلکہ یہ سب کچھ امتحان و آزمائش ہے کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آزماتا ہے کہ کون ہے جو سب سے اچھا عمل کرنے والا ہے، ورنہ دُنیا اور اس میں جو کچھ بھی ہے اس کو بقاء و دوام حاصل نہیں اور دنیا فانی ہے باقی رہنے والی نہیں، اس کی ہر چیز خاک کے ذرّوں کی طرح ہوا میں اڑتی نظر آئے گی اور ان حق کے منکروں اور اس سے منہ موڑنے والوں کو سوائے محرومیت و ندامت کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا اور وہ اپنے دل کی مرادیں حاصل کرنے میں بری طرح ناکام ہوں گے لہٰذا آپؐ کو ان کے انکار اور روگرداں ہونے سے دکھی ہونے کی کوئی وجہ و ضرورت نہیں کیونکہ ان کا ایسا کرنا ہماری کوشش کی ناکامی کا باعث نہیں بن سکتا اور نہ ہی ہماری قدرت کے بطلان اور ہمارے ارادہ میں سستی کا سبب بن سکتا ہے۔

اور جملہ ''وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ'' دراصل جملہ ''اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ'' کی علّت و سبب کے مقام میں ہے جیسا کہ اس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے یں۔

حکم جاہلیت یا حکم خدا؟

''اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ''

(کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا سب سے اچھا حکم کرنے والا کون ہے یقین والے لوگوں کے لئے؟)

یہ آیت مبارکہ سابق آیت میں بیان شدہ مطلب کی بنیاد پر استفہامی انداز کی حامل ہے کہ حرف ''ف'' (اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ) سے اس کی فرعی حیثیت کا اشاراتی ثبوت ملتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ جس سے منہ موڑتے ہیں وہ خدا کا نازل کردہ حکم ہے اور وہ حق ہے جس کے حق ہونے سے وہ بخوبی آگاہ ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں مذکور مطالب تمام سابقہ آیات میں بیان کئے گئے مطالب کے نتیجہ کے طور پر ہو۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ جب یہ شریعتیں اور احکام بھی حق ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی حکم حق ہو ہی نہیں سکتا اور جاہلیت کا حکم سوائے خواہشوں کی پیروی کے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا، تو یہ لوگ جو حق و برحق حکم سے روگردانی کرتے ہیں وہ اپنے اس عمل سے کیا چاہتے ہیں جبکہ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ حکم جاہلیت ہے؟ تو کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں حالانکہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو ان ایمان کے دعویداروں کے لئے اللہ سے بہتر حکم صادر کر سکے۔ فیصلہ دے سکے۔

بنابراین جملہ ''اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ'' (کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں؟) سرزنش پر مبنی استفہام و سوال ہے، اور جملہ ''وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا'' استفہام انکاری ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اللہ سے زیادہ بہتر حکم و فیصلہ دے سکتا ہو۔ اور یہ حقیقت واضح و مسلم ہے کہ ہر حکم اپنے اچھا و حسین ہونے کی وجہ سے قابل اتباع قرار پاتا ہے۔

اور جملہ ''لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ'' میں ''یقین'' والا ہونے کا حوالہ انہی لوگوں کی طرف اشارہ کے طور پر ہے کہ اگر وہ اللہ پر ایمان لانے کے اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات پر یقین رکھتے ہیں اور جو اللہ کی آیات پر یقین رکھتے ہیں وہ ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ اللہ کے علاوہ کوئی ہے جو اللہ سے زیادہ خوبصورت اور اچھا حکم و فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ زیر نظر آیات میں خطاب کے مختلف انداز اختیار کئے گئے ہیں یعنی کہیں واحد متکلم کو چھوڑ کر جمع متکلم کا صیغہ استعمال ہوا، کہیں متکلم کو چھوڑ کر غائب کا اور کہیں اس کے برعکس غائب کا صیغہ چھوڑ کر متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مثلاً ''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ'' (یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) کہا گیا، پھر یوں کہا گیا ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ'' (ہم ہی نے تورات نازل کی)، پھر یوں کہا گیا ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ'' (بوجہ اس کے کہ انہیں اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا) پھر فرمایا ''وَاخْشَوْنِ'' (اور مجھ سے ڈرو)۔

اور اس طرح کے دیگر الفاظ و جملے! تو جہاں غائب کے انداز میں لفظ جلالہ (اللہ) استعمال ہوا وہاں موضوع کی عظمت کا اظہار متکلم کی عظمت کے حوالہ سے مقصود و ملحوظ ہے، اور جہاں واحد متکلم کے انداز کو اختیار کیا گیا وہاں یہ مراد ہے کہ اس موضوع کا تعلق صرف اور صرف خدائے یکتا سے ہے اس میں کسی ولی و شفیع کا کوئی عمل دخل نہیں، پس اگر وہ حکم ترغیب

دلانے یا وعدہ پر مشتمل ہو تو اس کا پورا سلسلہ اللہ تعالیٰ سے مخصوص و مختص ہے اور وہ ہر وعدہ وفا کرنے والے سے برتر ہے اور اس سے منزہ و بالاتر ہے کہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کرے اور اگر وہ حکم ڈرانے وعذاب کا خوف دلانے پر مشتمل ہو تو شدید ترین اور سخت ترین ہوگا اور کسی شفیع کی شفاعت اور کسی ولی کے کہنے پر مجرم کو معاف نہیں کیا جائے گا کیونکہ پورا اختیار خود اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اس نے ہر طرح کے سفارشی کی سفارش کی نفی کردی ہے، اس مطلب پر بخوبی غور کریں۔

یاد رہے کہ اس موضوع کی بابت بعض مطالب بعض سابقہ بحثوں میں ذکر کئے جا چکے ہیں اور شفاعت کے حوالہ سے مربوطہ جہات واضح کی جاچکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں شفاعت کا موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے اور اس کی مختلف جہتوں کی بابت احادیث و روایات میں ضروری وضاحت موجود و مذکور ہے، شفاعت کی قرآنی حقیقت نا قابل انکار ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بعض شقوں اور جزئیات کے حوالہ سے جو امور وضاحت طلب ہیں ان میں احادیث شریفہ سے استفادہ کرتے ہوئے اصل حقیقت سے آگاہی کا حصول ممکن ہے، قرآن مجید نے شفاعت کی کلی نفی نہیں کی بلکہ اس کی استثنائی جہت کے تناظر میں اسے یقینی و مسلم قرار دیا ہے۔

روایات پر ایک نظر!

امام محمد باقرؑ کا تفصیلی بیان:

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیہ مبارکہ ''يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ'' کے ذیل میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا تفصیلی بیان مذکور و منقول ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا:

خیبر کی رہنے والی ایک معزز گھرانے کی عورت نے وہاں کے معزز گھرانے کے ایک شخص کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا اور وہ دونوں شادی شدہ تھے، ان دونوں کے معزز گھرانہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں سنگسار کیا جانا قبیلہ والوں کو ناگوار گزرا لہٰذا انہوں نے مدینہ کے یہودیوں کو خط لکھ کر بھیجا کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں پوچھیں، انہیں اُمید تھی کہ شاید وہ کوئی راستہ بتائیں جس سے سنگسار کرنے کے حکم سے خلاصی ہو جائے چنانچہ یہودیوں کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جن میں کعب بن اشرف، کعب بن اسید، شعبہ بن عمرو، مالک بن صیف، کنانہ بن ابی حقیق اور کچھ دیگر افراد شامل تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شرفیاب ہو کر عرض کی: اے محمدؐ! آپؐ ارشاد فرمائیں کہ شادی

شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا (حد) کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: میں جو حکم وفیصلہ دوں کیا تم اسے قبول کرلو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں، اس اثناء میں حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور خدا کی طرف سے پیغام پہنچایا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بتایا کہ ان کی سزا سنگسار کرنا ہے، انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس وقت جبریلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ اپنے اور ان کے درمیان ابن صوریا نامی شخص کو فیصل بنادیں، جبریلؑ نے ابن صوریا کی شناخت بھی بتادی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: کیا تم ایک نوجوان کو پہچانتے ہو جو سر سے گنجا، سفید رنگ اور بھینگا ہے اور فدک کے علاقہ کا مکین ہے اور اسے ''ابن صوریا'' کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں، ہم اسے جانتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: وہ کیسا شخص ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس وقت تمام یہودی علماء میں سے سب سے بڑا عالم ہے اور روئے زمین پر اس سے بڑا یہودی عالم کوئی نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والے تمام احکام سے آگاہی رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کسی کو بھیج کر اسے بلالاؤ، چنانچہ انہوں نے اسے بلوایا اور عبداللہ بن صوریا آگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن صوریا سے فرمایا: میں تجھے اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ کہ جس نے حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل فرمائی اور تمہارے لئے دریا کو چیر کر تمہیں غرق ہونے سے بچایا جبکہ آلِ فرعون کو غرق کردیا اور تم پر بادلوں سے سایہ کیا اور تم پر منّ وسلویٰ نازل کیا، کیا آپ کی کتابوں میں شادی شدہ شخص کے زنا کے مرتکب ہونے کی سزا سنگسار ہے؟ ابن صوریا نے عرض کی: ہاں، مجھے اسی ذات کی قسم جس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تذکرہ کیا ہے اس شخص کی سزا سنگسار ہے۔ اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ تورات کا پروردگار مجھے جھوٹ بولنے اور غلط بیانی کرنے، تورات میں مذکور حکم تبدیل کرنے کے جرم میں دوزخ کی آگ میں جلائے گا تو میں آپ کے سامنے ہرگز اعتراف نہ کرتا اور صاف گوئی سے کام نہ لیتا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اے محمد! خود مجھے بتائیں کہ اس سلسلہ میں آپ کی کتاب میں کیا حکم مذکور ومرقوم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر چار عادل افراد گواہی دیں کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان دونوں نے بدکاری کی اور ان کے عمل کو سرمہ دانی میں سرمہ کی سلائی داخل ہونے کی طرح دیکھا ہے تو ان کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ واجب ہے کہ ان دونوں کو سنگسار کیا جائے، ابن صوریا نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تورات میں حضرت موسیٰؑ پر بھی یہی حکم نازل فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا وجہ تھی کہ آپ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نظر انداز کرنے کا آغاز کیا اور اس میں تبدیلی کی؟ اس نے جواب دیا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی طاقتور نامور اور بڑے طبقہ سے تعلق رکھنے والا شخص بدکاری کا مرتکب ہوتا تو ہم اس پر حد نہیں جاری کرتے تھے بلکہ اسے چھوڑ دیتے تھے لیکن اگر کوئی کمزور شخص بدکاری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے جس کے نتیجہ میں بڑے طبقہ والوں کے درمیان زنا عام ہو گیا اور وہ کثرت کے ساتھ بدکاری کے

مرتکب ہونے لگے، یہاں تک کہ ہمارے بادشاہ کے چچازاد بیٹے نے بدکاری کی تو ہم نے اس پر حد جاری نہیں کی اور اسے سنگسار نہیں کیا پھر ایک اور شخص نے بدکاری کی تو بادشاہ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا، اس پر اس شخص کی قوم نے اعتراض کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہونے دیں گے جب تک کہ فلاں شخص بادشاہ کے چچازاد بھائی کو سنگسار نہ کیا جائے، تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ آئیں اور ہم مل کر اس کا حل نکالتے ہیں اور سنگسار کرنے کے علاوہ کوئی سزا تجویز کرتے ہیں جو طاقتور و کمزور سب کے لئے یکساں ہو چنانچہ ہم نے کوڑوں اور داغنے کی سزا تجویز کی، اور وہ یوں کہ چالیس کوڑے مارے جائیں پھر ان کے منہ کالے کئے جائیں اور دونوں کو الگ الگ اُونٹوں پر سوار کیا جائے اور وہ اس طرح سے کہ ان کے چہرے اُونٹ کی دم کی طرف ہوں اور اس حالت میں اُنہیں شہر میں پھرایا جائے تو اس کے بعد یہ سزا سنگسار کرنے کی جگہ رائج ہو گئی۔

ابن صوریا کی بات سن کر یہودیوں نے اسے مورد مذمت قرار دیا اور کہا کہ تو نے یہودیت کے راز فاش کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام صورتحال سے آگاہ کرنے میں بہت جلدی کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس مقصد کے لئے تجھے بلایا تھا تو اس کا اہل ہی نہ تھا لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیرے بارے میں پوچھا تو چونکہ تو اس وقت وہاں موجود نہ تھا لہٰذا ہم نے تیری غیبت کرنا مناسب نہ سمجھا، ابن صوریا نے کہا کہ انہوں (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے تورات کی قسم دی کہ میں تورات میں مذکور حکم بیان کروں اور اگر وہ مجھے تورات کی قسم نہ دیتے تو میں کبھی انہیں یہ سب کچھ نہ بتاتا۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ان دونوں کو سنگسار کیا جائے لہٰذا مسجد کے دروازہ پر ان دونوں کو سنگسار کیا گیا، ابن صوریا نے اس وقت کہا: میں پہلا وہ یہودی ہوں جس نے آپ کے حکم کو زندہ کیا ہے جبکہ دوسروں نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا، اس وقت اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ''يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ'' (اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو تمہیں واضح طور پر بہت سے ان امور و احکام سے آگاہی دلاتا ہے جو تم کتاب میں سے چھپاتے ہو اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کرتا ہے)

یہ سن کر ابن صوریا کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیئے اور عرض کی: میں اپنے آپ کو اللہ اور آپ کی پناہ میں دیئے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آپ کو جن بہت سی چیزوں سے چشم پوشی کا حکم دیا گیا ہے ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اس بات پر کان نہ دھرے اور اس کی طرف توجہ ہی نہ فرمائی،

پھر ابن صوریا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیند کی کیا کیفیت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تنام عيناي ولا ينام قلبي'' (میری دونوں آنکھیں سو جاتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا)۔

ابن صوریا نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے، یہ بتائیں کہ کیا وجہ ہے کہ بعض بچے باپ کی شکل وصورت پر ہوتے ہیں اور ان میں ماں کی کوئی شباہت نہیں پائی جاتی جبکہ بعض بچے اس کے برعکس ہوتے ہیں اور ان میں ماں کی شباہت ہوتی ہے

باپ کی شباہت بالکل ہی نہیں ہوتی؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: ماں باپ میں سے جس کا نطفہ دوسرے کے نطفہ پر غالب ہو اور حمل ٹھہرنے میں سبقت حاصل کرے تو بچہ میں اس کی شباہت پائی جائے گی۔

ابن صوریا نے کہا: آپؐ نے سچ فرمایا ہے۔ یہ بتائیں کہ بچے میں کون سی چیزیں باپ سے اور کون سی ماں سے ہوتی ہیں؟ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کافی دیر تک غشی طاری رہی اور جب افاقہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ اقدس سرخ تھا اور پسینہ میں شرابور تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: گوشت، خون، ناخن اور چربی ماں سے جبکہ ہڈیاں، جوڑ اور رگیں باپ سے ہوتی ہیں۔

ابن صوریا نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درست فرمایا ہے۔ آپؐ کی ہر بات اللہ کے برگزیدہ نبی کی بات ہے، (آپ نبی ہیں) پھر ابن صوریا مسلمان ہوگیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس کون سا فرشتہ آتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل! ابن صوریا نے عرض کی کہ اس کی صفات ونشانیاں بیان فرمائیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل کی توصیف میں اس کے اوصاف ونشانیاں بیان فرمائیں، اس وقت ابن صوریا نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ جیسا کہ آپؐ نے بیان فرمایا یہی تورات میں مذکور ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے برحق رسول ہیں۔

ابن صوریا کے اسلام لانے پر یہودی برانگیختہ ہوگئے اور اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا چنانچہ جب وہ لوگ وہاں سے اُٹھ کر جانے لگے تو قبیلہ بنی قریضہ کے افراد نے قبیلہ بنی نضیر کے افراد کو روک لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے: اے محمدؐ! قبیلہ بنی نضیر اور ہم ایک ہی باپ سے ہیں اور ہمارا دین ایک، اور ہمارا نبی ایک ہے، لیکن اگر ان کا کوئی شخص ہمارے کسی شخص کو قتل کر دے تو قاتل کو قتل نہیں کرتے۔ قصاص نہیں کرتے بلکہ ہمیں اس کی دیت کے طور پر ستر (وسق) کھجور دیتے ہیں (ہر وسق ساٹھ من کا ہوتا ہے) اور اگر ہم ان کے کسی شخص کو قتل کر دیں تو وہ قاتل کو قتل کرتے ہیں اور ہم سے دگنی دیت یعنی ایک سو چالیس وسق کھجور وصول کرتے ہیں، اگر مقتول عورت ہو تو اس کے بدلے میں ہمارا ایک مرد قتل کرتے ہیں اور اگر مقتول مرد ہو تو ہمارے دو مرد قتل کرتے ہیں اور اگر مقتول غلام ہو تو ہمارے آزاد کو قتل کرتے ہیں اور زخموں کی دیت ان کے زخموں کی دیت سے آدھی ہوتی ہے، تو آپ ہمارے اور ان کے درمیان اس سلسلہ میں بھی قضاوت فرمائیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے رجم (سنگسار کرنے) اور قصاص کی آیات نازل فرمائیں۔ (تفسیر "مجمع البیان" جلد ۳ صفحہ ۱۹۳)

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں مذکورہ بالا روایت کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے دیگر مفسرین کے حوالہ سے بھی ذکر کیا ہے اسی سے قریب المعنی روایات اہل سنت کی معتبر کتب حدیث اور تفاسیر میں متعدد راویوں کے حوالہ سے منقول ہیں مثلاً ابوہریرہ، براء بن عازب، عبداللہ بن عمر، ابن عباس اور دیگر اور مذکورہ

بالا واقعہ کا ذیلی حصہ تفسیر ''در منثور'' میں عبد بن حمید کے حوالہ سے اور ابو الشیخ نے قتادہ اور ابن جریر کے حوالہ سے اور ابن اسحاق وطبرانی اور ابن ابی شیبہ وابن منذر اور ان کے علاوہ دیگر راویوں نے ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

اور مذکورہ بالا روایت میں ابن صوریا کا تورات میں رجم کے حکم کے موجود ہونے کی تصدیق کرنا کہ جسے جملہ ''وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللهِ'' (اور وہ آپ کو کیونکر اپنا فیصل قرار دے سکتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے کہ جس میں اللہ کا حکم مذکور ہے) تو اس کی تائید اس وقت جو تورات یہودیوں کے ہاں رائج ہے اس میں مذکور رجم کے حکم سے بھی ہوتی ہے اور اس کے الفاظ مذکورہ بالا حدیث سے قریب المعنی ہیں چنانچہ تورات میں اصحاح ۲۲ سفر تثنیہ میں یوں مذکور ہے:

(۲۲) اگر کسی شخص کو کسی شوہر والی عورت کے ساتھ ہمبستری کرتے ہوئے دیکھا جائے تو دونوں کو قتل کر دیا جائے گا، یعنی اس مرد کو جو عورت کے ساتھ سویا ہوا ہو اور اس عورت کو جو اس مرد کے ساتھ سوئی ہوئی ہو دونوں کو قتل کیا جائے تا کہ یہ برائی اسرائیل میں باقی ہی نہ رہے، (۲۳) اگر کوئی باکرہ لڑکی، کہ جو کسی مرد کے ساتھ نامزد ہو چکی ہو شہر میں کوئی اور شخص اس سے ہمبستری کرے (۲۴) تو ان دونوں کو شہر کے دروازہ پر لے جاؤ اور دونوں کو سنگسار کر دو یہاں تک کہ دونوں مر جائیں کیونکہ اس لڑکی نے اپنے آپ کو برائی وبدکاری سے بچانے کے لئے کسی کو نہیں پکارا اور اس مرد نے اس شوہر والی لڑکی کی آبروریزی کر کے اس کی عزت خراب کی لہٰذا ان دونوں کو سنگسار کر کے موت کے گھاٹ اُتارو تا کہ وہ برائی تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ (منقول از تورات بزبان عربی، مطبوعہ کیمرج ۱۹۳۵ء)

اس عبارت میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ رجم کا حکم بدکاری کی بعض صورتوں پر بھی لاگو ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی لڑکی کسی شخص کے ساتھ منسوب بھی ہو چکی ہو تب بھی اس کے ساتھ بدکاری کرنے والا اور وہ خود دونوں ہی قتل کئے جائیں گے اور دونوں کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ اور جہاں تک روایت میں مذکور اس بات کا تعلق ہے کہ یہودیوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی شدہ کے زنا کا حکم پوچھا اور اس کے ساتھ ساتھ دیت کا مسئلہ بھی پوچھا تو اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آیات میں اس کا تائیدی ثبوت پایا جاتا ہے، اور آیت میں قتل کے حکم میں قصاص اور زخموں کی بابت تورات میں اس کے ذکر ہونے کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ موجودہ مروجہ تورات میں موجود ہے، ملاحظہ ہو:

تورات کے سفر الخروج سے اصحاح ۲۱ میں یوں مذکور ہے:

(۱۲) اگر کوئی شخص کسی کو مارے کہ جس کے نتیجہ میں وہ مر جائے تو مارنے والے شخص کو قتل کیا جائے گا۔ (۱۳) لیکن اگر اس کا ارادہ اسے قتل کرنا نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کا مرنا اس مارنے والے کے ہاتھ سے مقرر فرمایا تو میں تیرے لئے جگہ بنا دوں گا کہ وہ وہاں بھاگ جائے (۲۳) اور اگر اس کے مارنے سے صرف تکلیف کا شکار ہو تو جان کے بدلے جان

(۲۴) آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، اور پاؤں کے بدلے پاؤں، (۲۵) داغ کے بدلے داغ، زخم کے بدلے زخم اور ہڈی ٹوٹنے کے بدلے ہڈی توڑنے کی سزا ہے۔

اور اصحاح ۲۴ میں لاویوں کے سفر کی عبارت یوں ہے:

(۱۷) جب کوئی شخص کسی کو موت کے گھاٹ اُتارے تو اسے قتل کیا جائے گا (۱۸) اور جو شخص کسی کے جانور کو مار دے تو اس کے بدلے میں اس کی تلافی کرے، جان کے بدلے جان (۱۹) جب کوئی شخص کسی ساتھی کے بدن میں کوئی نقص وارد کرے تو اس کے ساتھ بھی اسی کے مانند سلوک کیا جائے گا (۲۰) ہڈی توڑنے کے بدلے ہڈی توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، اور اس نے جو نقص اس پر وارد کیا ہو اسی طرح کا نقص اس پر وارد کیا جائے گا۔

کافر، ظالم، فاسق:

تفسیر ''در منشور'' میں مذکور ہے کہ احمد، ابوداؤد، ابن جریر، ابن منذر، طبرانی، ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ''**ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئك هم الکافرون،۔۔۔الظالمون،۔۔۔الفاسقون**'' (اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ کافر ہیں،۔۔۔ظالم ہیں۔۔۔فاسق ہیں) یہ ارشاد خداوندی یہودیوں کے دو گروہوں کے بارے میں نازل ہوا کہ زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور ایک گروہ، دوسرے پر غالب آ گیا جس کے نتیجہ میں مغلوب ہونے والوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا گیا کہ اگر غالب آنے والے گروہ کے افراد میں سے کسی نے مغلوب ہونے والے گروہ کے کسی شخص کو قتل کیا تو مقتول کے وارثوں کو صرف پچاس (۵۰) وسق دیت دی جائے گی، لیکن اگر مغلوب گروہ کے افراد میں سے کسی نے غالب وطاقتور گروہ کے افراد میں سے کسی کو قتل کیا تو اس کی دیت ایک سو وسق ہوگی، دونوں گروہ اس معاہدہ پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو دونوں گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیر مقدم کہا، مغلوب و کمزور طبقہ کے افراد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کو اپنے لئے نیک فال قرار دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی کہ کیا کہیں ایسا ہوتا ہے کہ دو قبیلے کہ جن کا دین ایک، نسب ایک اور علاقہ وملک ایک ہو مگر ان کے درمیان دیت کا قانون مختلف ہو کہ ایک گروہ کی دیت دوسرے گروہ والوں کی دیت کی نصف ہو؟ اور اگر اب تک ہم نے تمہیں (اے غالب وطاقتور طبقہ) ایک سو وسق کامل دیت ادا کی ہے تو یہ صرف تمہارے ڈر کی وجہ سے تھی کہ کہیں تم ہماری جان وعزت کو نقصان نہ پہنچا سکو، اب جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ آ گئے ہیں تو ہم تمہیں کامل دیت نہیں دیں گے اور اس غیر

منصفانہ فیصلہ پر عمل نہ کریں گے، غالب و طاقتور گروہ نے اس کی بات نظر انداز کردی اور وہ ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے یہاں تک کہ دونوں کے درمیان جنگ ہونے کا خطرہ لاحق ہونے لگا مگر دونوں اس بات پر رضا مند ہوگئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے درمیان فیصل قرار دیں، البتہ اس دوران طاقتور طبقہ کے افراد نے آپس میں بات چیت کی اور کہنے لگے کہ بخدا قسم، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اس بات پر راضی نہ ہوں گے کہ ہمیں کامل دیت اور ان کے لئے آدھی دیت دینے کا فیصلہ کریں کیونکہ ان لوگوں نے بالکل سچ کہا ہے کہ وہ ہمارے خوف سے ہمیں کامل دیت (ایک سو وسق) ادا کرتے تھے اور ہم سے مغلوب ہونے کی وجہ سے اس معاہدہ پر عمل کرتے تھے چنانچہ انہوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مخفی طور پر کچھ لوگوں کو بھیجا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صورتحال سے آگاہ کرکے اپنے حق میں فیصلہ دینے پر راضی کریں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ارادہ و کوشش سے آگاہ کردیا کہ وہ کیا سازش کررہے ہیں، چنانچہ یہ آیت نازل فرمائی ''يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ـــ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ'' (اے رسول! آپ کو وہ لوگ دکھی نہ کریں جو کفر میں تیزی کرتے ہیں ـــ اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں)

یہ بیان کرنے کے بعد ابن عباس نے قسم کھا کر کہا کہ بخدا یہ آیات انہی دو گروہوں کے بارے میں نازل ہوئیں (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۸۱)

یہ واقعہ تفسیر قمیؒ میں بھی ایک طویل حدیث میں اس اضافہ کے ساتھ مذکور ہے کہ عبداللہ بن ابی قبیلۂ بنی نضیر جو کہ طاقتور و غالب گروہ تھا کا ترجمان تھا اور وہ آنحضرتؐ کو بنی نضیر سے ڈراتا تھا تا کہ آپؐ ان کے حق میں فیصلہ صادر کریں اور وہی تھا جس نے ان سے کہا تھا کہ اگر محمد تمہارے حق میں فیصلہ دیں تو قبول کرو اور اگر تمہارے حق میں فیصلہ نہ دیں تو اس سے بچ کر رہو (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۶۹)

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں سے پہلی روایت متن و مضمون کے لحاظ سے آخر الذکر روایت کی نسبت زیادہ قرین صحت معلوم ہوتی ہے اور آیات کے سیاق پر منطبق ہونے کے حوالہ سے زیادہ مضبوط نظر آتی ہے کیونکہ ان آیات کے ابتدائی جملے بالخصوص پہلی دو آیتوں کے الفاظ بنی نضیر اور بنی قریضہ کے درمیان دیت کے حوالہ سے اختلاف ہونے کے تناظر میں سیاق الکلام میں منطبق نہیں ہوتے جیسا کہ اسلوب بیان سے آگاہی رکھنے والے حضرات اس مطلب کو بخوبی سمجھتے ہیں اور یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہ روایت اس واقعہ کے قرآنی واقعات کی بابت ذکر کی جانے والی ان روایات سے مطابقت کی حامل ہو جن میں اسباب النزول ذکر کئے گئے ہیں ایسا لگتا ہے کہ راوی نے دیکھا کہ یہ واقعہ آیہ مبارکہ ''وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'' اور اس سے پہلی آیت سے مطابقت و انطباق کا حامل ہے، پھر اس نے دیکھا کہ یہ آیات کہ جن کی ابتداء جملہ ''يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ'' سے ہوتی ہے ایک دوسری سے مرتبط ہیں لہٰذا اس نے تمام آیات کو اسی

واقعہ سے مربوط قرار دیا لیکن وہ رجم کے واقعہ سے غافل رہا اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوا، واللہ اعلم۔

سفید اور سیاہ داغ:

تفسیر العیاشی میں سلیمان بن خالد سے منقول ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا آپؑ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو خیر سے نوازنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نقطہ بنا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان کھول دیتا ہے اور اس پر ایک فرشتہ مقرر و مامور کرتا ہے جو اس کا ہمدم و رہنما بنے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو ناگوار حالت کا شکار کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ بنا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان بند کر دیتا ہے اور اس پر کسی شیطان کو مسلط کر دیتا ہے جو اسے سیدھی راہ سے بھٹکا تا رہتا ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: ''فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا'' (اور اللہ جسے چاہے کہ ہدایت سے نوازے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں آلودہ رہنے دینا چاہے اس کا سینہ تنگ و جکڑا ہوا بنا دیتا ہے) اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی ''اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ'' پھر یہ آیت پڑھی: ''اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ'' (انہی لوگوں کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ نے ارادہ ہی نہیں کیا)۔ (تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۳۲۱)

حرام مال؟

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے سکونی کے حوالہ سے حضرت جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر ذکر کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا ''سحت'' (حرام مال) سے مردار کی قیمت، کتے کی قیمت، شراب کی قیمت، زانیہ کا مہر، قضاوت کرنے میں رشوت اور جادوگری کی اُجرت مراد ہے۔ (فروع کافی، جلد پنجم صفحہ ۱۲۷)

اس روایت میں ''سحت'' (حرام مال) کے چند نمونے ذکر کئے گئے ہیں جبکہ سحت کی بہت زیادہ قسمیں ہیں جو کہ روایات میں مذکور ہیں، اور اسی سے قریب المعنی کثیر روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے اسناد سے منقول ہیں۔

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید نے بیان کیا کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے ''سحت'' کا معنی پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد رشوت ہے، پوچھا گیا، یعنی قضاوت و فیصلہ کرنے میں رشوت لینا مراد ہے؟ امامؑ نے

فرمایا: وہ تو کفر ہے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۷۴)

امامؑ کا فرمانا کہ قضاوت وفیصلہ کرنے میں رشوت لینا کفر ہے گویا زیر نظر آیات میں مذکور اس ارشادِ خداوندی کی طرف اشارہ ہے جس میں ''سحت'' اور فیصلہ کرنے میں رشوت لینے کی مذمت ہوئی ہے: ''وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (اور تم میری آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو، اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ وقضاوت نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں) اور روایات میں بار بار اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام نے فرمایا: جہاں تک فیصلہ وقضاوت کرنے میں رشوت لینے کا تعلق ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کردینا (کفر) ہے۔

یاد رہے کہ ''سحت'' اور اس کی حرمت کے بارے میں شیعہ واہل سنت کے اسناد سے کثیر روایات منقول ہیں کہ جو کتب احادیث میں مذکور ہیں۔

ابن عباس کی دو روایتیں:

تفسیر ''درمنثور'' میں آیہ مبارکہ ''فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن ابی حاتم نے اور نحاس نے اپنی کتاب ناسخ میں، طبرانی نے، حاکم نے (اسے صحیح روایت قرار دے کر)، ابن مردویہ نے اور بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن'' میں ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا سورۂ مائدہ کی دو آیتیں منسوخ ہوچکی ہیں، ایک آیت ''قلائد'' اور دوسری آیت ''فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ'' کہ اس آیت کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار حاصل تھا کہ ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ موڑ لیں اور انہیں اپنی کتاب میں مذکور احکام کی طرف رجوع کرنے کا کہیں، مگر پھر یہ آیت نازل ہوئی ''وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ'' (اور یہ کہ آپ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں) تو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کریں جو ہماری کتاب (قرآن مجید) میں مذکور ہے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۸۴)

اسی کتاب (تفسیر ''درمنثور'') میں مذکور ہے کہ ابوعبید، ابن منذر اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ ابن عباس نے آیہ مبارکہ ''وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ''، کی تفسیر میں کہا: اسے اس آیت نے منسوخ کردیا ''وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' (بحوالہ مذکورہ بالا)

اسی روایت کے مانند تفسیر ''درمنثور'' ہی میں ایک روایت عبدالرزاق بن عکرمہ سے بھی منقول ہے بہر حال ان آیات مبارکہ کے مضمون و مندرجات سے روایات میں مذکور نسخ کی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ آیات کے سیاق سے ان کے درمیان پایا جانے والا اتصال و پیوستگی ان آیات کے ایک ہی مرتبہ نازل ہونے کی دلیل ہے لہٰذا اس صورتحال میں ان میں سے بعض کا دوسری بعض کو منسوخ کرنا بے معنی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ جملہ ''وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' خود مستقل معنی کی حامل آیت نہیں بلکہ اپنے ماقبل جملہ سے مرتبط وجڑی ہوئی ہے بنابرایں اسے کسی آیت کی ناسخ قرار دینا درست نہیں، اور اگر ان آیات میں ناسخ ومنسوخ کی نسبت پائی بھی جائے تو اس سے ماقبل جملہ ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' جوکہ سابقہ آیت میں مذکور ہے وہ اس سے زیادہ ناسخ ہونے کا حقدار ہوگا اس کے علاوہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ ''بَيْنَهُمْ'' میں ضمیر ''ھم'' کی بازگشت صرف اہل کتاب یا بالخصوص یہودیوں کی طرف نہیں بلکہ عامۃ الناس (سب افرادِ بشر) کی طرف ہے، ان تمام دلائل کے علاوہ ابتدائے بحث میں یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ مائدہ ناسخ ہے منسوخ نہیں ہے۔

مقام امامت اور عصمت:

تفسیر العیاشی میں آیہ مبارکہ ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ'' کے ذیل میں ابوعمرو زبیری سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: مقام امامت جن چیزوں کا متقاضی وحقدار ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں سے پاک کیا ہو اور وہ خود (امام) ان تمام معصیتوں و نافرمانیوں اور خطاؤں سے پاک ہو جو دوزخ کی آگ میں جلنے کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد ''علم منور'' یا بعض کتب میں ''علم مکنون'' مذکور ہے۔ کہ امام ان تمام چیزوں کا علم رکھتا ہو جن کی اُمت کو ضرورت پڑتی و پڑسکتی ہے اور ان میں سے تمام حلال وحرام سے آگاہ ہو، اور وہ کتاب اللہ کے تمام معارف واحکام کا عالم ہو خواہ وہ خاص ہوں یا عام، محکم ہو یا متشابہ، ناسخ ہو یا منسوخ، اور اس کی تمام علمی باریکیوں اور اسرار ورموز اور اس کی پس پردہ حقیقتوں سے مطلع ہو۔

ابوعمرو زبیری نے کہا کہ میں نے امامؑ سے پوچھا کہ جن امور کا آپؑ نے ذکر فرمایا ہے کہ امام کو ان کا عالم ہونا ضروری ہے اس کا کیا ثبوت ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا اس کا ثبوت یہ فرمانِ الٰہی ہے جس میں اللہ نے ان کا تذکرہ فرمایا ہے جنہیں حکمرانی کرنے کا اذن دیا اور انہیں اس کا اہل قرار دیا ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا

وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ '' تو یہ آئمہ ہیں جن کا درجہ انبیاء سے کم ہے وہ کہ جو اپنے علم کے ذریعے لوگوں کی تربیت کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور جو ''احبار'' ہیں وہ علماء ہیں جن کا درجہ ''ربانیون'' سے نیچے ہے پھر ان سب کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا'' اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ '' (بوجہ اس کے کہ انہیں کتاب خدا کی ذمہ داری سونپی گئی اور وہ اس پر گواہ ہیں) اس جملہ کی بجائے یوں نہیں فرمایا ''بما حملوا علیہ'' (بوجہ اس کے کہ انہیں اس پر تحمیل کیا گیا)۔ (تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۳۲۳)

امام علیہ السلام کا استدلال نہایت لطیف ہے کہ اس کی بناء پر آیت کا نہایت دلچسپ معنی سامنے آتا ہے جو کہ سابق الذکر معنی کی نسبت زیادہ دقیق وعظمت والا ہے کہ جس کا حاصل نتیجہ یہ ہے، آیہ مبارکہ میں حکمرانی کے اہل حضرات کی جو ترتیب ملحوظ ہے وہ یوں ہے کہ پہلے انبیاء، پھر ربانیون اور ان کے بعد احبار ہیں، تو اس سے ان کے فضل وکمال کے درجات ومراتب کا ثبوت ملتا ہے کہ ''ربانیون'' انبیاء سے کم اور احبار سے بالاتر ہیں اور ''احبار'' جو کہ علماء دین ہیں وہ ''ربانیون'' سے نچلے درجہ پر ہیں کہ جنہوں نے تعلیم وتعلم کے ذریعے دین وکتاب کا علم حاصل کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ''ربانیون'' کے علم کی بابت یوں ارشاد فرمایا ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ '' (بوجہ اس کے کہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی اور وہ اس پر گواہ تھے) اگر اس سے مراد علماء کے علم کی کیفیت ہوتی تو یوں کہا جاتا: ''بما حملوا من کتاب اللہ'' جیسا کہ یہودیوں کے علماء کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا ''مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا'' (ان لوگوں کی طرح کہ جن پر تورات لاد دی گئی مگر انہوں نے اس کا بوجھ نہ اُٹھا پایا) سورۂ جمعہ، آیت ۵، کیونکہ ''استحفاظ'' کا معنی حفاظت چاہنا ہے جس سے مراد حفاظت کا ذمہ دار قرار دینا ہے جیسا کہ سورۂ احزاب، آیت ۸ میں یوں ارشاد ہوا: ''لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ '' (تا کہ سچوں سے ان کے صدق کے بارے میں پوچھے) یعنی تا کہ انہیں مکلف وماً مور قرار دے کہ وہ اس سچائی کو ظاہر کریں جو ان کے باطن میں پوشیدہ ہے اور یہ حفاظت اور گواہی عصمت کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتی جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امام معصومؑ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری کی بناء پر حکمرانی کا اذن عطا فرمایا ہے اور پھر اسی بناء پر ان کا گواہ ہونا قرار دیا ہے، اور یہ بات محال وناممکن ہے کہ انہیں کتاب پر گواہ قرار دے جبکہ کتاب اسی گواہی پر مبنی ہو اور اس کے باوجود گواہی دینے والے جائز الخطاء ہوں اور ان سے غلطی وگناہ سرزد ہونا روا ہو۔

اور یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ یہاں حفاظت اور گواہی سے ہمارے ہاں ان الفاظ کے عام رائج استعمالی معانی مراد نہیں بلکہ ان سے مختلف معنے مقصود ہیں اور وہ عبارت ہیں اعمال کی حفاظت سے اور اس گواہی سے جو درج ذیل آیہ مبارکہ میں مذکور ہے:

○ سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۳

''لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا''

(تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں)

اس کی تفسیر المیزان جلد اوّل میں ذکر ہو چکی ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں حفاظت و گواہی کی نسبت سب کی طرف دی گئی ہے (بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ) جبکہ یہ کام بعض حضرات سے مربوط و مخصوص ہے تو اس کی مثال اس گواہی کی نسبت جیسی ہے جو اعمال پر ہوتی ہے کہ جسے تمام امت کی طرف منسوب کیا گیا جبکہ وہ کام اُمت کے بعض افراد کے سپرد ہوا اور وہ اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے اس طرح کی استعمالی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہیں مثلاً:

○ سورۂ جاثیہ، آیت ۱۶

''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ''

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب دی اور حکومت و نبوت عطا کی)

اس میں کتاب و حکمرانی اور نبوت دیئے جانے کی نسبت تمام بنی اسرائیل کی طرف دی گئی ہے جبکہ یہ ذمہ داری ان کے بعض افراد کو سونپی گئی تھی۔

البتہ یہ بات احبار اور علماء کو حفاظت و گواہی کی ذمہ داری سپرد کئے جانے اور ان سے اس کا عہد و پیمان لینے سے متصادم و منافی نہیں کیونکہ وہ عمومی ذمہ داری کے باب سے ہے نہ کہ اس معین و متعین ذمہ داری کے باب سے کہ جو حقیقی معنی میں مخصوص افراد کو سونپی جاتی ہے کہ جو ہر طرح کی خطاء و غلطی سے خالی و منزہ ہوتی ہے اور خدا کا دین ذمہ داری کی دونوں قسموں میں سے صرف کسی ایک قسم سے تمامیت پذیر نہیں ہوتا۔

ان مطالب سے ثابت ہوا کہ انبیاء اور احبار کے مقام و منزلت کے درمیان ایک مقام و منزلت اور بھی ہے جو کہ امامت کا مقام و منزلت ہے اور اس کی بابت اللہ تعالیٰ نے یوں آگاہ فرمایا ہے:

○ سورۂ سجدہ، آیت ۲۴

''وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ''

(اور ہم نے ان میں سے امام قرار دیئے جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کا فریضہ ادا کرتے ہیں یہ ان کے صبر کرنے اور ہماری آیات پر یقین رکھنے کی وجہ سے ہے)

اور انبیاء و احبار کے درمیان امامت کے مقام و منزلت کا قرار دیا جانا درج ذیل آیت میں اسحاق و یعقوب کو نبوت و

امات دونوں منصب عطا کئے جانے سے منافات نہیں رکھتا:

O سورۂ انبیاء، آیت ۷۳

"وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا"

(اور ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب اضافی نعمت کے طور پر عطا کئے اور ہم نے سب کو صالح بنایا اور انہیں امامت کا منصب عطا کیا، وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کا فریضہ ادا کرتے تھے)

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت وامامت دونوں ذمہ داریوں ومناصب کا بعض افراد میں یکجا ہونا ان کے علاوہ بعض دیگر افراد میں ان مناصب کا الگ الگ ہونا ممکن وقابل تصور ہے اور ان دونوں میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی، یعنی اگر بعض افراد کو نبوت وامامت دونوں ذمہ داریاں سونپی گئیں جبکہ دیگر بعض حضرات کو صرف ایک منصب عطا کیا گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں اور امامت سے مربوط بعض مطالب المیزان جلد اوّل میں آیہ مبارکہ "وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ---" (البقرہ آیت ۱۲۴) تفسیر میں ذکر کئے جاچکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ربانیون اور آئمہ جو کہ انبیاء اور احبار کے درمیان برزخی مقام ومنصب اور منزلت کے حامل ہیں وہ کتاب کا حقیقی علم رکھتے ہیں اور وہ اس پر برحق وحقیقی گواہ ہیں۔

اگرچہ یہ مطالب بنی اسرائیل کے ربانیون اور آئمہ کی بابت ذکر ہوئے ہیں لیکن آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یہ ذمہ داری اس لئے سپرد کی گئی کہ تورات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جانے والی کتاب ہے جو ہدایت اور نور یعنی ان اعتقادی وعملی معارف پر مشتمل ہے جن کی ضرورت تمام افرادِ اُمت کو ہے، لہٰذا جب یہی بات حفاظت وگواہی کی ذمہ داری و منصب سپرد کئے جانے کا سبب ہے کہ جسے صرف ربانیون اور آئمہ ہی ادا کرسکتے ہیں تو یہ سلسلہ ہر اس کتاب کی بابت ملحوظ ومقرر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہو اور وہ الٰہی معارف وعملی احکام ودستورات پر مشتمل ہو، لہٰذا ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو کتاب کی حفاظت وگواہی کے ذمہ دار ہوں، اسی سے ہمارا مطلوب ثابت ہوجاتا ہے۔

بنابرایں امام علیہ السلام کا یہ فرمان "فھٰذہ الآئمۃ دون الانبیاء" (تو یہ آئمہ ہیں کہ جو انبیاء سے نیچے درجہ والے ہیں) اس کا معنی یہ ہے کہ آیت میں جو ترتیب ذکر ہوئی ہے اس کی رو سے آئمہ کا مقام انبیاء کے بعد آتا ہے جیسا کہ احبار۔ یعنی علماء۔ کا مقام ربانیون کے بعد ہے، گویا پہلے انبیاء، پھر آئمہ اور پھر احبار وعلماء۔

اور امامؑ کا ارشاد گرامی "یربون الناس بعلمھم" (وہ اپنے علم سے لوگوں کی تربیت کرتے ہیں)، اس میں جملہ "یربون" بظاہر لفظ "ربانی" سے ماخوذ ہے جو لفظ "تربیت" سے مشتق ہے نہ کہ لفظ "ربوبیت" سے! ان کے علاوہ روایت کے دیگر جملوں اور الفاظ کے معانی سابق الذکر حاصل نتیجہ کے تناظر میں واضح ہوچکے ہیں۔

شاید مذکورہ بالا معنی ہی امامؑ کا مقصود و مراد ہو جیسا کہ تفسیر العیاشی میں مالک جہنی سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ: ''اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ۔۔۔ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یہ ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۳۲۲) یعنی ''بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ'' کا مصداق ہم ہیں کہ جنہیں کتاب اللہ کی حفاظت و گواہی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

فرمانِ نبویؐ:

تفسیر البرہان میں آیہ مبارکہ ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ'' (اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں) کی تفسیر میں کتاب کافی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن مسکان نے مرفوعاً یعنی راویوں کے نام ذکر کئے بغیر بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دو درہم کے تنازعہ میں ظالمانہ فیصلہ کرے اور پھر اس فیصلہ پر زبردستی عمل کروائے وہ اس آیت کا مصداق ہے ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ''

راوی نے پوچھا کہ فیصلہ پر زبردستی عمل کروانے سے کیا مراد ہے اور وہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: وہ اس طرح کہ حاکم کوڑے اور قید کرنے کے ذریعے اسے فیصلہ قبول کرنے پر مجبور کرے کہ اگر وہ اس کا فیصلہ کرلے تو ٹھیک ورنہ اسے کوڑے مارے اور پابند سلاسل کردے۔ (تفسیر البرھان، جلد ۲ صفحہ ۴۷۶)

اس روایت کو شیخ طوسیؒ نے کتاب تہذیب الاحکام (جلد ۶ ص ۲۲۱) میں اپنے اسناد کے ساتھ ابن مسکان ہی سے مرفوعاً (اسناد ذکر کئے بغیر) ذکر کی ہے جس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی منقول ہے اور اسے تفسیر العیاشی (جلد اوّل، صفحہ ۳۲۳) میں عبداللہ بن مسکان کے حوالہ سے مرسلہ حدیث کے طور پر (کسی سند کا ذکر کئے بغیر) ذکر کیا گیا ہے، اور اس حدیث کے ابتدائی جملوں کا معنی دیگر اسناد کے ساتھ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے بیانات وارشادات میں بھی مذکور ہے، اور فرمانِ نبویؐ میں فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ فیصلہ حتمی و لازم الاجراء اور قطعی طور پر نافذ العمل ہو، ورنہ صرف فیصلہ صادر کرنا کافی نہیں اور اسے لازم الاجراء و نافذ العمل ہونے سے موسوم نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے صرف ایک رائے سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔

ابن عباس کا بیان:

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ سعید بن منصور، ابوشیخ اور ابن مردویہ نے ابن عباس کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: خداوند عالم نے یہ آیات مبارکہ خاص طور پر یہودیوں کے بارے میں نازل فرمائی ہیں۔

- ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ''
- ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ''
- ''وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ''

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

اس روایت کو قرین صحت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تینوں آیات مطلق ہیں اور انہیں مقید کرنے (یہودیوں کے ساتھ مختص قرار دینے) کی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں، اور شانِ نزول کی وجہ سے الفاظ کے اطلاق میں تصرف وتبدیلی کرنا بلا جواز ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ تیسری آیت یہودیوں کے بارے میں نہیں بلکہ نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے بارے میں ہے، اور جہاں تک ابن عباس کا تعلق ہے تو ان سے منقول ایک روایت اس روایت سے متصادم و برعکس ہے۔

امام زین العابدینؑ کا واضح بیان:

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید نے حکیم بن جبیر کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: میں نے سعید بن جبیر سے سورۂ مائدہ کی ان آیات کے بارے میں پوچھا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیات ہمارے خلاف نازل نہیں ہوئیں بلکہ بنی اسرائیل کے خلاف نازل ہوئی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ان سے پہلے اور بعد والی آیات پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا، میں نے وہ آیات ان کے سامنے پڑھیں تو انہوں نے کہا: نہیں، ایسا نہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں بلکہ ہمارے خلاف نازل ہوئی ہیں اور ان کا تعلق ہم سے ہے، اس کے بعد ابن عباس کے آزاد کردہ غلام، مقسمؒ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے بھی سورۂ مائدہ کی آیات کے بارے میں پوچھا کہ ان کے بارے میں کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف نازل ہوئیں ہمارے خلاف نازل نہیں ہوئیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے اور ہمارے دونوں ہی کے خلاف نازل ہوئی ہیں اور جو آیات ہم پر اور ان پر دونوں پر نازل ہوئی ہیں وہ ہمارے اور ان کے دونوں کے لئے ہیں، پھر میں علیؑ بن الحسینؑ کے پاس آیا اور ان سے ان آیات کے بارے میں پوچھا جو کہ سورۂ مائدہ میں ہیں اور میں نے انہیں بتایا کہ میں

نے سعید بن جبیر اور مقسم سے بھی ان آیات کے بارے میں پوچھا ہے تو علیؑ بن الحسینؑ نے کہا کہ مقسم نے کیا کہا ہے؟ تو میں نے انہیں ساری بات بتا دی، انہوں نے کہا کہ اس نے درست کہا ہے مگر وہ کفر، شرک والا کفر نہیں اور وہ فسق، شرک والا فسق نہیں اور وہ ظلم، کفر والا ظلم نہیں ہے۔

پھر میری ملاقات سعید بن جبیر سے ہوئی تو میں اسے علیؑ بن الحسینؑ کی بات بتائی کہ انہوں نے یوں کہا ہے تو سعید بن جبیر نے اپنے فرزند کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تو ان کی بات کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں ان کی بات کو آپ کی اور مقسم کی بات سے بہتر سمجھتا ہوں (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۸۷)

آپ ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اس سلسلہ سے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان کے تناظر میں مذکورہ بالا روایت آیت مبارکہ کے ظاہر سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔

صدقہ: کفارۂ گناہ

کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے حلبیؒ کے حوال سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر ذکر کیا، اور تفسیر العیاشی میں ابو بصیر کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا بیان مذکور ہے کہ آپؑ نے آیۂ مبارکہ ''فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس کے گناہوں میں سے اسی مقدار میں معاف کئے جائیں جس قدر اس نے زخموں وغیرہ کی بابت معاف کیا ہوگا۔ (فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸، تفسیر العیاشی جلد اوّل ص ۳۲۵)۔

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن مردویہ نے انصار کے ایک شخص کے حوالہ سے بیان کیا کہ اس نے کہا حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیۂ مبارکہ ''فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: جس شخص کے دانت توڑ دیئے جائیں یا اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے یا اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹا یا زخمی کیا جائے اور وہ مجرم کو معاف کر دے تو اسی مقدار میں اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اگر اس کی سزا ۱/۲ دیت ہو تو اس کے ۱/۴ گناہ معاف کئے جائیں گے اور اگر 1/3 گناہ اور اگر پوری دیت ہو تو اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۸۸)

اسی روایت کے مانند ایک روایت دیلمی کے حوالہ سے ابن عمر سے بھی منقول ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۲۸۹)، یہ بھی ممکن ہے کہ اس روایت اور اس سے پہلی روایت میں گناہوں کے کفارہ کی بابت دیت کی مقدار کو معیار قرار دیا گیا ہے وہ دیت کی مقررہ شرعی حد و مقدار کو قصاص قرار دے کر قصاص اور دیت دونوں کی بنیاد پر گناہوں کی بخشش کا حساب لگایا گیا ہو اور چونکہ گناہوں کی بخشش تناسب و تقسیم پذیر ہے لہٰذا دیت کی بعض مقدار گناہوں کی بعض مقدار کے برابر اور پوری دیت کے تمام گناہوں کی بخشش کے برابر ہونا قابل تصور و تطبیق ہے۔

تفسیر قمی کی روایت:

تفسیر قمیؒ میں آیۂ مبارکہ ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ امامؑ نے فرمایا: ہر نبی کے لئے مخصوص شریعت اور دستور العمل معین کیا گیا ہے۔ (تفسیر قمی، جلد اوّل، صفحہ ۱۷۰)

چار قسم کے قاضی:

تفسیر البرہان میں آیہ مبارکہ ''اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ کتاب کافی میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ذکر کیا کہ احمد بن محمد بن خالد نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے سلسلہ سند ذکر کئے بغیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی بیان کیا جس میں آپؑ نے فرمایا: القضاة اربعة، ثلاثة فی النار و واحد فی الجنة، رجل یقضی بجور و هو یعلم فهو فی النار، ورجل یقضی بجور و هو لایعلم فهو فی النار، ورجل قضی بالحق، ورجل قضی بالحق و هو یعلم فهو فی الجنة وقال (ع): الحکم حکمان: حکم الله وحکم الجاهلیة، فمن اخطاء حکم الله حکم بحکم الجاهلیة،

قاضیوں کی چار قسمیں ہیں جن سے تین دوزخ میں اور ایک بہشت میں جائے گا (۱) جو شخص علم و آگاہی کے باجود ظالمانہ فیصلہ کرے وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ (۲) جو شخص علم و آگاہی سے عاری ہو اور ظالمانہ فیصلہ کرے وہ جہنم میں جائے گا، (۳) جو شخص برحق فیصلہ کرے مگر علم نہ رکھتا ہو وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلے گا، (۴) جو شخص برحق فیصلہ کرے اور علم بھی رکھتا ہو وہ بہشت میں جائے گا۔

اور امامؑ نے یہ بھی فرمایا: فیصلہ کی دو قسمیں ہیں: ایک خدائی فیصلہ، دوسرا جاہلیت کا فیصلہ، جو شخص خدائی فیصلہ (اللہ کے نازل کردہ کے مطابق) نہ کرے تو گویا اس نے جاہلیت کا فیصلہ کیا۔ (تفسیر البرہان، جلد اوّل صفحہ ۴۷۸)۔

مذکورہ بالا دونوں معانی کی بابت متعدد روایات شیعہ و سنی اسناد سے ان کی معتبر کتب حدیث میں قضاء و شہادات کے باب میں مذکور و منقول ہیں اور آیہ مبارکہ میں ان دونوں معنوں کی طرف اشارہ بلکہ واضح ثبوت پایا جاتا ہے اور وہ یوں کہ جہاں تک پہلے معنی کا تعلق ہے تو قاضی کا ظالمانہ و غیر منصفانہ فیصلہ خواہ اس کے علم و آگاہی پر مبنی ہو یا اس نے علم و آگاہی کے بغیر اسے صادر کیا ہو دونوں صورتوں میں حکم بالجور کہلائے گا اگرچہ دوسری صورت میں اتفاقی طور پر ایسا ہوا ہو لیکن نتیجتاً جور و ظلم کہلائے گا اور یہی حال اس صورت کا ہے جب جہالت کی بناء پر فیصلہ دیا ہو خواہ وہ فیصلہ صحیح و برحق ہی کیوں نہ ہو تو یہ سب

صورتیں خواہشات کی پیروی ہی کے باب سے ہیں کہ جس کی ممانعت میں واضح ارشاد الٰہی ہے: ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ '' (پس ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اس حق سے روگردانی کرتے ہوئے جو آپ کے پاس آچکا ہے) اس آیت میں فیصلہ کرنے میں خواہشات کی پیروی کرنے سے بچ کر رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے تقابل میں برحق فیصلہ کرنا مذکور ہے تو اس تقابلی بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حق کا علم رکھنا فیصلہ کرنے کے جواز کی بنیادی شرط ہے ورنہ اس کے بغیر فیصلہ کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں اپنی خواہش ومرضی کی پیروی پائی جاتی ہے کہ جس سے منع کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اسے جاہلیت کا فیصلہ کہا جائے گا جو کہ حکم اللہ کے مدمقابل ہے اور جہاں تک دوسرے معنی کا تعلق ہے یعنی حکم وفیصلے کا دو قسموں میں تقسیم ہونا کہ ایک جاہلیت کا حکم وفیصلہ اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حکم وفیصلہ، تو اس کا ثبوت یہ جملہ ہے ''اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا'' (کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں جبکہ اللہ کے سوا سب سے اچھا حکم کس کا ہوسکتا ہے؟) تو ان دونوں کے درمیان تقابل ملحوظ ہے جس سے ان دونوں کا ایک دوسرے کے مقابل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فقہاء وعلماء:

تفسیر طبری میں قتادہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے آیہ مبارکہ ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ'' کی تفسیر میں کہا ''ربانیون'' سے مراد یہودی فقہاء اور ''احبار'' سے مراد ان کے علماء ہیں۔ اور ہمیں بتایا گیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم یہودیوں اور دیگر ادیان کے پیروکاروں کے درمیان فیصلہ کریں گے (تفسیر جامع البیان، جلد ۶ صفحہ ۱۶۲)

یہی روایت تفسیر ''درمنثور'' میں اسی آیت (اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ) کے ذیل میں عبد بن حمید کے حوالہ سے اور ابن جریر نے قتادہ کے حوالہ سے مذکور ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ بیان کیا وہ آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے جو کہ حجت اور اس موضوع کی بابت حرف آخر ہے، مگر ان پر یہ اعتراض ممکن ہے کہ آیت مبارکہ صرف اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہودیوں کے لئے صرف تورات کے مطابق فیصلہ کیا جائے کیونکہ ارشاد ہوا ''لِلَّذِيْنَ هَادُوْا'' (یہودیوں کے لئے)، اس سے یہودیوں کے علاوہ کسی کے لئے یا یہودیوں کے لئے تورات کے علاوہ کسی کتاب سے فیصلہ کرنا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ ظاہر الروایہ سے واضح ہے سوائے اس کے کہ جملہ ''نحن نحکم'' سے مراد یہ

لیا جائے کہ انبیاء اس طرح فیصلہ کرتے ہیں یعنی ہم انبیاء یہودیوں اور ان کے علاوہ دیگر ادیان کے پیروکاروں کے لئے اس طرح فیصلہ کرتے ہیں تو یہ معنٰی جہاں نہایت کمزور اور نادرست ہے وہاں زیر نظر آیت سے کوئی ربط بھی نہیں رکھتا، ظاہراً بعض راویوں سے آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی قدر کو بیان کرنے میں غلط فہمی ہوئی، گویا کہ آنحضرتؐ نے یہ بات آیۂ مبارکہ ''وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کے نازل ہونے کے بعد فرمائی، اور سابق الذکر مطالب کے تناظر میں یہ روایت آیت میں مذکور ضمیر ''بَيْنَهُمْ'' کے تمام افراد بشر کی طرف لوٹنے سے مطابقت رکھتی ہے اور اسے صرف یہود کی طرف نہیں لوٹانا صحیح نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے اس آیت کو سابقہ آیت کی جگہ غلط فہمی سے ذکر کیا ہے۔

آیات ۵۱ تا ۵۴

○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۗ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

○ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۗ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

○ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۗ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۘ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۗ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

ترجمہ:

○ ''اے ایمان والو! تم یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنے دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں سے شمار ہوگا، یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا''

(۵۱)

○ ''چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں تیزی کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت ہم پر آپڑے گی، جبکہ عین ممکن ہے کہ اللہ فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز لائے جس سے یہ لوگ اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی چیز پر نادم و پشیمان ہوجائیں'' (۵۲)

○ ''اور اہل ایمان کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اللہ کی نہایت پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال برباد ہوگئے، پھر وہ خسارہ سے دوچار ہوگئے''

(۵۳)

○ ''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے منہ موڑ لے تو جان لو کہ اللہ بہت جلد ایسے لوگ لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں وہ لوگ مؤمنوں کے ساتھ نرم دل اور کافروں پر سخت دل و غالب ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی بدکلامی کی پرواہ نہیں کرتے، یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور اللہ بہت وسیع عنایت والا، ہر چیز سے بخوبی آگاہ ہے'' (۵۴)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں سرسری و اجمالی غور و فکر کرنے سے ان آیات کا اپنی ماقبل اور اسی طرح اپنی مابعد دو آیتوں ''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَ رَسُوْلُهٗ'' اور ان دو آیتوں کے بعد جملہ ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا'' اور پھر آیت مبارکہ: ''يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ'' سے ربط و پیوستگی غیر یقینی ہو جاتی ہے۔

اور جہاں تک ان چار آیتوں کا تعلق ہے (۵۱ تا ۵۴) تو ان میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں ایمان والوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی گئی ہے البتہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے مکی آیات میں ان کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا کیونکہ ان ایام میں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ان کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے وہ مدنی آیات میں ہے کہ ان سے مربوط مطالب ان میں مختلف موضوعات کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں بلکہ ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہونے والی آیات میں بھی ان کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ ان ایام میں اہل اسلام یہودیوں کے ساتھ معاشرت و میل جول اور لین دین وغیرہ میں یا ان کی سازشوں و مکارانہ چالوں کو ناکام بنانے میں مصروف تھے البتہ ان ایام میں نصاریٰ کے ساتھ زیادہ رابطہ نہ تھا سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ منورہ میں قیام کے آخری سالوں کی نصف مدت میں! شاید یہ چار آیتیں اسی دور میں نازل ہوئیں اور شاید ان میں جملہ ''فَعَسَى اللهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ'' میں فتح سے مُراد فتح مکہ ہو،

البتہ یہاں ایک نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ جس کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ممکن ہے سورۂ مائدہ حج الوداع کے سال یعنی فتح مکہ سے پہلے نازل ہوا ہو تو اس بناء پر ''فتح'' سے مُراد فتح مکہ کے علاوہ کوئی فتح ہو جو مسلمانوں کو نصیب ہوئی یا یہ کہ یہ آیات فتح مکہ اور پورے سورۂ مائدہ نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہوں۔

اس کے علاوہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخری آیت یعنی ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ'' کیا پہلی تین آیتوں سے تعلق رکھتی ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے ممکنہ مرتد ہونے کی خبر دی گئی ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اللہ انہیں لے آئے گا: ''فَسَوْفَ يَاْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ'' تو یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اصل صورتحال کو مبہم سے مبہم تر کرتا ہے، اور ان آیات کے شان نزول کی بابت جو روایات منقول ہیں ان میں

مفسرین حضرات کی ذاتی آراء کے سوا کچھ نہیں جیسا کہ آیات کے شان نزول کی بابت منقولہ روایات میں اکثر اسی طرح سے ہیں، اور اس طرح سے ان کا شدید صورت میں مختلف ہونا آیات سے فہم المعنٰی کے عمل کو سخت متاثر کرتا ہے اور اس میں دشواری پیدا ہوتی ہے اس پر مزید یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسباب نزول کی بابت اظہار رائے و تحقیق میں مذہبی و مسلکی تعصّبات نے بھی کسر نہیں چھوڑی بلکہ اختلافات کی شدت میں اضافہ بلکہ اصل وجہ بن گئی چنانچہ عنقریب اس کے شواہد آپ ملاحظہ کریں گے جو کہ روایات اور سابق ولاحق مفسرین کے اقوال میں واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔

ان آیات مبارکہ میں غور وفکر کرنے سے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار آیتیں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں اپنے اجزاء میں ایک دوسرے سے متصل و پیوستہ ہیں اور اپنی ماقبل اور مابعد آیات سے منقطع وغیر مربوط ہیں اور چوتھی آیت ان آیات میں اس اصل غرض ومقصد کی کہ جس کا بیان مقصود ہے تکمیلی حیثیت کی حامل ہے البتہ اس سے فہم المعنٰی میں تساہل اور ان بے التفاتیوں سے بچنا ضروری ہے جو ان آیات کی بابت بحث و تحقیق کرنے والے حضرات نے اپنی آراء میں کی ہیں بالخصوص اس آیت میں کہ جس میں بعض صفات وعلامات اور نشانیاں مذکور ہیں کہ ان کی بابت عنقریب مربوطہ مطالب ذکر کئے جائیں گے۔ ان آیات سے حاصل مطلب کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ یہودیوں و نصرانیوں سے دوستیاں اختیار نہ کریں اور اس سلسلہ میں انہیں شدید ترین انداز میں ڈرایا دھمکایا کہ اس کا نتیجہ ان کی دینی اقدار کی پامالی اور مذہبی سیرت کو داغدار ہی نہیں بلکہ سرے سے ختم کر دینے کا باعث بنے گا لیکن اللہ نے اس حقیقت سے بھی آگاہی دلائی کہ وہ بہت جلد ایسے افراد بھیجے گا جو دینی امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر دین کی بنیاد کو اس کی اصل حالت میں واپس لے آئیں گے اور اس نشاۃ ثانیہ کو یقینی بنائیں گے۔

یہود و نصاریٰ سے دوستی ممنوع!

O "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ"

(اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو سرپرست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست و سرپرست ہیں)

تفسیر "مجمع البیان" میں مذکور ہے کہ "اتخاذ" (تتخذوا) کا معنٰی کسی چیز پر اعتماد یا بھروسہ کرنا ہے تا کہ فلاں سلسلہ میں کام آئے۔ یہ لفظ (اتخاذ) "اُخذ" سے بابِ افتعال ہے کہ اصل میں یوں تھا "ائتخاذ" اور اس کا ہمزہ حرف "ت" میں تبدیل کر کے بعد والے حرف "ت" میں مدغم کر دیا گیا جیسا کہ "اتعاذ" میں ہوا جو کہ "وعد" سے بنا اور اس میں حروف "و" حرف "ت" میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "اُخذ" کے استعمالی معانی مختلف ہیں مثلاً جب یوں کہا جائے "اَخَذَ

الکتاب'' (اس نے کتاب لے لی) تو اس میں ہاتھ میں لینے، لے لینے کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور جب یوں کہا جاتا ہے: ''أخذ القربان'' (اس نے قربانی کو اخذ کیا) تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس نے قربانی کو قبول کر لیا۔ اور جب یوں کہا جاتا ہے ''أخذ الله من مأمنه'' (اللہ نے اسے اس کی پناہ گاہ سے لے لیا) تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اسے ہلاک کر دیا، اور اس کا اصل معنیٰ کسی کو چیز ایک جہت سے دوسری جہت میں لیجانا، منتقل کر دینا ہے۔ (مجمع البیان جلد ۳، صفحہ ۲۰۶)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے اپنی کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے کہ ''ولاء'' اور ''توالی''، ''تولّی'' کا معنیٰ یہ ہے کہ دو یا چند چیزیں اس طرح آپس میں اکٹھی ہوں، یکجا ہو جائیں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ان دونوں میں سے نہ ہو۔ اس لفظ کو استعارۃ مکان، نسبت، دین، دوستی، مدد و نصرت اور اعتقاد کے حوالہ سے قرب و نزدیک ہونے کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ (المفردات، صفحہ ۴۳۳)

اس سلسلہ میں تفصیلی بحث لفظ ''ولایت'' کے ذیل میں ہوگی۔ بہر حال ''ولایت'' کا معنیٰ کسی چیز کا دوسری چیز سے ایک طرح کا قریب تر ہونا ہے کہ وہ قرب و نزدیک ہونا ان کے درمیان پائے جانے والے موانع وحجابات کو اس مقصد کے لئے دور کرنے کا باعث ہو جس مقصد وغرض کے لئے وہ ایک دوسرے سے قریب ہوئے، لہٰذا اگر تقویٰ اور مدد و نصرت ملحوظ و مقصود ہو تو ''ولی'' کو وہ ناصر و مددگار کہا جائے گا جسے کوئی چیز اس شخص کی نصرت و مدد کرنے سے نہیں روک سکے گی جس کے ساتھ اس نے قرب اختیار کیا اور اگر معاشرتی میل جول اور محبت ملحوظ و مقصود ہو جو کہ روحی پیوستگی و روحانی دل بستگی کا نام ہے تو ''ولی'' اس محبوب کو کہا جائے گا جس کی خواہش و چاہت کو پورا نہ کرنا انسان کے بس میں نہ رہے بلکہ وہ جو کچھ چاہے اسے دے دے اور اگر قرب و نزدیک ہونا نسب کے حوالہ سے ہو تو ''ولی'' اس وارث کو کہیں گے جس کے وارث ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہو سکے اور اگر اطاعت و فرمانبرداری کی غرض ملحوظ و مقصود ہو تو ''ولی'' کا معنیٰ حاکم ہوگا جو دوسروں پر جو چاہے فرمان جاری کرے، یہ ہے ولایت کے مقصد وغرض کا حوالہ، جہاں تک زیر نظر آیت مبارکہ کا تعلق ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے جملہ ''فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ'' (آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان کی طرف تیزی کے ساتھ جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی بلا و مصیبت نہ آپڑے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ولایت سے مُراد ایک طرح کا قرب و پیوستگی اور ربط ہے جو کہ ان کے اس بیان سے مناسب تر ہے جس میں انہوں نے کہا ''ہمیں ڈر ہے کہ کوئی مصیبت ہم پر نہ آپڑے'' (نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ) کیونکہ بیمار دل لوگ یہود و نصاریٰ سے خوفزدہ تھے کہ ان کی سلطنت میں ان کے مظالم کا شکار نہ ہوں جیسا کہ انہیں یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسروں سے بھی خوف لاحق تھا کہ کہیں ان کی طرف سے ان پر کوئی مصیبت نہ آپڑے، لہٰذا وہ یہود و نصاریٰ سے دوستی و نزدیکی روابط کے خواہاں و درپے رہتے تھے تاکہ اس طرح ان کی مدد و نصرت حاصل کر سکیں اور یہ اسی طرح خود یہودیوں اور نصرانیوں کے ڈر سے ان

سے قرب و دوستی کے خواہاں وکوشاں تھے کہ کہیں ان کی طرف سے انہیں خطرہ لاحق نہ ہو اس لئے وہ ان سے محبت و میل جول رکھنا چاہتے تھے تا کہ ہر ممکنہ خطرہ سے نجات پا سکیں۔

اور ''ولایت'' سے قرب و میل جول اور رابطہ و پیوستگی کا معنیٰ مُراد لینا دونوں فوائد کا حامل ہے یعنی نصرت و مدد اور روحانی پیوستگی! جو کہ آیت میں مقصود و مراد ہے اور عنقریب بیان کیا جائے گا کہ آخری آیت یعنی ''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا مَن یَرْتَدَّ مِنکُمْ عَن دِینِهِ'' میں جو قیود و صفات ملحوظ ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں ولایت سے مُراد صرف دوستی و تعلق داری ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور بعض مفسرین نے بھی بھرپور اصرار اور تاکید کے ساتھ بیان کیا کہ ''ولایت'' سے مُراد نصرت و مدد کرنا ہے جو کہ دو انسانوں یا دو قوموں کے درمیان قسم یا عہد و معاہدہ کے ذریعے قرار پاتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کی مدد کرے گا اس مفسر نے اس نظریہ پر اس طرح استدلال پیش کیا کہ ان آیات مبارکہ کا حاصل خلاصہ یہ ہے جیسا کہ ان کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیات حجۃ الوداع سے پہلے اور ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل اسلام ابھی مدینہ کے یہودیوں اور فدک و خیبر وغیرہ کے یہودیوں کی شرانگیزیوں اور سازشوں میں گھرے ہوئے تھے اور دوسری طرف نصاریٰ تھے کہ جن کے اور بعض عرب قبائل کے درمیان ایک دوسرے کی مدد کرنے کے معاہدے اور حلفیہ قول و قرار طے پا چکے تھے، عین ممکن ہے کہ یہ نظریہ و موقف اسباب النزول میں وارد ہونے والی روایات سے مطابقت رکھتا ہو کہ جن میں مذکور ہے کہ عبادہ بن صامت نے کہ جس کا تعلق قبیلہ بنی عوف بن خزرج سے تھا قبیلہ بنی قینقاع سے لاتعلقی کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کی جبکہ ان کے درمیان دوستی کا حلفیہ معاہدہ ہو چکا تھا، لیکن عبداللہ بن ابی نے جو کہ منافقین کا سردار تھا ان سے لاتعلقی نہیں کی بلکہ قدم بہ قدم ان کا ساتھ دیتا رہا اور یہ کہتا رہا: ''نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ'' (ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آ پڑے) عبداللہ بن ابی قبیلہ بنی قینقاع کے ساتھ ملحق ہو گیا اور ان کے ساتھ حلفیہ معاہدہ کی بناء پر ساتھ دیتے ہوئے ممکنہ مصیبت سے دوچار ہونے کے بہانہ پریشہ دوانیوں میں لگا رہا، یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ (نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ) کی بابت درج ذیل روایات سے مطلوب و مقصود واضح ہو:

۱۔ ابولبابہ کے واقعہ میں مذکور و منقول ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بنی قریضہ کی طرف بھیجا تا کہ انہیں ان کے قلعہ سے نکال باہر کرے اور ان کے بارے میں فیصلہ صادر کرے، تو اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے گویا انہیں ذبح (قتل) کر دینے کی یقین دہانی کرائی۔

۲۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ بعض مسلمان شام کے نصرانیوں کو خط لکھ کر مدینہ کے حالات سے مطلع کرتے تھے اور بعض مسلمان مدینہ کے یہودیوں کو خبریں پہنچاتے تھے تا کہ ان کے اموال سے خواہ قرضہ کے طور پر سہی استفادہ کر سکیں۔

۳۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمان جنگ اُحد میں نہایت سنگین حالات سے دو چار ہونے اور قتل و مصائب کا شکار ہونے کی وجہ سے کسی یہودی یا نصرانی سے ملحق ہو گئے۔

توان روایات سے مجموعی طور پر یہ مطلب ثابت ہوتا ہے کہ جملہ ''نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ'' منافقوں نے کہا، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان آیات مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی و مدد کے معاہدے کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ اس طرح کے قول و قرار سے سخت منع کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے پرزور الفاظ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہا بلکہ دعویٰ کیا کہ اس آیت مبارکہ میں ''ولایت'' سے محبت و اعتماد والی ولایت مُراد ہے، حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق اور ترتیب و ترکیب سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور نہ ہی شانِ نزول سے اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ زمانہ تنزیل میں مسلمانوں اور اہل کتاب کی عمومی حالت کے تناظر میں اس کا قرین صحت ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ آیت کا یوں معنیٰ کیا جائے کہ اس میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے معاشرت و میل جول رکھنے سے منع کیا گیا ہے خواہ ان سے مفاہمت کے ساتھ اکٹھا رہنے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا معاہدہ بھی انجام پاچکا ہو؟ جبکہ یہودی، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے ساتھ ایک ہی شہر (مدینہ منورہ) میں اکٹھے رہتے تھے اور آپس میں مکمل برادری کی بنیاد پر لین دین کرتے تھے۔ (تفسیر المنار جلد ۶ ص ۴۲۹ کا خلاصہ)

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا مطالب آیت سے فہم المعنیٰ کی بابت تساہل و بے توجہی کا نتیجہ ہے اور جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آیات حجۃ الوداع والے سال سے کہ جس میں سورۂ مائدہ نازل ہوا پہلے نازل ہوئیں تو اگرچہ اس میں زیادہ اشکال نہیں لیکن ان آیات کا حجۃ الوداع والے سال سے پہلے نازل ہونا اس بات کا باعث قرار نہیں پاسکتا کہ ولایت سے مُراد محبت نہ ہو بلکہ مفاہمتی معاہدہ ہو،

اور جہاں تک اُن کی اس بات کا تعلق ہے کہ شانِ نزول کی بابت منقولہ روایات اور ان سے یہ ثابت ہونا کہ یہ آیات صرف مفاہمتی معاہدہ اور عرب کے بعض قبائل اور یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک دوسرے کی مدد کرنے کے عہد و میثاق کے بارے میں نازل ہوئیں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس پر تین طرح سے اشکال وارد ہوتا ہے:

۱۔ شانِ نزول والی روایات کے اپنے درمیان ایک دوسرے سے تعارض اور ایسا اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان سے کسی ایک مشترک قابل وثوق و اعتماد معنیٰ نہیں سمجھا جاسکتا۔

۲۔ اگر اس سے مفاہمتی معاہدہ اور ایک دوسرے کی مدد و نصرت کرنے کا عہد و میثاق ہی مقصود قرار دیا جائے تب بھی اس میں دونوں گروہوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں سے معاہدہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ ایک حوالہ سے صرف یہودیوں سے عہد و میثاق ملحوظ ہے کیونکہ اس وقت عرب مسلمانوں اور نصاریٰ کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ انجام نہیں پایا تھا۔

۳۔ شانِ نزول میں مذکور ومنقول روایات کے مضامین کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن آپ قارئین کرام آگاہ ہو چکے ہیں کہ شانِ نزول کی بابت منقولہ اکثر روایات سند کے حوالہ سے ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ رونما ہونے والے واقعات کو تاریخی تسلسل اور واقعاتی مناسبت کی بنیاد پر آیات پر منطبق کرنے کے باب سے ہیں۔

اس میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان روایات میں مذکورہ واقعات سے کسی بھی قرآنی آیت کی عمومیت یا لفظی اطلاق کو مقید کرنے کا نظریہ قرین صحت قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی آیات کے ظواہر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، اگر آیات کے ظواہر کو سبب نزول میں پائی جانے والی کسی خصوصیت کی بناء پر مقید کیا جائے یا اس میں تخصیص پیدا کی جائے جو کہ آیت کے الفاظ میں ماخوذ نہیں تو قرآن بھی ان افراد کے مرنے سے کہ جن کے بارے میں آیات نازل ہوئیں مر جائے گا اور زمانہ نزول کے بعد رونما ہونے والے واقعات میں سے کسی بھی واقعہ میں قرآنِ مجید سے استدلال ممکن نہ رہے گا جبکہ یہ بات نہ تو قرآن اور نہ ہی سنت بلکہ نہ ہی عقل سلیم سے درست قرار دی جاسکتی ہے۔

اور جہاں تک ان مفسرین کا تعلق ہے جنہوں نے کہا کہ ولایت سے محبت واعتماد مُراد لینا اس لئے درست نہیں کہ آیت مبارکہ کے الفاظ ولغت اور اس کا سیاق اس سے مبرا ہے اور اسبابِ نزول اور عصرِ نزول میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے عمومی حالات سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی، تو اس سلسلہ میں بخوبی غور کرنے سے اسے نتیجہ بخش قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ جو بات انہوں نے ذکر کی کہ شانِ نزول کی روایات اور اس دور کے عمومی حالات کے تناظر میں ولایت سے محبت واعتماد مُراد نہیں لیا جاسکتا، تو یہ اس صورت میں درست ہے جب آیت کے اس معنٰی پر انطباق کی کوئی صورت ممکن نہ ہو اور جہاں تک آیت کی دلالت کا شانِ نزول اور اس وقت کے عمومی حالات ہی سے مربوط ووابستہ ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ بلا دلیل بات ہے بلکہ اس کی رد میں دلیل موجود ہے اور وہ آیت کا مطلق ہونا اور اس اطلاق کا حجت ہونا ہے، اور آپ اس مطلب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیت مطلق ہے اور اس کے مقید ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں لہٰذا قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ جب کوئی تقییدی دلیل نہ ہو تو مطلق معنٰی ہی متعین اور حجت قرار پاتا ہے اور یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ ولایت کے لفظ کا اطلاق اس کے مطلق معنی یعنی محبت کا تعین کرتا ہے اور انہوں نے آیت کے مفردات اور سیاق کا جو حوالہ دیا ہے کہ اس سے ولایت کا یہ معنٰی ثابت نہیں ہوتا تو یہ بات بہت عجیب ہے کاش یہ واضح ہوتا کہ ان کا اس بات سے کیا مقصد ہے کہ آیت کے الفاظ ومفردات اور سیاق اس معنٰی کی نفی کرتا ہے اور اس سے مبرا ہے؟ عجیب بات تو یہ ہے کہ انہوں نے آیت کے الفاظ سے استدلال کے ساتھ ساتھ اس کے سیاق سے استدلال سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ آیت کے مفردات یا اس کے سیاق سے اس معنٰی کی نفی ہو اور وہ (مفردات یا سیاق) اس سے مبرا ہوں جبکہ آیت میں زیر بحث جملہ یعنی ''لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى أَوْلِيَآءَ'' (تم یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنے اولیاء نہ

بناؤ) کے بعد یہ جملہ ذکر ہوا ہے "بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" (وہ ایک دوسرے کے اولیاء ہیں) تو اس بابت میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاسکتا کہ ان کے درمیان مذکورہ "ولایت" سے مُراد محبت، اتحاد ومودّت ہے نہ کہ حلف والی ولایت! کیونکہ یہ بات بے معنیٰ ہے کہ یوں کہا جائے: "لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" (تم یہود ونصاریٰ سے عہد وپیمان نہ کرو، وہ ایک دوسرے سے عہد ومیثاق والے ہیں) تو کیا ان کا آپس میں عہد ومیثاق والا ہونا مسلمانوں کے ساتھ عہد ومیثاق کرنے سے مانع ہے؟ لہٰذا اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہودیوں کے درمیان جو وحدت پائی جاتی ہے اور جو چیز انہیں ایک دوسرے سے پیوستہ کرتی ہے وہ ان کی قومی وملّی محبت ہے، اور اسی طرح نصاریٰ کے درمیان ایک دوسرے سے پیوستگی کا سبب کوئی عہد وپیمان اور میثاق نہیں بلکہ صرف دین کے حوالہ سے پائی جانے والی محبت ومودت ہے اور یہ جملہ بھی اسی کا ثبوت دیتا ہے "وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ" (اور جو ان سے دوستی کرے گویا وہ انہی میں سے ہے) کیونکہ کسی گروہ کے چاہنے والوں کا کسی دوسرے گروہ کے افراد کے ساتھ شمار ہونا ان کے درمیان پائی جانے والی محبت ومودت کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جس سے متفرقات کا یکجا ہونا، بکھرے ہوئے خیالات ومختلف نظریات میں یکسوئی پیدا ہونا، افکار وادراکات، اخلاق وعادات میں پیوستگی، افعال واعمال میں مشابہت و ہمرنگی، محبت ومودّت کی اثر گزاری کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے دوستی کے رشتہ کی پختگی کے بعد اس طرح ہماہنگ ہوجانا یقینی ہو کہ وہ "دو" ایک قرار پائیں کہ جن کی چاہت وارادہ ایک ہو اور فعل وعمل ایک ہو اور ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے زندگی کی چال چلن اور معاشرتی معیار کے حوالہ سے مختلف نہ ہو، تو اس سے یہ بات درست قرار پاتی ہے کہ "جو شخص کسی قوم سے محبت ودوستی کرے وہ انہی میں سے شمار ہوگا اور ان کے ساتھ ملحق قرار پائے گا" چنانچہ یوں کہا گیا "من احب قوماً فهو منهم" (جو کسی قوم سے محبت کرے وہ انہی میں سے ہے)، اسی طرح یہ قول بھی ہے "المرء مع من احب" (ہر شخص اسی کے ساتھ شمار ہوتا ہے جس سے محبت رکھتا ہے)، اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے دوستی کرنے کی ممانعت میں یوں ارشاد فرمایا "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ" (اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف محبت ومودت کا ہاتھ بڑھاتے ہو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے) اس کے بعد چند آیتیں ہیں اور پھر یوں ارشاد ہوا: "وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور جو اُن سے دوستی کرے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں) (سورۂ الممتحنہ، آیت: ۹)

اس کے علاوہ درج ذیل آیت میں یوں ارشاد ہوا:

O سورۂ مجادلہ، آیت: ۲۲

"لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ"

(آپ کوئی ایسے لوگ نہیں پائیں گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ ان لوگوں سے دوستی کرتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہوں خواہ وہ ان کے باپ دادا، یا اولاد، یا بھائی یا رشتہ دار کیوں نہ ہوں)

اسی طرح درج ذیل آیت میں کافروں سے دوستی کرنے کی ممانعت کا حکم یوں بیان ہوا۔ اس میں ''کافروں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی شامل ہیں۔

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۲۸

''لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ''

(مؤمنین، مؤمنوں کی بجائے کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو شخص ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن اگر ان کا خوف لاحق ہو تو تقیہ اختیار کریں اور خدا تمہیں خبر دار کرتا ہے کہ اس سے (اس کے عذاب سے) بچ کر رہیں)

اس آیت میں صریح لفظوں کے ساتھ لفظ ''ولایت'' کو مودت اور محبت کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے عہد و پیمان اور باہمی تعاون کے معنیٰ میں استعمال نہیں کیا گیا، کیونکہ جن ایام میں سورۂ آلِ عمران کا نزول ہوا اس وقت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان کئی معاہدے اور عہد و میثاق ہو چکے تھے،

خلاصۂ کلام یہ کہ جو ''ولایت'' کسی قوم کے دوسری قوم کے ساتھ ملحق ہونے کا موجب بنتی ہے وہ محبت و مودت والی ولایت ہے باہمی تعاون وغیرہ کے معاہدہ والی ولایت نہیں اور یہ بات واضح و ظاہر ہے، اگر جملہ ''وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ'' کا معنیٰ یہ ہو کہ جو شخص کافروں سے تعلق داری و دوستی کرنے کی ممانعت کے باوجود ان سے باہمی تعاون و نصرت کا معاہدہ کرے وہ انہی میں سے شمار ہوگا کیونکہ اس نے اس ممانعت کے حکم کی نافرمانی کی اور ظالم قرار پایا لہٰذا وہ بھی ان ظالموں کے ساتھ ان کے ظلم میں شریک ہوا، تو یہ معنیٰ جہاں بے ربط و بے بنیاد ہے وہاں آیت کے الفاظ کے تناظر میں بھی قرین صحت نہیں کیونکہ اس معنیٰ کو مراد و مقصود قرار دینے کے لئے کلام میں اضافی قیود کی ضرورت ہوگی، جبکہ قرآنی بیانات میں یہ اسلوب معمول و ملحوظ ہے کہ جہاں بھی کسی اس کام کی ممانعت کا بیان مقصود ہو جس کا انجام دینا ممانعت کے حکم صادر ہونے سے پہلے جائز و روا تھا تو اس کا ذکر اشارۃً اس لئے ہوتا ہے کہ سابقہ جائز حکم کی حقیقت و اہمیت معلوم و ملحوظ رہے اور اس سے پہلے بلکہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار و موقف اور سیرت طیبہ کی عزت و احترام اور عملی پاسداری و حرمت برقرار رہے چنانچہ درج ذیل آیات مبارکہ اس حوالہ سے بطور مثال ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ توبہ، آیت: ۲۸

''اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا''

(یقیناً مشرکین نجس ہیں لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد الحرام میں داخل نہیں ہو سکتے)

- سورۂ بقر، آیت: ۱۸۷

''فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا''

(پس اب تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقرر کر دیا ہے اسے طلب کرو، اور کھاؤ پیو)

- سورۂ احزاب، آیت: ۵۲

''لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ''

(اس کے بعد آپ کے لئے عورتیں حلال نہیں اور نہ ہی یہ حق حاصل ہے کہ ان کی جگہ دوسری عورتوں سے شادی کریں)

یہ اور اس طرح کی دیگر آیات!

بنابرایں یہ مطلب واضح ہوا کہ آیت کے الفاظ اور اس کا سیاق، لفظ ''ولایت'' سے محبت و مودت کا معنیٰ مراد لینے میں مانع نہیں اور نہ ہی اس سے مبرا ہے، بلکہ اگر آیت کے الفاظ و سیاق کو اس سے مبرا مانا جائے تو اس کی دلیل و وجہ اس کے علاوہ ہوگی، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جملہ ''الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' (وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے) سے مُراد منافقین ہیں تو اس سلسلہ میں عنقریب وضاحت ہوگی کہ آیت کے سیاق سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

بنابرایں جملہ ''لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی'' سے مُراد یہ ہوگا کہ ان سے دوستی کرنا اس لئے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ اس سے مسلمانوں اور ان کے درمیان ایک دوسرے کی طرف روحانی کشش اور قلبی لگاؤ کا راستہ کھلتا ہے جو کہ طرفین کی ایک دوسرے پر اخلاقی اثر گزاری کا سبب بن جاتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اہل اسلام کی معاشرتی اقدار اکھاڑ پچھاڑ کا شکار ہو سکتی ہیں اور ان کی عملی سیرت جو کہ حق پر پیروی پر مبنی ہوتی ہے وہ کفر پر مبنی اس سیرت میں بدل جاتی ہے جس کی بنیاد نفسانی خواہشات کی پیروی، شیطان کی بندگی اور فطری حیات کے راستہ سے ہٹ جانے کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اہم نکتہ:

آیت مبارکہ میں ''اہل کتاب'' کی بجائے یہود و نصاریٰ کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں جبکہ اس کے بعد آنے والی آیت میں یوں ارشاد ہوا ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ'' (اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کا مذاق اُڑایا اور اسے بازیچۂ قیل و قال

بنادیا جو کہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور کافروں کو دوست نہ بناؤ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اہل کتاب'' کے الفاظ چونکہ ان کے مسلمانوں سے قریب تر ہونے کے غماز ہیں اور وہ بھی ایسا قرب جو محبت کے جذبات کو اُبھارتا ہے لہٰذا ان سے دوستی کرنے کی ممانعت کا حکم موزوں نہیں بنتا کیونکہ ''کتاب والے'' ہونے کے حوالہ سے مسلمان بھی اس کا مصداق ہیں، بنابرایں بعد والی مذکورہ آیت میں انہیں کتاب دیئے جانے کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان سے دوستی کرنے کی ممانعت کی گئی لہٰذا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ اُنہوں نے اللہ کے دین کو بازیچۂ قیل وقال بنایا اور دین خُدا کا مذاق اُڑایا ان کے اہل کتاب ہونے کے مدحتی بیان کو مذمتی صورت میں بدل دیتا ہے کیونکہ جسے کتاب دی گئی ہو کہ جو حق کی دعوت دینے والی ہو اور حق وحقیقت کو واضح کرنے والی ہو اور وہ شخص اس کے باوجود دین حق کا مذاق اُڑائے اور اسے بازیچۂ قیل وقال بنائے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے دوست نہ بنایا جائے اور اس سے میل جول، معاشرتی تعلق اور محبت کا رشتہ منقطع کردیا جائے اور جہاں تک جملہ ''بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ'' کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ یہاں ولایت سے مُراد محبت ہے جو کہ ان کے ایک دوسرے سے قریب تر ہونے اور روحانی پیوستگی کا باعث بنتی ہے تاکہ وہ سب نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے، حق سے روگردانی کرنے، نور خُدا کو خاموش کرنے کے لئے یکجا ہونے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے مددگار رہنے کے عہد وپیمان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اکٹھے ہوسکیں اور گویا وہ یک جان ویک قالب اور ملت واحدہ ہیں جبکہ وہ ملت واحدہ نہیں بلکہ وہ مختلف ملت وقومیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہیں مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی نے یکجا کردیا ہے کیونکہ اسلام انہیں حق کی راہ اپنانے کی دعوت دیتا ہے اور ان کے نزدیک سب سے زیادہ پیارے مقصد سے انہیں روکتا ہے جو کہ عبارت ہے نفسانی خواہشات کی پیروی سے اور دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے جذبوں سے! تو یہ وہ چیز ہے جس نے دونوں گروہوں یعنی یہود ونصاریٰ کو اپنے درمیان شدید ترین اختلاف ودشمنی کے باوجود اکٹھا کردیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے ہیں اور باہمی معاشرت ومیل جول کرتے ہیں اور یہی معنیٰ ہے جو جملہ ''بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ'' کے الفاظ میں پردۂ ابہام میں ہے یعنی لفظ ''اولیاء'' سے جو ابہامی صورت سامنے آتی ہے اس کا حل اسی معنی کے تناظر میں واضح ہو جاتا ہے، درحقیقت یہ جملہ ''بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ'' جملہ ''لَا تَتَّخِذُوا الۡیَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ'' کی علتِ واصل وجہ کے بیان پر مشتمل ہے لہٰذا اس کا معنیٰ یوں ہوگا کہ تم یہودیوں اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنے اندر پائے جانے والے شدید ترین اختلافات وتفرقہ کے باوجود تمہارے مقابلے میں متحد ویکجا ہیں لہٰذا تمہیں ان سے محبت ومودت اور دوستی کا رشتہ قائم کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا،

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ''بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ'' سے یہ معنیٰ سمجھا جائے کہ تم انہیں اپنا دوست نہ بناؤ کیونکہ تم اس لئے ان سے دوستی قائم کرنا چاہتے ہو کہ جن لوگوں سے تم دوستی کا رشتہ قائم کروگے وہ دوسروں کے مقابلے میں تمہارا ساتھ دیں

گے اور تمہاری مدد کریں گے لیکن یہ اس لئے تمہارے لئے مفید ثابت نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں لہٰذا وہ اپنوں کے خلاف تمہاری مدد نہیں کریں گے۔

ظالم: اللہ کی ہدایت سے محروم!

○ ''وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ''

(اور جو شخص ان سے دوستی کرے تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا، یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا)

''تولی'' کا معنیٰ دوست بنانا ہے،

''منکم'' میں حرف ''من'' تبعیض کا معنیٰ رکھتا ہے یعنی تم میں سے بعض،

آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص انہیں اپنا دوست بنائے وہ انہیں میں سے شمار ہوگا کیونکہ وہ انہیں میں شامل قرار پائے گا، تو اس طرح کا الحاق تنزیلی ہے یعنی اس سے بعض مسلمان بمنزلہ یہود و نصاریٰ ہو جائیں گے ایسا نہیں کہ وہ حقیقت میں یہودی یا نصرانی ہو جائیں گے بلکہ ان سے دوستی کا رشتہ قائم کرنے کی وجہ سے گویا انہی میں سے شمار کئے جائیں گے اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ ایمان خالص اور ناخالص وملاوٹ والا ہونے کے حوالہ سے مختلف مراتب و درجات رکھتا ہے جیسا کہ قرآنی آیات مبارکہ سے یہی مطلب معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

○ سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۶

''وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ''

(اور ان کے اکثر لوگ اللہ کو نہیں مانتے حالانکہ وہ مشرک ہیں)

اور اسی ناخالص اور ملاوٹ والا ہونے کو اللہ تعالیٰ نے مرض القلب (دل کی بیماری) سے تعبیر کیا ہے کہ اس کی وضاحت جملہ ''فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ'' کی تفسیر میں ہوگی،

بنابرایں وہ لوگ کہ جو یہود و نصاریٰ کو دوست بناتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں یہود و نصاریٰ ہی میں شمار کیا ہے اگرچہ وہ بظاہر ایمان والے ہیں، اس سے کم از کم یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہدایت کے اس راستہ پر چلنے والے نہیں جسے ''ایمان'' کہا جاتا ہے یعنی وہ ایمان والے کہلانے کے باوجود ایمان کی راہ پر نہیں چلتے بلکہ انہوں نے اس راستہ کو اختیار کیا جو یہود و نصاریٰ کا راستہ ہے اور وہ راستہ انہیں اسی منزل کی طرف لے جا رہا ہے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے لئے معین کی ہے اور وہ اس کی طرف رواں دواں ہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنانے والوں کو انہی کے ساتھ ملحق کر کے

یوں فرمایا ہے ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'' (اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت عطا نہیں کرتا)، لہٰذا پورے جملہ کا معنیٰ یوں ہوگا: تم میں سے جو شخص یہود و نصاریٰ سے دوستی کرے وہ انہی میں سے شمار ہوگا اور وہ تمہارے راستہ پر گامزن نہیں قرار پائے گا کیونکہ ایمان کا راستہ وہی ہے جو خدائی ہدایت کا راستہ ہے اور جو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنائے گا وہ انہی کی طرح ظالم قرار پائے گا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اور یہ آیۂ مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں صرف اصل التنزیل پر مشتمل ہے یعنی مؤمنین میں سے جو شخص یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنائے وہ بمنزلہ یہود و نصاریٰ کے ہے یعنی انہی کی طرح اور انہی میں سے ہے اس کے علاوہ آیت میں انہی میں سے ہونے یا بمنزلہ ان کے ہونے کے آثار و نتائج میں سے کسی کا ذکر نہیں ہوا اور آیت کے الفاظ میں اگرچہ کوئی قید و شرط مذکور نہیں لیکن چونکہ اصل حکم کے بنیادی بیان پر مشتمل ہے جیسا کہ درج ذیل آیات، احکام کے مقاصد و اہداف کے بیان پر مشتمل ہونے کی نسبت کی حامل ہیں:

- سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴

''وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ''

(اور اگر روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے)

- سورۂ عنکبوت، آیت: ۴۵

''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ''

(یقیناً نماز برائیوں اور غلط کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

لہٰذا اس آیت میں بھی اجمال پایا جاتا ہے اور اس سے مربوط احکام کے اثبات کے لئے سنت سے تمسک کرنا ناگزیر ہے اس سلسلہ میں فقہی بحثوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

بیمار دل لوگ:

- ''فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ''

(تو آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں بہت تیزی کرتے ہیں)

یہ جملہ سابق آیت میں مذکور جملہ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'' سے مربوط نتیجہ کے طور پر ہے کہ خدائی ہدایت ان بیمار دل افراد کو حاصل نہیں ہوتی کیونکہ وہ یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے اور محبت کے رشتہ کو مضبوط و مستحکم کرنے میں

بہت تیزی کرتے ہیں اوراس سلسلہ میں ان کا بہانہ ہرگز قابل قبول نہیں۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يُسَارِعُونَ فِيهِمْ'' (وہ ان میں تیزی کرتے ہیں) اور یوں نہیں فرمایا ''یسارعون الیهم'' (ان کی طرف تیزی سے جاتے ہیں) وہ تو انہی میں سے ہیں اور ان کے ساتھ گمراہی کے کھڈ میں گرے ہوئے ہیں تو یہ افراد ان میں اس لئے تیزی نہیں کرتے کہ ان کی طرف سے کسی تکلیف ومصیبت میں مبتلا کئے جانے کا خوف انہیں لاحق ہے کیونکہ وہ ان سے ہرگز خوفزدہ نہیں بلکہ یہ بات ان کا بہانہ ہے کہ جو اپنے لئے تراشتے ہیں تاکہ انہیں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنین کی طرف سے مذمت وتنبیہ کا سامنا نہ کرنا پڑے، بلکہ ان کا ایسا کرنا ان لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ سے محبت و دوستی قائم کرنے کی وجہ سے ہے،

اور چونکہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ہر ظلم اور باطل بالآخر مٹ جانے والا ہے اور اس کی رسوائی سب کے سامنے ظاہر ہو جائے گی اور ان لوگوں کی اُمیدوں پر پانی پھر جائے گا جو حق نمائی کے ذریعے اپنے باطل مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہیں جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' (یقیناً خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا) لہٰذا اس صورتحال میں قطعی طور پر یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اللہ کی طرف سے فتح کی نوید یا ایسا امر آجائے کہ وہ افراد کہ جو حق نمائی کے ذریعے باطل خواہی کرتے ہیں وہ اپنے کئے پر نادم ہوں اور جن باتوں میں وہ اپنے آپ کو برحق اور سچا ظاہر کرتے تھے ان میں مؤمنین پر ان کا جھوٹ اور جھوٹا ہونا ثابت وآشکار ہو جائے۔

ان مطالب سے جملہ ''فَتَرَى الَّذِيْنَ'' کا سابقہ جملہ: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' سے ربط واضح ہو جاتا ہے چنانچہ ظالموں کی ان کے ظلم کی وجہ سے ہدایت سے محرومی کے حوالہ سے مربوط مطالب واضح طور پر ذکر ہو چکے ہیں۔

بنابرایں وہ افراد اس لئے منافقین ہیں کہ وہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنوں کے سامنے جو کچھ ظاہر کرتے ہیں جس چیز کا اظہار کرتے ہیں وہ ان کے دلوں میں نہیں یعنی اپنے دل و باطن میں موجود حقائق کا اظہار نہیں کرتے بلکہ زبانی طور پر ہی سب کچھ کہتے ہیں کیونکہ وہ یہود و نصاریٰ سے تعلق ومیل جول کی بابت ان کے شر سے بچنے اور ان کی طرف سے نقصان پہنچنے کے ڈر کا بہانہ ظاہر کرتے ہیں جبکہ اصل بات جو کہ ان کے دلوں میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہیں تو یہ ان کی منافقت کی اصل وجہ ہے لیکن اگر ان کے منافق ہونے سے ان کا کافر ہونا اور ظاہری طور پر ہی ایمان کا اظہار کرنا مراد لیا جائے تو آیات کا سیاق اسے درست قرار نہیں دیتا (بعض حضرات کا خیال ہے کہ انہیں اس لئے منافق قرار دیا گیا ہے کہ وہ ظاہری طور پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جبکہ دلوں میں کافر ہیں، تو یہ خیال اس لئے صحیح نہیں کہ سیاق الکلام سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی)۔

یہاں ایک قول یہ بھی ہے جسے کچھ مفسرین نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ آیت میں جن منافقین کا تذکرہ ہوا ہے ان

سے مراد عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں جیسے افراد ہیں جیسا آیات کے اسباب نزول سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ وہ منافقین ہی تھے جو ایک طرف مؤمنین کے ساتھ معاشرتی میل جول رکھتے تھے اور ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے تھے اور دوسری جانب یہود و نصاریٰ کے ساتھ باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی مدد و نصرت کرنے کے معاہدے کرتے تھے تا کہ اس طرح دونوں گروہوں سے روابط برقرار رکھ کر اپنے مفادات کا تحفظ کریں اور ہر صورت میں اپنی مخصوص مصلحتوں و مقاصد کی پاسداری کو یقینی بنا سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں گروہوں میں سے جو بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہو یا اس پر دشمن کی طرف سے جنگ مسلط ہو جائے تو اس میں وہ محفوظ رہیں، تو ان کا ایسا کرنا ان کی طرف سے احتیاط کا راستہ اختیار کرنے کے طور پر تھا، لیکن یہ قول آیات کے سیاق سے موزونیت نہیں رکھتا کیونکہ آیات میں اس اُمید کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے فتح و کامیابی یا کسی دوسرے امر کے آنے کے نتیجہ میں وہ لوگ اپنے کئے پر پشیمان ہوں، خواہ اس فتح سے فتح مکہ مراد لیں یا یہودیوں کے قلعوں اور نصاریٰ کے ملکوں یا ان جیسے علاقوں کی فتح مراد ہو، تو اس صورت میں ان کے پشیمان و نادم ہونے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کیونکہ انہوں نے دونوں جانبوں سے اپنے لئے تحفظ کے اسباب مہیا کر لئے تھے اور احتیاط کی بھرپور عملداری کو یقینی بنا لیا تھا لہٰذا اب ان کے پشیمان ہونے کی کوئی وجہ باقی نہیں البتہ ان کے نادم و پشیمان ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ مؤمنوں سے پورے طور پر قطع تعلق کر لیں اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل جائیں اور پھر ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے، تو اس وقت وہ پشیمانی کا شکار ہو جائیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کیوں کی۔

اسی طرح یہ نظریہ و قول اللہ تعالیٰ کے ان کے بارے میں اس ارشاد سے بھی عدم صحت کا حامل نظر آتا ہے جس میں خدا نے ان کے اعمال کے ضائع و برباد ہونے اور ان کے خسارے و نقصان میں مبتلا ہونے کو بیان فرمایا ''حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ'' (ان کے اعمال ضائع ہو گئے تو وہ خسارہ پانے والے قرار پائے) کیونکہ اگر انہیں اپنے مفادات و مخصوص مقاصد کے تحفظ کے لئے احتیاط کے طور پر دونوں گروہوں سے تعلق و دوستی رکھنے والے منافقین قرار دیا جائے تو اس صورت میں ان کا خسارہ سے دو چار ہونا کیونکر قابل تصور ہوگا جبکہ کسی بھی نقصان و مصیبت اور ناگوار وخطرہ سے خوفزدہ شخص کا اس سے بچنے کیلئے احتیاط کی راہ اپنانا اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور جب وہ اس سے محفوظ و مامون ہو جائے تو پھر خسارہ کا شکار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کسی بھی سلسلہ میں احتیاط سے کام لینا عقلمندی کا بہترین راستہ ہے کہ جس کے بعد ندامت و پشیمانی یا ملامت و مذمت کی کوئی صورت نہیں بنتی، سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے کہ وہ اس لئے قابل مذمت قرار پاتے ہیں کہ انہوں نے خداوند عالم کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے یہود و نصاریٰ سے دوستی قائم کی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے فتح کا جو وعدہ کیا اس پر انہوں نے یقین نہ کیا اور ان کے دل اللہ کے وعدہ پر مطمئن نہ ہوئے، یہ خیال اگرچہ کسی حد تک صحیح ہے لیکن

آیت کے الفاظ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

فتح ونصرت کی اُمید:

''فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ'' (سورۂ المائدہ: ۵۲)

(امید ہے کہ اللہ فتح عطا کرے یا اس کی طرف سے کوئی ایسا امر آجائے جس سے وہ لوگ اپنے دلوں میں اصل حقیقت کو چھپانے کے عمل پر نادم وپشیمان ہوں)

لفظ ''عسٰی'' جس طرح ہر کلام میں امید کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے اور کلام الٰہی میں اسی معنٰی میں ہے جیسا کہ ہم اس سلسلہ میں بیان کر چکے یں کہ اللہ کے کلام میں اس کا امید کے معنٰی میں استعمال ہونا خود اللہ کے حوالہ سے نہیں بلکہ سامع یا مقام سخن کے حوالہ سے ہے لیکن یہاں قرینہ وشاہد موجود ہے کہ جس چیز کا تذکرہ ہوا ہے وہ قطعی ویقینی طور پر وقوع پذیر ہوگی کیونکہ یہ بات سابق الذکر جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' (اللہ ظالموں کو ہدایت کی نعمت سے نہیں نوازتا) کے یقینی ہونے اور اس اعلان وبیان کے سچا ہونے کو ثابت کرنے کی غرض سے ہے لہٰذا جو کچھ اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ یقینی طور پر وقوع پذیر ہونے والا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جس فتح کا تذکرہ کیا اور اسے اپنی طرف سے کسی امر کے درمیان مردّد صورت میں ذکر کیا کہ اس امر کی واضح مصداق معلوم نہیں بلکہ وہ ہمارے لئے نامعلوم ہے، تو اس فتح کے یقینی ہونے کی تصدیق لفظ ''الفتح'' پر الف ولام کو عہد کے بجائے جنس کے معنٰی کا حامل قرار دینے سے ہوتی ہے کیونکہ اگر اس نے بمعنٰی عہد لیں تو اس سے مراد فتح مکہ ہوگی کہ جس کے وقوع پذیر ہونے کی خبر درج ذیل آیتوں میں مذکور ہے:

- سورۂ قصص، آیت: ۸۵

''اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ''

(یقیناً وہ کہ جس نے آپ پر قرآن کی ذمہ داری عائد کی ہے وہ آپ کو اس جگہ واپس لیجائے گا جہاں سے آپ آئے ہیں)

- سورۂ فتح، آیت: ۲۷

''لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ''

(آپ یقیناً مسجد الحرام میں داخل ہوں گے اگر اللہ نے چاہا)

اس کے علاوہ دیگر آیات سے بھی یہ مطلب ثابت ہوتا ہے اور قرآن مجید میں جس فتح کا حوالہ وتذکرہ ہوا ہے اگرچہ اکثر مقامات میں اس سے مُراد فتح مکہ ہے لیکن بعض مقامات میں اس سے فتح مکہ مراد لینا مشکل ہے مثلاً:

○ سورۂ سجدہ، آیت: ۲۸ تا ۳۰

''وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِيْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ انْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ''

(اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ فتح کب آئے گی آپ ان سے کہہ دیں کہ جس دن فتح آئے گی اس دن کافروں کا ایمان لانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی انہیں اس دن کوئی مہلت دی جائے گی پس آپ ان سے منہ پھیر لیں اور اس دن کا انتظار کریں کہ وہ بھی انتظار کر رہے ہیں)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس فتح کے حوالہ سے فرمایا کہ اس وقت ایمان لانے والے کو اس کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا جبکہ وہ اس سے پہلے کافر تھا اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کافر اس دن کے انتظار میں ہیں تو ان امور کے تناظر میں واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں فتح سے مُراد فتح مکہ نہیں اور نہ ہی اس وقت تک مسلمانوں کو حاصل ہونے والی دیگر فتوحات مُراد ہیں کیونکہ اس دن ایمان کا فائدہ مند نہ ہونا یعنی توبہ کرنے کا بے نتیجہ ہونا دو طرح سے قابل تصور ہے جیسا کہ سورۂ نساء آیات ۱۷، ۱۸ ''اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ'' کی تفسیر میں توبہ کے حوالہ سے مربوط مطالب بیان کئے جا چکے ہیں ملاحظہ ہو المیزان جلد ۴ ص ۴۹۰)

(۱) دنیاوی زندگی اپنے اختتام کو پہنچنے اور دنیا کے آخرت میں بدل جانے سے بندوں کا اختیار ختم ہو جائے۔

(۲) انسانی وجود میں پائی جانی والی صفتیں و استعدادات کلّی طور پر بدل جائیں کہ ان کی وجہ سے دل میں ایسی قساوت و سختی پیدا ہو جائے کہ پھر توبہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف واپسی کی اُمید ہی باقی نہ رہے۔

جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۵۸

''يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا''

(اس دن تیرے رب کی بعض نشانیاں ظاہر ہوں گی تو اس شخص کو اس کا ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان سے کوئی خیر کسب نہ کی ہو)

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۸

''وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ

كُفَّارٌ‘‘

(ان لوگوں کی توبہ کی کوئی حیثیت نہیں جو موت آنے تک برے اعمال انجام دیتے رہے اور جب موت آئی تو کہنے لگے کہ اب میری توبہ! اور نہ ہی ان لوگوں کی توبہ قابل قبول ہے جو کفر کی حالت میں مریں)

بہرحال اگر فتح سے مُراد مسلمانوں کی فتوحات میں سے کوئی ایک ہو مثلاً فتح مکہ یا یہودیوں کے قلعوں کی فتح یا نصاریٰ کے ملکوں کی فتح، تو بات بنتی ہے لیکن جملہ ’’فَيُصْبِحُوا عَلٰى مَآ اَسَرُّوا‘‘ اور جملہ ’’وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ‘‘ اس سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اس سلسلہ میں وضاحت ہو چکی ہے۔

اور اگر فتح سے مُراد اسلام کا کفر پر فتح و غلبہ پانا اور اللہ تعالیٰ کا حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی قوم کے درمیان حتمی فیصلہ صادر کرنا ہو تو یہ بات ان قرآنی پیشگوئیوں میں سے ہوگی جن میں اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے مربوط مستقبل کے حوادث بیان فرمائے ہیں اور اس کا انطباق درج ذیل آیت پر ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عمومی سلسلہ ہدایت سے آگاہی دلائی ہے:

○ سورۂ یونس، آیت: ۴۷ تا ۵۶

’’وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ‘‘

(اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، پس جب ان کا رسول آجائے تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے)

اور جہاں تک اس جملہ کا تعلق ہے: ’’فَيُصْبِحُوا عَلٰى مَآ اَسَرُّوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ‘‘ تو ندامت اس صورت میں ہوتی ہے جب کوئی ایسا کام انجام دیا جائے جسے انجام نہیں دینا چاہئے تھا، تو اس آیت میں ان کے اس کام کا حوالہ دیا گیا ہے جو انہوں نے انجام دیا جبکہ انہیں وہ کام انجام نہیں دینا چاہئے تھا اور اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت میں ان کے اعمال کے ضائع ہونے اور ان کے نقصان و خسارہ سے دوچار ہونے کو بیان کیا کیونکہ انہوں نے اپنے دلوں میں یہود و نصاریٰ سے دوستی کے رشتہ کو چھپایا تاکہ اس کے ذریعے اور ان میں تیزی سے آگے جانے کے نتیجہ میں اس مقصد کو حاصل کریں جو یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں یعنی اللہ کے نور کو بجھانا اور کسی دینی رکاوٹ کے بغیر دنیاوی خواہشات کے مزے لینا!

تو یہ بات شاید وہ ہو جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپائی اور اس کے لئے ان کے ساتھ ہونے میں تیزی کی مگر بہت جلد خدا کی طرف سے حق کی فتح کے نتیجہ میں وہ اپنی کاوشوں کے ناکام ہونے پر ندامت سے دوچار ہو گئے۔

اور جملہ ’’وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا‘‘ میں ’’یقولُ‘‘ لام پر پیش کے ساتھ کو ’’یقولَ‘‘ لام پر زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے تاکہ اسے جملہ ’’فیصبحوا‘‘ پر عطف قرار دیا جائے تو یہ قرائت زیادہ قرین صحت ہے کیونکہ یہ سیاق الکلام سے زیادہ ہم آہنگ ہے، اور جہاں تک ان کے نادم و پشیمان ہونے اور مؤمنوں کے ان کے بارے میں یہ کہنے کا تعلق ہے: ’’اَهٰٓؤُلَآءِ‘‘

تو یہ سب کچھ ان کے یہود و نصاریٰ سے دوستی قائم کرنے پر ان کی سرزنش کے باب سے ہے، جملہ ''اَهٰٓؤُلَآءِ'' میں یہود و نصاریٰ کی طرف اشارہ، اور ''معکم'' (تمہارے ساتھ) کے الفاظ ان لوگوں سے خطاب ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے البتہ اس کے برعکس صورت بھی ممکن ہے، اور اسی طرح جملہ ''حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا'' میں ضمیر ''ھم'' کی بابت دونوں احتمال ممکن ہیں کہ اس کی بازگشت یہود و نصاریٰ کی طرف ہو یا بیمار دل افراد کی طرف ہو، لیکن سیاق الکلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیمار دل افراد ہی سے خطاب ہوا ہے تاہم یہود و نصاریٰ کی طرف اشارہ بھی ہے، اور جملہ: ''حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ'' گویا ایک سوال کا جواب ہے لہٰذا اس کا معنٰی یہ ہے کہ ممکن ہے خدا فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی ایسا سلسلہ بنا دے کہ اس وقت مؤمنین ان کمزور ایمان والوں پر اللہ کی ناراضگی و عذاب آنے کے وقت ان سے کہیں کہ کیا یہی وہ یہود و نصاریٰ ہی ہیں جنہوں نے پختہ قسمیں کھا کر اللہ کو گواہ بنا کر یہ نہیں کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں تو پھر اب وہ تمہارے کام کیوں نہیں آرہے؟ پھر گویا یہ سوال ہوا کہ یہود و نصاریٰ سے دوستیاں کرنے کا انجام کیا ہوا؟ تو اس کے جواب میں یوں کہا گیا: ''حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ'' ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ خسارہ اُٹھانے والے ہو گئے۔

دل کی بیماری:

آیت مبارکہ میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' (ان کے دلوں میں بیماری ہے) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دلوں میں بیماری کا پیدا ہونا ممکن ہے تو جب ان کا بیمار ہونا ممکن ہے تو ان کی صحت و تندرستی بھی ممکن ہے کیونکہ صحت اور بیماری ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اور ان میں سے کوئی ایسی کسی ایک جگہ وجود پذیر نہیں ہوتا جہاں دوسرے کے وجود پذیر ہونے کا امکان نہ پایا جائے، اس کی مثال بینائی و نابینائی سے دی جا سکتی ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ دیوار کو بیمار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں صحت و سلامتی کی نسبت کی گنجائش ہی نہیں۔

اور ان تمام موارد و مقامات میں کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں دلوں کیلئے بیماری کا ذکر کیا ہے وہاں ان بیمار دلوں کے احوال و آثار کے بیان میں جن اُمور کا حوالہ دیا ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دل اپنی فطری استقامت و پائیداری سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور سیدھی راہ سے ہٹ چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ احزاب، آیت: ۱۲

''وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا''

(اور جب منافقین اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول نے صرف دھوکہ

دینے کے لئے وعدے کئے ہیں)

○ سورۂ انفال، آیت: ۴۹

''اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ''

(جب منافقین اور بیمار دل افراد یوں کہیں گے کہ انہیں ان کے دین نے دھوکہ دیا ہے)

○ سورۂ حج، آیت: ۵۳

''لِّیَجۡعَلَ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ''

(تاکہ اللہ شیطانی القاءات کو ان لوگوں کیلئے آزمائش قرار دے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ سنگدل ہیں)

درحقیقت دل کی بیماری سے مُراد یہ ہے کہ اس میں شک وغیر یقینی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان متزلزل ہوجاتا ہے اور اس کی آیات کے بارے میں عدم اطمینان کی حالت دل کی شریانوں کو گھیر لیتی ہے، گویا دل کی بیماری ایمان وشرک کی آمیزش کا دوسرا نام ہے، اسی وجہ سے اس طرح کا دل گونا گوں حالات وکیفیات کی آماجگاہ بن جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اس دل والے شخص سے افعال واعمال کے مرحلہ میں اللہ اور اس کی آیات کے انکار (کفر) پر مبنی حرکات سرزد ہوتی ہیں، اور اس کے مقابلے میں دل کی سلامتی وصحت سے مُراد اس کا فطرت پر قائم و پائیدار رہنا اور درست راہ پر جما رہنا ہے کہ اس کا نتیجہ اللہ کی توحید میں اخلاص اور ہر اس چیز سے قطع تعلقی و دوری اختیار کرنا ہے جس کا تعلق نفسانی خواہشوں سے ہو چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل آیۂ مبارکہ سے واضح رہنمائی ملتی ہے:

○ سورۂ شعراء، آیت: ۸۸، ۸۹

''یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۹﴾''

(اس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد، سوائے اس کے کہ جو شخص پاکیزہ دل کیساتھ اللہ کے حضور آئے)

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوجاتا ہے کہ بیمار دل افراد سے منافقین کے علاوہ لوگ مُراد ہیں چنانچہ اس کا ثبوت دونوں کے تذکرے میں اس قرآنی بیان سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے: ''الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ'' (منافقین اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے) تو اکثر مقامات پر اس طرح کے الفاظ سے دونوں کا الگ الگ گروہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور وہ یوں کہ منافقین وہی لوگ ہیں جو زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں جبکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور خالص کفر دل کا مرجانا ہے اس کا بیمار ہونا نہیں ہے، اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۲۲

''اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ''

(کیا وہ شخص جو مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی قرار دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، دوسروں جیسا ہے؟)

○ سورۂ انعام، آیت: ۳۶

''اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؔ وَالْمَوْتٰى یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ''

(صرف وہی لوگ حق کی دعوت قبول کرتے ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں لیکن جو مُردہ ہیں اس دن سننے والے بنیں گے جب اللہ انہیں قبروں سے اُٹھائے گا)

بنابرایں قرآنی اصطلاح میں دل کی بیماری سے مراد وہ شک وشبہ اور غیر یقینی حالت ہے جو انسان کی قوت فہم و ادراک پر ان چیزوں کے بارے میں طاری ہوتی ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات مبارکہ سے ہو، اور دل کسی بھی دینی عقیدہ کو گہرائی سے قبول کرنے کی طاقت وصلاحیت کھو بیٹھتا ہے،

لہٰذا بیمار دل افراد جیسا کہ اس لفظ سے طبعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ ہیں جو ضعیف الایمان ہیں کہ جو ہر سنہرے رنگ کو سونا سمجھ کر اس پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اور ہر لحہ ہوا کے دوش پر سوار رہتے ہیں جبکہ منافقین وہ ہیں جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور کفر کو اپنے اندر چھپاتے ہیں تا کہ اس طرح اپنے دنیاوی مفادات کا تحفظ کر سکیں اور مومنوں کو اپنے ایمان کے اظہار کے ذریعے اور کافروں کو اپنے باطنی کفر کے ذریعے دھوکہ دے سکیں،

ہاں، یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن مجید میں بیمار دل افراد کو منافقین سے موسوم بھی کیا گیا ہے جو کہ ایک تجزیاتی صورت ہے کیونکہ وہ بھی منافقین کی طرح ایمان کی پاکیزگی ولطافت سے محروم ہیں تو اس لحاظ سے وہ بھی انہی جیسے ہیں البتہ یہ بات بیمار دل افراد کو اس کافر سے موسوم کرنے سے مختلف ہے جو صرف ظاہری طور پر ایمان لایا ہو، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۳۸ تا ۱۴۰

''بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ﴿﴾ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ﴿﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعَا''

(منافقین کو بشارت دیں کہ ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے وہ کہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں کیا وہ ان کے پاس عزت کی تلاش میں ہیں؟ عزت تو سب کی سب اللہ کے لئے ہے، حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب میں تمہارے لئے یہ فرمان صادر نہیں کیا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی بات میں مصروف نہ ہو جائیں

ورنہ تم انہی جیسے ہو جاؤ گے، یقیناً اللہ منافقوں اور کافروں سب کو دوزخ میں اکٹھا کرے گا)

اور جہاں تک سورۂ بقرہ کی آیات ۷ تا ۲۰ کا تعلق ہے کہ جن میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ '' (اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان والے نہیں)۔ ''فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا '' (ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ ان کی بیماری میں اضافہ کرتا رہتا ہے) ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ '' (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں؟) تو ان آیات میں ان بیمار دلوں کو اس لئے منافقین سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کے دل حق کے بارے میں شک سے اس کے انکار تک جا پہنچے اور یہ کہ وہ شروع ہی سے بیمار تھے کیونکہ انہوں نے اپنے ایمان کے حوالہ سے غلط بیانی سے کام لیا تھا اور وہ شک و غیر یقینی حالت میں مبتلا تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا یہاں تک کہ وہ حق کے انکار اور اس کا مذاق اُڑانے کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہو گئے۔

بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے دل کی بیماری کو جسمانی بیماریوں میں شمار کیا ہے کہ جو تدریجی طور پر بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہلاکت کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے اور یہ سب مریض کی لاپرواہی اور بیماری کے اسباب میں روز بروز اضافہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو کہ اللہ کی معصیت و نافرمانی کے سوا کچھ نہیں کہ جس کے حوالہ سے خداوند عالم نے فرمایا ''فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا '' (ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ ان کی بیماری کو بڑھا دیتا ہے) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰، اور یہی بات درج ذیل آیتوں میں بھی مذکور ہے:

○ سورۂ توبہ، آیت: ۱۲۶

''وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ ۔۔۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۞ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ''

(اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے، اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی پلیدی در پلیدی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ کفر کی حالت ہی میں مرجاتے ہیں کیا وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش کا شکار نہیں ہوتے مگر پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں)

○ سورۂ روم، آیت: ۱۰

''ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ''

(پھر گناہ و برائی کے مرتکب افراد کا انجام کار یہاں تک پہنچا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور وہ ان کا مذاق اُڑانے لگے)

اس آیت میں ایک عمومی بیان مذکور ہے:

دلوں میں بیماری کے ہونے کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج بھی ذکر فرما دیا اور وہ یہ کہ وہ اللہ پر ایمان لائیں چنانچہ ایک عمومی بیان میں یوں ارشاد فرمایا:

O سورۂ یونس، آیت: ۹

''يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ''

(ان کا پروردگار انہیں ان کے ایمان کی وجہ سے ہدایت سے نوازے گا)

O سورۂ فاطر، آیت: ۱۰

''إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ''

(اس کی طرف پاکیزہ کلمات اوپر جاتے ہیں اور نیک عمل اسے بلندتر کر دیتا ہے)

لہٰذا بیمار دل شخص پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اگر اپنی بیماری کا علاج کرنا چاہے تو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے جو کہ اس پر ایمان لانے اور اچھی سوچ اور نیک عمل کرنے سے عبارت ہے جیسا کہ اس مطلب کی طرف سابق الذکر آیت مبارکہ میں ان الفاظ میں ارشاد ہوا:

O سورۂ توبہ، آیت: ۱۲۶

''ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ''

(پھر وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ ہی نصیحت پاتے ہیں)

اور ایک جامع ارشاد میں یوں مذکور ہے:

O سورۂ نساء، آیت: ۱۴۴ تا ۱۴۶

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا''

(اے ایمان والو! تم مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے خلاف اللہ کے پاس واضح ثبوت چھوڑو، یقیناً منافقین دوزخ کے نچلے ترین درجے میں ہوں گے اور آپ ان کا کوئی مددگار نہ پائیں گے سوائے

ان لوگوں کے کہ جو توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں اور اللہ کے ساتھ پیوستہ ہو جائیں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لئے قرار دیں، تو وہ لوگ مؤمنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ بہت جلد مؤمنوں کو عظیم اجر عطا کرے گا)

اور سابق الذکر مطالب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یہاں توبہ سے مُراد اللہ کی طرف لوٹ آنا ہے جو کہ ایمان، ایمان پر استقامت و پائیداری، کتاب وسنت سے تمسک اختیار کرنا اور پھر اخلاص سے عبارت ہے۔

مرتد کے بارے میں واضح بیان:

○ ''یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ''

(اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے روگرداں ہو جائے)

ارتداد کا معنیٰ واپس جانا، لوٹ جانا اور پلٹ جانا ہے لہٰذا جب یوں کہا جاتا ہے ''ارتد عن دینہٖ'' (وہ اپنے دین سے مرتد ہو گیا) تو اس کا معنیٰ ہے: اس نے اپنا دین چھوڑ دیا، واپس پلٹ گیا، اور دینداروں کی اصطلاح میں اس کا معنیٰ ایمان سے کفر کی طرف پلٹ جانا کیا جاتا ہے خواہ وہ ایمان لانے سے پہلے کافر تھا یا نہ تھا جیسا کہ کوئی کافر ایمان لائے پھر مرتد ہو جائے یعنی کفر اختیار کرلے کہ ان دونوں کو مرتد ملی اور مرتد فطری سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح شرعی حقیقت پر مبنی ہو یا متشرعہ یعنی اہل شریعت کے درمیان رائج و معمول ہو دونوں صورتوں میں اس کا معنیٰ یہی ہے۔ یعنی ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا۔

ارتداد کے معنی کی بابت عموماً ذہن اسی معنیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو دینداروں کے ہاں مشہور و معروف ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ آیت میں بھی یہی مقصود و ملحوظ ہے: ایمان سے کفر کی طرف جانا، ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرنا، تو اس بناء پر یہ آیت اپنی ماقبل آیت سے غیر مربوط قرار پائے گی اور ایک مستقل آیت ہوگی جو اس مطلب کے بیان پر مشتمل ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض مؤمنین کے ایمان کی وجہ سے دوسروں کے ایمان سے بے نیاز ہے،

لیکن اس آیت میں بخوبی غور وفکر کرنے اور اس سے ماقبل آیات کو مدنظر قرار دینے سے اس قول کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اس قول ونظریہ کی بناء پر آیت کا مقصد یہ ہے کہ مؤمنین اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آگاہ و باخبر ہوں کہ وہ روئے زمین پر سب سے اپنی پرستش کروا سکتا ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ ایسے لوگ پیدا کرے جو اس کے دین سے روگردانی نہ کریں بلکہ اس سے وابستہ رہیں، اس سلسلہ سے مربوط آیات ملاحظہ ہوں:

○ سورۂ انعام، آیت: ۸۹

''فَاِنْ یَّکْفُرْ بِھَا ھٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِھَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِھَا بِکٰفِرِیْنَ''

(پس اگر یہ لوگ آیاتِ الٰہی کا کفر اختیار کریں تو کوئی بات نہیں، ہم نے ان پر ایسے لوگوں کو موکل کیا ہے جو کفر اختیار نہیں کریں گے)

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۹۷

''وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ''

(اور جو شخص بھی کفر اختیار کرے تو اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے)

○ سورۂ ابراہیم، آیت: ۸

''إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ''

(اگر تم اور جو بھی زمین میں ہیں سب ہی کفر اختیار کریں تب بھی معلوم رہے کہ اللہ بے نیاز و تعریف والا ہے)

تو اس صورتحال میں اصل غرض یعنی اس مطلب سے آگاہ کرنے سے زیادہ کسی چیز کے بیان واظہار کی ضرورت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو لے آئے گا جو اس کے دین سے روگردانی اختیار نہیں کریں گے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان کی اس صفت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ انہیں دوست رکھتا ہے اور یہ کہ وہ مومنین پر نرم دل اور کافروں پر سخت دل ہیں تو یہ اور آیت میں مذکور دیگر اوصاف اصل موضوع سے زائد امور ہیں کہ جن کے بیان کے لئے یقیناً دیگر عوامل ہیں جو مقتضائے مقام وحال کے عین مطابق ہیں،

اور دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ آیۂ مبارکہ میں جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں وہ سابقہ آیات میں مذکور یہود و نصاریٰ سے دوستی قائم کرنے کے مسئلہ سے بے ربط نہیں کیونکہ مومنین کو چھوڑ کر انہیں یعنی یہود و نصاریٰ کو دوست بنانا ان سے قلبی محبت و مودّت کے بغیر قابل تصور نہیں، تو جب دل میں دشمنانِ خدا کی محبت و مودت موجود ہو تو کیونکر ممکن ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت جگہ پائے؟ اور خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا:

○ سورۂ احزاب، آیت: ۴

''مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ''

(اللہ نے کسی شخص کے اندر دو دل نہیں بنائے)

یہاں اس مطلب کا بیان ضروری ہے کہ یہود و نصاریٰ سے دوستی قائم کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مومنین ان کافروں کے سامنے فروتنی کریں، پستی دکھائیں اور کافر مومنین پر برتری و سروری کا برتاؤ کریں، جیسا کہ اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۳۹

''اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا''

(کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، عزت تو سب کی سب اللہ سے مخصوص ہے)

اور ان سے دوستی قائم کرنے کے لازمی نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ ان سے جہاد کرنے کی بابت تساھل و بے رغبتی ہو جائے گی اور ان سے قتال کرنے سے بچنے کی راہ اختیار کی جائے گی بلکہ ان کی طرف سے ہر طرح کی زیادتی و ظلم اور استبداد واستحصال کو برداشت کرتے ہوئے ان کے ساتھ معاشرتی طور پر قطع روابط کی بابت ہر طرح کی ناگواری سہنی ہوگی، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

○ سورۂ ممتحنہ، آیت: ۱

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَقَدۡ كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَاِیَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ''

(اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف مودت وقلبی لگاؤ کا ہاتھ بڑھاتے ہو جبکہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے اگر تم میری راہ میں جہاد کو نکلے ہو اور میری خوشنودی کے خواہاں ہو تو ان سے دوستی قائم کرنے پر کیوں خوش ہوتے ہو)

○ سورۂ ممتحنہ، آیت: ۴

''قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ''

(یقیناً تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی سیرت بہترین نمونۂ عمل ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور اس سے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جس کی پوجا کرتے ہو برائت کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور اب ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کی دشمنی و دل رنجی شروع ہو گئی ہے اور یہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ گے)

اسی طرح ''ارتداد'' اپنے لغوی معنی یا اس کے تجزیہ وتحلیل پر مبنی صورت کی بناء پر کفار سے دوستی کرنے سے پوری مطابقت رکھتا ہے جیسا کہ سابقہ آیت (۵۱) میں یوں ارشاد ہوا: ''وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ'' (اور تم میں سے جو ان سے دوستی کرے تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا) اور درج آیل آیتوں میں یوں ارشاد ہوا:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۲۸

''وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَلَيۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِىۡ شَىۡءٍ''

(اور جو شخص ایسا کرے تو اللہ کے پاس اس کی ذرہ بھر حیثیت نہیں)

○ سورۂ نساء، آیت: ۱۴۰

''اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ''

(پھر تم انہی جیسے ہو گے)

اس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اپنی ماقبل آیات سے ربط و پیوستگی رکھتی ہے اور اس میں اس مطلب کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ کا دین ان لوگوں سے بے نیاز ہے جن سے مخالفت کی وادی میں گرنے اور یہود و نصاریٰ سے دوستی پر قائم رہنے کا اندیشہ ہے کیونکہ نفاق ان لوگوں میں رچ بس چکا ہے اور وہ دل کی گونا گوں بیماریوں میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے دین بیچ کر دنیا خریدنا ان کے لئے عار نہیں رہا اور وہ اس حقیقی عزت پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے پاس ہے اور اس حقیقی سعادت پر جو دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن ہے دشمنانِ دین کے پاس جھوٹی عزت اور فانی دنیا کی زوال پذیر زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں مذکورہ بالا مطالب کا اظہار اس غیبی پیشگوئی کے ذریعے ہوا ہے اور وہ یہ کہ دین الٰہی چونکہ اس طرح کے ضعیف الایمان لوگوں کے گھیرے میں آ گیا ہے کہ جنہوں نے اللہ کی محبت کے مقابلے میں غیر اللہ کی محبت کو اختیار کر لیا اور خدا کے دشمنوں کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں اور جہاد کی بابت تساہل و بے پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہر قسم کی ملامت و مذمت کا خوف انہیں کھائے جاتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ بہت جلد ان لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ مؤمنوں سے نرمی جبکہ کافروں سے سختی کرتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور انہیں ملامت کرنے والے کی ملامت و بدگوئی کی کوئی پروا نہیں۔

اکثر مفسرین حضرات اگرچہ اس مطلب کی طرف متوجہ و ملتفت ہوئے ہیں کہ آیۂ مبارکہ پیشگوئی پر مشتمل ہے اور انہوں نے اس سلسلہ میں طویل بحثوں کے ذریعے اس کے مصداق سے آگاہی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ واضح ہو سکے کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے بارے میں آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دوست رکھتا ہے اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں کہ جنہیں اللہ ان بیمار دل لوگوں کی جگہ پر لے آئے گا لیکن اس کے باوجود ان مفسرین نے آیت کے الفاظ کی تفسیر میں نہایت بے توجہی سے کام لیا اور آیت میں جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں ان کے معانی کی بابت ان کا حق ادا نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کے کلام کو غیر اللہ کے کلام کی طرح قرار دیتے ہوئے اس میں ہر طرح کے مسامحہ و تساہل کی گنجائش پائے جانے کو روا جانا جو کہ عام طور پر مخلوق کے کلام میں ہوتا ہے۔ جبکہ یہ حقیقت ثابت و واضح ہے کہ قرآن مجید نے

اپنی بلاغت میں نیا نویلا اسلوب اختیار نہیں کیا اور نہ ہی الفاظ کے استعمال کرنے اور جملوں کی ترکیب اور کلمات کو ان کے معانی کی جلوہ گری میں موزوں مقام پر قرار دینے میں کسی نئے اور نامانوس انداز وطریقہ کو اپنایا ہے بلکہ کلام کے معروف و مانوس اسلوب ہی کو اختیار کیا جو کہ اس کے علاوہ ہر کلام میں پایا جاتا ہے لیکن اسے دیگر ہر کلام سے جو امتیاز حاصل ہے اس کی وجہ ایک خاص امر ہے اور وہ یہ کہ عام طور پر ہم لوگ کہ جو بلیغ اور غیر بلیغ کلام کرنے والے ہیں اپنے کلام کی بنیاد ان معانی کو قرار دیتے ہیں جو ہماری عقلوں کے دائرے میں سماتے ہیں اور ہم جن معانی کا فہم وادراک رکھتے ہیں وہ ہماری اس معاشرتی زندگی سے حاصل ہونے والے امور ہیں جسے ہم نے اپنی انسانی معاشرتی فطرت سے تشکیل دیا ہے کہ جو قیاسی اصولوں پر مبنی ہے لہٰذا ہمارے ذہنوں میں تسامح و بے توجہی اور لاپرواہی و اصل حقائق سے غفلت کا باب کھل جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ''کثیر'' (زیادہ) کو ''جمیع'' (سب) اور ''غالب'' (اکثر) کو ''دائم'' (ہمیشہ) قرار دیتے ہیں اور ہم ہر قیاسی امر کو مطلق امر سمجھتے ہیں اور ہر نادر و کمیاب کو معدوم کی فہرست میں شمار کرتے ہیں ہمارا معمول یہ ہے کہ معمولی سی چیز کو سرے سے موجود نہ ہونے والی چیز قرار دے دیتے ہیں مثلاً ہمارا عام فرد یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے: یہ کام اچھا ہے یا برا ہے، یہ کام پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ ہے، یہ کام قابل تعریف ہے یا قابل مذمت ہے، یہ چیز فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے، فلاں شخص اچھا ہے یا برا و شریر ہے، تو اس طرح کے عمومی استعمال کی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور ہم آپس میں ان الفاظ کے روزمرہ استعمال کے عادی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی قضاوتیں دائمی اور مطلق صورتوں کی حامل نہیں بلکہ بعض حالات اور بعض صورتوں میں اسی طرح بعض افراد کے حوالہ سے اور بعض چیزوں کی نسبت سے درست قرار دی جاسکتی ہیں لیکن جو شخص اس طرح کے الفاظ زبان پر لاتا ہے وہ اپنے تئیں قرار دیئے ہوئے معانی اور اپنے فہم وادراک میں آئے ہوئے مفاہیم کے علاوہ ہر چیز کو نادرست ہی نہیں بلکہ ناقابل وجود قرار دیتا ہے اور ممکن ہی نہیں سمجھتا، یہ بات تو اس کے عالم الادراک میں آنے والی بعض ان جہتوں کے تناظر میں ہے جن کے مصادیق اس کے مشاہدہ میں آتے ہیں اور جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو اس کے آئینہ فکر و فہم کی دسترس سے باہر ہیں اور ان کی بابت اس کے ادراک کی محدودیت کی وجہ سے اس کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے تو وہ کہیں زیادہ ہیں لہٰذا انسان جس چیز کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنی زبان پر لاتا ہے اور اسے ہی اپنی قوت ادراک کا کمال و حقیقت آشنائی سمجھتا ہے وہ اصل میں تسامح اور بعض جہات سے غفلت و عدم توجہی پر مبنی ہوتا ہے بلکہ بعض امور میں جہالت و عدم آگاہی اس کا اصل سبب ہوتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ بات مذاق سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو حقیقت تک رسائی کے دعوے کے ساتھ کسی کے کلام کو اس سے کامل مطابقت کا حامل قرار دیں، (ان مطالب پر اچھی طرح غور کریں)

تو یہ ہے انسان کے کلام کا حال کہ جو اس کے اس علم پر مبنی ہوتا ہے جو کسی چیز کے بارے میں اسے حاصل ہوتا ہے لیکن جہاں تک اللہ کے کلام کا تعلق ہے تو اسے نقص و خامی سے منزہ و پاک قرار دینا واجب وضروری ہے کیونکہ وہ اپنے علم کے

ساتھ ہر چیز پر محیط ہے۔اس کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے چنانچہ اسی سلسلہ میں اس کا ارشاد ہے:''اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ''(وہ (قرآن) فیصلہ کن بات ہے۔حق و باطل کے درمیان فرق کو واضح کرنے والا۔وہ کوئی مذاق۔و بے غرض کلام نہیں)۔

تو یہ بات کلام الٰہی کے اطلاق سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے ظاہر سے تمسک پر مبنی ایک دلیل قرار پاتی ہے کیونکہ اس اطلاق کے بعد متصل یا منفصل طور پر کوئی قید و شرط مذکور نہیں۔جس کی بناء پر یوں کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس میں کوئی دوسری چیز ملحوظ ہوتی تو یقیناً ذکر کی جاتی لہٰذا اس کا اطلاق حجت ہے اور کلام الٰہی میں بعد میں آنے والوں کی جو صفت ذکر ہوئی ہے وہ اس کے حکم کی اصل علت و وجہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے چنانچہ جب خداوند عالم نے فرمایا''يُّحِبُّهُمْ''(وہ انہیں دوست رکھتا ہے)تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی چیز میں ان سے ناراض نہیں ہوتا ورنہ اس کا حوالہ و تذکرہ استثنائی صورت میں ضرور کرتا،اور جب اس نے ان کی توصیف ان لفظوں میں کی''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ''(وہ مؤمنوں پر نرمی کرنے والے ہیں)تو ان پر واجب و لازم اور ضروری ہے کہ وہ مؤمن ہونے کی حیثیت میں ان سے نرمی کرنے والے ہوں کیونکہ اللہ پر ایمان رکھنے والا ہونا نرمی کا برتاؤ کئے جانے کی اصل وجہ و سبب ہے،اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر حال اور ہر صورت میں نرمی کرنے والے ہوں ورنہ یہ بات''قولِ فصل''قرار نہیں پائے گی،

ہاں! کچھ معانی ایسے بھی ہیں جو اصل افراد کی طرف منسوب نہیں کہ اگر ان کے یکجا کرنے اور پیوستگی کو ملحوظ قرار دیا جائے تو ان کا انتساب قرین صحت قرار پا سکتا ہے،اس مطلب کی مزید وضاحت کے لئے درج ذیل آیات مبارکہ سے استفادہ ممکن ہے:

- سورۂ جاثیہ،آیت:۱۶

''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ''
(اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب،حکومت اور نبوت سے نوازا،اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا اور انہیں عالمین پر فضیلت و برتری دی)

- سورۂ حج،آیت:۷۸

''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ''
(اس نے تمہیں چنا اور دین میں تم پر کوئی سختی نہیں قرار دی)

- سورۂ آلِ عمران،آیت:۱۱۰

''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ''
(تم بہترین اُمت ہو کہ جسے لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے،تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)

- سورۂ بقرہ،آیت:۱۴۳

''لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا''

(تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو)

○ سورۂ فرقان، آیت: ۳۰

''وَقَالَ الرَّسُولُ يَارَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا''

(رسول کہے گا: پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا تھا)

مذکورہ بالا آیات اور ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات کہ جو اجتماعی و معاشرتی اوصاف کے تذکرہ پر مشتمل ہیں ان میں فرد اور معاشرہ دونوں کو ملحوظ قرار دیا گیا ہے جبکہ کسی طرح کا تسامح وتساھل اور بے توجہی و بے التفاتی اس میں معمول نہیں بلکہ وہ ایسے اوصاف ہیں جن سے جزء اور کُل، فرد اور معاشرہ سبھی متصف ہوتے ہیں کیونکہ ان سب میں ایک ہی حوالہ ملحوظ ہوتا ہے چنانچہ اس کی مثال مٹی کے اس گڑھے سے دی جاسکتی ہے جس میں لعل و جواہر پائے جاتے ہیں تو اسے اٹھا کر اس سے لعل و جواھر کو نکالا جاتا ہے جبکہ اسے اُٹھانے یا کھودنے میں اصل مقصد وہ مٹی نہیں ہوتی بلکہ اس میں موجود لعل و جواھر مقصود ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود مٹی اور لعل و جواھر دونوں یکجا ملحوظ قرار پاتے ہیں۔

بہرحال اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ یہ کہ آیۂ مبارکہ میں ارشاد حق تعالیٰ ہے، ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ'' (اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے منہ موڑے) تو اس میں ارتداد (مرتد ہونے) اور دین سے منہ موڑ کر واپس پہلے عقیدہ پر پلٹ جانے سے مراد جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے یہود و نصاریٰ سے دوستی قائم کرنا ہے اور اس میں مؤمنین کو مخاطب قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی مؤمنین ہی کو مخاطب کیا گیا تھا اور آیت اس مطلب کو بیان کرنے کے مقام میں ہے کہ دین حق لوگوں کے اس ایمان سے بے نیاز ہے جس میں دشمنان خدا سے دوستی کی ملاوٹ ہو کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک قرار دیا ہے چنانچہ واضح لفظوں میں فرمایا ''وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ'' (اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا) اور چونکہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے دین کا ولی و ناصر ہے لہٰذا وہ اپنے دین کی مدد و نصرت کے لئے بہت جلد ایسے لوگ لے آئے گا جو اس کے دشمنوں سے بیزار و لاتعلق ہوں گے اور وہ صرف اولیائے خدا سے دوستی کریں گے اور خدا کے سوا کسی سے محبت کا رشتہ قائم نہیں کریں گے۔

اور جملہ ''فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ'' میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو لانے کی نسبت خود اپنی طرف دی ہے تاکہ اس کی اپنے دین کی مدد کا مطلب واضح طور پر ثابت ہوجائے جو کہ آیت کے سیاق سے سمجھا جاتا ہے کہ اس دین کا ناصر و مددگار موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مددگار کی ضرورت نہیں اور وہ خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہاں یہ اہم مطلب قابل ذکر ہے کہ آیۂ مبارکہ میں اس مطلب کے بیان کو ملحوظ و مقصود قرار دیا گیا ہے کہ جو لوگ

اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہیں اور اپنی قومی مدد و نصرت اور باہمی یکجہتی کے معاہدوں کے بل بوتے پر اتراتے پھرتے ہیں ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے لئے ان لوگوں کو لائے گا جو اسے دوست رکھتے ہوں گے اور وہ انہیں دوست رکھتا ہے اور آیت میں یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ اس میں لفظ ''قوم'' استعمال کیا گیا ہے اور ان کے اوصاف و افعال کا ذکر جمع کے صیغہ میں ہوا ہے (يُحِبُّهُمْ ،يُحِبُّوْنَهٗ ، اَعِزَّةٍ ، اَذِلَّةٍ ، يُجَاهِدُوْنَ ، يَخَافُوْنَ) تو ان تمام امور سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قوم کے لائے جانے کا وعدہ ہوا ہے اُنہیں گروہ کی صورت میں لایا جائے گا یعنی ایک ایک یا دو دو کر کے نہیں بلکہ اجتماعی صورت میں لایا جائے گا لہٰذا ایسا نہیں کہ خداوند عالم ہر دور میں کسی ایک شخص کو لے آئے گا جو اللہ کو دوست رکھتا ہو گا اور اللہ اسے دوست رکھتا ہو گا اور وہ مؤمنین پر مہربان جبکہ کافروں کے ساتھ سختی کرنے والا ، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو گا کہ کسی ملامت و مذمت کرنے والے بدگو کی بدکلامی سے ڈرنے والا نہ ہو گا ،

ایک اہم مطلب یہ بھی اس بحث میں قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اس قوم کا آنا جہاں خود انہی کی طرف منسوب ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہے کہ وہ انہیں لانے والا ہے تو اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ وہ انہیں پیدا کرے گا کیونکہ وہی سب کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے ، اس کے سوا کوئی خالق نہیں ، چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: ''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ '' (اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے) سورۂ زمر ، آیت ۶۲ ، بلکہ یہاں ان کے لانے سے مراد انہیں مبعوث کرنا ہے ، ان پر ذمہ داری عائد کرنی ہے کہ جب بھی ضرورت ہو اور حالات و ماحول اس کے متقاضی ہوں وہ دین کی مدد و نصرت کے لئے میدان میں کود پڑیں اور یہ بات ان پر اللہ کی عنایت کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس نے اُنہیں اپنے اولیاء سے نرمی و انکساری پر مبنی سلوک کرنے کی توفیق عطا کی اور اپنے دشمنوں سے سختی سے پیش آنے کے ساتھ ساتھ اپنی راہ میں جہاد کرنے کی عزت عطا کی اور ہر بدکلام و بدگو سے روگردانی کی ہمت بخشی ، بنابرایں اُن کا دین کی نصرت و مدد کرنا دراصل اللہ کا اپنے دین کی نصرت و مدد کرنا ہے جو کہ ان لوگوں کے ذریعے اور ان کے سبب سے ہے ، یعنی اللہ نے انہیں اس کا سبب ہونے کا اعزاز بخشا ہے ، البتہ ان لوگوں کے لانے کا وقت نزدیک ہے یا دور ہے اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی فرق نہیں بلکہ اس کی نسبت سے صورتحال یکساں ہے یہ بات اور ہے کہ ہم اپنی کوتاہ فکری کی وجہ سے نزدیک اور دور کا فرق قرار دیتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ایسا نہیں۔

محبت کا دوطرفہ حوالہ:

زیر نظر آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں کہ جنہیں وہ اپنے دشمنوں سے محبت کرنے والوں

کے مقابلے میں لے آئے گا یوں ارشاد ہوا: ''یُحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ'' (وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے) اس میں محبت مطلق صورت میں ذکر ہوئی ہے، اللہ کی ان سے محبت ان کی ذات ونفوس سے ہے چنانچہ اس میں کوئی تقییدی شرط وغیرہ ذکر نہیں کی گئی اور جہاں تک ان لوگوں کی اللہ سے محبت کا تعلق ہے تو اس کا تقاضا ہر اس چیز پر اللہ تعالیٰ کو ترجیح دینا ہے جو انسان کی ذات ونفس سے تعلق رکھتی ہو خواہ مال ہو یا جاہ وجلال ہو یا قبیلہ وخاندان ہو یا کوئی اور چیز ہو، تو وہ لوگ اللہ کے دشمنوں میں سے کسی کو بھی دوست نہیں رکھتے اور اگر وہ کسی سے دوستی ومحبت قائم کریں تو وہ صرف اللہ کے اولیاء سے اللہ کی ولایت ودوستی کی بناء پر کرتے ہیں، اور اللہ کا اُن سے محبت کرنا اس بات کا متقاضی بلکہ یقینی سبب ہے کہ وہ ہر ظلم سے مُبرا اور ہر روحانی پلیدی یعنی کفر وفسق سے پاک ہوں خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ عصمت کے ذریعے یا توبہ کی بناء پر خدا کی طرف سے حاصل ہونے والی مغفرت وبخشش کے ذریعے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کا ظلم ومعصیت ہرگز پسند نہیں چنانچہ اس نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

- سورۂ آل عمران، آیت: ۳۲

''فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ''

(اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا)

- سورۂ آلِ عمران، آیت: ۵۷

''وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ''

(اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا)

- سورۂ انعام، آیت: ۱۴۱

''اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ''

(وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا)

- سورۂ مائدہ، آیت: ۶۴

''وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ''

(اور اللہ فساد پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

- سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۰

''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ''

(یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

○ سورۂ نحل، آیت: ۲۳

''اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ''

(اللہ غرور وتکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

○ سورۂ انفال، آیت: ۵۸

''اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآىِٕنِیْنَ''

(اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

مذکورہ بالا آیات میں تمام انسانی رزائل ذکر کئے گئے ہیں: (کفر، ظلم، اسراف، فساد، زیادتی، غرور وتکبر، خیانت) اور اگر یہ تمام بری صفتیں اس بناء پر انسان کی لوح نفس سے محو ہو جائیں کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے تو یقیناً وہ ان کے مدمقابل صفات وفضیلتوں سے متصف وآراستہ ہوگا کیونکہ شخص کا اپنے وجود میں ان دو چیزوں یعنی فضیلت ورزیلت (اچھی صفت اور بری صفت) میں سے ایک سے متصف ہونا ناگزیر ہے تو وہ لوگ ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر برحق وسچا ایمان رکھنے والے ہیں کہ ان کے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں، انہی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

○ سورۂ انعام، آیت: ۸۲

''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ''

(جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آمیختہ نہ کیا تو انہی کے لئے امن وامان ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں)

اور وہی لوگ گمراہی سے امان میں ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ نحل، آیت: ۳۷

''فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ''

(اللہ اسے ہدایت کی نعمت سے نہیں نوازتا جسے گمراہ کرے)

اور وہ لوگ کہ اللہ جن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہر طرح کی گمراہی سے امان میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہدایت کی وجہ سے اللہ کے سیدھے راستہ پر گامزن ہیں، اور وہ اپنے اس ایمان کی بدولت کہ جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کی ہے وہ اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی وفرمانبرداری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام ودستورات پر پوری طرح سر تسلیم خم کرنے والے ہیں جس طرح وہ اللہ کے فرامین پر عمل پیرا ہونے اور اس کے دستورات کی اطاعت کا عملی دم بھرتے ہیں چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

○ سورۂ نساء، آیت: ۶۵

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا''

(ایسا نہیں کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص سچا ہے، بلکہ تیرے پروردگار کی قسم! وہ اس وقت تک ایمان والے نہیں کہلا سکتے جب تک آپ کو اپنے درمیان رونما ہونے والے اختلافات وتنازعات میں اپنا فیصل قرار نہ دیں، پھر آپ جو بھی فیصلہ کریں اس کی بابت اپنے دلوں میں کوئی غلط خیال نہ لائیں بلکہ اسے اس طرح تسلیم کریں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے)

تو جب وہ ایسا کریں گے تو یقیناً اس آیت کا مصداق قرار پائیں گے۔

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۳۱

''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ''

(کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا)

اس سے واضح وثابت ہوتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور اللہ سے محبت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع و پیروی کرے اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور اللہ کسی بندے سے محبت نہیں کرتا جب تک کہ وہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع و پیروی کرنے والا نہ ہو،

بنابراین جب وہ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں تو ہر اس خوبی سے متصف ہو جائیں گے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اس سے راضی وخوش ہوتا ہے مثلاً تقویٰ، عدل، احسان، صبر، ثابت قدمی، توکل، پاکیزگی وغیرہ، چنانچہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

تقویٰ:

○ سورۂ آلِ عمران: ۷۶

''فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ''

(اللہ تقویٰ والوں کو دوست رکھتا ہے)

نیکی واحسان:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۵

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ''

(اللہ نیکی واحسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

صبر:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۴۶

''وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ''

(اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

ثابت قدمی:

○ سورۂ صف، آیت: ۴

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ''

(اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں قتال کرتے ہیں نہایت ثابت قدمی کے ساتھ جیسا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی بنیاد ہیں)

توکل:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۵۹

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ''

(اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

توبہ و پاکیزگی:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۲

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ''

(اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

اس کے علاوہ متعدد آیات میں مذکورہ بالا مطالب بیان ہوئے ہیں، اگر آپ ان آیات پر غور کریں جو مذکورہ بالا آیات میں بیان کئے اوصاف وفضائل کے آثار کی تشریح پر مشتمل ہیں تو آپ کو کثیر تعداد میں پاکیزہ خصلتوں و نیک صفتوں سے آگاہی تک دسترسی حاصل ہو جائے گی اور آپ بخوبی آگاہ ہو جائیں گے کہ ان اوصاف کے حامل افراد ہی ہیں جو خدا کی زمین کے وارث قرار دیئے گئے ہیں اور یہ کہ انہی کو حسن عاقبت نصیب ہوگی جیسا کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے: ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ'' اور سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۳۲ میں جامع الفاظ میں یوں ارشاد ہوا: ''وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى'' (اور حسنِ عاقبت تقویٰ ہی کے لئے ہے)، ہم عنقریب اس موضوع کے موزوں مقام پر اس سلسلہ میں وضاحت کریں گے کہ تقویٰ کو حسن عاقبت حاصل ہونے سے کیا مراد ہے؟ انشاء اللہ تعالیٰ۔

نرمی وسختی کا عملی تقابل:

○ سورۂ المائدہ، آیت: ۵۴

''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ''

(مؤمنوں کے ساتھ نرمی اور کافروں کے ساتھ سختی کرنے والے ہیں)

یہ دونوں الفاظ ''اَذِلَّةٍ'' اور ''اَعِزَّةٍ'' جمع کے صیغے ہیں، پہلے کا مفرد ''ذلیل'' اور دوسرے کا مفرد ''عزیز'' ہے، عربی زبان میں ''ذلیل'' متواضع وانکساری کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ دونوں الفاظ کنایۃً استعمال ہوئے ہیں، پہلا ''اَذِلَّةٍ'' ان کے تواضع وانکساری اور مؤمنین کے لئے نہایت ادب واحترام کا برتاؤ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی عملی پاسداری کی علامت ہے اور اس بنیاد پر ہے کہ اللہ ان کا ولی اور وہ اللہ کے اولیاء ہیں، اور لفظ ''اَعِزَّةٍ'' اس مطلب سے کنایۃً استعمال ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے کہیں بالاتر سمجھتے ہیں کہ کافروں کی جھوٹی عزت کو اہمیت دیں اور اسے درخور اعتناء قرار دیں کہ جسے دین میں کوئی مقام وحیثیت حاصل نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان آداب کی تعلیم دی اور یوں فرمایا:

○ سورۂ حجر، آیت: ۸۸

''لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ''

(آپ اپنی نظریں اس مال ومتاع کی طرف اٹھائیں ہی نہیں جو ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو دیا ہے اور نہ ہی ان کے حال پر دکھی ہوں آپ مؤمنوں کے ساتھ فروتنی روا رکھیں)

آیت میں لفظ ''اَذِلَّةٍ'' کو حرف ''عَلٰى'' سے متعدی کرنے کی بابت ایک قول یہ ہے کہ چونکہ اس میں محبت وجھکاؤ، قلبی لگاؤ اور تواضع وانکساری کا معنیٰ ملحوظ ہے لہٰذا اسے حرف ''عَلٰى'' سے متعدی کیا گیا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ:

○ سورۂ المائدہ، آیت: ۵۴

''يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ''

(وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی بدگو کی بدگوئی سے خوفزدہ نہیں ہوتے)

جملہ ''يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' ان اولیاء الٰہی کے فضائل ومناقب میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس مقام پر اس کا

بیان موزوں اور اس مطلب کے اظہار کے لئے مناسبت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اپنے دین کی نصرت و مدد کرے گا۔

اور جملہ ''وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ'' بظاہر تمام ماقبل جملوں سے تعلق کا حامل ہے صرف آخری جملہ سے مخصوص نہیں اگر چہ اس طرح کے موارد میں آخری جملہ ہی یقینی ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دین کی مدد و نصرت کرنا جس طرح ان بدگولوگوں کے طعن و تشنیع اور ڈراوٗ دھمکاوٗ کے تیروں کا نشانہ بنتا ہے کہ جو جہاد کرنے والوں کو مال ضائع ہونے، جانوں کے تلف ہونے اور نہایت سخت ترین و ناگوار ترین حالات سے دوچار ہونے سے ڈراتے رہتے ہیں اسی طرح ان اولیائے الٰہی کا مؤمنین کے ساتھ تواضع وانکساری سے پیش آنا اور کافروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ روا رکھنا جبکہ ان کافروں کے پاس دنیاوی چمک دمک کے تمام اسباب اور شہوت رانی کے ہر ممکنہ وسائل سمیت زندگی کی عیش وعشرت کا پورا ساز وسامان ہے جو کہ مؤمنین کے پاس ان میں سے کچھ نہیں لیکن اس کے باوجود ان بدکلامی کرنے والوں کی بدکلامی اولیائے الٰہی کو جہاد فی سبیل اللہ سے نہیں روکتی۔ یاد رہے کہ اس آیت میں ایک غیبی پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے جس کی بابت ہم عنقریب قرآن و حدیث سے مخلوط بحث میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

روایات پر ایک نظر

ایک تاریخی واقعہ کا تذکرہ:

تفسیر ''در منثور'' میں آیۂ مبارکہ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ'' (اے ایمان والو! تم یہودیوں اور نصرانیوں کو دوست نہ بناوٗ) کے ذیل میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، بیہقی نے اپنی کتاب دلائل میں اور ابن عساکر، ان سب حضرات نے عبادہ بن ولید کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا کہ عبادہ بن صامت کا کہنا ہے کہ جب بنی قینقاع نے حضرت پیغمبر اسلام سے جنگ شروع کی تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے ان میں پھوٹ ڈال دی اور ان سے الگ ہوگیا، اس وقت میں (عبادہ بن صامت) حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بنی قینقاع کے ساتھ کئے ہوئے میثاق و معاہدہ سے برائت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کی ولایت و دوستی کا اعلان کرتا ہوں اور اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کفار

سے کئے ہوئے عہد و پیمان اوران کی ولایت و دوستی سے برائت کا اظہار کرتا ہوں، یاد رہے کہ عبادہ بن صامت کا تعلق قبیلہ بنی عوف بن خزرج سے تھا اور اس نے بھی عبداللہ بن ابی کی طرح قبیلہ بنی قینقاع سے دوستی و نصرت کا معاہدہ کر رکھا تھا مگر اس نے اس معاہدہ کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ختم کر دیا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی، (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۹۰)

مزید چند روایتیں:

(۱) تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیات ''یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ - تا - فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ '' عبداللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئیں جو کہ اس وقت منافقین کا سردار تھا۔

(۲) تفسیر ''درمنثور'' ہی میں ہے کہ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے عطیہ بن سعد کے حوالہ سے بیان کیا کہ اس نے کہا عبادہ بن صامت کہ جس کا تعلق قبیلہ بنی حارث بن خزرج سے تھا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ عرض کی، اے اللہ کے رسول! میرے کثیر تعداد میں یہودی دوست ہیں مگر میں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت و دوستی کی بناء پر یہودیوں کی ولایت و دوستی سے برائت کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوستی کا اعلان کرتا ہوں۔

عبداللہ بن ابی نے کہا: میں ڈرپوک آدمی ہوں، مجھے ان لوگوں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے دوستی کا رشتہ ختم کر دوں اور وہ مجھے مصیبتوں میں مبتلا کر دیں لہٰذا میں ان سے دوستی کے رشتہ پر قائم ہوں، اس وقت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سے فرمایا: اے ابوحباب! کیا تو سمجھتا ہے کہ یہودیوں سے برائت کا جس طرح عبادہ بن صامت نے اظہار کیا ہے اگر تو بھی اس طرح کر لے تو کیا تیرے لئے مفید نہیں؟ اور ان سے برائت نہ کرنا تیرے لئے فائدہ مند ہے عبادہ کے لئے نہیں؟ اس پر وہ کہنے لگا کہ ہاں یہ بات درست ہے، میں اسے قبول کرتا ہوں، یہودیوں و نصاریٰ سے اسی طرح برائت کا اظہار کرتا ہوں جس طرح عبادہ بن صامت نے کیا ہے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ --- وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ''

(۳) تفسیر ''درمنثور'' میں ابن مردویہ کے حوالہ سے ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: عبداللہ ابی ایمان لایا مگر کہنے لگا کہ میرے اور قبیلہ بنی قریضہ اور قبیلہ بنی نضیر کے درمیان عہد و پیمان ہے لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے نقصان پہنچائیں گے، اس بناء پر وہ مرتد ہو گیا اور ایمان کو چھوڑ کر دوبارہ کفر کی طرف پلٹ گیا، لیکن عبادہ بن صامت نے کہا

کہ میں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور بنی قریضہ اور بنی نضیر سے دوستی کے معاہدہ سے برائت کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور مومنین کی ولایت و دوستی کا دم بھرتا ہوں، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ - فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ'' (اے ایمان والو! تم یہودیوں اور نصرانیوں کو دوست نہ بناؤ۔۔تا۔۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان (یہود و نصاریٰ) کی طرف جانے میں بہت تیزی کرتے ہیں) اس میں تیزی کرنے والوں سے مُراد عبداللہ بن ابی ہے اور یہ آیت نازل ہوئی ''إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ'' (یقیناً تمہارا ولی اللہ اور اس کا رسول اور وہ مؤمنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں) اس میں مؤمنین سے مراد عبادہ بن صامت اور دیگر اصحاب النبیؐ ہیں، اور یہ آیت نازل ہوئی ''وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ'' (اور اگر وہ اللہ اور نبی اور جو کچھ نبی پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لاتے تو انہیں (یہود و نصاریٰ کو) دوست نہ بناتے لیکن ان کے اکثر لوگ فاسق ہیں) (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۲۹۱)

تجزیاتی وضاحت:

مذکورہ بالا واقعہ ابن مردویہ کے علاوہ دیگر اسناد سے بھی منقول ہے کہ ابن عباس نے اسے بیان کیا البتہ ہم نے متعدد بار متوجہ کیا کہ اسباب وشانِ نزول میں جو روایات ذکر کی گئی ہیں وہ اجتہادی تطبیق کے باب سے ہیں اور ان میں کچھ نشانیاں پائی جاتی ہیں جن سے مطابقت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی مثال واضح ہے کہ زیر نظر آیات مبارکہ میں نصاریٰ کا ذکر یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے جبکہ بنی قینقاع کے واقعہ میں اور مسلمانوں اور بنی قریضہ و بنی نضیر کے درمیان رونما ہونے والے واقعات میں نصاریٰ کا ذرہ بھر کوئی دخل نہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں کو اُن سے کوئی سروکار تھا اور طفیلی طور پر ان کا نام لینے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی یا یہ کہ صرف انہیں یہودیوں کا ہم مشرب ہونے کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہو یہ بھی قرین صحت نظر نہیں آتا چنانچہ قرآنِ مجید میں متعدد آیات ایسی ہیں جن میں یہودیوں کا تذکرہ ہے اور وہ آیات ان واقعات کے بیان پر مشتمل ہیں جو یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان رونما ہوئے کہ جن میں منافقین بھی شامل رہے مگر ان میں صرف یہودیوں کا تذکرہ ہوا نصاریٰ کا ذکر تک نہیں ہوا جیسا کہ سورۂ حشر کی آیات اور ان جیسی دیگر آیات سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا زیر نظر آیات میں طفیلی طور پر اور ہم مشرب ہونے کی بناء پر ان کا تذکرہ کیا جانا کیونکر قرین صحت قرار پا سکتا ہے اور دیگر موارد میں کیونکر روا نہیں؟

اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیات عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئیں جو کہ سترہ آیات ہیں (۵۱ سے ۶۷ تک) حالانکہ ان کے درمیان کوئی اتصال و پیوستگی اور ربط نہیں پایا جاتا جس کی بناء پر ان کے دفعتاً نازل ہونے کا ثبوت قرار پائے اور آیت ''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ'' (تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ مؤمن ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں) اس کے شانِ نزول کے بارے میں فریقین شیعہ و سنی کی روایات تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ ان آیات میں یہ آیت بھی ہے: ''يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' (اے رسول! جو حکم آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کی رسالت کا کوئی کام انجام نہ دیا اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا) تو اس آیت کا زیر نظر موضوع و واقعہ سے کوئی ربط ہی نہیں کیونکہ یہ آیت بھی فریقین کی روایات متواترہ کے مطابق آنحضرت ﷺ کے آخری حج کے موقعہ پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ غدیر خم کے مقام پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر امام علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمایا۔ لہٰذا اس کا مذکورہ بالا واقعہ سے کوئی ربط نہیں بنتا، اور اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں کہ راوی نے عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کے واقعہ پر نگاہ کی پھر آیات میں اس سے مناسبت کی بعض جہات دیکھیں تو اس نے اسے اس پر منطبق کر دیا اور چونکہ اس کا تطبیقی عمل درست انجام نہیں پا رہا تھا لہٰذا اس نے تین آیتوں کی جگہ ان سترہ آیات کو پیش کر کے تطبیق درست کرنے کی کوشش کی جن میں اہل کتاب کے بارے میں مربوط مطالب مذکور ہیں،

(۴) تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر اور ابن منذر نے عکرمہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے آیہ مبارکہ ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ'' (اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں) کی تفسیر میں کہا کہ یہ آیت قبیلہ بنی قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب انہوں نے غداری کرتے ہوئے اس عہد و میثاق کو توڑا جو ان کے اور حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان تھا اور انہوں نے ایک خط ابوسفیان بن حرب کو بھیجا کہ مکہ کے مشرکین اور قریش سے کہیں کہ وہ ان کے قلعوں میں آ جائیں اور ان میں پناہ لیں، اس وقت حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے قلعوں سے باہر آ جائیں، چنانچہ وہ لوگ ابولبابہ کے کہنے پر قلعوں سے باہر آ گئے مگر اس نے انہیں اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا یا دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے گا (اس کی طرف سے ایسا کرنا خائنانہ عمل تھا)، ادھر طلحہ و زبیر بھی نصاریٰ اور اہل شام کو خطوط بھیج کر خیانت کرتے رہے اور

انہیں اندر کی خبریں پہنچاتے رہے، عکرمہ کا کہنا ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے کئی افراد فقر و فاقہ کے ڈر سے بنی قریضہ و بنی نضیر کے یہودیوں سے خط و کتابت کر کے انہیں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور مخفیانہ طور پر ان سے رابطہ قائم کر کے جاسوسی کر رہے تھے اور ان سے قرضہ وغیرہ مانگتے تھے لیکن اس آیت مبارکہ میں انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا، (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۲۹۱)

یہ روایت قابل قبول ہے اس میں لفظ ''ولایت'' جو کہ زیر نظر آیات مبارکہ میں مذکور ہے محبت و مودت کے معنیٰ میں تفسیر ہوا ہے اور اس حوالہ سے سابق الذکر مطالب میں تائیدی جہات بیان ہو چکی ہیں اور اگر اس میں واقعہ کو ان آیات کے نزول کا حقیقی سبب بھی مانا جائے تب بھی یہ آیات اس واقعہ کے علاوہ دیگر واقعات و موارد میں بھی مورِدِ توجہ قرار پا سکتی ہیں اور اپنے شانِ نزول کے علاوہ دیگر موارد میں ان کا انطباق، جری و تطبیق کے طور پر ہوگا، اور یہ امر نہایت واضح ہے۔

ناکثین، قاسطین، مارقین:

آیۂ شریفہ: ''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ'' کی تفسیر میں ''مجمع البیان'' میں مؤلف نے لکھا ہے کہ اس میں ''قوم'' سے مراد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب ہیں کہ جنہوں نے ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جنگ کی (جنگ جمل، صفین، نہروان) یہی مطلب عمار، حذیفہ اور ابن عباس سے منقول روایات میں بھی مذکور ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقولہ روایات میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

تفسیر ''مجمع البیان'' میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد مؤلف نے لکھا ہے کہ اس مطلب کی تائید و تصدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی قدر سے ہوتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خیبر کے دن اس وقت فرمایا جب جنگ کے پرچم دار نے بار بار فرار اختیار کیا اور وہ خود بھی خوفزدہ تھا اور دوسروں کو بھی خوف میں مبتلا کر رہا تھا اور لوگ بھی اسے خوفزدہ کر رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی قدر میں انہی اوصاف کو بیان فرمایا جو آیت میں ذکر کئے گئے ہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پرچم دار کے بار بار ایسا کرنے پر یوں فرمایا ''**لاعطین الرایۃ غداً رجلاً یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ کراراً غیر فرار لایرجع حتی یفتح اللہ علیٰ یدہٖ**'' (میں کل پرچم اس مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اسے دوست رکھتے ہیں وہ کرار ہے فرار نہیں، ثابت قدم رہنے والا ہے بھاگنے والا نہیں وہ اس وقت تک میدان سے واپس نہ آئے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھ پر فتح نہ دے) یہ کہہ کر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہِ اسلام کا پرچم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو عطا فرمایا،

اور آیت میں جو اوصاف ذکر ہوئے ہیں یعنی مؤمنین پر نرمی کرنے والے، کافروں پر سختی کرنے والے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے میں کسی بدکلامی کرنے والے کی بدکلامی سے خوفزدہ نہ ہونے والے! تو ان اوصاف کے حوالہ سے کسی کو بھی کلام نہیں کہ یہ سب امام علیؑ میں پائے جاتے تھے اور وہی ان کا استحقاق رکھتے ہیں جس کا ثبوت انہوں نے اپنے کردار و عمل کے ذریعے دیا کہ وہ اہل ایمان کے ساتھ نہایت نرم دل، کافروں و مشرکوں کے ساتھ نہایت سخت رویہ رکھنے والے تھے اور اُمت کے استحکام و دین الٰہی کی نصرت و مدد کرنے میں ان کا کردار روز روشن کی طرح واضح ہے۔

اس کی مزید تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو خبردار کیا تھا کہ ان کے بعد علیؑ تم سے قتال کریں گے چنانچہ ایک روایت میں مذکور ہے کہ سہیل بن عمرو چند افراد کے ہمراہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: اے محمد! ہمارے غلام جو آپ کے ساتھ ملحق ہو گئے ہیں انہیں ہمارے سپرد کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے قریش! تم لوگ کفر و شرک کے عقیدہ کو چھوڑ دو ورنہ خداوند عالم تم پر ایک مرد کو حاکم بنائے گا جو تمہارے ساتھ قرآن کی تاویل کے بارے میں اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح میں نے اس کی تنزیل کے بارے میں تم سے جنگ کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ کون شخص ہے؟ آیا وہ ابوبکر ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: نہیں، بلکہ وہ ہے جو کمرہ میں بیٹھا ہوا اپنی نعلین سی رہا ہے اس وقت حضرت علیؑ کمرہ میں تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعلین کو ٹانکے لگا رہے تھے۔

حضرت علیؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے جنگ بصرہ کے دن ارشاد فرمایا: خدا کی قسم! آج تک کوئی اس آیت کے مصداق لوگوں سے جنگ کرنے نہیں نکلا۔ آج پہلا دن ہے جب کوئی ان لوگوں سے جنگ کے میدان میں آیا ہے، یہ کہہ کہ امامؑ نے زیر نظر آیہ مبارکہ کی تلاوت کی، ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ''

اصحابي، اصحابي:

ابو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اپنے اسناد سے ذکر کیا کہ زہری نے سعید بن مسیب کے حوالہ سے بیان کیا کہ ابوہریرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''يرد الی قوم من اصحابي يوم القيامة فيحلون عن الحوض فأقول: يا رب أصحابي، اصحابي. فيقال: انك لا تدری بما احدثوا من بعدك. انهم ارتدوا علیٰ ادبارهم القهقری'' (قیامت کے دن میرے کچھ اصحاب میری طرف آئیں گے مگر انہیں حوض

کوثر پہ میرے قریب آنے سے روک دیا جائے گا، اس وقت میں کہوں گا کہ پروردگار یہ میرے صحابہ ہیں، یہ میرے صحابہ ہیں، ہاتف سے جواب آئے گا کہ آپ کو کیا معلوم کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا حرکتیں کیں، یہ لوگ مرتد ہو کر اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے۔ (تفسیر ثعلبی، بحوالہ مجمع البیان، جلد ۳، ص: ۲۰۸)

مذکورہ بالا مطالب سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ آیت میں ''قوم'' کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ سب حضرت علی علیہ السلام پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں بلکہ یہ ایک واضح اور ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ آیت میں مذکور صفات وفضائل کا افضل ترین مصداق ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا جو حضرات حضرت امیر المومنینؑ کے لشکر میں شامل ہو کر جنگ جمل و جنگ صفین میں دشمن سے لڑے وہ بھی ان صفات کا مصداق قرار پاتے ہیں جبکہ اس کے بعد ان میں سے بہت سے افراد نے اپنا قبلہ بدل لیا تھا اور حق کو چھوڑ کر ناحق کی طرف چلے گئے تھے، اور آیت میں جملہ ''يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗٓ'' مطلق آیا ہے اس میں کوئی تقییدی واستثنائی حوالہ نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا تمام افراد کا کسی استثناء کے بغیر آیت کا مصداق ہونا قرین صحت قرار نہیں پاسکتا، آپ قارئین کرام سابق الذکر مطالب میں اس موضوع سے مربوطہ جہات سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔

تفسیر ''مجمع البیان'' ہی میں مذکور ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارکہ سلمان فارسی کے کندھے پر رکھ کر فرمایا: ان سے مراد یہ اور اس کے علاقہ والے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر دین ثریا پر بھی لٹکا ہوا ہو تب بھی فارس کے رہنے والے لوگ اس تک پہنچ جائیں گے (تفسیر ''مجمع البیان'' جلد سوم، صفحہ ۲۰۸)

اس حدیث کے بارے میں ہماری وہی بات ہے جو اس سے پہلے ذکر کی جانے والی حدیث کے بارے میں بیان ہو چکی ہے البتہ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اللہ تعالیٰ بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں سے ان صفات کے حامل افراد کو مبعوث فرمائے گا تو اس صورت میں بات مختلف ہو جائے گی، اسی کتاب (مجمع البیان) میں ایک قول یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بعض حضرات نے ان سے یمن والے مراد لئے ہیں کیونکہ نرم دلی وٹھنڈا دل رکھنے والے لوگ ہیں چنانچہ ''یمن یا یمان اور یمانی حکمت'' زبان زدِ عام ہے اور عیاض بن غنم اشعری نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: وہ اس کی قوم کے افراد ہیں (بحوالہ مذکورہ بالا)

یاد رہے کہ یہی مطلب تفسیر ''درمنثور'' میں بھی مختلف ومتعدد حوالوں سے مذکور ہے لیکن اس کی بابت وہی اشکال ہے جو سابق الذکر دو روایتوں کی بابت بیان ہو چکا ہے۔

طبری کی نا قابل قبول روایت:

طبری نے اپنی تفسیر میں اپنے سلسلہ سند کے ساتھ قتادہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اس بناء پر نازل فرمائی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بہت جلد کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو عربوں کی اکثریت اسلام چھوڑ گئی اور مرتد ہو گئے سوائے تین مساجد کہ جن میں مدینہ والے، مکہ والے اور بحرین والے لوگ شامل تھے۔ کہ انہوں نے کہا: ہم نماز پڑھیں گے مگر زکات نہیں دیں گے اور بخدا ہم اپنے اموال کسی کو غصب نہیں کرنے دیں گے، چنانچہ حضرت ابوبکر نے اس سلسلہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا بعض حضرات نے کہا کہ اگر وہ لوگ موجودہ نظام کو صحیح سمجھتے تو ضرور زکات ادا کرتے بلکہ زیادہ دیتے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ جس چیز کو اللہ نے دوسری چیز کے ساتھ اکٹھا کر کے بیان کیا ہے (زکات کو نماز کے ساتھ) میں اسے الگ ہرگز نہیں کروں گا، اگر وہ اُونٹ کے پاؤں میں ڈالی جانے والی رسی بھی کہ جس پر اللہ اور اس کے رسول نے زکات واجب کی ہو ادا نہ کریں تو ہم اس پر بھی ان سے جنگ کریں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مبعوث کیا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی بات پر ان سے قتال کیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتال کیا تھا یہاں تک کہ اسلام سے مرتد ہونے والوں اور زکات ادا نہ کرنے والوں کو قید کیا گیا، قتل کیا گیا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جلا دیا گیا اور اس قدر ان سے جنگ کی کہ بالآخر انہوں نے نہایت ذلت وخواری کے ساتھ ''ماعون'' یعنی زکات کا اقرار کیا، (تفسیر ''جامع البیان'' جلد ششم، صفحہ ۱۸۳)

یہی روایت تفسیر ''درمنثور'' میں عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابوشیخ، بیہقی اور ابن عساکر کے حوالہ سے قتادہ سے منقول ہے اور ضحاک اور حسن سے بھی مروی ہے۔ لیکن جو بنیادی نکتہ ملحوظ وقابل ذکر ہے وہ یہ کہ حدیث کے الفاظ ہی واضح و روشن دلیل و گواہ ہیں کہ اس میں نظریاتی تطبیق کا عمل ہوا ہے یعنی راوی نے اپنے مخصوص نظریہ وعقیدہ کی بنیاد پر آیت کو اس مورد پر منطبق کیا ہے بنابرایں جو اعتراض سابقہ روایات پر وارد ہوا بعینہ اس روایت پر بھی وہی اعتراض وارد ہوگا کیونکہ جو واقعات حوادث اور جنگیں ہوئیں جو کہ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں ان میں گوناگوں امور ملحوظ قرار پاتے ہیں اور ان میں جو افراد شریک تھے مثلاً خالد، مغیرہ بن شعبہ، بسر بن ارطات اور سمرہ بن جندب وغیرہ تو ان کے بارے میں تاریخ نے ایسے مظالم و گناہ ذکر کئے ہیں جن کا ارتکاب انہوں نے ان جنگوں میں اور ان کے بعد کیا جن کی بناء پر جملہ: ''يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ'' (اللہ انہیں دوست رکھتا ہے اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں) ان لوگوں پر صادق نہیں آتا اور نہ ہی ان پر اس کی تطبیق کی صورت نظر آتی ہے، قارئین کرام اس سلسلہ میں تاریخ کا مطالعہ کر کے اس معنیٰ پر بخوبی غور کریں جو ہم نے آیت کی بابت ذکر کیا ہے تو ہمارے بیان کی صحت واضح ہو جائے گی۔

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ بعض مفسرین نے اس قدر افراط سے کام لیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ وہ قول نہایت عجیب و بے ربط ہے جس میں یوں کہا گیا ہے کہ ''یہ آیت واضح طور پر یمن کے اشعریوں پر منطبق ہوتی ہے نہ کہ ان پر کہ جو مرتدوں کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں اترے اور ان سے قتال کیا'' جبکہ یہ آیت عمومیت رکھتی ہے اور اس میں ہر وہ مومن شامل ہے جس نے عہد نبویؐ میں دین کی نصرت کی اور آیت میں مذکور اوصاف کا حامل تھا اور وہ مؤمنین بھی شامل ہیں جو ان کے بعد آئے اور ان اوصاف کے حامل تھے لہٰذا یہ آیت ان تمام روایات پر منطبق ہوتی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہے مثلاً وہ روایت کہ جس میں ان مؤمنین سے سلمان فارسی اور ان کی قوم کو مراد لیا گیا ہے حالانکہ وہ ضعیف روایت ہے اسی طرح وہ روایت کہ جس میں ان سے ابوموسیٰ اشعری اور اس کی قوم مراد لی گئی ہے اور وہ روایت کہ جس میں ان سے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھی مُراد لئے گئے ہیں سوائے اس روایت کے کہ جس میں صرف حضرت علیؑ کو مُراد لیا گیا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ اس سے مطابقت نہیں رکھتے اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''قوم'' جو کہ آیت میں خصوصیت کا حامل ہے وہ فرد واحد کیلئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس سے یقینی طور پر جماعت و گروہ مُراد ہوتا ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر جامع البیان طبری جلد ۶ ص ۱۸۳)

یہ ہے مذکورہ بالا مفسر کے بیان کا خلاصہ، حقیقت یہ ہے کہ اس کے اس افراطی نظریہ کا اس کے علاوہ کوئی سبب نظر نہیں آتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کہ جس میں خداوند عالم نے اس قوم کی مدح وثناء کی اسے شاعرانہ خیالی مدح وثنا سے زیادہ کوئی حقیقت و اہمیت نہیں دی جبکہ شاعرانہ کلام میں شاعر اپنے ممدوح کو تصور میں لا کر اس کے حق میں شعر کہہ دیتا ہے کہ جس میں وہ بات کے سچا و جھوٹا ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے: ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا'' (کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچا ہو) سورۂ نساء، آیت ۱۲۲، یا یہ کہ اس مفسر نے اللہ کے کلام کو ہمارے ہاں رائج کلام جیسا قرار دیا ہے کہ جس میں اظہار و ادائے مقصود کے لئے تسامح و تساہل پر مبنی افہام کے سوا کوئی چیز ملحوظ نہیں ہوتی اور اشکال و اعتراض کی صورت میں مسامحہ ہی کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام کے بارے میں ارشاد فرمایا ''اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ'' (قرآن حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا کلام ہے بے مقصد و فضول نہیں) سورۂ طارق، آیت ۱۴۔

آپ قارئین کرام سابق الذکر مطالب کے تناظر میں آگاہ ہو چکے ہیں کہ اگر آیت میں مذکور صفات پر غور کیا جائے اور ان کے معانی کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اب تک ان کا مصداق وجود پذیر نہیں ہو سکا، آپ گزشتہ مطالب پر توجہ کریں اور ان کی بابت ہر حوالہ سے غور کریں اس کے بعد جو چاہیں فیصلہ کریں اور رائے قائم کریں۔

مذکورہ بالا مفسر نے اپنے کلام کے آخر میں عجیب ترین بات کی ہے جس پر جس قدر حیرت کا اظہار کیا جائے کم ہے اور وہ یہ کہ اس نے کہا کہ آیت کو تمام روایات پر منطبق کیا جا سکتا ہے سوائے اس روایت کے کہ جس میں اس کا شانِ نزول علی (علیہ

السلام) کے بارے میں مذکور ہے، حالانکہ جس نے بھی اس کے شانِ نزول کے بارے میں لکھا اس نے ''حضرت علیؑ اور ان کے اصحاب'' کے الفاظ لکھے ہیں جیسا کہ دوسروں نے ''سلمان اور اس کی قوم کے افراد'' لکھے، اور کسی نے ''ابوموسیٰ اشعری اور اس کی قوم'' اور کسی نے ''ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں'' کے الفاظ لکھے، اسی طرح وہ روایات کہ جن میں سے بعض ذکر ہو چکی ہیں ان میں حضرت علیؑ اور ان کے اصحاب مراد لئے گئے ہیں، اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ اس مفسر نے جو روایات ذکر کی ہیں ان میں کوئی روایت ایسی نہیں جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ آیت صرف حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جس کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکے کہ آیت میں لفظ ''قوم'' استعمال ہوا ہے لہٰذا اس سے فردِ واحد مراد لینا صحیح نہیں بلکہ وہ جماعت وگروہ کے لئے مخصوص لفظ ہے کہ جسے نص کہا جاتا ہے یعنی متعین معنیٰ!

ہاں، تفسیر ثعلبی میں مذکور ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور کتاب ''نہج البیان'' تالیف شیبانی میں حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس روایت کو دیگر روایات کے تناظر میں موردِ توجہ قرار دیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیت حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو دین کی نصرت میں آنجنابؑ کے ساتھ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں شریک ہوئے۔ اور انہیں صرف اس لئے موردِ ستائش قرار دیا گیا کہ انہوں نے صرف دین الٰہی کی نصرت میں دشمنان دین سے جنگ میں شرکت کی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اس کے باوجود عنقریب ان کثیر روایات کے تناظر میں بیان کیا جائے گا کہ جمہور اہل سنت کی کثیر روایات میں مذکور ہے کہ آیۂ مبارکہ ''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ'' میں ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' سے مُراد حضرت علیؑ ہیں حالانکہ آیت میں جمع کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا)

اس سے قطع نظر یہ کہ قتادہ، ضحاک اور حسن کی بیان کردہ روایت میں ایک یہ اشکال بھی پایا جاتا ہے کہ جملہ: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ'' میں تبدیلی اور بے نیازی کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور وہ اس معنیٰ میں ظہور رکھتا ہے کہ جس میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہیں پائی جاتی خواہ اس کے مخاطب آیت کے نزول کے وقت موجود افراد ہوں یا وہ اور بعد میں آنے والے سب مراد ہوں، بہرحال اس میں سب مدعیان ایمان سے خطاب ہوا ہے کہ اگر وہ سب یا ان میں سے بعض اپنے دین سے روگرداں ہو جائیں (مرتد ہو جائیں) تو اللہ ان کی جگہ ان لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے جبکہ اللہ مرتد لوگوں کو دوست نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ اسے دوست رکھتے ہیں اور وہ فلاں فلاں صفت کے حامل ہیں اور اللہ کے دین کی نصرت کریں گے۔

یہ مطلب واضح وصریح ہے کہ اس سے مراد صرف وہ لوگ نہیں جو آیت کے عہد نزول میں موجود تھے اور وہ کہ جنہوں

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مرتدلوگوں سے جنگ کی کہ جو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے اور وہ بھی جملہ ''یَاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے مخاطبین میں سے تھے لہٰذا وہ جملہ ''فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ'' کا مصداق قرار نہیں پا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت درج ذیل آیت کی مانند ہے:

○ سورۂ محمد، آیت: ۳۸

''وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ''

(اور اگر تم روگردانی کرو تو وہ تمہاری جگہ تمہارے علاوہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تمہاری طرح کے نہ ہوں گے)

تفسیر نعمانی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے سلیمان بن ہارون عجلی سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ وہ فرما رہے تھے اس کام والا شخص اللہ کی حفاظت میں ہے، اگر تمام افراد بشر ختم بھی ہو جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ اس کے اصحاب وساتھیوں کو لے آئے گا اور وہ لوگ وہی ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''فَاِنْ یَّکْفُرْ بِھَا ھٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِھَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِھَا بِکٰفِرِیْنَ'' (اگر یہ سب اس کا انکار کردیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم نے ایسے لوگوں کو ذمہ داری دے رکھی ہے جو دین کا انکار کرنے والے نہیں)، اور وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا ''فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' (عنقریب اللہ ان لوگوں کو لے آئے گا جن سے اسے محبت ہے اور وہ اس سے محبت کریں گے وہ مؤمنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہیں)۔ یہی مطلب تفسیر العیاشی (جلد اوّل، ص ۳۲۶ اور تفسیر قمی جلد ۱، ص ۱۷۱) میں بھی مذکور ہے۔

قرآن وحدیث کی ملی جلی بحث:

سابقہ بحثوں میں متعدد بار اس مطلب کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اہم ترین قرآنی خطابات کہ جن میں خاص توجہ مبذول ہوئی ہے اور نہایت شدید لہجہ میں بات کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان امور کی بابت ایسے عوامل واسباب پائے جاتے ہیں جن کے نتیجہ میں مربوطہ اعمال کا ارتکاب کرنے والے مسلمانوں کو تباہی وبربادی کا سامنا ہو سکتا ہے اور وہ اعمال انہیں اللہ کی ناراضگی میں مبتلا کر سکتے ہیں جیسا کہ سود کے حکم پر مبنی آیات اور ذی القربیٰ کی مودت والی آیت اور اس طرح کی دیگر آیات میں شدید ترین لہجہ میں بات ہوئی ہے،

البتہ یہ بات بنیادی طور پر خطاب میں پائی جاتی ہے کہ جب کوئی دانا شخص اپنے خطاب میں متعلقہ افراد کو کسی معمولی وناچیز کام کا حکم دے پھر اس کام کی بابت نہایت تاکید واصرار پر مبنی لہجہ میں بات کرے کہ وہ ناچیز ومعمولی کام اس کا متقاضی

نہ ہو، یا وہ اپنے زیردست افراد میں سے کسی فرد سے اس طرح مخاطب ہو کہ اس انداز میں اس سے بات کرنا اس کی شخصیت و حیثیت کے مطابق نہ ہو مثلاً کسی عالم ربانی کو جو زہد و عبادت میں بلند و بالا مقام و منزلت رکھتا ہو بھرے مجمع میں نہایت بدترین گناہ کے ارتکاب سے روکے، تو اس سے ثابت ہوگا کہ اس میں کوئی خاص وجہ اور راز ہے کہ جس کے پیش نظر اس دانا و آگاہ شخص نے اس انداز و کیفیت میں بات کی ہے اور یقیناً اس کام کے انجام دینے میں بہت بڑا خطرہ لاحق ہونا متوقع ہے اور جن قرآنی بیانات میں اس طرح کا انداز پایا جاتا ہے ان میں متوقع آثار و حوادث کا وقوع پذیر ہونا آیات میں مذکور مطالب کی تصدیق بلکہ واضح دلیل قرار پاتا ہے جبکہ عین ممکن ہے کہ آیاتِ مبارکہ کے زمانہ نزول میں سامعین ان آثار و حوادث کی طرف ملتفت و متوجہ نہ ہوئے ہوں جن کا ذکر اشاروں یا واضح دلالت کے ساتھ ہوا، مثلاً قرآن مجید میں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قربیٰ سے مودت کا حکم دیا گیا اور اس کی بابت نہایت تاکید ہوئی یہاں تک کہ اسے رسالت کا اجر اور خدا تک پہنچنے کا راستہ قرار دیا گیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ پر مظالم کے پہاڑ توڑ دیئے کہ اگر انہیں حکم دیا جاتا کہ اہل بیتؑ پر اس طرح کے مظالم ڈھائیں تو وہ اس سے زیادہ نہ کر سکتے جو انہوں نے ان کے ساتھ سلوک کیا،

اس کی دیگر مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) قرآنِ مجید میں اُمت کو باہمی اختلافات کا شکار ہونے سے منع کیا گیا اور اس میں اس قدر شدت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ اس سے زیادہ قابل تصور نہیں، اس کے باوجود اُمت اسلامیہ اس قدر باہمی اختلافات کا شکار ہوئی اور آپس میں تفرقہ پیدا کر کے گروہوں میں بٹ گئی کہ اس قدر گروہ بندی یہود و نصاریٰ میں بھی نہیں پائی جاتی بلکہ ان سے کہیں آگے بڑھ گئی چنانچہ یہودی (۷۱) فرقوں میں اور نصاریٰ (۷۲) فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جبکہ مسلمان (۷۳) فرقوں میں بٹ گئے، یہ تعداد ان کے درمیان دینی علمی معارف و عقائد کی بنیاد پر ہے جبکہ معاشرتی رسم و رواج اور سیاسی و حکومتی ناموں میں پائے جانے والے اختلافات کی بنیاد پر گروہ بندیاں شمار سے باہر ہیں۔

(۲) قرآنِ مجید میں اللہ کے دستورات کے علاوہ فیصلہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور طبقاتی اختلافات، سرکشی اور نفسانی خواہشات کی پیروی جیسے اعمال سے منع کیا گیا اور اس میں نہایت سختی برتی گئی اور شدید ترین انداز میں سخت ترین عذاب سے دوچار ہونے سے خبردار کیا گیا مگر اس کے باوجود جو کچھ واقع ہوا وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

(۳) کفار اور اہل کتاب سے دوستی کرنے کی ممنوعیت کا حکم اور اس سلسلہ میں شدید تاکید بھی اس موضوع کی واضح ترین مثال ہے بلکہ اس سلسلہ میں پائی جانے والی شدید تاکید کا دیگر مسائل میں پائی جانے والی شدت آمیزی سے کہیں زیادہ ہونا بھی بعید نہیں چنانچہ یہ شدت آمیزی اس حد تک پہنچی کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور ان میں سے کفار سے

دوستی کرنے والوں کے بارے میں فرمایا: ''وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ '' (اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے وہ انہی میں سے شمار ہوگا) اور سورۂ آلِ عمران، آیت: ۲۸، میں ان لوگوں سے دوستی کرنے والے کو اپنے سے لاتعلق قرار دے کر یوں فرمایا ''وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ '' (اور جو شخص ایسا کرے اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا) اور دوبارہ اسی سلسلہ میں انہیں ان لفظوں میں خبردار کیا: ''وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ '' (اور اللہ تمہیں اپنے سے خبردار کرتا ہے)، سورۂ آل عمران، ۲۸، ۳۰۔ اس سلسلہ میں اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس چیز سے خبردار کیا گیا ہے وہ حتمی اور ناقابل تبدیل وتبدل فیصلہ ہے کہ وہ یقیناً واقع و نافذ ہوگا، اگر آپ اس سے زیادہ وضاحت چاہیں تو سورۂ ہود کی آیات کا مطالعہ اور ان میں غور کریں:

O سورۂ ہود، آیات، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳

''وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ''

(اور یقیناً تیرا پروردگار ان کے اعمال کا پورا پورا حساب کرے گا، وہ ان کے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

اس آیت سے پہلے حضرت نوحؑ، ہودؑ اور صالحؑ و دیگر انبیاءؑ کی اُمتوں کے واقعات ذکر ہو چکے ہیں اور پھر یہود و نصاریٰ کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔

O آیت: ۱۱۲

''فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ''

(جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ استقامت وثابت قدمی اختیار کریں اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ ہیں کہ جنہوں نے توبہ کر لی ہے، اور تم لوگ طغیان نہ کرو کہ یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے)

اس میں ''وَلَا تَطْغَوْا'' (اور تم طغیان وسرکشی اور حد سے تجاوز نہ کرو) اجتماعی خطاب ہے کہ جس کے بعد والا جملہ ''بِمَا تَعْمَلُوْنَ'' اس کے اجتماعی ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

O آیت: ۱۱۳

''وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ''

(اور تم ان لوگوں پر اعتماد نہ کرو، ان کا سہارا نہ لو، کہ جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ورنہ عذاب کی آگ تمہیں گھیر لے گی اور اللہ کے سوا کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا پھر تمہاری نصرت نہیں ہوگی)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ وہ آگ کا عذاب آخرت سے پہلے اسی دنیا میں ہے اور آیت مطلق ہے۔ اس میں کوئی قید وشرط مذکور نہیں اور اسی دنیوی عذاب سے اس جملہ کے ذریعے ڈرایا گیا ہے ''وَیُحَذِّرُكُمُ

اللہُ نَفْسَهٗ ''(اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے خبردار کرتا ہے) کہ جس سے بچنے کا واحد ذریعہ خدائی نظام ولایت کی پیروی ہے کہ جس کا غدیر خم میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح اعلان فرمایا اور اس کی فرمانبرداری کے نتیجہ میں اللہ نے مؤمنین کو یہ خوشخبری دی ''اَلْیَوْمَ یَىٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' (آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے پس تم ان سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو۔ میرے عذاب سے ڈرو) سورۂ مائدہ، آیت: ۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ مؤمنین اپنے دین کے بارے میں کافروں سے جو کہ مشرکین واہل کتاب ہیں آیت کے نازل ہونے کے دن تک خوف کھاتے تھے آج اس کی بابت امن میں ہیں لہٰذا انہیں ان سے ڈرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں بلکہ ان پر واجب ولازم ہے کہ اس سلسلہ میں صرف اپنے پروردگار سے ڈریں، اور وہ اپنے دین کی بابت کافروں سے جس چیز کا خوف واندیشہ رکھتے تھے وہ صرف یہ تھی کہ وہ دین کا چراغ گل کر دیں گے کہ جس کے نتیجہ میں یہ پاکیزہ نعمت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور کفار ہر ممکن ذریعہ استعمال کر کے انہیں اس نعمت سے محروم کرنے کی کوشش کریں گے، تو یہ چیز تھی جس سے اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مؤمنین خوفزدہ تھے مگر اس آیت نے ان کے خوف کو امن میں بدل دیا اور ان کے نفوس کو اطمینان حاصل ہو گیا، ان کے دل مطمئن ہو گئے تو اب ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں صرف اپنے پروردگار سے ڈریں کہ کہیں ان کی معصیت اور نعمت ولایت کی ناشکری کے نتیجہ میں وہ انہیں اپنے نور سے محروم نہ کر دے اور ان سے اپنے دین کی عظیم نعمت واپس نہ لے لے۔

یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب میں مبتلا نہیں کرتا جب تک وہ اس کے مستحق نہ ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

○ سورۂ انفال، آیت: ۵۳

''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ''

(یہ اس لئے ہے کہ اللہ کسی قوم کو عطا کی گئی اپنی نعمت کو تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اس نعمت کو تبدیل نہ کریں۔ اس کی تبدیلی کے اسباب فراہم نہ کریں)

اس آیت میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عطا کی گئی نعمت صرف اس وقت تبدیل کرتا ہے جب وہ لوگ اس تبدیلی کے حقدار بنیں اپنے اعمال کے نتیجہ میں! اور یہ سب کچھ لوگوں کی طرف سے ہی عقیدہ وعمل میں تبدیلی اور معصیت کا راستہ اختیار کرنے کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دین یا دینی ولایت کو جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے وضاحت ہو چکی ہے نعمت سے موسوم فرمایا ہے چنانچہ سورۂ مائدہ، آیت ۳ میں ''اَلْیَوْمَ یَىٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'' کے بعد یوں ارشاد ہوا ''اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا'' (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا) سورۂ مائدہ، آیت: ۳۔

بنابرایں نعمت کی تبدیلی کا سبب وہ خود ہیں کہ انہوں نے اللہ کی ولایت سے دوری اختیار کر کے اس سے اپنا تعلق توڑ لیا اور ظالموں کا سہارا لے لیا اور کفار و اہل کتاب سے دوستی قائم کر لی جو کہ ان سے متوقع تھا، جبکہ ان پر واجب تھا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاتے کہ کوئی بھی اس کا راستہ روک نہیں سکتا اور اسی کے بارے میں اللہ نے انہیں خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

O سورۂ مائدہ، آیت: ۵۱

''وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ''

(اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی قائم کرے وہ انہی میں سے ہوگا یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اُنہیں ان کی سعادت کا راستہ نہیں دکھاتا جبکہ سعادت ہی ہے جس کا تعلق ہدایت سے ہے اور دنیا میں ان کی سعادت سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کے طور طریقہ کو اپنائیں اور اپنے معاشرہ میں اسلام کے عمومی دستورات پر عمل پیرا ہوں، لیکن اگر اس پاکیزہ دینی طور طریقوں کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں اس کے ظاہری مظاہر میں بھی اختلال پیدا ہو جائے گا جو کہ اس کی معنوی حقیقت کے ترجمان و محافظ ہوتے ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہیں، اور پھر دینی عمومی شعائر کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور ان کی جگہ کفار کا طرزِ عمل آ جاتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور اس کے آثار پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں جیسا کہ عصر حاضر میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت اس کی واضح دلیل ہے۔

اگر آپ اس اسلامی طرزِ عمل پر غور کریں جس کی اساس کتاب و سنت پر استوار ہے اور اسے مسلمانوں میں رائج و نافذ کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے اور پھر آپ عصر حاضر میں مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لے کر اس مطلب پر غور کریں جو آیت ۵۴ میں ان الفاظ میں اشارہ ہوا ہے: ''فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ'' (پھر بہت جلد ان لوگوں کو لے آئے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہے اور وہ اسے دوست رکھتے ہیں وہ مومنین پر نرمی کے ساتھ اور کافروں پر سختی کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، انہیں کسی بدکلامی کرنے والے کی بدکلامی کا کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا) تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمام برائیاں کہ جو مسلمانوں کے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں اور آج ہمیں جن کا سامنا ہے وہ سب کفار سے حاصل کردہ تحفے ہیں کہ جو اب ہمارے ہاں گھر کر چکے ہیں اور ہم ان کے رسیا بن چکے ہیں درحقیقت وہ ان اقدار و اوصاف کے اضداد ہیں کہ آیت میں جن کا ذکر اللہ نے ان مومنین کے بارے میں کیا ہے کہ جنہیں وہ لے آئے گا یعنی وہ تمام برائیاں اور عملی رزیلتیں اس میں خلاصہ ہوتی ہیں کہ آج ہمارا معاشرہ ان لوگوں کی آماجگاہ ہے جو نہ تو اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور نہ ہی اللہ انہیں دوست

رکھتا ہے وہ کافروں کے ساتھ نرم اور مؤمنین کے ساتھ سخت رویہ رکھتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جہاد نہیں کرتے اور وہ ہر بدکلامی کرنے والے کی بدکلامی سے ڈرتے ہیں، تو یہ وہی بات ہے جس کی خبر قرآن مجید نے دی کہ جس نے اسلام کے دعویداروں کے چہروں پر پڑی نقاب کو اُلٹ دیا ہے اگر آپ اسے ان الفاظ میں بیان کریں تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ وہ غیبی خبر ہے جو خدائے علیم و خبیر نے دی کہ اسلامی معاشرہ بہت جلد اپنے دین سے منہ موڑ لے گا اور یہ منہ موڑنا اصطلاحی ارتداد نہیں بلکہ اس کی مانند ہے کہ جسے آیت ۵۱ میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ''وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ'' (اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی قائم کرے گا وہ انہی میں سے شمار ہوگا یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت عطا نہیں کرتا) اور آیت ۸۱ میں یوں ارشاد ہوا: ''وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ'' (اور اگر وہ اللہ، نبی اور جو کچھ نبی پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لاتے تو انہیں (کفار و مشرکین کو) دوست نہ بناتے لیکن ان کی اکثریت فاسق ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کی نصرت کریں تو وہ انہیں مدد سے نوازے گا اور ان کے دشمنوں کو کمزور و ناکام کردے گا بشرطیکہ وہ خود ان کی تقویت کا باعث نہ بنیں اور نہ ہی ان کے حامی ہوں، چنانچہ ارشاد ہوا:

- سورۂ محمد، آیت: ۷

''إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ''

(اگر تم اللہ کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا)

- سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۱۲

''وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ''

(اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا، ان میں سے بعض مؤمن اور ان کے اکثر افراد فاسق ہیں وہ تمہیں پریشان کرنے کے علاوہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو وہ تمہیں پشت دکھائیں گے۔ میدان جنگ سے بھاگ جائیں گے۔ تو ان کی کوئی مدد نہ ہوگی، ذلت وخواری ان کا مقدر بن چکی ہے خواہ وہ جہاں بھی پائے جائیں سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں اور لوگوں کی پناہ میں آجائیں)

اس میں جملہ ''إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ'' سے ممکن ہے یہ مطلب مقصود ہو کہ ان کے لئے ذلت وخواری سے نجات پانے کا واحد راستہ لوگوں کا ان سے دوستی کرنا اور اللہ کا انہیں ان لوگوں پر مسلط کرنا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرہ سے کہ جس کی صورتحال بیان ہوئی ہے وعدہ فرمایا کہ وہ ایسے افراد لے آئے گا جن

سے اسے محبت ہے اور وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے وہ مؤمنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے وہ کسی ملامت کرنے والے بدکلام کی ملامت و بدکلامی کا کوئی خوف نہیں کھائیں گے۔

اس ارشاد الٰہی میں جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں جیسا کہ آپ آگاہ ہیں اسلامی معاشرہ آج ان سب سے محروم ہے اور اس میں ان اوصاف میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا اور ان اوصاف میں نہایت غور و فکر کرنے اور ان کی بابت باریک بینی سے کام لینے سے یہ مطلب بھی واضح ہو جائے گا کہ جن پستیوں اور خواریوں و رزائل سے اسلامی معاشرہ کے آلودہ ہونے کی خبر آیت میں دی گئی ہے وہ اس وقت سب ہی اسلامی معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں، اور ان کا ذکر و شمار آخر الزمان کے حالات و پیشگوئی پر مبنی ان روایات میں موجود ہے جو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، اگرچہ وہ روایات بہت زیادہ ہیں اور مجموعی طور پر جعل و تحریف سے بھی محفوظ نہیں لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان ایسی روایات موجود ہیں کہ رونما ہونے والے واقعات اور میدانی حقائق ان کی تصدیق کرتے ہیں اور وہ روایات قدیم ارباب تحقیق نے اپنی کتب میں لکھی ہیں جو کہ اس تاریخ سے تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پہلے کی تالیفات میں موجود ہیں اور ان کتب کی ان مؤلفین کی طرف نسبت بھی یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور بعد میں آنے والے کثیر مؤلفین نے ہر صدی میں انہی کے حوالہ سے وہ روایات ذکر کی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ان روایات میں جن حوادث و واقعات کی خبر و پیشگوئی کی گئی ہے وہ اس دور میں وقوع پذیر نہیں ہوئے اور نہ ہی اس دور کے باسیوں کو اس طرح کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی توقع تھی، لہٰذا اس کے سوا کوئی راہ ہی باقی نہیں رہتی کہ ان روایات کو قرین صحت تسلیم کیا جائے اور ان کا سرچشمہ وحی سے بیان کیا جانا درست مانا جائے،

ان روایات میں ایک مثال اس روایت کی ہے جو تفسیر قمی میں مؤلفؒ نے اپنے پدرِ بزرگوار کے حوالہ سے ذکر کی ہے کہ انہوں نے سلیمان بن مسلم خشاب کی سند سے بیان کیا کہ انہوں نے عبداللہ بن جریح مکی کے حوالہ سے عطاء بن ابو ریاح کا قول ذکر کیا کہ عبداللہ بن عباس نے کہا: ہم نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری حج تھا کہ جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا یعنی حجۃ الوداع! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کو پکڑ کر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور اپنا چہرہ مبارک ہماری جانب کر کے فرمایا: میں تمہیں قیامت کی نشانیوں سے آگاہ کروں؟ اس دن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک کھڑے ہوئے تھے انہوں نے عرض کی ہاں! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہیں:

- نماز کا ضائع ہونا: (مسلمان نماز پڑھنا ترک کر دیں گے)
- خواہشات کی پیروی
- دنیاوی لذتوں کی طرف رغبت
- مال و دولت کا معیارِ عزت قرار پانا
- دین کو دنیا کے بدلے میں بیچنا

اس وقت مؤمن کا دل اس کے بدن میں اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے کہ جب وہ کسی بُرائی کو پنپتا دیکھے گا مگر اس کی روک تھام کرنے سے قاصر ہوگا۔

سلمان نے تعجب سے عرض کی: کیا کبھی ایسا ہوگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں! اے سلمان، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس وقت حکومت کی باگ ڈور ظالموں کے ہاتھوں میں ہوگی کہ جن کے وزراء فاسق، ماہرین فن ظالم و ستمگار اور ان کے اُمناء خیانت کار ہوں گے۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں! اے سلمان! مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس وقت منکر (برائی) معروف (اچھائی و نیکی) اور معروف (نیکی) منکر (برائی) میں بدل جائے گی، خیانت کار کو امانت دار اور امانت دار کو خائن، جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا قرار دیا جائے گا۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا ہوگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت عورتیں حکمران ہوں گی، غلام مشیر ہوں گے، بچے منبر نشین ہوں گے، جھوٹ کو چالاکی و ہشیاری، زکات کو جرمانہ، بیت المال کو مالِ غنیمت سمجھا جانے لگے گا، آدمی اپنے ماں باپ سے جفا کرے گا جبکہ اپنے دوست سے نیکی کرے گا اور اس وقت دم دار ستارہ طلوع کرے گا۔

سلمان نے عرض کی: کیا ایسا ہوگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس وقت بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوگی، بے موسمی بارشیں ہوں گے، شریف لوگوں پر کڑا وقت

ہوگا اور غریب و نادار کو حقیر گردانا جائے گا اور اس وقت بازاروں میں مندی کا یہ عالم ہوگا کہ ایک شخص کہے گا: میں نے کچھ بھی نہیں بیچا اور دوسرا کہے گا: میں نے کوئی نفع حاصل نہیں کیا، ان کی یہ باتیں اس طرح ہوں گی کہ گویا وہ خدا کو برا بھلا کہہ رہے ہیں (نعوذ باللہ)، یعنی مندی کی ذمہ داری خدا پر ڈال رہے ہیں۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، بخدا قسم کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس وقت ایسے لوگ ان پر مسلط ہوں گے کہ اگر زبان کھولیں اور کچھ کہیں تو وہ انہیں قتل کر دیں گے اور اگر خاموش رہیں تو وہ ان کی ہر چیز پر قبضہ کر لیں گے اور ان کی املاک و اموال کو اپنے لئے مباح قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کی عزت پامال کر دیں گے اور ان کی ناموس کی بے حرمتی کے مرتکب ہوں گے، صرف یہی نہیں بلکہ ان کا قتل عام کریں گے اور ان کے دلوں میں اس قدر خوف و رعب ڈالیں گے کہ وہ ہمیشہ وحشت زدہ، خوفزدہ، مرعوب و بے بسی کا شکار ہوں گے۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا ہوگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! وہ لوگ کوئی چیز مشرق سے اور کوئی چیز مغرب سے لا کر میری اُمت کو اپنی استعماری زنجیروں میں جکڑ دیں گے، میری اُمت کے کمزور افراد ان کے ہاتھوں نہایت سختی و تنگی کا شکار ہوں گے جبکہ وہ لوگ اللہ کے عذاب کا شکار ہوں گے، وہ نہ کسی چھوٹے پر رحم کریں گے اور نہ ہی کسی بڑے کی عزت کریں گے اور نہ ہی ان کے بارے میں سوائے بری خبروں کے کوئی بات سنی جائے گی، ان کی شکلیں انسانوں جیسی جبکہ اُن کے دل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوں گے۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا ہوگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، جس ذات کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس وقت مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے جنسی ضرورتیں پوری کریں گی اور چھوٹے لڑکوں پر چھوٹی لڑکیوں کی طرح خاندان کی غیرت کے تحفظ کی بابت کڑی نظر رکھی جائے گی، اس دور میں مرد عورتوں جیسے اور عورتیں مردوں کے مشابہ ہوں گی اور عورتیں زین والی سواریوں پر سواری کریں گی کہ ان پر میری اُمت کی طرف سے اللہ کی لعنت ہو!

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں مسجدوں کو اس طرح سجایا جائے گا جس طرح یہود و نصاریٰ کی عبادتگاہیں سجائی جاتی ہیں، قرآن مجید کے نسخوں کو سونے چاندی سے مزین کیا جائے گا اور مسجدوں کے میناروں کو بہت بلند بنایا جائے گا، عبادت گاہوں میں ہجوم ہوگا مگر دلوں

میں ایک دوسرے سے بغض وعناد اور زبانوں میں عدم ہم آہنگی ہوگی۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا ہی ہوگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس دور میں میری اُمت کے مرد سونے کے زیورات پہنیں گے اور اعلیٰ ترین ریشمی لباس زیب تن کریں گے، اور چیتے کی کھال کی خرید وفروخت کریں گے۔

سلمان نے پوچھا: کیا ایسا ہوگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں سودی کاروبار عام ہوگا اور لین دین میں غیبت ورشوت معمول ہوگی، دین کو پستی میں ڈال دیا جائے گا اور دنیا کو رفعت وبلندی حاصل ہوگی۔

سلمان نے عرض کی: کیا یہ سب وقوع پذیر ہوگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں طلاقیں کثرت سے واقع ہوں گی، کسی مجرم کو حد جاری نہیں کی جائے گی، اس صورتحال میں کوئی اللہ تعالیٰ کو نقصان سے دوچار نہ کرسکے گا۔

سلمان نے عرض کیا: کیا ایسا ہوگا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس دور میں گانے بجانے والی عورتوں کے کاروبار کا بازار گرم ہوگا اور رقص وسرور کے مظاہر عام ہوجائیں گے، اس وقت میری اُمت کے شریر لوگ حاکم بن جائیں گے۔

سلمان نے عرض کی: کیا ایسا ہوگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں میری اُمت کے دولتمند افراد حج کو جائیں گے مگر صرف تفریح وخوش طبع کے لئے! اور درمیانہ طبقہ کے لوگ حج کو جائیں گے مگر تجارت کی غرض سے! اور نادار اور غریب طبقہ کے افراد ریاکاری ودکھاوے کے لئے حج کو جائیں گے۔ اس دور میں لوگ قرآن کی تعلیم حاصل کریں گے مگر غیر اللہ کے لئے! اور اسے موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا وسیلہ قرار دیں گے، کچھ لوگ فقہ کا علم حاصل کریں گے، اللہ کے احکام ودستورات سے آگاہی حاصل کریں گے مگر غیر اللہ کے لئے! اس دور میں زنا کی اولاد زیادہ ہوگی، لوگ قرآن کی تلاوت میں غنا شامل کریں گے اور دنیاداری میں ایک دوسرے سے دست و

گریباں ہوں گے۔

سلمان نے عرض کی: کیا ایسی صورتحال پیدا ہو جائے گی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں عزت و ناموس کی پامالی عام ہو جائے گی، گناہ و معصیت کا بازار گرم ہوگا، اشرار و برے لوگ اخیار و نیک لوگوں پر مسلط ہو جائیں گے، جھوٹ رواج بن جائے گا، باہمی جھگڑے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے، فقر و ناداری دامن پھیلا دے گی، لوگ فاخرہ لباس پہننے میں ایک دوسرے پر فخر و مباہات کریں گے، غیر موسمی بارشیں برسنے لگیں گی، شطرنج اور ساز و آواز سے دل لگی بڑھ جائے گی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے روگردانی ہوگی، یہاں تک کہ اس دور میں مؤمن کو اُمت کا ذلیل و پست فرد سمجھا جائے گا، قاریوں اور عابدوں کے درمیان رسہ کشی ہوگی تو ایسے لوگ آسمانی ملکوتی دنیا میں ناپاک و پلید افراد میں شمار ہوتے ہیں۔

سلمان نے عرض کی: کیا ایسا ہی ہوگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں مجھے اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں دولتمند کو فقر و ناداری کے خوف کے سوا کسی چیز کا ڈر نہ ہوگا اور صورتحال یہ ہو جائے گی کہ پورے ہفتہ میں یعنی ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے دروانیہ میں کوئی شخص مانگنے والے کو کچھ بھی عطا نہ کرے گا۔

سلمان نے عرض کی: کیا ایسی صورتحال ہوگی اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اے سلمان! اس دور میں ''رُوَیضہ'' بولے گا،

سلمان نے عرض کی: رُوَیضہ سے کیا مراد ہے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کبھی نہ بولتا تھا وہ عمومی مسائل کی بابت کرے گا، پھر بہت کم لوگ بچ جائیں گے یہاں تک کہ زمین سے آوازیں سنائی دینے لگیں گی جس سے ہر قوم یہ خیال کرے گی کہ وہ آوازیں ان کے لئے ہیں، اس کے بعد جب تک اللہ چاہے گا لوگ اسی حال میں باقی رہیں گے، پھر وہ نابود ہو جائیں گے اور زمین اپنے اندر موجود ہر چیز باہر نکال دے گی ہر طرح کی دھاتیں، یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یعنی سونا اور چاندی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں موجود ستونوں کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا اور فرمایا: ان جیسے! مگر اس دن نہ سونا اور نہ چاندی، کوئی چیز کام نہ آئے گی، تو یہ ہے ''فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا'' کا معنٰی! (تفسیر قمی، جلد دوم، صفحہ ۳۰۷)

امام جعفر صادقؑ کا بیان:

کتاب روضۂ کافی میں محمد بن یحییٰ کے حوالہ سے منقول ہے کہ احمد بن محمد نے اپنے بعض دوستوں کے حوالہ سے بیان کیا، اور علی بن ابراہیم نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے ابن ابی عمیر کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ ان سب نے محمد بن ابی حمزہ کے حوالہ سے حرّان کا قول بیان کیا کہ انہوں نے کہا: حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک مجلس میں کہ جہاں دوسروں کی شان وشوکت اور شیعوں کی حالت زار کے بارے میں بات ہورہی تھی، فرمایا: ایک دفعہ میں ابوجعفر منصور دوانیقی کے ساتھ سفر کررہا تھا وہ اپنے مخصوص گھوڑے پر سوار تھا، اس کے آگے پیچھے اس کے سلطنتی اسپ سوار محافظ چل رہے تھے اور میں اپنی سواری پر سوار ہوکر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اس دوران اس نے مجھ سے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس شان و شوکت اور عزت واقبال سے نوازا ہے آپ کو اس پر خوش ہونا چاہیے اور لوگوں سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ آپ اور اہل بیت ہم سے زیادہ اس کے حقدار ہیں ورنہ آپ ہمیں اپنا اور لوگوں کا دشمن بنالیں گے۔

امامؑ نے فرمایا کہ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو میری طرف سے اس طرح کی جھوٹی خبر کس نے دی ہے؟

منصور نے کہا: کیا آپ حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے یہ بات نہیں کی؟

امامؑ نے فرمایا کہ میں نے اس سے کہا: لوگ جادوگر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تجھے مجھ سے رنجیدہ خاطر کریں اور تیرے دل میں میرے بارے میں غلط باتیں ڈال دیں، ان کی باتوں پر کان نہ دھرو، جتنی تجھے ہماری ضرورت ہے اس سے زیادہ ہمیں تیری ضرورت ہے۔

منصور نے پوچھا: کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک دن میں نے آپ سے پوچھا تھا، کیا ہمیں حکومت حاصل ہوگی؟ میں نے کہا ہاں، تمہیں طویل مدت، وسیع اور طاقتور حکمرانی حاصل ہوگی اور تم لوگ اب اسی کے مزے لے رہے ہو اور اپنی دنیا آباد کئے ہوئے ہو کہ بالآخر تم محترم مہینہ اور محترم شہر میں ہمارے محترم خون سے اپنے ہاتھ رنگین کروگے، امامؑ نے فرمایا: میں سمجھ گیا کہ منصور کو پرانی بات یاد ہے لہٰذا میں نے کہا: تیری بات صحیح ہے شاید کہ اللہ تجھ پر عنایت کرے ورنہ اس دن میرا مقصد تم نہ تھے بلکہ عمومی بات تھی جو میں نے تمہیں بتائی، عین ممکن ہے تمہارے ہی خاندان میں سے کوئی شخص اپنے ہاتھ ہمارے خون میں رنگین کرے۔

منصور یہ سن کر خاموش ہوگیا اور مجھ سے کوئی بات نہ کی، پھر جب میں واپس اپنے گھر پہنچا تو ہمارے موالیوں میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا: میری جان آپ پر فدا ہو، بخدا میں نے آپ کو منصور کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھا جبکہ آپ اپنے خچر پر سوار تھے اور وہ گھوڑے پر سوار تھا اور وہ اپنی سواری سے نیچے کی طرف جھک کر آپ سے باتیں

کررہا تھا گویا وہ اُونچا اور آپ نیچے تھے تو میں نے اپنے آپ سے کہا: یہ مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں جو کہ حقیقی معنی میں اس مسند اقتدار و حکومت کے حقدار ہیں کہ تمام افراد بشر ان کے پیروکار و تابع فرمان ہیں جبکہ دوسرا شخص (منصور) ظالم، جابر، انبیاءؑ کی اولاد کا قاتل اور زمین میں خونریزیاں کرنے والا ہے اور ایسے اعمال انجام دیتا ہے جو اللہ کو ہرگز پسند نہیں، وہ تو گھوڑے پر سوار ہو اور آپ گدھے پر! آخر ایسا کیوں؟ یہ منظر دیکھ کر میں اپنے دین اور اپنی جان کے بارے میں خوفزدہ ہو گیا۔

امامؑ نے فرمایا: میں نے اس سے کہا کہ اگر تو ان فرشتوں کو دیکھ پاتا جو میرے اردگرد، میرے آگے، میرے پیچھے، میرے دائیں اور میرے بائیں جانب تھے تو یقیناً تو اسے حقیر و پست سمجھتا اور اس کی ظاہری شان و شوکت تجھے ہیچ دکھائی دیتی۔

اس نے جب یہ سنا تو کہنے لگا: اب مجھے سکون ملا ہے، پھر اس نے پوچھا: آخر کب تک یہ لوگ حکمرانی و سلطنت کے مزے لیتے رہیں گے اور عیش و عشرت سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے؟

امامؑ نے فرمایا: میں نے اس سے کہا: کیا تو نہیں جانتا کہ ہر چیز کا وقت متعین ہے؟ اس نے جواب دیا: بالکل صحیح ہے، پھر میں نے کہا: اگر تمہیں معلوم ہو کہ جب وقت پورا ہو جائے تو پلک جھپکنے کی مہلت بھی نہ ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے کام تمام ہو جائے گا، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کیا حالت ہے اور وہ کس طرح کی بدحالی کا شکار ہیں تو ان کے بارے میں تیری دشمنی کی انتہا نہ رہتی اور تو ان سے سخت نفرت کرتا، اور اگر تم اور روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگ انہیں اس سے زیادہ سخت ترین حالت میں مبتلا کرنا چاہیں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے زیادہ سنگین ترین حالت ہو ہی نہیں سکتی، یاد رکھو! کہیں شیطان تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے اور اپنے دام فریب کا شکار نہ کر لے، یاد رکھو! حقیقی عزت اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مؤمنوں کے لئے ہے لیکن منافقین کو اس کا علم ہی نہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جو شخص ہمارے امر کا منتظر ہو اور اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں و سختیوں پر صبر سے کام لے وہ کل ہمارے ساتھ ہوگا؟

- پس جب تم حق اور اہل حق کا نام و نشان مٹتا دیکھو۔
- اور ظلم و جور کو ہر طرف پھیلتا دیکھو۔
- اور دیکھو کہ قرآن کو پرانی کتاب قرار دے کر اس میں رد و بدل کیا جا رہا ہے اور اس کی من پسند تفسیریں کی جا رہی ہیں، اور اس میں اپنی مرضی کے اضافے کئے جا رہے ہیں۔
- اور دین کو اس طرح اُلٹ دیا گیا جس طرح پانی کا برتن اُلٹ دیا جاتا ہے۔
- اہل باطل، اہل حق پر برتری پانے کی راہ پر چل نکلے ہیں۔
- شر و برائی کھل کر سامنے آ گئی ہے اور اس سے منع کرنے والا کوئی نہیں اور شریر و برے لوگوں کا ساتھ دیا جا رہا ہے۔
- فسق و فجور کا بازار گرم ہو چکا ہے۔

- مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے جنسی ضرورت پوری کرنے کو کافی سمجھنے لگے ہیں۔
- مؤمن نے چپ سادھ لی ہے کہ اس کی بات قبول نہیں کی جاتی۔
- فاسق جھوٹ پہ جھوٹ بولتا ہے مگر کوئی اس کے جھوٹ کو جھوٹ نہیں کہتا اور نہ ہی اس افتراء پردرازی کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے۔
- چھوٹا بڑے کی بے حرمتی کا مرتکب ہو رہا ہے۔
- قطع رحمی عام ہو چکی ہے۔
- فاسق کی تعریف ہوتی ہے تو وہ خود اس پر ہنستا ہے مگر تعریف کرنے والے کو روکتا نہیں۔
- اغلام بازی شرمناک حد تک پہنچ چکی ہے۔
- عورتیں اپنی ہی صنف کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہی ہیں۔
- بیجا مدح سرائی عام رائج ہے۔
- لوگ اپنے اموال اللہ کی اطاعت کے منافی امور میں خرچ کرتے ہیں اور کوئی انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکتا اور نہ ہی کوئی انہیں نصیحت کرتا ہے کہ یہ کام صحیح نہیں۔
- مؤمن کی نیک کاوشوں پر اس کا مذاق ہی نہیں بلکہ اس کی دل شکنی کے لئے ''معاذ اللہ''، ''نعوذ باللہ'' کہہ کر نیک کام کا راستہ روکا جاتا ہے۔
- ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ کو اذیت و آزار دیتا ہے مگر کوئی اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا۔
- کافر مؤمن کی حالت زار دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور جب معاشرے میں فتنہ وفساد پھیلتا دیکھتا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔
- شراب نوشی کھلے عام ہو رہی ہے اور خوف خدا سے بے پرواہر شخص اس کا مرتکب ہو رہا ہے۔
- امر بالمعروف بے قدر و قیمت ہو چکا ہے۔
- فاسق ان کاموں میں خوب مزے لے رہا ہے اور لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں۔
- معروف شخصیات کی تذلیل ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی تحقیر و تذلیل ہو رہی ہے جو ان شخصیات سے محبت کرتے ہیں۔
- نیکی کے راستے بند جبکہ برائی کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور لوگ ان پر چل رہے ہیں۔
- خانہ خدا کی یاد دلوں سے مٹ رہی ہے اور وہاں جانے سے روکنے کی تاکیدیں ہو رہی ہیں۔

- لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں، جس کام کے کرنے کا دوسروں سے کہتے ہیں وہ خود نہیں کرتے۔
- مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے اپنی ہوس پرستی کے خواہاں وکوشاں نظر آتے ہیں۔
- مرد اور عورتیں جسم فروشی کے ذریعے روزی کماتے ہیں (جسم فروشی ہی ان کا ذریعہ معاش بن چکا ہے)۔
- عورتیں مردوں جیسی محفلیں سجائی ہوئی ہیں۔
- بنی عباس کے مردوں پر عورتیں بننے کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور وہ خضاب لگا کر اپنے آپ کو جوان ظاہر کر کے بالوں کو اس طرح سنوارتے ہیں جس طرح کوئی عورت اپنے شوہر کے لئے ایسا کرتی ہے۔
- مرد اپنی جنسی رغبت (اپنے ساتھ بدفعلی کروانے) کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔
- ایک مرد سے بدفعلی کرنے کے لئے کئی لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور اسے اپنی غیرت کا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔
- مالدار شخص کو مومن سے زیادہ عزت حاصل ہے۔
- سودخوری ظاہر بظاہر ہو رہی ہے اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا۔
- عورتوں کی بدکاری کے ارتکاب پر تعریف کی جا رہی ہے۔
- بیوی اپنے شوہر کو ہم جنس پرستی پر اکساتی ہے۔
- عام لوگوں میں اس گھرانہ کو معزز سمجھا جا رہا ہے جو اپنی عورتوں کو بدکاری کی ترغیب اور ان کا ساتھ دیتے ہیں۔
- مؤمن ہمیشہ غمگین و پریشان اور ذلیل وخوار ہوتا ہے۔
- بدعتوں اور بدکاری کا بازار گرم ہے۔
- جھوٹی گواہی دینے والے کی وجہ سے آپس میں دست وگریباں ہوتے ہیں۔
- حرام کو حلال اور حلال کو حرام کہا جا رہا ہے۔
- دین پر اپنی مرضی ٹھونسی جا رہی ہے اور اللہ کی کتاب اور اس کے احکام کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔
- رات کی تاریکی میں اللہ کی نافرمانی کی جرأت ہو رہی ہے بلکہ رات کی بجائے دن میں خدا کی معصیت عام ہے۔
- مؤمن دل ہی دل میں برائی کو برائی کہتا ہے اسے کھلے عام ایسا کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔
- زیادہ تر اموال خدا کی ناراضگی میں خرچ ہو رہے ہیں۔
- حکمران کافروں سے نزدیک اور اہل خیر سے دور ہو رہے ہیں۔
- حکام رشوت ستانی کی بجائے رشوت دے کر اپنا اقتدار مضبوط کئے ہوئے ہیں۔
- ریاست کا کاروبار دولتمندوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔

- محرم ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں کر رہے ہیں۔
- تہمت و بدگمانی کی بناء پر لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔
- اغلام بازی پر ایک دوسرے کے ساتھ لڑائیاں ہو رہی ہیں اور اس پر جان و مال کی بازیاں لگائی جا رہی ہیں۔
- شوہر کو بیوی سے مقاربت کرنے پر مذمت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔
- مرد اپنی بیوی سے بدکاری کا کاروبار کرواتا ہے اور جان بوجھ کر اس کام میں اس کی مدد کرتا ہے۔
- بیوی اپنے شوہر پر حکومت کرتی ہے اور اس کی مرضی کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مرضی کے خلاف و برعکس کام کرتی ہے اور اسے ستانے و محکوم و مغلوب رکھنے کے لئے مال خرچ کرتی ہے۔
- مرد اپنی بیوی اور بیٹی اور کنیز کو نہایت کمترین چیز کے بدلے نامحرموں کے سپرد کر دیتا ہے اور کھانے پینے کی عام و ناچیز اشیاء ہی پر راضی ہو جاتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کی جھوٹی قسمیں زیادہ ہوگئی ہیں۔
- جوا معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔
- شراب کھلے عام بیچی جا رہی ہے اور کوئی اس سے منع نہیں کرتا۔
- عورتیں اپنے آپ کو کافروں کے ہاتھوں بیچ رہی ہیں اور اپنی عزتیں لوٹا رہی ہیں۔
- لہو ولعب اور رقص و سرور کی محفلیں علی الاعلان برپا ہو رہی ہیں اور کسی کو ان سے روکنے کی جرأت و ہمت نہیں ہوتی۔
- طاقتور طبقہ شریف لوگوں کی تذلیل و تحقیر میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔
- سلطنتی درباروں میں ہم اہل بیتؑ کو برا بھلا کہہ کر حکمرانوں کی تعریفیں کرنے والا شخص ہی ارباب اقتدار کے مقرب لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔
- ہم اہل بیتؑ سے محبت کرنے والے کو جھٹلایا جاتا ہے اور اس کی گواہی قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔
- جھوٹ اور جھوٹی باتیں معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں۔
- قرآن کی تلاوت کا سننا لوگوں کی سماعتوں پر گراں گزرتا جبکہ باطل و ناحق بات سننا مرغوب و مطلوب ہے اور اسے بھاری نہیں سمجھا جاتا۔
- ہمسایہ دوسرے ہمسایہ کی بدزبانی کے ڈر سے اس کی عزت کرتا ہے۔
- اللہ کی حدود سے روگردانی کر کے اپنی مرضی کے فیصلے کئے جا رہے ہیں۔
- مساجد کی ظاہری آرائش ہی پر توجہات جمی ہوئی ہیں۔

- سچا ترین شخص لوگوں میں جھوٹا وافتراء پرداز سچا گردانا جارہا ہے۔
- برائی اور چغل خوری ہی پر لوگوں کی کوششیں مرکوز ہیں۔
- بدعملی اپنا دامن پھیلا چکی ہے۔
- غیبت دل پسند مشغلہ ہے اور لوگ اس کے ارتکاب سے ہی دل بہلانے اور ایک دوسرے کی تفریح طبع کا کام لیتے ہیں۔
- فریضہ حج اور جہاد کا مقصد اللہ کی رضا واطاعت نہیں بلکہ دیگر مقاصد واہداف ملحوظ ہوتے ہیں۔
- حکمران طبقہ، کافروں کو خوش کرنے کے لئے مؤمنوں کی توہین کرتا ہے۔
- تعمیر کی جگہ تخریب نے لے لی ہے۔
- تاجروں نے ناپ تول میں کمی کرنے کو روزی کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔
- خونریزیاں معمول بن چکی ہیں۔
- لوگ صرف دنیاداری کے لئے اقتدار کے پیچھے دوڑتے ہیں اور اس کے لئے ہر طرح کی گندی زبان استعمال کر کے اپنا مطلوب حاصل کرنے میں کوشاں ہوتے ہیں۔
- مردوں کو قبروں سے نکال کران کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور ان کے کفن اتار کر انہیں بیچ دیا جاتا ہے۔
- معاشرے میں ہرج مرج پھیل چکا ہے۔
- نماز کو اہمیت نہیں دی جاتی۔
- مالدار اپنے مال کی زکات ادا نہیں کرتے۔
- لوگ صبح شام مستی ونشہ میں بسر کرتے ہیں اور انہیں معاشرہ کے افراد کے امور کی کوئی پروانہیں۔
- جانوروں کے ساتھ بدفعلی کی جاتی ہے۔
- چوپایوں کے درمیان خونریز لڑائیاں ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے ہیں۔
- لوگ نماز پڑھنے جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو ان کے کپڑے تک نوچ لئے جاتے ہیں۔
- لوگوں کے دل سخت، آنکھیں خشک اور اللہ کا ذکر ان پر بھاری ہو گیا ہے۔
- حرامخوری کا دور دورہ ہے۔
- نمازی، ریاکاری ودکھاوے کی غرض سے نماز پڑھتے ہیں۔
- فقیہ کا علم دین حاصل کرنے میں دین اور دین کی تبلیغ وخدمت مقصود نہیں بلکہ دنیاداری وریاست طلبی مطلوب ہے۔
- لوگ اسی کے ساتھ ہوجاتے ہیں جو طاقتور ہو۔

- حلال روزی تلاش کرنے والا مذموم و بیوقوف سمجھا جاتا ہے جبکہ حرام جمع کرنے میں کوشاں شخص کی تعریف کی جاتی ہے اور اسے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔
- حرمین شریفین، مکہ و مدینہ میں وہ کام انجام دیئے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور کوئی شخص ان سے نہیں روکتا اور نہ ہی ان کے اور اس قبیح فعل کے درمیان حائل ہوتا ہے۔
- حرمین شریفین میں ظاہر بظاہر ساز و آواز کا بازار سجا ہے۔
- جو شخص حق کی بات کرتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا ہے تو بعض لوگ اسے ازراہِ نصیحت کہنے لگتے ہیں کہ یہ تیری ذمہ داری نہیں۔
- لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی میں اہل شر کی پیروی کرتے ہیں۔
- خیر و نیکی کے راستے خالی پڑے ہوئے ہیں کوئی ان پر چلنے والا نہیں۔
- جنازوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے مگر کوئی اس سے روکنے والا نہیں۔
- سال بہ سال نئی بدعتیں جنم لیتی ہیں اور برائی میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔
- معاشرے میں صرف دولتمندوں کی بات سنی جاتی ہے۔
- ضرورتمندوں کو کچھ دیتے وقت ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے اور اگر کچھ دے کر ان پر مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا ہے تو وہ اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے نہیں ہوتا۔
- آسمانی آفتوں، زلزلہ و ہلاکت خیز آندھیوں وغیرہ سے کوئی بھی خوف و عبرت حاصل نہیں کرتا۔
- انسان، حیوانوں کی طرح ایک دوسرے سے جنسی ملاپ کرتے ہیں مگر کوئی اس برائی کو برائی کہنے کو صرف اس لئے تیار نہیں ہوتا کہ اس کے دل میں لوگوں کا ڈر رہتا ہے۔
- لوگ اللہ کی اطاعت کے منافی اعمال و امور میں کثیر مال خرچ کرتے ہیں مگر اللہ کی اطاعت کے امور میں تھوڑا سا مال خرچ کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔
- والدین کی ناراضگی مول لینا جس سے وہ اپنی اولاد کو عاق کرتے ہیں عام ہے اور ماں باپ کی بے حرمتی کو عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اگر والدین پر کڑا وقت آجائے اور شدید ترین دشمن کی طرف سے ان پر تہمت لگائی جارہی ہو تو اولاد اس سے خوش ہوتی ہے۔
- معاشرہ کی حکمرانی عورتوں کے پاس آگئی ہے اور وہی ہر چیز پر مسلط ہیں کہ سوائے اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے کوئی چیز ان کا مطمع نظر قرار نہیں پاتی۔

- اولاد اپنے والدین پر جھوٹ وافتراء اور الزام تراشی کرتی ہے اوران کے لئے بددعا کرتی ہے اوران کے مرنے کی خبر سن کر خوشیاں مناتی ہے۔
- اگر کسی دن کوئی شخص سارا دن گزارے مگر کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو یا ناپ تول میں کمی نہ کی ہو، یا شراب نوشی نہ کی ہو یا کوئی نشہ آور چیز استعمال نہ کی ہو تو وہ نہایت غمزدہ اور حزن وملال میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے تئیں سوچنے لگتا ہے کہ میری زندگی کا ایک دن ضائع ہو گیا اور میں کچھ نہ کرسکا۔
- حکمران کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابتداروں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے اموال پر ڈاکہ ڈال کران کی تقسیم میں جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے اوران اموال کو غلط کاموں مثلاً جوا بازی وشرابخوری میں استعمال کیا جاتا ہے۔
- شراب سے بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے اور بیمار کو اس کے فوائد بتا کر اس کے ذریعے شفاء حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
- سب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کرنے اور دینداری سے منہ موڑنے میں یکساں ہیں۔
- منافقین کی طوطی بولتی ہے جبکہ اہل حق کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی کوئی ان کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔
- اذان اور نماز کی اُجرت لی جاتی ہے۔
- مسجدیں کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں مگر وہاں وہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف نہیں ہوتا وہ صرف اس لئے اکٹھے ہوتے ہیں تاکہ غیبت وایک دوسرے کی برائی کریں اور اہل حق کا گوشت کھانے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کی ترغیب دلاتے ہوئے اس کے فوائد ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔
- نشہ میں دھت شخص مسجد میں آکر لوگوں کو نماز پڑھایا ہے (پیشنماز) جبکہ اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے کوئی اسے نشہ کرنے سے منع بھی نہیں کرتا بلکہ لوگ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کا احترام کرتے ہیں اوراس کی نشہ کی علت پر اسے سرزنش کرنے کی بجائے اسے بے بس سمجھتے ہیں۔
- یتیم کا مال کھانے والے کو نیک شخص قرار دے کر اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔
- قاضی، اللہ کے احکام کے منافی فیصلے صادر کرتے ہیں۔
- حکام، خائن لوگوں کو اپنے لالچ کی بنیاد پر امانتیں سپرد کرتے ہیں۔
- اربابِ اقتدار میراث کی تقسیم میں ایسا نظام قرار دیتے ہیں جس کی بنیاد پر فاسق وفاجر اور معصیت کار لوگوں کو ہی وراثت میں حصہ مل سکے اور وہ دوسرے وارثوں کے حق پر ڈاکہ ڈالنے میں اپنی من مانی کرسکیں۔

- منبروں پر تقویٰ اختیار کرنے کا حکم و ترغیب دلائی جاتی ہے مگر خطیب حضرات خود اس پر عمل نہیں کرتے۔
- نماز اپنے مخصوص اوقات میں ادا نہیں کی جاتی بلکہ ان اوقات میں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لاپرواہی برتی جاتی ہے۔
- صدقہ دینے میں سفارشوں کی عملداری ہوتی ہے اور اس میں اللہ کی رضا و خوشنودی مقصود نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کے مانگنے پر دیا جاتا ہے۔
- لوگوں کی تمام تر توجہات اپنے شکم و شرمگاہوں پر ہوتی ہے انہیں اس چیز کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ کیا کھا رہے ہیں اور کس سے مناکحت کر رہے ہیں۔
- دنیا نے لوگوں کو اپنی محبت کا اسیر کر لیا ہے، اور حق کی نشانیاں مٹ چکی ہیں اور شعائر اللہ کا نام و نشان ختم کر دیا گیا ہے۔

تو اس صورتحال میں نہایت احتیاط سے کام لو، اور اللہ تعالیٰ سے نجات طلب کرو، اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان حالات میں لوگ اللہ کی ناراضگی کا شکار ہیں اور اللہ نے انہیں کسی وجہ سے مہلت دے رکھی ہے لہٰذا تم خبردار رہو اور کوشش کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان جیسا نہ دیکھے کہ اگر ان پر عذاب نازل ہو تو تم جلدی سے اللہ کی رحمت کے سایہ میں آ جاؤ اور اگر ان پر عذاب آنے میں تاخیر ہو جائے تو وہی اس کا نشانہ بنیں اور تم بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکو اور تم اللہ کی نافرمانی کے مرتکب قرار نہ پاؤ، جان لو کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا بلکہ اللہ کی رحمت نیک لوگوں کے نزدیک ہے (روضہ کافی، جلد ۸، صفحہ ۳۶)

یاد رہے! کہ قیامت کی نشانیوں کے بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بہت زیادہ روایات منقول ہیں اور مذکورہ بالا دو حدیثیں ان میں سے معنی کے حوالہ سے جامع ترین ہیں اور آخر الزمان کے حالات کے تذکرہ پر مشتمل احادیث میں اسی مطلب کی تفصیلات ذکر ہوئی ہیں جس پر یہ آیت مبارکہ دلالت کرتی ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" (اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے منہ موڑ لے تو اللہ اس کی جگہ ان لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرنے والے ہیں وہ مؤمنوں کے ساتھ نرمی اور کافروں کے ساتھ سختی کرنے والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں انہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کرنے کا خوف نہیں)۔۔۔ واللہ اعلم۔۔۔

والحمد للہ

پانچویں جلد اختتام کو پہنچی

خدایا اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما اور مجھے المیزان فی تفسیر القرآن کی تمام جلدوں کے تراجم کرنے کی توفیق عطا فرما۔

العبد

حسن رضا غدیری

پرسٹن۔یو۔کے

12 جولائی 2017ء

صاحبزادہ حافظ
حکیم قاری **محمد رضاء الحق** نقشبندی قادری
ایم اے اسلامیات، عربی
رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف پنجاب   رجسٹریشن نمبر---25

حوالہ نمبر المیزان فی تفسیر القرآن   تاریخ 5-8-17
جلد نمبر 5

میں نے اس حصۂ تفسیر کو
عربی متن کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
اور اس کو اغلاط سے مبرا پایا ہے۔

پروف ریڈر۔ قاری محمد رضاء الحق نقشبندی

خطیب: جامع مسجد اصحاب صفہ (N) بلاک سمن آباد لاہور   رابطہ: 0300-4348316

الغدیر فاؤنڈیشن کے اہم اشاعتی منصوبے

ہمارے اشاعتی منصوبوں میں قرآنیات اور عقائد واخلاق، تاریخ، ادب، فقہ اور دعاؤں پر مشتمل کتب کا معیاری طباعت کے ساتھ شائع کرنا شامل ہے۔ الحمد للہ اب تک ہماری شائع کردہ کتب کو قارئین کی طرف سے بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور ماہنامہ الغدیر بھی اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اپنی تمام مطبوعات کو اہم موضوعات کے ساتھ ساتھ طباعت کے اعلیٰ ترین معیار کا حامل قرار دیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اپنے قارئین کرام کی معاونت مطلوب ہے تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ کتب شائع کر کے اہل ایمان اور علم دوست حضرات تک ایمانی اور علمی دولت کو پہنچا سکیں۔

اب تک جن حضرات نے ہمارے خالص دینی وتبلیغی اشاعتی منصوبوں میں معاونت کی ہے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی مزید توفیق کے لئے دعا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ قارئین کی طرف سے تعاون اور حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ہم اپنے منصوبوں کو مزید وسعت دینے میں کامیاب ہوں گے۔ ہماری مطبوعات کاروباری بنیاد پر نہیں بلکہ خالص دینی جذبہ پر مبنی ہیں اس لئے ان کی قیمتوں میں اصل اخراجات سے کہیں کمتر مقدار مقرر کی جاتی ہے اور بقیہ اخراجات ادارہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا کرتا ہے۔ ہم اپنے تمام کرمفرماؤں سے گزارش کرتے ہیں کہ ہمارے اشاعتی منصوبوں میں ہمارے ساتھ شریک کار رہوں اور اپنے اجر وثواب اور اپنے بزرگوں کی بلندئ درجات کے لئے دینی کتب کی اشاعت میں معاونت کریں۔

یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہماری اولین ترجیح عالم اسلام کی عظیم علمی تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن کی اشاعت ہے جس کی پانچ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور دیگر جلدوں کی تدوین وترتیب اور تکمیل پر تیزی سے کام جاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مقدس سلسلہء اشاعت کو جاری وساری رکھنے اور اس میں وسعت دینے میں آپ ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔ الغدیر فاؤنڈیشن کی شائع کردہ تفسیر المیزان کی تمام جلدیں کاپی رائٹ ایکٹ پاکستان کے تحت رجسٹرڈ شدہ اور انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی وزارت تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد سے باقاعدہ رجسٹرڈ ہوتی ہیں اس لئے کوئی ادارہ ہماری مطبوعات کو اپنی طرف سے شائع کرنے کا مجاز نہیں اگر کسی شخص یا ادارے کی طرف سے ہماری اجازت کے بغیر کوئی کتاب شائع کی گئی تو قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہوگا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے معیار اور غیر منفعتی حوالہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جس دینی خدمت اور تبلیغی جذبہ کے تحت ہم کتب شائع کرتے ہیں وہ باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی خاص عنایات سے نوازے اور ہمیں اس مقدس مشن کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے تمام معاونین کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

سید دولت علی زیدی

الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان